بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

تالیف: آیت اللہ العظمیٰ ناصر مکارم شیرازی اور دیگر علماء ودانشور

کلامِ

امیر المومنین علی علیہ السلام

نہج البلاغہ کی جدید، جامع شرح اور تفسیر

(جلد اوّل)

ترجمہ زیر نگرانی

حجۃ الاسلام مولانا سیّد شہنشاہ حسین نقوی

پیشکش

باب العلم دار التحقیق، مسجد باب العلم

فروغِ ایمان ٹرسٹ، شمالی ناظم آباد، بلاک ڈی، کراچی، پاکستان

ناشر

مصباح القرآن ٹرسٹ

https://downloadshiabooks.com/

جملہ حقوق بحق ناشر محفوظ ہیں۔

نام کتاب .... کلام امیر المومنین علی علیہ السلام
جلد .... اوّل
مؤلف .... حضرت آیۃ اللہ العظمیٰ ناصر مکارم شیرازی دام ظلہ
معاونین .... حجۃ الاسلام محمد جعفر امامی، حجۃ الاسلام محمد رضا آشتیانی
حجۃ الاسلام محمد جواد ارسطا، حجۃ الاسلام ابراہیم بہادری
حجۃ الاسلام سعید داؤدی، حجۃ الاسلام احمد قدسی
ترجمہ .... باب العلم دار التحقیق (فروغ ایمان ٹرسٹ) کراچی، پاکستان
زیر نگرانی .... حجۃ الاسلام مولانا سیّد شہنشاہ حسین نقوی
تعداد ۱۰۰۰
طبع .... اوّل
تاریخ اشاعت .... ستمبر ۲۰۱۶ء بطابق روز عید غدیر ۱۸ ذی الحجہ ۱۴۳۷ھ ہجری
ناشر .... مصباح القرآن ٹرسٹ
مطبع ....
ہدیہ ....

ملنے کا پتہ
معراج کمپنی
LG-3 بیسمنٹ میاں مارکیٹ غزنی سٹریٹ اُردو بازار لاہور۔
فون: 0321-4971214/0423-7361214

باب العلم دار التحقیق
مسجد باب العلم بلاک ڈی، شمالی ناظم آباد، کراچی، پاکستان

https://downloadshiabooks.com/

انتساب

بہ روحِ پرفتوح

محسن علم وادب وثقافت اسلامی،

شریف اجل

ذوالمنقبتین

رضی ذوالحسبین

سید محمد الشریف الرضی رحمۃ اللہ علیہ

https://downloadshiabooks.com/

https://downloadshiabooks.com/

فہرست مطالب

عرض ناشر ۱۹
وجہ تالیف کتاب ۲۱
عرض مترجم ۲۵
پیش لفظ ۲۹
سیّد رضیؒ مدوّنِ نہج البلاغہ ۳۱
سیّد رضیؒ کے اساتذہ ۳۲
سیّد رضیؒ کے شاگرد ۳۳
سیّد رضیؒ کی تالیفات ۳۳
سیّد رضیؒ اور شعر ۳۴
سیّد رضیؒ کے القاب اور ان کی سماجی شخصیت ۳۴
سیّد رضیؒ کے متعلق دانشوروں کے اقوال ۳۵
سیّد رضیؒ کی وفات ۳۶
نہج البلاغہ اور اُس کے خالق کے بارے میں ۳۷
کلام مولا علیہ السلام کی تجلیاں ۳۹
نہج البلاغہ کی فصاحت و بلاغت ۳۹
نہج البلاغہ کے عظیم و عمیق مطالب ۴۵
نہج البلاغہ کی بے مثال جاذبیت ۵۰
نہج البلاغہ کی جاذبیت اور اہم شخصیات کی تعبیرات ۵۲
نہج البلاغہ کی اسناد ۵۴
نہج البلاغہ کی شرحیں ۵۷
''تمہید از سیّد رضیؒ قدس سرہ'' ۵۹

پہلا خطبہ

شرح و تفسیر ۶۵
اُس کی ذات کی بلندی تک فکر کی پرواز ممکن نہیں ۶۵
خدا کی پہلی صفت ۶۵

https://downloadshiabooks.com/

اس موضوع پر جدید نظریات ۱۱۶

دنیا کیسے خلق ہوئی؟ ۱۱۸

نزولِ قرآن کے دور میں تخلیق کائنات کے متعلق مفروضے ۱۱۹

سات آسمانوں سے مراد کیا ہے؟ ۱۲۱

ان امور پر حضرت علیؑ کی دسترس ۱۲۳

شرح و تفسیر ۱۲۴

فرشتوں کا عالم ۱۲۴

اعمال ثبت کرنے والے فرشتوں کا کیا فائدہ؟ ۱۳۰

نکات ۱۳۱

فرشتے کیسے ہوتے ہیں؟ ۱۳۱

اقسام و اوصافِ ملائکہؑ ۱۳۳

عرش و حاملانِ عرشِ الٰہی ۱۳۴

فرشتوں کا معصوم ہونا ۱۳۶

حاملانِ عرش کا مقامِ معرفت ۱۳۷

شرح و تفسیر ۱۳۸

آدمؑ کی خلقت کا آغاز ۱۳۸

پہلا مرحلہ: جسم و روح کے اعتبار سے حضرت آدمؑ کی خلقت ۱۳۸

دوسرا مرحلہ: روح پھونکنے کا مرحلہ ۱۴۰

اہم نکات ۱۴۴

حضرت آدمؑ کی تخلیق ۱۴۴

جسم اور روح کی ترکیب ۱۴۵

انسان، کائنات کا عجوبہ ۱۴۷

شرح و تفسیر ۱۴۸

ابلیس کی گمراہی کا آغاز ۱۴۸

اہم نکات ۱۵۲

مقامِ انسانی کی عظمت ۱۵۲

حضرت آدمؑ کے لیے سجدے کی کیفیت کیا تھی؟ ۱۵۲

شیطان کی خلقت سے متعلق مختلف سوالات ۱۵۳

اس موضوع پر جدید نظریات ۱۱۶
دنیا کیسے خلق ہوئی؟ ۱۱۸
نزولِ قرآن کے دور میں تخلیق کائنات کے متعلق مفروضے ۱۱۹
سات آسمانوں سے مراد کیا ہے؟ ۱۲۱
ان امور پر حضرت علیؑ کی دسترس ۱۲۳
شرح وتفسیر ۱۲۴
فرشتوں کا عالم ۱۲۴
اعمال ثبت کرنے والے فرشتوں کا کیا فائدہ؟ ۱۳۰
نکات ۱۳۱
فرشتے کیسے ہوتے ہیں؟ ۱۳۱
اقسام واوصافِ ملائکہؑ ۱۳۳
عرش وحاملانِ عرشِ الٰہی ۱۳۴
فرشتوں کا معصوم ہونا ۱۳۶
حاملانِ عرش کا مقامِ معرفت ۱۳۷
شرح وتفسیر ۱۳۸
آدمؑ کی خلقت کا آغاز ۱۳۸
پہلا مرحلہ: جسم وروح کے اعتبار سے حضرت آدمؑ کی خلقت ۱۳۸
دوسرا مرحلہ: روح پھونکنے کا مرحلہ ۱۴۰
اہم نکات ۱۴۴
حضرت آدمؑ کی تخلیق ۱۴۴
جسم اور روح کی ترکیب ۱۴۵
انسان، کائنات کا عجوبہ ۱۴۷
شرح وتفسیر ۱۴۸
ابلیس کی گمراہی کا آغاز ۱۴۸
اہم نکات ۱۵۲
مقامِ انسانی کی عظمت ۱۵۲
حضرت آدمؑ کے لیے سجدے کی کیفیت کیا تھی؟ ۱۵۲
شیطان کی خلقت سے متعلق مختلف سوالات ۱۵۳

https://downloadshiabooks.com/

جاہلوں کی بے بنیاد تاویلیں ۱۵۷
شرح وتفسیر...... ۱۵۹
حضرت آدمؑ کی عبرت انگیز داستان...... ۱۵۹
نکات...... ۱۶۴
۱۔حضرت آدمؑ کی جنّت کون سی تھی؟...... ۱۶۴
۲۔کیا حضرت آدم علیہ السلام گناہ کے مرتکب ہوئے؟...... ۱۶۵
۳۔وہ ممنوعہ درخت کیا تھا؟...... ۱۶۷
۴۔حضرت آدم علیہ السلام کو توبہ کے لیے سکھائے گئے کلمات...... ۱۶۸
شرح وتفسیر...... ۱۷۱
پیغمبروں کی بعثت اور ان کی عظیم ترین ذمّے داریاں...... ۱۷۱
نکات...... ۱۷۷
۱۔پیغمبرؑ باغبان کی مانند ہیں...... ۱۷۷
۲۔وہ حادثات جو بیدار کرتے ہیں...... ۱۷۸
۳۔انسانی زندگی میں دین کا کردار...... ۱۷۸
۴۔ہر زمانے میں حجّت خدا کا ہونا ضروری ہے...... ۱۷۹
۵۔پیغمبروں کی خصوصیات...... ۱۸۰
شرح وتفسیر...... ۱۸۲
ظہورِ اسلام...... ۱۸۲
اہم نکات...... ۱۸۵
پہلا نکتہ: بعثت رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے قبل ادیان و مذاہب...... ۱۸۵
غیر معطّلہ...... ۱۸۶
برناڈ شا انگریز فلسفی لکھتا ہے:...... ۱۸۸
دوسرا نکتہ: انبیائے کرامؑ کا آئندہ کے لیے فکر مند ہونا...... ۱۸۸
شرح وتفسیر...... ۱۹۰
قرآن کی خصوصیات...... ۱۹۰
چودہ نکات...... ۱۹۰
۱۔حلال اور حرام الٰہی...... ۱۹۰
۲۔ناسخ ومنسوخ...... ۱۹۱

https://downloadshiabooks.com/

۳۔مباح اور ممنوع ۱۹۱
۴۔خاص و عام ۱۹۲
۵۔وعظ و نصیحت ۱۹۳
۶۔مطلق و مقید ۱۹۴
۷۔محکم اور متشابہ آیات ۱۹۵
۸۔ایک اور خاصیت ۱۹۶
۹۔جہالت کا سہارا ۱۹۶
۱۰۔جز وقتی احکام ۱۹۷
۱۱۔ایک عمل سنّت میں واجب، لیکن آیات میں متروک ۱۹۷
۱۲۔واجبِ موقّت ۱۹۸
۱۳۔گناہان ۱۹۸
۱۴۔قلیل اعمال مقبول اور زیادہ کی اجازت ۱۹۹
نکات ۲۰۰
۱۔ قرآن مجید کی جامعیت ۲۰۰
۲۔قرآنِ کریم کا علم کس کے پاس ہے؟ ۲۰۱
۳۔کبیرہ و صغیرہ گناہوں کے پہچاننے کا معیار ۲۰۲
۴۔ناسخ و منسوخ اور ان کا فلسفہ ۲۰۳
۵۔قرآن مجید کے واقعات اور خوبصورت مثالیں ۲۰۴
شرح و تفسیر ۲۰۶
خطبے کا آخری حصّہ، حج کی عظمت ۲۰۶
نکات ۲۱۱
۱۔خانۂ کعبہ کی تاریخ ۲۱۱
۲۔فلسفۂ حج ۲۱۳

دوسرا خطبہ

خطبہ ایک نگاہ میں ۲۱۸
وہ حالات جن میں یہ خطبہ دیا گیا ۲۱۸
شرح و تفسیر ۲۲۰
اسلام کے دو بنیادی ارکان ۲۲۰

https://downloadshiabooks.com/

اہم نکات ۲۲۵
۱۔توحید، تمام نیکیوں کی جڑ ۲۲۵
۲۔امیر المومنینؑ کی زندگی میں توحید خالص کی تجلی ۲۲۷
شرح وتفسیر ۲۲۹
زمانۂ جاہلیت کا ایک خاکہ ۲۲۹
نکتہ ۲۳۶
دورِ جاہلیت میں لوگوں کی بے حس و مردہ زندگی ۲۳۶
شرح وتفسیر ۲۴۱
آلِ محمد علیہم السلام کا عظیم رتبہ ۲۴۱
چند اہم نکات ۲۴۵
۱۔خاندانِ پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم امتِ اسلامی کی پناہ گاہ ۲۴۵
۲۔آلِ محمد علیہم السلام کون ہیں؟ ۲۴۶
شرح وتفسیر ۲۴۷
اہلِ بیت علیہم السلام کا کوئی ہم پلہ نہیں ۲۴۷
دو اہم نکات ۲۵۴
۱۔قرآن وحدیث کی روشنی میں عظمتِ اہلِ بیتؑ ۲۵۴
۲۔نامعقول توجیہات! ۲۵۶

تیسرا خطبہ

خطبہ، ایک نگاہ میں ۲۶۰
شرح وتفسیر ۲۶۳
مسئلۂ خلافت کے بارے میں اہم تجزیہ ۲۶۳
تاریخی نکات ۲۷۱
۱۔امام علی علیہ السلام نے صبر کو کیوں ترجیح دی؟ ۲۷۱
۲۔خلافت کو ''میراث'' کا نام کیوں دیا گیا؟ ۲۷۲
۳۔حضرت امام علیؑ اور گوشہ نشینی ۲۷۴
۴۔امام المتقینؑ نے خلافت کے مسئلے کو کیوں اٹھایا؟ ۲۷۴
شرح وتفسیر ۲۷۷
خلیفۂ دوّم کا دور ۲۷۷

https://downloadshiabooks.com/

ایک سوال کا جواب:...... ۲۸۱
چند نکات...... ۲۸۹
۱۔خلیفۂ دوّم کا انداز اور طریقۂ کار...... ۲۸۹
۲۔عذر خواہیاں...... ۲۹۲
۳۔ایک سوال اور اُس کا جواب...... ۲۹۵
شرح و تفسیر...... ۲۹۶
خلیفۂ سوّم کا دورِ حکومت...... ۲۹۶
۱۔خلیفۂ دوّم اور سوّم کے انتخاب کا طریقہ...... ۳۰۱
۲۔ابولؤلؤ کا واقعہ اور خلیفۂ سوّم کی حکومت کا آغاز...... ۳۰۲
۳۔چھے آدمیوں کی شوریٰ اور اس کا انجام...... ۳۰۳
۴۔خلیفۂ سوّم کے خلاف تحریک کی وجوہات...... ۳۰۵
۵۔کیا تمام صحابہ، رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے راستے پر گامزن رہے؟...... ۳۰۸
شرح و تفسیر...... ۳۱۰
بیعت کے موقع پر حضرت امام علی علیہ السلام کا خطبہ...... ۳۱۰
آخرت کو متاعِ دنیا کے عوض ہاتھ سے کھو دیا...... ۳۱۴
نکات...... ۳۱۵
۱۔حضرت علیؑ کی بیعت عمومی تھی...... ۳۱۵
۲۔اجتماعی انحرافات کا سرچشمہ...... ۳۱۶
۳۔حضرت علیؑ کے دور میں تین جنگوں کی طرف اشارہ...... ۳۱۷
جنگ جمل...... ۳۱۷
جنگ صفین...... ۳۱۸
جنگ نہروان...... ۳۲۰
شرح و تفسیر...... ۳۲۱
میں نے خلافت اور بیعت کیوں قبول کیا؟...... ۳۲۱
شرح و تفسیر...... ۳۲۵
اہم نکات...... ۳۲۸
ایک سوال کا جواب...... ۳۲۸
اس خط میں کون سے سوالات تھے؟...... ۳۲۸

https://downloadshiabooks.com/

خطبۂ شقشقیہ کی خصوصیات......۳۳۱

چوتھا خطبہ

خطبہ، ایک نگاہ میں......۳۳۵
شرح وتفسیر......۳۳۶
اپنی آنکھیں اور کان کھول دیں......۳۳۶
نکتہ......۳۳۹
ہدایت خاندانِ وحی کے سائے میں......۳۳۹
شرح وتفسیر......۳۴۰
تمہاری عہد شکنی جانتا تھا، مگر!!!......۳۴۰
نکات......۳۴۳
۱۔ باطنی بصیرت......۳۴۳
۲۔ لوگوں کے عیبوں پر پردہ ڈالنا......۳۴۵
شرح وتفسیر......۳۴۶
آج میں حقائق کو آشکار کرتا ہوں......۳۴۶
نکتہ......۳۴۹
حق اور باطل کی جنگ......۳۴۹

پانچواں خطبہ

خطبہ، ایک نگاہ میں......۳۵۱
شرح وتفسیر......۳۵۲
فتنہ برپا کرنے والوں سے ہوشیار رہو......۳۵۲
چار اہم نکات......۳۵۳
پہلا نکتہ......۳۵۳
دوسرا نکتہ......۳۵۴
تیسرا نکتہ......۳۵۵
چوتھا نکتہ......۳۵۶
نکتہ......۳۵۷
پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بعد امام علی علیہ السلام نے کیوں قیام نہیں کیا؟......۳۵۷

https://downloadshiabooks.com/

شرح وتفسیر.......... ۳۵۹
اِن بہانہ ڈھونڈنے والوں سے کیا برتاؤ کیا جائے؟.......... ۳۵۹
نکات.......... ۳۶۱
امام علیہ السلام کی بہادرانہ جدوجہد.......... ۳۶۱
میں موت سے کیوں ڈروں؟.......... ۳۶۲
میں کیوں خاموش ہوا؟.......... ۳۶۳

چھٹا خطبہ

خطبہ، ایک نگاہ میں.......... ۳۶۵
شرح وتفسیر.......... ۳۶۶
دشمن کے مقابل غفلت کا شکار نہیں ہونا چاہیے.......... ۳۶۶
نکتہ.......... ۳۶۹
تمام ذمّے داروں کے نام پیغام.......... ۳۶۹

ساتواں خطبہ

شرح وتفسیر.......... ۳۷۱
شیطان کے پیروکار.......... ۳۷۱
شیاطین کے بارے میں اہم نکتہ.......... ۳۷۵

آٹھواں خطبہ

خطبہ، ایک نگاہ میں.......... ۳۷۹
شرح وتفسیر.......... ۳۸۰
عُذرِ گناہ بدتر از گناہ.......... ۳۸۰

نواں خطبہ

شرح وتفسیر.......... ۳۸۳
کھوکھلے نعرے بازی.......... ۳۸۳
نکات.......... ۳۸۵
۱۔ باعمل لوگ.......... ۳۸۵
۲۔ شوروغل اور مفید وموثر تبلیغات کے درمیان فرق.......... ۳۸۷

https://downloadshiabooks.com/

دسواں خطبہ

خطبہ، ایک نگاہ میں ۳۸۹
شرح و تفسیر ۳۹۰
مسلمانوں کے لیے انتباہ ۳۹۰
نکتہ ۳۹۳
شیطان کے لشکر ۳۹۳

گیارہواں خطبہ

خطبہ، ایک نگاہ میں ۳۹۵
شرح و تفسیر ۳۹۷
چٹان کی طرح کھڑے رہو ۳۹۷
نکات ۴۰۰
حضرت محمد بن حنفیہؓ کون ہیں؟ ۴۰۰
دشمن پر فتح پانے کی اہم ترین شرائط ۴۰۲

بارہواں خطبہ

خطبہ، ایک نگاہ میں ۴۰۳
شرح و تفسیر ۴۰۴
مکتب کا رشتہ ۴۰۴
اہم نکتہ ۴۰۶
محکم ترین رشتے داری ۴۰۶

تیرہواں خطبہ

خطبہ، ایک نگاہ میں ۴۱۲
شرح و تفسیر ۴۱۲
جنگ جمل کی افواج کے اوصاف ۴۱۲
نکات ۴۲۰
پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی جنگ جمل کے بارے میں پیش گوئی ۴۲۰
اہل بصرہ کی مذمّت ۴۲۲

https://downloadshiabooks.com/

دائرۂ اخلاق کی تاثیر ۴۲۳

چودھواں خطبہ

خطبہ، ایک نگاہ میں ۴۲۵
شرح وتفسیر ۴۲۶
پھر اہلِ بصرہ کی مذمّت ۴۲۶

پندرہواں خطبہ

خطبہ، ایک نگاہ میں ۴۲۹
شرح وتفسیر ۴۳۰
خدا کی قسم، غصب شدہ مال کو واپس لوٹاؤں گا ۴۳۰
نکات ۴۳۲
انسانی معاشرے میں عدل کے آثار ۴۳۲
خلیفۂ سوّم کی عجیب بخششیں ۴۳۴
ایک اہم سوال کا جواب ۴۳۵

سولہواں خطبہ

خطبہ، ایک نگاہ میں ۴۳۸
شرح وتفسیر ۴۳۹
ہوشیار ہوجاؤ! بڑی آزمائش کا سامنا ہے ۴۳۹
نکات ۴۴۳
تاریخ اپنے آپ کو دوہراتی ہے ۴۴۳
حقیقت کا بیان یا مصلحت کی رعایت ۴۴۳
شرح وتفسیر ۴۴۵
گناہ سرکش گھوڑوں کی مانند ہیں ۴۴۵
شرح وتفسیر ۴۵۱
راہِ نجات یہ ہے ۴۵۱
چند نکات ۴۵۸
جاہل وہ ہے جو اپنی قدر نہ جانے ۴۵۸
اعتدال، اللہ کا سیدھا راستہ اور صراط مستقیم ہے ۴۶۰

https://downloadshiabooks.com/

سترہواں خطبہ

خطبہ، ایک نگاہ میں ۴۶۴
شرح و تفسیر ۴۶۴
تمام مخلوقات میں ناپسندیدہ ترین افراد کون لوگ ہیں؟ ۴۶۴
چند نکات ۴۷۰
بدعت کیا ہے اور اسے ایجاد کرنے والا کون ہے؟ ۴۷۰
خطرناک ترین گناہ، دوسروں کے گناہوں کا بوجھ اپنے کاندھوں پر لادنا ۴۷۲
شرح و تفسیر ۴۷۴
عالم نما جاہل ۴۷۴
چند نکات ۴۸۵
علمائے سوء اور اُن کے خطرات ۴۸۵
مکڑی کے جال جیسی کمزور معلومات ۴۸۶
چاپلوس مداح (حاشیہ نشین) ۴۸۷
شرح و تفسیر ۴۸۹
نکتہ ۴۹۱
تفسیر بالرائے اور حقائق کی تحریف ۴۹۱

اٹھارہواں خطبہ

خطبہ، ایک نگاہ میں ۴۹۳
شرح و تفسیر ۴۹۴
یہ تمام اختلافات کیوں ہیں؟ ۴۹۴
نکات ۴۹۶
مسئلۂ تصویب کیا ہے اور اس کی ابتدا ۴۹۶
اجتہاد کے دروازے کو بند کردینا ۴۹۹
عقیدۂ تصویب اور اجتہاد کا دروازہ بند کرنے کے نتائج ۵۰۱
شرح و تفسیر ۵۰۳
ان اختلافات کی توجیہ نہیں کی جاسکتی ۵۰۳
نکتہ ۵۰۶

https://downloadshiabooks.com/

قرآن میں کس طرح ضرورت کی تمام چیزیں موجود ہیں ۵۰۶
شرح وتفسیر ۵۱۰
قرآن کی خوشنمائی اور گہرائی ۵۱۰
نکات ۵۱۲
قرآن واہلِ بیتؑ سے دوری کے بُرے نتائج ۵۱۲
قرآن اور جدید مسائل ۵۱۶
قرآن کے عجائبات کیوں ختم نہیں ہوتے ہیں؟ ۵۱۷

اُنیسواں خطبہ

شرح وتفسیر ۵۲۰
بے ادب اور جسور منافق سے مُڈ بھیڑ ۵۲۰
نکات ۵۲۶
اتنا سخت برتاؤ کیوں؟ ۵۲۶
امامؑ نے کیسے اس منافق آدمی کو برداشت کیا؟ ۵۲۷

بیسواں خطبہ

شرح وتفسیر ۵۲۹
بہت جلد پردے اٹھادیئے جائیں گے ۵۲۹
ایک نکتہ ۵۳۵
مرنے کے بعد کی دنیا ۵۳۵

https://downloadshiabooks.com/

https://downloadshiabooks.com/

عرض ناشر

مصباح القرآن ٹرسٹ محسن ملت علامہ سیّد صفدر حسین نجفی اعلی اللہ مقامہ کے ان صدقاتِ جاریہ میں سے ہے، جن سے لوگ تا قیامت استفادہ کرتے رہیں گے اور موصوف کے درجات عالیہ میں اضافہ ہوتا رہے گا۔ مصباح القرآن ٹرسٹ نے تراجم وتفاسیر قرآن سے کام شروع کیا اور پھر ہر وہ کتاب جس کی ملت کو ضرورت تھی، شائع کی اور انشاء اللہ العزیز شائع کی جاتی رہے گی۔

قرآن واہل بیت علیہم السلام کی تعلیمات کو عام کرنا اور انہیں گھر گھر پہنچانا ہمارے ادارے ''مصباح القرآن ٹرسٹ'' لاہور کا پہلے روز سے ہدف رہا ہے۔ اس سلسلے میں دسیوں علمی کام جو علمائے کرام کی تالیف وتصنیف اور ترجے کی صورت میں منظر و مشہود ہیں۔ ان میں حضرت آیۃ اللہ العظمٰی ناصر مکارم شیرازی دام ظلہ کی تالیف شدہ ''تفسیرِ نمونہ، تفسیرِ پیامِ قرآن'' سرِ فہرست ہیں۔ ادارہ ہذا نے چاہا کہ حضرت آیۃ اللہ العظمٰی ناصر مکارم شیرازی دام ظلہ کی شرح نہج البلاغہ ''پیام امام امیر المومنین علیہ السلام'' کا ترجمہ پیش کیا جائے۔ اگرچہ خود حضرت آیۃ اللہ العظمٰی ناصر مکارم شیرازی دام ظلہ نے مجھے اجازت دی تھی، یہاں ممنونِ احسان ہیں حجۃ الاسلام والمسلمین الحاج السیّد ذوالقدر رضوی دامت برکاتہ (وکیل ونمائندہ آقائی مکارم شیرازی برائے لندن) کے جن سے تحریری اجازت حاصل کر کے ترجمہ کیا گیا ہے۔ امید ہے بہت جلد تمام جلدوں کو پیش کیا جائے گا۔

یاد رہے کہ مصباح القرآن ایک خود مختار ادارہ ہے۔ اس کے بانی مرحوم حجۃ الاسلام والمسلمین علامہ سیّد صفدر حسین نجفیؒ تھے۔ انہوں نے اس ادارے کا ایک الگ ٹرسٹ تشکیل دیا جو اوّل دن سے اخراجات کا خود انتظام کرتا ہے۔ ادارہ مصباح القرآن ٹرسٹ حجۃ الاسلام مولانا سید شہنشاہ حسین نقوی کا تہہ دل سے مشکور ہے کہ اُنہوں نے شرح نہج البلاغہ کے ترجمہ کی نگرانی کے فرائض از خود انجام دیئے، نیز ادارہ ''باب العلم دار التحقیق'' کا بھی ممنون ہے کہ اُنہوں نے کتابِ ہٰذا کی اشاعت کی اجازت دی۔

مصباح القرآن کی تمام کتابیں آپ کے استفادے کے لیے انٹرنیٹ پر موجود ہیں، جن کا مطالعہ آپ ان ویب سائٹس پر کر سکتے ہیں: www.misbahulqurantrust.com

قارئین کرام سے التماس ہے کہ اگر وہ اس کتاب میں کہیں خامی، کمی یا غلطی محسوس کریں تو ہمیں مطلع فرمائیں، ہم آپ کے شکر گزار ہیں۔ ادارے کی ترقی اور اس کے بانی محسنِ ملت علامہ سیّد صفدر حسین نجفی اعلی اللہ مقامہٗ کے درجات کی بلندی کے لیے دعا کا طالب

مسئول

مصباح القرآن ٹرسٹ، لاہور، پاکستان

https://downloadshiabooks.com/

https://downloadshiabooks.com/

وجہ تالیف کتاب

''اسلامی تعلیمات کا عمیق سمندر''''انسان کی تعلیم وتربیت کا اعلیٰ ترین درس''
''خودسازی اور تہذیب نفس کا بہترین سرمایہ''
اور''پاک وپاکیزہ اور قابلِ فخر معاشرہ بنانے کے بہترین دستور''

یہ عنوانات ہیں جنہیں''نہج البلاغہ'' کے تعارف کے لیے قرار دیا جاسکتا ہے،صرف وہی شخص اس کے بارے میں گفتگو کرسکتا ہے،جس نے شروع سے آخر تک غور سے اس کا مطالعہ کیا ہو، پھر اس پر واضح ہوجائے گا کہ جو کچھ اس گراں قدر تالیف کے بارے میں کہا گیا ہے،وہ بہت کم ہے۔میں نے بھی دوسروں کی طرح''نہج البلاغہ'' کے مختلف حصّوں کا اپنی ضرورت کے مطابق مطالعہ کیا تھا۔یہاں تک کہ ۱۵/خرداد ۴۲ شمسی کو بہت سی شخصیات کے ساتھ گرفتار کرلیا گیا،شروع میں شاہ کی حکومت کی طرف سے بہت سختیاں تھیں، تمام چیزیں ہمارے لیے ممنوع تھیں۔رفتہ رفتہ مشکلات کم ہوئیں تو دوستوں سے تقاضا کیا کہ ہمارے پڑھنے کے لیے کتابیں فراہم کریں اور میں نے اپنے لیے''نہج البلاغہ'' کا مطالبہ کیا۔اس فرصت کو غنیمت جانتے ہوئے نہج البلاغہ کی ترتیب کے مطابق مطالعہ شروع کیا۔توفیقِ الٰہی شاملِ حال رہی،دوسرے حصّے کا مکمل مطالعہ کیا، جو خطوط اور سیاسی واخلاقی حکم ناموں پر مشتمل ہے۔اُس وقت احساس ہوا کہ نہج البلاغہ میرے تصّور سے کہیں زیادہ بلند ہے۔اپنے آپ کو علم ودانش کے سمندر کے مقابل پایا۔زندگی سے متعلق تمام اہم ترین مسائل اور ان کے تمام معنوی اور مادّی پہلو اس میں موجود ہیں،سمندر کی امواج کی طرح جو گوہر اور موتیوں کو لاکر ساحل پر ڈال جاتی ہیں اور غوطہ زن کا اس پر زیادہ حق ہوا کرتا ہے۔میں اُس دن سمجھا کہ کتنے محروم ہیں وہ افراد جو اس بے مثال گنجینہ کے ہوتے ہوئے اس سے بے خبر ہیں اور دوسروں کی طرف ہاتھ پھیلاتے ہیں، جو چیز خود ان کے پاس موجود ہے۔اس کی تمنا دوسروں سے کرتے ہیں۔

نہج البلاغہ کی خصوصیات میں سے ایک یہ ہے کہ جس طرح قرآن کے مضامین زمانے کے گزرنے سے پرانے نہیں ہوتے، اسی طرح اس کے مطالب بھی چاہے وہ سیاسی ہوں یا فکری اور اَخلاقی ہوں،زمانہ گزرنے کے ساتھ پرانے نہیں

https://downloadshiabooks.com/

ہوتے۔ گویا ایسا محسوس ہوتا ہے کہ آج امیر المومنین علیہ السلام کی زبانِ مبارک سے یہ کلمات جاری ہوئے ہیں۔ مناسب ہوگا کہ عاشق باللہ، سالک الی اللہ اور کامیاب زندگی گزارنے والے افراد ہر روز اس بزرگ عالم یعنی علامہ سیّد رضیؒ کی قبر پر حاضر ہوں اور ان کی رُوح پر سلام بھیجیں کہ انھوں نے امیر المومنینؑ کے ایسے گراں بہا کلمات پر مشتمل کتاب ہم مسلمانوں، بلکہ انسانی معاشرے کے حوالے کی ہے۔

نہج البلاغہ کے بارے میں جتنا بھی کہا جائے کم ہے، کیوں کہ اس کا حق ادا کرنا ممکن نہیں۔ بہتر تو یہ ہے کہ اصل مطلب کی طرف بڑھیں، جو اس کتاب کے لکھنے کا سبب ہے اور وہ یہ ہے کہ تاریخ میں نہج البلاغہ کی متعدد شرحیں لکھی گئیں، علمائے گزشتہ اور عصر حاضر کے دانش مندوں نے ہمارے لیے اس کی تفسیر اور حقائق کو ظاہر کرنے کی کوششیں کی ہیں اور قابلِ قدر خدمات انجام دی ہیں۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ نہج البلاغہ اس طرح ہے کہ گویا ابھی تک کسی نے اس پر نظر ہی نہ ڈالی ہو۔ یہ اب بھی مظلوم ہے اور اس کے لیے مزید کوشش کرنے کی ضرورت ہے۔ خاص طور پر اس زمانے میں جب کہ مسائل و مشکلات زیادہ ہیں اور مختلف مکاتبِ فکر اپنے اعتقادات معاشرے پر تھوپنا چاہتے ہیں اور دوسری جانب اخلاق، تقویٰ و پرہیزگاری سے دوری بڑھ رہی ہے، اُدھر دنیا دار لوگ اپنے غیر اخلاقی مقاصد کے حصول میں مصروف ہیں لہٰذا اس بات کی اشد ضرورت ہے کہ نہج البلاغہ پر زیادہ سے زیادہ کام کیا جائے تا کہ معنوی، مادّی، انفرادی اور اجتماعی مشکلات کا حل پیش کیا جا سکے اور دیگر مکاتبِ فکر کا مقابلہ کیا جا سکے۔

اسی دلیل کی بنا پر اس توفیق کے بعد جو ''تفسیرِ نمونہ'' اور ''پیامِ قرآن'' کی صورت میں الحمد للہ اس حقیر اور میرے بہترین ساتھیوں کو نصیب ہوئی۔ اہلِ علم نے اصرار کیا کہ اب نہج البلاغہ کا مرحلہ ہے اور تفسیرِ نمونہ کی طرح اس پر کام کیا جائے اور سابقہ تجربات کی روشنی میں اور بہتر انداز سے خوبصورت اسلوب کے ساتھ اس کام کو انجام دیا جائے۔ جب کہ مسائل و مشکلات پہلے سے زیادہ ہوگئی ہیں اور یہی سبب اس کام کی راہ میں رکاوٹ تھا، لیکن سوچا کہ جب تک عمر باقی ہے اس کام کو انجام دیا جائے، پھر خدا سے توفیق اور حضرت علیؑ سے مدد مانگی، چنانچہ تفسیر نمونہ میں مدد کرنے والے کچھ پرانے ساتھیوں اور کچھ نئے ساتھیوں کے ساتھ مل کر نہج البلاغہ کی شرح مکمل کی، جس میں روزمرہ کے مسائل، فکری، سماجی، عقیدتی ضروریات کا حل ہے۔ اس کے علاوہ گزشتہ شارحینِ نہج البلاغہ سے استفادہ کرتے ہوئے اس میں جدّت اور نئے مطالب کی طرف توجّہ کی گئی ہے۔

یہ کام روزِ ولادتِ باسعادت امیر المومنین علیہ السلام ۱۳ رجب المرجب ۱۴۱۳ھ ہجری قمری میں شروع ہوا، البتہ سُستی کا شکار رہا اور پہلی جلد کو تقریباً تین سال کا عرصہ لگا۔ (شروع میں جلدی میں کام کرنا ویسے بھی صحیح نہیں تھا) لیکن اب الحمد للہ تیزی

https://downloadshiabooks.com/

سے کام جاری ہے، امید ہے اس سے بھی زیادہ کام میں تیزی آئے گی، لیکن نہج البلاغہ کی موجیں اس قدر عظیم ہیں کہ اس اوقیانوس میں کام کرنا اتنا آسان بھی نہیں۔

بہر حال ہم اسے اہلِ نظر کے ذوقِ مطالعہ پر چھوڑتے ہیں اور صاحبانِ نظر سے درخواست ہے کہ اگر کوئی کمی محسوس کریں تو ہماری توجّہ دلائیں تاکہ اس کام میں وہ بھی حصّہ دار ہوسکیں۔ آیئے دُعا کے لیے ہاتھ اٹھاتے ہیں کہ خداوند عالم ہمیں توفیق عطا فرمائے کہ اس کام کی تکمیل بہ طریقِ احسن انجام پائے۔ (آمین)

ناصر مکارم شیرازی (قم المقدسہ)
۳ ربیع الثانی ۱۴۱۷ھ ہجری قمری

https://downloadshiabooks.com/

https://downloadshiabooks.com/

عرض مترجم

قرآن مجید اللہ کا وہ کلام ہے جو تمام گزشتہ آسمانی صحیفوں کے بعد اپنی تمام تر جامعیت اور ضرورت کے مطابق پیکر علمِ الٰہی سرورِ کائنات رحمۃ للعالمین آنحضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر نازل کیا گیا جو قیامت تک رہنمائی عطا کرتا رہے گا اور اس کی تفسیر و تفہیم کی ذمے داری بعد از پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم عترت و اہل بیت علیہم السلام کو دی گئی۔ چنانچہ ان پاک اور عظیم ہستیوں نے اپنی احادیث، فرامین اور عملی اقدامات کے ذریعے اسے تصویرِ تجسّم عطا کی اور عملی جامہ پہنایا، یعنی اہل بیت علیہم السلام کی روِش، ان کے فیصلے اور طرزِ زندگی قرآن کی عملی تفسیر ہے، البتہ اس عظیم سرمائے کو جمع کر کے کتابی شکل دینا ایک اساسی خدمت ہے جسے علاّمہ سیّد شریف رضی علیہ الرحمہ نے اپنے ذوقِ ادبی و علمی کے مطابق جمع کر کے "نہج البلاغہ" نام دیا جو ایک ہزار سال سے عقلوں کی بیداری و ہدایت، ضمیروں کی سالمیت، فطرت کی اصالت، سماج کی قیادت اور ان سب کے محور اللہ کی عبادت کو فروغ دے رہی ہے۔ مولا علی علیہ السلام کے کلام کا معیار اس درجے کا ہے کہ ادبائے کرام نے متفقہ طور پر تسلیم کیا ہے کہ یہ اللہ کے کلام سے نیچے اور بندوں کے کلام سے اوپر ہے۔

تَحۡتَ کَلَامِ الۡخَالِقِ وَفَوۡقَ کَلَامِ الۡمَخۡلُوۡقِ

مسلم و غیر مسلم علمائے کرام اور اہل ادب نے اسے سمجھنے اور سمجھانے کے لیے سیکڑوں مفصل و موضوعاتی شرحیں، مقالے اور مضامین لکھے، ایسی ہی شروح میں سے ایک مرجع عالی قدر حضرت آیۃ اللہ العظمیٰ ناصر مکارم شیرازی (مدظلہ العالی) اور دیگر علما و دانشوروں کی مرتب کردہ بہترین، سلیس اور نئی شرح "پیام امام امیر المومنین علیہ السلام" ہے۔ نہج البلاغہ اور مولا علی علیہ السلام کی خدمت و نوکری کا کسے شوق نہیں ہوگا۔ چنانچہ مصباح القرآن ٹرسٹ لاہور کے مسئول محترم جناب سیٹھ محمد امین ساعتی کی فرمائش پر دفتر حضرت آیۃ اللہ العظمیٰ ناصر مکارم شیرازی لندن کے مسئول و نمائندہ محترم عالم بزرگوار حضرت حجۃ الاسلام والمسلمین سیّد ذو القدر رضوی دامت برکاتہ کی تحریری اجازت اور حضرت آیۃ اللہ علاّمہ سیّد عقیل الغروی دامت برکاتہ سے مفید مشوروں اور رہنمائی کے بعد باب العلم دار التحقیق، کراچی، پاکستان کے اراکین، مولانا محمد حسین کریمی، مولانا

https://downloadshiabooks.com/

غلام علی عارفی، مولانا فدا حسین انقلابی، مولانا محمد یعقوب شاہد آخوندی، مولانا منظور حسین ابوالحسنی، جناب مظہر حسنین نقوی (مرحوم)، محترم آغا نادر رضوی، محترم سیّد ذوالفقار حسین نقوی سمیت محترم مرزا محمد علی، محترم محمد مرسلین، محترم ذاکر اسدی، محترم سیّد شہزاد عالم زیدی، محترم ضمیر الحسن جعفری، محترم سیّد سجاد رضا رضوی اور محترم سیّد اسد علی زیدی کی باہمی تعاون سے ترجمے کا کام شروع ہوا جس کی تیسری جلد اب الحمدللہ آپ کے سامنے ہے۔

اس کتاب کے مکمل دورے کے بعد چند جلدوں کا ضمیمہ ترتیب دیا گیا ہے، جس میں روات کا ذکر، جو کہ منہاج البراعہ (خوئیؒ) سے استفادہ ہے اور حوالہ جات بھی مزید بڑھائے جائیں گے۔ اسی طرح قائد ملت جعفریہ علامہ مفتی جعفر حسین اور برصغیر کے بلند مرتبہ علامہ سید ذیشان حیدر جوادی کی شرح کے علاوہ باب العلم دار التحقیق کی جانب سے معلومات کا اضافہ ہے۔

قابل ذکر ہے کہ کلام امیر المؤمنین علی علیہ السلام میں اردو ترجمہ علامہ مفتی جعفر حسین مرحوم اور علامہ سید ذیشان حیدر جوادی سے لیا گیا ہے۔

نہج البلاغہ کا اگر پوری ملّت مطالعہ کرے تو یقیناً ترقی وعظمت مسلمین وتشیع میں کئی گنا اضافہ ہوگا اور انشاءاللہ یہ کاوش اس راہ میں مددگار ثابت ہوگی۔ شہید پروفیسر سیّد سبط جعفر زیدی سے اس کتاب کے بارے میں مشورے رہے کہ نہج البلاغہ کا منظوم ترجمہ کیا جائے، چنانچہ اس پر کام شروع کر دیا گیا ہے۔

والسلام

سیّد شہنشاہ حسین نقوی

مدیر باب العلم دار التحقیق، کراچی، پاکستان

https://downloadshiabooks.com/

مجوز کا عکس

دفتر حضرت آیت اللہ العظمیٰ
مکارم شیرازی (مدظلہ)
سڈبری، ویمبلی، لندن
انگلستان

باسمہ سبحانہ وتعالیٰ

جناب حجۃ الاسلام والمسلمین سید شہنشاہ حسین نقوی دامت معالیکم
ڈائرکٹر ــــــ باب العلم دارالتحقیق،
فروغ ایمان ٹرسٹ،
ناظم آباد، کراچی، پاکستان۔

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ
انشاءاللہ العزیز آپ ہر طرح سے بخیر وعافیت ہوں گے۔

یہ جان کر مجھے بے انتہا مسرت ہو رہی ہے کہ حضرت آیۃ اللہ العظمیٰ شیخ ناصر مکارم شیرازی کی زیر نگرانی تالیف ہونے والی نہج البلاغہ کی سلیس و نفیس شرح ــــ پیام امامؑ ــــ کا اردو ترجمہ باب العلم دارالتحقیق میں آپ کی زیر نگرانی انجام پا رہا ہے۔

حضرت آیۃ اللہ العظمیٰ شیخ ناصر مکارم شیرازی مدظلہ العالی کے نمائندہ اور ان کے لندن کے آفس کے مسئول کی حیثیت سے میں آپ کی خدمت میں صمیم قلب سے مبارکباد پیش کرتا ہوں۔ اور دعا گزار ہوں کہ ربّ کریم آپ کے توفیقات میں اضافہ فرمائے اور آپ کے مساعی جمیلہ وجلیلہ کو شرف قبول سے سرفراز فرمائے۔

تبلیغ دین اور خدمتِ کتب ومذہب اہل بیتِ عصمت وطہارت کی غرض سے حضرت آیۃ اللہ العظمیٰ مکارم شیرازی مدظلہ العالی کی جانب سے آپ کو ان کی تمام کتابوں کے ترجمہ اور اشاعت کی اجازت حاصل ہے۔ بشرطیکہ ان کے مضامین اور محتویٰ میں کسی قسم کی تبدیلی واقع نہ ہو۔

میں اس عظیم الشان کتاب کی تکمیل اور اشاعت کے لیے بھی دست بہ دعا ہوں۔ ربّ اکبر ــــ سبحانہ وتعالیٰ ــــ آپ کے دست وبازو کو قوت وطاقت عطا فرمائے اور اس جیسے کارناموں کے لیے زیادہ سے زیادہ امکانات فراہم فرمائے ــــ آمین بحق محمد وآلہ الطاہرین!

دعا گو
۲۶ صفر المظفر ۱۴۳۲ ہجری
سید ذوالفقار رضوی
مرکز باب المراد
لندن، یو۔ کے۔

Head Office
دفتر حضرت آیت اللہ العظمیٰ
مکارم شیرازی
حوزہ علمیہ قم
جمہوری اسلامی
ایران
Tel: (0098) 251 774 311
(0098) 251 774 312
Fax: (0098) 251 774 311
www.makarem.ir

Babul Murad Centre
856-858 Harrow Road, Sudbury Town, Wembley, Middlesex, London HA0 2PX .U.K
Tel: 0208 908 1525 • Fax: 0208 537 1232 • Answer Phone: 0208 908 0055

https://downloadshiabooks.com/

https://downloadshiabooks.com/

پیش لفظ

نہج البلاغہ آج کی دنیا میں تصور سے کہیں زیادہ بہتر طریقے سے روشنی پھیلا رہی ہے، کیوں کہ بہت ساری اجتماعی اور انفرادی مشکلات اور دشواریوں کا حل اس میں موجود ہے اور بشریت کی جان لیوا بیماریوں کے لیے دوا اِس میں پوشیدہ ہے۔ نہج البلاغہ کی روشن شعاؤں نے دنیائے اسلام کی سرحدوں کو پار کر کے اب غیر مسلموں کے دلوں کو بھی منور کرنا شروع کر دیا ہے، وہ ایسے فیضیاب ہو رہے ہیں کہ کبھی ان کے ایسے بیانات نہج البلاغہ کے بارے میں آتے ہیں کہ دوستوں کی جان و دل کو جھنجوڑ کے رکھ دیتے ہیں اور شوق کے آنسوؤں کو آنکھوں سے بہا دیتے ہیں۔

ایک عرب عیسائی مفکر میخائیل نعیمہ اپنی کتاب "نہج البلاغہ اور اُس کے صاحب" کے بارے میں لکھتا ہے کہ کیا علیؑ صرف اسلام کے لیے ہے؟ اگر ایسا ہے تو ۱۹۵۶ء میں ایک عیسائی ان کی گزشتہ زندگی کے بارے میں تحقیق و جستجو اور دقت کیوں کرتا؟ یہ جارج جرداق جو ایک لبنانی عیسائی مصنف ہیں جنہوں نے کتاب "اَلْاِمَامُ الْعَلِیؑ صَوْتُ الْعَدَالَۃِ الْاِنْسَانِیَّۃِ" لکھی ہے یہ ان کی طرف اشارہ ہے۔ وہ (امیر المومنینؑ) ایسے دل پذیر شاعر، دل فریب واقعات، نرم اور لطیف حکایات اور حیرت انگیز جنگی واقعات کو شاعرانہ انداز سے پیش کرنے والے، ایک ایسے مردِ میدان، جو نہ صرف جنگ کے میدان میں، بلکہ دور اندیشی اور پاک دلی میں، فصاحت، بلاغت اور سحر انگیز بیانی میں، بہترین اخلاق اور جوشِ ایمانی میں، بلند ہمتی میں، مظلوموں اور ناامیدوں کی مدد کرنے میں، حق اور سچ کی پیروی کرنے میں، من جملہ تمام صفاتِ حسنہ میں ایسے مردِ میدان تھے کہ تاریخ میں آپؑ کی کوئی نظیر نہیں۔

نہج البلاغہ کی کشش اس حد تک ہے کہ سخت پیاسی ارواح کو اپنی شفاف حقیقت سے ایسا سیراب اور مست کر دیتی ہے کہ وجودِ انسان سے شراب طہور کے نشے کے تمام اثرات آشکار ہو جائیں، گویا حوض کوثر ہے اور مولا علیؑ ساقی کوثر کنارے پر بیٹھے ہر کسی کو اس کی قابلیت کے مطابق فائدہ پہنچاتے ہیں۔ مگر افسوس! کہ نہج البلاغہ کی تفسیر و تشریح اور معانی کی وضاحت کے بارے میں مسلمان دانشوروں نے گروہی شکل میں اگر چہ بہت کوششیں کی ہیں، مگر اب بھی گہری اور بیشتر تشریحات کی

https://downloadshiabooks.com/

ضرورت ہے۔ پہلے زمانے میں بزرگان دین نے اپنے حساب سے عمدہ لیکن محدود شرحیں لکھی ہیں، مگر آج کی دنیا کو تازہ اور تفصیلات کے ساتھ شرحیں درکار ہیں، اسی بنا پر تفسیر نمونہ کا کام ختم کرنے کے بعد، مولا امیر المومنین علیہ السلام کی عنایات اور مدد سے مالی مشکلات کے باوجود ہم نے نہج البلاغہ کی مکمل شرح وتفسیر کا ارادہ کیا۔ اس امید کے ساتھ کہ اس کتاب سے دانشور حضرات، علما، فضلا، محققین اور عام لوگ بھی استفادہ کرسکیں۔

اس شرح وتفسیر کے لیے مندرجہ ذیل نکات پر خصوصیت کے ساتھ کام کیا گیا ہے۔

۱۔ اس کے ساتھ تمام جملوں کا ترجمہ وتفسیر۔

۲۔ تمام لغات اصلی وغیر لغات کی تفسیر۔

۳۔ خطبوں اور خطوط سے مربوط تاریخی مسائل کے بیان کی اہمیت۔

۴۔ مختلف عقیدتی، اخلاقی، اجتماعی اور سیاسی۔۔۔ بحثوں پر ضروری تجزیہ وتحلیل۔

۵۔ اضافی نکات جن پر مکمل بحث کی گئی ہے، جو شاید محترم پڑھنے والوں کو دوسری کتابوں کی طرف رجوع کرنے سے بے نیاز کردے۔

بحمد اللہ اس کام میں ہمارے ساتھ کچھ نئے ساتھیوں اور تفسیر نمونہ میں کام کرنے والے ساتھیوں نے مدد کی، جس کے نتیجے میں ابحاث مزید توضیحات اور تشریحات کے ساتھ بیان کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ ان عزیزوں کے تشکر کے ساتھ امید ہے عنایات پروردگار سے اس شرح وتفسیر کا مناسب اثر عالم اسلام ومسلمین میں پیدا ہوگا اور یوم آخرت کا ذخیرہ قرار پائے گا۔

ناصر مکارم شیرازی

۱۳ رجب ۱۴۲۰ھ

حوزۂ علمیہ، قم

https://downloadshiabooks.com/

سیّدرضیؒ مدوّنِ نہج البلاغہ

تمام مورّخین کے نزدیک سیّد رضیؒ ۳۵۹ہجری قمری میں بغداد میں پیدا ہوئے۔بچے کا نام محمد رکھا،بعد میں ''شریف رضیؒ'' اور''ذوالحسبین'' مشہور ہوئے۔آپ کی والدہ فاطمہ بنت حسین ابن ابی محمد اطروش تھیں۔حضرت امام علی علیہ السلام کی نسل سے تھیں۔[۱] آپ باکردار، بلندنظر خاتون تھیں۔سیّدرضیؒ آپ کے بارے میں فرماتے ہیں:

لَوْ کَانَ مِثْلَكِ کُلُّ اُمٍّ بَرَّةٍ غَنِیَ الْبَنُوْنَ بِهَا عَنِ الْآبَآءِ[۲]

اگر ساری مائیں آپ جیسی نیک ہوتیں تو بچّے باپ کی ضرورت محسوس نہیں کرتے۔[۳]

آپ کے والد حضرت امام موسیٰ کاظم علیہ السلام کی اولاد سے ہیں،جن کا نام ابواحمد،حسین بن موسیٰ ہے۔آپ عباسی اور آلِ بویہ حکمرانوں کے نزدیک عظیم مقام رکھتے تھے۔آپ کو ابونصر بہاء الدین نے ''الطاہر الاوحد'' کا لقب دیا۔ابواحمد پانچ مرتبہ طالبیین کے سرپرست ورئیس رہے۔جب آپ کی وفات ہوئی تو یہ گروہ آپ کو نقیب و بزرگ کے عنوان سے یاد کرتا تھا۔سیّدرضیؒ ایسے ماں باپ کے ہاں پیدا ہوئے اور آپ نے پاک خاندان میں پرورش پائی،بچپن ہی سے آپ کے چہرے سے بزرگی کے آثار نمایاں تھے۔

مرحوم علامہ امینیؒ،سیّد رضیؒ کے بارے میں فرماتے ہیں:''سیّدرضیؒ کا تعلق خاندان نبوت کے ان صاحبان افتخار افراد سے ہے،جن پر علم ودانش اور حدیث وادب کے لحاظ سے دین ومذہب کو فخر ہے۔''انہوں نے تمام نیک افراد کی نیکیاں میراث میں پائی ہیں جبکہ عظیم دانشور،بہترین زندگی کے مالک اور صائب وثاقب نظر،بلندطبع،بہترین ادیب،پاکیزہ حسب کے مالک تھے۔

خاندانِ نبویؐ سے تعلق رکھتے تھے کہ ان کی عظمت حضرتِ فاطمہ زہرا سلام اللہ علیہا سے تھی اور بزرگی وسیادت حضرت

---

[۱] فاطمہ بنت الحسین بن ابی محمد الحسن الاطروش بن علی بن الحسن بن علی بن عمر بن علی بن ابی طالب علیہم السلام۔

[۲] مقدّمۂ یادنامہ،علّامہ شریف رضیؒ۔

[۳] ابواحمد الحسین بن موسیٰ بن محمد بن موسیٰ بن ابراہیم بن الامام ابی ابراہیم موسیٰ الکاظمؑ۔

https://downloadshiabooks.com/

امام موسیٰ کاظم علیہ السلام سے میراث میں ملی، سیّد رضیؒ کئی ایسے دیگر فضائل کے مالک ہیں کہ قلم ان کو بیان کرنے کی طاقت نہیں رکھتا۔[1]

علاّمہ امینیؒ چالیس سے زیادہ ایسی کتابوں کا ذکر کرتے ہیں، جن میں سیّد رضیؒ کی زندگی اور شخصیت کے بارے میں تحریریں موجود ہیں اور مزید فرماتے ہیں: ''ان کی عظمت بلندی، علاّمہ شیخ عبدالحسین حلّیؒ نے مقدمے کے طور پر تفسیر کی پانچویں جلد میں، ص ۱۱۲ پر بیان کی ہے۔ اسی طرح ان کی بلند شخصیت'' عبقریۃ الرضیؒ میں بیان کی گئی ہے، جو معروف مصنّف ''زکی مبارک'' نے دو جلدوں میں پیش کی ہے۔ ان دو افراد سے قبل علاّمہ شیخ محمد حسین کاشف الغطاءؒ نے ان کے بارے میں کتاب لکھی ہے۔

سیّد رضیؒ کے اساتذہ

علامہ امینیؒ چودہ افراد کے نام بطور استاد سیّد رضیؒ ذکر کرتے ہیں، چنانچہ چند کے نام درج ذیل ہیں:

۱۔ ابوسعید حسن بن عبداللہ بن مرزبان نحوی، المعروف بہ سیرافی (متوفی ۳۶۸ھ) اُس وقت سیّد رضیؒ دس سال کے بھی نہیں تھے، جب ان کے پاس علم نحو سیکھا۔

۲۔ ابوعلی حسن ابن احمد فارسی، جو کہ نحوی معروف تھے، (متوفی ۳۷۷ھ)

۳۔ ہارون ابن موسیٰ۔

۴۔ ابویحییٰ عبدالرحیم بن محمد جو کہ ''ابنِ نباتہ'' مشہور تھے، اور زبردست خطیب تھے۔ (متوفی ۳۹۴ھ)

۵۔ قاضی عبدالجبار، شافعی معتزلی مشہور عالم تھے۔

۶۔ سیّد رضیؒ کے اصل اُستاد فقیہ، محدّث، متکلم اور شیعہ عظیم شخصیت شیخ مفیدؒ ہیں۔ یہاں سیّد رضیؒ اور سیّد مرتضیٰؒ کی شاگردی کی داستان قابل ذکر ہے

"الدّرجات الرفیعه" کے مؤلف کہتے ہیں: شیخ مفیدؒ نے خواب دیکھا کہ حضرتِ فاطمہ زہرا سلام اللہ علیہا اپنے دونوں چھوٹے بچّوں کا ہاتھ پکڑے مسجد کرخ (جو بغداد کے قدیم محلے میں واقع ہے) میں تشریف لاتی ہیں، دونوں کو میرے حوالے کرتے ہوئے فرماتی ہیں میرے حسن وحسین علیہما السلام کو فقہ کی تعلیم دو۔

"وقالت له: علمهما الفقه" شیخ مفیدؒ حیرانی کے عالم میں بیدار ہوتے ہیں؛ معمول کے مطابق مسجد تشریف

---

[1] الغدیر، ج ۴، ص ۱۸۱

https://downloadshiabooks.com/

لے جاتے ہیں؛ کچھ دیر بعد محترمہ فاطمہ سیّد رضیؒ وسیّد مرتضیٰؒ کی والدہ اپنے بچوں سیّد رضی، سیّد مرتضیٰؒ اور خادموں کے ساتھ مسجد میں تشریف لاتی ہیں؛ شیخ مفیدؒ ان کو دیکھ کر اپنی جگہ سے کھڑے ہوجاتے ہیں؛ فاطمہ کو سلام کرتے ہیں؛ فاطمہ شیخ مفیدؒ کی طرف دیکھ کر کہتی ہیں:

''اے شیخ! یہ دو میرے بچّے ہیں، ان کو آپ کے پاس لائی ہوں تاکہ علم فقہ کی تعلیم حاصل کریں۔''

شیخ مفیدؒ اپنے رات کے خواب میں محو ہوجاتے ہیں، رونے لگتے ہیں اور خواب بیان کرتے ہیں۔ اس طرح شیخ مفیدؒ نے ان دونوں بچّوں کی تعلیم وتربیت کی؛ خداوند عالم نے ان پر احسان کیا اور ان پر علم وفضل کے نئے باب کھولے اور آج بھی ان کے آثار باقی وموجود ہیں۔ اس واقعے کو ابن ابی الحدید نے اپنی شرح، جلد ا ص ۴۱ پر تحریر کیا ہے۔

سیّد رضیؒ کے شاگرد

بہت سے شیعہ وسنّی بزرگوں نے بیان کیا ہے کہ علامہ امینیؒ نے نو (۹) افراد کو ان کا شاگرد شمار کیا ہے، جنھوں نے سیّد رضیؒ سے روایت کی، ان میں سے آپ کے بھائی سیّد مرتضیٰ اور شیخ الطائفہ، ابوجعفر محمد بن حسن طوسیؒ ہیں۔ سیّد رضیؒ نے مدرسہ قائم کیا، جہاں طلاب، درس وتدریس کے ساتھ قیام بھی کرتے تھے اور اس کا نام ''دارالعلوم'' رکھا۔ سیّد رضیؒ وہ پہلے شخص ہیں، جنھوں نے اس طرح کا مدرسہ جہاں طلاب کی تعلیم کے ساتھ رہائش کا بھی مکمل انتظام ہوا اور لائبریری بھی ہو، قائم کیا۔[1]

سیّد رضیؒ کی تالیفات

علّامہ امینی، سیّد رضیؒ کے آثار وتالیفات میں سے اُنیس کتابوں کا ذکر فرماتے ہیں، جن میں سے اہم ترین تالیف ''نہج البلاغہ'' ہے، جو مولائے کائناتؑ کے فرامین وخطوط پر مشتمل ہے۔ علّامہ امینیؒ اُن اکیاسی (۸۱) کتابوں کا ذکر کرتے ہیں، جو ان کے دورِ حیات تک نہج البلاغہ کی شرح کے عنوان سے لکھی جا چکی تھیں۔

سیّد رضیؒ کی تالیفات میں سے اہم ترین کتب درج ذیل ہیں

۱۔ خصائص الائمہؑ: جس کی طرف مؤلف نے نہج البلاغہ کے مقدمے میں اشارہ کیا ہے۔

۲۔ مجازات آثار النبویہؐ: جو ۱۳۲۸ھ ہجری میں بغداد سے طبع ہوئی۔

---

[1] یادنامہ علامہ سید رضیؒ، ص ۲۹

https://downloadshiabooks.com/

۳۔علمی خطوط (تین جلدوں پر مشتمل ہے)

۴۔معانی القرآن

۵۔حقائق التاویل فی متشابہ التنزیل (جسے "کشّی" نے حقائق التنزیل سے تعبیر کیا ہے)

مرحوم شیخ عباس قمیؒ اپنے استاد محدث نوریؒ سے نقل فرماتے ہیں اور ابوالحسن عمری بھی اس بات کے قائل ہیں کہ "حقائق التنزیل" شیخ طوسیؒ کی کتاب "تبیان" سے بھی زیادہ بڑی، مفید اور جامع ہے، ہمیں اس کتاب کی پانچویں جلد ملی، جس میں سورۂ آلِ عمران کی ابتدا سے لے کر سورۂ نساء کے وسط تک (قرآن کی) تفسیر ہے۔ اس کتاب میں سیّد رضیؒ کی قابل قدر روش یہ رہی ہے کہ ایک مشکل آیت کو بیان کرتے ہیں اور اس میں موجود پیچیدگیوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے ان اشکالات کا مفصل جواب دیتے ہیں اور اسی ضمن میں دیگر آیات کی بھی تفسیر کرتے ہیں۔ لہٰذا انہوں نے تمام آیتوں کی تفسیر نہیں کی ہے بلکہ مشکل اور مبہم آیتوں کی تفسیر لکھی ہے۔[1]

سیّد رضیؒ اور شعر

سیّد رضیؒ شعر گوئی میں بھی مشہور تھے، لیکن شعر گوئی نے ان کی عظمت میں اضافہ نہیں کیا، بلکہ وہ خود پہلے ہی عظیم تھے، سیّد رضیؒ ابھی دس سال کے بھی نہیں ہوئے تھے، کہ "قصیدۂ غرّاء" لکھا، جس میں انھوں نے اپنا نسب عالی بیان کیا۔ بہت سے دانشمندوں نے آپ کو قریش کا بہترین شاعر کہا ہے، خطیب بغدادی نے اپنی تاریخ میں لکھا ہے، محمد بن عبداللہ کاتب سے سنا ہے، ایک بزرگ جن کا نام ابوالحسین بن محفوظ ہے، انہوں نے کہا، میں نے ادبیات کے ماہرین سے سنا کہ سیّد رضیؒ زبردست شاعر قریش تھے۔ ابن محفوظ نے جواب دیا، یہ صحیح ہے کہ قریش میں اچھے شاعر جو اچھے شعر کہتے تھے بہت تھے، مگر وہ کم کہتے تھے لیکن ایسے شاعر جو زیادہ اور اچھے شعر کہتے ہوں، سیّد رضیؒ کے علاوہ کوئی اور نہیں۔

سیّد رضیؒ کے القاب اور ان کی سماجی شخصیّت

بہاء الدولہ دیلمی نے ۳۸۸ھ میں سیّد رضیؒ کو "شریف اجل" کا لقب دیا۔ ۳۹۲ھ میں "ذوالمنقبتین" کا ۳۹۸ھ میں "رضی ذوالحسبین" کا لقب ملا۔ ۴۰۱ھ میں بہاء الدّولہ نے حکم دیا کہ تمام تقاریر اور مکاتیب میں سیّد رضیؒ کو "شریف

[1] سفینۃ البحار، مادّہ "رضا"

https://downloadshiabooks.com/

اجل'' کے لقب سے یاد کیا جائے۔

سیّد رضیؒ کو ۳۸۰؁ھ میں جب آپ کی عمر مبارک ۲۱ سال سے زیادہ نہ تھی، عباسی خلیفہ ''الطائع باللہ'' کی جانب سے ''طالبیین'' کی سرداری، حاجیوں کی سرپرستی، دیوان مظالم کی ذمہ داری جیسے عہدوں سے نوازا گیا۔ ۱۶ محرّم ۴۰۳؁ھ میں تمام شہروں میں موجود ساداتِ کرام کے ولی اور سرپرست منصوب ہوئے، اور نَقِیْبُ النُّقَبَاءِ [۱] کہلائے جانے لگے۔

سیّد رضیؒ نے اپنی تمام تر ذمہ داریوں کو خوب نبھایا، یہاں تک کہ خلیفہ عبّاسی القادر باللہ کے زمانے میں خادم حرمین شریفین قرار پائے۔ اگر چہ یہ بات بہت واضح ہے کہ سیّد رضیؒ کو یہ ذمہ داریاں اور اعلیٰ مناصب سونپنے کا اہم سبب جناب سیّد رضیؒ کا بنی ہاشم، سادات اور علویوں میں خاص اہمیت کا حامل ہونا تھا، چنانچہ عباسی خلفاء کے نزدیک سوائے اس کے کہ وہ سیّد رضیؒ ہی کی طرح کے لوگوں کو یہ منصب دیں، کوئی اور چارہٗ کار نہیں تھا۔

سیّد رضیؒ کے متعلق دانشوروں کے اقوال

بہت سے دانشوروں نے سیّد رضیؒ کے بارے میں اظہارِ خیال کیا ہے، لیکن ہم چند افراد کے اقوال نقل کرتے ہیں:

۱۔ ثعلبی جو آپ کے ہم عصر تھے، کہتے ہیں: سیّد رضیؒ آج کے زمانے کے روشن فکر اور شریف ترین عراقی سیّد ہیں، وہ حسب ونسب کے لحاظ سے اصیل اور ان کی شرافت، ادب وفضل آشکار ہے۔

۲۔ ابن جوزی نے ''المنتظم'' میں لکھا: سیّد رضیؒ بغداد کے طالبیین کے بڑوں میں سے تھے۔ جب آپ کی عمر تین سال تھی کہ آپ نے بہت جلد قرآن حفظ کیا، اور فقہ کو بہت جلد مکمل کیا، آپ دانشمند، فاضل، زبردست شاعر، بلند ہمت اور دین دار تھے۔ بیان کیا جاتا ہے ایک دن آپ نے ریشمی کپڑا ایک عورت سے پانچ درہم میں خریدا، جب گھر لے جا کر اسے کھولا تو اس میں ابنِ علی بن مقلہ کا لکھا ہوا کاغذ پایا؛ سیّد رضیؒ نے خادم سے کہا، اس عورت کو بلاؤ؛ جب عورت آئی تو اس سے کہا، میں نے تم سے جو کپڑا خریدا تھا اس میں ابن علی بن مقلہ کے ہاتھوں کی تحریر ہے، اب تمہاری مرضی ہے اس کاغذ کو لے لو یا اس کی

---

[۱] نقابت، وہ منصب تھا جو ممتاز و محبوب عالم باتقویٰ کو دیا جاتا تھا۔ لوگ اُسکی طرف رجوع کرتے تھے، منصب ھٰذا کا مالک درج ذیل امور کو انجام دیتا تھا اور اسے خلیفہ وقت کی تائید حاصل ہوتی تھی۔

۱۔ سادات گھرانوں کی حفاظت و پرورش ۲۔ اَخلاقی و ادبی لحاظ سے لوگوں کی پرورش ۳۔ لوگوں کو پست مشغلوں اور غیر مشروع کاموں سے دور رکھنا ۴۔ شریعتِ محمدیؐ کی بے حرمتی سے روکنا ۵۔ دوسروں پر ظلم کرنے سے روکنا ۶۔ حقوق کی حفاظت و ادائیگی ۷۔ بیت المال سے لوگوں کے حقوق طلب کرنا ۸۔ خواتین اور ان کی بیٹیوں کی شادیوں کی نگرانی کرنا۔ ۹۔ عدالت کا قیام ۱۰۔ موقوفات پر نظارت رکھنا (الغدیر ج ۴، ص ۲۰۵ تا ۲۰۷، خلاصے کے ساتھ)

https://downloadshiabooks.com/

قیمت مجھ سے وصول کرلو؛ عورت نے پیسے لے کر سیّد رضیؒ کے لیے دُعا کی اور چلی گئی۔ سیّد رضیؒ کی سخاوت مندانہ زندگی میں اس طرح کے منفرد واقعات بہت زیادہ ہیں۔

۳۔ معاصرین میں سے مصر کے مشہور دانشمند ''ڈاکٹر زکی مبارک'' جو خود بہترین مصنّف بھی ہے، لکھتے ہیں: ''بلاشبہ سیّد رضیؒ ایک عظیم مصنّف ہیں، لیکن ان کی روِش، علمی روِش ہے، فنی روش نہیں۔ اگرچہ بعض جگہ فنی روِش نظر آتی ہے۔

دوسرے مقام پر کہتے ہیں:

''جب سیّد رضیؒ کے شعر سننے کے بعد ان کی نثر اور دوسری تحریروں پر نظر ڈالتے ہیں تو لگتا ہے کہ سیّد رضیؒ ایک اور شخصیت کے مالک ہیں۔ وہ ایسے دانشمند ہیں، جن کی تحریر گواہی دیتی ہے کہ قابلِ فخر ادیبوں میں سے ایک ہیں، ایسا دانشور جو لغت اور شریعت سے متعلق علوم پر لکھتا ہے تو ادبیات کی بہترین خوشبو چھوڑ جاتا ہے۔''

وہ ایک دوسرے مقام پر لکھتے ہیں:

''اگر سیّد رضیؒ کے تمام آثارِ قلمی محفوظ رہ جاتے تو اس وقت ہم کہہ سکتے تھے کہ وہ تمام مولفوں اور مصنفوں میں یگانہ روزگار اور ایسے عظیم مؤلف ہیں جن کی مثال نہیں۔''[۱]

سیّد رضیؒ کی وفات

سیّد رضیؒ ۶ محرم ۴۰۶ھ ہجری میں (۴۷ سال کی عمر میں) اس دارِ فانی کو الوداع کہہ گئے۔ آپ کی وفات کی خبر سن کر وزراء، قضات اور دوسری اہم شخصیات اور ہر طبقے کے افراد ننگے پاؤں ان کے گھر کی طرف روانہ تھے۔ آپ کا گھر محلہ کرخ میں تھا، جہاں بے مثال مراسم ادا ہوئے۔ بہت سے مورّخوں کے مطابق آپ کے جسد کو کربلا منتقل کیا گیا۔ آپ کو آپ کے والد کے برابر میں سپردِ خاک کیا گیا۔ جو چیز تاریخ سے ملتی ہے، وہ یہ ہے کہ آپ کی قبر حضرت امام حسین علیہ السلام کے حرم میں ہے۔ سیّد مرتضیٰ، سیّد رضیؒ کے بھائی، شدتِ غم کی وجہ سے جنازے میں شریک نہیں ہوئے اور انھوں نے نماز جنازہ ادا نہیں کی، اور بھائی کا آخری دیدار بھی کرنے کی تاب نہیں رکھتے تھے اور اسی غم میں امام موسیٰ کاظمؑ کے حرم یعنی قبرِ امام موسیٰ کاظم علیہ السلام کے قریب مدت تک بیٹھے رہے۔ بہت سے شعرائے کرام من جملہ سیّد مرتضیٰؒ نے آپ کی وفات پر مرثیے کہے۔[۲]

---

[۱] عبقریہ الشریف الرضیؒ ص ۲۰۴، ۲۰۵

[۲] سیّد رضیؒ کی زندگی کے بارے میں الغدیر ج ۴، ص ۱۸۱ تا ۲۱۱، شرح نہج البلاغہ ابن ابی الحدید، عبقریہ الشریف الرضیؒ، سفینۃ البحار اور یادنامہ علّامہ شریف رضیؒ دیکھیے)

https://downloadshiabooks.com/

نہج البلاغہ اور اُس کے خالق کے بارے میں

حضرت علی علیہ السلام یا نہج البلاغہ کے بارے میں [1] گفتگو کرنا ایک اعتبار سے آسان کام نہیں، جبکہ ایک اور اعتبار سے آسان ہے، جو چاہتے ہیں مولا علی علیہ السلام کی زندگی کو گہرائی سے دیکھیں، ان کے لیے یہ کام آسان نہیں کہ وہ ان کی بلند فکری، قوتِ ایمانی اور ملکاتِ نفسانی سے آشنا ہوں، یا نہج البلاغہ کا حق ادا کرتے ہوئے اس کی شناخت کر سکیں، یہاں البتہ ان دو گہرے سمندروں کے ساحلوں سے آگاہی حاصل کرنا سب کے لیے ممکن ہے۔ جو تھوڑی سی بھی معلومات حضرت علی علیہ السلام اور اُن کی زندگی کے بارے میں ان کے اقوال و افکار کے بارے میں رکھتا ہو، بخوبی جانتا ہے کہ وہ ایک بلند انسان ہیں، وہ خدا کی نشانیوں میں سے بزرگ ترین نشانی ہیں۔ وہ انسان کے وجود کی کتاب کا نادر نسخہ اور عجوبہ روزگار شخصیت ہیں۔

نہج البلاغہ ایک ایسا سمندر ہے، جس کا کنارہ نہیں، بحرِ بے کراں ہے اور جواہرات سے پُر گنجینہ ہے؛ ایسا باغ ہے جہاں پھول ہی پھول ہیں؛ ایسا آسمان ہے جہاں ستارے ہی ستارے ہیں، مختصراً یہ کہ ایسا شہر ہے جہاں انسانی سعادت کی تمام چیزیں موجود ہیں۔ بے شک جب کوئی اس میدان میں قدم رکھنے کا ارادہ کرے تو اس کے لیے ضروری ہے کہ ایک ضخیم کتاب لکھنے کے لیے خود کو تیار کرے، جبکہ ہمارا مقصد صرف اشاروں سے کام لینا ہے اور مختصر طور پر امامؑ کے کلام کی شرح مطلوب ہے۔ اگرچہ امامؑ کا کلام خود اپنے کلام کا شارح ہے۔ یہ خود آفتاب بھی ہے اور دلیلِ آفتاب بھی۔ اس مقام پر چند موضوعات کی جانب توجّہ دلانا مقصود ہے۔ اسی طرح اور دوسرے دانشوروں کے افکار سے جو برسوں سے نہج البلاغہ اور اس کے خالق سے آشنا ہیں، استفادہ چاہتے ہیں۔ خصوصاً غیر مسلم اور غیر شیعہ افراد کے بیانات جنھوں نے امام علی علیہ السلام کے کلام کو سنا یا پڑھا اور امامؑ کے گرویدہ ہوئے تاکہ ہماری تحریر زیادہ مؤثر ہو سکے۔

خوشتر آن باشد کہ حسنِ دلبران
گفتہ آید در زبانِ دیگران

[1] اتفاقاً اس کام کا آغاز خدا کی عطا کردہ توفیق کے ذریعے ۱۳ رجب المرجب ۱۴۱۳ ہجری قمری شبِ ولادتِ امیر المومنین علیہ السلام ہوا۔

https://downloadshiabooks.com/

https://downloadshiabooks.com/

کلام مولا علیہ السلام کی تجلیاں

مطالعے کے دوران نہج البلاغہ کی تاریخ، شروح، تفاسیر کی طرف رجوع کیا تو اس نکتے کو پایا کہ بہت سے افراد حتیٰ کہ علماء اور دانشمندوں نے دُور سے نہج البلاغہ کے بارے میں سنا ہے اور تصوّر کیا کہ یہ کوئی عام سا کلام ہے، یا اس سے کچھ بلند ہے جو امام علیؑ کے اقوال، اُن کے ارشادات پر مبنی ہے، لیکن جب اس کے قریب ہوتے ہیں تو اپنے آپ کو ایک عظیم سمندر کے سامنے پاتے ہیں کہ جس کی گہرائی اس کے کنارے سے نظر نہیں آتی۔ ایسے میں ان پر حیرت چھا جاتی ہے اور ان سے ایسے کلمات اور احساسات کا اظہار ہوتا ہے جو شوق و عشق پر مبنی ہیں، جنھیں درج ذیل عناوین میں بیان کیا جا سکتا ہے:

۱۔ نہج البلاغہ کی فصاحت و بلاغت ۲۔ نہج البلاغہ کے عظیم و عمیق مطالب ۳۔ نہج البلاغہ کی بے مثال جاذبیت

نہج البلاغہ کی فصاحت و بلاغت

پہلے حصّے میں نہج البلاغہ کی فصاحت و بلاغت کے بارے میں ادیبوں اور بزرگوں کے کلمات پر (جو انھوں نے نہج البلاغہ کے بارے میں کہے ہیں) نظر ڈالتے ہیں، جن سے پتا چلتا ہے کہ وہ نہج البلاغہ کے حُسن و زیبائی، شیریں تعبیرات، فن فصاحت و بلاغت کی کرشمہ سازیوں سے متاثر ہو کر اپنے اپنے خیالات کا اظہار کر رہے ہیں، جو کہ اس کتاب کے حُسن میں مزید اضافہ کا باعث ہیں

۱۔ سب سے پہلے نہج البلاغہ کے جمع کرنے والے کے بارے میں غور کرتے ہیں جو خود میدانِ فصاحت و بلاغت کے بے نظیر مرد ہیں اور جنھوں نے اپنی عمرِ مبارک نہج البلاغہ کی جمع آوری میں لگا دی کہ ''ڈاکٹر زکی مبارک'' مصر کے معروف قلمکار ''عبقریۃ الشریف الرضیؒ'' میں لکھتے ہیں:

جب ان کی نثر کو دیکھتے ہیں تو نثر خود گواہی دیتی ہے کہ وہ ادباء میں سے ہیں اور جب ان کے اشعار پر نظر ڈالتے ہیں تو محسوس ہوتا ہے ایک بلند پایہ اور باذوق شاعر ہیں، جبکہ بہت کم دیکھنے میں آیا ہے کہ ایک ہی شخص دونوں شعبوں میں مہارت رکھتا ہو۔ نہایت افسوس ہے کہ ان کے تمام آثار ہماری دسترس میں نہیں، اگر ہوتے تو کہہ سکتے تھے کہ وہ مولفوں کی صف میں

https://downloadshiabooks.com/

اپنا منفرد مقام رکھتے ہیں۔ [1]

سیّد شریف رضیؒ نہج البلاغہ کے مقدمے میں فرماتے ہیں:

"کَانَ اَمِیْرُ الْمُؤْمِنِیْنَ مَشْرَعَ الْفَصَاحَةِ وَ مَوْرِدَهَا وَ مَنْشَأَ الْبَلَاغَةِ وَ مَوْلِدَهَا وَ مِنْهُ ظَهَرَ مَكْنُوْنُهَا وَ عَنْهُ اُخِذَتْ قَوَانِيْنُهَا وَ عَلٰى اَمْثِلَتِهٖ حَذَا كُلُّ قَائِلٍ خَطِيْبٍ وَ بِكَلَامِهٖ اسْتَعَانَ كُلُّ وَاعِظٍ بَلِيْغٍ وَ مَعَ ذٰلِكَ فَقَدْ سَبَقَ وَ قَصَّرُوْا وَ قَدْ تَقَدَّمَ وَ تَاَخَّرُوْا"

''امیر المومنینؑ سرچشمۂ فصاحت ہیں اور بلاغت نے آپ سے نشاط پائی ہے۔ آپؑ سے اسرارِ بلاغت آشکار ہوئے۔ قوانین و دستورِ بلاغت آپ سے حاصل کیے گئے۔ آپؑ کی طرز سے ہر خطیب نے طاقت پائی۔ آپؑ کے کلام سے ہر خطیب، توانا خطیب بنا، اور وہ میدانِ خطابت میں ایسے آگے بڑھا کہ دوسروں کو پیچھے چھوڑ دیا۔''

پھر نہج البلاغہ کے بارے میں مزید بیان کرتے ہیں:

"لِاَنَّ كَلَامَهٗ (عَلَيْهِ السَّلَامُ) اَلْكَلَامُ الَّذِیْ عَلَيْهِ مَسْحَةٌ مِنَ الْعِلْمِ الْاِلٰهِیِّ وَ فِيْهِ عَبْقَةٌ مِنَ الْكَلَامِ النَّبَوِیِّ"

''امیر المومنینؑ کا کلام علم الٰہی کی نشانی اور رسولِ اکرمؐ کے کلام کی خوشبو رکھتا ہے۔''

۲۔ اس کے بعد بہت سے شارحین نہج البلاغہ میں سے ایک جنہوں نے ایک مدت نہج البلاغہ کی شرح و تفسیر میں لگائی اور جو نہج البلاغہ کے بارے میں کافی آگاہی رکھتے ہیں اور اس کی گہرائی اور دقائق سے آشنا ہیں، اہلِ سنّت کے مشہور علماء میں سے ہیں اور ساتویں صدی ہجری کی شخصیت یعنی عزالدین عبدالحمید ابن ابی الحدید معتزلی نے نہج البلاغہ کی شرح کے دوران بار بار اس بات کا اعتراف کیا ہے کہ یہ فصاحت و بلاغت کی اس منزلت پر ہیں کہ یہاں سرِ تسلیم خم ہوجاتا ہے۔ [2] وہ ایک جگہ خطبہ ۲۲۱ کے ذیل میں مولا علیؑ کے کلام کی شرح کے بعد برزخ کے بارے میں کہتے ہیں:

"وَ يَنْبَغِیْ لَوِ اجْتَمَعَ فُصَحَاءُ الْعَرَبِ قَاطِبَةً فِیْ مَجْلِسٍ وَ تُلِیَ عَلَيْهِمْ اَنْ يَسْجُدُوْا لَهٗ كَمَا سَجَدَ الشُّعَرَاءُ لِقَوْلِ عَدِیِّ ابْنِ الرُّقَاعِ: قَلَمٌ اَصَابَ مِنَ الدَّوَاةِ مِدَادَهَا... فَلَمَّا قِيْلَ لَهُمْ فِیْ ذٰلِكَ قَالُوْا اِنَّا نَعْرِفُ مَوَاضِعَ السُّجُوْدِ فِی الشِّعْرِ كَمَا تَعْرِفُوْنَ مَوَاضِعَ السُّجُوْدِ فِی الْقُرْاٰنِ"

''اگر عرب کے تمام فصحاء کو ایک جگہ جمع کر کے خطبے کے اس حصّے کو ان کے سامنے پڑھا جائے، تو حق یہ ہے کہ تمام

---

[1] کتاب عبقریۃ الشریف الرضیؒ، ص ۲۰۵، ۲۰۶، ۲۰۹ (خلاصہ)

[2] یہ کتاب ۲۰ جلدوں پر مشتمل ہے، جو امیر المومنینؑ کے دورِ خلافت کے برابر تقریباً پانچ سال میں مکمل ہوئی۔

https://downloadshiabooks.com/

کے تمام اس کے لیے سجدے میں گر جائیں کہ عرب کے معروف شاعر ''عدی بن الرقاع'' کے اس شعر کو سن کر ادیبوں نے اس کے لیے سجدہ کیا اور جب ان سے سوال کیا کہ سجدے کی کیا وجہ تھی؟ تو جواب دیا ہم جانتے ہیں کہ کس شعر پر سجدہ کیا جائے، جس طرح تم جانتے ہو کہ آیاتِ سجدہ کون سی ہیں۔''[۱]

ایک مقام پر حضرت امام علی علیہ السلام کے کلام کا موازنہ چوتھی ہجری کے مشہور خطیب ''ابنِ نباتہ''[۲] سے کرتے ہوئے کہتے ہیں:

"فَلْيَتَأَمَّلْ أَهْلُ الْمَعْرِفَةِ بِعِلْمِ الْفَصَاحَةِ وَالْبَيَانِ هٰذَا الْكَلَامَ بِعَيْنِ الْإِنْصَافِ يَعْلَمُوْا أَنَّ سَطْرًا وَاحِدًا مِنْ كَلَامِ نَهْجِ الْبَلَاغَةِ يُسَاوِيْ أَلْفَ سَطْرٍ مِنْهُ بَلْ يَزِيْدُ وَيُرْبِيْ عَلٰى ذٰلِكَ"

''علم فصاحت و بلاغت سے واقف لوگ اگر حضرت علی علیہ السلام کے کلام کو انصاف کی نگاہ سے دیکھیں، تو نہج البلاغہ کی ایک سطر، ابنِ نباتہ کی ہزار سطروں کے برابر ہے، بلکہ ان پر برتری رکھتی ہے۔''[۳]

اس مقام پر ایک اور عجیب تعبیر موجود ہے، جہاں ابن نباتہ کے ایک خطبے میں (جو جہاد کے بارے میں ہے اور جسے فصاحت و بلاغت کا کمال تصوّر کیا جاتا ہے) حضرتؑ کا ایک جملہ شامل کیا گیا ہے:

"مَا غُزِيَ قَوْمٌ فِيْ عُقْرِ دَارِهِمْ إِلَّا ذَلُّوْا"

''کوئی قوم ایسی نہیں ہے جس پر ان کے گھروں میں حملہ ہوا اور وہ ذلیل و خوار نہ ہوئی ہو۔''

علم فصاحت و بلاغت کے ماہر اگر حضرتؑ کا یہ جملہ انصاف کی نگاہوں سے دیکھیں تو حضرتؑ کی ایک سطر ابن نباتہ جیسے معروف خطیب کی ہزار سطروں پر بھاری ہے اور یہاں ابن ابی الحدید کہتے ہیں، اس ایک جملے کو دیکھا جائے تو فصاحت و بلاغت جاننے والے خود بول لیں گے کہ یہ ایک جملہ اس خطبے کا نہیں ہے، جیسے کسی خطبے یا تحریر میں قرآن کی آیت کو لکھا جاتا ہے تو وہ پورے کلام میں منفرد ہوتی ہے۔[۴]

ابن ابی الحدید معتزلی کے ان کلمات پر گفتگو کو ختم کرتے ہیں، جو انھوں نے کتاب کے مقدمے میں بیان کیے ہیں:

"وَ اَمَّا الْفَصَاحَةُ فَهُوَ (عَلَيْهِ السَّلَامُ) إِمَامُ الْفُصَحَاءِ وَسَيِّدُ الْبُلَغَاءِ وَفِيْ كَلَامِهِ قِيْلَ: دُوْنَ كَلَامِ الْخَالِقِ وَفَوْقَ كَلَامِ الْمَخْلُوْقِيْنَ وَمِنْهُ تَعَلَّمَ النَّاسُ الْخِطَابَةَ وَالْكِتَابَةَ"

---

[۱] شرح نہج البلاغہ ابن ابی الحدید جلد ۱۱ صفحہ ۱۵۳

[۲] اس کا نام ابویحییٰ عبدالرحیم بن محمد بن اسماعیل بن نباتہ ہے جس نے سن ۳۷۴ ہجری ق میں وفات پائی۔

[۳] شرح نہج البلاغہ ابن ابی الحدید جلد ۷ صفحہ ۲۱۴

[۴] شرح نہج البلاغہ ابن ابی الحدید جلد ۲، صفحہ ۸۴

https://downloadshiabooks.com/

''رہی فصاحت تو حضرت امیر المومنینؑ فصحاء کے رہبر اور بلغاء کے سردار ہیں؛ اُن کے کلام کے بارے میں کہا گیا ہے کہ خدا کے کلام سے نیچے اور مخلوق کے کلام سے بالا آپؑ کا کلام ہے؛ لوگوں نے آپؑ سے خطابت اور تحریر کا ہنر سیکھا ہے۔[1]

۳۔ جارج جرداق، لبنان کا مشہور عیسائی قلمکار اپنی بیش بہا کتاب ''الامام علیؑ صوت العدالۃ الانسانیۃ'' کی آخری فصل میں حضرت علیؑ کی شخصیت کے بارے میں لکھتا ہے: بلاغت میں سب سے اونچا مقام آپ کی بلاغت کا ہے، گویا قرآن ہے جو اپنے مقام سے کچھ نیچے آ گیا ہے۔ آپ کا کلام عربی زبان کی تمام گزشتہ اور آئندہ خوبصورتیوں کو سمیٹے ہوئے ہے اور اُس کے لکھنے والے یعنی حضرت علی علیہ السلام کے بارے میں لکھتا ہے، ''خدا کے کلام سے نیچے اور مخلوق کے کلام سے بلند آپ کا کلام ہے۔''[2]

۴۔ جاحظ جو علماء ونوابغ عرب میں شمار ہوتے ہیں اور جنہوں نے تیسری صدی ہجری کے اوائل میں زندگی گزاری، اپنی معروف کتاب ''البیان والتبیین'' میں امیر المومنینؑ کے کلماتِ قصار نقل کرتے ہوئے اُن کی مدح کرتے ہیں ۔ اپنی کتاب کی پہلی جلد میں امامؑ کے اس کلمے کو بیان کرتے ہیں "قِيمَةُ كُلِّ امْرِءٍ ما يُحْسِنُهُ" انسان کی قیمت وہ (ہنر) ہے، جسے وہ اچھی طرح جانتا ہے اور کر سکتا ہے۔[3]

وہ لکھتا ہے اگر پوری کتاب میں صرف یہ ہی جملہ ہوتا تو کافی تھا، بلکہ اس سے زیادہ کفایت کرتا ہے۔ بہترین کلام وہ ہے جو مختصر ہو اور مفید ہو اور اس کا مفہوم روشن ہو۔ گویا خداوند عالم نے اس کلام کو جلالت وعظمت کا لباس پہنایا ہے اور اسے نورِ حکمت عطا کیا ہے۔ جو پاک نیت وصاحب تقویٰ کہنے والے (علیؑ) کی طرح بے نظیر ہے۔

۵۔ ''الطراز'' کا مولف ''امیر یحییٰ علوی'' اپنی کتاب میں جاحظ کا یہ جملہ نقل کرتے ہوئے کہ ''یہ مردِ میدان، فصاحت وبلاغت کا بے مثال شخص ہے، مزید اس طرح بیان کرتے ہیں۔ خدا اور رسولؐ کے بعد کوئی کلام میرے کانوں نے نہیں سنا جو بے مثل ہو، سوائے امیر المومنین کرم اللہ وجہہٗ کے کلام کے۔ میں نے ان کے کلام کا دیگر کلاموں سے موازنہ کیا مگر کسی کو ان کے کلام کے مقابل نہیں پایا، مثلاً یہ جملے

"مَا هَلَكَ امْرُءٌ عَرَفَ قَدْرَهُ"

''جو اپنی قدر جانتا ہو، کبھی ہلاک نہیں ہوگا۔''

مَنْ عَرَفَ نَفْسَهُ عَرَفَ رَبَّهُ"

---

[1] شرح نہج البلاغہ جلد ۱ صفحہ ۲۴

[2] صوت العدالۃ الانسانیۃ، ج۱، صفحہ ۴۷

[3] نہج البلاغہ، قصار الحکم، شمارہ ۸۱

https://downloadshiabooks.com/

''جس نے اپنے نفس کو پہچان لیا، اُس نے اپنے رب کو پہچان لیا۔''

"اَلْمَرْءُ عَدُوٌّ مَا جَهِلَ"

''انسان اُس چیز کا دشمن ہے جسے نہیں جانتا۔''

"وَاسْتَغْنِ عَمَّنْ شِئْتَ تَكُنْ نَظِيْرَهُ"

''جس کا نظیر بننا چاہتے ہو اس سے بے نیاز رہو۔''

"وَاَحْسِنْ اِلٰى مَنْ شِئْتَ تَكُنْ اَمِيْرَهُ"

''اور جس کا امیر بننا چاہتے ہو اس کے ساتھ نیکی کرو۔''

"وَاحْتَجْ اِلٰى مَنْ شِئْتَ تَكُنْ اَسِيْرَهُ"

''اور جس کسی کا نیازمند رہنا چاہتے ہو رہو، تم اس کے اسیر بن جاؤ گے۔''

پھر مزید لکھتا ہے کہ جاحظ اگر انصاف سے پڑھے تو اسے ماننا پڑے گا کہ حضرت علی علیہ السلام نے اس کے کانوں کے پردے ہلا دیے ہیں اور فصاحت و بلاغت کے معجزے سے اس کی عقل حیران کر دی ہے اور جب جاحظ جیسا زبردست ادیب علیؑ کے سامنے ایسا ہو تو پھر دوسروں کا حال تو واضح ہے کہ کیا ہوگا۔ [1]

یہ ایک حقیقت ہے کہ یہی زیدی دانشمند (صاحبِ کتاب الطراز) اس بات پر حیرت کا اظہار کرتا ہے کہ بزرگ علمائے علمِ معانی و بیان خدا اور رسولؐ کے کلام کے بعد علیؑ کے کلام کو نظرانداز کرتے ہوئے شعرائے عرب اور خطبائے عرب کے دیوانوں اور آثار پر بھروسا کرنے لگے، جبکہ جانتے ہیں کہ فصاحت و بلاغت کی بلندترین کیفیت کہ جس میں جو چاہیں میسر ہے، استعارہ، کنایہ، تمثیل خوبصورت مجاز اور گہرے مفاہیم سب اس نہج البلاغہ میں موجود ہیں۔ [2]

۶۔ محمد غزالی نظرات فی القرآن کے مشہور مصنّف اپنے فرزند کو نصیحت کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"اِذَا شِئْتَ اَنْ تَفُوْقَ اَقْرَانَكَ فِي الْعِلْمِ وَ الْاَدَبِ وَ صَنَاعَةِ الْاِنْشَاءِ فَعَلَيْكَ بِحِفْظِ الْقُرْآنِ وَ نَهْجِ الْبَلَاغَةِ" [3]

''اگر چاہتے ہو علم وادب میں برتر ہو تو قرآن اور نہج البلاغہ کو حفظ کرو۔''

---

[1] الطراز، ج۱ ص ۱۶۵، ۱۶۸

[2] الطراز، ج۱ ص ۱۶۵، ۱۶۸

[3] نظرات فی القرآن، ص ۱۵۴، از نقل نہج البلاغہ، ج۱ ص ۹۱

https://downloadshiabooks.com/

۷۔ مفسرِ قرآن شہاب الدین آلوسی جب نہج البلاغہ کے نام پر پہنچے تو کہتے ہیں:

''اس کتاب کا نام اس لیے نہج البلاغہ ہے کہ یہ اُس کے کلام پر مشتمل ہے جس کے بارے میں انسان تصور کرتا ہے، یہ کلامِ مخلوق سے بلند اور کلام خالق سے نیچے ہے۔ یہ کلام معجزنما ہے، حقیقت و مجاز ہے رمز و استعارات سے بھرا ہے۔ [۱]

۸۔ اُستاد محمد محی الدین عبدالحمید، نہج البلاغہ کی توصیف میں لکھتے ہیں:

یہ ایسی کتاب ہے جو اپنے اندر سے فصاحت و بلاغت وفنون کے چشمے جاری کر رہی ہے۔ وقت آ گیا ہے کہ اس پھل ''نہج البلاغہ'' کی شیرینی اور لذت سے استفادہ کیا جائے۔ یہ اُس کا کلام ہے جو مخلوقِ خدا میں بعد از رسولؐ سب سے بہتر ہے۔ جس کا لغات اور منطق پر مکمل تسلط ہو کہ جیسے چاہیں الفاظ کو استعمال کر لیں۔ ایسے حکیم ہیں کہ ان کے فنونِ حکمت بیان سے باہر ہیں۔ ایسے خطیب ہیں کہ سحر بیان دلوں کو ہلا کر رکھ دیں اور ایسے عالم اور دانشور ہیں کہ نبی مکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ہم نشینی، کتابتِ وحی، تلوار و زبان سے دین کا دفاع کیا، بچپن سے جوانی اور پھر بڑھاپے تک آپ کی خدمات نے آپ میں ایسی صلاحیت ایجاد کر دی جو کسی اور میں نہیں ہو سکتی۔ [۲]

۹۔ اہلِ سنّت کے بزرگ عالم، شارحِ نہج البلاغہ شیخ محمد عبدہٗ اپنی کتاب کے مقدمے میں اعتراف کرنے کے بعد کہ اتفاقاً ''نہج البلاغہ'' سے آشنائی ہوئی، فرماتے ہیں کہ یہ بات سوچنے کی ہے کہ ''جب نہج البلاغہ کے بعض صفحات پر نظر ڈالی، بعض عبارات پر غور کیا، اس کے مختلف عناوین پر توجّہ کی تو ایسا لگا، گویا اس کتاب میں جنگیں برپا ہیں، مگر ان پر فصاحت کی حکومت اور بلاغت کا اختیار ہے اور وہم و خیالاتِ باطل پر سپاہِ خطابت نے حملہ کر دیا ہے اور توہّمات کے لشکر پر فصاحت و بلاغت نے فتح حاصل کر لی ہے۔ [۳] بنابر نقل اور مضبوط اور قوی دلائل نے وسوسوں پر حملہ کر کے انھیں شکست دے دی ہے، اور جو قدرتِ باطل کو ہر جگہ ختم کر رہا ہے، شک و تردّد کو شکست دے رہا ہے، اوہام کے فتنوں کو مٹا رہا ہے، وہ حاکم اور دلاور امیر المومنین علی ابنِ ابی طالب علیہ السلام ہیں۔

۱۰۔ سبط ابنِ جوزی جو خود مورّخ و مفسرِ اہلِ سنّت ہیں، ''تذکرۃ الخواص'' میں ایک جاذب جملہ لکھتے ہیں:

''وَ قَدْ جَمَعَ اللہُ لَہُ بَیْنَ الْحَلَاوَۃِ وَ الْمَلَاحَۃِ و الطَّلَاوَۃِ وَ الْفَصَاحَۃِ لَمْ یَسْقُطْ مِنْہُ کَلِمَۃٌ وَلَا بَارَتْ لَہُ حُجَّۃٌ، اَعْجَزَ النَّاطِقِیْنَ وَ حَازَ قَصَبَ السَّبْقِ فِی السَّابِقِیْنَ اَلْفَاظٌ یُشْرِقُ عَلَیْھَا نُوْرُ النُّبُوَّۃِ وَ

[۱] از کتاب الجد یرۃ الغیبۃ نقل از مصادر، نہج البلاغہ ج۱

[۲] مصادر نہج البلاغہ، جلد ۱، صفحہ ۹۶

[۳] شرح نہج البلاغہ محمد عبدہٗ، صفحہ ۹، ۱۰

https://downloadshiabooks.com/

یُحَیِّرُ الْاَفْھَامَ وَ الْاَلْبَابَ"۔ [۱]

''اللہ نے شیرینی ونمکینی وخوبصورتی اورفصاحت کی تمام خصوصیات حضرت علی علیہ السلام میں جمع کر دیں۔کوئی بات آپؑ کے کہنے سے رہی نہیں۔سخنوروں کو ناتواں کر دیا۔ یہ ایسے کلمات ہیں،جن پر نورِنبوّت چمک رہا ہے اور عقلیں حیران و پریشان ہیں۔''

۱۱،۱۲۔اس حصّے کو دو مسیحی شخصیات کے کلام پرختم کرتے ہیں:عربی زبان کے معروف مسیحی مفکر میخائیل نعیمہ لکھتے ہیں:

''اگرعلی ابن ابی طالب علیہما السلام صرف اسلام کے لیے تھے تو کیوں ایک عیسائی ۱۹۵۶ء میں ان کی زندگی پرغور و خوض کرتا ہے(اشارہ ہے جارج جرداق لبنانی مسیحی مؤلف: کتاب "اَلْاِمَامُ عَلِیٌّ صَوْتُ الْعَدَالَةِ الْاِنْسَانِیَّةِ" کی جانب) اور ایک دل باختہ شاعر کی طرح جو دل فریب واقعات، پُرمغز حکایات اورتعجب آور کارناموں کو غزلیہ انداز میں نظم کررہا ہے، کیونکہ امام علیؑ کی پہلوانی صرف میدان حرب میں نہیں تھی، بلکہ بالغ نظری، طہارتِ قلبی، بلاغت، سحر بیانی، عظیم اخلاقیات، ایمانی جذبہ، بلند ہمت، مساکین کی امداد، ناامیدوں کی امید اورحق وصداقت کی پیروی، بلکہ تمام صفاتِ حسنہ میں پہلوان تھے۔'' [۲]

ایک اور مقام پر لکھتے ہیں:

''اس نابغۂ عرب نے جو سو چا وہ کر دکھایا، خدا کی قسم ایسے ایسے معاملات ہیں،جنہیں نہ کسی کان نے سنا اور نہ کسی آنکھ نے دیکھا اور اس سے کہیں زیادہ حقیقت ہے جسے مورّخوں نے قرطاس وقلم کے ذریعے محفوظ کیا ہے، گویا ہم کتنی ہی تعریف کریں وہ پھر بھی کم ہوگی۔'' [۳]

نہج البلاغہ کے عظیم وعمیق مطالب

نہج البلاغہ کی ممتاز خصوصیت،جس کی طرف ہر قاری بادی النظر متوجہ ہوجاتا ہے،اس کی جامعیت اور ہمہ گیر ہونے کے ساتھ مختلف انواع واقسام کے پیغامات ہیں۔ انسان کا یقین کرنا مشکل ہے کہ ایک شخص اس طرح شیریں اور دقیق

[۱] تذکرۃ الخواص، باب ۶،ص ۱۲۸

[۲] ترجمہ وانتقاد از کتاب امام علیؑ ندای عدالتِ انسانیت،ص ۲

[۳] ترجمہ وانتقاد از کتاب امام علی ندای عدالتِ انسانیت،ص ۳

https://downloadshiabooks.com/

موضوعات پر، جو ایک دوسرے سے مختلف اور متضاد بھی ہوں، گفتگو کرسکتا ہے۔ یہ کام سوائے امیر المومنین علی علیہ السلام کے جن کا سینہ اسرار الٰہی کا گنجینہ ہے اور علم و دانش کا عظیم سمندر ہے، ممکن نہیں۔ یہاں اس باب میں چند دانشوروں کے اقوال نقل کرتے ہیں:

۱۔ اہل سنّت کے معروف بزرگ عالم شیخ محمد عبدہٗ کے کلام سے آغاز کرتے ہیں، جب ان کی نگاہ نہج البلاغہ کے خطبات، خطوط اور کلماتِ قصار پر پڑی، تو انھوں نے بہترین انداز میں جائزہ لیتے ہوئے کہا:

جب بھی میں نہج البلاغہ کے ایک حصّے سے دوسرے حصّے کی طرف منتقل ہوا، مجھے احساس ہوا کہ مکمل طور پر نظر ہی تبدیل ہوگئی ہے؛ اپنے آپ کو اُس عالم میں پایا، جہاں ارواح کے بلند معانی، بہترین اور زیبا ترین عبارتوں کے لباس میں پاک نفوس کے گرد چکر کاٹ رہے ہیں اور پاک دلوں کے قریب ہو رہے ہیں، انھیں راہِ راست کی ہدایت کر رہے ہیں اور انھیں لغزشوں سے آگاہ کرتے ہوئے ہدف تک رسائی کا راستہ دکھا رہے ہیں اور فضل و کمال کی طرف رہنمائی کر رہے ہیں۔

ایک دوسرے موقع پر دیکھا تو نہج البلاغہ کا چہرہ بالکل مختلف نظر آیا، اس طرح کہ جیسے کوئی حملہ آور حملے کے لیے تیار ہو۔ اور دشمن کو اپنی مرضی سے تسخیر کرلے اور بغیر کسی زور زبردستی کے ذہنوں پر حاکم ہوجائے اور مکمل طاقت سے باطل خیالات اور فاسد نظریات کو مٹا کر رکھ دے، کبھی اس طرح دیکھتا ہوں کہ جیسے ایک نورانی عقل جو مخلوقاتِ جسمانی سے کسی بھی طرح کوئی شباہت نہیں رکھتی، الٰہی لشکر سے جدا ہوئی اور ارواحِ انسانی سے متصل ہوجاتی ہے اور ارواح انسانی کو ظلماتی پردوں سے نکال کر ملکوتِ اعلیٰ کی طرف بلندیوں پر لے جاتی ہے اور انھیں نورِ اجلی تک پہنچا دیتی ہے اور انھیں عالم قدس میں مقام دیتی ہے کہ دھوکا دہی اور فریب خوری سے نجات نصیب ہوجائے۔

پھر کچھ دیر بعد حکمت آموز خطیب کے سخن میرے کانوں سے ٹکراتے ہیں کہ وہ دانشمندوں اور معاشرے کو چلانے والوں سے خطاب کرتے ہوئے صحیح راہ بتاتے ہیں اور ان کو شک و تردّد، خطاؤں سے بچاتے ہوئے سیاست کی روشنی کی طرف رہنمائی کرتے ہیں اور حکومت کرنے کا بہترین درس اور تدبیری امور انھیں سکھاتے ہیں۔ ہاں یہ وہی کتاب ہے، جس میں سیّد رضیؒ نے مولا امیر المومنین علی ابن ابی طالب علیہ السلام کے کلمات کو جمع کیا ہے اور اس کا نام نہج البلاغہ رکھا ہے اور میں اس نام سے بہتر کوئی نام اس لائق نہیں جانتا جو اس کتاب کے مضامین و مواد کو بیان کرسکتا ہو۔ [۱]

۲۔ نہج البلاغہ کے معروف شارح ابنِ ابی الحدید معتزلی اس بارے میں کہتے ہیں:

مجھے بہت تعجب ہوا اس مرد کے بارے میں جو میدانِ جنگ میں اس طرح خطبہ دیتا ہو، جس طرح کوئی شیر صفت ہو اور جب اس میدان میں وعظ و نصیحت کرتا ہے تو محسوس ہوتا ہے اس سے بہتر کوئی واعظ نہیں کہ جس سے نہ تو کسی جانور کا خون ہوا اور نہ

[۱] شرح نہج البلاغہ شیخ محمد عبدہٗ صفحہ ۱۰

https://downloadshiabooks.com/

ہی اس نے کسی جانور کا گوشت کھایا ہو۔کبھی وہ ''بسطام بن قیسؓ''اور''عتیبۃ بن حارثؓ''اور''عامر بن طفیلؓ''[1] کی صورت میں آشکار ہوتے ہیں اور کبھی حکیم سقراط،کبھی یوحنا اور کبھی مسیح بن مریمؑ کی صورت میں ظاہر ہوتے ہیں۔میں قسم کھاتا ہوں اُس کی جس کی تمام امتیں قسمیں کھاتی ہیں، میں خطبہ "اَلْھٰکُمُ التَّکَاثُرُ" (خطبہ ۲۲۱) کو پچاس سال سے مسلسل ہزار مرتبہ سے زیادہ پڑھ چکا ہوں، جب بھی پڑھتا ہوں ایک وحشت وخوف اور بیداری میرے وجود میں پیدا ہوجاتی ہے، جو دل پر گہرا اثر چھوڑتی ہے، میرے اعضاء میں لرزش پیدا ہوجاتی ہے۔جب کبھی اس خطبے کے مضامین میں غور کیا،تو اپنے خاندان، رشتے داروں اور دوستوں میں مرنے والوں کا خیال دل میں آیا اور ایسا محسوس ہوا، گویا مولاؑ میرے بارے میں گفتگو فرما رہے ہیں۔کتنے ہی واعظوں،خطیبوں،فصحاء نے اس موضوع پر بات کی،مگر حضرتؑ کے کلام کے علاوہ کسی کے کلام نے مجھ پر اثر نہیں کیا۔[2]

۳۔شیخ بہائی اپنی کتاب ''کشکول'' میں کتاب ''الجواہر'' سے ابوعبیدہ کا قول نقل کرتے ہیں: ''حضرت علی علیہ السلام نے نو (۹) جملے ایسے بیان فرمائے ہیں کہ عرب کے بلیغ افراد ایک جملہ بھی ان کے مقابلے میں لانے سے قاصر ہیں:۔تین جملے مناجات کے،تین علوم اور تین ادب کے ہیں[3] پھر ان (۹) نو جملوں کی شرح بیان کرتے ہیں،جن میں سے کچھ نہج البلاغہ میں اور کچھ مولا علیؑ کے دوسرے اقوال میں ہیں۔

۴۔ڈاکٹر مبارک، کتاب ''عبقریۃ الشریف الرضیؒ میں لکھتے ہیں: میں سمجھتا ہوں کہ نہج البلاغہ پر غور وفکر اور تدبر انسان کو بہادری،شجاعت اور عظمت عطا کرتا ہے، کیونکہ نہج البلاغہ ایک روح پرور بزرگ کا کلام ہے،جس نے مشکلات اور حادثات کے مقابلے میں مانندِ شیر مقابلہ کیا ہے۔[4] یہاں بات نہج البلاغہ کی عظمت اور روحِ شہامت،شجاعت اور روحانی بلندی کی ہے، جو نہج البلاغہ میں غور وفکر کے زیر سایہ میسّر ہے۔

۵۔ابنِ ابی الحدید اس مقام پر کہتے ہیں:''سبحان اللہ'' کون ہے،جس نے فضیلتیں اور شرف وگرانقدر خوبیاں اس نمونۂ عمل انسان''علی علیہ السلام'' کو عطا کیں، کیسے ممکن ہے کہ ایک انسان جو ایک عرب (مکے) کا رہنے والا ہو اور جس نے عرب کے اس ماحول میں زندگی بسر کی ہو اور کسی فلسفی سے کبھی دوستی نہ رہی ہو، پھر بھی علومِ الٰہیہ اور حکمتِ متعالیہ میں افلاطون وارسطو سے زیادہ آگاہی رکھتا ہو، جو کسی بھی علم عرفان واَخلاق کے ماہر کے ساتھ نہ رہا ہو لیکن سقراط سے برتر ہو۔جو بہادروں کے ساتھ نہ رہا

[1] یہ تین افراد زمانۂ جاہلیت میں بہادری کے حوالے سے ضرب المثل تھے۔(الاعلام زرکلی ج۴ صفحہ ۲۰۱)
[2] شرح نہج البلاغہ ابن ابی الحدید، ج۱۱،ص ۱۵۳
[3] کشکول شیخ بہائی، ج۳،ص ۳۹۷
[4] عبقریۃ الشریف الرضیؒ، ج۱،ص ۳۹۶

https://downloadshiabooks.com/

ہو، کیونکہ اہلِ مکہ تاجر تھے، جنگجو نہیں تھے اور شجاع ترین فرد ہو کہ گویا اُس جیسے نے اس زمین پر قدم ہی نہ رکھا ہو۔[۱]

۶۔ سیّد رضیؒ نے بھی کہیں کہیں نہج البلاغہ کے موضوعات کے پُر معانی ہونے پر اشارے کیے ہیں، جو قابلِ ملاحظہ ہیں، مثلاً اکیسویں خطبے کے ذیل میں کہتے ہیں:

"اِنَّ هٰذَا الْكَلَامَ لَوْ وُزِنَ بَعْدَ كَلَامِ اللّٰهِ سُبْحَانَهُ وَ بَعْدَ كَلَامِ رَسُوْلِ اللّٰهِ بِكُلِّ كَلَامٍ لَمَالَ بِهِ رَاجِحاً وَبَرَّزَ عَلَيْهِ سَابِقاً"

''مولا علی علیہ السلام کے کلام کا مقام بلند و برتر ہے، خدا اور رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے کلام کے بعد اولین و آخرین میں اس کلام کا کوئی مقابلہ نہیں کر سکتا۔''

پھر اکیسویں خطبہ میں اشارہ کرتے ہیں:

"فَاِنَّ الْغَايَةَ اَمَامَكُمْ وَ اِنَّ وَرَاءَكُمُ السَّاعَةُ تَحْدُوْكُمْ وَخَفَّفُوْا تَلْحَقُوْا فَاِنَّمَا يُنْتَظَرُ بِاَوَّلِكُمْ آخِرُكُمْ"

''قیامت تمہارے مقابل ہے اور موت تمہیں ڈھونڈ رہی ہے، سامان اور بار کم کرو تاکہ جلدی اور تیز دوڑ سکو ورنہ قافلے سے پیچھے رہ جاؤ گے اور جان لو تم پیچھے رہ جانے والوں کے انتظار کے لیے روکے گئے ہو۔''

وہ کہتے ہیں:

یہ کلام خدا اور رسولؐ کے کلام کے بعد سب سے بلند و برتر کلام ہے۔ حکمت ۸۱ کے ذیل میں اس جیسا ہی کلام لاتے ہوئے کہتے ہیں، یہ وہ کلام ہے جس کی قیمت نہیں لگائی جا سکتی۔ ایسی حکمت ہے جس کے ہم وزن کوئی حکمت نہیں اور کوئی کلام اس کے ہم پلہ نہیں۔''[۲]

۷۔ اس جگہ عنوانِ کلام مصر کے مشہور مصنّف عباس محمد العقاد کے سپرد کرتے ہیں اور ان کے ساتھ نہج البلاغہ کی سیر کرتے ہیں، وہ اپنی کتاب ''عبقریۃ الامامؑ'' میں بلند و بالا تعبیرات بیان کرتے ہیں، جو اس بات کی علامت ہے کہ وہ حضرت امام علی علیہ السلام کے متعلق گہری معرفت رکھتے ہیں۔ وہ ایک جگہ کہتے ہیں۔ نہج البلاغہ ایک ایسا اُبلتا ہوا چشمہ ہے، جس سے توحید و حکمت کی آیات جھلکتی ہیں، جو عقائد و خدا شناسی کے اصول کو وسعت بخشتی ہیں۔[۳]

---

[۱] شرح نہج البلاغہ ابن ابی الحدید، ج ۱۶، ص ۱۴۶

[۲] العبقریات، ج ۲، ص ۱۳۸ (طبع دار الکتاب لبنانی)

[۳] العبقریات، ج ۲، ص ۱۴۵

https://downloadshiabooks.com/

ایک دوسرے مقام پر کہتے ہیں، اُن کا ہر کلام اس بات کی گواہی دیتا ہے کہ وہ بیانِ حقائق کی قدرت وصلاحیت اور ملکہ رکھتے تھے۔ بے شک یہ وہ فرزندِ آدمؑ ہیں جنہیں علمِ اسماء سکھایا گیا ہے اور "وَ عَلَّمَ آدَمَ الْاَسْمَاءَ کُلَّهَا" اور "اُوتُوا الْكِتَابَ" اور "فَصْلُ الْخِطَابِ" کا مکمل مصداق ہیں۔[1]

دوسرے مقام پر کہتے ہیں:

حضرت امام علی علیہ السلام سے جو بلند عظیم کلمات روایت ہوئے ہیں، ان سے برتر کلمات تصور نہیں کیے جاسکتے۔ پیغمبر اسلامؐ نے فرمایا: "میری امّت کے علماء بنی اسرائیل کے انبیاء کی طرح ہیں"۔ اس حدیث کا مصداق حضرت علیؑ سے زیادہ کوئی نہیں، جن کے حکیمانہ کلمات انبیاءؑ کے کلمات کی طرح ہیں۔[2]

۸۔ معروف مصنف محمد امین نواوی، نہج البلاغہ کے بارے میں لکھتے ہیں:

یہ وہ کتاب ہے، جسے خدا نے اس حقیقت پر حجّت قرار دیا ہے کہ علی علیہ السلام قرآن کے نور، اس کی حکمت اور معجزہ ہونے پر دلیل ہیں۔ اس کتاب میں ایسے مطالب ونکات جمع ہیں کہ سوائے علی علیہ السلام کے کوئی حکیم، فلسفی، عالم ربّانی اور نابغۂ روزگار فلسفہ اور اصولِ سیاست جیسے موضوعات کو بیان کرنے پر قادر نہیں تھا۔[3]

۹۔ ثقۃ الاسلام کلینیؒ کافی کی پہلی جلد میں توحید کے بارے میں حضرتؑ کے خطبے کو بیان کرتے ہیں:

یہ خطبہ بہت مشہور ہے، اکثر لوگ اسے جانتے ہیں اور جو توحید کے طالب علم ہیں، ان کا اس پر غور وفکر کرنا کافی ہے۔ اگر انبیاءؑ کے علاوہ تمام انس وجن کی زبانیں مل کر توحید کو بیان کریں تو ہرگز علیؑ (جن پر میرے ماں باپ فدا ہوں) جیسا کلام نہیں لاسکتیں۔ اگر حضرت علی علیہ السلام کے بیانات نہ ہوتے تو لوگوں کو معلوم نہ ہوتا کہ راہ توحید پر کیسے چلا جائے۔[4]

۱۰۔ مصر کے ایک اور معروف مصنّف "ڈاکٹر طٰہٰ حسین" کے بیانات میں ہے:

جب جنگ جمل میں شک وتردّد کے شکار ایک شخص نے حضرت علی علیہ السلام سے سوال کیا تو اُس کا کہنا ہے کہ آپؑ کا جواب ایسا تھا کہ "میں نے وحی الٰہی کے بعد ایسا باعظمت، رسا تر جواب نہ دیکھا نہ سنا۔"

۱۱۔ اس موضوع کو حضرت آیت اللہ علّامہ خوئیؒ اپنے اس کلام پر ختم کرتے ہیں:

امام علی علیہ السلام جب "نہج البلاغہ" کے خطبوں کو بیان کرتے ہیں، تو کسی اور کو اس موضوع پر بات کرنے کا اہل نہیں

[1] العبقریات، ج۲، ص۱۴۴

[2] مصادر نہج البلاغہ، ج۱، ص۹۰

[3] سیری ونہج البلاغہ، ص۱۸، ۱۹

[4] اصول کافی، ج۱، ص۱۳۶

https://downloadshiabooks.com/

چھوڑتے، یہاں تک کہ جو لوگ حضرت علیؑ کی زندگی کے بارے میں نہیں جانتے، وہ سمجھتے ہیں کہ گویا مولا علیؑ نے ساری زندگی اس موضوع کو بیان کرنے میں صرف کر دی'' ۔[1]

نہج البلاغہ کی بے مثال جاذبیت

نہج البلاغہ کے پڑھنے والے تمام افراد چاہے وہ شیعہ دانشور ہوں، مسلم یا مسیحی علماء ہوں، بغیر کسی استثنیٰ کے سب نے نہج البلاغہ کی بے مثال جاذبیت کو تسلیم کیا ہے۔ یہ کشش اور جاذبیت خطبوں، خطوط اور کلماتِ قصار میں بطور کامل محسوس کی جا سکتی ہے، جو سبب بنی ہے کہ دانشوروں نے نہج البلاغہ کی شرحیں لکھی ہیں اور حضرت علیؑ کی زندگی اور شخصیت پر کتب اور مقالات پیش کیے ہیں۔ ہمارے خیال میں یہ جاذبیت اور کشش چند چیزوں کی وجہ سے ہے جو درج ذیل ہیں:

۱۔ نہج البلاغہ میں مظلوموں، محروم اور ستم رسیدہ افراد سے ہمدردی اور ظلم، بے انصافی، استعمار اور طاغوت سے نفرت کی بات ہوئی ہے۔ عہد نامۂ مالکِ اشترؒ میں مختصر سی عبارت کے ذریعے مملکت کے امور سنبھالنے سے متعلق بیان ہے، جس میں معاشرے کے سات طبقات اور ان کی ذمے داریاں اور ان کے حقوق کو بہت آرام اور سکون سے بیان فرمایا، مگر جوں ہی محروم و مظلوم طبقے کی بات آئی تو گویا امامؑ کے کلام کو پرواز مل گئی اور دل کی گہرائی سے فرمایا:

"اَللهَ اَللهَ فِي الطَّبَقَةِ السُّفْلٰى مِنَ الَّذِيْنَ لَا حِيْلَةَ لَهُمْ مِنَ الْمَسَاكِيْنِ وَ الْمُحْتَاجِيْنَ وَ اَهْلِ الْبُؤْسٰى وَ الزَّمْنٰى"

''خدا کے لیے، خدا کے لیے اے مالکِ اشترؒ نچلے درجے کے افراد جو مظلوم، محروم، ضرورت مند، ستم دیدہ اور مجبور ہیں، اُن کے ساتھ اپنا برتاؤ اچھا رکھو۔ اُن کے پاس کسی اور کو نہ بھیجنا، خود ان کا خیال کرنا اور پوری مملکت میں ان پر نظر رکھنا اور کسی اور کو ان کے معاملات میں مداخلت کرنے نہ دینا اور مسلسل ان سے ملاقات رکھنا، تا کہ سب کی مشکلات عدل و انصاف کے ساتھ دور ہو جائیں۔'' اور یہ فرمان صرف اسی جگہ نہیں بلکہ مختلف مقامات پر آپؑ نے ان کے بارے میں سفارش فرمائی ہے۔

۲۔ نہج البلاغہ انسانی آزادی، غلامی سے نجات، ہوا و ہوس سے آزادی، ذلّت و خواری سے آزادی اور ثروت مندوں کے حملوں سے آزادی دلانے کے لیے ہر موقع سے استفادہ کرنے کا درس دیتی ہے اور حضرتؑ نے سمجھایا کہ جہاں بھی

---

[1] البیان، ص ۹۰

https://downloadshiabooks.com/

مادّی نعمتوں کے انبار لگے ہوں جان لو کہ وہاں دوسروں کے حقوق پائمال کیے گئے ہیں۔[1] امامؑ متنبہ کرتے ہیں کہ آزادی، مساوات اور عدالت کی راہ میں کسی بھی دھمکی کو برداشت نہ کیا جائے بلکہ حضرتؑ نے تو حکومتی اعلیٰ منصب اسی وجہ سے قبول کیا تھا[2] اور جو لوگ اس خام خیالی میں تھے کہ حضرت علی علیہ السلام اس موضوع پر کوئی سودا بازی کریں گے وہ کھلی گمراہی میں تھے جو امام علی علیہ السلام کو نہ پہچاننے کی دلیل ہے۔[3]

۳۔ نہج البلاغہ کی عرفانی جاذبیت اور کشش ایسی ہے کہ روحانیت و معنویت کی تشنہ ارواح کو سیراب کر دیتی ہے اور جب معرفت خدا اور صفاتِ جمال وجلالِ الٰہی کی بات آتی ہے تو نہج البلاغہ پڑھنے والے کو محسوس ہوتا ہے کہ جیسے وہ فرشتوں کے بال و پر کا سوار ہے اور ایسے ایسے آسمانوں کی سیر کر رہا ہے جہاں تک رسائی ممکن نہیں تھی۔[4] اور جب بے حس اور سوئی ہوئی روحوں کی بیداری کی بات آتی ہے تو تازیانۂ سخن ایسے چلتا ہے کہ گویا زندگی ختم ہو رہی ہے اور جب گزشتہ اُمتوں کی گفتگو ہوتی ہے تو ایسا لرزہ طاری ہوتا ہے کہ گویا دردناک بھی ہے اور لذت آور بھی۔[5]

۴۔ نہج البلاغہ کی ایک اور جاذبیت جس کی طرف پہلے بھی اشارہ ہوا ہے کہ ہر میدان میں ایسے قدم رکھا ہے کہ گویا حق سخن ادا کر دیا اور ہر چیز کی ہر زاویے سے شرح کی ہے۔ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ کہنے والے نے تمام زندگی انہی موضوعات پر صرف کی ہے اور اس کے علاوہ کچھ نہیں کیا۔ جب حضرت امام علیؑ خطبۂ توحید کا آغاز کرتے ہیں اور اسماء، صفاتِ جمال وجلال پر گفتگو کرتے ہیں تو ایک عظیم فلسفی کا چہرہ دکھائی دیتا ہے، جس نے عرصۂ دراز تک صرف توحید پر گفتگو کی ہو۔ وہ ایسے گراں بہا گہر پیش کرتے ہیں جو اس سے قبل بیان نہیں ہوئے، نہ تجسّم خدا نہ صفات کی تفصیل بلکہ اس طرح کا اندازِ گفتگو کہ انسان، دل کی آنکھوں سے زمین وآسمان اور خود کو اپنے لیے حاضر محسوس کرتا ہے اور روح معرفتِ الٰہی سے سرشار ہو جاتی ہے۔ پھر ہماری نگاہ جب ان خطبات پر پڑتی ہے، جو جہاد کے بارے میں ہیں تو ایسا محسوس ہوتا ہے گویا ایک سپہ سالار شجاع و دلیر، لباسِ جنگ زیب تن کیے جنگی آداب بیان کرتا ہوا نظر آ رہا ہے کہ جیسے اس نے تمام عمر میدانِ جنگ میں گزار دی ہو۔

۵۔ جب ہم نہج البلاغہ کی ورق گردانی کرتے ہیں تو حضرت امام علی علیہ السلام کو کرسی، حکومت اور رہبری اُمّت پر پاتے ہیں کہ آپ گورنروں کو حکومت چلانے کے احکامات صادر کرتے ہیں۔ تمدن کے انحطاط سے بچنے اور ترقی کے رموز، ظالم

---

[1] حضرت امام علیؑ (صدائے عدالتِ انسانیت) ج ۳، صفحہ ۱۷۷۔

[2] خطبۂ شقشقیہ، خطبہ ۳

[3] عثمان بن حنیف کے نام (نامہ ۴۵)

[4] خطبۂ اوّل اور خطبۂ اشباح، خطبہ ۹۱

[5] خطبہ ۱۰۹، ۱۱۱، ۱۱۳ و دیگر

https://downloadshiabooks.com/

قوموں اور ستمگروں کا انجام اور معاشرتی و سیاسی بہتری وسکون حاصل کرنے کے طریقے پختہ ترین عبارات کے سانچے میں ایسے بیان کرتے ہیں گویا صرف انہی امور میں آپ نے ساری زندگی صرف کی ہے۔ پھر مسند اخلاق پر آپ کو پاتے ہیں تو تہذیبِ نفس، تربیتِ افکار وارواح کا درس دیتے ہیں۔ ''ہمام'' آپ سے متقیوں کی صفات بیان کرنے کا تقاضا کرتے ہیں، وہ اتنے پیاسے تھے کہ ایک دو جام سے سیراب ہونے والے نہیں تھے۔

حضرتِ امام علی علیہ السلام اُن کو اس طرح علم ودانش عطا کرتے ہیں کہ پرہیزگاروں کی تقریباً سو (۱۰۰) صفات جو محکم عبارات اور گہرے مطالب سے آراستہ ہیں، بیان فرماتے ہیں۔ ایسا لگتا ہے ہزاروں برس اس مسند پر آپ بیٹھے رہے اور یہ ہی کام کرتے رہے ہوں۔ تاریخ میں ایسے سخنوری اور کہیں نظیر نہیں ملتی، نہج البلاغہ کے یہ مختلف زاویے جو ہر ایک اپنی جگہ بے مثال ہے، اس کتاب کے عجائب اور خصوصیات میں شمار ہوتے ہیں۔

نہج البلاغہ کی جاذبیت اور اہم شخصیات کی تعبیرات

سیّد رضیؒ خود ایک عرب کے نامور ادیب شمار ہوتے ہیں، خطبات کے ذیل میں ایسی تعبیرات بیان کرتے ہیں کہ جو سننے والے کو مجذوب اور متاثر کرتی ہیں:

(الف) خطبہ غراء (خ ۸۳) میں آیا ہے:

"وَ فِي الْخَبَرِ أَنَّهُ لَمَّا خَطَبَ بِهٰذِهِ الْخُطْبَةِ اِقْشَعَرَّتْ لَهُ الْجُلُوْدُ وَ بَكَتِ الْعُيُوْنُ وَ رَجَفَتِ الْقُلُوْبُ"

''جب حضرت علی علیہ السلام نے یہ خطبہ بیان کیا تو بدن لرزنے لگے، آنکھوں سے آنسو جاری ہو گئے اور دل مضطرب ہو گئے۔''

(ب) خطبہ ہمّام کے ذیل میں (ہمام، جنہوں نے صفاتِ متقی کا تقاضا کیا تھا) ہم پڑھتے ہیں:

جب امامؑ خطبے کے حساس ترین موڑ پر آئے، ہمام نے ایک آہ بھری اور بے ہوش ہو گئے، زمین پر گرے اور ان کی روح جسم سے پرواز کر گئی۔ امامؑ نے فرمایا، مجھے اس بات کا خوف تھا اور میں ہمام کے مطالبے کو قبول نہیں کر رہا تھا مگر۔۔۔! پھر فرمایا کہ آیا ایسا نہیں کہ جو اہل ہیں، اُن پر نصیحت اثر کرتی ہے۔

(ج) اسی طرح خطبہ ۲۸ کا بیان ہے، جو انسان کی فکر و جان پر اثر انگیز اور اسے اپنی طرف جذب کرتا ہے، اُس کے بارے میں سیّد رضیؒ فرماتے ہیں، ''اگر کلام ایسا ہو جو لوگوں کو زہد کی طرف لے جائے اور آخرت کے لیے عمل کرنے کی

https://downloadshiabooks.com/

ترغیب دے، تو وہ طولانی آرزوؤں سے دور کرتا ہے اور بُرے اعمال سے نفرت دلاتا ہے۔''

پھر اس خطبے کی تعبیرات کی طرف توجہ دلاتے ہیں، ''اس خطبے کا گہری فکر و نظر سے مطالعہ کرو کہ اس میں باطنی حیرت انگیزی اور عجیب گہرائی موجود ہے، جو امامؑ کے اکثر کلام میں پائی جاتی ہے۔''

(د) اسی طرح خطبہ ۱۶ کے ذیل میں بیان کرتے ہیں، اس کلام میں حقیقت سے نزدیک ترین فصیح و لطیف کلام پنہاں ہے کہ کوئی کلام اس تک رسائی نہیں پا سکتا۔ اور ہمیں حیرت میں ڈال دیتا ہے کہ فصاحت کی باریک بینی اور موشگافیاں جنہیں بیان کرنے سے انسانی زبان قاصر ہے اور انسان جن کی گہرائیوں تک رسائی کی قدرت نہیں رکھتا، "وَمَا يَعْقِلُهَا إِلَّا الْعَالِمُونَ" اور سوائے دانش مندوں کے کوئی اور درک نہیں کر سکتا۔

(ھ) خطبۂ شقشقیہ کی شرح میں ابن عباسؓ (محدّث و مفسر قرآن) کا بیان، جو کہ اس خطبے میں آپؑ کی محویت کا ثبوت ہے:

"فَوَاللهِ مَا أَسَفْتُ عَلَى كَلَامٍ قَطُّ كَأَسَفِي عَلَى هٰذَا الْكَلَامِ أَنْ لَا يَكُونَ أَمِيرُ الْمُؤْمِنِينَ بَلَغَ مِنْهُ حَيْثُ أَرَادَ"

''خدا کی قسم کبھی مجھے اتنا افسوس نہیں ہوا جتنا اب ہو رہا ہے کہ یہ کلام کیوں مکمل نہ ہوا۔''

امیر المومنینؑ جس مقام تک پہنچنا چاہتے تھے، آپ نے وہ مقام بیان نہیں کیا (ایک شخص ماحول کو نظر انداز کرتے ہوئے ایک خط امامؑ کو دیتا ہے، جس کی وجہ سے امامؑ کا کلام قطع ہو جاتا ہے)

اس گفتگو کو محقق خوئی، منہاج البراعہ اور ابن ابی الحدید کے کلام پر ختم کرتے ہیں، وہ کہتے ہیں:

کسی بھی کلام کا حضرت علی علیہ السلام کے کلام سے باعظمت و منظم ہونے کے اعتبار سے موازنہ نہیں کر سکتے؛ اس میدان میں میرا مولاؑ تنہا ترین فرد ہے، ایسا خطیب ہے جس کے بیان سے غضب و اضطراب ختم ہو جاتا ہے؛ ایسا سمندر ہے جو ساحل پر موتی بکھیرتا ہے اور دلوں پر حکومت کرتے ہوئے انہیں امر و نہی کی پیروی کی طرف لے جاتا ہے؛ نیکیوں پر دلائل اور بیدار کُن کلام کے تازیانوں کے ذریعے منکرات سے دور کرتا ہے اور یہی وجہ ہے:

"فَحَقِيقٌ بِكَلَامِهِ أَنْ يُجْعَلَ إِمَامَ الْكَلَامِ كَمَا أَنَّهُ إِمَامُ الْأَنَامِ" [1]

''اُن کا کلام دوسرے تمام کلاموں کا پیشوا کہلوانے کا سزاوار ہے، جس طرح وہ خود سب کے پیشوا ہیں۔''

بالآخر ابن ابی الحدید خطبہ ۱۰۹ کے آغاز میں اس حقیقت کو بیان کرنے کے بعد (کہ جو چاہتا ہے فصاحت و بلاغت

[1] منہاج البراعہ ج ۱ صفحہ ۲۷۱

https://downloadshiabooks.com/

کے امور سے آگاہی حاصل کرے وہ اس خطبے پر ضرور غور کرے) کہتے ہیں ''اس خطبے کی تاثیر اور جاذبیت ایسی ہے کہ بے دین وملحد انسانوں کے سامنے جو قیامت کے منکر ہیں پڑھا جائے تو وہ مضمحل ہو جائیں گے اور ان کے دل وحشت زدہ ہو کر ان کے منفی ارادے کو کمزور کر دیں گے ان کے اعتقاد میں دراڑیں پڑ جائیں گی۔ خدا اس کلام کے کہنے والے کو جزائے خیر دے اور بہترین جزا جو اُس نے اپنے اولیاء کو دی ہے۔ کیا بہترین مددگار ہے جو اسلام کی کبھی ہاتھ سے کبھی تلوار، کبھی زبان و بیان وقلب وفکر سے مدد کرنے والا ہے، ہاں یہی "سَیِّدُ الْمُجَاهِدِینَ وَ أَبْلَغُ الْوَاعِظِیْنَ وَ رَئِیْسُ الْفُقَهَاءِ وَ الْمُفَسِّرِیْنَ وَإِمَامُ أَهْلِ الْعَدْلِ وَالْمُوَحِّدِیْنَ" ہے۔[1]

نہج البلاغہ کی اسناد

اس بات میں کوئی شک نہیں کہ نہج البلاغہ میں خطبات، مکتوبات اور کلمات قصار بطور روایات مرسل سیّد رضیؒ نے جمع کیے ہیں، یعنی ایسی کوئی سند نہیں ہے جو معصومینؑ تک پہنچے، اس بناء پر بعض لوگوں نے اس میں شک وتردّد کا اظہار کیا ہے، بالخصوص وہ لوگ جو سوچتے تھے کہ نہج البلاغہ اپنے اعلیٰ معیار کی وجہ سے مذہبِ شیعہ کی حقانیت اور فضیلت، نیز تمام اصحاب پر حضرت امام علی علیہ السلام کی برتری کو ثابت کرنے کے لیے ایک بہترین سند ہے، انہوں نے اس عظیم کتاب کی اہمیت کو مسلمانوں کے ذہنوں سے کم کرنے کے لیے ''سند'' کو ایک بہانہ قرار دیا۔

خوش قسمتی سے ان ہتھکنڈوں کی وجہ سے اسلامی مفکرین کے افکار پر کوئی فرق نہیں پڑا بلکہ اہلسنّت اور اہلِ تشیع کے علماء نے اس کی تعریف وتمجید میں بیانات اور تحریریں پیش کیں۔ نیز اس کتاب کے اَسرار و رموز کو بیان کرنے کے لیے شرحیں تحریر کی ہیں، جس کے بعض نمونے پہلے بیان ہو چکے ہیں، لیکن بہرحال ضروری ہے کہ ان شکوک وشبہات کو دور کرنے کے لیے نہج البلاغہ کی اسناد کے بارے میں وضاحت کی جائے تا کہ اس نورانی چہرے سے شبہات کی گرد وغبار دور ہو جائے۔ چنانچہ ان دو نکات کی طرف توجّہ دینا ضروری ہے:

۱۔ نہج البلاغہ کے اکثر خطبات، مکتوبات اور کلماتِ قصار بلکہ سب کے سب بالاتفاق ایسے مضامین پر مشتمل ہیں، جو منطقی دلائل کے ہمراہ ہیں اور حقیقت میں اس قول "قَضَایَا قِیَاسَاتُهَا مَعَهَا" کا عملی مصداق ہیں، ایسے مضامین جن کے دلائل خود انہی میں پوشیدہ ہیں۔ چنانچہ اسناد ذکر کرنے کی کوئی ضرورت نہیں ہے، کیونکہ نہج البلاغہ کے اکثر موضوعات اعتقادات پر مشتمل ہیں مثلاً مبداء ومعاد، خدا کی صفات، عظمتِ قرآن ورسولؐ پر دلائل وغیرہ۔ جبکہ دوسرا حصّہ پند ونصیحت، گزشتہ اقوام کی

[1] شرح نہج البلاغہ ابن ابی الحدید، ج ۷، ص ۲۰۲ خلاصے کے ساتھ۔

https://downloadshiabooks.com/

زندگی سے درسِ عبرت، اجتماعی زندگی، جہاد کے آداب وغیرہ جو منطقی مطالب اور دلائل پر مشتمل ہے، جیسا کہ عظیم فلسفیوں کے مقالات، ماہرین علوم کی تحریریں، شعراء کے اشعار وغیرہ سند کے بغیر مقبول اور قابلِ قبول ہیں۔ نہج البلاغہ کے حوالے سے بھی بطریق اولیٰ سند کی کوئی ضرورت نہیں، کیوں کہ ان کے دلائل بھی ان کے ساتھ ہیں۔ بقول معروف "قَضَایَا قِیَاسَاتُهَا مَعَهَا"، نہج البلاغہ کا ایک مختصر حصہ فروعات تعبدیہ پر مشتمل ہے اور سند کی ضرورت صرف اسی حصے کے لیے ہے۔ جو نہج البلاغہ کا دسواں حصّہ بھی نہیں ہے۔ بنابرایں نہج البلاغہ کی اسناد کے حوالے سے اعتراضات بے اثر ہیں۔

۲۔ دوسرا نکتہ یہ ہے کہ اگر نہج البلاغہ کی سند کو حجیّت کے معیار پر لائیں تو اس حوالے سے بھی کوئی مشکل نہیں ہے، کیونکہ حدیث و روایات کو تسلیم کرنے کے لیے جس طرح علم اصول میں تحقیق کی گئی ہے، اس کا اصلی معیار اعتماد و اطمینان ہے، جو ممکن ہے مختلف طریقے سے بیان ہو۔ کبھی قابلِ اعتماد، راویوں کا سند میں ہونا روایت کو قابلِ اعتبار بناتا ہے اور کبھی روایت کی کثرت اور متعدد ہونے کی بنا پر اطمینان حاصل ہوتا ہے اور وہ بھی معتبر کتابوں سے اعتماد حاصل ہوتا ہے اور کبھی کلام کی بلندی، عمیق معانی و مفاہیم خود اس بات کی گواہی دیتے ہیں کہ یہ کلام رسول اللہؐ یا امام معصومؑ کی فکر ہے۔

اسی معیار کی کتاب صحیفۂ سجادیہؑ ہے، جس کی معتبر سند بھی موجود ہے، اور عالی ترین مطالب و معانی اور مفاہیم خود اس بات کی گواہی دیتے ہیں کہ یہ مضامین امامِ سجاد علی بن الحسین علیہما السلام کے ہیں۔ اسی لیے کہا گیا ہے کہ اگر کوئی نہج البلاغہ کے معانی و مفاہیم میں غور و فکر کرے تو کہیں نہ کہیں وہ اعتراف ضرور کرے گا کہ یہ ایک عام انسان کا کلام نہیں ہوسکتا۔ یقیناً یہ کلام رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم یا امامِ معصومؑ کی زبان سے ادا ہوا ہے۔ اہلِ تشیّع اور اہلِ سنّت کے بزرگ علماء نے نہج البلاغہ کی تعریف میں کہا ہے کہ یہ خالق کے کلام کے نیچے اور مخلوق کے کلام کے اوپر ہے۔ آمد آفتاب خود دلیلِ آفتاب ہے۔ نہج البلاغہ کے مضامین خود دلیل و سند ہیں کہ یہ امامِ معصومؑ سے صادر ہوئے ہیں اور یہ نسبت صرف حضرت علی علیہ السلام کی طرف ہے اور ہمیں یقین ہے کہ یہ کلام اسی امامؑ کا ہے۔ کون یہ احتمال دے سکتا ہے کہ یہ ایک عام انسان یا مفکر نے بنا کر امام علیؑ کی طرف نسبت دی ہے؟ کون ہے وہ شخص جو ایسا کرسکتا ہو کہ اس کا ایک حصّہ بھی ایجاد و انشاء کرسکے؟ وہ خود اپنی طرف نسبت کیوں نہیں دیتا کہ ساری دنیا اس کے لیے تعریف و تمجید کرنے لگے۔

سیّد رضیؒ کی شخصیت، سچائی اور مقام و منزلت کو مدنظر رکھتے ہوئے ہم یہ سمجھتے ہیں کہ انہوں نے معتبر منابع دیکھے بغیر اس صراحت کے ساتھ امام علی علیہ السلام کی جانب نسبت نہیں دی ہے کہ امیر المومنینؑ سے روایت ہے۔ یہ امامِ عالی مقام علیہ السلام کے خطبات، مکتوبات اور کلماتِ قصار وغیرہ ہیں۔ یہ کس طرح ممکن ہے کہ ایک مفکر صراحت کے ساتھ کسی کلام کو اپنے معصوم رہنما سے نسبت دے جبکہ اس کی کوئی معتبر سند بھی نہ رکھتا ہو؟ اس کتاب سے پہلے سیّد رضیؒ نے مختلف کتابیں تالیف کی

https://downloadshiabooks.com/

ہیں، ان کتابوں میں نہج البلاغہ کے خطبات، مکتوبات اور کلماتِ قصار ذکر ہوئے ہیں اور یہ اس بات کی دلیل ہے کہ سیّد رضیؒ سے پہلے بھی یہ کلام مفکرین، راویانِ حدیث اور عام لوگوں کے درمیان معروف و مشہور تھا۔ اسی شہرت کی بنا پر ہم اسنادِ متصل کو بیان کرنے سے بے نیاز ہیں۔ یہاں تک کہ بعض مورّخین نے لکھا ہے سیّد رضیؒ سے پہلے بھی نہج البلاغہ کے خطبات عوام کے درمیان مشہور تھے، یعنی در حقیقت نہج البلاغہ ان ہی تمام خطبات کا دل آویز گلدستہ ہے۔

من جملہ مشہور مورّخ ''مسعودی'' جو سیّد رضیؒ سے ایک صدی پہلے تھے، اپنی کتاب ''مروّج الذہب'' میں امام علیؑ کے خطبات کے حوالے سے انہوں نے یوں تحریر کیا ہے:

"وَالَّذِيْ حَفِظَ النَّاسُ عَنْهُ مِنْ خُطَبِهِ فِيْ سَائِرِ مَقَامَاتِهِ أَرْبَعُ مِاْئَةٍ وَنَيِّفٌ وَثَمَانُوْنَ خُطْبَةً" [1]

''لوگوں نے مختلف مقامات پر امامؑ کے خطبات کو محفوظ کیا، چار سو اسّی سے بھی زیادہ ہیں۔''

جبکہ (نہج البلاغہ) میں دو سو چالیس خطبات ہیں۔''

دوسرے معروف مورّخ سبط ابنِ جوزی نے کتاب (تذکرۃ الخواص) میں سیّد مرتضیٰؒ سے نقل کیا ہے کہ انہوں نے فرمایا:

''امامؑ کے چار سو خطبات میرے پاس موجود ہیں۔'' [2]

معروف مسلم مفکّر جاحظ اپنی کتاب (البیان والتبیین) میں یوں تحریر کرتے ہیں:

''امام علی علیہ السلام کے خطبات ہمیشہ سے معروف و مشہور رہے ہیں۔'' [3]

ایک اور دانشور ابن واضح نے اپنی کتاب "مشاکلۃ الناس لزمانھم" [4] میں یوں تحریر کیا ہے:

''لوگوں نے امام علیؑ کے متعدد خطبات حفظ کیے ہوئے ہیں۔ انہوں نے چار سو خطبات پڑھے، جنھیں لوگوں نے حفظ کیا اور وہی خطبات ہمارے درمیان رائج ہیں اور ان سے اپنی تقاریر میں استفادہ کرتے ہیں۔''

اس وقت چند کتابیں موجود ہیں، جن کو عصرِ حاضر کے فضلاء اور بزرگانِ دین نے نہج البلاغہ کی اسناد اور مصادر کے عنوان سے جمع کیا ہے، جو سیّد رضیؒ سے قبل منظرِ عام پر آئی ہیں۔ اس حوالے سے سب سے بہترین کتاب محقق السیّد عبد الزہراء الحسینی الخطیب کی تالیف کردہ کتاب ''مصادرِ نہج البلاغہ واسانیدہ'' ہے۔ اس کتاب کی طرف رجوع کرنے والا اس حقیقت

[1] مروّج الذہب، ج ۲، ص ۴۱۹، ناشر دار الہجرۃ قم

[2] تذکرۃ الخواص، ص ۱۲۸

[3] البیان والتبیین، ج ۱، ص ۸۳

[4] مشاکلۃ الناس لزمانھم، ص ۱۵

https://downloadshiabooks.com/

سے بخوبی آگاہی حاصل کرتا ہے کہ ان خطبات کو نقل کرنے والے سیّد رضیؒ اکیلے نہیں ہیں۔ قابلِ توجّہ بات یہ ہے کہ اس کتاب میں نہج البلاغہ کے علاوہ ایک سو چودہ دوسری کتابیں بھی ذکر ہوئی ہیں، جن میں سے زیادہ کتابیں ان علماء کی ہیں، جو سیّد رضیؒ سے قبل زندگی گزار چکے ہیں، البتہ زیادہ معلومات حاصل کرنے کے لیے اہلِ ذوق اس کتاب کی طرف رجوع کر سکتے ہیں، کیوں کہ یہاں اس سے زیادہ تحریر کی گنجائش نہیں ہے۔ یہاں یہ نکتہ بھی قابل ذکر ہے کہ سیّد رضیؒ نے نہج البلاغہ کے خطبات کی وضاحت کرتے ہوئے پندرہ کتابوں کے نام لیے ہیں۔ [۱] جن سے سیّد رضیؒ نے نہج البلاغہ کی تالیف میں استفادہ کیا ہے۔ اس طرح ان کتابوں کے ساتھ مندرجہ بالا کتابوں کے مجموعے کو مدنظر رکھتے ہوئے نہج البلاغہ کی اسناد میں شک و تردّد کرنے کی کوئی گنجائش نہیں ہے۔

نہج البلاغہ کی شرحیں

اس مقدمے کی آخری بات مختصر طور پر اس کتاب کی شروح اور تراجم کے حوالے سے ہے، جو مسلم مفکرین نے سیّد رضیؒ کے دور سے لے کر اب تک کیے ہیں اور جوں جوں ہم سیّد رضیؒ کے زمانے سے دور ہوتے جاتے ہیں، اتنا ہی شروح، تفاسیر اور تراجم میں اضافہ ہوتا چلا جاتا ہے۔ اور یہ اس وجہ سے ہے کہ ہر دن نہج البلاغہ پر غور و خوض بڑھتا جا رہا ہے۔ نہج البلاغہ کے حوالے سے مختلف دروس اور سیمینار وغیرہ منعقد کیے جاتے ہیں جو ہمارے مدّعا پر دلالت کرتے ہیں۔ علّامہ امینیؒ مرحوم نے کتاب الغدیر میں سیّد رضیؒ کے حالاتِ زندگی پر روشنی ڈالتے ہوئے یوں تحریر فرمایا ہے: سیّد مرحوم کے زمانے سے لے کر آج تک نہج البلاغہ کی ستّر سے زیادہ شروح منظرِ عام پر آ چکی ہیں۔

علامہ امینیؒ نے ان شروح کے مؤلفین، ان کی تاریخ وفات اور تراجم کا اکیاسی (۸۱) شروح اور تراجم کے نام سے ذکر کیا ہے۔ [۲] ظاہر ہے کہ ان شروح میں سے ہر ایک نے قرآن مجید کی تفاسیر کی طرح نہج البلاغہ کی بھی مختلف زاویوں سے شرح و تفسیر کی ہے۔ کسی نے ادبی، کسی نے تاریخی اور کسی نے فلسفی، تربیتی اور اجتماعی مسائل پر سیر حاصل گفتگو کی ہے۔ مصادرِ نہج البلاغہ کے مؤلف نے اپنی کتاب میں ایک سو دس شروح اور تفاسیر کے نام لیے ہیں، بعض فضلا نے کتاب نامہ نہج البلاغہ

---

[۱] وہ کتابیں جن سے سیّد رضیؒ نے استفادہ کیا ہے حسب ذیل ہیں۔ ۲: البیان والتبیین مؤلف جاحظ۔ ۲: تاریخ طبری۔ ۳: الجمل مؤلف واقدی۔ ۴: المغازی مؤلف سعید ابن یحییٰ اموی۔ ۵: المقامات مؤلف ابی جعفر اسکافی۔ ۶: المقتضب مؤلف مبرد۔ ۷: حکایۃ ابی جعفر محمد ابن علی الباقر علیہم السلام۔ ۸: حکایۃ ثعلب عن ابن الاعرابی۔ ۹: خبر ضرار الضبائی۔ ۱۰: روایۃ ابی جحیفہ۔ ۱۱: روایۃ کمیل ابن زیاد النخعی۔ ۱۲: روایۃ مسعدۃ بن صدقۃ لخطبۃ الاشباح عن الصادق جعفرؑ ابنِ محمدؑ۔ ۱۳: روایۃ نوف البکالی۔ ۱۴: ماذکرہ ابوعبید القاسم بن سلام، من غریب الحدیث۔ ۱۵: ماوجد بخط ہشام بن الکلبی۔

[۲] الغدیر، ج ۴، ص ۱۸۴ تا ۱۹۳

https://downloadshiabooks.com/

میں تین سو ستر شروح، تراجم اور تفاسیر کا بھی ذکر کیا ہے۔[۱]

مگر اس کے باوجود اس کتاب کے لیے متعدد شروح اور بھی درکار ہیں تا کہ معانی کے جواہرات کو الفاظ کے صدف سے باہر نکالیں۔ نہج البلاغہ کے عظیم دریا میں غوطہ زن ہو کر معانی کے یاقوت کو باہر نکالیں، عصر حاضر اور مستقبل کی ضروریات کا حل پیش کریں، کیوں کہ نہج البلاغہ بھی امام علیؑ کی طرح وسیع اور عمیق ہے، جس تک پہنچنا آسان نہیں۔ البتہ جن شروح اور تراجم کی طرف اشارہ ہوا ہے وہ کامل اور جامع نہیں ہیں۔ بعض لوگوں نے نہج البلاغہ کے بعض حصوں کی شرح کی ہے، البتہ ان شروح میں سے بعض کامل و جامع شرحیں ہیں جن کو خاص امتیازات حاصل ہیں اور وہ عظیم علمی کام ہیں۔ ان میں سے ہم بعض کی طرف اشارہ کرتے ہیں:

۱۔ **''اعلام نہج البلاغہ''** علامہ امینیؒ کے بقول یہ سب سے پرانی شرح ہے۔ اس کے مؤلف ''علی بن الناصر'' ہیں، جو سیّد رضیؒ کے ہم عصر تھے۔

۲۔ **''منہاج البراعۃ''** مؤلف سعید الدین ھبۃ اللہ قطب راوندی چھٹی صدی ہجری کے علماء میں سے تھے۔

۳۔ **''شرح ابن ابی الحدید معتزلی''** بیس جلدوں پر مشتمل ہے۔ ساتویں صدی ہجری کے علماء میں سے تھے۔ یہ شرح نہج البلاغہ کی مشہور شروح میں سے ایک ہے۔

۴۔ **''شرح ابن میثم بحرانی''** ساتویں صدی ہجری کے علماء میں سے تھے، بہت جالب اور عمدہ شرح ہے۔

۵۔ **''منہاج البراعۃ''** مؤلف مرحوم حاج میرزا حبیب اللہ موسوی خوئی، چودہویں صدی ہجری کے علماء میں سے تھے، یہ شرح خوئی کے نام سے معروف ہے۔

۶۔ **''شرح شیخ محمد عبدہٗ''** اہلسنّت کے مشہور و معروف علماء میں سے تھے، جو تیرہویں صدی ہجری کے علماء میں سے تھے۔ عصرِ حاضر کے بعض علماء و فضلاء نے بھی نہج البلاغہ کی شروح تالیف کی ہیں، ان تمام کو یہاں بیان کرنا ممکن نہیں ہے۔

قابلِ توجّہ بات یہ ہے کہ **مرحوم محدث تہرانی** نے کتاب الذریعۃ میں نہج البلاغہ کے شارحین کے ایک سو چالیس نام تحریر کیے ہیں، اہل سنّت کی سولہ شروح کو بیان کیا ہے، جن میں سے سب سے قدیم شرح **فخر رازی** کی ہے، جو ۶۰۶ھ میں وفات پا گئے تھے۔[۲]

---

[۱] المعجم المفہرس اقتباس از نہج البلاغہ ص ۱۰

[۲] الذریعہ، ج ۱۴، ص ۱۱۱، ۱۶۰

https://downloadshiabooks.com/

''تمہید از سیّد رضیؒ قدس سرہ''

وجہ تدوین نہج البلاغہ

حمد و تعریف اُس خداوند کے لیے جس نے حمد کو نعمتوں کی قیمت، بلاؤں کے لیے پناہ گاہ، نعمت اور ابدی جنت تک پہنچنے کا وسیلہ اور اپنے فضل و کرم میں افزائش کا ذریعہ قرار دیا ہے۔ درود و سلام ہو پیغمبر رحمت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر جو رہبران الٰہی کے سردار، امّت کے لیے ایسا روشن چراغ ہے کہ جن کے سراسر وجود سے عظمت و بزرگواری چھلکتی ہے اور جن کی قامت میں عزت ،جن کے وجود کے سرچشمے میں عزت و افتخار، شاخوں میں عظمت و بلندی، حسب و نسب پُر برگ و ثمر ہیں اور ان کے اہلِ بیت علیہم السلام پر جو ظلمتوں سے نجات کے چراغ، امّت کی نجات کا وسیلہ، دین کی روشن علامت، فضیلت و برتری کا معیار ہیں، درود و سلام ہو۔

ایسا درود و سلام جو ان کی فضیلت و بزرگی کے برابر ہو، اور جو ان کے اعمال کی پاداش قرار پائے۔ ایسی پاداش جو کہ اصل و فرع کی پاکیزگی کے ساتھ مناسبت رکھتی ہو۔ اُن پر درود و سلام ہو، اس وقت جب صبح کی سفیدی رات کے گریباں کو چاک کرتی ہے، ستارے طلوع و غروب کرتے ہیں۔ میں نے اپنی جوانی کے آغاز میں خصائص ائمہ علیہم السلام کے نام سے ایک کتاب تالیف کی جو ان ہستیوں کے دیدہ زیب اور دل نشین کلام پر مشتمل تھی۔ اس کام کے سبب کو کتاب کے آغاز میں ذکر کیا ہے اور اسی کو عنوانِ کلام قرار دیا ہے۔

اس کتاب میں امیر المومنینؑ کی خصوصیات کو جمع کرنے کے بعد زمانے کے حوادث اور مشکلات کی بنا پر تحریر کو پایۂ تکمیل تک نہیں پہنچا سکا۔ اس کتاب کو چند ابواب میں اور ابواب کو چند فصلوں میں تقسیم کیا ہے۔ کتاب کے آخر میں ایک فصل امامؑ کے دیدہ زیب کلام پر مشتمل ہے۔ البتہ وہ کلماتِ قصار جن میں موعظہ، حکمت، تمثیلات آداب وغیرہ شامل تھے، نہ تو طولانی خطبات اور نہ ہی وسیع مکتوبات۔ کچھ دوستوں نے اس کو دیدہ زیب اور مختلف حوالوں سے تعجب آمیز سمجھا۔ اور مجھ سے

https://downloadshiabooks.com/

خواہش ظاہر کی کہ میں کوئی ایسی کتاب تالیف کروں جو امیر المومنین علیہ السلام کے مختلف خطبات، مکتوبات، مواعظ اور آداب پر مشتمل ہو، کیوں کہ ایسی کتاب فصاحت و بلاغت کا شاہکار ثابت ہوگی، جس میں عربی ادب کے جوہر نیز دینی اور دنیاوی معاملات پر ایسے درخشاں نکات ہوں، جو کسی کتاب میں تالیف نہیں ہوئے ہوں۔ کیوں کہ امیر المومنینؑ کے علاوہ کسی اور کے کلام میں اتنی وسعت نہیں ہوسکتی۔ آپ کی شخصیت فصاحت کا سرچشمہ اور بلاغت کی ولادت گاہ ہے۔ بلاغت کے اسرار آپ کے وسیلے سے آشکار ہوئے اور اس کے اصول وضوابط آپ ہی نے مرتب کیے ہیں۔ ہر مقرر اور خطیب نے آپ کی اقتدا کی اور واعظوں نے آپ کے کلام سے امداد طلب کی ہے۔ اسی بنا پر آپ ہمیشہ آگے ہیں اور باقی سارے پیچھے، آپ مقدم ہیں اور لوگ آپ سے مؤخر، کیوں کہ آپ کا کلام ایک ایسا کلام ہے کہ جس میں علمِ الٰہی کے آثار اور کلامِ رسولؐ کی خوشبو پائی جاتی ہے۔

میں نے ان دوستوں کی دعوت کو قبول کرتے ہوئے کام کا آغاز اس یقین کے ساتھ کیا کہ اس کے معنوی فوائد بہت زیادہ ہیں اور عنقریب یہ کتاب چھا جائے گی اور اس کا اجر میرے لیے ذخیرۂ آخرت ہوگا۔ میرا یہ مقصد بھی تھا کہ دیگر تمام فضائل کے ساتھ امیر المومنینؑ کی شخصیت کو اس حوالے سے بھی بیان کیا جائے کہ آپؑ وہ واحد شخصیت ہیں کہ گزشتہ لوگوں میں سے صرف آپؑ کا کلام باقی ہے، آپؑ کے فرمودات فصاحت و بلاغت کی آخری سرحد کو چھو رہے ہیں۔ آپؑ کا کلام ایک ایسا گہرا سمندر ہے، جس کی تہہ تک کسی فصیح و بلیغ انسان کا کلام بھی نہیں اتر سکتا۔ امامؑ کا کلام ہمارے لیے سرمایہ افتخار ہے۔ اس حقیقت کو بیان کرنے کے لیے میں معروف شاعر فرزدق کے قول کو نقل کر رہا ہوں کہ جو اپنے آباء واجداد پر فخر ومباہات کرتے ہوئے جریر نامی شخص سے یوں کہتا ہے

"أُولٰئِكَ آبَائِيْ فَجِئْنِيْ بِمِثْلِهِمْ إِذَا جَمَعَتْنَا يَا جَرِيْرُ الْمَجَامِعُ"

"فضیلتیں مِرے اجداد کی بیاں کرنا جریر، رُتبے سرِ بزم تُو عیاں کرنا اے جریر! وہ میرے آباء واجداد تھے، اگر ممکن ہو تو کسی اجتماع کے موقع پر ایسے اپنے آباء واجداد کا بھی ذکر کرنا۔"

میں نے دیکھا کہ امامؑ کے فرمودات کے تین بنیادی محور ہیں۔ اوّل خطبات اور اوامر، دوم مکتوبات و رسائل، سوم مواعظ اور حکمت آمیز اقوال۔ اسی بنا پر (توفیق الٰہی کے ساتھ) عزم وارادہ کیا کہ پہلے دیدہ زیب خطبات، پھر جاذبِ نظر مکتوبات، اس کے بعد حکمت آمیز کلماتِ قصار کا انتخاب کیا جائے۔ ان میں سے ہر ایک کے لیے ایک باب قرار دیا اور ان کے لیے مخصوص صفحات قرار دیے تاکہ آئندہ بھی اگر کوئی کلام ہاتھ آئے، تو اسے اس باب میں اضافہ کردوں اور جب بھی کوئی ایسا کلام جس کا تعلق مناظرے یا کسی سوال کے جواب سے تھا یا کسی اور حوالے سے تھا، ہاتھ آیا اور وہ ان مذکورہ تین اقسام کلام اور ابواب سے نہیں ہوتا تھا، تو اسے ایسے باب میں رکھ دیا، جو زیادہ مناسب تھا، کہ اس میں رکھا جائے۔

https://downloadshiabooks.com/

لہٰذا بعض جگہ غیر منظم اور غیر مرتّب سا محسوس ہوتا ہے، اس کی وجہ یہ ہے کہ میرے نزدیک حضرتؑ کے عظیم جملوں کو جمع کرنا تھا ان میں ربط برقرار رکھنا میرا ہدف نہیں تھا۔ امام علیؑ کا مقام ایسا تعجب خیز اور بے نظیر ہے کہ اگر کسی نے آپؑ کے کلام میں موجود زہد پر غور وفکر کرنا شروع کیا (البتہ وہ یہ نہ جانتا ہو کہ یہ کلام کہنے والا وہ عظیم انسان ہے، جس کے سامنے سب سرِ تسلیم خم کرتے ہیں) تو یقیناً وہ یہ گمان کرے گا کہ کلام ایسے زاہد کا ہے جس نے زہد کی وادی کے علاوہ اور عبادتِ پروردگار کے علاوہ کوئی کام نہیں کیا اور اسے یقین ہو جاتا ہے کہ یہ شخص معاشرے سے دور گوشۂ خلوت، کسی پہاڑ کے دامن میں رہتا ہے۔ جو اپنی آواز کے علاوہ کسی آواز کو نہیں سنتا۔ وہ دوسروں کو نہیں دیکھتا اور ہمیشہ مشغولِ عبادت ہے۔ وہ یہ یقین نہیں کر سکتا کہ یہ کلام اُس کا ہے جو میدانِ جنگ میں تلوار اٹھاتا ہے اور دشمن کے لشکر سے واپس لوٹتے وقت اس کی تلوار سے خون ٹپکتا تھا اور وہ اس حال میں بھی زاہدوں کا سردار اور صالحین سے بلند تر ہے۔

یہ حضرتؑ کے فضائل میں سے ہے کہ ان کے اندر متضاد صفات جمع تھیں یعنی متضاد صفات کا ایک جگہ جمع ہونا آپؑ ہی کا خاصہ تھا، بارہا ایسا ہوا کہ میں دوستوں سے اس پہلو کا تذکرہ کرتا تھا جو خود غور وخوض کے لیے عظیم پہلو ہے۔ یہ نکتہ بھی قابلِ ذکر ہے کہ بعض اوقات کلام کے درمیان الفاظ اور مفاہیم کی تکرار ہوئی ہے اور یہ میری مجبوری تھی کیونکہ امامؑ کے کلام سے مربوط روایات میں شدید اختلاف ہے۔ کبھی ایک کلام کو روایت میں پایا تو اس کو اسی طریقے سے نقل کر دیا اور اس میں پھر دوسری روایت ملی تو وہ پہلی روایت کی طرح نہیں تھی یا اس میں مطالب زیادہ ہونے کی وجہ سے یا پھر دیدہ زیب الفاظ کی وجہ سے اس کو دوبارہ ذکر کرنا ضروری تھا۔

اس کے علاوہ یہ بھی ممکن ہے طویل مدّت کام کرنے کی وجہ سے کچھ حصہ بھول کر تکرار کر دیا ہو البتہ عمداً ایسا نہیں ہوا ہے۔ اس کے باوجود میں کبھی بھی دعویٰ نہیں کر سکتا کہ میں نے امامؑ کے تمام کلام کا احاطہ کر لیا ہے۔ یعنی ایسا دعویٰ نہیں ہو سکتا کہ حضرتؑ کا کوئی کلام میرے ہاتھ سے نہیں رہا، بلکہ عین ممکن ہے جو جمع کر دیا ہے اس سے زیادہ وہ کلام ہو جس تک میری رسائی نہیں ہو سکی، کیوں کہ میری ذمّے داری ان گم شدہ گوہروں کی تلاش ہے اور خدا سے دعا ہے کہ وہ اس راہ میں رہنمائی عطا کرے۔

کتاب پایۂ تکمیل تک پہنچی تو سوچا اس کتاب کا نام نہج البلاغہ رکھا جائے، کیونکہ یہ کتاب بلاغت کے دروازوں کو کھول دیتی ہے اور اس کی آرزو کو پورا کر دیتی ہے۔ یہ کتاب مفکرین، علماء اور طالب علم سب کی ضرورت ہے۔ اس کتاب میں ادیب اور زاہد دونوں کی تسکین مزاج پائی جاتی ہے امامؑ کے کلام میں تعجب کی بات یہ ہے کہ توحید، عدل اور مخلوق سے خدا کی مشابہت کا انکار وغیرہ وہ موضوعات ہیں، جن پر بات کرنا مشکل ہے، مگر ہر تشنۂ معرفت اور ہر بیمار کو شفاء اور زنگ آلود دلوں کو

https://downloadshiabooks.com/

صاف کرنے کے لیے یہ کلام معجزہ ہے۔ میں خداوندِ عالم سے لغزشوں سے بچنے کے لیے توفیق چاہتا ہوں۔ وہ مجھے اس راہ میں ہمّت و طاقت عطا کرے اور زبان کی خطا سے پہلے فکر کی خطا اور خطائے قدم سے پہلے خطائے زبان سے پناہ مانگتا ہوں۔ وہی میرے لیے کافی ہے اور میرے لیے بہترین محافظ اور مددگار ہے۔

❁❁❁❁❁

https://downloadshiabooks.com/

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

وَبِہٖ نَسۡتَعِیۡنُ

پہلا خطبہ

یہ خطبہ نہج البلاغہ کے اہم ترین خطبات میں سے ایک ہے، [1] جو اس کتاب کے آغاز میں ہے اور مرحوم سیّد رضیؒ کے حسنِ انتخاب کی علامات میں سے ایک علامت ہے۔ یہ خطبہ اسلامی تصوّر کائنات کا مکمل نصاب ہے جس میں خداوند متعال کی صفاتِ کمال وجلال اور اَسرار و رموز سے آغاز ہوتا ہے اور پھر عمومی طور پر کائنات کی خلقت، آسمان وزمین کی خلقت، فرشتوں کی خلقت، پھر حضرت آدمؑ کی خلقت، فرشتوں کے سجدے کی داستان، ابلیس کی مخالفت اور زمین پر حضرت آدمؑ کی آمد کا تذکرہ ہے۔ خطبے کے دوران پیغمبروں کی بعثت اور اس کا فلسفہ، آخر الامر رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلّم کی بعثت، قرآن مجید کی عظمت اور سنّت رسولؐ کی اہمیت پر گفتگو کی ہے، اسلامی دستورات میں سے فروعِ دین اور اس میں سے بھی حج کو ایک عظیم الٰہی فریضے کے طور پر بیان کیا ہے۔ اس خطبے کے ذریعے سے ہمارے لیے اسلام کے اہم ترین مسائل کے بارے میں ایک جامع تصّور اور بہت سے اہم مسائل کا حل بیان کیا گیا ہے۔ ایک اعتبار سے یہ خطبہ قرآن مجید میں موجود سورۂ فاتحہ کی مانند ہے۔ جس میں نہج البلاغہ کے تمام مندرجات کی ایک فہرست موجود ہے۔ اس خطبے میں تمام خطبات، مکتوبات اور کلماتِ قصار کی ایک مختصر تجلی پائی جاتی ہے۔ ہم نے خطبے کو پندرہ حصوں میں تقسیم کیا ہے پھر ہر حصے کی وضاحت اور تشریح بیان کی ہے اور آخر میں حاصلِ کلام کو بیان کیا ہے۔

https://downloadshiabooks.com/

پہلا حصّہ

بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

وَمِنْ خُطْبَةٍ لَهُ عَلَيْهِ السَّلامُ

"يَذْكُرُ فِيهَا ابْتِدَاءَ خَلْقِ السَّمَاءِ وَ الأَرْضِ وَ خَلْقَ آدَمَ وَ فِيهَا ذِكْرُ الْحَجِّ وَ تَحْتَوِي عَلَى حَمْدِ اللهِ وَ خَلْقِ الْعَالَمِ وَ خَلْقِ الْمَلَائِكَةِ وَ اخْتِيَارِ الأَنْبِيَاءِ وَ مَبْعَثِ النَّبِيِّ وَ الْقُرآنِ وَ الأَحْكَامِ الشَّرْعِيَّةِ"

''جس میں آسمان وزمین کی خلقت کی ابتدا اور خلقت آدم علیہ السلام کے تذکرے کے ساتھ حج بیت اللہ کی عظمت کا بھی ذکر کیا گیا ہے۔ یہ خطبہ حمد وثنائے پروردگار، خلقتِ عالم، تخلیقِ ملائکہ، انتخاب انبیاء، بعثتِ سرکارِ دوعالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم، عظمت قرآن اور مختلف احکامِ شرعیہ پر مشتمل ہے۔''

"اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِي لَا يَبْلُغُ مِدْحَتَهُ الْقَائِلُونَ، وَ لَا يُحْصِي نَعْمَاءَهُ الْعَادُّونَ، وَ لَا يُؤَدِّي حَقَّهُ الْمُجْتَهِدُونَ، الَّذِي لَا يُدْرِكُهُ بُعْدُ الْهِمَمِ، وَلَا يَنَالُهُ غَوْصُ الْفِطَنِ، الَّذِي لَيْسَ لِصِفَتِهِ حَدٌّ مَحْدُودٌ، وَ لَا نَعْتٌ مَوْجُودٌ، وَ لَا وَقْتٌ مَعْدُودٌ وَ لَا أَجَلٌ مَمْدُودٌ، فَطَرَ الْخَلَائِقَ بِقُدْرَتِهِ، وَنَشَرَ الرِّيَاحَ بِرَحْمَتِهِ، وَ وَتَّدَ بِالصُّخُورِ مَيَدَانَ أَرْضِهِ"

''ساری تعریف اُس اللہ کے لیے ہے، جس کی مدحت میں بولنے والوں کے تکلم کی رسائی نہیں ہے اور اس کی نعمتوں کو گننے والے شمار نہیں کر سکتے ہیں۔ اس کے حق کی ادائیگی کی کوشش کرنے والے بھی ادا نہیں کر سکتے ہیں۔ نہ ہمتوں کی بلندیاں اس کا ادراک کر سکتی ہیں اور نہ ذہانتوں کی گہرائیاں اس کی تہہ تک جا سکتی ہیں۔ اس کی صفت ذات کے لیے نہ کوئی معین حد ہے نہ توصیفی کلمات، نہ مقررہ وقت ہے اور نہ آخری مدّت۔ اس نے تمام مخلوقات کو صرف اپنی قدرت کاملہ سے پیدا کیا ہے اور پھر اپنی رحمت ہی سے ہوائیں چلائی ہیں اور زمین کی حرکت کو پہاڑوں کی میخوں سے سنبھال کر رکھا ہے۔''

https://downloadshiabooks.com/

شرح وتفسیر

اُس کی ذات کی بلندی تک فکر کی پرواز ممکن نہیں

اس خطبے میں اگر اجمالی طور پر دیکھا جائے تو امیر المومنین حضرت علی علیہ السلام نے پروردگارِ عالم کے بارہ اوصاف کو منظم اور خوبصورت طریقے سے بیان فرمایا ہے۔

پہلے مرحلے میں: یہ معلوم ہوتا ہے کس طرح بندے خداوند عالم کی مدح وثنا اور شکر بجالانے سے عاجز ہیں۔ اس میں تین اوصاف کی طرف اشارہ ہوا ہے۔

دوسرے مرحلے میں: اس حقیقت کو بیان کرتے ہیں کہ اُس کی مقدس ذات ہر حوالے سے لامحدود اور اس کی نعمتیں بے پناہ ہیں۔ ہم اُس کی ذات کو درک کرنے سے عاجز ہیں، نیز اس کے حق کو ادا کرنے سے قاصر ہیں۔ اس مرحلے میں دو اوصاف کی طرف اشارہ ہوا ہے۔

تیسرے مرحلے میں: اس بات کی طرف رہنمائی ہے کہ اُس کی ذاتِ پاک ہر اعتبار سے لامحدود اور اسی وجہ سے اس کی نعمتیں بھی بے حد وحساب ہیں اور اس بارے میں ہماری عاجزی کہ اسے درک نہیں کر سکتے اور اُس کے حق کو ادا نہیں کر سکتے۔ یہی وجہ ہے کہ اس مرحلے میں چار اوصاف کی طرف اشارہ ہے۔

چوتھے مرحلے میں: یہ خطبہ کائنات اور مخلوقات کی خلقت کی طرف پلٹتا ہے۔ گویا اس حقیقت کو بیان کرتا ہے کہ اُس کی ذات کو صرف اسی طریقے سے پہچان سکتے ہیں اور یہ ہماری سب سے بڑی اور آخری کوشش ہے۔ اس حصّے میں تین اوصاف کی طرف اشارہ ہوا ہے۔ یہ خطبہ اس بات کا گواہ ہے کہ عالم بشریت کے اس عظیم معلّم نے اپنے خطبے میں ایسی تعبیرات کا انتخاب فرمایا ہے جو بالکل طے شدہ اور ایک خاص نظم وضبط کے ساتھ ہیں۔ اس اجمالی خاکے کے بعد مندرجہ بالا بارہ اوصاف کو بیان کرنے کے لیے خطبے پر دوبارہ غور کرتے ہیں۔

خدا کی پہلی صفت

امامؑ نے گفتگو کا آغاز حمد الٰہی سے کرتے ہیں اور اس کے مقابلے پر عاجزی کا اظہار کرتے ہوئے کہتے ہیں:

https://downloadshiabooks.com/

"اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِی لَا یَبْلُغُ مِدْحَتَهُ الْقَائِلُوْنَ"۔[۱]

''حمد و تعریف اُس اللہ کے لیے، جس کی مدحت میں بولنے والوں کے تکلم کی رسائی نہیں ہے۔''

واضح رہے کہ خداوند متعال کے اوصافِ کمال و جمال حدودِ عقل سے بالاتر ہیں۔ جو کچھ انسان اور فرشتے اس کی حمد و ثناء میں کہتے ہیں، ان کی اپنی استعدادِ معرفت و شناختِ پروردگار کے مطابق ہوتا ہے ورنہ اُس کی ذات بے مثال ہے اور کمالات لامحدود۔ جب خود پیغمبر ختمی مرتبتؐ جو پیغمبرانِ الٰہی میں سب سے بلند مرتبے پر ہیں، خداوند متعال کی معرفت سے عاجزی کا اظہار کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

"مَا عَرَفْنَاكَ حَقَّ مَعْرِفَتِكَ"۔[۲]

خدایا! ہم تیری معرفت نہیں رکھتے، جس طرح معرفت رکھنے کا حق ہے، تو دوسرے لوگ کس طرح اُس کی معرفت کے دعویدار ہو سکتے ہیں؟ اور جب انسان اُس کی معرفت سے عاجز ہو تو کس طرح اُس کی حمد و ثنا بجا لا سکتا ہے؟ بنابرایں سب سے برتر حمد وہی ہے جسے مولاؑ نے بیان فرمایا ہے۔ یعنی اُس کی حمد و ثنا کرنے سے عاجزی کا اظہار۔ اس اعتراف کے ساتھ کہ کوئی بھی قاری حمد و ثنا کی بلندی تک نہیں پہنچ سکتا۔ حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام کی ایک حدیث ہے کہ خداوند عالم نے حضرت موسیٰ علیہ السلام پر وحی بھیجی، اے موسیٰ! میرے شکر کے حق کو ادا کرو۔ عرض کی، پروردگار! کس طرح تیرے شکر کا حق بجا لاؤں؟ کیوں کہ جب تیرا شکر بجا لاتا ہوں تو یہ خود بھی ایک نعمت ہے، جو تُو نے مجھے عطا کی ہے (شکر کرنے کی توفیق خود ایک نئی نعمت ہے جس سے تو نے نوازا ہے، اس کے لیے ایک اور شکر ادا کرنا ضروری ہے) فرمایا:

"یَا مُوْسٰی اَلْآنَ شَكَرْتَنِی حِیْنَ عَلِمْتَ اَنَّ ذٰلِكَ مِنِّی۔۔۔۔"[۳]

''اے موسیٰؑ! تم نے اب میرا شکر ادا کیا ہے کہ جب تم نے یہ جان لیا کہ یہ بھی میری جانب سے ہے اور تم شکر

---

[۱] حمد، مدح اور شکر کے الفاظ کی توضیح میں علمائے لغت، مفسرین قرآن اور شارحین نہج البلاغہ میں کافی فرق ہے۔ لیکن ان کے درمیان مشہور یہ ہے کہ حمد ہر قسم کی وہ تعریف ہے جو نیک اور اچھے کاموں کے مقابل اپنے اختیار سے کی جاتی ہے۔ جبکہ مدح کا مفہوم بہت وسیع ہے۔ اس کی تعریف میں اختیاری اور غیر اختیاری تمام کیفیات جیسے خوبصورتی کی مدح شامل ہیں، لیکن شکر اس جگہ ہے جہاں کسی کو کوئی نعمت میسر ہو تو وہ اپنے رب کا شکر ادا کرے۔ (اس حوالے سے بہتر معلومات کے لیے تفسیر مجمع البحرین لسان العرب سے رجوع کیا جائے۔ مفردات، شرحِ ابن میثم، شرح علاّمہ خوئی) قرآن اور نہج البلاغہ کے بعض مفسرین منجملہ زمخشری نے کشاف میں اور ابن ابی الحدید نے اپنی شرح میں حمد اور مدح کو ایک ہی شمار کیا ہے۔ ان دونوں کے درمیان فرق کے قائل نہیں ہوئے ہیں۔ البتہ پہلی تفسیر صحیح دکھائی دیتی ہے۔

[۲] مرحوم علامہ مجلسیؒ، اپنے مفصل بیانات میں بحار الانوار کی احادیث کی توضیح کرتے ہوئے فرماتے ہیں، کہ محقق طوسیؒ نے پیغمبر اکرمؐ سے بغیر سند کے نقل کیا ہے، "مَا عَبَدْنَاكَ حَقَّ عِبَادَتِكَ وَمَا عَرَفْنَاكَ حَقَّ مَعْرِفَتِكَ"، بحار الانوار، ج ۶۸، ص ۲۳۔

[۳] اصولِ کافی، ج ۲، ص ۹۸، حدیث ۲۷

https://downloadshiabooks.com/

بجالانے سے عاجز ہو۔''

ایک اعتبار سے جب انسان کہتا ہے ''الحمدللہ'' تمام تر حمد وتعریف اللہ کے لیے ہے، پھر حمد وتعریف کا کوئی مرتبہ باقی نہیں بچتا ہے مگر یہ کہ تمام تر حمد وتعریف اُسی کے لیے مختص ہوجاتی ہے۔ اسی لیے حدیث میں ہے کہ حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام مسجد سے باہر تشریف لائے تو دیکھا کہ آپؑ کی سواری گم ہوگئی ہے آپ نے فرمایا، اگر خدانے اسے مجھے واپس لوٹا دیا تو اس کے شکر کا حق ادا کروں گا، کچھ دیر بعد امامؑ کی سواری واپس آگئی۔ اس موقع پر فرمایا: ''الحمدللہ'' ایک شخص نے کہا، آپؑ پر قربان ہوجاؤں، کیا آپؑ نے نہیں فرمایا تھا کہ میں خدا کے شکر کا حق ادا کروں گا۔ امامؑ نے فرمایا۔ کیا تم نے نہیں سنا کہ میں نے ''الحمدللہ'' کہا ہے۔[1]

خدا کی دوسری صفت

''وَلَا يُحْصِي نَعْمَائَهُ الْعَادُّوْنَ''

حساب کرنے والے ماہرین کبھی بھی اُس کی نعمتوں کو شمار نہیں کرسکتے، کیوں کہ خداوند متعال کی مادّی، معنوی، ظاہری، باطنی، انفرادی اور اجتماعی نعمتیں اتنی زیادہ ہیں، جو شمار نہیں کی جاسکتیں۔ انسان کے جسم میں اوسطاً، ایک کروڑ ارب خلیے (سیلز) ہیں اور ان میں سے ہر ایک زندہ وجود رکھتا ہے یعنی ایک انتہائی پیچیدہ نظام کے تحت ان میں سے ہر ایک نعمتِ الٰہی ہے، جن کو دس ہزار سال میں بھی شمار کرنا ممکن نہیں ہے۔

پس جب انسان اپنے اس مختصر وجود میں پوشیدہ نعمتوں کو شمار نہیں کرسکتا، تو یہ کیسے ممکن ہوسکتا ہے کہ وہ بیرونی نعمتوں کو جو خواہ مادّی شکل میں ہوں یا معنوی شکل میں، شمار کرسکے گا۔ پھر اصولاً ہم اُس کی تمام نعمتوں سے آگاہ بھی نہیں ہیں کہ شمار کرنے کی کوشش کرسکیں۔ اُس کی بے شمار نعمتیں ایسی ہیں کہ جو ہمیں ہمیشہ گھیرے رہتی ہیں اور ہم سے کبھی زائل نہیں ہوتیں، اسی لیے ہم ان سے بے خبر رہتے ہیں (واضح رہے کہ کسی نعمت کا احساس اس کے ختم ہونے کے بعد ہوتا ہے) اس سے بڑھ کر اہم بات یہ ہے کہ جیسے جیسے انسانی علم ودانش کے دامن میں وسعت ہورہی ہے خداوند متعال کی نئی نئی نعمتوں کا انکشاف ہورہا ہے یہی وہ چیزیں ہیں جو مولاؑ کے اس قول کی تصدیق کرتی ہیں کہ: ''حساب کرنے والے اس کی نعمتوں کا شمار کرنے پر قادر نہیں۔'' جملہ ممکن ہے کہ سابقہ جملے کی علّت کے طور پر بیان کیا گیا ہو، یعنی جب اُس کی نعمتوں کا شمار ہی ممکن نہیں تو اس کی مدح وستائش کا حق کیسے ادا کیا جاسکتا ہے۔ افسوس کچھ بے خبر، ستمگر، غاصبوں نے اُس کی بہت سی نعمتوں کو غصب کر رکھا ہے یا

---

[1] اصولِ کافی، ج۲، ص۹۷، حدیث ۱۸

اِسراف وتبذِیر سے برباد کر کے مخلوقِ خدا کے ایک بڑے گروہ کو زحمت وتکالیف میں مبتلا کر دیا ہے، لیکن یہ اُس کی نعمتوں کے محدود ہونے کی ہرگز دلیل نہیں ہے۔

خدا کی تیسری صفت

"وَلَا يُؤَدِّي حَقَّهُ الْمُجْتَهِدُونَ"

اُس کے حق کو سعی وتلاش کرنے والے ادا نہیں کر سکتے ہیں (چاہے وہ جتنا خود کو مشکل میں ڈالیں) یہ جملہ درحقیقت پہلے جملے کا نتیجہ ہے۔ جب اُس کی نعمتوں کو شمار نہیں کر سکتے تو پھر کس طرح اس کے حق کو ادا کر سکتے ہیں۔ دوسری تعبیر میں، اُس کا حق اُس کی عظمت کے مطابق ہے، جبکہ شکر اور حمد، ہماری محدود طاقت اور توانائی کے مطابق ہے۔ اسی دلیل کی بنا پر یہ ہمارا شکر اس کا بدلہ نہیں ہے اور صرف عمل کے میدان میں اُس کی مدح وثنا سے عاجز نہیں ہیں بلکہ فکر وخیال کے میدان میں بھی اس کی ذات کو درک کرنے سے عاجز ہیں۔ اس دلیل کی بنیاد پر مولاؑ نے دو اوصاف کا اضافہ کیا ہے۔

"اَلَّذِي لَا يُدْرِكُهُ بُعْدُ الْهِمَمِ وَلَا يَنَالُهُ غَوْصُ الْفِطَنِ"[1]

''وہ خدا جس کی ذات کی گہرائی کو بلند افکار اور دور اندیش افراد درک نہیں کر سکتے ہیں؛ علم ودانش کے دریا میں غوطہ زن انسان بھی اُس ہستی کے کمال تک رسائی حاصل نہیں کر سکتا۔''

بعد الھمم اور غوص الفطن کی تعبیر گویا اس حقیقت کی طرف اشارہ ہے کہ اگر بلند افکار ذاتِ الٰہی سے عالمِ مادہ وخاکی کی جانب محوِ حرکت ہوں قوسِ صعودی (عالمِ مادّہ سے اللہ کی جانب) میں اور مضبوط فکر واندیشہ افراد قوسِ نزولی (اللہ سے عالمِ مادّہ کی جانب) میں سفر کریں تو ان میں سے کوئی بھی کسی مقصد تک پہنچ نہیں سکتا اور اُس کی ذات کو درک کرنے سے عاجز اور ناتواں ہیں۔ پھر امامؑ نے اس دلیل کو بیان کیا کہ انسان کس طرح اُس کی ذات کی گہرائی کو درک کرنے سے عاجز ہے۔ فرمایا:

[1] "ھمم" ہمّت کی جمع ہے۔ مقائیس اللغۃ کے مطابق پگھل جانا، جاری ہونا، اور حرکت کرنے کے معنی میں ہے۔ غم واندوہ کو اسی وجہ سے ''ہمّ'' کہا گیا ہے جس سے انسان کا جسم وبدن پگھل جاتا ہے۔ پھر اہمیت رکھنے والی ہر بات جو انسان کی فکر وخیال کو مشغول رکھتی ہو، اس پر ھم اور ہمت کا اطلاق ہوا ہے۔ (مفردات میں بھی اس طرح کا بیان ہے) ''غوص'' پانی میں ڈوب جانا یا پھر اہم کام میں وارد ہونے کو کہا گیا ہے۔ ''فطن'' فطنہ کی جمع ہے فتنہ کے وزن پر۔ لسان العرب کے مطابق فہم، استعداد اور صلاحیت کے معنیٰ میں ہے۔

https://downloadshiabooks.com/

"اَلَّذِیْ لَیْسَ لِصِفَتِهٖ حَدٌّ مَحْدُوْدٌ، وَلَا نَعْتٌ [۱] مَوْجُوْدٌ، وَلَا وَقْتٌ مَعْدُوْدٌ وَلَا اَجَلٌ [۲] مَمْدُوْدٌ"

"وہ ایسی ہستی ہے جس کی صفات کے لیے کوئی سرحد نہیں ہے؛ اُس کے لیے توصیفی الفاظ ہیں، نہ اس کی ابتدا کے لیے وقت ہے نہ اس کی کوئی مدت ہے۔" یعنی یہ کس طرح ممکن ہے کہ اُس کی ذات کی معرفت حاصل کر سکیں جبکہ ہماری فکر بلکہ ہماری تمام ہستی محدود ہے اور محدود اشیاء کے علاوہ اشیاء کا ادراک نہیں کر سکتی جبکہ ذاتِ باری تعالیٰ ہر طریقے سے لامحدود ہے اور اس کی صفات بے کراں، ازل و ابد اس کی گرفت میں ہیں۔ نہ اُس کی کوئی حد ہے نہ ایسی صفت جس کو درک کیا جا سکے نہ اُس کا آغاز ہے نہ انجام، اُس کی ذات ہی نہیں، بلکہ اُس کی صفات بھی لامحدود ہیں۔

اُس کا علم لامحدود اور قدرت بے پایاں ہے، بالکل اسی طرح جس طرح اُس کی ذات لامحدود ہے۔ دوسرے الفاظ میں وہ ہستی مطلق ہے اور اس کے لیے کوئی قید اور شرط نہیں ہے۔ اس لیے کہ اگر اس کے لیے کوئی قید یا حد مقرر کر دی جائے تو وہ ذات "مرکب" ہو جائے گی اور ہر "مرکب" وجود ممکن الوجود ہوتا ہے واجب الوجود نہیں ہو سکتا۔ اس بنا پر واجب الوجود ذات ہر لحاظ سے لامحدود ہوتی ہے اور اسی دلیل کی بنا پر یکتا و یگانہ اور بے مثل ہوتی ہے، کیونکہ دو لامحدود ذاتوں کا ہونا ایک وقت میں ناممکن ہے، کیونکہ دوئی کی صورت میں دونوں کی محدودیت لازم ہو جاتی ہے ہر ایک دوسرے کے وجود کی نفی کرتا ہے۔ (غور کیجیے)

گزشتہ جملے میں خدا کی صفاتِ جمال و جلال (صفاتِ ثبوتی اور سلبی) کو بیان کرنے کے بعد پروردگارِ عالم کے فعل کی صفات بیان کرتے ہوئے فرمایا:

"فَطَرَ [۳] الْخَلَائِقَ بِقُدْرَتِهٖ، وَنَشَرَ الرِّيَاحَ بِرَحْمَتِهٖ، وَوَتَّدَ [۴] بِالصُّخُوْرِ [۵] مَيَدَانَ [۶] اَرْضِهٖ"

---

[۱] "نعت"، خلیل ابن احمد کے بقول کسی چیز کی نیک صفات کے ذریعے توصیف بیان کرنا، جب کہ وصف نیکی اور بدی دونوں کے لیے استعمال ہوتا ہے۔

[۲] اجل: یعنی کسی چیز کا آخر یا آخری انجام چاہے وہ انسان کی عمر کے بارے میں ہو یا کسی اور چیز کے لیے جیسے وعدہ پورا کرنے یا قرض ادا کرنے کا وقت قریب ہونے کے معنی میں ہے۔

[۳] فَطَرَ مادّہ فَطر سے بروزن۔ سطر ہے، راغب مفردات میں کہتے ہیں کہ لمبائی میں کسی چیز کو شگافتہ کرنا ہے۔ روزے میں وقت مقررہ پر کھانا کھانے کو افطار کہا جاتا ہے، کیونکہ روزے کی حالت اس سے شگافتہ ہو جاتی ہے۔ اور یہ ایجاد و ابداع اور تخلیق کے معنی میں آیا ہے، گویا عدم کے پردے کو چاک کر کے اسے وجود بخشا ہے۔

[۴] وَتَّدَ، وَتد کے مادّے سے وَقْت کے وزن پر ہے یعنی کسی چیز کا ثابت کرنا جیسے کیل (میخ) کسی چیز کو مضبوط کر دیتی ہے اور اسے روک دیتی ہے البتہ کبھی یہ وَقْت کے وزن پر آیا ہے اور کبھی وَتَد، سَبَد کے وزن پر آیا ہے۔

[۵] صُخُور، صَخْرہ کی جمع ہے، لسان العرب کے مطابق سخت چٹان کو کہتے ہیں۔

[۶] مَیَدان، مَیْد کے مادّے سے ہے یعنی تحرک اور اضطراب، مَیَدان، ضَرَبان کے وزن پر اسی دھڑکن کے معنی میں ہے اور "مَیدان" خَیرَان کے وزن پر وسیع فضا کے معنیٰ میں ہے جس کی جمع میادین ہے۔

https://downloadshiabooks.com/

اپنی قدرت سے مخلوقات کو خلق کیا، ہواؤں کو اپنی رحمت سے متحرک کیا اور انھیں پھیلا دیا اور زمین کے اضطراب کو پہاڑوں کے ذریعہ دور کیا۔ مذکورہ بالا تعبیرات پر چند آیات قرآنی دلالت کرتی ہیں، جیسے "فَطَرَ الْخَلَائِقَ بِقُدْرَتِهِ" آیت "فَاطِرِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ" کی طرف اشارہ ہے، جو قرآن مجید کی مختلف سورتوں میں آئی ہے۔[۱] 'وَنَشَرَ الرِّيَاحَ بِرَحْمَتِهِ" اشارہ ہے اس آیت کی جانب:

"وَهُوَ الَّذِیْ یُرْسِلُ الرِّیَاحَ بُشْرًا بَیْنَ یَدَیْ رَحْمَتِهٖ"[۲]

''وہ ایسا ہے، جس نے بارانِ رحمت سے پہلے بشارت دینے والی ہواؤں کو بھیجا۔''

اور "وَتَّدَ بِالصُّخُوْرِ مَيَدَانَ اَرْضِهٖ" اشارہ ہے اس آیت کی طرف:

"وَاَلْقٰى فِی الْاَرْضِ رَوَاسِیَ اَنْ تَمِیْدَ بِكُمْ"[۳]

''زمین میں بلند و بالا پہاڑوں کو نصب کر دیا ہے، تاکہ وہ تمھیں نہ لرزائے۔''

جیسا کہ ''فطر'' کے معنی میں کہا گیا ہے خلق کا ظلمانی، پردۂ عدم چاک کرنے سے مشابہ ہے، ایک ایسا پردہ جو منظم، مربوط اور ہر قسم کے شگاف سے خالی ہے، لیکن پروردگارِ عالم اپنی طاقت سے اس کو شگافتہ کر کے اس سے مخلوقات کو باہر بھیجتا ہے۔ اور یہ چیز اُس کی قدرت کے علاوہ ممکن نہیں ہے۔ جدید مفکرین اس بات پر متفق ہیں کہ یہ محال ہے کہ ہم عدم سے کسی چیز کو وجود بخشیں۔ یا وجود سے وادیٔ عدم کی طرف بھیجیں، جو چیز ہمارے پاس ہے وہ صرف موجودات کی شکل کو تبدیل کرنے کی حد تک ہے اور بس۔ "نَشَرَ" ہوائیں چلانے کو رحمت سے تعبیر کیا ہے، ہوا کی جاذبیت و لطافت کے ہمراہ اس کے مختلف آثار ہیں، مثلاً سوکھی زمینوں کی طرف بادلوں کی حرکت، پودوں کے درمیان پیوند کاری، کشتیوں کی حرکت، گرمی اور سردی میں درجۂ حرارت کو معتدل رکھنا، اور دیگر تمام فوائد کو مدنظر رکھتے ہوئے یہ تعبیر بہت ہی مناسب ہے۔

لیکن اس مسئلے میں کہ ''وَتَّدَ بِالصُّخُوْرِ'' پہاڑ اور چٹانیں زمین کو ہلنے سے روکتے ہیں، پچھلے زمانے کے مفکرین یہ عقیدہ رکھتے تھے کہ زمین ساکن ہے اور اس کے لیے وضاحتیں بھی بیان کرتے تھے جو آج کل کے دور میں قابلِ قبول نہیں ہیں، بلکہ اس ضمن میں بہترین تفاسیر موجود ہیں، جو علمی حقائق کے ساتھ سازگار اور آیاتِ قرآنی کے ساتھ ہم آہنگ بھی ہیں، اس لیے کہ

---

[۱] سورۂ یوسف: آیت ۱۰۱، سورۂ ابراہیم: آیت ۱۰، سورۂ فاطر: آیت ۱، وغیرہ۔

[۲] سورۂ اعراف، آیت ۵۷

[۳] سورۂ نحل، آیت ۱۵

https://downloadshiabooks.com/

(الف) پہاڑوں کا سطح زمین پر ہونا سبب بنتا ہے کہ ''مدّ و جزر'' جو چاند و سورج کے جاذبے کا نتیجہ ہے، وہ خشکی پر کم سے کم ہو، اگر سطحِ زمین کو نرم خاک نے پُر کر دیا ہوتا تو لامحالہ ''مدّ و جزر'' دریاؤں کی طرح زمین کو پُر کر دیتا اور یہ قابل سکونت نہ رہ پاتی۔

(ب) زمین کے نیچے پہاڑوں کی جڑیں آپس میں ملی ہوئی ہیں جنہوں نے ایک زرہ (جو فوجی حالت جنگ میں زیب تن کرتے ہیں) کی مانند زمین کو حصار میں لے رکھا ہے۔ اگر یہ نہ ہوتیں تو اندرونی گیسوں کی وجہ سے زمین کے مختلف گوشے حرکت میں ہوتے اور زمین میں ٹھہراؤ نہ ہوتا۔ اب بھی بعض اوقات جب زمین کے اندر موجود گیسوں کا تناؤ حد سے بڑھ جاتا ہے تو زمین پر زلزلہ آ جاتا ہے۔ اگر یہ پہاڑ نہ ہوتے تو یہ زلزلے مستقل شکل اختیار کر لیتے۔

(ج) زمین پر پہاڑوں کا وجود سائیکل کے پہیے میں موجود کمانیوں کی طرح ہوا کو متفرق و منتشر کر دیتا ہے۔ اگر سطح زمین صاف ہوتی تو ہوا کے مختلف حصّوں سے تصادم ہوتا جبکہ ایک طرف شدید طوفان اور دوسری جانب اس تصادم کی وجہ سے درجۂ حرارت میں اضافہ ہوتا، جس سے انسان کے لیے زندگی گزارنا مشکل ہو جاتا۔ الحاصل یہ کہ ''صخور یعنی پہاڑ میدان'' یعنی زمین کی نامنظم تحرکات کو کنٹرول کر لیتے ہیں، اس کے علاوہ پہاڑ انسان کے لیے پانی کا مخزن ہے۔

چنانچہ زمین زیر زمین چشموں اور روئے زمین نہروں کا دارومدار انہی بلند و بالا پہاڑوں پر ہے۔ انسان کی زندگی میں ہواؤں اور پہاڑوں کے کردار کے ذکر سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ امیر المومنینؑ نے خلقت و آفرینش کی طرف اشارہ کرنے کے بعد خصوصی طور پر ان دو موضوعات پر توجّہ مرکوز فرمائی ہے۔

دوسرا حصّہ

"اَوَّلُ الدِّیْنِ مَعْرِفَتُهُ، وَ كَمَالُ مَعْرِفَتِهِ التَّصْدِیْقُ بِهٖ، وَ كَمَالُ التَّصْدِیْقِ بِهٖ تَوْحِیْدُهٗ، وَ كَمَالُ تَوْحِیْدِهِ الْاِخْلَاصُ لَهٗ، وَ كَمَالُ الْاِخْلَاصِ لَهٗ نَفْیُ الصِّفَاتِ عَنْهُ، لِشَهَادَةِ كُلِّ صِفَةٍ اَنَّهَا غَیْرُ الْمَوْصُوْفِ، وَ شَهَادَةِ كُلِّ مَوْصُوْفٍ اَنَّهٗ غَیْرُ الصِّفَةِ، فَمَنْ وَصَفَ اللهَ سُبْحَانَهٗ فَقَدْ قَرَنَهٗ، وَ مَنْ قَرَنَهٗ فَقَدْ ثَنَّاهُ، وَ مَنْ ثَنَّاهُ فَقَدْ جَزَّاَهٗ، وَ مَنْ جَزَّاَهٗ فَقَدْ جَهِلَهٗ، وَ مَنْ جَهِلَهٗ فَقَدْ اَشَارَ اِلَیْهِ، وَ مَنْ اَشَارَ اِلَیْهِ فَقَدْ حَدَّهٗ، وَ مَنْ حَدَّهٗ فَقَدْ عَدَّهٗ"[1]

''دین کی ابتداء اس کی معرفت سے ہے اور معرفت کا کمال اس کی تصدیق ہے۔ تصدیق کا کمال توحید کا اقرار ہے

---

[1] مشکل الفاظ کے معنی آخر کتاب ''ضمیمہ'' میں ملاحظہ فرمائیں۔

https://downloadshiabooks.com/

اور توحید کا کمال اخلاص عقیدہ ہے اور اخلاص کا کمال زائد بر ذات صفات کی نفی ہے' کہ صفت کا مفہوم خود ہی گواہ ہے کہ وہ موصوف سے الگ کوئی شے ہے اور موصوف کا مفہوم ہی یہ ہے کہ وہ صفت سے جداگانہ کوئی ذات ہے۔ پس جس نے اس کی توصیف کی تو گویا اس نے کسی کو خدا اقرین قرار دیا اور جس نے کسی کو خدا کا قرین قرار دیا تو گویا وہ ذات الٰہی میں دوگانگی کا قائل ہوا اور جس نے خدا میں دوگانگی کا عقیدہ رکھا تو اس کا لازمی نتیجہ ذات الٰہی میں اجزاء کا تصور ہے اور ذات خدا میں اجزاء کا تصور جہالت ہے اور جو خدا کی ذات سے جاہل ہوگا وہ خدا کی طرف اشارہ کرے گا اور جس نے خدا کی طرف اشارہ کیا تو گویا اس نے خدا کو ایک خاص سمت میں محدود کر دیا اور جس نے محدود کر دیا، اس نے اسے گننا شمار کر لیا (جو سراسر خلافِ توحید ذات ہے)۔''

شرح وتفسیر

توحید ذات وصفاتِ الٰہی

یہ مقام خود خدا شناسی کا ایک مکمل باب ہے۔ امیر المومنینؑ نے اس حصّے میں نہایت مختصر اور جامع عبارات کے ذریعے خداوندِ عالم کی ایسی تعریف کی ہے کہ جس کے آگے کوئی تعریف تصور نہیں کی جا سکتی۔ اور اگر توحید و خدا شناسی کے حوالے سے تمام تر دُروس اور مضامین کو جمع کر لیں، تب بھی اس سے زیادہ وسیع درس نہ مل سکے گا۔ اس مقام پر آپؑ نے خداوندِ عالم کی معرفت اور پہچان کے لیے پانچ مراحل کا ذکر کیا ہے، جنہیں مختصراً یُوں بیان کیا جا سکتا ہے:

۱۔ مجمل اور ناقص شناخت ۲۔ تفصیلی شناخت ۳۔ مقامِ توحید ذات وصفات ۴۔ مقامِ اخلاص ۵۔ مقامِ نفی تشبیہ۔

۱۔ ابتدا میں فرماتے ہیں:

"اَوَّلُ الدِّیْنِ مَعْرِفَتُهُ"

''دین کا آغاز معرفت اور خدا شناسی ہے۔''

بلاشبہ اس مقام پر دین کو عقائد، احکام و اعمال اور اخلاق کا مجموعہ بتایا گیا ہے، جس مجموعے کا آغاز و بنیاد معرفتِ الٰہی ہے۔ اس بنا پر شناخت خداوند عالم پہلا قدم بھی ہے اور اصول و فروعِ دین کے لیے سب سے اہم مرحلہ بھی، جس کے بغیر یہ ہرا بھرا درخت پھل دار نہیں ہو سکتا۔ بعض حضرات کا یہ گمان ہے کہ معرفتِ خدا سے پہلے دین کے بارے میں تحقیق و جستجو اور

https://downloadshiabooks.com/

اس کے بارے میں مطالعہ کی ضرورت ہے۔ایک بڑی غلطی ہے، کیونکہ دین کے بارے میں فحص وجستجو اگرچہ بنیادی ضرورت ہے مگر خداوند عالم کی شناخت دین کی پہلی بنیاد ہے، گویا تحقیق مقدّمہ ہے اور خداوند عالم کی شناخت مقدمے کا مقدمہ ہے۔ [۱]

ظاہر ہے کہ اجمالی معرفت، انسان کی فطرت میں ہے، یہاں تک کہ اُس کے لیے تبلیغ کی ضرورت تھی، مگر انبیاء و مُرسلینؑ کی بعثت کا مقصد یہ ہے کہ اجمالی معرفت کو تفصیلی معرفت میں بدل ڈالیں اور اُس کی شاخ و برگ رُشد ونمو پائیں اور معرفت کے اس درخت کے اطراف میں اُگنے والی گھاس، پھوس کو جسے شرک آلودہ ہواؤں نے جنم دیا ہے، زائل کیا جا سکے۔

۲-دوسرے مرحلے میں فرماتے ہیں:

"وَ كَمَالُ مَعْرِفَتِهِ التَّصْدِيْقُ بِهِ"

''خدا کی معرفت اور شناخت کا کمال اُس کی پاک ذات کی تصدیق ہے۔''

البتہ تصدیق اور معرفت میں کیا فرق ہے؟ اس بارے میں مختلف تفاسیر موجود ہیں۔ پہلی بات یہ ہے کہ یہاں معرفت سے مُراد فطری شناخت ہے اور تصدیق سے مُراد علمی اور استدلالی شناخت ہے۔ یا یہ کہ معرفت سے مراد، اِجمالی معرفت وشناخت ہے اور تصدیق سے مراد تفصیلی معرفت وشناخت ہے، یا پھر معرفتِ خدا کی نسبت علم وآ گاہی کی طرف اشارہ ہے۔ جبکہ تصدیق، ایمان کی جانب اِشارہ ہے۔ کیونکہ ہم جانتے ہیں کہ علم، ایمان سے جدا ہے، کیونکہ یہ ممکن ہے کہ انسان کسی چیز پر یقین رکھتا ہو مگر اس چیز پر قلبی ایمان نہ رکھتا ہو، ایمان قلبی سے مراد اُس شے کے سامنے سرِتسلیم خم ہونا اور دل کی گہرائی سے اُسے پہچاننا ہے۔ بزرگ علماء نے ان دونوں میں فرق کیا ہے، وہ ایک سادہ سی مثال دیتے ہیں کہ بہت سے لوگ کسی جنازے کے پاس ٹھہرنے سے خاص طور پر رات کے وقت وہ بھی خالی کمرے میں وحشت کھاتے ہیں۔ جبکہ اُنہیں یقین ہے کہ وہ مر چکا ہے، مگر یہ علم ان کے قلب کی گہرائیوں میں نافذ نہیں ہوا اور یہ یقین جس کی وجہ سے انھیں وحشت ہوتی ہے۔ دوسرے لفظوں میں یہ کہا جاسکتا ہے کہ علم کسی بھی چیز کے بارے میں آ گاہی رکھنا ہے، مگر ممکن ہے کہ یہ آ گاہی اور معلومات صرف سرسری ہوں اور اُن کی گہرائیوں سے واقفیت نہ ہو اور انسان کی روح اور وجود میں داخل نہ ہوئی ہوں، مگر جس وقت یہ یقین روح کی گہرائی میں داخل ہو جائے اور یقین کے گہرے درجات تک پہنچ جائے اور پھر انسان کا دل بھی اس کا گواہ بن جائے تو اُسے

[۱] مشہور دانشور مرحوم ''مغنیہ'' نے نہج البلاغہ کی اپنی شرح ''فی ظلال نہج البلاغہ'' میں اسے خدا کے اوامر ونواہی میں اطاعت کے معنیٰ میں لیا ہے۔ اور شارح خوئی نے پہلے اسی مطلب کا انتخاب کیا ہے، اگر ان کی مراد اطاعت کے دونوں پہلو ہیں، جن میں اعتقادی امور بھی شامل ہوتے ہوں تو پھر صحیح ہے اور اگر صرف عملی امور کی ادائیگی مراد ہے، تو درج بالا اشکال یہاں پر بھی وارد ہوتا ہے۔

https://downloadshiabooks.com/

ایمان کہا جاتا ہے۔

۳۔تیسرے مرحلے میں آپؑ فرماتے ہیں:

"وَ کَمَالُ التَّصْدِيقِ بِهِ تَوْحِيدُهُ"

''اُس کی پاک ذات کی تصدیق کا کمال اُس کی توحید ہے۔''

بے شک اگرچہ انسان خدا کی تفصیلی معرفت بھی حاصل کرلے یا دوسرے الفاظ میں دلائل و بُرہان کے ساتھ اسے پہچان لے، پھر بھی یہ نہیں کہا جا سکتا کہ وہ توحید کامل کے درجے تک پہنچ گیا ہے۔توحیدِ کامل تو یہ ہے کہ اُس کی ذات کو ہر طرح کی نظیر، مثال یا شبیہ سے پاک اور مُنزّہ جانے، کیونکہ جو بھی اُس کے لیے کسی کو شبیہ یا اُس جیسا سمجھ لے، تو درحقیقت جس چیز کو اس نے پہچانا ہے وہ خدا تھا ہی نہیں، کیوں کہ خدا ایک لامحدود وجود ہے اور ہر چیز اور ہر موجود سے بے نیاز ہے۔جو بھی شبیہ یا مانند رکھتا ہو یقیناً وہ محدود ہے، کیونکہ آپس میں ملتے جلتے ایک ہی طرح کے یہ دونوں وجود ایک دوسرے سے جدا ہیں اور مختلف کمالات رکھتے ہیں۔لہٰذا اُس کی پاک ذات کی تصدیق اُس وقت اپنے کمال کو پہنچے گی، جب انسان اُسے ایک، واحد، یگانہ اور بے مثال سمجھے، یہاں یگانہ و یکتا سے مراد تعداد میں یگانہ اور واحد ہونا نہیں ہے بلکہ یگانہ اور ایک ہونے سے مراد بے مثال و بے شبیہ و نظیر ہونا ہے۔

۴۔چوتھے مرحلے میں جو کہ اِخلاص کا مرحلہ ہے، فرماتے ہیں:

"وَ كَمَالُ تَوْحِيدِهِ الْإِخْلَاصُ لَهُ"

''اُس کی توحید کا کمال اُس کے لیے اِخلاص رکھنا ہے۔''

اخلاص کا لفظ خلوص سے آیا ہے جو کہ خالص کرنا، صاف ستھرا کرنا اور اُس کے غیر سے پاک کرنے کے معنی میں استعمال ہوتا ہے۔نہج البلاغہ کے مفسرین میں اس بات پر کافی بحث ہے کہ اس مقام پر اخلاص سے مراد کیا اخلاص عملی یا قلبی یا اعتقادی مراد ہے؟ اخلاصِ عملی سے مراد یہ ہے کہ جو شخص توحیدِ الٰہی انتہائی درجے کی معرفت رکھتا ہو تو یقیناً وہ صرف اُسی کی بندگی کرے گا اور اُس کے ہر کام اور ہر شے میں منظور و مقصود خدا کی ذات ہی ہوگی۔یہ وہی بات ہے کہ جس پر فقہاء نے عبادت میں اِخلاص کے عنوان پر تکیہ کیا ہے۔شارح نہج البلاغہ خُوئی نے اس مذکورہ تفسیر کو ایک قول کی طرف اشارہ کرتے ہوئے ذکر کیا ہے، اگرچہ اُس کے قائل کا حوالہ نہیں دیا۔[1]

مگر یہ احتمال بہت بعید ہے، کیونکہ اِس جملے کے سیاق و سباق کے جملے بھی اعتقادی حوالے سے ہیں، لہٰذا مولاؑ کا یہ

[1] منہاج البراعۃ، جلد ۱، ص ۳۲۱، آقائی خوئی کے مطابق، صدر الدین شیرازی کا بھی ''شرحِ کافی'' میں یہی نظریہ ہے۔

https://downloadshiabooks.com/

جملہ بھی اعتقادی اور عقیدتی خلوص کے بارے میں ہے۔ مگر قلبی اخلاص کو" شارح بحرانی ابنِ میثم نے" زہدِ حقیقی کے معنی میں لیا ہے، یعنی اُس کا قلب ہر اعتبار سے صرف خدا کی جانب متوجّہ ہو اور اُس کے غیر کی جانب تصوّر بھی نہ کرے اور اللہ کے علاوہ کسی اور کا گمان بھی نہ لائے اور اس کے غیر کی جانب توجّہ بھی نہ کرے۔[1] اگرچہ یہ مقام ایک بہت بلند و بالا مقام ہے مگر بعید ہے کہ مولاؑ کے اس جملے کا مقصد یہ ہو، بلکہ اس جملے کا واحد مفہوم یہ ہے کہ پروردگار کی نسبت اپنے عقیدے کو خالص بنانا اور اُسے ہر حوالے سے بے مثال، واحد اور شباہت سے منزّہ جاننا اور ترکیب کے اجزاء سے پاک و مبرّ ا ٹھہرانا ہے۔

۵۔ پانچویں جملے میں اِمامؑ اِس معنی کی طرف اشارہ فرما رہے ہیں:

"وَ كَمَالُ الْإِخْلَاصِ لَهُ نَفْيُ الصِّفَاتِ عَنْهُ"

"اُس کے لیے خلوص رکھنے کا کمال یہ ہے کہ تمام صفاتِ ممکنات کی اس سے نفی کی جائے۔"

پچھلے مرحلے میں اِخلاص کی گفتگو میں اِجمالی طور پر اخلاص کی بات ہوئی، مگر اس مقام پر جبکہ کمال اخلاص کے مرحلے کی گفتگو ہوئی ہے، تو یہ تفصیل کا مقام ہے اور یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ توحید میں اخلاص پیدا کرنے کے لیے مخلوقات کی تمام صفات کو اُس کی ذات سے نفی کرنا ہوگا۔ چاہے وہ ترکیبی اجزاء رکھنے کی صفت ہو یا اس کے علاوہ کوئی اور صفت۔ اگرچہ ہم جانتے ہیں کہ عقل و نفس جیسے مجرد ممکنات بھی درحقیقت مُرکب ہیں (کم از کم وجود و ماہیت کی ترکیب کے حوالے سے یہاں تک کہ خود مجردات) یعنی مادّے سے اوپر کے موجودات بھی اِس ترکیب سے علیحدہ نہیں ہیں اور جہاں تک مادّی موجودات کی بات ہے، تو وہ سب کے سب ویسے ہی خارجی اجزاء کا مجموعہ ہیں۔ مگر پروردگار کی ذاتِ پاک نہ تو خارجی اجزاء رکھتی ہے نہ عقلی اجزاء رکھتی ہے۔ نہ خارج میں تجزیے کے قابل ہے اور نہ ہی ہمارے فہم و ادراک کے سانچے میں۔ جو بھی اس حقیقت کو نہ پہچانے اُس نے خالص توحید نہیں پائی اور اس جملے یعنی "اُس کی توحید کا کمال صفات کا اُس سے نفی کرنا ہے" سے مراد ہرگز یہ نہیں ہے کہ صفاتِ کمالیہ کی بھی نفی کی جائے، کیونکہ تمام کمالیہ صفات جن میں علم، قدرت، حیات وغیرہ شامل ہیں، یہ سب کی سب اُسی کی ہیں۔ یہاں وہ صفات مراد ہیں، جن سے ہمارا ہمیشہ کا واسطہ ہے، جنہیں ہم جانتے پہچانتے ہیں، یعنی مخلوقات کی صفات جو کہ ہر طرف سے نقص سے بھرپور ہوا کرتی ہیں۔ اور دُرست ہے کہ مخلوقات علم و قدرت رکھتی ہیں۔ مگر ان کا علم و قدرت ناقص، محدود اور جہالت وضعف و ناتوانی سے مخلوط ہے، جبکہ پروردگار کی ذاتِ پاک ایسے علم و قدرت سے منزّہ ہے۔ اس بات پر گواہ خود مولا علی علیہ السلام کا کلام ہے، جس میں آپؑ فرشتوں کے بارے میں فرماتے ہیں:

"لَا يَتَوَهَّمُونَ رَبَّهُمْ بِالتَّصْوِيرِ وَلَا يُجْرُونَ عَلَيْهِ صِفَاتِ الْمَصْنُوعِينَ"

---

[1] شرح نہج البلاغہ، ج۱، ص۱۲۲

https://downloadshiabooks.com/

''یہ کبھی بھی اپنے پروردگار کی تصویر کو قوتِ وہم کے سانچے سے نہیں بناتے اور کبھی اُس کے لیے مخلوقات کی صفات کے قائل نہیں ہوتے''، کیوں کہ مخلوقات کی صفات ہمیشہ اُن کی ذات سے الگ اور جدا ہوتی ہیں یا دوسرے لفظوں میں یوں کہا جائے کہ ذات کے علاوہ کچھ صفات ہیں، چوں کہ انسان ایک شے ہے اور اُس کا علم اور قدرت ایک الگ شے ہے۔ اس طرح سے انسان کا وجود ان دو چیزوں سے مرکب ہے، جبکہ پروردگار کی تمام صفات عین ذات ہیں اور ان میں ترکیب کی کوئی گنجائش نہیں ہے۔ درحقیقت خدا شناسی اور توحید کی راہ میں سب سے بڑا خطرہ ''قیاس'' کے بھنور میں گر جانا ہے۔ یعنی صفاتِ خداوندی کو مخلوقات کی صفات سے ملا دینا یا اُن جیسا سمجھنا، جو کہ خود نُقص و کمی سے بھرپور ہیں۔ یا ذات کے علاوہ اس کی صفات پر عقیدہ رکھنا، جیسا کہ مسلمانوں کا ایک گروہ ''اشاعرہ'' اس میں گرفتار ہے۔ [۱]

اسی بنا پر امامؑ اگلے جملے میں یوں فرماتے ہیں:

''لِشَهَادَةِ كُلِّ صِفَةٍ أَنَّهَا غَيْرُ الْمَوْصُوفِ، وَشَهَادَةِ كُلِّ مَوْصُوفٍ أَنَّهُ غَيْرُ الصِّفَةِ''

''کیونکہ صفاتِ ممکنات میں سے ہر صفت اس بات کی گواہی دیتی ہے کہ وہ موصوف سے علیحدہ ایک چیز ہے اور ممکنات میں سے ہر مُوصوف اس بات کی گواہی دیتا ہے کہ وہ صفت کا غیر ہے۔''

یہ بات درحقیقت اس بات پر ایک روشن دلیل ہے کہ ذات کے علاوہ زائد صفتیں، زبانِ حال سے خود گواہی دیتی ہیں کہ وہ موصوف سے جُدا ہیں، اور ہر مُوصوف خود گواہی دیتا ہے کہ وہ صفت سے جُدا ہے۔ لہٰذا خدا کی صفات کو عین ذات جاننا چاہیے اور اس بات کا عقیدہ رکھنا چاہیے کہ خداوندِ عالم ایک ایسی ذات ہے، جو پورے کا پورا علم ہے، پوری قدرت ہے، ساری کی ساری حیات اور ازلیّت اور اَبدیّت ہے۔ اگرچہ ایسے معانی کا درک کرنا ہم جیسوں کے لیے بہت دُشوار ہے، جو مخلوقات کی صفات میں ہی دن رات جکڑے ہوئے ہیں۔ اور انسان کو ایک شے اور اُس کے علم و قدرت کو اُس کی ذات کے علاوہ ایک اور شے سمجھتے ہیں۔ (کیونکہ جب انسان ماں کے پیٹ سے جدا ہوا تو نہ علم رکھتا تھا اور نہ قدرت، اُس کے بعد وہ علم و قدرت رکھنے والا بنا)۔ پھر اس بات کو آگے بڑھاتے ہوئے آپؑ نہایت مختصر اور پُر معنی جملے ارشاد فرماتے ہیں:

''فَمَنْ وَصَفَ اللّٰهَ سُبْحَانَهُ فَقَدْ قَرَنَهُ، وَمَنْ قَرَنَهُ فَقَدْ ثَنَّاهُ وَمَنْ ثَنَّاهُ فَقَدْ جَزَّأَهُ، وَمَنْ جَزَّأَهُ

[۱] اشاعرہ جو کہ ابوالحسن اشعری کے پیروکار ہیں، معانی کا اعتقاد رکھتے ہیں، اور معانی سے ان کی مراد عالمیت، غالبیت جیسی صفات کا مفہوم بھی خدا کی ذات کس طرح قدیم اور وازلی ہونا ہے، گویا یہ صفات غیر از ذاتِ الٰہی ہیں، لہٰذا یہ چند امرِ ازلی پر عقیدہ رکھتے ہیں، یا دوسرے لفظوں میں یوں کہا جائے، تعددِ قدما کے قائل ہیں، یعنی ایسا عقیدہ جو خالص توحید کے ساتھ کسی بھی صورت میں سازگار نہیں ہے، لہٰذا مکتبِ اہلِ بیتؑ کے پیروکار، ان ہستیوں کی تعلیمات کہ جو مذکورہ خطبے یا دیگر خطبوں اور فرامین میں آئی ہیں۔ کی روشنی میں (معانی) کو۔ جو کہ صفاتِ زائد بر ذات ہی کے مفہوم کو عیاں کرتی ہے۔ کو خدا کی ذات سے نفی کرتے ہیں۔ اور اسی طرح یہ جملہ کہ وہ ''بے شریک'' اور لا معانی کا جملہ اسی نکتے کی طرف اشارہ ہے۔

https://downloadshiabooks.com/

فَقَدْ جَهِلَهُ"

"جو بھی خدائے سبحان کی مخلوقات کی سی صفات سے توصیف کرے، اُس نے اُسے دوسرے اُمور کا قرین ٹھہرایا ہے، اور جو بھی اُسے کسی دوسری شے کا قرین ٹھہرائے، اُس نے اُس کی ذات کے دُوگانہ ہونے کا اقرار کیا ہے، اور جس نے اس کے دوگانہ ہونے کا اقرار کیا اس نے گویا اس کے لیے اجزاء تصور کیے اور جو بھی اُس کے لیے اَجزاء کا تصور کرے اُس نے درحقیقت خدا کو پہچانا ہی نہیں۔"

درحقیقت امامؑ اِس بات پر زور دے رہے ہیں کہ مخلوقات کی جیسی صِفات کا خدا کے لیے ثابت ہونا اللہ کے مقدّس وجود میں ترکیب کا موجب بنتا ہے یعنی جیسے انسان اپنی ذات اور صفات کی مِلی ہوئی ترکیب پر مشتمل ہے، لیکن یہ بات اُس کے واجب الوجود ہونے سے سازگار نہیں ہے، کیونکہ ہر مُرکّب کو اپنے اجزاء کی ضرورت ہوتی ہے اور کسی بھی چیز کی ضرورت اور محتاجی وفقر ہونا، واجبُ الوُ جود ہونے کے خلاف ہے۔ اس عبارت کی تشریح میں دو مزید تفسیریں کی گئی ہیں:

پہلی تفسیر: جب اُس کی صفات کو غیر ذات جانیں گے، تب بھی وہ مرکب ہوں گی، کیونکہ ذات اور صفات دو ہونے کے فرض میں کوئی جہت مشترک اور کوئی جہت امتیاز رکھتی ہے (کہ جو وجہ اشتراک اور وجہ امتیاز کہی جاتی ہے) کیونکہ یہ دونوں وجود اور ہستی میں ایک دوسرے کے شریک ہیں اور اُسی دوران ایک دوسرے سے جدا بھی ہیں۔ لہٰذا اُس کی ذات کو مذکورہ دو لحاظ سے مرکب جاننا ہوگا۔

دوسری تفسیر: ہم جانتے ہیں کہ ذاتِ الٰہی کے بارے میں وحدت سے مراد عددی وحدت نہیں، بلکہ ذاتِ الٰہی کی وحدت کا مفہوم یہ ہے کہ وہ اپنی کوئی شبیہ، نظیر اور مانند نہیں رکھتا۔ اُصولی طور پر ایک ایسا وجود جس کی ہر جہت سے کوئی انتہا نہیں، اُس کی کوئی شبیہ یا مثال ہو یہ ناممکن ہے اور اگر ہم صفاتِ خدا کو اُس کی ذات کی طرح ازلی اور ابدی اور بے انتہا سمجھیں تو ہم نے گویا اُس کو محدود کر دیا اور اس کے لیے یہیں پر ہم نے خود ایک شبیہ اور مانند بنا دیا۔ (غور کیجیے)

مذکورہ گفتگو اسی معنی کی طرف رہنمائی کرتی ہے، جس میں امامؑ نے اخلاص کی تشریح فرمائی ہے: جس نے خدا کو مخلوق کی صفات سے قیاس کیا، اُس نے اُسے دوسری مخلوقات جیسا سمجھ لیا اور جس نے اُسے دوسری مخلوقات جیسا سمجھ لیا اُس نے اُس کے دوگانہ ہونے کا اقرار کیا یعنی صفات اور ذات کو اجزاء سے مرکب سمجھ لیا اور جس نے اُس کی ذات کو مرکب ٹھہرایا، اُس نے اُسے پہچانا ہی نہیں۔ کیونکہ اُس نے اسے اپنی جیسی مرکب اور محدود مخلوق سمجھ لیا اور اُسے خدا کا نام دے دیا ہے۔ اس بات کو آگے بڑھاتے ہوئے فرماتے ہیں:

"وَمَنْ جَهِلَهُ فَقَدْ اَشَارَ اِلَيْهِ. وَمَنْ اَشَارَ اِلَيْهِ فَقَدْ حَدَّهُ. وَمَنْ حَدَّهُ فَقَدْ عَدَّهُ"

https://downloadshiabooks.com/

''جس نے خدا کو پہچانا نہیں اُس نے اُس کی جانب اشارہ کر دیا۔ اور جس نے اُس کی جانب اشارہ کیا اُس نے اُسے محدود کر دیا اور جس نے اُس کو محدود کر دیا اُس نے اُسے گنا اور وہ شرک کی وادی میں سرگرداں و پریشاں ہو گیا۔''

خدا کی طرف اشارہ کرنے سے کیا مراد ہے؟ اس میں دو احتمال دیے جاسکتے ہیں: پہلا احتمال: یہ ہے کہ یہ عقلی اشارہ ہے، دوسرا احتمال: یہ ہے کہ یہ عقلی اِشارہ بھی ہے اور حسّی اشارہ بھی ہے۔

وضاحت یہ ہے کہ جب انسان خدا کو اُس کی لامحدود اور بے کراں حقیقت کے مطابق نہیں پہچان سکتا تو وہ اُس کے حوالے سے ایک محدود سا مفہوم اپنے ذہن میں بٹھا لیتا ہے اور دوسرے الفاظ میں یہ کہ اُس کی جانب عقلی اشارہ کرتا ہے، اس طرح گویا اُس نے اُسے محدود جانا ہے، کیونکہ ایک لامحدود ہستی اُس انسان کے ذہن و تصور میں جو خود محدود ہے، سما ہی نہیں سکتی۔ یعنی انسان اُس شے کو درک کر سکتا ہے، جس پر اُس کا احاطہ ہو اور وہ شے اس کی محدود فکر میں سما سکے۔ اور ایسی چیز یقیناً اس کی طرح محدود ہی ہوگی۔ اور یوں خداوند عالم گنی جانے والی اشیا میں شمار ہوگا۔ کیونکہ محدود ہونے کا لازمہ یہ ہے کہ ایک شے کسی اور جگہ پر بالکل اُس کی طرح تصور کی جاسکتی ہے۔ البتہ صرف اُس کا ثانی نہیں ہوسکتا جو ہر جہت اور ہر لحاظ سے لامحدود ہو اور وہ کسی بھی طرح کی گنتی میں نہ آسکتا ہو۔ اِس لحاظ سے حضرت امام علیؑ نے اس مقام پر توحید کی حقیقت کو نہایت مختصر سی اور پُر معنی عبارت میں واضح کیا ہے کہ خداوند عالم ہر طرح کے خیال و گمان اور قیاس و وہم سے بالاتر ہے۔

یہ وہی بات ہے جو امام محمد باقر علیہ السلام کے کلام میں ایک خوبصورت تعبیر کے ساتھ آئی ہے، فرمایا:

''كُلُّ مَا مَيَّزْتُمُوْهُ بِأَوْهَامِكُمْ فِيْ اَدَقِّ مَعَانِيْهِ مَخْلُوْقٌ مَصْنُوْعٌ مِثْلُكُمْ مَرْدُوْدٌ اِلَيْكُمْ''

''جس چیز کو بھی اپنے وہم و گمان میں تصور کر لیجیے گرچہ کتنی ہی دقیق اور ظریف ہی کیوں نہ ہو، بہرحال وہ آپ کی بنائی ہوئی ایک مخلوق ہے اور وہ آپ کی جانب ہی لوٹ جائے گی جو آپ کی بنائی ہوئی، آپ کی تصور کی ہوئی اور آپ کی فکر میں سمائی ہوئی شے ہوگی، جبکہ خدا اس سے کہیں بلند و برتر ہے کہ کسی مخلوق کی محدود فکر و خیال میں سما سکے۔ [1]

یہ احتمال بھی ہے کہ اشارے سے مراد، اشارۂ عقلی بھی ہو اور اشارۂ حسی بھی، کیونکہ خدا کی جسمانیت کا عقیدہ رکھنا بھی جہل کا نتیجہ ہے اور اس کا نتیجہ سوائے خدا کو محدود کرنے اور گنتی کے قابل سمجھنے اور مثال و نظیر کا قائل ہونے کے کچھ نہیں۔

سوال: اس مقام پر ایک سوال سامنے آتا ہے کہ اگر خداوند عالم کسی طور بھی عقلی اشارے کے قابل نہیں، تو پھر گویا معرفت خدا ہو ہی نہیں سکتی اور اُسے پہچاننے کے تمام دروازے انسان پر بند ہو گئے ہیں اور خدا شناسی کا کوئی مفہوم باقی نہیں رہے گا، کیونکہ جب بھی ہم اُس پاک ذات کی معرفت کے لیے دست دراز کرنا چاہتے ہیں تو ہماری تمام تر رسائی اپنے افکار کی

---

[1] بحارُالانوار، جلد ۶۶، صفحہ ۲۹۳

https://downloadshiabooks.com/

تخلیق کردہ کسی مخلوق تک محدود ہو جاتی ہے، اس طرح ہم جتنا اس کے قریب آنا چاہتے ہیں اتنا ہی دور بھٹکتے ہیں۔ لہٰذا یہ کتنا بہتر ہوگا کہ ہم اس بھنور میں کود کر شرک میں پھنسنے کی بجائے خدا کی معرفت سے ہی کنارہ کشی اختیار کریں۔

جواب: ایک باریک نکتے پر توجّہ کرنے سے (جو یہاں بھی مشکل کشا ہے اور آگے بھی کام آئے گا) یہ سوال مزید واضح ہو جائے گا اور وہ یہ ہے کہ معرفت دو قسم کی ہوتی ہے: معرفت اِجمالی اور معرفت تفصیلی یا دوسرے الفاظ میں ذات کی پہچان اور افعال کے مبدأ کی پہچان۔ اس سے زیادہ واضح تعبیر میں یوں کہیں کہ جب ہم اس عالم ہستی کو اور اس کی حُسن سے بھرپور رعنائیوں اور موجودات کی مختلف قسموں کو دیکھتے ہیں یا اپنے آپ کو دیکھتے ہیں تو سرسری طور پر یہ بات ذہن میں آتی ہے کہ ان سب کا کوئی نہ کوئی خالق اور پروردگار ہے۔ یہ وہی اجمالی علم ہے، جو خدا کی معرفت کی نسبت انسان کی کوشش کا آخری مرحلہ ہے۔ البتہ جس قدر انسان عالم ہستی کے اسرار سے آگاہ ہوتا چلا جائے گا، اتنا ہی اُس کی ذات کی عظمت سے آشنا ہوتا جائے گا اور اجمالی معرفت زیادہ سے زیادہ پرتاثیر ہو جائے گی۔ لیکن جب اپنے آپ سے پوچھتے ہیں کہ وہ کیا ہے؟ اور کیسا ہے؟ اور پھر جب اُس کی ذاتِ پاک کی حقیقت کی جانب دستِ نیاز کو پھیلاتے ہیں تو سوائے حیرت اور سرگردانی کے ہمارے دامن میں کچھ نہیں آتا، اُس وقت ہمیں یہ کہنا پڑتا ہے کہ اُس کی جستجو کی جانب راستہ مکمل طور پر کھلا بھی ہے اور مکمل طور پر بند بھی ہے۔ اس مسئلے کو ایک مثال سے اس طرح واضح کیا جا سکتا ہے کہ قوت جاذبہ کے نام سے ایک قوت ہے، کیونکہ جو چیز بھی ہاتھ سے چھوڑ دی جائے وہ گر جاتی ہے اور زمین کی طرف کھنچی جاتی ہے اور اگر یہ قوتِ جاذبہ نہ ہوتی تو زمینی موجودات میں کوئی قرار وسکون نہ پایا جاتا۔

قوتِ جاذبہ سے آگاہی کوئی ایسی شے نہیں ہے، جو صرف سائنس دانوں کے لیے مخصوص ہو، بلکہ ننھے بچے بھی اسے اچھی طرح سمجھ سکتے ہیں، مگر جاذِبہ کی حقیقت کیا ہے؟ آیا یہ کوئی نادیدہ لہریں ہیں یا نامعلوم ذرّات یا پھر کوئی اور طاقت ہے؟ عجیب بات تو یہ ہے کہ قوتِ جاذِبہ اس دنیا کی تمام تر مادّی قوتوں میں سے ایک انوکھی خاصیت رکھتی ہے اور وہ یہ ہے کہ وہ ایک جگہ سے دوسری جگہ مُنتقل ہونے کے لیے زمانے کی محتاج نہیں ہے۔

روشنی کے برعکس جو دنیائے مادّہ میں سب سے تیز رفتار حرکت کی قوّت ہے رکھتی ہے، مگر اس کے باوجود ایک جگہ سے دوسری جگہ منتقل ہونے کے لیے اسے کئی ملین سال درکار ہوتے ہیں، لیکن قوتِ جاذبہ گویا ہر لمحے، دنیا کے ایک کونے سے دوسرے کونے میں منتقل ہوتی رہتی ہے یا یُوں کہا جائے کہ اس کی کم سے کم سرعتِ رفتار بھی دنیا کی سمجھ سے بالاتر ہے۔ آخر یہ کون سی قوت ہے، جس کے ایسے کرشمے ہیں؟ اس کی حقیقت کیا ہے؟ آج تک کسی کے پاس اس سوال کا مکمل جواب نہیں ہے۔ اب یہ قوتِ جاذبہ جو مخلوقات میں سے ایک ہے، ہم اس کے متعلق کوئی تفصیلی علم نہیں رکھتے اور جو کچھ ہمیں پتا ہے وہ صرف

https://downloadshiabooks.com/

اجمالی علم ہے، تو پھر اس پورے مادّی جہاں کے خالق کو سمجھنا جو خود مادّے کے دائرے سے خارج اور بے نہایت اور لامحدود ذات ہے، تو پھر کیسے یہ توقع ہو سکتی ہے کہ ہم اس کی ذات کی تفصیلات سے باخبر ہو سکتے ہوں؟ پھر بھی اس کے باوجود اُسے ہر جگہ حاضر و ناظر اور ہر مخلوق و موجود کے ساتھ پاتے ہیں۔

با صد ھزار جلوہ برون آمدی کہ مَن　　با صدھزار دیدہ تماشا کُنم تورا

تُو لاکھوں جلووں میں آیا نظر کہ میں　　دیکھوں فقط تجھے کہ نگاہیں ہوں بے شمار

"وَمَنْ حَدَّهُ فَقَدْ عَدَّهُ"

یہ جملہ ایک دقیق نکتے کی جانب اِشارہ ہے، جو مندرجہ بالا بات سے مزید واضح ہو جاتا ہے اور وہ یہ کہ جب بھی انسان، خدا کو محدود ٹھہرائے، تو اُسے اللہ کے لیے عدد کا قائل ہونا پڑے گا یا دوسرے الفاظ میں اُس کے لیے کسی شریک کو ماننا پڑے گا، کیونکہ جو ہر جہت سے لامحدود ہو اُس کے لیے کوئی شبیہ، مانند، یا شریک کا ہونا ناممکن ہے، لیکن اگر وہ محدود ہے تو (چاہے اُس کی کتنی ہی رفعت اور عظمت و بلندی ہو) اُس کی کوئی نہ کوئی شبیہ اور مانند تصور ہو سکتا ہے کہ جو اُس کی ذات کے علاوہ ہوگا، یا پھر دوسرے الفاظ میں اُس جیسی دو یا چند محدود موجودات (چاہے جتنی بھی بڑی ہوں) تصور کی جا سکتی ہیں، مگر ہر لحاظ سے لامحدود ذات کے لیے اس جیسا دوسرا وجود تلاش کرنا ناممکن ہے اور اس راہ میں جتنی کوشش کر لیں، آخر میں اُسی کی طرف بازگشت ہوگی۔

تیسرا حصّہ

"وَمَنْ قَالَ فِيمَ؟ فَقَدْ ضَمَّنَهُ، وَمَنْ قَالَ عَلَامَ؟ فَقَدْ أَخْلَىٰ مِنْهُ كَائِنٌ لَا عَنْ حَدَثٍ مَوْجُودٌ لَا عَنْ عَدَمٍ، مَعَ كُلِّ شَيْءٍ لَا بِمُقَارَنَةٍ، وَ غَيْرُ كُلِّ شَيْءٍ لَا بِمُزَايَلَةٍ فَاعِلٌ لَا بِمَعْنَى الْحَرَكَاتِ وَ الْآلَةِ بَصِيرٌ إِذْ لَا مَنْظُورَ إِلَيْهِ مِنْ خَلْقِهِ، مُتَوَحِّدٌ إِذْ لَا سَكَنَ يَسْتَأْنِسُ بِهِ وَلَا يَسْتَوْحِشُ لِفَقْدِهِ"

"جس نے یہ سوال اٹھایا کہ وہ کس چیز میں ہے، اس نے اسے کسی کے ضمن میں قرار دے دیا اور جس نے یہ کہا کہ وہ کہاں مستقر ہے تو گویا اس نے ایک جگہ کو اس سے خالی جانا، اس کی ہستی حادث نہیں ہے اور اس کا وجود عدم کی تاریکیوں سے نہیں نکلا ہے۔ وہ ہر شے کے ساتھ ہے، لیکن مل کر نہیں اور ہر شے سے الگ ہے، لیکن جدائی کی بنیاد پر نہیں۔ وہ فاعل ہے، لیکن حرکات

https://downloadshiabooks.com/

و آلات کے ذریعے نہیں اور وہ اس وقت بھی بصیر تھا، جب قابل رؤیت مخلوق کا وجود ہی نہیں تھا، وہ اپنی ذات میں یگانہ وتنہا ہے اور اُس کا کوئی ایسا ساتھی نہیں ہے، جسے پا کر اسے اُنس ومحبت اور کھونے کی صورت میں اضطراب و پریشانی کا احساس ہو۔''

شرح وتفسیر

اُس جیسی کوئی چیز نہیں

حضرت امام علیؑ خطبے کے اس حصّے میں چند نہایت حسّاس، دقیق اور ظریف توحیدی بحثوں کی جانب اشارہ کررہے ہیں اور انہیں درج ذیل پانچ نکات کے قالب میں نہایت مختصر عبارات میں بیان فرمارہے ہیں:

اوّل: اُس کی ذات کے لامحدود ہونے یا دوسری عبارت میں مکان کی قید سے بالاتر ہونے کو یوں بیان فرمایا:

''وَمَنْ قَالَ فِيمَ؟ فَقَدْ ضَمَّنَهُ''

''جو لوگ یہ سوال کرتے ہیں کہ خدا کس چیز میں ہے۔ انہوں نے اُسے موجودات کے احاطے میں تصور کرلیا۔''

لفظ ''فی'' اردو ادب میں اس کا متبادل لفظ ''میں'' کی قید اس وقت لائی جاتی ہے جب ایک موجود چیز بطور ظرف کسی دوسری چیز کو اپنے اندر سمالے اور اُس پر احاطہ کرلے، جیسے انسان کا گھر میں ہونا، پھول کا باغ میں ہونا یا گلاب کا پتّوں کے درمیان ہونا، جس کا نتیجہ اُس کی ذات کا محدود ہونا ہے۔ جیسا کہ ذکر ہوچکا توحید کے تمام دلائل یہ کہتے ہیں کہ اُس کی ذات ہر جہت اور ہر لحاظ سے لامحدود ہے۔

اسی طرح اگر کوئی سوال کرے:

''عَلَامَ فَقَدْ أَخْلَى مِنْهُ''

''خدا کہاں پر ہے؟ (عرش پر، کرسی پر، آسمانوں کی بلندیوں وغیرہ پر) اُس نے بھی خدا کو محدود شمار کیا۔''

کیونکہ اُس نے دوسرے مقامات کو اُس کے وجود سے خالی سمجھا ہے۔ اس بات کا لازمہ بھی یہی بنتا ہے کہ اُس کی ذات محدود ہو جو واجب الوجود سے سازگار نہیں، اس بنا پر تمام وہ لوگ جو اُسے عرش یا آسمانوں کی بلندیوں پر سمجھتے ہیں وہ خالص مُوَحِّد نہیں ہیں اور درحقیقت وہ کسی ایسی مخلوق کی پرستش کرتے ہیں جسے انہوں نے اپنے فکر وخیال میں تخلیق کرلیا ہے اور اُس کا نام اللہ رکھ دیا ہے (چاہے وہ لوگ عوام ہوں یا خواص کے مخصوص لباس میں) بعض اوقات کچھ ناواقف لوگ یہ سمجھتے

https://downloadshiabooks.com/

ہیں کہ آیتِ مبارکہ: "اَلرَّحۡمٰنُ عَلَی الۡعَرۡشِ اسۡتَوٰی"[1] خدا کا جسمانیت کے لبادے میں عرش پر واقع ہونے کی دلیل ہے جب کہ لفظ ''اِسۡتَوٰی'' صرف کسی شے پر سوار ہونے یا بیٹھنے کے معنی میں نہیں آتا، بلکہ کسی شے کی باگ ڈور ہاتھ میں رکھنے کے معنی میں بھی آتا ہے۔ اور اُصولاً "اِسۡتَوٰی عَلَی الۡعَرۡشِ" کی یہ تعبیر، تختِ سلطنت پر قرار پانے اور اقتدار سنبھالنے کے معنی میں آتی ہے۔

اس کے مقابل ''ثَلَّ عَرۡشُهٗ'' کی تعبیر ہے، جس کے معنی ہیں اُس کا تختہ ٹوٹ گیا، یہ ایک معروف و مشہور تعبیر ہے، جو برسرِ اقتدار آنے یا حکومت سے کنارہ کشی اختیار کرنے سے کنایہ ہے۔ تخت کے ٹوٹ جانے یا تختِ سلطنت پر بیٹھنے کے معنی میں نہیں ہے، لہٰذا "اِسۡتَوٰی عَلَی الۡعَرۡشِ" کا مطلب خدا کی حکومت اور حاکمیت کا عرش پر استقرار ہونا ہے۔

بہر حال یہ نہایت سطحی بات ہوگی کہ مذکورہ تعبیر سے خدا کی جسمانیت کا توہم کیا جائے۔

دوّم: دوسرے حصّے میں خدا کے ازلی ہونے اور ہمیشہ سے ہونے اور اُس کے، وقت اور زمانے کی قید سے آزاد ہونے کے بارے میں فرماتے ہیں:

"کَائِنٌ لَا عَنۡ حَدَثٍ"

''وہ ہمیشہ سے تھا اور کسی چیز سے نہیں بنا۔''

"مَوۡجُوۡدٌ لَا عَنۡ عَدَمٍ"

''وہ ایسا موجود ہے، جو عدم سے نہیں نکلا۔''

لہٰذا وہ تمام مخلوقات سے مختلف ہے، کیونکہ وہ سب ''حُدوث وعدم'' کا سابقہ رکھتی ہیں۔ گویا یوں کہا جائے کہ وہ سب ماضی میں کبھی نہیں تھیں اور بعد میں بنی ہیں۔ مگر واحد ایسا وجود جس کا کوئی سابقۂ عدم نہیں ہے وہ اللہ ہی کی ذاتِ پاک ہے

[1] سورۂ طٰہٰ، آیت ۵

https://downloadshiabooks.com/

۔ ’’کائن‘‘ اور ’’موجود‘‘ کا مفہوم مخلوق کی صفات اور سابقۂ عدم کو واضح کیے بغیر سمجھنا ممکن نہیں۔ [۱]

سوم: اگلے جملے میں نہایت لطیف انداز سے مخلوقات کا خالق سے گویا ممکن الوجود کا واجب الوجود سے تعلق بیان فرمایا ہے:

’’مَعَ كُلِّ شَيْءٍ لَا بِمُقَارَنَةٍ، وَغَيْرُ كُلِّ شَيْءٍ لَا بِمُزَايَلَةٍ‘‘

’’وہ ہر چیز کے ساتھ ہے، مگر ایسا نہیں کہ اُس کا ہم نشین اور مثل بن جائے اور ہر چیز کا غیر ہے، مگر اس طرح نہیں کہ اُس سے بے گانہ اور جُدا ہو جائے۔‘‘

بہت سے لوگ حتیٰ کہ بہت سے دانشور حضرات اور فلسفی بھی خدا اور موجودات کے رابطے کو، دو مستقل وجودوں کا ایک دوسرے سے رابطہ سمجھتے ہیں، جن میں سے ایک مخلوق اور دوسرا خالق ہے جیسا کہ ایک بڑا سا شعلہ ہو اور اُس سے ایک چھوٹی سی شمع جلائی جائے، جبکہ حقیقت یہ نہیں ہے، مخلوق اور خالق کا آپس میں فرق کسی کمزور اور طاقتور وجود کا فرق رکھنا نہیں ہے، بلکہ ہر جہت اور ہر لحاظ سے ایک مستقل وجود کا، ایک وابستہ اور محتاج وجود کا فرق ہے۔ تمام عالم ہستی اُس سے وابستہ ہے اور لحظہ بہ لحظہ اُس سے نورِ وجود حاصل کرتا ہے۔ خداوند عالم اس عالمِ ہستی سے جدا بھی نہیں ہے مگر اس کے باوجود موجوداتِ عالم بھی نہیں ہے۔ (جیسا کہ وحدتِ وجود اور موجود کے قائل حضرات نے صُوفیہ سے یہ نظریہ لیا ہے) جبکہ حقیقی توحید اس حقیقت کو درک کرنے سے مشروط ہے، ایک مثال سے بات واضح ہوگی، اگر چہ یہ مثال بھی ناقص ہے کہ سورج کی روشنی اور دُھوپ کا وجود، اگر چہ روشنی، سورج سے الگ شے ہے، مگر اُسی سے وابستہ اور جڑی ہوئی ہے، یعنی غیر تو ہے مگر اس کا غیر ہونا بیگانہ اور جدا ہونے یا اپنا الگ اور مستقل وجود رکھنے کے معنی میں نہیں ہے، گویا اُس کے ساتھ بھی ہے اور اسے ایک جسم بھی نہیں کہا جا سکتا، بے شک اِس عالم کے موجودات کا اُس ذاتِ پاک سے وابستہ اور جڑا ہوا ہونا اس سے بھی زیادہ نزدیک اور مضبوط ہے اور درحقیقت اس سے زیادہ بہتر مثال پیش کرنا نہایت مشکل ہے، جو اس جہاں میں وابستگی اور استقلال (وحدت در کثرت) کو

---

[۱] بعض شارحینِ نہج البلاغہ نے مندرجہ بالا دو جملوں کو ایک مطلب اور مفہوم پر دو عبارات شمار کیا ہے، ابنِ ابی الحدید نے جملۂ اوّل ’’کائن لا عن حدث‘‘ کو عدم حدوث زمانی جبکہ جملہ دوم ’’موجود لا عن عدم‘‘ کو عدم حدوثِ ذاتی شمار کیا ہے۔ یعنی پہلے جملے میں حضرتؑ فرما رہے ہیں: خداوند متعال کے لیے کوئی ایسا زمانہ تھا ہی نہیں جب وہ حادث ہوا ہو، اور دوسرے جملے میں زمانے سے قطع نظر یہ فرما رہے ہیں کہ اُس کی ذات میں حدوث نہیں ہے، بلکہ وہ واجب الوجود ہے (شرح نہج البلاغہ، ابن ابی الحدید جلد ۱، صفحہ ۷۹) جبکہ دوسرے شارحین نے اس کے برعکس بیان کیا ہے، یعنی پہلا جملہ حدوثِ ذات کی نفی ہے اور دوسرا جملہ حدوثِ زمانی کی نفی ہے (شرحِ نہج البلاغہ ابنِ میثم جلد ۱، صفحہ ۱۲۷) البتہ ان دونوں پر کوئی تسلی بخش دلیل نہیں ہے، کیوں کہ ’’حدوث‘‘ کا لفظ معمولاً حدوث زمانی کے لیے استعمال ہوتا ہے۔ جب کہ حدوثِ ذاتی پر بھی اطلاق ہوتا ہے، جیسا کہ ’’عدم‘‘ کا لفظ معمولاً عدمِ زمانی کے لیے استعمال ہوتا ہے، جب کہ عدم ذاتی پر بھی اطلاق ہوتا ہے، لہٰذا ان دونوں جملوں کو ایک دوسرے کے لیے تاکید کہا جائے تو بہتر ہے، یعنی دونوں جملے حدوثِ زمانی و ذاتی کی نفی کر رہے ہیں گویا حدوث و عدم ذات اور زمان دونوں لحاظ سے اللہ کے لیے قابلِ تصور نہیں ہیں۔

https://downloadshiabooks.com/

بیان کرتی ہو، اگر چہ اوپر بیان کی گئی مثالیں یا انسان کے ذہن کے تصورات جو اُس کی روح سے وابستہ ہیں، مگر اُس روح سے جدا بھی ہیں، کسی حد تک موضوع کو واضح کر دیتے ہیں۔(غور کیجیے)

چہارم: اگلے جملے میں اُس ذاتِ پاک کی ایک اور صفت کی جانب اشارہ فرماتے ہیں:

"فَاعِلٌ لَا بِمَعْنَى الْحَرَكَاتِ وَالْآلَةِ"

''وہ کاموں کو انجام دینے والا ہے، مگر اس کا مطلب یہ ہرگز نہیں ہے کہ وہ حرکات یا آلات کے ذریعے کام انجام دیتا ہے۔''

ہم روزمرہ کی گفتگو میں عام طور پر، کام کا کرنے والا اور فاعل کا لفظ اُس پر صادق آتا ہے جو اپنے ہاتھ پاؤں، سر، گردن اور دیگر اعضائے بدن کے استعمال سے کوئی کام انجام دے، اور جہاں تک انسان اور تمام جانداروں کی قدرت کی بات ہے تو وہ انجامِ افعال میں محدود ہے، یعنی انسان کو اوزار اور آلات کی ضرورت پڑتی ہے، وہ ہتھوڑے سے کیل ٹھونکتا ہے، آری سے لکڑی کاٹتا ہے، اور نفیس اور ظریف آلاتِ کار سے چھوٹے چھوٹے ذرّات کو اِدھر سے اُدھر کر سکتا ہے اور بلڈوزر اور کرین کے ذریعے بھاری سامان کو ایک جگہ سے دوسری جگہ منتقل کر لیتا ہے، یہ سب جسم اور جسمانیت کے آثار ہیں، جہاں تک خدا کا معاملہ ہے تو اُس کا نہ کوئی جسم ہے نہ حد ہے، جس کے دائرے میں وہ محدود ہو۔ اُس کا فاعل ہونا ہرگز کسی حرکت کے انجام دینے کے مطلب میں نہیں اور وہ اپنی لامحدود قدرت کی وجہ سے آلات و وسائل کا محتاج نہیں ہے۔ اُصولی بات تو یہ ہے کہ خدا اس وقت سے فاعل ہے جب کسی آلے کا وجود ہی نہیں تھا۔ اگر اُسے آلات کی ضرورت ہوتی تو وہ پہلے خلق کی ہوئی اشیاء کو بھی خلق نہ کر پاتا۔

جی ہاں! وہ ایک چشم زدن میں یا ایک لمحے یا پھر اُس سے بھی کم تر وقت میں صرف ایک ارادے اور ایک ''کُن'' کے حکم سے تمام عالمِ ہستی کو ایجاد یا ختم کر سکتا ہے یا بتدریج جس چیز کو جتنی مُدت میں خلق فرمانا چاہے اُسے اتنی مدت میں وجود میں لا سکتا ہے۔ تو اس پر توجّہ رکھنی چاہیے کہ جب ہم یہ کہتے ہیں کہ وہ فاعل ہے تو اُس کی فاعلیت (کر سکنے کی صلاحیت) کو اپنی ذات پر قیاس نہ کریں اور اُسے آلات و حرکات کا محتاج نہ جانیں۔ البتہ اس کا مطلب یہ نہیں کہ خدا فرشتے (مُدَبِّرَاتُ اَمر) یعنی کام انجام دینے والے نہیں رکھتا۔ وہ بہت سے کاموں کو اَسباب کے ذریعے سے کرتا ہے اور انھیں وجود بخشتا ہے۔ یعنی خدا کا ارادہ ان چیزوں سے تعلق رکھتا ہے نہ کہ وہ ان چیزوں کا محتاج ہے۔

پنجم: اگلے جملے میں اِضافہ فرماتے ہیں:

"بَصِيرٌ إِذْ لَا مَنْظُورَ إِلَيْهِ مِنْ خَلْقِهِ"

https://downloadshiabooks.com/

''وہ دیکھنے والا ہے، اُس وقت سے جب کوئی دکھائی دینے والی شے بھی وجود نہیں رکھتی تھی۔''

یہ بات درست ہے کہ لفظ بصیر یعنی دیکھنے والا، اسے لفظ بصر کے مادّے سے لیا گیا ہے، جس کا مطلب ہے آنکھ، مگر یہ خداوندِ عالم کے بارے میں ہرگز اپنے حقیقی معنوں میں استعمال نہیں ہوتا، بلکہ دوسرے الفاظ میں ایسا مجاز ہے جو حقیقت سے بالاتر ہے۔ خدا کا بصیر ہونا یعنی تمام دیکھنے میں آنے والی اشیا سے آگاہ ہونا حتیٰ کہ دیکھنے میں آنے والی اشیا کی خلقت سے پہلے بھی بصیر تھا۔ لہٰذا اُس کا بصیر ہونا، اُس کے بے انتہا علم کی طرف اشارہ ہے اور ہم جانتے ہیں کہ علمِ خدا ''ازلی'' ہے۔ موضوع کے آخری جملے میں حضرت علی علیہ السلام اُس ذات کا، کسی بھی طرح کے مونس و غمخوار کے وجود سے بے نیاز ہونا بیان فرماتے ہیں:

''مُتَوَحِّدٌ اِذْ لَا سَكَنَ يَسْتَأْنِسُ بِهِ وَلَا يَسْتَوْحِشُ لِفَقْدِهِ.''[1]

''وہ تنہا ہے کیونکہ، کوئی ایسا نہیں جو اُس کا مونس ہو اور وہ اُس کے نہ ہونے پر وحشت زدہ ہو جائے۔''

اس کی وضاحت یوں ہے کہ انسان اور دوسری زندہ مخلوقات کی قدرت کم اور محدود ہے، لہٰذا وہ اپنے تمام فائدے حاصل نہیں کر سکتے اور نہ ہی تمام نقصانات کو دور کر سکتے ہیں۔ تو ایسے میں وہ اپنے جیسے یا بعض اوقات اپنی نوع کے علاوہ کسی اور مخلوق سے مدد لینے کے محتاج ہوتے ہیں تا کہ اپنے ساتھ پیش آنے والے خطروں کو ٹال کر، سکون اور اَمن کا احساس حاصل کر سکیں۔ اسی وجہ سے انسان کے لیے تنہائی وحشت ناک اور دوسرے افراد کا اس کے پاس ہونا آرام بخش ہے، خاص طور پر خطروں، آفات وَبلیّات اور بیماریوں کے وقت۔ بعض اوقات یہ محدود فکر اِنسان، خدا کو اپنے آپ سے قیاس کرتا ہے اور تعجب کرتا ہے کہ وہ مخلوقات سے پہلے تنہا تھا!!! کیونکہ اُس کا کوئی انیس و مونس نہیں ہے اور اس تنہائی کے باوجود وہ پُرسکون کیسے ہے؟ یہ انسان اس بات سے بے خبر ہے کہ وہ ایک لامتناہی وجود ہے، نہ کسی چیز کا محتاج ہے کہ مدد لے اور نہ کسی دشمن سے اسے کوئی خوف ہے جس کی وجہ سے اسے کسی اور سے مدد مانگنی پڑے، نہ اُس کی کوئی شبیہ ہے نہ کوئی اُس جیسا جس کو وہ اپنا مونس بنائے۔ اسی دلیل پر وہ متوّحد (یعنی ہمدم و مونس کے بغیر) ہے اور رہے گا، یہاں (مُتَوَحِّدٌ) کا لفظ، واحد اور ''اَحَد'' کے مفہوم کے علاوہ استعمال ہوا ہے۔

[1] یہاں یہ بات کہ کیا ''اذ'' اس جگہ پر ظرفیت کے معنیٰ میں آیا ہے تو گویا ازل میں کوئی اس کے علاوہ تھا ہی نہیں جو اس کا مونس و غم خوار قرار پائے۔ یا وہ اس کے فقدان سے غم زدہ ہو جائے یا پھر ''اذ'' یہاں تعلیل (بیانِ علّت) کے معنیٰ میں ہے۔ گویا کوئی تھا ہی نہیں وہ ہمیشہ سے یکتا ہے لہٰذا آج بھی یکتا ہے اور کسی شخص یا شے کی اسے ضرورت و حاجت نہیں ہے البتہ دوسرا احتمال زیادہ قوی دکھائی دیتا ہے، یہ بھی قابلِ ذکر ہے کہ لَا يَسْتَوْحِشُ میں لفظ لا، زائدہ ہے اور تاکید کے لیے آیا ہے، اگرچہ بعض افراد نے اسے جملہ کو مستانفہ شمار کیا ہے۔

https://downloadshiabooks.com/

نکات

یہاں بہت سے پُر معنی نکات چھپے ہوئے ہیں، جن سے گراں قدر درس ملتے ہیں، نتیجتاً بہت سے اعتقادی مسائل خاص طور پر ''معرفت خدا اور اُس کے اَسماء اور صفات'' سے متعلق مسائل حل ہو جاتے ہیں، من جملہ:

ا۔ مخلوق اور خالق کا رابطہ اور وحدتِ وجود کا مسئلہ

خالق کا مخلوق سے اور پیدا کرنے والے کا، پیدا ہونے والوں سے کیا رابطہ ہے، اِس مسئلے پر فلسفیوں اور دانشوروں میں کافی بحث و مباحثے پائے جاتے ہیں۔ ایک گروہ نے اِفراط کا راستہ پکڑ لیا ہے اور موجود اور وُجود کے درمیان وحدت کو بیان کرتے ہیں اور اُسے عین مخلوقات قرار دیتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ عالم ہستی میں ایک وجود کے علاوہ کوئی وجود نہیں اور اُس کے علاوہ جو بھی ہے وہ اُس کی ذات کے جلوے ہیں۔ یا دوسرے الفاظ میں درحقیقت ایک چیز کے علاوہ کچھ بھی نہیں ہے اور تعداد اور کثرت محض خیال اور سراب ہے جو دُور سے پانی نظر آتا ہے، مگر درحقیقت کچھ نہیں ہے۔

بعض اوقات وحدت واتحاد کے بجائے حلول کی تعبیر بیان کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ وہ ہر وقت کسی ایک لباس میں اُترتا ہے، اور کہتے ہیں کہ یہ بے خبر لوگ دوگانگی کا احساس غلط کرتے ہیں، جبکہ ایک وجود سے زیادہ کچھ نہیں ہے۔[۱] مختصراً یہ کہ لوگ عالم ہستی کو دریا کی طرح سمجھتے ہیں اور موجوداتِ عالم کو دریا کے قطروں کی طرح:

ہر کس کہ ندیدہ قطرہ با بحر یکی — حیران شدہ اَم کہ چون مسلمان باشد؟

قطرے میں نہ جو بحر کا نظّارہ کرے — حیران ہوں میں کیسا مسلمان ہے وہ؟

گویا یہ لوگ ثنویّت کو نہیں مانتے اور اسے خیالِ محض کہتے ہیں اور ان کے مطابق اگر کوئی وجود اور موجود کی وحدت کو نہ تسلیم کرے، تو وہ صحیح معنی میں صوفی نہیں کہلا سکتا، کیوں کہ تصوّف کی بنیاد ہی وحدت الوجود ہے!! البتہ ان کے بعض کلمات

---

[۱] بہت سے متصوفہ یہی بات کرتے ہیں، جیسا کہ ان کے بزرگوں سے نقل ہے کہ بعض کہتے ہیں ''انی انا اللہ'' میں خدا ہوں، بعض نے نغمے بنائے کہ سبحانی ما اعظم شانی'' میں منزّہ ہوں، میرا مقام کتنا بلند ہے حتیٰ کہ بعض نے تو اپنے اشعار میں کہہ دیا کہ بت پرستی بھی خدا پرستی ہے:

مسلمان گر بدانستی کہ بت چیست — یقین کردی کہ حق در بت پرستی است!

جیسا کہ مولوی کے قابلِ اعتراض اشعار میں (نعوذباللہ) اللہ کو ایک مکار اور عیّار بت شمار کیا ہے۔ جو کبھی آدمؑ کی شکل میں کبھی نوحؑ کی شکل میں اور کبھی محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی شکل میں آیا اور ایک دن علیؑ اور ذوالفقار بن کر آیا اور بالآخر ایک دن منصور کے قالب میں ڈھل گیا اور سولی پر چڑھ گیا۔ (عارف وصوفی چہ می گویند، ص ۱۱۷)

https://downloadshiabooks.com/

قابلِ توجیہ ہیں، مثلاً یہ لوگ کہتے ہیں کہ وجودِ حقیقی جو عالم میں قائم بالذّات ہے، وہ ایک سے زیادہ نہیں اور باقی تمام موجودات اس سے وابستہ ہیں (جیسا کہ معنی اسمیہ اور حرفیہ کے بارے میں بات ہوئی) گویا ذاتِ خداوند عالم کے علاوہ جو ہے وہ اتنا چھوٹا اور حقیر ہے کہ اسے حساب میں لانا صحیح نہیں۔ اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ اس کا وجود ہی نہیں ہے۔

مگر بلاخوفِ تردید اُن کی کچھ باتیں توجیہہ اور دفاع کے قابل نہیں۔ وہ کھلم کھلا کہتے ہیں کہ عالمِ ہستی میں ایک سے زیادہ وجود پائے نہیں جاتے اور باقی سب کے سب خیالات اور وہم و گمان ہیں، یہاں تک کہ بُت پرستی کو بھی اگر محدود شکل نہ دی جائے تو وہ بھی عین خدا پرستی ہے، کیونکہ سارا عالم وہی ہے اور وہ ہی سارا عالم ہے۔ یہ جملہ کسی کا بھی ہو، اس سے ہٹ کر کہ یہ باتیں بعید از عقل، بلکہ بعید از بدیہیّات ہیں۔ یہ لوگ علّت و معلول، خالق و مخلوق، عابد و معبود سب کا سرے سے انکار کر رہے ہیں۔

یہ اسلامی عقائد کے لحاظ سے بھی فاسد نظریات ہیں، جو کسی سے پوشیدہ نہیں، کیونکہ اِس طرح تو خدا، بندہ، پیغمبرؐ، امّت، عابد و معبود اور شارع و مکلّف کا کوئی مفہوم ہی باقی نہیں رہے گا۔ یہاں تک کہ جنّت و دوزخ، بلکہ جنّتی اور دوزخی لوگ سب کے سب ایک جیسے ہو جائیں گے۔ اور سب کے سب اُس کے عینِ ذات ہیں اور یہ دوئی اور تمام موجودات کا جُدا جُدا ہونا سب وہم و خیال کی پیداوار ہیں کہ اگر ہم خیالات اور وہم کے پردوں کو چاک کر دیں تو اُس کے علاوہ کوئی چیز نہیں ہوگی، وغیرہ وغیرہ۔

اس عقیدے کا سب سے خطرناک لازمہ یہ ہوگا کہ خدا مجسّم ہے یا وہ حلول کر سکتا ہے، یوں طرح سے یہ نظریہ نہ تو عقلِ سلیم کے لیے قابلِ قبول ہے اور نہ عقائدِ اسلامی اور قرآن مجید کے ساتھ سازگار ہے، اسی لیے فقیہِ نامدار مرحوم محقق یزدی (قدس سرہ) عُروۃُ الوُثقیٰ کے متن میں کفّار سے متعلق بحث میں لکھتے ہیں:

"لَا اِشْكَالَ فِيْ نَجَاسَةِ الْغُلَاةِ وَ الْخَوَارِجِ وَ النَّوَاصِبِ وَ أَمَّا الْمُجَسِّمَةُ وَ الْمُجَبِّرَةُ وَ الْقَائِلِيْنَ بِوَحْدَةِ الْوُجُوْدِ مِنَ الصُّوفِيَةِ اِذَا الْتَزِمُوْا بِاَحْكَامِ الْاِسْلَامِ فَالْاَقْوىٰ عَدَمُ نَجَاسَتِهِمْ اِلَّا مَعَ الْعِلْمِ بِاِلْتِزَامِهِمْ بِلَوَازِمِ مَذَاهِبِهِمْ مِنَ الْمَفَاسِدِ"[1]

غالیوں و خوارج و نواصب [2] کے ناپاک ہونے میں کوئی شک نہیں اور وہ لوگ جو خدا کے مجسّم ہونے اور جبر کے

---

[1] عُروۃ الوُثقیٰ، بحثِ نجاستِ کافر، مسئلہ ۲

[2] غلاۃ، یعنی وہ افراد جو ائمہ اہل بیتؑ خاص طور پر حضرت علیؑ کے بارے میں غلو کرتے ہیں اور انہیں (نعوذ باللہ) خدا (رب اور اللہ) یا خدا سے متحد قرار دیتے ہیں جبکہ "خوارج" وہ باقی ماندہ گروہ ہے جس نے جنگِ نہروان میں حضرت علیؑ سے جنگ کی اور شکست کھائی۔ اسی طرح "نواصب" دشمنانِ اہل بیتؑ کو کہا جاتا ہے۔

https://downloadshiabooks.com/

قائل ہیں اور اسی طرح صُوفیہ میں سے ایک ایسا گروہ جو وحدتِ وجود کا عقیدہ رکھتا ہے، اگر یہ لوگ احکامِ اسلام پر عمل کرتے ہوں تو اَقویٰ یہ ہے کہ وہ نجس نہیں ہیں، لیکن اگر یہ واضح طور پر معلوم ہوجائے کہ یہ عقائدِ مُفسدہ کے پابند ہیں، جو ان کے مذہب کا لازمہ ہے تو وہ کافر ہیں۔ اس عبارت میں دو نکات قابلِ توجّہ ہیں: ایک تو یہ کہ عقیدۂ وحدتِ وجود کے قائل افراد کو جبریین اور جسمانیت کے قائل حضرات کی صَف میں شمار کیا گیا ہے۔

اور دوسرا یہ کہ اُن کے عقائد ایسے دینی مفاسد سے بھرپور ہیں کہ اگر وہ اُن پر عمل پیرا اور پابند ہوں، تو مسلمان نہیں ہیں اور اگر اِن لوازمات کے پابند نہ ہوں تو مسلمانوں کے زُمرے میں ہوں گے۔ یہاں یہ وضاحت ہوجاتی ہے کہ اُن کے مذہب میں ایسے مفاسد شامل ہیں کہ اگر اُن پر ملتزم ہوں، تو مسلمانوں کی صف سے ہی خارج ہوجاتے ہیں۔

قابلِ توجّہ بات یہ ہے کہ ہماری معلومات کے مطابق ''عُروَۃُ الوُثقیٰ'' پر حاشیہ لکھنے والے تمام افراد نے اس بات کو قبول کیا ہے یا پھر کسی ایک قید کا اضافہ کیا ہے۔ (مثلاً توحید اور رسالت کے انکار کا موجب نہ بنیں)[1] یہ مسئلہ کون کون سے مفاسد کا باعث بن سکتا ہے، اس کی وضاحت کے لیے، مثنوی کے کچھ اشعار کی طرف اشارہ مناسب رہے گا۔ مثنوی کی چوتھی کتاب میں ایک طولانی داستان کے ساتھ ''سُبحَانِیْ مَا اَعْظَمَ سَاْنِیْ'' کا قصّہ ذکر کیا گیا ہے جو بایزید سے متعلق ہے، جب اُس کے مریدوں نے اُس پر اعتراض کیا کہ آپ نے یہ کیسا نامناسب جملہ کہا ہے۔ گویا تو اپنے اس جملے میں اپنے آپ کو ''لَا اِلٰہَ اِلَّا اَنَا فَاعْبُدُ وْنِی'' میرے سوا کوئی معبود نہیں پس میری عبادت کرو کا مصداق ٹھہراتے ہو تو اُس نے جواب دیا کہ اگر میں نے یہ جملہ دوبارہ کہا تو تم سب کلہاڑیاں اُٹھا کر مجھ پر حملہ کر دینا۔ اور شعر پڑھا:

نیست اندر جبہ ام غیر از خدا   چند جوئی در زمین و در سما
کوئی بھی مجھ میں نہیں غیرِ خدا   ڈھونڈ آؤ چاہے تم ارض و سما

اُس کے مریدوں نے کلہاڑیاں اُٹھا کر اُس پر حملہ کیا، مگر اُن لوگوں نے دیکھا کہ جو کلہاڑی وہ اُسے مار رہے ہیں، وہ خود ان کو زخمی کر رہی ہے۔ یہ بناوٹی افسانہ بتاتا ہے کہ اس راستے کے لوگ کس حد تک آگے بڑھ سکتے ہیں۔ اس گفتگو کو علمائے عصرِ حاضر میں سے ایک عالم کے جملے پر ختم کرتے ہیں جو شرح نہج البلاغہ میں فرماتے ہیں: ''یہ مکتبِ فکر (وحدتِ وجود یعنی وحدتِ مُوجود) تمام تر عقلی و فکری اور بصیرتی قوانین کو اور اَدیانِ الٰہی کے مقاصِد کو پامال کر رہا ہے، یہ پورے عالم کو خدا کے مرتبے تک بلند کرتا ہے، یا پھر خدا کو مخلوقات کی حدود معیار تک نیچے لا کر مخلوقات کے ساتھ ایک بنا دیتا ہے، ایسا لگتا ہے کہ اس

[1] مزید معلومات کے لیے ''مصباح الہدیٰ'' جلد ۱، ص ۴۱۰، تالیف مرحوم آیۃ اللہ شیخ محمد تقی آملی (فقیہ و فلسفی) اور اسی طرح تقریرات مرحوم آیۃ اللہ خوئی جلد ۳، ص ۸۱، ۸۲ ملاحظہ کریں۔

https://downloadshiabooks.com/

مکتبِ فکر نے بعض لوگوں کے اذہان کو ان کے ذوق سلیقہ یا اشکالات واعتراضات سے فرار اختیار کرنے کے عنوان سے جھکڑ لیا ہے، نہ یہ کہ نفسیاتی طور پر غور وفکر اور حقائق سے آگاہی کے لیے تدبیر کی راہوں کو مسدود کیا ہوا ہو۔ [۱]

۲۔ صفاتِ خدا کی حقیقت سے جاہلانہ اِنحراف

اگر ہم مولا علیؑ کے کلام کے اس فقرے کو بخوبی سمجھنے کی کوشش کریں تو اصلِ توحید اور حقیقت صفاتِ خدا سے انحراف کے تمام تر راستے بند ہو جائیں گے اور ان آیات کا حقیقی مفہوم واضح ہو جائے گا۔

"وَنَحْنُ اَقْرَبُ اِلَيْهِ مِنْ حَبْلِ الْوَرِيْدِ" [۲]

''ہم انسان کی رگِ گردن (شہ رگ) سے زیادہ اُس کے قریب ہیں''۔

اور اسی طرح کا مفہوم دیگر آیات قرانی میں بھی پایا جاتا ہے:

"وَهُوَ مَعَكُمْ اَيْنَمَا كُنْتُمْ"

''وہ تمہارے ساتھ ہے جہاں کہیں بھی تم رہو۔'' [۳]

"وَمَا يَكُوْنَ مِنْ نَجْوٰى ثَلَاثَةٍ اِلَّا هُوَ رَابِعُهُمْ" [۴]

''کوئی بھی بات کسی تین افراد کے درمیان نہیں ہوتی، مگر یہ کہ وہ اُن کا چوتھا ہوتا ہے۔''

"اَللّٰهُ نُوْرُ السَّمٰوَاتِ وَالْاَرْضِ"

''اللہ آسمانوں اور زمین کا نور ہے۔'' [۵]

"وَاعْلَمُوْا اَنَّ اللّٰهَ يَحُوْلُ بَيْنَ الْمَرْءِ وَقَلْبِهٖ" [۶]

''جان لو کہ اللہ انسان اور اُس کے قلب کے درمیان حائل ہو جاتا ہے۔''

یہ نکتہ وحدتِ وجود سے متعلق تمام تر بحثوں کو (صحیح معنوں میں) مکمل کر دینے کے علاوہ صفاتِ خدا کو سمجھنے کی راہ کے

---

[۱] ترجمہ و تفسیر نہج البلاغہ، اُستاد جعفری، جلد ۲، صفحہ ۶۴

[۲] سورۂ قٓ، آیت ۱۶

[۳] سورۂ حدید: آیت ۴

[۴] سورۂ مجادلہ: آیت ۷

[۵] سورۂ نور: آیت ۳۶

[۶] سورۂ انفال: آیت ۲۴

https://downloadshiabooks.com/

تمام ممکنہ انحرافات کا راستہ روک دیتا ہے۔ مگر افسوس وادیِ حیرت کے بھٹکے ہوئے لوگ اُن مسائل میں پڑ گئے ہیں کہ جن کے بیان سے انسان کو شرم آتی ہے۔ من جملہ وہ لوگ جو مجسمہ کہلاتے ہیں، یعنی خداوند متعال کے لیے صفاتِ ممکنات کے قائل ہیں اور اُسے جسم وجسمانیات کی حد تک نیچے لے آتے ہیں اور اُس کے لیے ہاتھ، پاؤں، شکل وصورت اور گھنگریالے بالوں اور اُس کے لیے زمان ومکان کے قائل ہیں۔ کچھ لوگ اُسے دنیا میں دیکھنے کے قابل تصوّر کرتے ہیں اور کچھ لوگ اُسے آخرت میں قابلِ دید سمجھتے ہیں۔

''محقق دَوانی'' جو معروف فلسفی ہیں، بحارُ الانوار سے نقل کرتے ہوئے کہتے ہیں: اہلِ تشبیہ میں سے ایک گروہ، خدا کا حقیقتاً جسم سمجھتا ہے۔ بعض اُسے گوشت اور خون سے مُرکب سمجھتے ہیں، اور بعض اُسے ایسا چمکتا ہوا نور سمجھتے ہیں جو چاندی کے سُفیدی مائل ڈلے جیسا ہے اور اُس کی لمبائی اِن لوگوں کے اپنے ہاتھ کی سات بالشت کے برابر ہے۔ ایک گروہ اُسے انسان جیسا اور ایک گروہ کے افراد اُسے ایک سادہ لوح جوان کی طرح سمجھتا ہے کہ جس کے گھنگریالے بال ہیں اور بعض اُسے ایک کالے اور سفید بالوں والے بوڑھے شخص سے تشبیہ دیتے ہیں اور بعض اُسے (دوسرے جسموں سے مختلف) ایک جسم سمجھتے ہیں اور بعض افراد اسی طرح مختلف قسم کے باطِل، بے بنیاد اور سطحی عقیدے رکھتے ہیں۔ [۱]

اس سے زیادہ تعجب خیز بات یہ ہے کہ رسولِ خدا ؐ اور بعض صحابہ سے کچھ روایات نقل کی ہیں (جو کہ بے بنیاد اور جعلی احادیث ہیں) اُن میں خدا کے عجیب وغریب جسمانی اوصاف ذکر ہوئے ہیں۔ مثلاً ایک حدیث جو ابنِ عباس ؓ سے نقل کی ہے کہ ان سے پُوچھا گیا: کیا آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے کبھی اپنے پروردگار کو دیکھا ہے؟ تو ابنِ عباس ؓ نے کہا: ہاں۔ سوال کیا گیا: خدا کو کیسا پایا؟ تو کہا: ایک ہرے بھرے سرسبز باغ میں دیکھا کہ وہ ایک سونے کی کُرسی پر بیٹھا ہوا ہے اور اُس کے نیچے ایک سنہرا فرش بچھا ہوا ہے جسے چار فرشتوں نے اُٹھایا ہوا ہے۔ [۲] البتہ اِس طرح کی بہت سی روایات صحیح بُخاری اور سنن ابنِ مَاجہ وغیرہ میں نقل ہوئی ہیں، جن میں وضاحت کے ساتھ یہ کہا گیا ہے کہ خدا بروزِ قیامت آنکھوں سے دیکھا جائے گا۔ [۳] یہاں تک کہ بعض روایات میں تو یوں وضاحت کی گئی ہے کہ اہلِ جنت خدا کو ایسے دیکھتے ہیں جیسے چودھویں کی رات میں چاند نظر آتا ہے۔ [۴] اِن اَحادیث کی وجہ سے بہت سے اہلسنّت دانشور خدا کے دیکھے جانے کے معتقد ہیں اور اس موضوع کا پُرزور

---

[۱] بحارُ الانوار، جلد ۳، ص ۲۸۹

[۲] توحید ابنِ خذیمہ ص ۲۱۷ مطابق بحوث فی الملل والنحل جلد ۱، ص ۱۴۵

[۳] صحیح بُخاری، جلد ۶، ص ۵۶، تفسیر سورۂ نساء اور سُنَن ابن مَاجہ، جلد ۱ مقدمہ باب ۱۳ حدیث ۱۷۷

[۴] ان کے جعلی ہونے کے اعتقاد کے ساتھ اور ان روایات کے جوابات جو کہ آیات اور روایات سے ہی ہیں کہ خدا ان آنکھوں سے نہیں دیکھا جاسکتا نہ دنیا میں اور نہ ہی آخرت میں، جلد ۴، تفسیر موضوعی پیامِ قرآن صفحہ ۲۴۱ تا ۲۵۱ کی طرف رجوع کریں۔

https://downloadshiabooks.com/

دفاع بھی کرتے ہیں۔ جب کہ قرآن وضاحت کے ساتھ تردید کرتا ہے کہ

"لَا تُدْرِكُهُ الْاَبْصَارُ" [۱]

کوئی آنکھ اُسے دیکھ نہیں سکتی۔

اور حضرت موسیٰ علیہ السلام سے فرمایا:

"لَنْ تَرَانِيْ" [۲]

"تم مجھے ہرگز نہیں دیکھ سکتے۔" اور ہم جانتے ہیں کہ "لن" کا لفظ ابدی نفی کے لیے آتا ہے۔

خطبہ اِشباح میں یہ مسئلہ وَضاحت کے ساتھ بیان ہوا ہے، جیسا کہ امیرالمؤمنینؑ فرماتے ہیں:

"وَالرَّادِعُ اَنَاسِيَّ الْاَبْصَارِ عَنْ اَنْ تَنَالَهُ اَوْ تُدْرِكَهُ اَوْ تُبْصِرَهُ"

"وہ جس نے لوگوں کی آنکھوں کو اپنی پاک ذات کے مشاہدے اور اُس تک پہنچنے سے باز رکھا۔" [۳]

ایک اور خطبے میں اپنے فصیح وبلیغ بیان میں فرماتے ہیں:

"اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِيْ لَا تُدْرِكُهُ الشَّوَاهِدُ وَلَا تَحْوِيْهِ الْمَشَاهِدُ وَلَا تَرَاهُ النَّوَاظِرُ وَلَا تَحْجُبُهُ السَّوَاتِرُ" [۴]

تمام تعریف اُس خدا کے لیے سزاوار ہے کہ جسے حواس درک نہیں کر سکتے اور کوئی جگہ اُسے اپنے آپ میں سما نہیں سکتی اور پردے اُسے چھپا نہیں سکتے۔ عقائد کے علاوہ یہ موضوع ویسے بھی خلافِ عَقل ہے، کیونکہ اگر خدا دیکھے جانے کے قابل ہو تو یقیناً وہ جسم اور جگہ اور سمت میں مقید ہوگا اور اس کا نتیجہ محدود ہونا اور قابلِ تغیر ہونا ہے اور اس طرح وہ واجب الوجود کی بلندی سے نیچے آکر ممکن الوجود کہلائے گا۔ اس مقام پر امیرالمؤمنین حضرت علی ابن ابی طالب علیہما السلام کی بیان شدہ تعبیرات چاند، سورج کی طرح چمک رہی ہیں اور حقائق کے چہرے روشن کرتی ہیں اور باطل اور خرافات کو نابود کر دیتی ہیں اور ہمیں توحید خدا کو پہچاننے کا سب سے دَقیق، سب سے حسین اور سب سے پیارا درس دیتی ہیں۔

جیسا کہ ہوتا آرہا ہے کہ افراط کرنے والے گروہ کے مقابلے میں تفریط کرنے والے خُودنمائی کرتے ہیں۔ تشبیہ کے

---

[۱] سورۂ انعام، آیت ۱۰۳

[۲] سورۂ اعراف، آیت ۱۴۳

[۳] نہج البلاغہ، خطبہ ۹۱

[۴] نہج البلاغہ خطبہ ۱۸۵

https://downloadshiabooks.com/

قائل حضرات خدا کو جسم اور جسمانیات کی حد تک نیچے لے آئے ہیں، جبکہ کچھ لوگوں نے بالکل ہی اُلٹا راستہ چُن لیا، یعنی وہ یہ عقیدہ رکھتے ہیں کہ خدا کو پہچاننا بالکل ناممکن ہے اور نہ اُس کی ذات کی گہرائیوں کو سمجھا جا سکتا ہے اور نہ ہی اُس کی صفات کو سمجھ سکتے ہیں اور ہم خدا کی صفات کے بارے میں مختصر سے مفہوم کے سوا کچھ بھی نہیں سمجھ سکتے۔ جب ہم یہ کہتے ہیں کہ وہ عالم ہے تو ہم اتنا ہی سمجھ سکتے ہیں کہ وہ جاہل نہیں ہے۔ مگر اُس کے عالم ہونے کا کوئی مفہوم مطلقاً ہمارے علم میں نہیں آ سکتا، اس طرح یہ گروہ انسان کے فخر کا باعث ہونے والی سب سے بڑی چیز جو کہ معرفتِ خدا ہے، ضائع کر بیٹھا ہے۔ اور اس گروہ نے سراسر ظلمت و تاریکی کے راستے پر قدم رکھا ہے اور قرآن مجید کی تعلیمات کے خلاف ہے۔ ہم اس گفتگو کو نہج البلاغہ کی ایک آسان تعبیر پر ختم کرتے ہیں، کہ مولاؑ نے فرمایا:

"لَمْ يُطْلِعِ الْعُقُوْلَ عَلٰى تَحْدِيْدِ صِفَتِهٖ وَ لَمْ يَحْجُبْهَا عَنْ وَاجِبِ مَعْرِفَتِهٖ فَهُوَ الَّذِيْ تَشْهَدُ لَهٗ أَعْلَامُ الْوُجُوْدِ عَلٰى إِقْرَارِ قَلْبِ ذِي الْجُحُوْدِ تَعَالَى اللّٰهُ عَمَّا يَقُوْلُ الْمُشَبِّهُوْنَ بِهٖ وَ الْجَاحِدُوْنَ لَهٗ عُلُوًّا كَبِيْرًا"۔[1]

اُس نے عقلوں اور ذہنوں کو اپنی صفات سے آگاہ نہیں کیا، اس کے ساتھ ساتھ اُنہیں اپنی معرفت اور شناخت کی بقدرِ ضرورت آگاہی سے رُوکا بھی نہیں، وہی ہے جس کی نشانیوں نے منکروں کے دلوں کو اُس کا اِقرار کرنے پر مجبور کر دیا ہے۔ جی ہاں وہ تشبیہ دینے والوں کی باتوں سے کہیں بُلند تر ہے۔ یعنی وہ لوگ جو اُسے مخلوق سے تشبیہ دیتے ہیں اور منکر لوگ یا وہ جو ایمان ہی نہیں لائے، یا وہ جو اُس کی شناخت کو غیر ممکن جانتے ہیں۔

خلاصۂ کلام

سیدھی راہ پانے کا بہترین طریقہ معرفت اور شناختِ پروردگار ہے، جو افراط اور تفریط کا درمیانی راستہ ہے یعنی تشبیہ اور تعطیل سے خالی ہے، جیسا کہ مولاؑ کے قول میں ذکر ہوا۔ صفاتِ الٰہی کی کیفیت اور اُس کی معرفت کا صحیح راستہ، نہج البلاغہ کے دوسرے خطبوں میں نہایت آسان، سلیس اور عام فہم تعبیرات کے ساتھ بتایا گیا ہے، اُن کا ذکر اُن کے موقع و محل پر کیا جائے گا۔

۳۔ اُس کی پاک ذات سے حدوثِ ذاتی اور زمانی کی نفی کرنا

جو تعبیرات اس مقام پر ذکر کی گئی ہیں، اُن سے یہ پتا چلتا ہے کہ اُس کی پاک ذات، حدوثِ ذاتی اور حدوثِ زمانی

[1] نہج البلاغہ: خطبہ ۴۹

https://downloadshiabooks.com/

سے بھی پاک ہے۔حدوثِ زمانی سے مُراد یہ ہے کہ ایک شے کسی وقت وجود میں آئے،یعنی یہ کہا جائے کہ کسی زمانے میں اس کا وجود نہ ہو اور بعد میں وجود میں آئے۔اور یہ معنی مادّی دنیا کے بننے کے بعد ہی تصور کیے جاسکتے ہیں، کیوں کہ جہانِ مادّہ (مادّی دُنیا) کے خلق ہونے کے بعد زمانہ خلق ہوا اور اُس کے بعد ہی حدوثِ زمانی اور عدمِ زمانی کا مفہوم سامنے آئے گا۔مگر خدا مادّی دنیا اور اس کے زمانے دونوں کی تخلیق سے پہلے موجود تھا۔وہ زمانے سے وجود میں نہیں آیا،جبکہ حدوثِ ذاتی سے مراد یہ ہے کہ مادّی دنیا سے ہٹ کر یہ کہا جائے کہ کوئی چیز اپنی ذات میں خود بخود وجود میں نہیں آئی ہے، بلکہ اُس کی ذات کسی اور ذات کے ہونے کی وجہ سے ہے۔یعنی اُس کا وجود کسی اور ذات سے اس طرح وابستہ ہے کہ وہ ہے تو یہ ہے اور اگر وہ نہیں رہا تو یہ نہیں رہے گا۔اور یہ بات ظاہر ہے کہ پروردگارِ عالم کی پاک ذات کا ان دونوں حدوث سے کوئی تعلق نہیں، کیوں کہ وہ واجب الوجود ہے، وہ ہمیشہ سے ہے اور ہمیشہ رہے گا، بلکہ اُس کا وجود کسی کے سبب سے نہیں وہ خود عینِ ہستی اور عینِ ذات ہے۔

۴۔خداوندِ عالم کے لیے لفظ ''موجود'' کا استعمال

کیا ''موجود'' کا لفظ خدا کے لیے استعمال کرنا ٹھیک ہے؟ اوپر بیان کی گئی تعبیر سے تو یہ ظاہر ہوتا ہے کہ اس تعبیر کا خدا کے لیے استعمال کرنا غلط نہیں ہے، جیسا کہ فرمایا: ''مَوْجُودٌ لَا عَنْ عَدَمٍ'' وہ وجود رکھتا ہے، مگر اس کا یہ مطلب نہیں کہ پہلے کسی وقت میں نہیں تھا، جب کہ اس لفظ کو درحقیقت دیکھا جائے تو یہ اسم مفعول کا صیغہ ہے اور اس کا مطلب یہ بنتا ہے کہ کسی اور نے اُسے ہستی اور وجود بخشا ہے، مگر یہ لفظ یہاں اس معنی میں استعمال نہیں ہوگا، کیوں کہ یہ بات اُس کی پاک ذات سے بَعید ہے کہ اُسے کوئی وجود بخشے، بلکہ یہاں موجود کا مفہوم وجود رکھنے والے کے معنی میں ہے۔جیسا کہ نہج البلاغہ کی بعض شروح میں اس بات کی وضاحت کچھ یوں کی گئی ہے کہ ایسا موجود، جو ماہیاتِ ممکنہ سے برتر ہے اور اُس نے وجود کا لفظ اپنی ذات سے مخصوص کرلیا ہے۔بعض اوقات اُسے موجود کہا جاتا ہے مگر، یہ خود وجود اور ہستی رکھنے والے کے معنی میں استعمال ہوا ہے۔[۱]
یہ تعبیر اُصولِ کافی کی بعض روایات میں بھی اِسی مقصد سے ذکر ہوئی ہے۔[۲]

چوتھا حصّہ

أَنْشَأَ الْخَلْقَ إِنْشَاءً وَ ابْتَدَأَهُ ابْتِدَاءً بِلَا رَوِيَّةٍ أَجَالَهَا وَ لَا تَجْرِبَةٍ اسْتَفَادَهَا وَ لَا حَرَكَةٍ أَحْدَثَهَا وَ لَا هَمَامَةِ نَفْسٍ اضْطَرَبَ فِيهَا أَحَالَ الْأَشْيَاءَ لِأَوْقَاتِهَا وَ لَاءَمَ بَيْنَ مُخْتَلِفَاتِهَا وَ

[۱] مفتاح السعادۃ فی شرحِ نہج البلاغہ جلد نمبر ۱ صفحہ ۱۳۹

[۲] اصولِ کافی۔جلد ۱، باب ادنی المعرفۃ، حدیث ۱۔اور جلد ۱، باب النھی عن الصفۃ، حدیث ۱، اور جلد ۱، باب جوامع التوحید، حدیث ۴۔

https://downloadshiabooks.com/

غَرَّزَ غَرَائِزَهَا وَ أَلْزَمَهَا أَشْبَاحَهَا عَالِماً بِهَا قَبْلَ ابْتِدَائِهَا مُحِيطاً بِحُدُودِهَا وَ انْتِهَائِهَا عَارِفاً بِقَرَائِنِهَا وَ أَحْنَائِهَا.

اُس نے مخلوقات کو از غیب ایجاد کیا اور ان کی تخلیق کی ابتدا کی بغیر کسی فکر کی جولانی کے اور بغیر کسی تجربے سے فائدہ اٹھائے ہوئے یا حرکت کی ایجاد کیے ہوئے یا نفس کے افکار کی الجھن میں پڑے ہوئے۔ تمام اشیاء کو ان کے اوقات کے حوالے کر دیا اور پھر ان کے اختلافات میں تناسب پیدا کر دیا۔ سب کی طبیعتیں مقرر کر دیں اور پھر انہیں شکلیں عطا کر دیں۔ اسے یہ تمام باتیں ایجاد سے پہلے معلوم تھیں اور وہ ان کی حدود اور ان کی انتہا کو خوب جانتا تھا۔ اُسے ہر شے کے ذاتی اطراف کا بھی علم تھا اور اس کے ساتھ شامل ہو جانے والی اشیاء کا بھی علم تھا۔

شرح وتفسیر

دنیا کی تخلیق سے گفتگو کا آغاز

جو کچھ اب تک اس انتہائی اہم خطبے میں ذکر ہوا، وہ معرفتِ الٰہی کے بارے میں گہرے اور پُرمعنی اشارات ،مطالب اور مفاہیم تھے، جو انسانی معرفت کا سب سے پہلا مرحلہ ہے۔ اور اس کے بعد دنیا اور جہانِ عالم کی تخلیق اور خلقت کے آغاز اور عجائب خلقتِ زمین وآسمان سے متعلق ہے۔ اگرچہ یہ صفاتِ خدا سے متعلق ایک اختتامی کلام اور خلاصۂ کلام بھی سمجھا جا سکتا ہے۔ ابتدا میں مولا علیہ السلام فرماتے ہیں:

"اَنْشَأَ [1] الْخَلْقَ اِنْشَاءً وَابْتَدَأَهُ اِبْتِدَاءً" لَارَوِيَّةٍ [2] أَجَالَهَا [3] وَلَا تَجْرِبَةٍ اِسْتَفَادَهَا، نَفْسِ اضْطَرَبَ فِيهَا"

اُس نے تخلیق کو، بغیر کسی غور وفکر اور بغیر کسی تجربے کی ضرورت کے، بغیر کسی حرکت کو ایجاد کیے اور نفس کے افکار کی الجھنوں میں پڑے بغیر شروع کیا۔"

اس مقام پر اِمامؑ نے مخلوقات کے کاموں سے اللہ کے کاموں کو بالکل علیحدہ شمار کیا ہے، کیوں کہ مثال کے طور پر جب

[1] اَنْشَأَ، کا لفظ ،اِنشاء، سے آیا ہے اور اس کے کئی مختلف معانی ہیں مگر یہ بات واضح ہے کہ یہاں پر ایجاد کے معنی میں ذکر ہوا ہے۔

[2] رویۃ، کا لفظ مقائیسُ اللغۃ کے مُطابق سیراب ہونے کے معنی میں ہے مگر غور وفکر اور خصوصی توجّہ کے معنی میں بھی آتا ہے۔ گویا اپنی فِکر کو اُس مسئلے سے سیراب کرنا، یا مسئلے کو اپنے غور وفکر سے سیراب کرنا اور غور وفکر کا حق ادا کر دینا۔

[3] أَجَالَ، کا لفظ "جَولان" سے آیا ہے جس کا مطلب حرکت کرنا اور گردش کرنا ہے۔

https://downloadshiabooks.com/

کبھی کوئی انسان کوئی کام انجام دیتا ہے اور اگر وہ کام اُس سے پہلے کوئی سابقہ نہ رکھتا ہو، یعنی اُس سے پہلے کبھی نہ کیا گیا ہو، تو اُس کے بارے میں اُسے غور وفکر سے کام لینا پڑتا ہے اور وہ اس پر خصوصی توجّہ دیتا ہے۔ اور اگر اِس سے پہلے کبھی یہ کام انجام دے چکا ہوتا، تو وہ اپنے یا دوسروں کے تجربوں سے استفادہ کرتا اور کبھی اُس کے ذہن میں کچھ فکری حرکات پیدا ہوتی ہیں، تو اس مسئلے کی باریکیوں پر اور نتائج پر غور کرتا ہے، تاکہ اُن سے کوئی نتیجہ نکلے اور بعض اوقات تردّد کا شکار ہو جاتا ہے اور پھر بالآخر یک طرفہ فیصلے کے بعد اِس کام کو انجام دیتا ہے۔ ان چاروں حالتوں میں سے کسی ایک کا بھی خداوندعالم کی پاک ذات سے کوئی واسطہ نہیں۔ وہ کسی بھی شے کو خلق کرتے وقت نہ اُس پر غور وفکر کرنے کا محتاج ہے نہ کسی تجربے کا، نہ فکری حرکت اور ذہنی تگ ودو کا محتاج ہے اور نہ ہی کسی تردد اور اضطراب و پریشانی کا۔ گویا اِدھر ارادہ کیا اور اُدھر وہ شے خَلق ہوگئی جو کبھی تھی ہی نہیں۔

"اِنَّمَآ اَمۡرُهٗۤ اِذَاۤ اَرَادَ شَیۡـًٔا اَنۡ یَّقُوۡلَ لَهٗ كُنۡ فَیَكُوۡنُ"

"اس کا حکم تو ایسا ہے کہ جیسے ہی وہ کسی چیز کو چاہتا ہے تو اُسے کہتا ہے کہ ہو جا، اور وہ فوراً ہو جاتی ہے۔"[1]

دوسری تعبیر کے مطابق کسی کام کی انجام دہی میں چار حالتیں اُن کے لیے ہیں، جن کا علم اور قُدرت محدود ہے اور اُس کا لازمہ بنتا ہے کہ وہ غور وفکر اور تجربے یا اضطرابی کیفیت اور تردّد کا شکار بھی ہوں، مگر وہ جس کا علم و اقتدار لامحدود اور بے انتہا ہے، وہ خلقت کے وقت ان حالتوں میں سے کسی کا بھی شکار نہیں ہو سکتا۔ جو کچھ اوپر بیان کیا گیا اُس سے بخوبی پتا چلتا ہے کہ یہاں پر حرکت سے مراد وہی فکری اور اندرونی ذہنی حرکت ہے۔

مگر بعض مفسّرین کے کلام میں یہ احتمال بھی دیا گیا ہے کہ حرکت سے مراد جسمانی اور خارجی (بیرونی) حرکت ہے، جس کا لازمہ یہ ہوتا ہے کہ وہ جسم بھی رکھتا ہو اور خداوند عالم جسم اور جسمانیات سے کہیں بلند و بالاتر ہے۔ مگر پہلا مطلب زیادہ مُناسب لگتا ہے کیوں کہ اوپر کی عبارت میں جو تین حالتیں اس کے اوّل و آخر بیان کی گئی ہیں، وہ سب کی سب فیصلہ کرنے اور غور وفکر کرنے سے متعلق ہیں۔ مختصر یہ کہ خداوندِ عالم کے افعال، بندوں کے افعال سے کلّی طور پر جدا ہیں، کیوں کہ وہ نظامِ خلقت سے بخوبی آگاہ اور ہر چیز پر اپنی مکمل دسترس اور قدرتِ کامل رکھتا ہے، جس کے باعث حتمی اور اٹل فیصلہ کرتا ہے اور کسی بھی قسم کے تردّد اور تجربے کی ضرورت کے بغیر موجودات کو لباسِ وجود پہنا دیتا ہے۔ چناں چہ خلقت کے آغاز میں بھی ایسا تھا اور اس کے بعد بھی ایسا ہی ہوگا۔ اُس کے بعد موجوداتِ عالم کی خلقت اور اُن کی پیدائش کے معاملے میں پروردگارِ عالم کی خاص تدبیر اور دَقیق نظام کی جانب مولا علیؑ اشارہ فرماتے ہیں:

"اَحَالَ الۡاَشۡیَآءَ لِاَوۡقَاتِهَا"

"خدا نے ہر موجود کی پیدائش کو اُس کے خاص وقت پر مقرر کر دیا۔" (کیونکہ اُس کی پیدائش کو بتدریج اور ایک

---

[1] سورۂ یٰسین: آیت نمبر ۸۲

https://downloadshiabooks.com/

مخصوص وقت گزرنے کے ساتھ مقرر کیا، تاکہ وہ اپنی عظمت، اِقتدار اور تدبیر کو مزید آشکار کر سکے)۔

وقت کے تقرر کا اشیا کی خلقت میں کیا دخل ہے، اس کی وضاحت فرمانے کے بعد اَشیاء کے خاص داخلی اور ترکیبی نظام کی جانب اشارہ کرتے ہوئے فرمایا:

"وَلَاءَمَ بَيْنَ مُخْتَلِفَاتِهَا" [1]

"اُس نے مختلف موجودات کو ایک دوسرے سے جوڑ دیا اور "متضاد" اور مختلف اشیا کے درمیان ہم آہنگی قرار دی۔"

یہ بھی قدرت کے عجائبات میں سے ہے کہ خداوند متعال نے مختلف موجودات (مخلوقات) کو ایک دوسرے سے ایسے جوڑ دیا تھا کہ گویا سب کے سب ایک ہیں۔ ٹھنڈا اور گرم، اندھیرا اور اُجالا، موت اور زندگی، پانی اور آگ، سب کو ایک دوسرے سے جوڑ رکھا ہے، ہرے اور سرسبز درخت سے آگ پیدا کی، جب کہ انسان، حیوان، گھاس پھوس وغیرہ کے وجود کو بالکل مختلف مواد اور تراکیب سے خلق کیا اور مختلف طبائع عطا کیے، یہاں تک کہ روح و جسم کے درمیان بھی جو دو بالکل علیحدہ وجود ہیں، ان میں سے ایک کو "مجرد، نورانی" اور لطیف مادّے سے بنایا جب کہ دوسری کو ایک تاریک اور کمتر مادّے سے بنایا اور ان میں ایک گہرا رابطہ بھی برقرار رکھا۔ جب کہ یہ سب بالکل مختلف اجزا، بلکہ مختلف جسم و رُوح سے بنے ہوئے ہیں۔

پھر فرماتے ہیں:

"وَغَرَّزَ [2] غَرَائِزَهَا"

"خداوند عالم نے ان میں ہر ایک کی طبیعتیں اور فطرتیں مقرر فرمائیں اور ہر ایک کو اُس کی مخصوص اور علیحدہ فطرت اور احساس بخشا۔"

یہ اللہ کی حکمتوں میں سے ہے کہ اُس نے ہر مخلوق سے جیسی توقع رکھی جاتی ہے، ایسا ہی مزاج اُس کی فطرت میں رکھ دیا تاکہ کسی انگیزے اور محرک کا محتاج نہ ہو اور خود اپنے راستے پر اپنے اندر سے ملنے والی ہدایت کے مطابق گامزن رہے اور اگر یہ حس نہ ہوتی تو اشیا کے آثار میں دوام نہ ہوتا اور بے نظمی اُن پر حاکم ہوتی۔ آج اِنسان اور دوسری مخلوقات کی ذاتی خصلتوں کو دو مختلف تعبیروں سے واضح کیا جاتا ہے۔ بعض اوقات اسے فطرت کہا جاتا ہے، یعنی خداشناسی انسان کی فطرت میں ہے اور بعض

[1] لام، اور لائم، کے الفاظ لائم، کے مادّے سے بنے ہیں، جن کے معنی ہیں، جمع کرنا، اصلاح کرنا، کسی چیز کا دوسری چیز سے مِلا دینا، جوڑ دینا، اُس میں ضَم کر دینا۔ اسی وجہ سے زِرَہ کو لاَمَۃ، بروزنِ رحمۃ کہتے ہیں، کیونکہ اُس کے حلقے ایک دوسرے میں جڑے ہوئے ہوتے ہیں۔

[2] غَرَّزَ، کا لفظ "غَرَز" کے مادّے سے آیا ہے جو "قَرض" کے وزن پر ہے دراصل یہ لفظ سوئی چبھونے، گھسانے اور داخل کرنے کے معنی میں آتا ہے، اس کے بعد یہ لفظ انسان اور دوسری موجودات کی طبیعت اور فطرت کے لیے استعمال ہوا تو گویا طبیعتیں اور فطرتیں، ان پودوں کی طرح ہیں جنہیں انسان کے وجود کی زمین میں بویا گیا ہے۔

https://downloadshiabooks.com/

اوقات اِسے غریزے کا نام دیا جاتا ہے۔مثال کے طور پر کہا جاتا ہے کہ انسان جنسی غریزہ رکھتا ہے، یا یہ کہا جاتا ہے کہ حیوانات کی حرکات وسکنات بعض اوقات غریزے کی بنیاد پر ہوتی ہیں۔ یہ درحقیقت وہ اِصطلاح ہے، جسے دانش وروں نے انتخاب کیا ہے۔کہ ان میں سے ایک فکری بنیادیں رکھتی ہے یعنی فطرت اور دوسری غیر فکری اور احساساتی وجذباتی، عاطفی بنیادوں پر اُستوار ہے یعنی غریزہ، مگر لغوی معنی میں یہ دونوں خلقت اور پیدائش کے معنی میں استعمال ہوتے ہیں۔

اس عبارت کے آخری جملے میں فرماتے ہیں:

"آلْزَمَهَا أَشْبَاحَهَا"

اُن کی مخصوص صفات کواُن کے ساتھ کردیا۔

کچھ افراد من جملہ ''ابنِ ابی الحدید'' کہتے ہیں کہ یہ جملہ اس بات کی جانب اشارہ ہے کہ پروردگارِ عالم نے اِن غریزوں کو موجودات میں ثابت اور مستحکم قرار دیا ہے، لہٰذا "آلْزَمَهَا" کی ضمیر غرائز کی طرف لوٹ رہی ہے۔ چناں چہ مذکورہ جملہ موجودات کے غرائز ثابت ہونے کی تاکید ہے، مگر بعض کہتے ہیں کہ اس کا مطلب یہ ہے کہ تمام موجودات کو مخصوص شناخت کے ساتھ خلق کیا ہے، یعنی خداوندِ عالم نے ہر مخلوق کو کچھ انوکھی خصوصیات سے نوازا ہے، یہ مخلوقات علمِ الٰہی میں کلّیت رکھتی ہیں اور ظاہری طور پر جزئیات اور اشخاص کی شکل میں وجود میں آئی ہیں۔

اس بنا پر "آلْزَمَهَا" کی ضمیر اَشیا کی طرف لوٹ رہی ہے اور بعض شارحین نے ان دونوں تفسیروں کا احتمال دیا ہے۔مگر جیسا کہ پہلی تفسیر میں ضمیروں کی مطابقت کو محفوظ نہیں رکھا گیا اور یہ کہ اس تفسیر کے مطابق جملہ تاکیدی شمار ہوگا، اور کوئی نیا مطلب سامنے نہیں آئے گا، لہٰذا دوسری تفسیر زیادہ مناسب اور صحیح ہے۔مزید وضاحت: کہ خدا نے ہر مخلوق کو دو قسم کی خصوصیات سے نوازا ہے۔پہلی وہ خصوصیات جو اس کی ذات کے اندر ہیں اور حضرت امام علیؑ نے اُنہیں غرائز کے نام سے تعبیر فرمایا ہے۔

اور دوسری وہ خصوصیات جو ظاہری پہلو رکھتی ہیں، جیسے کہ زمان ومکان اور دیگر جزئیات جنہیں مولاؑ نے "آلْزَمَهَا أَشْبَاحَهَا" کے جملے سے تعبیر فرمایا ہے۔اور اس طرح سے اُس نے اپنی حکمت بالغہ سے تمام موجودات کے لیے اندرونی اور بیرونی خصوصیات مُقرر فرمائیں تاکہ ہر مخلوق اپنے اپنے خاص وظائف اور کاموں کو انجام دے اور اُس کی دوسری مخلوقات سے الگ ایک پہچان ہو۔[1]

---

[1] "أَشْبَاح" کا لفظ "شَبَح" کی جمع ہے۔ بہت سے اہلِ لغت کی وضاحت کے مطابق، دراصل یہ شخص کے معنی میں آتا ہے، اور آشکار یا ظاہر اور نمایاں ہونے والی چیز کے معنی میں بھی استعمال ہوتا ہے۔اور آج کل یہ لفظ کسی ایسی آدھی نظر آنے والی شے کو کہا جاتا ہے جو اچانک پوری طرح سے ظاہر اور آشکار ہوجائے، یہاں پر "شَبَح" اسی معنی میں ہے۔

https://downloadshiabooks.com/

نکتہ

موجوداتِ عالم کی فکری اور تکوینی ہدایت

مذکورہ جملوں میں ایک ایسے نکتے کی جانب اِشارہ ہے، جس کی قرآن مجید میں بھی مکرّر تاکید ہے۔ اور وہ یہ کہ اس عالم کی تمام تر موجودات ومخلوقات، ایک خاص وقت کی بندش میں ہیں۔ آپس میں تمام اِختلافات اور تضاد کے باوجود ایک دوسرے سے میل جول رکھتی ہیں اور ایک دوسرے کی تکمیل اور ضرورتوں کو پورا کرنے کا باعث ہیں اور ہمیشہ اپنی ذات کے اندرونی اور بیرونی نظم کے مطابق ہدایت پاتے ہوئے ایک ہدف کے ساتھ کارواں کی صورت میں منزلِ آخر کی طرف رواں دواں ہیں اور کبھی اپنے راستے سے نہیں بھٹکتیں اور مستقل اپنے مقصد کی جانب بڑھتی رہتی ہیں۔

گرمیوں اور بہار کے موسم میں درختوں کا پھل پھول جانا، اور سردیوں میں سُوکھ کے خشک ہوجانا، سورج کا بارہ بُرجوں میں حرکت کرنا، نظامِ شب وروز کی کیفیت اور زمین کا اپنے گرد گھومنا، اور اسی طرح سے انسان کی اندرونی اور بیرونی قوتیں یہ سب کی سب اللہ کی تکوینی ہدایت کی گواہ ہیں۔ جیسا کہ قرآن مجید حضرت مُوسیٰ علیہ السلام کی زبانی بیان کرتا ہے۔

"رَبُّنَا الَّذِیۡۤ اَعۡطٰی کُلَّ شَیۡءٍ خَلۡقَہٗ ثُمَّ ہَدٰی"

"ہمارا پروردگار وہ ہے جس نے ہر چیز کو اُس کے مخصوص انداز سے خَلق کیا پھر اُس کی ہدایت کی۔"[1]

اور فرمایا:

"فِطۡرَتَ اللّٰہِ الَّتِیۡ فَطَرَ النَّاسَ عَلَیۡہَا"

"توحید اور اسلام خدا کی وہ فطرت ہے جس پر اُس نے انسانوں کو پیدا کیا۔"[2]

اور فرماتا ہے:

"وَاِنۡ مِّنۡ شَیۡءٍ اِلَّا عِنۡدَنَا خَزَآئِنُہٗ وَمَا نُنَزِّلُہٗۤ اِلَّا بِقَدَرٍ مَّعۡلُوۡمٍ"

"ہر شے کے خزانے ہمارے پاس ہیں اور ہم کسی چیز کو سوائے اُس کی خاص مقدار (اور خاص نظم وحساب) کے علاوہ نازل نہیں کرتے۔"[3]

[1] سورۂ طٰہٰ: آیت ۵۰

[2] سورۂ روم: آیت ۳۰

[3] سورۂ حجر: آیت ۲۱

https://downloadshiabooks.com/

درحقیقت یہ سب موضوعات اِس عالم میں خداوند عالم کی عظیم نشانیوں کو بیان کرتے ہیں، جن پر انسان جتنا زیادہ سے زیادہ غور کرے، اُتنا زیادہ ہدایتِ تکوینی اور نظم وضبط اور وقت کی بندش اور مخلوقات کی آپس میں محبت اور ضرورت مند ہونے وغیرہ جیسے مسائل سے آگاہ ہوتا جائے گا۔ حضرت علی علیہ السلام مزید فرماتے ہیں:

"عَالِماً بِهَا قَبْلَ ابْتِدَائِهَا مُحِيطاً بِحُدُودِهَا وَانْتِهَائِهَا عَارِفاً بِقَرَائِنِهَا [۱] وَأَحْنَائِهَا [۲]، [۳]

"ان سب چیزوں سے وہ اُس وقت بھی آگاہ تھا جب اُنہیں پیدا ابھی نہ کیا تھا اور اُن کی تمام حُدود اور ضرورتوں سے باخبر تھا۔"

یہ تین جملے گویا درحقیقت پچھلے جملوں کے لیے دلیل اور وضاحت کے طور پر یہاں لائے گئے ہیں۔ کیونکہ جو ذات ہر مخلوق کو اُس کے مناسب وقت میں ایجاد کرنا چاہتی ہے اور ساتھ ہی ساتھ مختلف قسم کی اشیا اور مخلوقات کو ایک دوسرے کے ساتھ جوڑ کر ایک دوسرے کی ضرورت بنانا چاہتی ہے اور اُن کے اندرونی غریزوں اور بیرونی لوازمات کو اپنی اپنی جگہ رکھنا چاہتی ہو، ایک طرف تو اُس ذات کو کامل علم اور واقفیت کی ضرورت ہے اور دوسری جانب اُس کا ہر شے پر مکمل احاطہ اور قدرتِ تامّہ اور کاملہ رکھنا بھی ضروری ہے۔ اس حوالے سے حضرت مولا علیؑ فرماتے ہیں کہ:

"عَالِماً بِهَا قَبْلَ ابْتِدَائِهَا ...."

"خداوندِ عالم تمام اشیاء کو خلق کرنے سے پہلے، اُن سے آگاہ تھا اور اُن کی تمام تر حدود اور نتائج سے واقف تھا اور وہ اِن سب پر مکمل قدرت وتوانائی رکھتا تھا۔"

نہ صرف یہ کہ وہ اُن سے آگاہ تھا، بلکہ وہ اُن کے تمام تر نتائج، اُن کے حدود اور مختلف پہلوؤں سے بھی باخبر تھا۔ درحقیقت جو بھی تمام معاملات سے آگاہ ہو اور اُن کی ضرورت کے مطابق تمام قدرت وتوانائی بھی رکھتا ہو، وہ اِس بات پر قادِر ہے کہ ہر چیز کو اُس کی جگہ قرار دے اور جس کی جو بھی ضرورت ہے، وہ پوری کرے اور وہ اُس کی زندگی اور موت کے معاملات میں اُس کی ہدایت بھی کرسکتا ہے۔

[۱] قَرائِنِ کا لفظ قرینہ کی جمع ہے، جو کہ ساتھ کے معنی میں استعمال ہوتا ہے۔ اسی بنا پر دوست، ساتھی، شوہر کو بھی قرینہ کہا جاتا ہے۔ صحاح، قاموس اور دیگر لغت کی کتب میں بعض شارحین جیسے کہ ابن اَبی الحدید وغیرہ، قرائن کو قرونۃ کی جمع کہتے ہیں "بروزنِ معونۃ" یعنی نفس کے معنیٰ میں لیا ہے۔ مگر اس جملے کی تمام تعبیرات کو دیگر جملوں کی روشنی میں یہی کہا جاسکتا ہے کہ پہلا مطلب زیادہ مناسب ہے۔

[۲] لسان العرب اور مقائیس اللغۃ کے مطابق "اَحنا" کا لفظ حِنو بروزنِ فِعل اور حَنوَۃٌ، بروزنِ حرف اُس چیز کو کہا جاتا ہے جس میں کوئی ٹیڑھا پن اور کوئی پیچیدگی اور خم پایا جاتا ہو۔ جیسے کہ ہڈی، خاص طور پر جسم کی گول اور خم ہونے والی ہڈیاں یا اس جیسی اور چیزیں۔ اس کے علاوہ جوانب کے معنی میں بھی آیا ہے، کیونکہ اطراف اور جوانب بھی اکثر اوقات پیچ وخم والے ہوتے ہیں۔

[۳] اس جملے میں موجود ضمیریں اشیاء کی طرف پلٹتی ہیں، نہ کہ غرائز کی طرف۔

https://downloadshiabooks.com/

چند نکات

۱-خدا پر لفظ "عارف" کا اطلاق

نہج البلاغہ کے بعض مفسّرین اس مسئلے میں تردّد کا شکار ہیں کہ آیا خداوند عالم کی ''عارف'' کے لفظ سے توصیف کی جاسکتی ہے؟اس تردّد کا سرچشمہ درحقیقت دو چیزیں ہیں:

پہلی بات یہ کہ مفردات میں راغب کے مطابق معرفت اور عرفان کا مطلب کسی چیز کو تفکر اور تدبر کے ساتھ درک کرنا ہے یا دوسرے الفاظ میں، معرفت اُس علم کو کہا جاتا ہے جو کہ محدود ہو اور تفکر و سوچ بچار کرنے سے حاصل ہو۔ جب کہ یہ بات واضح ہے کہ خدا کا علم ایسا نہیں، اور دوسرے یہ کہ حضرت رسولِ خداؐ سے ایک حدیث نقل ہوئی ہے جس میں آپؐ فرماتے ہیں:

"اِنَّ لَهُ (تَعَالٰى) تِسْعَةً وَتِسْعِيْنَ اِسْمًا مَنْ اَحْصَاهَا دَخَلَ الْجَنَّةَ"

''خدا کے ننانوے نام ہیں، جو انہیں شمار کرے اور ان پر ایمان اور ان کی معرفت بھی رکھے گا وہ جنت میں داخل ہوجائے گا۔''

ادھر علماء اس بات پر متفق ہیں کہ عارف کا لفظ اُن ننانوے ناموں میں نہیں ہے، مگر ایک سرسری مطالعے سے پتا چلتا ہے کہ یہ لفظ اسلامی روایات میں کئی بار خداوند عالم کے لیے استعمال ہوا ہے اور نہج البلاغہ میں ایک مقام پر وصفی صورت میں اور ایک دوسرے مقام پر فعلی صورت میں ذِکر ہوا ہے، البتہ نہج البلاغہ کے علاوہ اصولِ کافی میں بھی کئی جگہوں پر استعمال ہوا ہے۔[1]

چنانچہ یہ کہا جاسکتا ہے کہ لفظ ''معرفت'' اگرچہ دراصل ایک محدود معنی کا حامل تھا اور فکر و تدبر کی ضرورت کے ساتھ تھا ،مگر بعد میں کثرتِ استعمال کی وجہ سے مزید وسیع مفاہیم کے لیے استعمال ہونے لگا جو کہ ہر قسم کے علم و آ گاہی پر مشتمل ہے اور فکر و تدبر سے اس کا کوئی تعلق نہیں۔ اور وہ روایت جس میں خدا کے ۹۹ ناموں کے بارے میں ذکر ہے، تو اس روایت میں کہیں بھی اللہ کے ناموں کا صرف ۹۹ ناموں میں محدود ہونا ثابت نہیں، بلکہ یہ ننانوے نام تو درحقیقت اللہ کی برجستہ صفات اور اسمائے حسنیٰ ہیں اور بعض روایات میں اللہ کے ایک ہزار نام بتائے گئے ہیں۔ اور ایک بڑی دلیل یہ ہے کہ حضرت علیؑ ابن

---

[1] ابن میثم اس موضوع کو ایک اعتراض کے طور پر ذکر کرتے ہیں کہ خدا کے نام ان ناموں سے کہیں زیادہ ہیں، جنہیں بیان کیا گیا ہے اور اس بات پر دلائل بھی دیئے ہیں۔''شرحِ نہج البلاغہ، ابن میثم، جلد ۱، صفحہ ۱۳۷'' یاد رہے کہ یہ حدیث درالمنثور سے صحیح بخاری اور مسلم اور مسند احمد، سنن ترمذی اور دیگر متعدد کتب میں ذکر ہوئی ہے۔ الدرالمنثور، جلد ۳، صفحہ ۱۴۷، پیامِ قرآن، جلد ۴، صفحہ ۴۶۔

https://downloadshiabooks.com/

ابی طالبؑ جو اَسماء وصفاتِ خداوندی کے بارے میں سب سے زیادہ آگاہ ہیں، انہوں نے اس نام اور اس جیسے ناموں کو اللہ کے لیے استعمال کیا ہے۔

۲۔خلقت سے قبل مخلوقات کے بارے میں علم الٰہی

اعتقادی اور فلسفی مسائل میں سب سے زیادہ پیچیدہ مسئلہ ''مخلوقات کی تخلیق سے پہلے خدا کا اُن کے بارے میں علم'' کا مسئلہ ہے۔ایک طرف تو ہم یہ بات جانتے ہیں کہ خداوند عالم مستقبل کے حالات اور حوادث سے آگاہ ہے اور قرآن میں بھی متعدد بار اس کی جانب اِشارہ ہوا ہے، دوسری جانب قابلِ ذکر بات یہ ہے کہ علمِ خدا علمِ حصولی نہیں ہے، یعنی اشیاء کی شکل وصورت ذھنیہ اُس کی ذات میں منعکس نہیں ہوتی ہے، کیونکہ وہ مخلوقات جیسا ذہن نہیں رکھتا، اور اُس کا علم موجودات کی شکلوں کا تصور ذہن میں کرنے سے حاصل نہیں ہوتا، گویا مخلوقات کا وجود اُس کی نظر میں ہر وقت حاضر ہے، جبکہ یہ بھی معلوم ہے ان اشیاء کے بارے میں جو ابھی تک معرض وجود میں نہیں آئی ہیں علمِ حضوری کوئی معنی اور مفہوم نہیں رکھتا ہے یہاں تک کہ یہ اعتراض اُن اشیاکے بارے میں بھی ٹھیک ہوگا، جو ماضی میں معدوم ہوچکی ہیں۔

اگر ہم اُن اشیاکے بارے میں کچھ آگاہی رکھتے ہیں تو اس کی وجہ وہ واقعات وذہنی نقش وتصّورات ہیں، جو ہمارے ذہن میں اُن کے حوالے سے بسے ہوئے ہیں، مگر وہ پاک ذات جو قصّے اور واقعات یاد رکھنے کے لیے ذہن کا محتاج نہیں ہے، وہ کیسے اِن اشیاء سے آگاہ ہے؟ مثال کے طور پر فرعون اور اُس کے ساتھیوں کی شکلیں گل سڑ چکی ہیں اور اُن کی تاریخ بھی گزر چکی ہے، ہم اُن کی صرف ایک خیالی تصویر یا ایک خاکہ اپنے ذہن میں بناسکتے ہیں مگر جب وہ ذاتِ الٰہی کا علم ایسا نہیں ہے تو وہ اُن سے کیسے آگاہ رہ سکتا ہے؟[۱] کیا یہ کہا جاسکتا ہے کہ وہ ماضی سے آگاہ نہیں ہے؟ یا مستقبل کی خبر نہیں رکھتا؟ ہرگز نہیں، تو پھر اگر وہ آگاہ ہے تو کیسے ہے؟ اِس پیچیدہ مسئلے نے علمائے کلام اور فلسفیوں کے درمیان ہلچل مچادی، اُنہوں نے اِس موضوع پر درج ذیل متعدد جوابات تیار کیے ہیں:

۱۔خدا ہمیشہ اپنی پاک ذات سے جو کہ تمام اشیاء کی علت ہے، آگاہ ہے یا دوسرے لفظوں میں اُس کی ذات، اس کے حضور، بہترین حضور رکھتی ہے اور اس کا اپنی ذات کے بارے میں علم رکھنا درحقیقت عالمِ وجود کے تمام تر واقعات اور مخلوقات کے ایجاد ہونے سے پہلے اور ایجاد ہونے کے بعد اس کے علمِ اجمالی پر مشتمل ہے۔اس کی وضاحت کچھ یوں ہوگی کہ اگر ہم تمام اشیاء کی علّت سے آگاہ ہوں تو یہ آگاہی خود بخود اُس کے نتیجے اور معلول سے آگاہی کا باعث بنے گی۔

کیونکہ ہر علّت اپنے معلول کے تمام تر کمالات اور اُس سے اوپر کے کمالات کو بھی اپنے اندر رکھتی ہے۔اس لیے

[۱] اصولِ کافی، جلد۱، صفحہ ۹۱، باب النسبہ، حدیث ۲، صفحہ ۱۸، بابِ حدوث الاسماء، حدیث ۲

https://downloadshiabooks.com/

خداوند عالم تمام اشیاء کی علّت ہے اور وہ اپنی ذات سے آگاہی رکھتا ہے اور تمام اشیاء سے بھی آگاہ ہے اور یہ درحقیقت تمام مخلوقات کی نسبت اِجمالی علم کے ذریعے علمِ تفصیلی کا انکشاف ہے۔

ایک اور طریقے سے اس بات کی وضاحت کی جاسکتی ہے۔مثلاً یہ کہا جاسکتا ہے کہ، گزشتہ واقعات وحادثات مکمل طور پر نیست ونابود نہیں ہوئے ہیں، بلکہ اُن کے آثار آج تک کے حادثات میں نظر آتے ہیں، اسی طرح آنے والے حادثات آج کے حادثات سے جدا نہیں بلکہ مکمل طور پر ان سے مربوط ہیں اور انہی سے جنم لیتے ہیں۔اس طرح سے ماضی، حال اور مستقبل مل کر زنجیر کی طرح ایک مجموعے کو تخلیق کرتے ہیں، جس میں علّت ومعلول کی کڑی سے کڑی جڑی ہوئی ہے، جن میں سے ہر ایک کڑی کی آگاہی، گویا اگلی اور پچھلی کڑی سے آگاہی کا باعث ہے۔

بطور مثال اگر ہم بڑی باریکی سے پوری روئے زمین کے موسم اور موجودہ موسم کے سبب پیدائش کو جان لیں اور اس کی علّت ومعلول کے درمیان رابطے کی تمام جزئیات سے آگاہ ہوجائیں، تو ہم اس طرح آج سے ہزاروں سال پہلے اور بعد کے موسم کی کیفیت کا بھی پتا لگا سکتے ہیں، کیونکہ ماضی اور مستقبل کے موسم کی تفصیلات آج کے موسم میں موجود ہیں۔آج، ماضی کی تصویر ہے، اور آنے والا کل، آج کی تصویر ہوگا۔اور آج کی تمام تر جزئیات سے آگاہی، گزرے ہوئے کل اور آنے والے کل کے حادثات سے خود بخود آگاہ کردے گی۔اب اگر ہم اس حقیقت کی طرف توجّہ کریں کہ خداوند عالم کل، آج اور آنے والے کل کے حادثات کا اصل سرچشمہ ہے اور وہ اپنی پاک ذات کے بارے میں علم رکھتا ہے اور خود کو خوب جانتا ہے، تو ہمیں یہ بھی ماننا ہی پڑے گا کہ وہ ماضی، حال اور مستقبل کے حادثات وواقعات سے بھی واقف ہوگا۔بے شک ہر مخلوق کا اپنا ایک اثر ہے، جو خدا کے اِذن وحکم سے ہے، جسے وہ جب چاہے واپس لے سکتا ہے مگر اُس کی سنّت یہ ہے کہ وہ مخلوقات کو کچھ آثار اور خاصیتوں سے نوازتا ہے اور جب بھی چاہتا ہے اُن سے واپس لے لیتا ہے۔[1]

۲-اِس سوال کے جواب کے لیے دوسری جو راہ اختیار کی جاتی ہے، وہ یہ ہے کہ آج، کل، اور آنے والا کل، یہ تمام چیزیں ہمارے علم وآگاہی کے بارے میں تصوّر کی جاتی ہیں، کیونکہ ہم ایک محدود مخلوق ہیں مگر خداوند عالمین کے بارے میں جس کی ذات ایک لامحدود وجود ہے، گزرے ہوئے کل، آج، اور آنے والے کل کا تصوّر کوئی مفہوم نہیں رکھتا، بلکہ اُس کے سامنے تو تمام اشیاء اور تمام حادثات اپنے اپنے ظرف کے ساتھ اپنی تمام خصوصیات اور جزئیات کے ساتھ حاضر ہیں۔اس

---

[1] جن لوگوں نے مذکورہ بالا اعتراض کو حل کرنے کے لیے یہ جواب تراشا ہے وہ ایک نئے سوال کا سامنا کرنا پڑتا ہے کہ اس بات کا لازمہ یہ بنتا ہے کہ خداوند عالم انگنت موجودات کے بارے میں قبل از تخلیق ان کی کثیر صفت کے ساتھ علم وآگاہی نہیں رکھتا تھا۔کیونکہ اُس کی ذات میں کثرت نہیں ہے، دوسرے لفظوں میں اُس کا موجودات اور مخلوقات کے بارے میں علم، ان کے وجود سے پہلے اور وجود کے بعد کے بارے میں مختلف ہے۔پہلے اِجمالی علم کی شکل میں تھا اور بعد میں تفصیلی علم کی شکل میں ہے اور تعجب کا مقام تو یہ ہے کہ اُن میں سے بعض نے اس فرق کو مان بھی لیا ہے۔

https://downloadshiabooks.com/

باریک اور دقت طلب بات کو ایک آسان سی مثال سے سمجھا جا سکتا ہے، فرض کیجیے کہ ایک شخص ایک کمرے میں قید ہے اور اُس میں ایک چھوٹا سا سوراخ ہے، جو باہر کی طرف نکلا ہوا ہے۔ اُدھر اونٹوں کی ایک قطار اس سوراخ کے سامنے سے گزر رہی ہے تو یہ شخص پہلے ایک اُونٹ کے سر کو پھر گردن کو دیکھے گا پھر کُوہان اور پھر پیروں اور دُم کو دیکھے گا اور اس طرح باری باری دوسرے اُونٹوں کو دیکھے گا جو اس قطار میں ہیں۔ یہ سوراخ کے چھوٹا ہونے کی وجہ سے ہے کہ وہ پھر اپنے لیے ماضی، حال اور پھر مستقبل کا زائچہ بنائے گا، اور وہ شخص جو اس کمرے سے باہر چھت پر اور کھلی فضا میں کھڑا ہوا ہے وہ پورے بیابان کو ایک ساتھ دیکھ رہا ہے تو وہ اُونٹوں کی قطار کو ایک جگہ پر ایک ساتھ چلتے ہوئے دیکھ رہا ہے۔ (غور کیجیے)

پانچواں حصّہ

ثُمَّ أَنْشَأَ سُبْحَانَهُ فَتْقَ الْأَجْوَاءِ وَشَقَّ الْأَرْجَاءِ وَسَكَائِكَ الْهَوَاءِ

''اس کے بعد اُس نے فضا کی وسعتیں، اُس کے اطراف و اکناف اور ہواؤں کے طبقات ایجاد کیے۔''

شرح وتفسیر

آغاز تخلیقِ عالم

زیر بحث موضوع کی طرف مولا علیؑ کا پہلا جملہ ہی راہنمائی کرتا ہے کہ فضا کی خلقت کیسے ہوئی، فرماتے ہیں:

https://downloadshiabooks.com/

ثُمَّ اَنْشأَ سُبحَانَہُ فَتقَ [۱] الْاَجْوَاءِ [۲] وَشَقَّ [۳] الْاَرْجَاءِ [۴] وَسَکَائِکَ [۵] الْھَوَاءِ [۶]

''پھر خداوندِ سبحان نے فضا کے طبقات اور حصّوں کو ایک دوسرے سے الگ کیا اور فضا کو ایجاد کیا۔''

پہلے حصے میں فضا کو کھولنے کی جانب اشارہ فرمایا، اور دوسرے حصّے میں اُس کے اطراف و جوانب کو ایجاد کرنے اور تیسرے حصّے میں اُس کے طبقات کی طرف اشارہ فرمایا ہے۔ یہ تمام جملے اس بات کو واضح کررہے ہیں کہ مادّی دنیا میں، سب سے پہلی تخلیق اس دنیا کی فضا کی ہوئی ہے، ایک ایسی فضا جس میں آسمانی کرّات اور کہکشاؤں کو قبول کرنے کی صلاحیت ہو۔ بالکل اُس کاغذ کے صفحے کی طرح جسے ایک ماہر مصوّر تصویر بنانے کے لیے تیار کرتا ہے۔

اس سے یہ بات واضح ہوجاتی ہے کہ لفظ ''ثُمّ'' اس جگہ تکوینی ترتیب کے معنی میں نہیں استعمال ہوا، بلکہ تاخیر بیان اور ترتیبِ بیان کے لیے استعمال ہوا ہے، کیونکہ پچھلے جملوں میں مختلف مخلوقات اور کائنات کی تخلیق کی جانب اشارہ ہوچکا ہے اور یقیناً ایسا نہیں ہوسکتا کہ فضا اور آسمانی کرّات اور زمین وغیرہ اُس کے بعد خلق کیے جائیں۔ درحقیقت پچھلی بحث میں تمام موجودات اور مخلوقات کی تخلیق کے بارے میں اجمالی ومختصر ذکر تھا اور اِس حصّے میں اُس بیان کی ایک نئی شرح اور تفصیل بیان کی جارہی ہے۔

بہرحال اس عبارت سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ فضا مخلوقات میں سے ایک یا پہلی مخلوق ہے، جس کا عالمِ مادّہ سے تعلق

---

[۱] لفظ فَتقَ، مشق کے وزن پر ہے جو کہ دراصل کھولنے اور دو چیزوں کے درمیان فاصلے کے معنی میں آتا ہے۔ اور یہ رَتق کی ضِد ہے، جیسا کہ راغب نے مفردات میں کہا ہے، صبح کو فَتِیق کہا جاتا ہے کیونکہ آسمانوں کو چیرتے ہوئے ظاہر ہوجاتی ہے۔ اور لِسانُ العرب کے مطابق اچھے فصیح اور سخن ور شخص کو ,فَتیقُ اِللّسان، کہا جاتا ہے کیونکہ اُس کی زبان کھلی ہوتی ہے۔

[۲] اَجواء کا لفظ جَوّ کی جمع ہے، اور بقول ''مفردات'' لسان عرب میں زمین وآسمان کے درمیان وسیع فضا کو (جو) کہا گیا ہے۔

[۳] شَقّ، کا لفظ کسی چیز میں شگاف (یا چیخ یا دراڑ) کے معنی میں آتا ہے اور اسی وجہ سے جب لوگوں میں اختلافات پیدا ہوجاتے ہیں اور وہ ایک دوسرے سے دور ہوجاتے ہیں تو اسے شقاق کہا جاتا ہے۔

[۴] ارجاء کا لفظ رَجا کی جمع ہے، ہمزہ کے بغیر، مقائیس اللغۃ کے مطابق کنویں کے اطراف یا کسی بھی چیز کے اطراف کے معنی میں استعمال ہوتا ہے۔ اور جب، رَجاء ہمزہ کے ساتھ کہا جائے تو یہ اُمید کے معنی میں آتا ہے۔ بعض افراد، جیسے ''التحقیق'' کے مولّف یہ کہتے ہیں کہ اِس کا اصل مطلب یہ ہے کہ جب کسی چیز کے وقوع پزیر ہونے کی اُمید، اطراف وجَوانب میں نظر آتی ہے، تو ایسے اطراف وجوانب کو، رَجا، کہا جاتا ہے، بغیر ہمزہ۔

[۵] سکائک کا لفظ سُکا کہ، کی جمع اور خُلاصہ کے وزن پر ہے۔ لسانُ العرب کے مطابق اس کا مطلب وہ فضا ہے جو زمین وآسمان کے درمیان موجود ہے۔ اور ''ابن ابی الحدید'' کے مطابق فضا کے بالائی حِصّوں کو کہا جاتا ہے۔

[۶] ھواء، دراصل خالی ہونے اور سقوط کرنے، گر جانے کے معنی رکھتا ہے، ہر خالی چیز کو ھوا کہا جاتا ہے۔ مِن جملہ زمین وآسمان کے درمیان کی فضا کو ہوا کہا جاتا ہے۔ اور جو نفسانی خواہشات کے بناء پر نفس کو ھویٰ کہا جاتا ہے، اُس کی وجہ یہ ہے کہ یہ دُنیا وآخرت میں سُقوط کا باعث بنتا ہے، مقائیس اللغۃ، مفردات، لسانُ العرب، اس لفظ کا غیر مرئی گیس کے لیے استعمال ہونا جیسے کہ آکسیجن وغیرہ جو ہمارے اطراف میں ہر طرف پھیلی ہوئی ہے، ایک جدید استعمال ہے، جو اصل مطلب سے بھی تناسب رکھتا ہے۔ (اگرچہ بعض روایات میں یہ معنی بھی ذکر ہوئے ہیں)

https://downloadshiabooks.com/

ہے،مگر فلسفیوں اور متکلمین نے اس بارے میں تردید کی ہے کہ آیا فضا ایک امرِ وجودی ہے یا عدمی؟ اور بعض کا کہنا ہے کہ جیسا کہ وقت، موجودات کی پیدائش اور اُن کی حرکت سے حاصل ہوتا ہے(کیونکہ وقت دراصل وہی حرکت کے اندازے کا قرینہ ہے)اِسی طرح سے مکان بھی مختلف اَجسام اور چیزوں کی پیدائش اور اُن کا ایک دوسرے سے مقائسہ کرنے سے حاصل ہوتا ہے۔ گو یا یہ تصّور کرنا بہت مشکل ہے کہ جب پہلا جسم پیدا ہوا تھا، اُس وقت کوئی مکان موجود ہی نہ تھا، جس وقت ہم ایک چند منزلہ عمارت کی تعمیر کرتے ہیں، تو جس طرح وہ زمین پر کچھ جگہ گھیرتی ہے اُسی طرح سے فضا میں بھی کچھ جگہ گھیرتی ہے اور ہم جتنی بڑی عمارت بنائیں گے وہ اُتنی ہی بڑی فضا کو گھیرے گی۔

بہر حال ہم حضرت علی علیہ السلام کے کلام کے ظاہری مطلب پر اکتفا کرتے ہیں کہ حضرتؑ نے فرمایا،''فضا اور اُس کے اطراف وجوانب خدا کی مخلوق ہیں'' اور بحث کو مزید طول دینے سے گُریز کرتے ہوئے اِس موضوع پر مناسب مقام میں بحث کریں گے۔

ایک نکتہ

کیا مادّی دنیا حادث ہے؟

مادّی دنیا حادث ہے یا قدیم وازلی ہے، اِس موضوع پر فلاسفہ اور دانشوروں میں بڑی بحث پائی جاتی ہے۔ بعض اِسے قدیم اور ازلی کہتے ہیں، یعنی وہ ہمیشہ سے تھا، اور ایک بڑا گروہ اسے حادث شمار کرتا ہے۔ اور جو دلائل یہ لوگ پیش کرتے ہیں اُن میں سرفہرست یہ ہے کہ ازلی اور ابدی سوائے ایک کے اور کوئی نہیں اور وہ صرف خدا کی پاک ذات ہے، اور اُس کے علاوہ ہر چیز حادِث اور مخلوق ہے اور اُس سے وابستہ ہے۔ مادّی دنیا کے حُدوث کا عقیدہ رکھنے والے حضرات کبھی فلسفی دلائل پیش کرتے ہیں اور کبھی علمی دلائل سے استفادہ کرتے ہیں۔ حرکت اور سُکون کے فلسفی دلائل میں سے معروف ترین دلیل ہے کہ ساری مادّی دنیا ہر وقت حرکت اور سُکون کی حالت میں ہے اور حرکت وسُکون حادِث اُمور میں سے ہیں۔ اور جو چیز حادثات کے معرض میں ہو، وہ حادِث ہوتی ہے۔

اس دلیل کو ایک مزید اور پختہ تعبیر کے ساتھ پیش کیا جاسکتا ہے اور وہ یہ کہ مادّی دنیا ہر وقت حالتِ تغیر میں ہے اور یہ تغیر اور تبدیلی خود حدوث کی علامت ہے۔ کیونکہ اگر وہ ازلی بھی ہو اور ساتھ ہی ساتھ اُس میں تبدیلیاں اور حادثات بھی واقع ہوتے رہیں تو یہ حدوث اور قدم کا ایک ساتھ ہونا کہلائے گا۔ یعنی بیک وقت حادِث بھی ہے اور قدیم بھی، جس کا لازمہ یہ بنتا ہے

https://downloadshiabooks.com/

کہ ہم تغیرات اور تبدیلیوں کو جو کہ اُمورِ حادثہ میں سے ہیں، اُنہیں ازلی شمار کریں اور یہ کھلا تناقص ہے۔ دلیل حرکتِ جوہری کو قبول کرتے ہوئے یہ دلیل زیادہ واضح اور روشن ہے کہ ''حرکت تمام اشیاء کی ذات میں چھپی ہوئی ہے بلکہ ان کی عینِ ذات ہے، کیونکہ حرکت کا وجود ایک امر حادِث ہے، جو ازل کے معنی نہیں رکھتا۔ (غور کیجیے) یہ دلیل تحقیق طلب ہے اور فلسفی موضوع ہے، جہاں تک علمی دلائل کی بات ہے تو اُس میں یہ کہا گیا ہے کہ یہ ساری مادّی دنیا مسلسل فرسودگی اور اختتام پزیر ہونے کی حالت میں ہے اور بے حساب علمی دلائل نے اِس فرسودگی کو ثابت کیا ہے کہ تمام سیّارے، کہکشائیں، زمین اور جو کچھ زمین پر ہے، یہ سب اِس قانون کے زمرے میں آتے ہیں۔ یہ مستقل فرسودگی اِس بات کی دلیل ہے کہ اس مادّی دنیا کی ایک انتہا ہے اور اسے ختم ہونا ہے، کیونکہ فرسودگی بغیر انتہا کے چلتی رہے یہ نہیں ہوسکتا، یعنی فرسودگی اُس شے کو کبھی نہ کبھی مکمل طور پر ختم کردے گی اور اس طرح فرسودگی بھی ختم ہوجائے گی۔

اور جب ہم نے یہ مان لیا کہ اختتام اور انتہا ہے، تو پھر یہ بھی ماننا پڑے گا کہ کوئی نہ کوئی آغاز بھی ہوگا، کیونکہ اگر کوئی چیز ابدی نہیں ہے تو یقیناً ازلی بھی نہیں ہے۔ کیوں کہ ابدیت بے انتہا ہونے کے معنی رکھتی ہے اور جو چیز بے انتہا ہے وہ لامحدود ہے اور لامحدود شے کا کوئی آغاز نہیں، اِس بنا پر جو چیز اَبدی نہیں ہے وہ ازلی بھی نہیں ہوگی۔ اِس بات کو اِس مثال کے ذریعے سے واضح کیا جاسکتا ہے کہ یہ جہان اَزلی ہے اور فرسودگی کی حالت میں بھی ہے تو پھر اِس فرسودگی کو اب تک مادّی دنیا کی عمر ختم کردینی چاہیے تھی۔ کیونکہ بے انتہا فرسودگی عدم کے برابر ہے۔ پھر ایک اور تعبیر کے مطابق جو جدید علمی نظریات میں سے ہے، جہاں مادّہ رفتہ رفتہ ایک جیسا بنتا جارہا ہے۔

سارے ایٹم بتدریج پھٹتے اور انرجی (Energy) میں بدلتے جارہے ہیں اور تمام اِنرجی آہستہ آہستہ ایک جیسی ہوتی جارہی ہے، بالکل ایسے کہ ایک آگ کا شعلہ کسی کمرے میں جلایا جائے اور یہ آگ کا مادّہ گرمی میں تبدیل ہوجاتا ہے اور یہ گرمی اور حرارت، آہستہ آہستہ کمرے میں ہر طرف پھیل کر ایک سی ہوجاتی ہے۔ اگر کبھی دنیا میں بے انتہا وقت گزرا ہوگا، تو یہ تمام حالتیں بھی واقع ہوئی ہوں گی، مثلاً تمام مواد کا اِنرجی میں تبدیل ہونا اور پھر اِنرجی کا ہر طرف پھیل کر ایک جیسا ہوجانا۔

بہر حال اِس بات کا مقصد یہ ہرگز نہیں کہ کوئی ایسا وقت بھی گزرا ہو کہ خدا کی کوئی مخلوق نہیں تھی اور اُس کی فیّاض ذات، بے فیض رہی ہو، بلکہ اس کے برخلاف یہ سوچا جاسکتا ہے کہ خدا کی ہر وقت کوئی نہ کوئی مخلوق رہی ہے اور یہ تمام مخلوقات ہر وقت تغیر اور تبدّل کی زد میں رہی ہیں اور یہ تمام مخلوقات اُس کی پاک ذات سے تعلق رکھتی تھیں یا دوسری تعبیر کے مطابق اِن میں حدوث ذاتی تھا، نہ کہ حُدُوث زَمانی۔ کیونکہ سب کے لیے حدوثِ زمانی کا تصوّر نہیں کیا جاسکتا۔ (غور کیجیے) اور یہ جملہ روایات میں آیا ہے کہ ''کَانَ اللّٰہُ وَلَا شَیْئَ مَعَہٗ' خدا ہمیشہ سے تھا اور اُس کے ساتھ کوئی چیز نہ تھی۔ اِس کا مقصد یہی ہے کہ

https://downloadshiabooks.com/

اُس کی ذات پاک کے ساتھ نہیں تھی، بلکہ اُس کی مخلوق تھی۔ (غور کیجیے)[۱]

چھٹا حصّہ

فَأَجْرٰى فِيْهَا مَاءً مُتَلَاطِمًا تَيَّارُهُ مُتَرَاكِمًا زَخَّارُهُ حَمَلَهُ عَلٰى مَتْنِ الرِّيْحِ الْعَاصِفَةِ وَ الزَّعْزَعِ الْقَاصِفَةِ فَأَمَرَهَا بِرَدِّهِ وَ سَلَّطَهَا عَلٰى شَدِّهِ وَ قَرَنَهَا إِلٰى حَدِّهِ الْهَوَاءُ مِنْ تَحْتِهَا فَتِيقٌ وَ الْمَاءُ مِنْ فَوْقِهَا دَفِيقٌ.

''اور ان کے درمیان ایسا پانی بہا دیا جس کی لہروں میں تلاطم اور اس کی موجیں تہ بہ تہ تھیں، اسے ایک تیز و تند ہوا کے کاندھے پر لاد دیا اور پھر ہوا کو الٹنے پلٹنے سے روکے رکھنے کا حکم دیا اور اس کی حدوں کو پانی کی حدوں سے یوں ملا دیا کہ نیچے ہوا کی وسعتیں تھیں اور اوپر پانی کا تلاطم۔''

شرح وتفسیر

پانی، سب سے پہلی مخلوق

امیر المومنین علی ابن ابی طالب علیہا السلام کے کلام سے جو کچھ اس باب میں اور جو کچھ آئندہ کے ابواب میں ملتا ہے، وہ دراصل اِس دنیا کے طرزِ تخلیق کے بارے میں وضاحت ہے کہ خداوند عالم نے سب سے پہلے پانی یا پانی جیسا کوئی مائع خلق کیا اور اُسے تیز ہواؤں کے دوش پر سوار کر دیا۔ اس تیز طوفانی ہوا کی یہ ذمّے داری تھی کہ وہ اِسے محفوظ رکھے اور اِسے پھیلنے اور منتشر ہونے سے بچائے اور اِسے اس کے خاص حدود میں روکے رکھے۔ پھر ایک اور تیز طوفانی ہوا بنائی، جس کا کام تھا کہ اُس بہت سارے اور جوشیلے پانی کی موجوں اور لہروں کو مزید جوشیلا اور متلاطم بنائے اور اُس تیز ہوا نے اِن لہروں کو آپس میں خوب ٹکرایا جس کے نتیجے میں وہ لہریں اور مزید اونچی لہروں میں تبدیل ہو گئیں اور موجیں اتنی بلند ہوئیں، کہ فضا میں ایک کے پیچھے ایک اُڑیں اور اُن سے سات آسمان خلق ہوئے۔

یہ بات تو واضح ہے کہ پانی، ہوا، اور طوفان وغیرہ جیسے الفاظ (اُس وقت جب نہ کوئی پانی تھا نہ طوفان، نہ ہوا تھی اور

---

[۱] توحید صدوق، ص ۶۶، اس مضمون کی طرح کی بحث، ص ۱۴۵ اور صفحہ ۲۲۶ پر بھی آئے گی۔ اس آخری اور نتیجہ خیز تحریر کو پڑھتے ہوئے عظمت محمدؐ و آل محمد علیہم السلام پر غور کریں۔ (مترجم)

https://downloadshiabooks.com/

نہ دن رات تھے) کا استعمال یعنی اُن جیسی مخلوقات یا ان سے شباہت رکھنے والی مخلوقات کے لیے کنایہ ہے، کیونکہ لُغت بنانے والوں نے ان لفظوں کو ان مخصوص چیزوں اور کاموں کے لیے قرار دیا ہے۔ ایسا نہیں کہ اُنہوں نے دنیا بننے سے قبل اِن حادثات کے لیے الفاظ وضع کر دیے ہوں۔ ذرا سے غور و فکر کے بعد مولاؑ کے کلام میں آنے والے مفاہیم کی آج کے دانشوروں کے مفروضوں اور نظریات کی روشنی میں زیادہ بہتر تفسیر یہ ہے، البتہ ہمارا مطلب ہرگز یہ نہیں ہے کہ مولاؑ یہ فرما رہے ہیں، بلکہ مراد یہ ہے کہ اس تفسیر کا احتمال ممکن ہے۔

ضروری وضاحت

آج کل کے مفروضوں اور نظریات (جو دنیا کے آغاز کے بارے میں کیے گئے ہیں) کے مطابق سارا عالم ایک بڑے سے گیس کے تُودے (ڈھیر) کی شکل میں تھا جو کہ مائع (یعنی بہنے والی شے) کی شبیہ تھا۔ اور اُسے دُھوئیں کا نام دیا جا سکتا ہے، یا دوسری تعبیر کے مطابق، اُوپری سطح پر دُھواں تھا اور جو حصہ بھی جس قدر بھی اپنے مرکز کے قریب تر ہوتا تھا، وہ اُتنا ہی زیادہ سے زیادہ پریشر (Pressure) دباؤ کے تحت قرار پاتا اور مائع (پانی کی طرح بہنے والی کسی شے) کی صورت اِختیار کر لیتا۔

جو چیز اس عظیم تودے کو روکے ہوئے تھی، یہ وہی قوتِ جاذبہ اور کشش ثقل تھی جو تمام عالم کے ذرّات میں پائی جاتی ہے، اِس قوتِ جاذبہ نے اُس گیس (Gas) کو پکڑا ہوا تھا اور اُسے مضبوطی کے ساتھ اس کی حدود میں روکے رکھا تا کہ ہوا اپنے مرکز سے دور نہ ہو جائے اور حدود سے باہر نہ نکل جائے، پھر اس عظیم تودے نے اپنے ہی گرد گھومنا شروع کیا (یا تو شروع سے ہی اپنے ہی گرد گھوم رہا تھا) اِس جگہ پر قوتِ گریز پیدا ہوئی۔ [1]

اپنے مرکز سے گریز اں یہ قوت اس چیز کا باعث بنی کہ گیس سے بنے ہوئے بڑے بڑے تودوں کو خالی فضا کی طرف پھینکے نہج البلاغہ کی تعبیر کے مطابق اِس دریا کی لہروں کو ہر طرف پھینکے، یا دوسری تعبیر کے مطابق جھاگ کی جو سطح بن گئی تھی اسے، حدود سے باہر بھیج دیا اور ایک وسیع اور بلند تر فضا میں اِن لہروں کو بلند کیا (اِس خطبے کے آخر میں یہی تعبیرات آئی ہیں) اور اُس سے اس عالم کے بڑے چھوٹے کرّہ ارض جیسے کُرّے اور کہکشائیں وغیرہ پیدا کیں یا قرآن اور نہج البلاغہ کی تعبیر کے مطابق اُس سے سات آسمان بنائے۔ ہم بغیر کسی ضرر کے مذکورہ تعبیرات کو ان نظریات پر تطبیق کرنے کی بجائے اس بات

[1] ہر وہ شے جو اپنے ہی گرد گھومے اور کسی مرموز قوت کے تحت اپنے مرکز سے فرار کرنے پر مائل ہو، بالکل آگ کے اُس گولے کی طرح ہے، جسے ہم اپنے ہاتھوں سے گھماتے ہیں اور اچانک چھوڑ دیتے ہیں، تو وہ ایک دور دراز جگہ کی جانب چلا جاتا ہے، یہ وہی مرکز سے گریز کرنے والی طاقت ہے اور یہ جس قدر شدید تر ہو، اُس کا اُتنا ہی دور جانا ممکن ہے۔

https://downloadshiabooks.com/

پر اکتفا کرنا چاہتے ہیں کہ آسمانوں، منظوموں، اور کہکشانوں کی پیدائش کے بارے میں حضرت علیؑ کے جملے تمام مفروضوں اور نظریات کے افق پر پائے جاتے ہیں اور مفہوم کو واضح کرنے میں رسا تر بھی ہیں اور قابل ادراک بھی۔ اب ہم حضرت علیؑ کے کلام میں دقیق اور قابل غور تعبیرات کرتے ہیں، سب سے پہلے فرماتے ہیں:

"فَأَجْرَىٰ فِيهَا مَاءً مُتَلَاطِمًا [۱] تَيَّارُهُ." [۲]

"خدا نے اُس فضا میں جو پہلے سے پیدا کر چکا تھا، ایک پانی پیدا کیا جو جوش مارتا ہوا اور متلاطم تھا، اور اُس کی موجیں شدت کے ساتھ حرکت میں تھیں۔"

"تلاطم" اس سے مراد لہروں کا ایک دوسرے سے ٹکرانا اور (تیار) سے مُراد ہر قسم کی لہر خاص طور پر وہ لہریں جو پانی کو باہر کی جانب پھینکتی ہیں۔"

کیا یہ جوش مارتا ہوا متلاطم پانی وہی دَبی ہوئی گیس تو نہیں جو آج کے دانشوروں کے نظریئے کے مطابق دنیا کے ابتدائی مادّے کو تشکیل دیتی ہے؟

پھر فرماتے ہیں:

"مُتَرَاكِمًا [۳] زَخَّارُهُ." [۴]

"یہ اِس حال میں ہوا کہ اِس جوش مارتے ہوئے دریا کی لہریں اُڑ کر ایک دوسرے پر سوار ہو جاتی تھیں۔"

پھر اضافہ فرماتے ہیں:

---

[۱] مُتَلَاطِم، کا لفظ دراصل لَطْم سے آیا ہے، بَروَزنِ ختم، جس کا مطلب ہے ہاتھ سے منہ پر تھپڑ مارنا، پھر یہ موجوں کے آپس میں ٹکرانے اور ایک دوسرے کو تھپیڑے مارنے کے معنی میں استعمال ہوا ہے۔

[۲] تَيَّار، دَراَصل دَریا کی اُن مُوجوں کو کہا جاتا ہے جو جوش مارنے کی وجہ سے پانی کو باہر کی جانب پھینکتی ہیں۔ بعض نے اِس لفظ کو ہر طرح کی موجوں اور لہروں کے لیے استعمال کیا ہے۔ (مقائیس اللُّغَة ولِسَانُ العَرُب)

[۳] متراکِم کا لفظ رَکم کے لفظ سے آیا ہے جو (رَزْم) کے وَزن پر ہے، جس سے مُراد کسی چیز کا شدت سے دَرہم برہم ہو جانا ہے اور یہ لفظ پانی، ہوا، ریت اور یہاں تک کے انسانوں کے اُس ہجوم کے لیے بھی استعمال ہوتا ہے جو کسی ایک جگہ شدید رش میں گتھم گُتھا ہو جائیں۔ (مغردات، لسان العرب، مقائیس اللُّغَة)

[۴] زخَّار کا لفظ "زَخَر" کے مادّے سے آیا ہے اور زُخور دراصل اٹھنے کے اور بلند ہونے کے معنی میں آتا ہے اور یہ سمندر اور دریا کے بھر جانے کے لیے بھی استعمال ہوتا ہے۔ (مفردات، لسانُ العرب، مقاییس اللُّغَة)

https://downloadshiabooks.com/

"حَمَلَهُ عَلٰى مَتْنِ الرِّيحِ الْعَاصِفَةِ [۱] والزَّعْزَعِ [۲] الْقَاصِفَةِ [۳]

''خدا نے اِس پانی کو تیز اور طوفانی ہواؤں کی پشت پر سوار کر دیا۔اس سے مراد مارنے والی اور توڑنے والی ہوائیں ہیں۔''

"عاصِف" کوٹنے والا اور توڑنے والا کے معنی میں ہے اور "والزَّعْزَع" سے مراد بے چین اور شدید ہے۔اور "الْقَاصِفَةِ" سے مراد بھی توڑنے والی ہے اور یہ سب الفاظ ایک کے بعد ایک، اُن تند و تیز اور طوفانی ہواؤں کی شدت کو بیان کرنے کی تاکید ہے۔

"فَأَمَرَهَا بِرَدِّهِ، وَسَلَّطَهَا عَلٰى شَدِّهِ، [۴] وَقَرَنَهَا إِلٰى حَدِّهِ"

''یہ عظیم اور وحشت ناک طوفان اِس بات پر مامور تھا کہ پانی کے موجوں کو محفوظ رکھے اور اس کے تمام حصوں کو آپس میں جوڑے رکھے اور اُسے اپنی خاص حدود میں سنبھال کر رکھے۔''

کیا یہ عظیم طوفان اور شدید موجیں، قوتِ جاذِبہ کی اَمواج کی جانب اشارہ نہیں، جنہیں خداوند عالم نے سارے عالم مادّہ کے ذرّات پر مسلط کر دیا ہے جو اِن سب کو ایک دوسرے سے جوڑے رکھنے کا سبب ہے اور اِن کے پھیل جانے اور بکھر جانے کی راہ میں رُکاوٹ ہے، سب کو مہار کر کے اپنی حدود میں سنبھال کر رکھتی؟ قوتِ جاذبہ کی امواج اور لہروں کے لیے اس دور میں طوفانی اور مارنے والی ہوا سے بہتر اور کون سی تعبیر ہو سکتی۔

---

[۱] عاصِفَة کا لفظ عَصْف بروزنِ عصر کے لفظ سے آیا ہے۔جو کہ ہلکے پن اور تیزی کے معنی میں آتا ہے، اِس لیے ذرّات اور چھوٹے چھوٹے ٹکڑوں کے تیزی سے اُڑ جانے اور پھیل جانے کے معنی میں آتا ہے۔اور عاصف اور مُعصف، اُس چیز کو کہتے ہیں جو تمام اشیاء کو آپس میں درہم برہم کرے اور انہیں موم کر دے (مفردات، لسانُ العرب مقائیس اللُّغَة)

[۲] زعزع، یہ لفظ، زمزم کے وزن پر حرکت اضطراب اور بلند ہونے کے معنی میں آتا ہے اور کبھی شدید کے معنی میں آتا ہے۔''مقاییس اللغہ، اور لسان العرب''

[۳] قاصفة، یہ لفظ، قصف، کے مادے سے (حذف) کے وزن پر ہے، جس کا معنی کسی چیز کو توڑنے کے ہے اسی لیے سمندر کی ان تند و تیز ہواؤں کو جو کشتیوں کے ٹوٹنے کا باعث بنتی ہیں۔اور شدید طرح کے رعد و برق کو قاصفہ کہا جاتا ہے۔(مفردات، لساب العرب اور مقاییس اللغہ)

[۴] شدّ، مد کے وزن پر کسی بھی چیز کی طاقت اور قدرت کے معنی میں آتا ہے۔اسی وجہ سے طاقتور لوگوں خصوصاً جنگ و پیکار میں اپنا لوہا منوانے والوں، کو شدید کہا جاتا ہے۔یہ لفظ ظاہری بدن یا باطنی و روحی طاقتوں یا عذاب و مصیبت کے وقت اپنے آپ کو مضبوط اور محکم کرنے اور گرہ لگانے کے لیے بھی استعمال ہوتا ہے۔لسان العرب، مفردات، مقائیس اللغہ)

https://downloadshiabooks.com/

"اَلْهَوَاءُ مِنْ تَحْتِهَا فَتِيْقُ [۱] وَالْمَاءُ مِنْ فَوْقِهَا دَفِيْقُ" [۲]

یہ سب اُس وقت ہوا کہ اُس کے نیچے فضا نے اپنا دامن پھیلایا ہوا تھا اور اُس کے اوپر پانی (مائع کی شکل کی گیس) حرکت میں تھا۔

"فَتِيْقُ" کا لفظ "فَتْقُ" کے مادّے سے، ''کھلا'' ہونے کے معنی میں آیا ہے اور "دَفِيق" کا لفظ "دَفْقُ" کے معنی میں آتا ہے، جس کا مطلب تیزی سے حرکت کرنا ہے۔

جی ہاں یہ جوش مارتی ہوئی موجیں، تیز ہواؤں کے ذریعے محدود جگہ میں روک دی گئیں اور اُنہیں یہ ہوائیں اپنی حدود سے تجاوز کرنے نہیں دیتی تھیں۔ یہاں پر یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ اِن تیز و طوفانی ہواؤں کے ہوتے ہوئے وہ جوش مارتی لہریں اور امواج، پانی کی سطح میں پیدا ہی کیسے ہوئیں۔ عام طور پر موجیں اور جوش مارتی ہوئی لہریں، تیز اور طوفانی ہواؤں کے نتیجے میں بنتی ہیں جبکہ یہاں طوفان اِن لہروں کو روکنے کا کام کر رہا ہے اور اَمواج کو مہار کر رہا ہے، تو پھر آخر یہ کیا چیز ہے جو اَمواج کو متحرک اور جو ہیجان زدہ بنا رہی ہے۔

بظاہر ایسا لگتا ہے کہ اِن موجوں کی پیدائش کا سبب کوئی اندرونی شے تھی، جو موجوں کو جوش میں لا کر آپس میں ٹکرا رہی تھی، اگرچہ یہ بات ٹھیک طرح سے ہم پر واضح نہیں ہے کہ وہ کیا چیز تھی، مگر آج کے دانشوروں اور سائنسدانوں کے نظریات سے بالکل ہم آہنگ ہے، کیونکہ یہ لوگ کہتے ہیں کہ مائع نُما گیسز کے اندر کچھ ایٹمی دھماکے ہوتے رہے اور وہی دھماکے آج سورج میں ہو رہے ہیں۔ یہ بڑے بڑے دھماکے اِس گیس کے سُکون کو ختم کر کے اِس میں تلاطم اور ہیجان پیدا کر کے ٹھاٹھیں مارتی ہوئی امواج اور لہروں میں بدل دیتے ہیں۔ خطبے کے اِس حصے کو مکمل کرنے کے لیے ہمیں اِس کے آخری حصے کو اگلے موضوع کے ساتھ ملا کر غور کرنا ہوگا تا کہ مولائے کائناتؑ کے کلام کی گہرائی کو سمجھ سکیں۔

ساتواں حصّہ

ثُمَّ أَنْشَأَ سُبْحَانَهُ رِيحًا اعْتَقَمَ مَهَبَّهَا وَ أَدَامَ مُرَبَّهَا وَ أَعْصَفَ مَجْرَاهَا وَ أَبْعَدَ مَنْشَأَهَا فَأَمَرَهَا بِتَصْفِيقِ الْمَاءِ الزَّخَّارِ وَ إِثَارَةِ مَوْجِ الْبِحَارِ فَمَخَضَتْهُ مَخْضَ السِّقَاءِ وَ عَصَفَتْ بِهِ عَصْفَهَا بِالْفَضَاءِ تَرُدُّ أَوَّلَهُ [عَلَى] إِلَى آخِرِهِ وَ سَاجِيَهُ [عَلَى] إِلَى مَائِرِهِ حَتَّى عَبَّ عُبَابُهُ وَ رَمَى بِالزَّبَدِ رُكَامُهُ

[۱] فتیق کا لفظ فَتْق کے مادّے سے آیا ہے جس کا ترجمہ ہو چکا۔

[۲] دفیق کا لفظ دَفْق کے لفظ سے آیا ہے اور دَفْن کے وَزن پر ہے اور یہ کسی چیز کو آگے بڑھانے اور پھینکنے کے معنی میں استعمال ہوتا ہے اور تیزی کے معنی میں بھی آتا ہے۔ تیز چلنے والے اُونٹ کو اَدفَق کہتے ہیں۔

https://downloadshiabooks.com/

فَرَفَعَهُ فِي هَوَاءٍ مُنْفَتِقٍ وَ جَوٍّ مُنْفَهِقٍ فَسَوَّى مِنْهُ سَبْعَ سَمَوَاتٍ جَعَلَ سُفْلَاهُنَّ مَوْجاً مَكْفُوفاً وَ عُلْيَاهُنَّ سَقْفاً مَحْفُوظاً وَ سَمْكاً مَرْفُوعاً بِغَيْرِ عَمَدٍ يَدْعَمُهَا وَلَا دِسَارٍ [يَنْتَظِمُهَا] يَنْظِمُهَا ثُمَّ زَيَّنَهَا بِزِينَةِ الْكَوَاكِبِ وَ ضِيَاءِ الثَّوَاقِبِ وَ أَجْرَى فِيهَا سِرَاجاً مُسْتَطِيراً وَ قَمَراً مُنِيراً فِي فَلَكٍ دَائِرٍ وَ سَقْفٍ سَائِرٍ وَ رَقِيمٍ مَائِرٍ۔

''اس کے بعد ایک اور ہوا ایجاد کی جس کی حرکت میں کوئی تولیدی صلاحیت نہیں تھی اور اسے مرکز پر روک کر اس کے جھونکوں کو تیز کر دیا اور اس کے میدان کو وسیع تر بنا دیا اور پھر اسے حکم دیدیا کہ سمندر کے پانی کو آپس میں ٹکرا دے اور موجوں کو الٹ پلٹ کر دے۔ چنانچہ اس نے سارے پانی کو ایک مشکیزہ کی طرح انڈیل دیا اور اسے فضائے بسیط میں اس طرح لے کر چلی کہ اوّل کو آخر پر الٹ دیا اور ساکن کو متحرک پر پلٹ دیا اور اس کے نتیجے میں پانی کی ایک سطح بلند ہوگئی اور اس کے اوپر جھاگ کی ایک تہہ بن گئی۔ پھر اس جھاگ کو پھیلی ہوئی ہوا اور کھلی ہوئی فضا میں بلند کر دیا اور اس سے سات آسمان پیدا کر دیے، جس کی نچلی سطح ایک ٹھہری ہوئی موج کی طرح تھی اور اوپر کا حصہ ایک محفوظ سقف (چھت) اور بلند عمارت کی مانند تھا۔ نہ اس کا کوئی ستون تھا جو سہارا دے سکے اور نہ کوئی بندھن تھا جو منظم کر سکے۔ پھر ان آسمانوں کو ستاروں سے مزین کیا اور ان میں تابندہ نجوم کی روشنی پھیلا دی اور ان کے درمیان ایک ضوفگن چراغ اور ایک روشن ماہتاب روشن کر دیا جس کی حرکت ایک گھومنے والے فلک اور ایک متحرک چھت اور جنبش کرنے والی تختی میں تھی۔''

شرح وتفسیر

دنیا کی پیدائش میں طوفانوں کا کردار

مولاؑ کے کلام کا یہ حصہ جیسا کہ اشارہ ہوا، پچھلے فقروں سے جڑی ہوئی ایک اور تکمیلی بحث ہے۔ اِس مقام پر ہم بغیر کسی تمہید کے کلام کی عمیق و گہری اور قابل غور تعبیرات سے آغاز کرتے ہیں اور اس کے بعد اِن باتوں کا موجودہ دور کے سائنسدانوں کی باتوں سے ملا کر موازنہ کریں گے کہ کس طرح حضرتؑ کا کلام آج کے سائنسدانوں کے علمی نتائج کے قریب ہے۔ امامؑ اِس حصّے میں چند مراحل کی طرف اِشارہ کرتے ہوئے پہلے مرحلے میں فرماتے ہیں:

https://downloadshiabooks.com/

"ثُمَّ اَنْشَأَ سُبْحَانَهُ رِيحاً اِعْتَقَمَ [۱] مَهَبَّهَا"[۲]

''خداوند سبحان نے ایک اور طوفان ایجاد کیا (جو کہ چار ایسی خصوصیات کا حامل تھا، جن کے ہوتے ہوئے وہ طوفان ہمارے کرۂ ارض کے عام طوفانوں سے جدا نظر آتا ہے) جو بار آور نہیں تھا'' نہ وہ بادل تھا، جو آپس میں پیوندگی کا کام دے اور بارش برسائے اور نہ گیلی مٹی تھا جو بار آور کردے۔ (ایسی ہوا جو پانی کے ساتھ تھی اور اُس سے جُدا نہیں ہوتی تھی)

"وَأَدَامَ مُرَبَّهَا"[۳]

''عام ہواؤں کے برخلاف جو کہ دائمی نہیں ہیں یعنی کبھی چلتی ہیں اور کبھی تھم جاتی ہیں۔''

"وَأَعْصَفَ[۴] مَجْرَاهَا"

''وہ ہوا جس کے چلنے کی قوت بہت پُر قدرت اور طاقتور تھی۔''

عام ہواؤں کے مقابلے میں یہ ہوا وہ ہے جو دور سے پوری قدرت سے چلتی ہے۔

"وَأَبْعَدَ مَنْشَاهَا"

ایسی ہوا جو دور کے مقامات سے چلتی تھی۔'' معمولی ہواؤں کی طرح نہیں جو قریب سے اُٹھتی ہیں۔

دوسرے مرحلے میں اس ہوا کے کام کی جانب اشارہ فرماتے ہیں:

"فَأَمَرَهَا بِتَصْفِيقِ[۵] الْمَاءِ الزَّخَّارِ"

''اسے حکم دیا کہ گہرے اور پھیلے ہوئے پانی کو لگاتار تہ و بالا کرے۔''

---

[۱] اعتقم کا لفظ عُقم کے مادّے سے آیا ہے بروزنِ قُفْل۔ اِس کا مطلب ہے وہ خشکی جو کسی بھی اثر کو قبول نہ کرے۔ اور عَقِیم اُس عورت کو کہا جاتا ہے جو صاحب اولاد نہیں ہو سکتی انسانی اور مرد کے نطفے کو قبول نہیں کرتی اور مزید یہ ہے کہ تنگی کے معنی میں بھی استعمال ہوا کرتا ہے۔ (مفردات، لسانُ العرب، مقائیس اللغة)

[۲] مَهَبّ، کا لفظ ھُبوب کے مادّے سے ہے بروزنِ سجود، جس کے معنی بیدار ہونے اور تلوار کے متحرک ہونے کے بھی ہیں اور کلی طور پر ہیجان انگیز ہونے کو بھی کہا جاتا ہے لہٰذا ہوا کے چلنے پر بھی اِس لفظ کا اطلاق کیا جا سکتا ہے۔

[۳] مُرَبّ کا لفظ رَبّ سے آیا ہے اور دراصل اس کے معنی تربیت کے ہیں اور مُرَبّی، مالِک اور خالق کو بھی رَبّ کہا جاتا ہے۔ (یہ ایسا مصدر ہے جو فاعل کا معنی رکھتا ہے) اور جب یہ بابِ افعال سے آئے یعنی ''اِرباب'' پڑھا جائے تو اس کے معنی اِستمرار اور لزوم کے ہوں گے۔ (کیونکہ تربیت بھی باقاعدگی اور اِستمرار کے بغیر ممکن نہیں) اِس بنا پر مُرَبّ جو کہ مصدرِ میمی ہے، یہ دوام اور بقا کے معنی میں ہے۔

[۴] أَعْصَفَ کا لفظ عَصف کے لفظ سے آیا ہے جو کہ عَصْر کے وزن پر ہے جیسا کہ ہم کہہ چکے یہ تیزی، حرکت، اور شدّت کے معنی میں آیا کرتا ہے۔

[۵] تصفیق کا لفظ صَفَق کے مادّے سے آیا ہے، بروزنِ سَقْف۔ اس کا مطلب ہے کسی چیز کو دوسری چیز پر اِس طرح سے مارنا کہ کوئی آواز آئے۔ اِسی رُو سے تالی بجانے کو بھی، تَصْفِیق، کہا جاتا ہے اور یہاں پر پانی کو پانی پر مارنے اور ٹکرانے کے معنی میں استعمال ہوا ہے۔ (لِسانُ العرب، مقائیسُ اللُّغة، شرح عَبدہ)

https://downloadshiabooks.com/

"وَ اَثَارَةِ مَوْجِ الْبِحَارِ"

"اور پھر اُن بڑے بڑے سمندروں کی لہروں کو ہر طرف ساتھ پھیلا دیا۔"

"فَمَخَضَتْهُ [۱] مَخْضَ السِّقَاءِ"

"اس عظیم طوفانی ہوا نے اُس ڈھیر سارے پانی کو سقاؤں کی مشک کی طرح ایک دوسرے پر مارا۔"

"وَ عَصَفَتْ بِهِ عَصْفَهَا بِالْفَضَاءِ"

"اور اُسے بڑی شدت کے ساتھ فضا میں بلند کیا۔"

"تَرُدُّ أَوَّلَهُ إِلَى آخِرِهِ وَ سَاجِيَهُ [۲] إِلَى مَائِرِهِ" [۳]

"یہ تیز طوفانی ہوائیں اِس پانی کے پہلے حصّے کو اس کے آخری حصّے سے ملا دیتی تھیں اور اس کے ٹھہرے ہوئے خطوں کو متحرک حصوں کی طرف لے جاتی تھیں۔"

تیسرے مرحلے میں فرماتے ہیں:

"حَتَّى عَبَّ عُبَابُهُ" [۴]

"تمام پانی آپس میں مل کر جوش میں آئے اور اوپر کی جانب اُٹھنے لگے۔"

"وَ رَمَى بِالزَّبَدِ رُكَامُهُ" [۵]

اور پانی کے جوش مارتے ہوئے حصّے نے اپنے اندر کے جھاگ کو ہوا میں اُچھالا۔

چوتھے مرحلے میں فرماتے ہیں:

---

[۱] مَخَضَ کا لفظ مخض کے مادّے سے آیا ہے بروزنِ قرض ہے۔ درحقیقت یہ مائع (بہنے والی) اَشیاء کو اُن کے برتنوں میں ہلانے کے معنی میں آتا ہے، اِسی لیے جب مشک میں دہی کو ہلایا جاتا ہے تاکہ اُس کا مکھّن الگ ہو جائے۔ اُس میں بھی یہی تعبیر استعمال ہوتی ہے۔

[۲] "ساجی" کا لفظ سجو کے مادّے سے سہو کے وزن پر ہے۔ اس لفظ کے معنی سکون اور ٹھہراؤ کے ہیں۔

[۳] "مائر" کا لفظ مور کے مادّے سے آیا ہے۔ بروزن فور، دراصل یہ کسی چیز کے رفتار تیز ہونے کے معنی میں آتا ہے، یہ لفظ سڑک کے لیے بھی استعمال ہوتا ہے۔ کیونکہ لوگ اور گاڑیاں اس پر تیزی سے آمد و رفت کرتی ہیں۔

[۴] "عُباب" کا لفظ عب کے مادّے سے آیا ہے، جس کے معنی ہیں پانی کو تیزی سے اور بغیر وقفے کے پینا۔ اسی لیے بہت سارے پانی کو، زیادہ بارش ہونے کو اور بڑے سیلاب کو عباب کہتے ہیں اور یہ یہاں پر بہت سارے پانی کا آپس میں ایک موج کا دوسری موج کو پچھاڑنے کے معنی میں آیا ہے۔

[۵] "رکام" جوش و خروش میں آنے کو کہتے ہیں۔

https://downloadshiabooks.com/

"فَرَفَعَهُ فِي هَوَاءٍ مُنْفَتِقٍ وَجَوٍّ مُنْفَهِقٍ"[1]
''خداوند عالم نے اس جھاگ کو ایک وسیع اور کشادہ فضا کی جانب اوپر کی طرف اٹھایا۔''

"فَسَوّٰى مِنْهُ سَبْعَ سَمٰوَاتٍ"
''اور اس سے سات آسمانوں کو خلق کیا۔''

"جَعَلَ سُفْلَاهُنَّ مَوْجًا مَكْفُوفًا[2] وَعُلْيَاهُنَّ سَقْفًا مَحْفُوظًا وَسَمْكًا[3] مَرْفُوعًا"
''جب کہ اُس کے نچلے حصوں کو کسی مہار شدہ موج کی مانند قرار دیا اور اوپر کے حصوں کو کسی محفوظ اور بلند چھت کی مانند بنایا۔''

"بِغَيْرِ عَمَدٍ[4] يَدْعَمُهَا[5] وَلَا دِسَارٍ يَنْظِمُهَا"[6]
اس حال میں کہ کوئی ایسا ستون نہیں تھا جو اُسے روکے رکھے اور نہ کوئی کیل ایسی تھی جو اُسے باندھ کر ایک جگہ ٹکا دے۔''

پانچویں اور آخری مرحلے میں فرماتے ہیں:
"ثُمَّ زَيَّنَهَا بِزِينَةِ الْكَوَاكِبِ وَضِيَاءِ الثَّوَاقِبِ"[7]
''پھر خدا نے آسمانوں کو ستاروں اور ان کی روشنی سے آراستہ کیا۔''

---

[1] "منفهق" کا لفظ ،فَهِقَ، کے مادّے سے،فرق کے وزن پر ہے۔اس کے معنی پھیلاؤ اور وسعت کے ہیں اور اسی وجہ سے پانی کے برتن کو اور پہاڑوں کے درمیانی راستے کو اگر وہ چوڑا ہو تو اُسے بھی منفهق کہتے ہیں۔

[2] مکفوف، کا لفظ ،کف، کے مادّے سے ہے، سد کے وزن پر ہے، یہ قبض و انقباض: ہتھیلی کو بھی کف کہا جاتا ہے کیوں کہ معمولاً لین دین کا تعلق ہتھیلی سے ہوتا ہے۔اسی طرح نابینا شخص کو بھی مکوف کہا جاتا ہے، کیوں کہ اس کی آنکھیں بند ہوئی ہیں کے معنی میں آتا ہے۔

[3] سمك دراصل بلندی اور اونچائی کے معنی میں آتا ہے اور گھر کی چھت کو بھی سمک کہتے ہیں کیونکہ وہ اٹھی ہوئی اونچی ہوتی ہے۔

[4] عمد بروزن سبد اور عمد بروزن شُتُر دونوں عمود کی جمع ہیں جو کہ ستون کے معنی میں آتے ہیں۔

[5] يدعم ، کا لفظ ،دعم، کے مادّے سے فهم کے وزن پر ہے جس کے معنی ہیں کسی چیز کو کھڑا رکھنا۔ دعام اور ،دعامة، کے معنی وہ لکڑیاں ہیں جن کے ذریعے کسی کو دار،سولی پر لٹکایا جاتا ہے اور یہ لفظ ہر اُس چیز پر صادق آتا ہے جو اِس کام میں شریک ہو، اور سولی پر لٹکانے والا شخص بھی اسی کے زمرے میں آتا ہے۔

[6] دسار، کیل کے معنی میں ہے اور اسی طرح سے وہ رسی بھی کہلائی جاسکتی ہے کہ جس سے کسی چیز کو مضبوطی سے باندھا جائے۔

[7] ثواقب، کا لفظ ،ثقب، کے مادّے سے جو سقف کے وزن پر ہے،اس کے معنی سوراخ کرنے، پھاڑنے اور کسی چیز میں نفوذ کرنے کے ہیں اور درخشاں ستاروں کو اسی لیے ثواقب کہا جاتا ہے کیونکہ وہ آسمان کو چیرتے ہوئے ہم تک روشنی پہنچاتے ہیں اور ان کی روشنی اور چمک آنکھوں میں نفوذ کر جاتی ہے۔

https://downloadshiabooks.com/

"وَ أَجْرِی فِيهَا سِرَاجاً مُسْتَطِيراً[۱] وَ قَمَراً مُنِيراً فِي فَلَكٍ دَائِرٍ وَ سَقْفٍ سَائِرٍ وَ رَقِيمٍ[۲] مَائِرٍ"

''اور اُس میں ایک روشن اور نورافشاں چراغ (خورشید) اور ایک روشن چاند ایک متحرک محور پر گھومتی ہوئی چھت اور ہلتے ہوئے صفحے پر متحرک کر دیا۔''

چند نکات

اس موضوع پر جدید نظریات

آج کے دانشور اس دنیا کی خلقت کے بارے میں بہت سے خیالات رکھتے ہیں، کیونکہ کروڑوں سال پہلے کوئی نہیں تھا جس نے اس دنیا کی خلقت کا منظر اپنی آنکھوں سے دیکھا ہو،لیکن بہر حال کچھ ایسے قرینے بھی موجود ہیں جو ان بعض مفروضوں اور نظریات کی بھر پور تائید کرتے ہیں اور جو تعبیرات مولاؑ کے کلام میں آئی ہیں، وہ آج کے معروف نظریات سے مشابہت رکھتی ہیں، جن میں سے کچھ ذکر کی جارہی ہیں، مگر اس کا مقصد ہرگز یہ نہیں کہ مولاؑ کا فرمان اور سائنسدانوں کے نظریات بالکل ایک ہیں، البتہ ممکن ہے ایسا ہو۔ جیسا کہ ذکر ہوا کہ یہ دنیا شروع میں مختلف قسم کی گیس کا دھواں تھا جو کہ مائعات سے بھی مشابہت رکھتا تھا اور اُسے قرآن کے مطابق ''دُخان'' یعنی دھواں کہا گیا ہے۔ خداوند عالم نے ان پر دو عظیم طاقتوں کو مسلط کیا جنھیں دو ہواؤں سے تعبیر کیا گیا ہے۔ پہلی قوتِ جاذبہ جو ان گیسوں کو ملا کر اور جوڑ کر رکھتی تھی اور اپنی کشش کی قوت سے اُسے بکھرنے نہیں دیتی تھی اور دوسری قوت دافعہ تھی جو اپنے ہی گرد گھوم کر قوت گریز (یعنی مرکز سے دور کرنے کی قوت) کو ایجاد کرتی تھی اور اسے باہر کی جانب دھکیلتی تھی۔

یہ ہی دوسرا طوفان تھا جو نہایت شدید اور طاقتور تھا۔ اگر ہم یہ مان لیتے ہیں کہ اس کائنات کے آغاز سے اب تک اس میں مختلف قسم کی گردشیں واقع ہوتی رہی ہیں تو یہ بھی ماننا پڑے گا کہ یہ گردش کبھی شدید اور کبھی ہلکی اور معمولی بھی رہی ہو گی۔ یہ بات بھی لازمی ہے کہ اُس مائع نما، بہنے والی چیزوں کی گیس کے اندر جو موجیں اور لہریں پائی جاتی تھیں، ان میں طرح

---

[۱] مستطیر، کا لفظ، طیر، کے مادّے سے آیا ہے جس کے کا اصلی معنی کسی بھی چیز کا ہوا میں ہلکا ہونا ہیں۔ اس کے بعد ہر تیز چیز کے لیے استعمال ہوا ہے جیسے کہ پرندے جبکہ مستطیر، پھیلے ہوئے اور کشادہ کے معنی میں ہے۔ طلوع صبح کے اس وقت پر بھی صادق آتا ہے جب صبح کی روشنی آسمان پر چمکتی ہے۔

[۲] رقیم، کا لفظ، رقم، کے لفظ سے بروزن رزم ہے، اصل میں یہ خط و کتابت کے معنی میں ہے اور رقیم کا مطلب ہے صفحہ آسمان کہ وہ کسی کتاب کے صفحے کی مانند ہے اور ستاروں کے نقش و نگار سے پھیلا ہوا ہے، اسے ہی رقیم کہا جاتا ہے۔

https://downloadshiabooks.com/

طرح کے جوش وخروش بھی ظاہر ہوتے ہوں گے اور کبھی وہ موجیں ایک دوسرے پر تھپیڑے کی شکل میں گرتی پڑتی بھی رہی ہوں گی۔ بالآخر جو حصے ہلکے اور کم وزن تھے، جنہیں مولاؑ کے کلام میں (کف) جھاگ سے تعبیر کیا گیا ہے۔ وہ بیرونی فضا کی جانب پھینکے گئے ہوں گے۔ (یاد رہے کہ زبد پانی کے اوپر کے جھاگ کو بھی کہا جاتا ہے اور مشک کے اندر کی چار دیواری پر ظاہر ہونے والی چربی اور مکھن کو بھی کہا جاتا ہے) اس طرح ایک اور گول حرکت شروع ہوئی اور ایک بڑا تودہ اوپر کی فضا میں اُچھلا اور اس سے نکلنے والے حصوں میں جن میں زیادہ شدت تھی، وہ مزید اوپر اور آگے سے آگے کے مقامات تک جا پہنچے اور جن میں شدت کم تھی، وہ نچلے حصوں تک ہی جا کر رک گئے۔ مگر وہ جو زیادہ دور کے مقامات تک گئے، وہ بھی قدرتِ جاذبہ کی وجہ سے مکمل طور پر فرار نہ کر سکے اور ایک محفوظ چھت کی صورت اختیار کر گئے اور نچلے حصے ہلکے دباؤ والی موجیں تھیں، جنہیں موجِ مکفوف سے تعبیر کیا ہے۔

اور اس طرح سات آسمان (جن کی تفصیلی بحث بعد میں آئے گی) اس وسیع اور کھلی فضا میں ظاہر ہو گئے، جن کو کھڑا رکھنے کے لیے کسی ستون اور کیل اور رسّی کی ضرورت بھی نہیں پڑی۔ صرف یہ قوت جاذبہ اور دافعہ کی عادلانہ تقسیم تھی، جس نے انہیں اپنے اپنے مقامات پر روکے بھی رکھا اور ان کے اپنے اپنے مرکز پر متحرک بھی رکھا۔ اُس وقت پوری فضا چھوٹے بڑے کرُّوں (گولوں) اور انواع واقسام کے ان ٹکڑوں سے بھری ہوئی تھی، جو ان موجوں کے دباؤ اور شدت کی وجہ سے چاروں طرف پھیل گئے تھے، پھر بتدریج چھوٹے قطعات اور ٹکڑے قوتِ جاذبہ کے حکم پر بڑے کرّوں سے جا ملے اور یوں پوری فضا کی صفائی ہوگئی اور ستارے چمکنے لگے، جو باعث زینت بن گئے جبکہ چاند اور سورج کی روشنی گرمی اور حرارت پیدا کرنے کا باعث بنی اور ہر چیز اپنے مخصوص خط (سمت) پر گردش کرنے لگی۔

بعض موجودہ سائنسی مفروضوں اور نظریات میں سے ایک یہ ہے کہ اس دنیا کے بننے کی وجہ ایک بہت بڑا ایٹمی اندرونی دھماکا تھا جس کی وجہ سے ہر طرف مختلف قسم کے ٹکڑے اور ذرّات پھیل گئے، جن سے پھر چاند، سورج، ستارے اور سیّارے وغیرہ بن گئے۔ اور مختلف کہکشائیں بن گئیں۔ البتہ کسی نے اب تک یہ معیّن نہیں کیا کہ یہ دھماکا اصل میں کہاں سے ہوا تھا اور اس کے اسباب کیا تھے۔ یہ ضرور ہے کہ یہ دھماکا گیس کے بڑے بڑے تودوں اور ٹکڑوں میں ہوا جو کہ دیکھنے میں پانی کی طرح تھے۔ اس دھماکے سے ٹکڑے فضا میں اُڑے اور کہکشائیں بن گئیں۔ ممکن ہے کہ مولاؑ کے کلام کا یہ فقرہ، اسی بڑے دھماکے کی طرف نشاندہی کر رہا ہو کہ (تیز ہوائیں اور طوفان چلنے لگے جس کا آغاز ایک دور دراز نقطہ تھا اور اس نے پانی کو شدت سے درہم برہم کر کے اتنا پٹخا کہ اس میں سے جھاگ ظاہر ہوا۔

بہر حال ان سب وضاحتوں کا مقصد جیسا کہ پہلے عرض کیا جا چکا، صرف موجودہ سائنسی انکشافات اور نظریات سے

https://downloadshiabooks.com/

تطبیق کرنا اور موازنہ کرنا ہے تاکہ ہم اِس دنیا کی خلقت کو اس خطبے اور سائنسی نظریات کی روشنی میں سمجھ سکیں اور یہ کوئی حتمی اور یقینی بات نہیں ہے۔

دنیا کیسے خلق ہوئی؟

وہ پیچیدہ مسائل جن میں آج بھی تمام سائنسدان اُلجھے ہوئے ہیں، ان میں سے ایک مسئلہ اِس دنیا کی خلقت کی کیفیت کا مسئلہ ہے۔ یہ مسئلہ جو کروڑوں اربوں سال پہلے سے متعلق ہے اور شاید کسی انسان کے وہم وگمان میں بھی نہیں آ سکتا ۔اسی وجہ سے بڑے بڑے سائنسدانوں اور دانشوروں نے تمام تر مفروضوں اور خیالی نظریات کا اظہار کرنے اور دقیق ترین اور عمیق ترین مطالعات کرنے کے بعد بھی عاجزی اور ناتوانی کا اظہار کیا ہے، مگر انسان کی تجسّس سے بھرپور رُوح اُسے چپ رہنے کی اجازت نہیں دیتی۔ درحقیقت دانشوروں اور سائنسدانوں کی زبانِ حال یہ ہے کہ اگرچہ ہم اس موضوع کی انتہا تک نہیں پہنچ سکے، مگر پھر بھی اس بارے میں کچھ شبہات اور خیالی مفروضوں کو روشن کرکے اپنی بے چین روح کو کسی حد تک سیراب کر سکتے ہیں۔

آیات و روایات میں بھی اس موضوع پر سوائے کچھ اشاروں کے اور کچھ نہیں ملتا کہ جس سے موضوع مکمل طور پر واضح ہوجائے اور شاید اس مسئلے کا تقاضا بھی کچھ ایسا ہی ہے۔

بہرحال جو کچھ اس خطبے میں دنیا کی خلقت اور تخلیق کے بارے میں آیا ہے، وہ خطبہ نمبر ۲۱۱ میں بھی ہے کہ مولاؑ نے فرمایا:

"وَكَانَ مِنِ اقْتِدَارِ جَبَرُوْتِهِ وَ بَدِيْعِ لَطَائِفِ صَنْعَتِهِ اَنْ جَعَلَ مِنْ مَاءِ الْبَحْرِ الزَّاخِرِ الْمُتَرَاكِمِ الْمُتَقَاصِفِ يَبَساً جَامِداً ثُمَّ فَطَرَ مِنْهُ اَطْبَاقاً فَفَتَقَهَا سَبْعَ سَمٰوَاتٍ بَعْدَ ارْتِتَاقِهَا"

"اُس کی قدرت، جبروت اور اُس کی صنعت کے بدیع لطائف میں سے ایک یہ تھا کہ اُس نے موجوں کے ٹھاٹھیں مارتے ہوئے سمندر کے پانی سے ایک جامد مخلوق بنائی، پھر اُس میں کچھ طبقے بنائے اور مل جانے کے بعد اُنہیں ایک دوسرے سے الگ کیا اور یوں سات آسمانوں کو خلق فرمایا۔"[1]

اسلامی تعلیمات میں بھی اس بارے میں بہت سے مطالب پائے جاتے ہیں اور بہت سی روایات، نہج البلاغہ سے

[1] ان روایات سے مزید آگاہی کے لیے بحار الانوار، جلد ۳، ۱۰، اور ۵۷ (طبع بیروت) کا مطالعہ فرمائیں، ان میں سے زیادہ تر روایات جلد نمبر ۵۷ میں موجود ہیں۔

https://downloadshiabooks.com/

مطابقت رکھتی ہیں، البتہ اس فرق کے ساتھ کہ اُن میں یہ ملتا ہے کہ پہلے پانی پر کچھ جھاگ بنا اور اُس جھاگ میں سے کچھ دھواں اُٹھا اور اُس سے سات آسمان خلق ہوئے۔

مگر جیسا کہ بتایا گیا، ان تمام روایات میں کہیں بھی دوسری روایت کی مخالفت نہیں ہے، کیونکہ سب سے پہلا جو مادّہ تھا وہ دراصل پانی کی طرح ایک گیس تھی جس میں شدید دباؤ پایا جاتا تھا۔ اب اس کے لیے پانی، دھواں، بخارات وغیرہ کے جیسے مختلف الفاظ استعمال ہوئے ہیں، مگر اصل مطلب ایک ہی ہے۔ یہ نکتہ بھی قابلِ توجّہ ہے ان تمام روایات میں کوئی تضاد نہیں، جو یہ کہتی ہیں کہ خدا نے سب سے پہلی چیز جو خلق کی وہ پانی تھا یا یہ کہ سب سے پہلی چیز جو خدا نے خلق کی وہ نورِ رسالت مآب صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم تھا، یا پہلی مخلوق عقل تھی، وغیرہ۔ کیونکہ ان میں سے بعض روایات عالمِ مادّہ کو دیکھتے ہوئے بیان کی گئی ہیں اور بعض روایات عالمِ مجردات اور عالمِ ارواح کے حوالے سے ہیں۔ جو کچھ بیان ہوا، اس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ ان روایات اور سورۂ فصلت (سورۂ حٰم السجّدہ) کی اس آیت میں بھی کوئی فرق نہیں ہے "ثُمَّ اسْتَوٰى اِلَى السَّمَآءِ وَهِيَ دُخَانٌ"[1]
''پھر آسمان کی طرف متوجّہ ہوا، جبکہ وہ دھوئیں کی صورت تھا۔''

نزولِ قرآن کے دور میں تخلیق کائنات کے متعلق مفروضے

قابلِ ذکر بات تو یہ ہے کہ جس جگہ قرآن نازل ہوا یا بہتر لفظوں میں یوں کہا جائے کہ جس زمانے میں قرآن نازل ہوا، تخلیق کائنات کے بارے میں اُس وقت بھی دو نظریے پائے جاتے تھے۔ ان میں سے ایک نظریہ (بطلیموس) کے گروہ کا تھا، جو تقریباً پندرہ سو (۱۵۰۰) سال تک علمی دنیا پر حاکم رہا اور یہ عقیدہ کئی صدیوں تک چلتا رہا۔ اس مفروضے کے مطابق زمین سارے جہاں کا مرکز تھی اور اُس کے گرد نو (۹) فلک گھوم رہے تھے۔ تمام افلاک پیاز کے چھلکوں کی طرح اور شیشے کی طرح صاف شفاف اور ایک دوسرے کے اوپر تھے۔ اور گھومنے والے ستارے عطارد، زھرہ، مریخ، مشتری اور زحل، کسی نہ کسی فلک میں اور چاند، سورج دونوں اپنے اپنے فلک سے تعلق رکھتے تھے، ان سات افلاک کے علاوہ ایک فلک ایسا تھا جو ثابت ستاروں کا فلک تھا۔ (ثابت ستاروں سے مراد وہ ستارے ہیں جو ایک ساتھ طلوع کرتے اور ایک ساتھ غروب کرتے ہیں اور آسمان پر اپنی جگہ تبدیل نہیں کرتے، یہ ستارے اُن پانچ ستاروں سے بالکل مختلف ہیں جن کے نام ذکر کیے گئے) آٹھواں فلک، یعنی فلکِ ثوابت تھا اور اس کے بعد فلک اطلس تھا، ایسا فلک جس میں کوئی ستارہ نہیں تھا اور اُس کا کام پورے جہاں کو زمین کے گرد گھمانا تھا اور اُس کا نام فلک الافلاک تھا۔

[1] سورۂ فصلت (سورۂ حم سجدہ): آیت ۱۱

https://downloadshiabooks.com/

اگلا مفروضہ، عقول عشرہ کا مفروضہ تھا جو کہ خود ''بطلیموس'' کے نظریے سے (جو فطرت کی طرف جھکاؤ رکھتا ہے) مدد لیتا ہے۔ یہ نظریہ جو یونانی فلسفیوں کا بنایا ہوا تھا، اس کے مطابق خداوند عالم نے سب سے پہلے عقل اوّل کو بنایا اور اُس کے سوا کچھ نہیں بنایا۔ عقلِ اوّل کسی فرشتہ یا عظیم روح یا مجرد مخلوق کو کہا گیا تھا، اس عقل نے دو چیزیں خلق کیں۔ عقلِ دوّم اور نواں فلک۔ پھر عقلِ دوّم نے عقلِ سوّم اور آٹھویں فلک کو خلق کیا اور اسی ترتیب سے دس (۱۰) عقلیں اور نو (۹) فلک بنائے گئے اور گویا عقل نے سارے جہاں کو پیدا کیا۔

البتہ ان فرضی مراتب کا سلسلہ درحقیقت بے دلیل اور بے بنیاد تھا۔ اگرچہ ''بطلیموس'' کا مفروضہ بھی بے دلیل تھا، مگر جیسا بھی تھا، بہر حال کئی صدیوں تک لوگوں کے افکار پر حکومت کرتا رہا، مگر قرآن مجید اور اسلامی تعلیمات نے نہ تو پہلے مفروضے کو قبول کیا اور نہ ہی دوسرے مفروضے کو، کیونکہ قرآنی آیات اور معروف روایات، خاص طور پر نہج البلاغہ میں ان افکار کے کوئی آثار نظر نہیں آتے بلکہ ان کی تردید ہے اور یہ خود قرآن کریم اور اسلامی روایات کی عظمت اور استقلال کی دلیل ہے، کیوں کہ ان تعلیمات کا آغاز افکار بشر کے آغاز سے نہیں، بلکہ مبداء وحی سے ہے، ورنہ انہی کے رنگ میں رنگی ہوئی نظر آتیں۔ [۱] دنیا کی پیدائش کی کیفیت کو کلام امیرالمومنینؑ میں ملاحظہ کیا، جو کہ بہت سی دیگر روایات میں بھی ملتی ہے۔

جو کچھ قرآن میں اور روایات میں ملتا ہے وہ سات آسمانوں کا تذکرہ ہے، نہ نو (۹) افلاک اور نہ ہی دس (۱۰) عقلوں کی بات ہے اور رہی سات آسمانوں کی تفصیل تو وہ آگے ذکر ہوگی۔

مگر افسوس کی بات تو یہ ہے کہ نہج البلاغہ کے بہت سے قدیم شارحین جو کہ عقولِ عشرہ کے مفروضے اور ''بطلیموس'' کے نظریے سے متاثر تھے، اُنہوں نے ان نظریات اور مفروضاتِ باطلہ کو نہج البلاغہ کی شرح میں گھسیٹ لیا اور مولائے کائناتؑ کے کلام کو اُن نظریات سے ملانے کی کوشش کی، جو کہ محض فرضی اور خیالی باتیں تھیں اور اُن کے نقل کرنے کی ضرورت بھی نہیں تھی، کیوں کہ یہ ایسے مفروضے تھے جن کا باطل ہونا آج ثابت ہو چکا ہے۔

آج کے علمی مشاہدات اور فلکی دانشوروں اور سائنسدانوں کے تجربوں نے یہ ثابت کردیا ہے کہ فلک کے بارے میں جو ''بطلیموس'' سمجھ رہا تھا، موجود ہی نہیں اور گھومنے والے اور ثابت ستاروں کی تعداد بھی اُن سے کئی گنا زیادہ ہے۔ جیسا کہ پہلے کے لوگ سمجھتے تھے۔ خالی فضا میں تمام سیارے زمین کے گرد نہیں بلکہ سورج کے گرد گھوم رہے ہیں اور ساتھ ہی اپنے اپنے

---

[۱] بلکہ بہت سی قرآنی آیات زمین کی حرکت کی جانب اشارہ کررہی ہیں، جیسے کہ سورۂ نمل کی آیت نمبر: ۸۸ ''وَ تَرَى الْجِبَالَ تَحْسَبُهَا جَامِدَةً وَّهِيَ تَمُرُّ مَرَّ السَّحَابِ صُنْعَ اللّٰهِ الَّذِيْٓ اَتْقَنَ كُلَّ شَيْءٍ'' اور سورۂ مرسلات کی آیت نمبر: ۲۵ ''اَلَمْ نَجْعَلِ الْاَرْضَ كِفَاتًا'' بعض تفسیریں اور بعض آیات چاند، سورج عالم بالا کی فضا میں شناور ہونے پر دلالت کرتی ہیں۔ جیسے کہ سورۂ یاسین کی آیت: ''لَا الشَّمْسُ يَنْۢبَغِيْ لَهَآ اَنْ تُدْرِكَ الْقَمَرَ وَلَا الَّيْلُ سَابِقُ النَّهَارِ ۭ وَكُلٌّ فِيْ فَلَكٍ يَّسْبَحُوْنَ ۝۴۰'' (مزید وضاحت کے لیے تفسیر نمونہ کا مطالعہ کیجیے)

https://downloadshiabooks.com/

محور کے گرد گھوم رہے ہیں اور زمین نہ صرف یہ کہ مرکز جہاں نہیں ہے بلکہ یہ بھی اپنی ذات میں ایک چھوٹا سا سیارہ ہے جو اپنے نظامِ شمسی کے سیاروں میں سے ایک ہے اور یہ نظامِ شمسی بھی لاکھوں کروڑوں نظاموں میں سے ایک بہت چھوٹا نظام ہے۔مگر عقولِ عشرہ کے طرفداروں نے باوجود اس کے کہ اپنی ایک ٹانگ ''بطلیموس'' کے نظریے میں اٹکائی ہوئی ہے، جو آج باطل ہو چکا ہے، بلکہ اپنی دوسری ٹانگ بعض من پسند عقلی قاعدوں میں اٹکائی ہوئی ہے جیسے کہ ''اَلْوَاحِدُ لَا یَصْدُرُ مِنْہُ اِلَّا الْوَاحِدُ'' کا قاعدہ جس کی تشریح کا یہ مقام نہیں ہے۔البتہ یہ قاعدہ بھی سائنسدانوں اور دانشوروں کی اکثریت کے نزدیک دلائل کے لحاظ سے اُدھورا اور کمزور ہے۔لہٰذا عقولِ عشرہ جیسے نظریے کا اکلوتا سہارا بھی ختم ہو جاتا ہے۔[1]

سات آسمانوں سے مراد کیا ہے؟

سات آسمانوں کا تذکرہ قرآن کے علاوہ اس خطبے میں یا نہج البلاغہ کے دوسرے خطبوں میں (خطبہ نمبر ۲۱۱ وغیرہ میں) آیا ہے۔[2]

جدید اور قدیم دانشوروں کے درمیان سات آسمانوں کے بارے میں مختلف تفسیریں پائی جاتی ہیں، جن کی وضاحت اور بحث کی یہاں پر گنجائش نہیں ہے اور مختصر یہ کہ اُن تمام تفسیروں میں سے جو سب سے زیادہ صحیح نظر آتی ہے، وہ یہ ہے کہ سات آسمانوں سے مُراد درحقیقت وہی ہے جو اس لفظ میں سے بظاہر سمجھ میں آتا ہے۔آسمان سے مراد ستاروں اور کواکب کا ایک مجموعہ ہے، جو اوپر کے عالم سے متعلق ہیں اور سات کا عدد وہی عدد ہے جو ایک معین تعداد کی نمائندگی کرتا ہے، کوئی کثرت اور مبالغہ مراد نہیں۔مگر قرآن کی دوسری آیات سے یہ پتا چلتا ہے کہ جو کچھ ہم نے ثابت اور سیار ستارے اور کہکشائیں بنائی ہیں، وہ سب پہلے آسمان سے متعلق ہیں۔

اس لحاظ سے دیکھا جائے تو اس عظیم مجموعے کے پیچھے، چھے (۶) مزید مجموعے ہیں، جو چھے (۶) آسمانوں کی صورت میں موجود ہیں، جو فی الحال انسان کی دسترس میں نہیں ہیں۔

سورۂ صافات میں بھی اس بات کی گواہی ملتی ہے:

---

[1] مرحوم خواجہ نصیر الدین طوسی اپنی کتاب ''تجرید الاعتقاد'' میں نظریۂ عقولِ عشرہ پر دلائل پنجگانہ کی جانب اشارہ کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ یہ سب نظریات غلط ہیں اور ایک مختصر سی عبارت میں کہتے ہیں ''وَ اَدِلَّتُہُ وُجُودِہٖ مَدْخُولَۃ'' مزید وضاحت کے لیے خواجہ کے کلام اور اُس کی شرح میں لکھے ہوئے علامہ حلّی کے کلام کی طرف رجوع کیجیے۔

[2] قابل توجہ بات یہ ہے کہ قرآن کی سات آیات میں سات آسمانوں کا تذکرہ ہوا ہے۔(سورۂ بقرہ، آیت ۲۹، اسراء، آیت ۴۴، مومنون، آیت ۸۶، فصلت، آیت ۱۲، طلاق، آیت ۱۲، ملک، آیت ۳، اور نوح، آیت ۱۵) اور بعض آیات میں دوسری تعبیرات کے ساتھ ان کی جانب اشارہ ہے۔

https://downloadshiabooks.com/

"اِنَّا زَيَّنَّا السَّمَاءَ الدُّنْيَا بِزِيْنَةِ الْكَوَاكِبِ"[۱]

''ہم نے نچلے آسمان کو یا نزدیک کے آسمان کو ستاروں سے زینت بخشی۔''

یہی مطلب سورۂ فصلت کی آیت نمبر ۱۲ میں نظر آتا ہے:

"وَزَيَّنَّا السَّمَاءَ الدُّنْيَا بِمَصَابِيْحَ"

''ہم نے سب سے نچلے آسمان کو ستاروں کے چراغوں سے زینت بخشی۔''

اور سورۂ ملک کی پانچویں آیت:

"وَلَقَدْ زَيَّنَّا السَّمَاءَ الدُّنْيَا بِمَصَابِيْحَ"

لطف کی بات تو یہ ہے کہ علامہ مجلسیؒ نے بھی بحار الانوار میں اس تفسیر کو ایک فکری احتمال کی بناء پر یا دوسرے الفاظ میں یوں کہا جائے کہ آیات اور روایات سے جو کچھ اُنہیں ملا، اُس کی بنا پر ذکر کیا ہے۔[۲]

یہ بات درست ہے کہ علمی وسائل نے اب تک ان چھ عالموں سے پردہ نہیں اُٹھایا ہے، مگر ساتھ ہی ان علمی میدانوں میں اُن عوالم کے خلاف کوئی دلیل نہیں پائی جاتی۔ اور شاید آئندہ اس معمے کا راز کھل جائے، بلکہ بعض دانشوروں کے مکاشفات سے یہ پتا چلتا ہے کہ اُنہیں دُور کے کچھ عالموں پر شبہ ہے۔ مثال کے طور پر بعض فضائی رسالوں میں پالومار کے رصد خانے کا بیان آیا ہے کہ 'پالومار' کے رصد خانے کی دوربین سے کئی ملین (Million) کہکشاؤں کو کشف کیا گیا ہے، جن میں سے بعض تو لاکھوں نوری سال کی مسافت کے فاصلے پر ہیں، مگر ہزاروں لاکھوں نوری برسوں کے فاصلے کے بعد ایک نہایت بڑی اور اندھیری فضا ہے جو کہ ہیبت ناک ہے اور اُس میں کوئی چیز دیکھی نہیں جارہی۔ مگر بلا تردید یہ کہا جاسکتا ہے کہ اُس ہیبت ناک اور تاریک فضا میں بھی ہزاروں لاکھوں کہکشائیں ہوں گی کہ جن کی قوت جاذبہ کی طاقت سے ہماری یہ دنیا بھی سنبھلی ہوئی ہے۔

یہ پوری عظیم دنیا جو ہماری نظر میں ہے اور اس میں ہزاروں لاکھوں کہکشائیں ہیں، یہ دنیا اپنے پورے اتنے بڑے اور ہیبت ناک وجود کے باوجود اپنے سے بڑی دنیا کے مقابل میں ایک چھوٹے ذرّے سے زیادہ حیثیت نہیں رکھتی اور ابھی کچھ نہیں کہا جاسکتا کہ اُس دوسری دنیا کے پیچھے بھی کوئی تیسری دنیا نہ ہو۔[۳] اِس بنا پر جتنے عالم انسان پر کشف ہوئے ہیں، وہ

---

[۱] سورۂ صافات، آیت نمبر ۶

[۲] بحار الانوار: ج ۵۵، ص ۸۷

[۳] مجلہ فضا، شمارہ ۵۶، فروع دین سن ۱۳۵۱ شمسی۔

https://downloadshiabooks.com/

سب کے سب اپنی تمام تر عظمتوں ، حیرت انگیزیوں اور رعنائیوں کے باوجود اس بڑے عالم کے ایک چھوٹے سے ٹکڑے ہیں۔ اور کیا معلوم کہ آئندہ انسان پر اُن چھے عالموں کی حقیقت بھی واضح ہو جائے۔

ان امور پر حضرت علیؑ کی دسترس

قابل توجہ بات یہ ہے کہ جو تعبیرات امیر المومنین حضرت علی علیہ السلام نے اس جہاں کی خلقت کے بارے میں ارشاد فرمائی ہیں، وہ ہرگز کوئی نظریہ یا فرضیہ یا احتمال نہیں ہے، بلکہ پورے یقین اور قاطعیت کے ساتھ کہی ہوئی ایسی حتمی باتیں ہیں، جو کسی حاضر و ناظر شخص کی زبان سے کہی گئی ہیں۔ اور یہ اس بات کی منہ بولتی دلیل ہے کہ آپؑ علم غیب الٰہی کے خزانے سے اور تعلیماتِ رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے وابستہ ہیں، جس کا سرچشمہ اور مبداء، وحی ہے اور ابن ابی الحدید کے بقول یہ سب باتیں اس حقیقت کی نشان دہی کر رہی ہیں کہ حضرت علیؑ تمام تر علوم کے مالک تھے اور یہ مطالب اُن کے فضائل و مناقب سے وابستہ ہیں۔ [۱] اور ایسا کیوں نہ ہو کہ ایک مقام پر آپؑ خود فرماتے ہیں:

"اَنَا بِطُرُقِ السَّمَاءِ اَعْلَمُ مِنِّی بِطُرُقِ الْاَرْضِ"

''میں زمین کے راستوں سے زیادہ آسمان کے راستوں کو جانتا ہوں۔'' [۲]

آٹھواں حصّہ

"ثُمَّ فَتَقَ مَا بَيْنَ السَّمٰوَاتِ الْعُلَا فَمَلَأَهُنَّ اَطْوَاراً مِنْ مَلَائِكَتِهِ، مِنْهُمْ سُجُوْدٌ لَا يَرْكَعُوْنَ، وَ رُكُوعٌ لَا يَنْتَصِبُونَ، وَ صَافُّونَ لَا يَتَزَايَلُوْنَ، وَ مُسَبِّحُونَ لَا يَسْأَمُوْنَ، لَا يَغْشَاهُمْ نَوْمُ الْعُيُوْنِ، وَلَا سَهْوُ الْعُقُوْلِ، وَلَا فَتْرَةُ الْاَبْدَانِ، وَلَا غَفْلَةُ النِّسْيَانِ، وَ مِنْهُمْ اُمَنَاءُ عَلٰى وَحْيِهِ، وَ اَلْسِنَةٌ اِلٰى رُسُلِهِ، وَ مُخْتَلِفُوْنَ بِقَضَائِهِ وَاَمْرِهِ، وَ مِنْهُمُ الْحَفَظَةُ لِعِبَادِهِ وَ السَّدَنَةُ لِاَبْوَابِ جِنَانِهِ، وَ مِنْهُمُ الثَّابِتَةُ فِي الْاَرَضِيْنَ السُّفْلٰى اَقْدَامُهُمْ، وَ الْمَارِقَةُ مِنَ السَّمَاءِ الْعُلْيَا اَعْنَاقُهُمْ، وَ الْخَارِجَةُ مِنَ الْاَقْطَارِ اَرْكَانُهُمْ، وَالْمُنَاسِبَةُ لِقَوَائِمِ الْعَرْشِ اَكْتَافُهُمْ نَاكِسَةٌ دُوْنَهُ اَبْصَارُهُمْ مُتَلَفِّعُوْنَ تَحْتَهُ بِاَجْنِحَتِهِمْ، مَضْرُوْبَةٌ بَيْنَهُمْ وَ بَيْنَ مَنْ دُوْنَهُمْ حُجُبُ الْعِزَّةِ وَ اَسْتَارُ الْقُدْرَةِ، لَا يَتَوَهَّمُوْنَ رَبَّهُمْ

[۱] شرح نہج البلاغہ، ابن ابی الحدید، جلد ۱، صفحہ ۸۰

[۲] نہج البلاغہ، خطبہ ۱۸۹

https://downloadshiabooks.com/

بِالتَّصْوِيرِ، وَلَا يُجْرُوْنَ عَلَيْهِ صِفَاتِ الْمَصْنُوْعِيْنَ، وَلَا يَحُدُّوْنَهُ بِالْاَمَاكِنِ، وَلَا يُشِيْرُوْنَ اِلَيْهِ بِالنَّظَائِرِ"

پھر اُس نے بلند ترین آسمانوں کے درمیان شگاف پیدا کیے اور انہیں طرح طرح کے فرشتوں سے بھر دیا، جن میں سے بعض سجدے میں ہیں تو رکوع کی نوبت نہیں آتی ہے اور بعض رکوع میں ہیں تو سر نہیں اٹھاتے ہیں اور بعض صف باندھے ہوئے ہیں تو اپنی جگہ سے حرکت نہیں کرتے ہیں، بعض مشغول تسبیح ہیں تو خستہ حال نہیں ہوتے ہیں، یہ سب کے سب وہ ہیں کہ ان کی آنکھوں پر نیند کا غلبہ ہوتا ہے اور نہ عقلوں پر سہو ونسیان کا۔ نہ بدن میں سستی پیدا ہوتی ہے اور نہ دماغ میں نسیان کی غفلت۔ ان میں سے بعض کو وحی کا امین اور رسولوں کی طرف قدرت کی زبان بنایا گیا ہے۔ جو اس کے فیصلوں اور احکام کو برابر لاتے رہتے ہیں اور کچھ اس کے بندوں کے محافظ اور جنت کے دروازوں کے دربان ہیں اور بعض وہ بھی ہیں جن کے قدم زمین کے آخری طبقے میں ثابت ہیں اور گردنیں بلند ترین آسمانوں سے بھی باہر نکلی ہوئی ہیں۔ ان کے اطرافِ بدن اقطارِ عالم سے وسیع تر ہیں اور ان کے کاندھے عرش کے ستونوں کو اٹھانے کے قابل ہیں۔ ان کی نگاہیں عرش الٰہی کے سامنے جھکی ہوئی ہیں اور وہ اس کے نیچے پروں کو سمیٹے ہوئے ہیں۔ ان کے اور دیگر مخلوقات کے درمیان عزت کے حجاب اور قدرت کے پردے حائل ہیں۔ وہ اپنے پروردگار کے بارے میں شکل وصورت کا تصور بھی نہیں کرتے ہیں اور نہ اس کے حق میں مخلوقات کی صفات کو جاری کرتے ہیں، وہ نہ اسے مکان میں محدود کرتے ہیں اور نہ اس کی طرف امثال ونظائر سے اشارہ کرتے ہیں۔[1]

شرح وتفسیر

فرشتوں کا عالم

اس خطبے کے شروع میں حضرت علی علیہ السلام نے آسمانوں کی تخلیق اور مخلوقات کی طرز خلق کا ذکر کیا اور اب فرشتوں کے عالم بالا میں رہنے، ان کی خصوصیات، اقسام اور عمل کا طریقہ کار اور ان کے وجود کی عظمت، ان کی معرفت کا بلند معیار ہونا وغیرہ بیان فرمایا ہے۔

"ثُمَّ فَتَقَ مَا بَيْنَ السَّمٰوَاتِ الْعُلَا[2]"

---

[1] وضاحت، کتاب کے آخر "ضمیمہ" میں ملاحظہ فرمائیں۔

[2] العلاء، علیا کی جمع ہے اور اس کی مونث "اعلیٰ" ہے یعنی بالا اور اشرف کے معنی میں ہے۔

https://downloadshiabooks.com/

اس تعبیر سے ہم اچھی طرح استفادہ کر سکتے ہیں کہ آسمانوں کے درمیان فاصلے موجود ہیں اور وہ شروع سے ایک دوسرے میں بھی مربوط اور پیوست تھے اور پھر ایک دوسرے سے جدا ہوئے۔ یہ حقیقت نظریۂ بطلیموس کے خلاف ہے کہ یہ طبقات پیاز کے چھلکوں کی طرح ایک دوسرے سے جڑے ہوئے ہیں، اور ان کے بیچ میں کوئی فاصلہ نہیں ہے۔ اس کے بعد حضرت امام علیؑ فرماتے ہیں:

"فَمَلَاَهُنَّ اَطْوَارًا [۱] مِنْ مَلَآئِكَتِهِ، [۲]

خداوند عالم نے ان فاصلوں کو فرشتوں کے وجود سے پُر کیا ہے۔

خطبۂ اشباح (خطبہ نمبر ۹۱) میں ہم پڑھتے ہیں:

"وَمَلَاَ بِهِمْ فُرُوْجَ فِجَاجِهَا وَحَشَا بِهِمْ فُتُوْقَ اَجْوَائِهَا"

یعنی فرشتوں کے ذریعے سے آسمانوں کے فاصلوں کو پُر کیا اور اُن کی فضا کے فاصلوں کو فرشتوں سے مالا مال کیا۔

اسی خطبے کے دوسرے جملے میں ہم پڑھتے ہیں:

"وَلَيْسَ فِي اَطْبَاقِ السَّمَاءِ مَوْضِعُ اِهَابٍ اِلَّا وَعَلَيْهِ مَلَكٌ سَاجِدٌ اَوْ سَاعٍ حَافِدٌ"

''تمام آسمانوں میں اتنی جگہ نہیں جتنی چو پایوں کی کھال کے درمیان، مگر یہ کہ وہاں کوئی فرشتہ سجدہ کرتا ہوا ہوگا یا تیزی سے اپنے کام میں مشغول ہوگا۔''

یہاں پر فرشتوں کو چار گروہوں میں تقسیم کیا گیا ہے، سب سے پہلے وہ فرشتے جن کا کام عبادت کرنا ہے اور ان کے بھی چند گروہ ہیں:۔

"مِنْهُمْ سُجُوْدٌ [۳] لَا يَرْكَعُوْنَ"

'' ایک گروہ وہ ہے جو صرف سجدہ کرتا ہے، رکوع نہیں کرتا۔''

"وَرُكُوْعٌ لَا يَنْتَصِبُوْنَ"

''ایک گروہ ہے جو رکوع کرتا ہے قیام نہیں کرتا۔''

---

[۱] اطوار، طور کی جمع ہے، قول کے وزن پر یہ صنف کے معنی میں، نیز حد، مقدار اور حالت وکیفیت کے معنی میں بھی آیا ہے۔

[۲] اگر چہ عبارت کا ظاہر یہ ہے کہ ''ھن'' کی ضمیر آسمانوں کی طرف پلٹتی ہے لیکن ''ثم فتق'' کے قرینے کے ذریعے اور فملاھن میں موجود فاء تفریع سے واضح ہو جاتا ہے کہ یہاں مراد آسمانوں کے درمیان موجود فاصلے ہیں۔

[۳] سجود ''ساجد'' کی جمع ہے (سجدہ کرنے والا)۔ جس طرح رکوع ''راکع'' کی جمع ہے (یعنی رکوع کرنے والا)

https://downloadshiabooks.com/

"وَ صَافُّوْنَ [۱] لَا یَتَزَایَلُوْنَ"

''ایک گروہ وہ ہے جو صرف قیام کرتا ہے اور اس حالت سے جدا نہیں ہوتا۔''

بعض نے لفظ ''صافون'' کو صف باندھنے والوں کے معنی میں استعمال کیا ہے اور بعض نے ان کے بال و پر کو آسمان تک پھیل جانے کا معنی لیا ہے، اس بات پر قرینہ، وہ تعبیر ہے جو کہ قرآن میں پرندوں کے لیے آئی ہے:

"اَوَلَمْ یَرَوْا اِلَی الطَّیْرِ فَوْقَهُمْ صَافَّاتٍ"

''کیا وہ نہیں دیکھا ہے کہ ان کے سروں پر پرندے پر پھیلائے ہوئے ہیں۔''

یہ احتمال بھی موجود ہے کہ منظم صفوں سے مراد خداوند متعال کی اطاعت و فرمانبرداری ہے۔[۲] پہلا احتمال زیادہ مناسبت رکھتا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ جس طرح ہماری عبادت کی تین مخصوص حالتیں:۔ قیام، رکوع اور سجود ہیں، ان فرشتوں میں بھی ہر گروہ ان تین میں سے کسی ایک عبادت میں غرق ہے۔

صافون سے مراد یا تو فرشتوں کی منظم صفیں ہیں یا ان میں سے ہر ایک کا منظم قیام ہے۔ بالکل اُسی طرح، جس طرح خطبۂ ہمام میں متقین کے بارے میں آیا ہے:

"اَمَّا اللَّیْلَ فَصَافُّوْنَ اَقْدَامَهُمْ تَالِیْنَ لِاَجْزَاءِ الْقُرْآنِ" [۳]

راتوں میں اپنے پیروں پر کھڑے قرآن کی تلاوت کرتے ہیں۔

"وَ مُسَبِّحُوْنَ لَا یَسْأَمُوْنَ"

''اور دوسرا گروہ تسبیح خدا میں مصروف ہے، ہرگز تھکتا نہیں۔''

اس جملے سے ظاہر ہوتا ہے کہ یہ گروہ مذکورہ تین گروہوں کے علاوہ ایک اور گروہ ہے۔ نہج البلاغہ کے بعض مفسّروں نے احتمال دیا ہے کہ تسبیح کرنے والے وہی پہلے تینوں گروہ ہیں۔ اور بعض روایات سے اس کلام کی تائید کی جاسکتی ہے۔ جیسا کہ روایت میں ہے کہ پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے پوچھا گیا کہ فرشتوں کی نماز کیسے ہوتی ہے؟ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے جواب نہیں دیا، اتنے میں جبرئیل امینؑ نازل ہوئے اور آپؐ سے فرمانے لگے:

"أَنَّ اَهْلَ السَّمَاءِ الدُّنْیَا سُجُوْدٌ اِلٰی یَوْمِ الْقِیَامَةِ یَقُوْلُوْنَ سُبْحَانَ ذِی الْمُلْكِ وَ الْمَلَكُوْتِ وَ

---

[۱] ''صافون'' جمع ہے ''صاف'' کی (بروزنِ حاد) اس کا مادّہ ''صف'' ہے، اور مساوات کا معنیٰ دیتا ہے، اس کو اس کے اصلی مادّے ''صفصف'' سے لیا گیا ہے جو صاف زمین کے معنیٰ میں آتا ہے۔

[۲] سورۂ ملک، آیت ۱۹

[۳] نہج البلاغہ، خطبہ ۱۹۳

https://downloadshiabooks.com/

اَهْلُ السَّمَاءِ الثَّانِيَةِ رُكُوعٌ إِلَى يَوْمِ الْقِيَامَةِ يَقُولُونَ سُبْحَانَ ذِي الْعِزَّةِ وَ الْجَبَرُوتِ وَ اَهْلُ السَّمَاءِ الثَّالِثَةِ قِيَامٌ إِلَى يَوْمِ الْقِيَامَةِ يَقُولُونَ سُبْحَانَ الْحَيِّ الَّذِي لَا يَمُوتُ"[۱]

''پہلے آسمان کے فرشتے قیامت تک سجدہ ریز رہیں اور ان کا ورد یہ ہے اور کہتے ہیں'' پاک ہے جو صاحبِ ملک وملکوت ہے'' اور دوسرے آسمان کے فرشتے قیامت تک رکوع میں ہیں اور کہتے ہیں۔'' پاک ہے جو صاحبِ عزت وجبروت ہے'' اور تیسرے آسمان کے فرشتے قیامت تک حالت قیام میں ہیں اور کہتے ہیں۔'' پاک ہے جو زندہ ہے اور اُسے موت نہیں۔''

کیا اس مقام پر سجدہ، رکوع اور قیام سے مراد وہی سجدہ و قیام و رکوع ہے جو ہم انجام دیتے ہیں یا فرشتوں کے خضوع اور عبادت کی طرف اشارہ ہے، جو ان کے مقام و مرتبہ کے حساب سے ہے۔ اگر اُن کے لیے جسم لطیف مانیں اور کہیں کہ ان کے ہاتھ، پاؤں اور شکل ہے، تو پہلا معنی زیادہ مناسب ہے اور اگر اُن کا جسم نہ مانیں یا ان کے لیے جسم ہمارے جسم کی طرح نہ مانا جائے، تب دوسرا معنی زیادہ مناسب ہے۔

بہر حال اُن کا کام اللہ کی عبادات و تسبیح و تقدیس کرنا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ ان فرشتوں کا وجود اللہ کی عظمت کا مظہر ہے دوسرے لفظوں میں ان کی خلقت کا فلسفہ یہ ہے کہ انسان اپنی عبادتوں پر مغرور نہ ہو اور اگر وہ عبادت کا محتاج ہوتا (نعوذ باللہ) تو عالم بالا کے فرشتے جو ہر جگہ عبادت میں مشغول ہیں، اُس کی عبادت کے لیے کافی تھے، لہٰذا زمین پر بسنے والے بندگان خدا یہ خیال نہ کریں کہ ان کی عبادت کرنے یا نہ کرنے سے خدا کی بزرگی و کبریائی پر کوئی فرق پڑتا ہے، کیوں کہ اگر ان سب کو کافر قرار دے دیا جائے، تب بھی خدا کی کبریائی پر کوئی حرف نہیں آتا۔ چنانچہ ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

"اِنْ تَكْفُرُوْا فَاِنَّ اللّٰهَ غَنِيٌّ عَنْكُمْ "[۲]

''اگر تم نے اس کا انکار کروگے تو (یاد رکھو کہ) خدا تم سے بالکل بے پروا ہے۔''

ان فرشتوں کے اوصاف کے بارے میں مزید فرمایا:

"لَا يَغْشَاهُمْ نَوْمُ الْعُيُوْنِ وَلَا سَهْوُ الْعُقُوْلِ وَلَا فَتْرَةُ الْاَبْدَانِ وَلَا غَفْلَةُ النِّسْيَانِ"

''نہ آنکھوں کی نیند انہیں چھپا سکتی ہے، نہ عقل کی خطا انہیں گرفتار کرسکتی ہے نہ بدن کی سستی اور نہ نسیان کی غفلت ان پر عارض ہوسکتی ہے۔''

---

[۱] بحارالانوار، جلد ۵۹، صفحہ ۱۹۸

[۲] سورۂ زمر، آیت ۷

https://downloadshiabooks.com/

اس کے برعکس انسان کی عبادتوں کا یہ سلسلہ جب تکرار ہوتا ہے؛ تو وہ آہستہ آہستہ ان کیفیات کا شکار ہو جاتا ہے؛ نیند کا خمار اسے گھیر لیتا ہے؛ بدن سست ہو جاتا ہے؛ سہو و نسیان عارض ہو جاتا ہے، لیکن عبادت کرنے والے ملائکہ ان حالات سے دوچار نہیں ہوتے۔ یہ فرشتے اس طرح عبادات و مناجات اور تسبیح میں غرق ہیں کہ ہرگز نیند یا کوئی کمزوری انہیں چھو نہیں سکتی۔ دوسرے معنوں میں یہ کیفیات امور شرعی و الٰہی کی انجام دہی میں کوتاہی کا سرچشمہ بنتی ہیں جو کہ ان فرشتوں کے اندر نہیں ہیں۔ گویا کبھی اس کوتاہی کا منشا تھکاوٹ ہے، کبھی آنکھوں میں نیند، کبھی سستی اور کبھی غفلت و نسیان۔ اور یہ سب ان فرشتوں میں نہیں ہے۔ یعنی عبادت پروردگار کرتے ہوئے ان کے بدن میں کبھی سستی پیدا نہیں ہوتی۔

اس کے بعد فرشتوں کے دوسرے گروہ کا ذکر فرمایا:

"وَمِنْهُمْ أُمَنَاءُ عَلَىٰ وَحْيِهِ وَأَلْسِنَةٌ إِلَىٰ رُسُلِهِ وَمُخْتَلِفُونَ بِقَضَائِهِ وَأَمْرِهِ"

''ان میں سے بعض امین وحی اور پیغمبروں سے گفتگو کرنے والے ہیں اور حکم خدا کو پہنچاتے ہیں''۔

درحقیقت یہ فرشتے پروردگار اور اس کے پیغمبروں کے درمیان واسطہ اور وحی الٰہی کے ترجمان ہیں، اس بات سے معلوم ہوتی ہے کہ صرف جبرئیل علیہ السلام ہی سفیر وحی نہیں ہیں، بلکہ وہ اللہ کے سفیروں کے رئیس و سردار ہیں۔ قرآن مجید کی آیات میں فرشتوں کے اس گروہ کی طرف اشارہ ملتا ہے:

"قُلْ نَزَّلَهُ رُوحُ الْقُدُسِ مِنْ رَبِّكَ بِالْحَقِّ"[1]

''کہو کہ اس قرآن کو روح القدس نے اپنے پروردگار کی طرف سے حق کے ساتھ نازل کیا ہے۔''

ایک دوسری جگہ فرمایا:

"قُلْ مَنْ كَانَ عَدُوًّا لِجِبْرِيلَ فَإِنَّهُ نَزَّلَهُ عَلَىٰ قَلْبِكَ بِإِذْنِ اللَّهِ"[2]

''کہو کہ جو بھی جبرائیلؑ کا دشمن ہے (وہ درحقیقت خدا کا دشمن ہے کیوں کہ) اس نے اللہ کے حکم سے قرآن کو تمہارے دل پر نازل کیا ہے۔''

کبھی حاملان وحی کی طرف اشارہ ہوتا ہے:

"يُنَزِّلُ الْمَلَائِكَةَ بِالرُّوحِ مِنْ أَمْرِهِ عَلَىٰ مَنْ يَشَاءُ مِنْ عِبَادِهِ"[3]

---

[1] سورۂ نحل: آیت ۱۰۲

[2] سورۂ بقرہ: آیت ۹۷

[3] ۳۔ سورۂ نحل: آیت ۲

https://downloadshiabooks.com/

''وہی اپنے حکم سے اپنے بندوں میں سے جس کے پاس چاہتا ہے وحی دے کر فرشتوں کو بھیجتا ہے۔''

روایات اور نہج البلاغہ کے بعض خطبوں میں بھی اس معنی کی طرف اشارہ ہوا ہے، متوجہ رہیں کہ اس مقام پر قضا اور امرِ الٰہی سے مراد فرمان و دستورِ الٰہی و شریعت ہے، فرمانِ تکوینی مراد نہیں، جس کا بعض مفسرین نہج البلاغہ نے احتمال دیا ہے، کیوں کہ یہ بات سابق الذکر جملوں، جہاں فرشتوں کو وحی الٰہی کا امین ٹھہرایا گیا ہے سے مناسبت نہیں رکھتی اور مولاؑ کے کلام میں ''مُخْتَلِفُوْنَ'' جو مادّۂ اختلاف سے ہے، کا مطلب رفت و آمد ہے۔ اس کے بعد فرشتوں کے تیسرے گروہ کی طرف اشارہ ہوتا ہے:

''وَمِنْهُمُ الْحَفَظَةُ لِعِبَادِهِ وَالسَّدَنَةُ لِاَبْوَابِ جِنَانِهِ'' [۱]

''ان میں سے بعض بندگانِ خدا کے محافظ اور بہشت کے دربان ہیں۔''

''حَفَظَةُ'' جمع حافظ، نگہبان کے معنی میں آیا ہے، یہاں دو معنی لیے جاسکتے ہیں، ایک یہ کہ بندوں کے محافظ اور ان کے اعمال کے نگران کہ جو اعمال کو لکھتے ہیں جیسا کہ سورۂ طارق میں اشاد ہوتا ہے:

''اِنْ كُلُّ نَفْسٍ لَّمَّا عَلَيْهَا حَافِظٌ'' [۲]

''ہر نفس کے اوپر ایک نگہبان مقرر ہے۔''

اور سورۂ انفطار میں ارشاد ہے:

وَاِنَّ عَلَيْكُمْ لَحٰفِظِيْنَ كِرَامًا كَاتِبِيْنَ'' [۳]

''تمہارے اوپر نگہبان مقرر ہیں کہ جو تمہارے اعمال کو مسلسل لکھتے ہیں۔''

دوسرے وہ نگہبان ہیں جو بندگانِ خدا کو آفات و بلیات اور مختلف حادثاتِ دنیاوی سے محفوظ رکھتے ہیں، اگر یہ نہ ہوتے تو بربادی ہمیشہ اُنہیں گھیرے رہتی۔ اس لیے سورۂ رعد میں ارشاد ہے:

''لَهٗ مُعَقِّبٰتٌ مِّنْ بَيْنِ يَدَيْهِ وَمِنْ خَلْفِهٖ يَحْفَظُوْنَهٗ مِنْ اَمْرِ اللّٰهِ'' [۴]

''انسان کے لیے کچھ نگہبان مقرر ہیں جو کہ ان کے آگے پیچھے اللہ کے حکم سے حفاظت کرتے ہیں۔''

لیکن پہلا معنی اپنے سابقہ معنوں کے ساتھ جو وحی اور شرعی تکالیف کے ساتھ تعلق رکھتا ہے اور اس کے بعد کا جملہ جو

---

[۱] سدنۃ، سادن کی جمع ہے خدمت گزار اور دربان کے معنی میں ہے۔

[۲] سورۂ طارق، آیت ۴

[۳] سورۂ انفطار، آیات ۱۰، ۱۱

[۴] سورۂ رعد، آیت ۱۱

https://downloadshiabooks.com/

بہشت اور اعمال کی جزا کی طرف اشارہ ہے، زیادہ مناسبت رکھتا ہے اور بہر حال دونوں معنی عبادت کے مفہوم سے دور نہیں ہیں۔ سَدَنَۃٌ، سَادِنٌ کی جمع ہے، جس کے معنی دربان کے ہیں اور جِنَانٌ بروزن کتاب، جنت یعنی بہشت، کی جمع ہے۔ اس تعبیر سے معلوم ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے کئی بہشتیں بنائی ہیں۔

نہج البلاغہ کے بعض شارحین نے آٹھ جنتوں کا تذکرہ کیا ہے، جن کے نام قرآن مجید میں آئے ہیں:

"جَنَّۃُ النَّعِیْمِ وَ جَنَّۃُ الْفِرْدَوْسِ وَ جَنَّۃُ الْخُلْدِ وَ جَنَّۃُ الْمَأْوٰی وَ جَنَّۃُ عَدْنٍ وَ دَارُ السَّلَامِ وَ دَارُ الْقَرَارِ وَ جَنَّۃٌ عَرْضُھَا السَّمٰوَاتُ وَ الْاَرْضُ"[1]

اعمال ثبت کرنے والے فرشتوں کا کیا فائدہ؟

ان کا فائدہ یہ ہے کہ انسان اپنی ذمّے داری کا احساس کرے اور اپنے اعمال و کردار میں ہوشیار رہے، کیونکہ ان کا ہدف تربیت انسان اور اسے برے اعمال و انحرافات سے روکنا ہے۔ فرشتوں کے چوتھے گروہ، جو کہ حاملانِ عرشِ الٰہی کہلاتے ہیں، کی طرف اشارہ فرماتے ہیں:

"وَمِنْھُمُ الثَّابِتَۃُ فِی الْاَرَضِیْنَ السُّفْلٰی اَقْدَامُھُمْ وَ الْمَارِقَۃُ مِنَ السَّمَاءِ الْعُلْیَا اَعْنَاقُھُمْ وَ الْخَارِجَۃُ مِنَ الْاَقْطَارِ اَرْکَانُھُمْ وَ الْمُنَاسِبَۃُ لِقَوَائِمِ الْعَرْشِ اَکْتَافُھُمْ"

''ان کے پاؤں زمین پر ہیں، ان کی گردنیں آسمان بالا میں ہیں، ان کے جسم کے اعضا و جوارح اس کرّۂ ارض سے باہر ہیں اور ان کے کندھے عرشِ خدا کو قائم رکھنے کے لیے ہیں۔''

ان اوصاف کے بیان میں مزید ارشاد ہوتا ہے:

"نَاکِسَۃٌ[2] دُوْنَہٗ اَبْصَارُھُمْ مُتَلَفِّعُوْنَ[3] تَحْتَہٗ بِاَجْنِحَتِھِمْ مَضْرُوْبَۃٌ بَیْنَھُمْ وَ بَیْنَ مَنْ دُوْنَھُمْ حُجُبُ الْعِزَّۃِ وَ اَسْتَارُ الْقُدْرَۃِ"

ان کی آنکھیں عرش کے آگے جھکی ہوئی ہیں اور انھوں نے اپنے بالوں میں خود کو چھپایا ہوا ہے۔ انھیں اور ان سے

[1] شرح نہج البلاغہ ابن میثم، جلد اوّل ص ۱۵۸، اور شرح نہج البلاغہ مرحوم میرزا حبیب اللہ خوئی، ج ۲، ص ۲۶۔

[2] "ناکسہ" "نکس" کے مادّے سے ہے (بروزن عکس) یعنی زیر و زبر کرنا۔ اسی لیے پیروں سے پیدا ہونے والے بچے کو ''منکوس'' اور تیر بنانے کے لیے تراشی جانے والی لکڑی کے نوک دار سرے کو "نُکس" کہتے ہیں۔

[3] متلفعون "لفع" کے مادّہ سے ہے (بروزن نفع) جو کسی چیز کو شامل ہونے اور لپیٹنے کو کہتے ہیں، اسی لیے عورت جب اپنی چادر لپیٹتی ہے تو اسے "تلفعت المرئۃ" کہا جاتا ہے۔

https://downloadshiabooks.com/

مرتبے میں کم فرشتوں پر عزت اور قدرت کے حجاب پڑے ہوئے ہیں۔ مزید تعریف کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

"لَا يَتَوَهَّمُونَ رَبَّهُمْ بِالتَّصْوِيرِ، وَلَا يُجْرُونَ عَلَيْهِ صِفَاتِ الْمَصْنُوعِينَ وَلَا يَحُدُّونَهُ بِالْأَمَاكِنِ وَلَا يُشِيرُونَ إِلَيْهِ بِالنَّظَائِرِ"۔[1]

ان کی معرفت اتنی ہے کہ وہ اپنے پروردگار کی تصویر ہرگز نہیں بناتے، مخلوق کی صفات کو اس پر جاری نہیں کرتے، اسے کسی مکان میں محدود نہیں کرتے اور نہ مثالوں سے اشارہ کرتے ہیں، بلکہ ان کی روحانی قدرت، فوق العادہ ہے کہ کوئی بھی اس مقام کو حاصل نہیں کرسکتا ہے۔ بس اسی دلیل کی بنیاد پر حاملانِ عرشِ الٰہی کے اہل قرار پائے ہیں۔ درحقیقت انہوں نے توحید کے بلند ترین مقام کو سمجھا ہے جو کہ تمام بندگانِ الٰہی بالخصوص بلند پایہ انسانوں کے لیے شائستہ ہے۔ وہ کسی بھی طریقے سے خدا کی شبیہ اور مثال کے قائل نہیں ہیں اور نہ ہی اُس کی ذات وصفات میں محدودیت کے قائل ہیں، اسے اپنے وہم وگمان سے بالاتر سمجھتے ہیں۔ چونکہ جو بھی انسان یا فرشتے کے خیال میں آئے، وہ مخلوق ہے اور خدا مخلوق سے بالاتر ہے۔ عرش کیا ہے؟ حاملانِ عرشِ الٰہی کون ہیں؟ اور اس جملے میں ذکر شدہ عظمت سے کیا مراد ہے، وغیرہ، آئندہ نکات سے متعلق موضوع میں بیان ہوں گے۔

نکات

فرشتے کیسے ہوتے ہیں؟

قرآن مجید کی آیات میں فرشتوں کے اوصاف، خصوصیات، اعمال وافعال اور ان کی مختلف ذمے داریوں کے بارے میں بہت کچھ آیا ہے، اگر ان کو جمع کیا جائے تو ایک مستقل کتاب بن سکتی ہے۔ روایات میں بھی فرشتوں کے اوصاف، اعمال اور مقامات کے بارے میں بہت کچھ ملتا ہے، لیکن کہیں بھی ان کی ماہیت سے متعلق نہیں ملتا۔ چنانچہ اس دلیل کی بنا پر ان کی ماہیت کے متعلق دانشوروں میں بحث ومباحثہ پایا جاتا ہے۔ علمِ کلام کے اکثر علماء نے انہیں لطیف جسم سے تعبیر کیا۔ بعض تعبیرات میں فرشتوں کے لیے کلمۂ نور استعمال ہوا ہے، جس سے ان کے اصل مادّے کی تشکیل مراد لی گئی ہے:

"اَلْمَلَكُ جِسْمٌ نُورِيٌّ"۔[2]

---

[1] "نظائر"، "نظیر" کی جمع ہے، یعنی مثال۔

[2] بحارالانوار ج ۵٦، ص ۲۰۲ (بابِ حقیقتِ ملائکہ)۔

https://downloadshiabooks.com/

''فرشتہ ایک نوری جسم ہے۔''

علامہ مجلسیؒ نے یوں بیان کیا ہے کہ امامیہ اور دیگر مسلمان، سوائے چند فلسفیوں کے، فرشتوں کے بارے میں اجسامِ لطیفہ نوری کے قائل ہیں اور یہ کہ وہ مختلف شکلوں میں آسکتے ہیں البتہ نبی اور اوصیا کو وہ دکھائی دیتے تھے۔ ایک دوسری تعبیر کے مطابق فرشتے جسمِ نوری جبکہ جنّ جسمِ ناری اور انسان کا جسم عناصرِ اربعہ سے مرکب ہے۔ ایک دوسرا قول جو تمام فلاسفہ سے مربوط ہے کہ ملائکہ جسم وجسمانیات سے خالی ہوتے ہیں۔ مرحوم خوئی شارح نہج البلاغہ (منہاج البراعہ) نے چھے اقوال اس سلسلے میں نقل کیے ہیں، جن کے قائل افراد بہت کم ہیں۔ بے شک قرآن نے فرشتوں کے (اعمال واوصاف، خصوصیات) وجود کو بیان کیا ہے۔ جو غیبی امور میں سے ہیں اور ان صفات، خصوصیات کو بغیر دلیلِ نقلی کے ثابت نہیں کیا جاسکتا ہے۔ قرآن مجید نے ان کے لیے یہ خصوصیات بیان کی ہیں:

۱۔ یہ کہ عاقل اور باشعور ہیں۔

۲۔ مکمل طور پر خدا کے فرماں بردار ہیں اور کسی صورت میں خدا کی معصیت نہیں کرتے ہیں۔

۳۔ اللہ کے حکم سے اہم ذمّے داری اور مختلف قسم کے اعمال انجام دیتے ہیں۔ (یعنی بعض حاملانِ عرش ہیں، بعض مدبراتِ امر ہیں۔ بعض روح قبض کرتے ہیں، بعض بشر کے اعمال کا حساب کتاب کرتے ہیں، بعض انسانوں کو خطرات سے بچاتے ہیں، بعض جنگوں میں مومنین کی امداد کرتے ہیں، بعض سرکشوں اور تجاوز کرنے والوں پر عذاب نازل کرتے ہیں، بعض وحی الٰہی کو انبیاؑ تک پہنچاتے ہیں)

۴۔ تمام فرشتے ایک سطح کے نہیں بلکہ ان کے مختلف درجات اور حیثیتیں ہیں۔

۵۔ تسبیح اور حمدِ الٰہی مسلسل انجام دیتے ہیں۔

۶۔ کبھی انسان کی صورت میں یا دوسری صورتوں میں انبیا علیہم السلام اور کچھ منتخب انسانوں پر ظاہر ہوتے ہیں، جیسے حضرت مریمؑ پر فرشتہ ظاہر ہوا، اور دیگر اوصاف جن کی تفصیل اس مختصر بحث میں نہیں سما سکتی۔ اگرچہ یہ بحث کہ فرشتے جسم رکھتے ہیں یا نہیں، اس کا کوئی اثر نہیں ہے، کیوں کہ آیات وروایات کا ظاہر تفسیر کے بغیر سمجھ میں آتا ہے کہ یہ فرشتے مادّی نہیں ہوتے اور جسم وجسمانیت سے مبرّا بھی نہیں ہیں، کیوں کہ جسم وجسمانیت کے لیے زمان ومکان لازمی جز ہے جو آیات وروایات میں ان کے لیے بیان ہوا ہے۔

خطبۂ اشباح میں اور مولا علی علیہ السلام کے دیگر کلام میں بعض تعبیرات کی تائید ہوتی ہے اور قرآن کے مطابق ملائکہؑ پر اجمالی طور پر اعتقاد رکھنا اسلامی تعلیمات کا حصّہ ہے۔ چنانچہ ارشاد ہے:

https://downloadshiabooks.com/

"آمَنَ الرَّسُوْلُ بِمَآ اُنْزِلَ اِلَیْہِ مِنْ رَّبِّہٖ وَ الْمُؤْمِنُوْنَ کُلٌّ آمَنَ بِاللّٰہِ وَ مَلٰٓئِکَتِہٖ وَ کُتُبِہٖ وَ رُسُلِہٖ"
"(ہمارے) پیغمبر (محمدؐ) جو کچھ ان پر ان کے پروردگار کی طرف سے نازل کیا گیا ہے اس پر ایمان لائے اور ان کے (ساتھ) مومنین بھی۔ (سب کے) سب خدا اور اس کے فرشتوں اور اس کی کتابوں اور اس کے رسولوں پر ایمان لائے۔"[1]

یہ نکتہ قابل غور ہے کہ بعض نااہل افراد نے غیبی عوالم کے منکرین کو شاد کرنے کے لیے یہ نظریہ اپنایا ہے کہ فرشتے بھی انسانی خواص رکھتے ہیں، جبکہ آیات قرآنی کے اجمالی مطالعے کی رُو سے اس طرزِ فکر کی مکمل طور پر نفی ہوتی ہے، کیوں کہ فرشتوں کے لیے عقل و شعور، ایمان و اخلاص اور عصمت ثابت ہے۔

اقسام و اوصافِ ملائکہؑ

ملائکہؑ کی مختلف اقسام ہیں، جن کے متعلق آیات و روایات میں اشارہ ہوا ہے۔ البتہ چار مشہور گروہ وہ ہیں، جن کے بارے میں مولا علیؑ کے خطبے میں ذکر آیا ہے (پروردگار کی عبادت کرنے والے، لوگوں کے اعمال کا حساب رکھنے والے، اللہ کی طرف سے پیغمبروں کی طرف بھیجے جانے والے اور حاملانِ عرش) جبکہ ہم کہہ چکے کہ آیات قرآنی میں دیگر اقسام کی طرف بھی اشارہ ہوا ہے، ان میں سے سرکش و ظالموں پر مقرر فرشتے، مومنین کی امداد کرنے والے، انسانوں کی روح قبض کرنے والے اور مدبّراتِ امر یعنی اس دنیا کے معاملات چلانے والے اگرچہ ان سب کو مدبرات امر کے زمرے میں شامل کیا جا سکتا ہے۔ سنتِ الٰہی یہ ہے کہ وہ اپنی قدرت و عظمت اور مقاصد کی نشاندہی، اور اس دنیا کے امور ان فرشتوں کے وسیلے سے انجام دیتا ہے جو اس کے حکم کے سامنے بغیر کسی سستی، کمزوری، سہو و نسیان اور کجی کے سرِ تسلیم خم ہیں۔ ان گروہوں میں سے ہر ایک منظم اور معیّن نظام کے تحت گامزن ہے۔

چنانچہ کبھی کبھی انسان فرشتوں کے مختلف گروہوں کی سرگرمی اور منظم امور سے اپنے اندر احساس کمتری محسوس کرتا ہے کہ اس وسیع دنیا اور حق کے لیے کام کرنے والے خدائی لشکر اور اللہ کے فرماں بردار بندوں میں یہ کیا حیثیت رکھتا ہے اور کس کام کا ہے؟ اگر اطاعت و عبادت وہ ہے جو فرشتے انجام دیتے ہیں تو میری عبادت کیا ہے؟ اگر قدرت و توانائی وہ ہے جو ان کے پاس ہے تو میری قدرت کی کیا حیثیت ہے؟ مختصر یہ کہ فرشتوں کے وجود کا فلسفہ یہ ہے کہ انسان اس کائنات اور اس کے خالق کی عظمت اور اپنی بے بسی اور حرکات سے آشنا ہوتا ہے۔

---

[1] سورۂ بقرہ، آیت ۲۸۵

https://downloadshiabooks.com/

عرش وحاملانِ عرشِ الٰہی

قرآن مجید کی آیات میں تقریباً بیس مرتبہ عرشِ الٰہی کی طرف اشارہ ہوا ہے اور روایات میں اس سے متعلق بہت زیادہ ابحاث موجود ہیں۔ بعض روایات کے مطابق عرشِ خدا کی عظمت اس قدر ہے کہ انسان کے تصور میں نہیں آسکتی۔ زمینوں، آسمانوں اور ان کے اندر جو کچھ ہے وہ سب عرش کی عظمت کے مقابلے میں ایک وسیع صحرا میں حلقۂ انگشتری کے برابر ہے۔ اسی طرح بعض روایات میں آیا ہے کہ سب سے زیادہ بڑے فرشتے اگر قیامت تک تیز رفتاری سے پرواز کریں، تب بھی عرش تک نہیں پہنچ سکتے۔ نیز وارد ہوا ہے کہ خدا نے عرش کے لیے ہزار زبان اور تمام مخلوقات کی صورتیں خواہ وہ دریا میں ہوں یا صحرا میں پیدا کی ہیں۔

یہ بھی آیا ہے کہ جب عرش کو پیدا کیا گیا تو خدا نے فرشتوں کو دستور دیا کہ اسے اٹھائیں تو وہ اسے نہ اٹھا سکے، پھر زیادہ سے زیادہ فرشتے پیدا کیے مگر وہ بھی نہیں اٹھا سکے، تب خدا نے اپنی قدرت سے اس کی حفاظت کی۔ اور جب فرشتے اس کے اٹھانے پر مامور ہوئے تو ان سے اللہ نے کہا، اسے اٹھاؤ، انہوں نے کہا کہ جو کام سارے فرشتے مل کر نہ کر سکے ہم کیسے کر سکتے ہیں! تو اس مقام پر دستور دیا گیا کہ خدا کے نام اور ذکر "لَاحَوْلَ وَلَا قُوَّةَ اِلَّا بِاللهِ الْعَلِیِّ الْعَظِیْمِ" اور محمد وآلِ محمد علیہم السلام پر درود سے مدد لو، انہوں نے ایسا ہی کیا تو عرشِ الٰہی کو اٹھانا آسان ہوا۔ [1]

یہ تمام اشارات وکنایات خدا کے عرش کی عظمت کو بیان کرتے ہیں، مگر یہ عرش کیا ہے، دانشمندوں میں زیرِ بحث ہے۔ اور وضاحت کے ساتھ اس بحث میں داخل ہونا ہمیں اصل مقصد سے دور کر دے گا، اس لیے یہاں مختصر گفتگو پر اکتفا کرتے ہیں۔ بادشاہوں اور سلاطین کے دو قسم کے تخت ہوتے ہیں، ایک چھوٹا تخت ہوتا ہے جو عام دنوں میں بیٹھنے کے لیے اور حکومت کے معاملات کو چلانے کے لیے ہوتا ہے اور دوسرا اونچا ہوتا ہے جو خاص دنوں اور عمومی ملاقاتوں اور بڑے پروگراموں کے لیے ہوتا ہے۔ عربی ادب میں پہلے تخت کو کرسی اور دوسرے کو عرش کہتے ہیں۔ اکثر اوقات عرش سے قدرت اور مکمل تسلط مراد لی جاتی ہے، جیسا کہ معلوم ہے کہ عرش کے پائے نہیں ہیں، مگر معروف جملہ ہے "ثُلَّ عَرْشُهُ" یعنی عرش گر پڑا تو اس سے مراد قدرت وطاقت کا ہاتھ سے کھو بیٹھنا ہے اور یہ کنایہ ہے۔

خداوند عالم، کائنات کا حاکم ہے، یعنی اس کائنات کا حاکم مطلق ہے، جس کے پاس تخت کی ان دو قسموں یعنی

[1] منہاج البراعۃ فی شرح نہج البلاغہ ج ۲، ص ۳۲ تا ۳۵۔ مرحوم علامہ مجلسیؒ نے عرش وکرسی سے متعلق روایات کو بحار الانوار کی جلد ۵۵ میں تفصیل کے ساتھ ذکر فرمایا ہے اور درج بالا روایات کا اسی جلد کے صفحہ ۵، ۱۷ اور ۵۵ پر ذکر ہے۔

https://downloadshiabooks.com/

حکومت اور شہنشاہیت (کنائی مفہوم کے طور پر عرش و کرسی) ہے۔عرش اور حکومتِ الٰہی کا تخت کیا ہے؟اس سلسلے میں جو تفسیریں بیان ہوئی ہیں ،من جملہ یہ کہ عالم مادّہ کا مجموعہ، آسمان و زمین، ستارے، نظامِ شمسی یہ سب گویا کرسی اور چھوٹا تخت ہیں،اس لیے قرآن فرماتا ہے:

"وَسِعَ كُرْسِيُّهُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ"

"اُس کی کرسی زمین وآسمانوں کوگھیرے ہوئے ہے۔"

عرش کا مطلب وہ عالم جو مادّے سے ماورا ہے، جو صرف عالمِ بالا پر محیط ہے، بلکہ یوں کہا جائے کہ پوری مادّی دنیا اس کے مقابل بہت چھوٹی اور کم اہمیت ہے۔البتہ حاملان عرش کا ہرگز یہ مطلب نہیں کہ وہ ایسے فرشتے ہیں جوخوفناک ہیکل اور لمبا چوڑا جسم رکھتے ہیں اور ایک بلند تخت کو اپنے کاندھوں پر اٹھائے ہوئے ہیں اور خداوند عالم اس کے اوپر (نعوذ باللہ) ٹیک لگائے بیٹھا ہے کیوں کہ یہ بیان ہو چکا کہ یہ مقامِ کنایہ ہے اور قرائن عقلی سے ثابت ہے کہ اللہ جسم وجسمانیت سے مبرّا ہے۔

اس بنا پر حاملانِ عرش، بلند و بالا مقام کے حامل فرشتے ہیں اور ان کی مانند کوئی نہیں اور وہ طبیعت سے بالاتر اس کائنات کے امور کو چلاتے ہیں اور اس کے فرمان کا ہر جگہ نفاذ کرتے ہیں اور آپ نے دیکھا کہ مولائے کائنات کی عبارت میں ان کی عظمت و بزرگی اس طرح بیان ہوئی ہے کہ ان کی گردنیں آسمانوں میں، ان کے پاؤں زمین کے نچلے طبقات میں ان کے اعضاء و جوارح اس دنیا سے باہر ہیں اور ان کے کاندھے عرشِ عظیم سے ملے ہوئے ہیں۔یہ سب ایسی تعبیرات و کنایات ہیں کہ ان کی قدرت کو اس عالم کے امور چلانے کے لیے واضح کرتے ہیں۔

یہ بات درست ہے کہ ہم الفاظ کو ان کے حقیقی معانی پر منطبق کریں، مگر ایسی جگہ جہاں محکم عقلی قرائن موجود ہوں، کنائی معنی استعمال کرنے کے سوا چارہ نہیں ہے، جیسے:

"يَدُ اللّٰهِ فَوْقَ اَيْدِيْهِمْ"

"خدا کی قدرت ان پر حاکم ہے۔"

"اَلَّذِيْنَ يَحْمِلُوْنَ الْعَرْشَ وَمَنْ حَوْلَهٗ يُسَبِّحُوْنَ بِحَمْدِ رَبِّهِمْ وَ يُؤْمِنُوْنَ بِهٖ وَ يَسْتَغْفِرُوْنَ لِلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا"[1]

"جو (فرشتے) عرش کو اٹھائے ہوئے ہیں اور جو اس کے گرداگرد (تعینات) ہیں (سب) اپنے پروردگار کی تعریف کے ساتھ تسبیح کرتے ہیں اور اس پر ایمان رکھتے ہیں اور مومنوں کے لیے بخشش کی دعائیں مانگا کرتے ہیں۔"

---

[1] سورۂ غافر: آیت ۷

https://downloadshiabooks.com/

فرشتوں کا معصوم ہونا

فرشتوں کی خصوصیات زیادہ ہیں ۔ان میں کچھ کا اُوپر کی عبارتوں میں (مثلاً کچھ کا کام صرف عبادت کرنا ہے وغیرہ) تذکرہ ہو چکا ہے ۔نہ آنکھوں کی نیند ستاتی ہے نہ تسبیحِ خداوندی سے تھکتے ہیں نہ سہو ونسیان ان پر طاری ہوتا ہے ۔اسی طرح قرآن مجید میں وضاحت ہے کہ یہ گناہ ومعصیت سے آلودہ نہیں ہوتے:

"بَلْ عِبَادٌ مُّكْرَمُوْنَ لَا يَسْبِقُوْنَهٗ بِالْقَوْلِ وَهُمْ بِاَمْرِهٖ يَعْمَلُوْنَ" [۱]

بلکہ (وہ فرشتے خدا کے) معزز بندے ہیں ،وہ گفتگو میں اس سے سبقت نہیں کر سکتے اور وہ اسی کے حکم پر چلتے ہیں ۔"

جبکہ عذاب پر مقرر فرشتوں کے متعلق ارشاد ہے:

"لَا يَعْصُوْنَ اللّٰهَ مَاۤ اَمَرَهُمْ" [۲]

"اُس کے فرمان کی کبھی مخالفت نہیں کرتے ۔"

بعض تصور کرتے ہیں کہ اس مقام پر معصوم ہونے یا نہ ہونے کا مفہوم نہیں نکلتا ،جبکہ یہ کہنا صحیح نہیں ہے، کیوں کہ یہ بات درست ہے کہ گناہ کے انگیزے مثلاً شہوت اور غضب ان میں نہیں ہے، مگر یہ بات نہیں بھولنی چاہیے کہ یہ فاعل مختار ہیں اور مخالفت پر قدرت رکھتے ہیں، یہاں تک کہ آیات سے معلوم ہوتا ہے:

"وَهُمْ مِّنْ خَشْيَتِهٖ مُشْفِقُوْنَ" [۳]

"وہ اللہ کے عذاب سے ڈرتے ہیں ۔"

ان تمام تعبیرات سے معلوم ہوتا ہے کہ معصیت پر قدرت رکھتے ہوئے معصوم وگناہ سے پاک ہیں ۔یہاں پر یہ بات بھی روشن ہو جاتی ہے کہ روایات میں آیا ہے کہ فرشتوں کی کوتاہیوں اور اس کی وجہ سے اللہ کی طرف سے انھیں تنبیہہ کی جاتی ہے ۔یہ وہی ترک اولیٰ ہے، جس کا ذکر انبیاءؑ کے باب میں بھی آیا ہے جو ہرگز گناہ نہیں ہے (بلکہ ممکن ہے دو مستحب کام ایک خوب اور دوسرا خوب تر ہو)

---

[۱] سورۂ انبیاءؑ، آیات ۲۶، ۲۷

[۲] سورۂ تحریم، آیت ۶

[۳] سورۂ انبیاءؑ، آیت ۲۸

https://downloadshiabooks.com/

حاملانِ عرش کا مقامِ معرفت

وہ تعبیرات جو اوپر کی عبارت کی ذیل میں ذکر ہوئی ہیں، ان سے اچھی طرح معلوم ہوتا ہے کہ اگر حاملانِ عرش الٰہی اس عظیم کام پر مامور کیے گئے ہیں، تو یہ ان کی قدرت وطاقت کی وجہ سے نہیں ہے بلکہ ان کی خدا کے بارے میں معرفت کی وجہ سے ہے، یہ توحید کا اقرار ہر قسم کے شرک سے دوری کا نتیجہ ہے کہ اس عظیم ذمّے داری کے لائق قرار پائے ہیں۔ یہ بات درحقیقت تمام بندگانِ خدا اور خصوصی طور پر بنی نوع انسانیت کے لیے درسِ عبرت ہے۔

نواں حصّہ

ثُمَّ جَمَعَ سُبْحَانَهُ مِنْ حَزْنِ الْأَرْضِ وَ سَهْلِهَا وَ عَذْبِهَا وَ سَبَخِهَا تُرْبَةً سَنَّهَا بِالْمَاءِ حَتَّى خَلَصَتْ وَ لَاطَهَا بِالْبَلَّةِ حَتَّى لَزَبَتْ فَجَبَلَ مِنْهَا صُورَةً ذَاتَ أَحْنَاءٍ وَ وُصُولٍ وَ أَعْضَاءٍ وَ فُصُولٍ أَجْمَدَهَا حَتَّى اسْتَمْسَكَتْ وَ أَصْلَدَهَا حَتَّى صَلْصَلَتْ لِوَقْتٍ مَعْدُودٍ وَ أَمَدٍ [أَجَلٍ] مَعْلُومٍ ثُمَّ نَفَخَ فِيهَا مِنْ رُوحِهِ- [فَتَمَثَّلَتْ] فَمُثِلَتْ إِنْسَاناً ذَا أَذْهَانٍ يُجِيلُهَا وَ فِكَرٍ يَتَصَرَّفُ بِهَا وَ جَوَارِحَ يَخْتَدِمُهَا وَ أَدَوَاتٍ يُقَلِّبُهَا وَ مَعْرِفَةٍ يَفْرُقُ بِهَا بَيْنَ الْحَقِّ وَ الْبَاطِلِ وَ الْأَذْوَاقِ وَ الْمَشَامِّ وَ الْأَلْوَانِ وَ الْأَجْنَاسِ مَعْجُوناً بِطِينَةِ الْأَلْوَانِ الْمُخْتَلِفَةِ- وَ الْأَشْبَاهِ الْمُؤْتَلِفَةِ وَ الْأَضْدَادِ الْمُتَعَادِيَةِ وَ الْأَخْلَاطِ الْمُتَبَايِنَةِ مِنَ الْحَرِّ وَ الْبَرْدِ وَ الْبَلَّةِ وَ الْجُمُودِ-

''اس کے بعد پروردگار نے زمین کے سخت ونرم اور کھارے اور شیریں حصوں سے خاک کو جمع کیا اور اسے پانی سے اس قدر بھگویا کہ بالکل خالص ہوگئی اور پھر تری میں اس قدر گوندھا کہ لیس دار بن گئی اور اس سے ایک ایسی صورت بنائی، جس میں موڑ بھی تھے اور جوڑ بھی، اعضا بھی تھے اور جوڑ بند بھی۔ پھر اسے اس قدر سکھایا کہ مضبوط ہوگئی اور اس قدر سخت کیا کہ کنکھنانے لگی اور یہ صورت حال ایک وقتِ معین اور مدتِ خاص تک برقرار رہی، جس کے بعد اس میں مالک نے اپنی روحِ کمال پھونک دی اور اسے ایسا انسان بنا دیا، جس میں ذہن کی جولانیاں بھی تھیں اور فکر کے تصرّفات بھی۔ کام کرنے والے اعضا و جوارح بھی تھے اور حرکت کرنے والے اوزار و آلات بھی، حق و باطل میں فرق کرنے والی معرفت بھی تھی اور مختلف ذائقوں، خوشبوؤں، رنگ و روغن میں تمیز کرنے کی صلاحیت بھی۔ اسے مختلف قسم کی مٹی سے بنایا گیا، جس میں موافق اجزاء بھی پائے جاتے تھے اور متضاد عناصر بھی اور گرمی، سردی، تری اور خشکی جیسی کیفیات بھی۔''

https://downloadshiabooks.com/

شرح وتفسیر

آدمؑ کی خلقت کا آغاز

خطبے کے گزشتہ عمیق حصوں میں زمین وآسمان کی تخلیق کے بارے میں اشارے ہوئے اور اب اس کائنات کی دوسری مخلوق کے بارے میں ذکر شروع ہوتا ہے، جہاں انسان کی خلقت کے مختلف مراحل کی نشاندہی کی گئی ہے، کیوں کہ انسان کی خلقت، خالقِ کائنات کا بڑا شاہکار ہے۔اس کی زندگی کے مراحل کی طرف یوں ارشاد کیا:

۱۔جسم وروح کے اعتبار سے آدمؑ کی خلقت۔

۲۔فرشتوں کا آدمؑ کے لیے سجدہ اور ابلیس کا انکار۔(اسی خطبے کا دسواں حصہ ملاحظہ فرمائیں)

۳۔حضرت آدمؑ کا بہشت میں رہنا پھر ترکِ اولیٰ، اس کے بعد پشیمان ہوکر توبہ کرنا، بہشت کو چھوڑ کر زمین پر آنا۔(گیارہواں حصہ ملاحظہ فرمائیں)

۴۔اولادِ آدمؑ کا زیادہ ہونا اور خداوند عالم کا روحانی ومعنوی کمالات کے ساتھ اور آسمانی کتب کے ساتھ انسانی معاشرے کی تشکیل اور انسان کی ہدایت اور انسانی معاشرتی نظام کو چلانے کے لیے پیغمبروں کا بھیجنا۔(بارہواں حصہ ملاحظہ فرمائیں)

۵۔اس کے بعد انسانی معاشرے کا کامل سے کامل تر ہونا تاکہ دینی بالیدگی کا مرحلہ انجام تک پہنچے۔اس مقام پر خداوند عالم نے اپنے رسول آنحضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو قرآن مجید کے ساتھ انسانوں کی نجات اور ہدایت کی تعلیم اور انھیں اخلاق عالیہ سے مزین کر کے مبعوث فرمایا، اس مقام پر تعارف قرآن کے بارے میں بہت گہرے اور بیش قدر بیانات موجود ہیں۔(تیرہواں حصہ ملاحظہ فرمائیں)

پہلا مرحلہ: جسم وروح کے اعتبار سے حضرت آدمؑ کی خلقت

حضرت آدمؑ کے جسم کی خلقت کے سلسلے میں ارشاد فرمایا ہے:

https://downloadshiabooks.com/

"ثُمَّ جَمَعَ سُبْحَانَهُ مِنْ حَزْنِ [۱] الْاَرْضِ وَ سَهْلِهَا، وَ عَذْبِهَا [۲] وَ سَبَخِهَا [۳] تُرْبَةً"

''پھر خداوند عالم نے سخت اور نرم زمین اور اسی طرح میٹھی اور شور مٹی کو جمع کیا۔''

حقیقت میں یہ ایک طرف تو انسان کے خاک سے پیدا ہونے کی طرف اشارہ ہے اور دوسری طرف اشارہ یہ ہے کہ زمین کے مختلف حصّوں سے خمیر بنایا گیا تا کہ زندگی کے مختلف اوقات میں اور انسانی معاشرے کی ضرورتوں کے وقت ان قسم قسم کی اور مختلف صلاحیتوں کو بروئے کار لایا جا سکے اور انسان کے مختلف طبقات سے ان کی استعداد اور صلاحیتوں کو مدنظر رکھتے ہوئے مختلف کام لیے جا سکیں۔ پھر دوسرا مادّہ جو پانی اور مٹی سے بنایا گیا ہے، اُس کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا:

"سَنَّهَا [۴] بِالْمَاءِ حَتّٰى خَلَصَتْ"

''اس پر پانی چھڑکا تا کہ خالص گارا بن جائے۔''

"وَ لَاطَهَا [۵] بِالْبَلَّةِ حَتّٰى لَزَبَتْ" [۶]

''اسے گیلا کر دیا، یہاں تک کہ موجودہ صورت میں ظاہر ہو گیا۔''

حقیقت میں پانی کا کردار اس کو مختلف اجزا کے ساتھ ملانا اور ناہموار کو صاف کرنا اور بکھرے ہوئے مختلف اجزا کو جوڑنا تھا، پھر اس مٹی اور گارے سے انسان کی شکل بنانے کی طرف اشارہ فرمایا ہے:

"فَجَبَلَ مِنْهَا صُوْرَةً ذَاتَ اَحْنَاءٍ [۷] وَ وُصُوْلٍ، وَ اَعْضَاءٍ وَ فُصُوْلٍ"

''پھر خدا نے اس سے انسان کی صورت تخلیق کی جس میں جھکنے کی صلاحیت، جوڑ بند اور اعضا و جوارح تھے۔''

حقیقت میں احناء (حنو کی جمع ہے) جسم کے مختلف حصوں کا جھکنے کی طرف اشارہ ہے۔ جیسے جبڑے اور پسلیوں کا جھکنا اور سر کے اوپر کے حصے کو پاؤں کی طرف جھکانا تا کہ جسم کو مختلف کاموں کے لیے تیار کیا جا سکے، کیونکہ اگر جسم ایک ہندسی شکل میں ہو تو ہرگز اس طرح کام نہیں کر سکتا۔ اور "وَ اَعْضَاءٍ وَ فُصُوْلٍ" کے جملے سے جسم کے مختلف اعضا مراد ہیں، جیسے

---

[۱] ''حزن''، ''وزن'' کے وزن پر ہے، غم واندوہ اور روئے زمین کے سخت نقاط کو کہتے ہیں، دکھ اور غم کو "حَزْنِ" یا "حَزَنَ" بھی کہتے ہیں کیوں کہ غم روح بشری سے متعلق ہے۔

[۲] عَذْبِ، جذب کے وزن پر ہے، پاکیزہ، صاف اور میٹھے پانی کو کہتے ہیں۔

[۳] سَبِخَ، مَلِحَ کے وزن پر ہے، شورزدہ زمین کو کہتے ہیں اس کی جمع سباخ ہے۔

[۴] سَنَّ، سَنَ کے مادّے سے، ظن کے وزن پر ہے، جو کسی چیز پر پانی انڈیلنے کو کہتے ہیں، اور کبھی نرم اور صاف چیز کے لیے بھی استعمال ہوتا ہے۔

[۵] لَاطَ، لَوطَ کے مادّے سے، صوت کے وزن پر ہے۔ جو کسی چیز کے دوسری چیز میں ملنے کے معنی میں آتا ہے۔

[۶] لَزَبَتْ، لُزُوب کے مادّے سے، سکوت کے وزن پر ہے جو ثبوت و لزوم کے معنی میں آتا ہے۔

[۷] "اَحنَا" "حِنو" کی جمع ہے ''حرص'' کے وزن پر ہے، جو کجی اور خمیدگی کے معنی میں آتا ہے اور کبھی اطراف اور کنارے کے معنی میں آتا ہے۔

https://downloadshiabooks.com/

جوڑ و بند جو ایک دوسرے اعضاء سے جڑے ہوئے ہیں اور اسی وجہ سے زیادہ کام کیے جا سکتے ہیں۔ انسان کے ہاتھ کو کہنی تک مدنظر رکھیں، اگر یہ سب ایک حصہ ہوتا اور ایک عضو اور ایک ہڈی ہوتی تو یہ بہت کم کام آتا، لیکن ہم جانتے ہیں کہ خداوند عالم نے کچھ ہڈیوں کے ٹکڑے اور کچھ اعضا اور جوڑ درمیان میں پیدا کیے، اسی وجہ سے ہر انگلی بلکہ ہر انگلی کے بند ہاتھ کے پنجے کے علاوہ ہیں اور ہر ایک کا ایک خاص کام ہوتا ہے اور یہ حکمت و عظمت پروردگار کی نشانیوں میں سے ہے۔

پھر، بعد کے مرحلے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

"اَجْمَدَهَا حَتّٰى اسْتَمْسَكَتْ وَ اَصْلَدَهَا [1] حَتّٰى صَلْصَلَتْ" [2]

"پھر اسے اس قدر سکھایا کہ مضبوط ہوگئی اور اس قدر سخت کیا کہ کھنکھنانے لگی۔"

"لِوَقْتٍ مَعْدُوْدٍ، وَ اَجَلٍ مَعْلُوْمٍ [3]

"اسی ترتیب سے جسم کو کامل کیا اور اسی حالت کو ایک وقتِ معین اور معین انجام تک برقرار رکھا۔"

بعض روایات میں حضرت امام محمد باقر علیہ السلام سے نقل ہوا ہے کہ یہ حالت چالیس سال تک رہی، گویا حضرت آدمؑ کا جسم ایک گوشے میں رکھا ہوا تھا اور فرشتے اس کے قریب سے گزرتے ہوئے کہتے تھے کہ کس مقصد کے لیے پیدا کیا گیا ہے؟ [4] بعض محققین نے کہا ہے کہ یہ فاصلۂ زمانی ملائکہؑ کو آزمانے کے لیے یا کاموں میں انسانوں کو جلد بازی سے روکنے کے لیے اور معاملات میں غور و فکر رکھنے کے لیے تھا۔

دوسرا مرحلہ: روح پھونکنے کا مرحلہ

"ثُمَّ نَفَخَ فِيْهَا مِنْ رُوْحِهٖ، فَمَثُلَتْ [5] اِنْسَانًا ذَا اَذْهَانٍ يُجِيْلُهَا [6]"

"پھر اس میں مالک نے اپنی روحِ کمال پھونک دی اور اسے ایسا انسان بنا دیا، جس میں ذہن کی جولانیاں بھی

---

[1] اصلد، صَلُد کے مادّے سے ہے، محکم اور صاف کو کہتے ہیں۔

[2] صلصل، صلصلۃ کے مادّے سے ہے، اور کسی چیز کے خشک ہونے کو کہتے ہیں اور کبھی خشک اور کبھی محکم کو کہتے ہیں۔

[3] لوقتِ معلوم کا لام "الیٰ" کے معنی میں آیا ہے، بعض لوگوں نے احتمال دیا ہے کہ لام علّت کا ہے، اور بعض نے درج بالا عبارت سے مراد یہ لی ہے کہ یہ حالت قیامت تک جاری رہے گی اور اس کے بعد بدن کے تمام پیوند کلّی طور پر گل جائیں گے، لیکن یہ احتمال بہت بعید ہے۔ کیوں کہ خلقتِ انسان کی بات ہو رہی ہے، ابھی نفخ روح کا مرحلہ بیان ہی نہیں ہوا۔

[4] فَبَقِیَ اَرْبَعِیْنَ سَنَةً مُلْقًى تَمُرُّ بِهِ الْمَلَائِكَةُ فَتَقُوْلُ لِاَمْرٍ مَا خُلِقْتَ؟ (منہاج البراعۃ ج ۲، ص ۴۴)

[5] مَثُلَت، مُثُول کے مادّے سے ہے حُصول کے وزن پر۔ کھڑے ہونے اور اٹھنے کو کہتے ہیں۔

[6] یُجِیلُ، اِجالۃ کے مادّے سے ہے، اس کا مصدر بابِ افعال ہے جس کا مادّہ جَول اور جَولان ہے، گھمانے اور ہلانے کو کہتے ہیں۔

https://downloadshiabooks.com/

تھیں۔'' تا کہ انہیں مختلف جہات میں حرکت دے اور ان میں سے ایک کو اپنے کام انجام دینے کے لیے استعمال کرے اور ان کاموں کے لیے اپنے اعضاء کو حکم دے۔

یہ تعبیر ان مختلف ذہنی وعقلی قوتوں کی طرف اشارہ ہے، جن میں سے ہر ایک کے ذریعے انسان اس سے مربوط کام میں استفادہ کرتا ہے اور پھر ان کی مدد سے اپنے منزل کی طرف گامزن رہتا ہے۔ (ان قوتوں سے مراد قوتِ ادراک، قوتِ حافظہ اور قوتِ خیال وغیرہ ہے) توجہ رہے کہ ذہن بھی اصل میں قوت کے معنی میں ہے۔ پھر عقل وفہم و درایت اور تمام عقلی قوتیں مراد لی گئی ہیں۔ مولا علیؑ نے اس عبارت کے ذریعے توجہ دلائی کہ ان میں سے ہر ایک اللہ کی عنایت ہے، مزید فرماتے ہیں: "وَ فِكَرٍ يَتَصَرَّفُ بِهَا"، کہ انسان کے پاس ایسے افکار ہیں کہ جن کو (مختلف موجودات اور گوناگوں کاموں میں) استعمال کرتا ہے۔ کبھی یہ تصور کیا جاتا ہے کہ یہ جملہ عطف تفسیری ہے اور سابقہ جملے کی وضاحت کر رہا ہے، لیکن ظاہر یہ ہے کہ یہ دونوں الگ الگ جملے اور ان میں سے ہر ایک کسی خاص حقیقت کی طرف اشارہ ہے۔

جملہ "ذَا أَذْهَانٍ يُجِيلُهَا"، میں مراحل شناخت، تصور وتصدیق وفہم و درک کی طرف اشارہ ہوتا ہے۔ اور جملہ ''وَ فِكَرٍ يَتَصَرَّفُ بِهَا'' میں ان افکار کی طرف اشارہ ہے کہ جو نفاذ کے مرحلے میں ہوتے ہیں اور ان کے ذریعے انسان مختلف اشیا میں تصرّف کرتا ہے (خیال رہے کہ فکر دراصل ذہنی حرکت اور تصرفات ذھنیہ کو کہا جاتا ہے) بہر حال فکر جمع کی صورت میں ہے، جیسے اذہان صیغہ جمع ہے، تا کہ بتایا جاسکے کہ قوت عقلی اور انسانی افکار کی بہت سی اقسام ہیں، فلاسفہ اور مفکرین نے اس سلسلے میں تاکید کی ہے۔ یاد رہے کہ انسان کی مختلف فکری صلاحیتوں میں اختلاف کی وجہ بھی یہی ہے۔ بہت سارے افراد کسی حصے میں طاقتور اور کسی حصے میں کمزور ہوتے ہیں اور دوسرے افراد اس کے برعکس ہوتے ہیں۔ اس مسئلے میں ایسے عجیب اسرار وحقائق پوشیدہ ہیں کہ انسان ان میں جس قدر غور وفکر کرے، اُس کی معرفت الٰہی میں اضافہ ہوتا جاتا ہے۔ اس کے بعد دو چیزوں کی طرف اشارہ ہے کہ جو انسان کو اپنے مطلوب تک پہنچنے میں مدد کرتی ہیں:

"وَ جَوَارِحَ يَخْتَدِمُهَا[1] وَ أَدَوَاتٍ يُقَلِّبُهَا"

''خدا نے انسان کو اعضا عطا فرمائے کہ جن سے وہ خدمت لیتا ہے، اور اوزار عنایت فرمائے کہ جن سے مقصد حاصل کرنے میں مدد لیتا ہے۔''

حقیقت میں ذہن انسانی چار مرحلوں سے گزر کر اپنے مقصد تک پہنچتا ہے:

پہلا مرحلہ: شناختِ ادراک (تصور وتصدیق) ہے اور اس کے بعد دوسرا مرحلہ: فکر واندیشہ، پھر تیسرا مرحلہ: اعضا

[1] يَخْتَدِمُ، اِخْتِدَام کے مادّے سے ہے، خدمت لینے کو کہتے ہیں۔

https://downloadshiabooks.com/

وجوارح کو حکم کرنا اور چوتھا مرحلہ: اس مقام پر جہاں تنہا اعضا وجوارح کارآمد نہیں ہیں، وہاں مختلف وسیلوں سے مدد لینا جو کہ خداوند عالم نے اس کائنات میں پیدا کیے ہیں؛ ان چار مرحلوں میں سے ہر ایک کی بہت سی اقسام ہیں۔ اہدافِ معین تک پہنچنا، اچھے اور برے درست ونادرست اور مختلف محسوسات کی تشخیص ایک صلاحیت ہے کہ جو درحقیقت پانچواں مرحلہ ہے، جسے قوت تمیز وتشخص کہا جائے گا۔ اسی طرح محسوسات کی دنیا میں مختلف ذائقے، مختلف خوش بو اور مختلف رنگ وجنس ایک دوسرے سے خود کو جدا کرتے ہیں۔ حقیقت میں تشخیص کی قوتِ انسانی عقل کی قوت میں اہم ترین قوت ہے، جو معنوی امور مثلاً حق وباطل کی تمیز اور مادّی امور جیسے رنگ، خوشبو، بدبو اور ذائقوں دونوں کے بارے میں کارگر ہے۔ فرماتے ہیں:

"وَ مَعْرِفَةٍ يَفْرُقُ بِهَا بَيْنَ الْحَقِّ وَ الْبَاطِلِ"

خداوند عالم نے انسان کو حق ومعرفت کی شناخت کے لیے وہ قوت عطا کی ہے، جس کے ذریعے وہ حق وباطل کو ایک دوسرے سے جدا کر دیتا ہے۔

اور اسی طرح، طرح طرح کے ذائقوں، رنگوں اور خوشبوؤں کو ایک دوسرے سے علیحدہ کرنے اور ان کے درمیان فرق کرنے کی صلاحیت رکھتا ہے۔

یہ بات بھی قابل غور اور توجہ ہے کہ بحث وگفتگو کو اس مقام میں امور مادی کے چار حصوں، چکھنا، سونگھنا، دیکھنا اور اجناس۔ جیسا کہ اس مقام میں انواع واقسام کے موجودات جیسے زمین سے اگنے والے تمام پودے، حیوانات اور پرندگان وغیرہ، کی طرف اشارہ ہے۔ پر مرکوز رکھا گیا ہے۔ یہاں سننے اور قابل عمل چیزوں کی طرف اس لیے اشارہ نہیں کیا گیا ہے کہ مذکورہ بالا تین محسوسات بطور مثال ذکر ہوئے ہیں، کیوں کہ مذکورہ تینوں محسوسات کو سننے کے بعد یہ انسان (کا ذہن خود بخود) باقی دونوں محسوسات کی طرف منتقل ہو جاتا ہے۔

آیا تمیز وتشخیص کی یہ طاقت وقدرت ایک مستقل طاقت ہے یا ذہن وفکر کے مفہوم میں ہی شامل ہے جن کا سابق الذکر سطور میں تذکرہ آیا ہے؟

حضرت علی علیہ السلام کی عبارات سے یہ بات عیاں ہو جاتی ہے کہ آپؑ نے اسے مستقل طور پر ایک قدرت شمار کیا ہے۔

"وَ الْاَذْوَاقِ وَ الْمَشَامِّ وَ الْاَلْوَانِ وَ الْاَجْنَاسِ"[1]

---

[1] جیسا کہ اوپر کہا گیا "وَ الْاَذْوَاقِ وَ الْمَشَامِّ وَ الْاَلْوَانِ وَ الْاَجْنَاسِ" یہ جملہ حق وباطل پر عطف ہے۔ لیکن بعض علماء نے اسے معرفت پر عطف کیا ہے، لیکن امامؑ کے کلمات پر غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ پہلا عطف زیادہ مناسب تر ہے۔ پس پہلے والے عطف کے مطابق تمیز کرنے کی قدرت سب کے لیے (یکساں) شامل ہوگی، اور دوسرے عطف کے مطابق تمیز کی قدرت بھی خدا کی نعمتوں میں سے ایک نعمت شمار کی جائے گی، جیسے سونگھنے کی طاقت، یا دیکھنے کی طاقت، یا چکھنے کی طاقت۔

https://downloadshiabooks.com/

تمیز و تشخیص کی یہ قوت عقل و شعور انسانی کی بہترین طاقت ہے۔ یہ طاقت رنگ، بو اور ذائقہ جیسے مادی اور امور محسوسہ کو بھی شامل ہے اور حق و باطل جیسے معنوی امور کو بھی شامل ہے۔

اس کے بعد مولا علیؑ اس گفتگو کو آگے بڑھاتے ہوئے انسان کی اہم ترین خصوصیات میں سے ایک خصوصیت جو زندگی کے بہت سے مراحل کا سرچشمہ ہے، کی طرف اشارہ کرتے ہیں:

"مَعْجُوْناً[1] بِطِيْنَةِ الْاَلْوَانِ الْمُخْتَلِفَةِ"

''اور اسے (انسان کو) طرح طرح کے رنگوں اور مختلف صلاحیتوں کا مرکب اور پیکر قرار دیا۔''

یہ تعبیر ممکن ہے انسان کی مختلف رنگوں اور ذاتوں کے اختلاف کی طرف اشارہ ہو، یا پھر جسم کے اجزا کے رنگوں کے اختلاف کی طرف کہ بعض مکمل سفید ہیں (جیسے آنکھوں اور ہڈیوں کی سفیدی) اور بعض مکمل کالے (جیسے بال) اور بعض کے دوسرے رنگ ہوتے ہیں اور ان رنگوں کا ایک دوسرے کے ساتھ ملنا انسان کو ایک خاص خوبصورتی بخشتا ہے۔ ممکن ہے معنی اس سے بھی وسیع تر ہوں اور انسان کی تمام صلاحیتوں اور غریزوں کو شامل ہو۔

اس کے بعد ایک جیسی چیزوں مانند رگیں، اعصاب اور ہڈیاں جو ایک دوسرے سے زیادہ شمائل و مشابہت رکھتی ہیں اور طرح طرح کی ذمہ داریاں نبھاتی ہیں، کے بارے میں امام علی علیہ السلام مزید فرمایا:

"وَالْاَشْبَاهِ الْمُؤْتَلِفَةِ"

''اس میں موافق اجزاء بھی پائے جاتے ہیں۔''

"وَالْاَضْدَادِ الْمُتَعَادِيَةِ، وَالْاَخْلَاطِ الْمُتَبَايِنَةِ مِنَ الْحَرِّ وَالْبَرْدِ وَالْبَلَّةِ وَالْجُمُوْدِ"

''اور اسی طرح سردی، گرمی، رطوبت اور خشکی جیسی مختلف قوتوں اور اشیا کا مرکب قرار دیا گیا۔''

مذکورہ جملے میں چار طبیعتوں کی طرف اشارہ ہے۔ قدیم طب کے مطابق انسانی طبیعت چار قسم کی ہوتی ہے، اگرچہ موجودہ ڈاکٹر اس تقسیم بندی کو ان الفاظ میں قبول نہیں کرتے اور دیگر تعبیرات اپنی گفتگو میں لے آتے ہیں، مثلاً سردی اور گرمی کے بجائے بلڈ پریشر کے زیادہ ہونے اور کم ہونے کا ذکر کرتے ہیں اور رطوبت و خشکی کو بدن میں پانی کی زیادتی یا کمی سے تعبیر کرتے ہیں۔ بہر حال مذکورہ تعبیرات جو کلامِ امامؑ میں ذکر ہوئیں، یہ سب اس اہم خصوصیت کو بیان کرتی ہیں کہ خداوند متعال نے انسانی جسم کو مختلف مواد اور کئی کیفیات و گوناگون صلاحیتوں اور غریزوں کا مرکب قرار دیا ہے اور یہی اختلاف انسانی فکر اور اس کی راہ و روِش کے اختلاف کا سرچشمہ ہے اور یہی سبب ہے کہ وہ معاشرتی منصوبوں اور انسانوں کی ضروریات کو پورا

[1] معجوناً ترکیب کے اعتبار سے ''انساناً'' جیسا ہے، جو عبارت میں اس سے پہلے مذکور ہے۔

https://downloadshiabooks.com/

کرنے کی صلاحیت رکھتا ہے تاکہ ہر چیز اپنی اپنی جگہ کام کرے اور اس طرح ایک مکمل معاشرہ تیار ہو جائے۔ بہر حال یہ ایک مستقل داستان ہے یہاں اس کی تشریح کی گنجائش نہیں ہے۔

اہم نکات

حضرت آدمؑ کی تخلیق

اس خطبے کی تعبیرات سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت آدمؑ کی خلقت مستقل بنیادوں پر تھی، یعنی دیگر پست وحقیر جانداروں کی طرح تکامل کے مراحل سے نہیں گزرا ہے، بلکہ موجودہ شکل وصورت میں ہی اس کی تخلیق ہوئی تھی، اسی بات کی طرف قرآن بھی رہنمائی کرتا ہے۔ البتہ قرآن اور نہج البلاغہ بایولوجی کی کتابیں نہیں بلکہ انسان سازی کی کتابیں ہونے کے ناطے ان میں عقائد واخلاق کے مسائل بیان ہوئے ہیں۔ البتہ موقع ومحل کی مناسبت سے علومِ طبیعی بایولوجی وغیرہ کی جانب بھی اشارہ ضرور پایا جاتا ہے۔

لیکن آج کل کے علمی حلقوں میں جو نظریہ رائج ہے، وہ یہ ہے کہ تمام جاندار اس شکل میں نہیں تھے، جس میں آج ہیں بلکہ گہرے سمندروں کی تہہ میں مختلف شکلوں میں پیدا ہوئے اور پھر درجہ بدرجہ تکامل کی جانب گامزن ہوئے، گویا ایک نوع سے دوسری نوع کی شکل اختیار کرتے رہے اور پھر دریا سے چوپایوں اور پرندوں کی شکل میں زمین اور ہوا میں منتقل ہو گئے۔ اور انسان کو بھی اس قاعدے سے مستثنیٰ نہیں مانتے۔ اس نظریے کے حامل افراد چند گروہوں میں تقسیم ہیں، لامارک اور ڈارون اور پھر جدید ڈارونسیزم اور موٹیسزم کے حامی افراد، ان میں سے ہر ایک اپنے اپنے نظریات کے لیے دلائل پیش کرتے ہیں۔ اور ان گروہوں کے مقابل انواع ناقابلِ تغیر ہیں، کے قائل افراد کہتے ہیں کہ آغاز سے آج تک ہر جانور اپنی اپنی اسی شکل میں تھا، انھوں نے تحول اور تکامل کے مفروضے کے رد میں دلائل دیئے ہیں، جنھیں کسی اور مناسب موقع پر بیان کیا جائے گا، یہاں مختصراً چند دیگر موضوعات کی طرف اشارہ ضروری ہے:

۱۔ قرآن مجید اور نہج البلاغہ کے خطبوں میں انواع کے ثبوت اور عدم تغیّر کا بیان کم از کم انسان کے بارے میں پایا جاتا ہے مگر دوسرے موجودات کے بارے میں تصریح نہیں ہے، اگرچہ تحول اور تکامل والے نظریئے کے لوگ انسان کو بھی اس قبیلے میں شامل کرنے پر اصرار کرتے ہیں اور قرآن اور نہج البلاغہ کی ایسی تعبیر اور تفسیر کرتے ہیں جو تحول وتکامل کے اثبات میں ہو، بلکہ یہ لوگ ان آیاتِ قرآنی اور خطبات کو اپنی تائید اور اپنے موضوع پر دلیل کے طور پر پیش کرتے ہیں۔

https://downloadshiabooks.com/

۲۔ تکامل یا انواع کا نا قابل تغیر ہونا کوئی ایسا مسئلہ نہیں کہ جسے حسی و عقلی تجربات و دلائل کے ذریعے ثابت کر سکیں، کیونکہ ان کی جڑیں لاکھوں سال پرانی ہیں۔ اس بنا پر اس کے حامی و مخالف جو کچھ کہتے ہیں، مفروضوں سے زیادہ نہیں ہیں۔ ان کے دلائل، ظن اور گمان پر مشتمل ہیں، لہٰذا ان کے کہنے سے انسان کی تخلیق سے مربوط آیات اور نہج البلاغہ کی عبارات کی نفی نہیں ہو سکتی ہے۔ دوسرے الفاظ میں سائنسی علوم مذہبی عقائد کو کوئی نقصان نہیں پہنچا سکتے، کیونکہ سائنسی مفروضے ہر روز تبدیل ہوتے رہتے ہیں لہٰذا ہو سکتا ہے کل نئی تحقیق ہو اور انواع کے عدم تغیر کو تسلیم کر لیا جائے، مثلاً حال ہی میں دنیا کی چند مطبوعات میں یہ خبر آئی ہے کہ بیس لاکھ سال پرانی، انسان کی کھوپڑیاں دریافت ہوئیں ہیں، جن میں اور آج کے انسان کی کھوپڑی میں کوئی فرق نہیں اس خبر نے تکامل کے مفروضے کو ہلا کر رکھ دیا ہے کیوں کہ وہ تو قائل ہیں کہ چند لاکھ سال پہلے والا انسان ہرگز آج کے انسان جیسا نہیں تھا۔ اس بات سے یہ بھی اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ ان مفروضوں میں کتنا دم ہے، جو ایک دریافت سے ہل کر رہ جاتے ہیں۔ البتہ طبیعی بات، سائنسی علوم میں اس کے علاوہ کوئی اور راستہ نہیں، کیوں کہ یہ ایک نظریئے پر بنیاد رکھ کر چلتے ہیں یہاں تک کہ دوسرا نظریہ آ کر اسے ختم کرے۔

خلاصہ یہ کہ سائنسی مفروضے اور قطعی اور یقینی مسائل دو علیحدہ مسئلے ہیں۔ سائنس میں قطعی اور یقینی بات مثلاً پانی کا آکسیجن اور ہائیڈروجن سے مل کر بننا، ایک محسوس عمل ہے اور لیبارٹری ٹیسٹ سے یہ بات ثابت بھی ہے، جبکہ کتنی باتیں ہیں جو گمان اور ظن پر مبنی ہیں۔ [۱]

جسم اور روح کی ترکیب

قرآن مجید کی آیات کے عین مطابق خطبے کے اس حصے میں جو کچھ آیا ہے، اس سے بخوبی معلوم ہوتا ہے کہ انسان دو اصل سے خلق ہوا ہے ایک کی بنیاد، مادّہ یعنی پانی اور گیلی مٹی (دنیا کا انتہائی سادہ مواد) ہے اور دوسرے بنیاد، الٰہی روح جیسی والا مقام سے ترکیب ہوا ہے اور یہی بات انسان کے اندرونی تضادات کا راز بھی ہے۔ اس کی کچھ خواہشیں اس کو مادّی دنیا کی طرف کھینچتی ہیں اور کچھ خواہشیں اس کو فرشتوں کی طرف لے جاتی ہیں۔ یہ ایک طرف حیوانی صفات اور دوسری طرف ملکوتی اور روحانی سرشت رکھتا ہے۔ نیز اسی وجہ سے انسان کی ترقی وتنزل کا دائرہ وسیع ہو جاتا ہے۔ ترقی کی استعداد اور قابلیت اتنی ہے کہ ''اعلیٰ علیّین'' تک پہنچ سکتا ہے اور تنزل و انحطاط ایسا کہ ''اسفل السافلین'' میں شمار ہو سکتا ہے اور یہی وہ خصوصیت ہے جو

---

[۱] مزید تفصیلات کے لیے کتاب ''ڈاروِن و آخرین فرضیہ ھای تکامل'' کی طرف رجوع کریں جبکہ اس کا مختصر بیان تفسیر نمونہ، ج ۱۱۔ سورۂ حجر آیات ۲۶، ۴۴۔ میں بھی ملاحظہ کیا جا سکتا ہے۔ اور جب تک ان ظنی مفروضوں کے خلاف ٹھوس اور یقینی قرائن نہ ملیں سائنس میں ان مفروضوں کو قبول کیا جاتا ہے، لیکن ان کی قاطعیت کا کسی کو ادعا نہیں ہوتا ہے۔

https://downloadshiabooks.com/

پاک و پاکیزہ انسانوں کی اہمیت کو بڑھا دیتی ہے کہ انھوں نے انحطاط اور تنزل کی ایسی وادیوں سے خود کو بچا کر سرخرو ہوئے اور یہ خصوصیت انسان کے علاوہ کسی اور مخلوق میں نہیں پائی جاتی ہے، بقول شاعر:

جان گشودہ سوی بالا بالھا　　تن زدہ اندر زمین چنگالھا

ہے عروجِ فطرتِ انساں، شرف انسان کا　　یہ بدن ایک روز بن جائے گا کیڑوں کی غذا

میل جان اندر ترقی و شرف　　میل تن در کسب اسباب وعلف

روح کی ہے آرزو اعلیٰ مراتب کا حصول　　مال وزر دنیا میں حاصل ہو، بدن ہے چاہتا

روح کی طاقت عالمِ بالا کی طرف انسان کو لے جاتی ہے، مگر مادّی طاقت زمینی بن کر رہ جاتی ہے اور روح ہمیشہ ترقی و شرف پاتی ہے، مگر مادّی طاقت کا ہم وغم دنیوی مفادات ہیں۔

روح و مادّہ دو الٰہی طاقتیں　　مختلف ہوتی ہیں ان کی عادتیں

ایک طاقت ہے ترقی کی طرف　　اور اک لاتی ہے پستی کی طرف

اور یہی وہ چیز تھی جس کو فرشتے حضرت آدم علیہ السلام کے خلق ہونے سے پہلے سمجھنے سے قاصر تھے۔ شاید حضرت آدمؑ کی خلقت کو ایک تکراری کام سمجھ رہے تھے اور اپنی تسبیح و تقدیس کو مدنظر رکھتے ہوئے اس تخلیق کو تحصیلِ حاصل (یعنی حاصل شدہ چیز کا حصول) جان رہے تھے اور یہ نکتہ بھی قابل توجہ ہے کہ حضرت آدمؑ کی ملکوتی روح کو خدا نے اپنی طرف نسبت دی ہے:

"وَنَفَخْتُ فِيهِ مِنْ رُّوحِي"

"میں نے اپنی روح اس میں پھونک دی۔"[۱]

ظاہر ہے کہ نہ خدا کے لیے جسم ہے، نہ اُس کے لیے روح، لہٰذا جب خدا کسی چیز کی نسبت اپنی طرف دیدے، مثلاً خدا کا گھر، خدا کا مہینہ، تو اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ وہ چیز انتہائی عظمت والی ہے۔ اس وجہ سے کہ انسان کی روح میں خدا کی صفات کی نشانیاں مثل علم، قدرت اور خلاقیت پائی جاتی ہیں، درحقیقت خدا نے سب سے بہترین اور سب سے نیک ترین روح کو حضرت آدمؑ میں پھونکا ہے۔ اسی وجہ سے روح پھونکنے کے بعد خدا نے اپنے آپ کو احسن الخالقین (بہترین خلق کرنے والا) کہا۔

"ثُمَّ اَنْشَاْنَاهُ خَلْقًا آخَرَ فَتَبَارَكَ اللّٰهُ اَحْسَنُ الْخَالِقِينَ"[۲]

---

[۱] سورہ حجر، آیت ۲۹

[۲] سورہ مؤمنون، آیت ۱۴

https://downloadshiabooks.com/

''پھر ہم نے اس (آدمؑ) کو ایک نئی خلقت عطا کی پس بابرکت ہے وہ اللہ جو سب سے بہترین خالق ہے۔''

کتنی دکھ کی بات ہے کہ انسان اتنی قابلیت وصلاحیت وکمال کی قدرت رکھتے ہوئے اس مقام وعہدے پر پہنچ سکنے کے باوجود جو اس کے انتظار میں ہے اور اس کے سائے میں تمام مخلوقات پر برتری حاصل کرسکتا ہے اور کرامتِ انسانی ''وَلَقَدْ كَرَّمْنَا'' کے عظیم تاج کا سزاوار ہونے کے باوجود اس طرح گر جائے کہ ''أُولَٰئِكَ كَالْأَنْعَامِ بَلْ هُمْ أَضَلُّ''[۱] کہ ''وہ حیوان کی طرح ہیں، بلکہ ان سے بھی زیادہ گمراہ ہیں۔''

انسان، کائنات کا عجوبہ

انسان حقیقت میں اس کائنات کی عجیب ترین مخلوق ہے، جس کے کچھ اسرار کی طرف امامؑ کے اس کلام میں اشارہ کیا گیا ہے۔ مثلاً مختلف اعضا کا رکھنا اور مختلف قسم کی طاقتیں اور متضاد عناصر سے ترکیب ہونا اور مختلف عوامل سے تشکیل پانا جو بہت پیچیدہ اور معجون کی شکل میں ظہور پذیر ہوا ہے۔ عالم کی تمام چیزیں اس کے وجود میں جمع ہیں۔ درحقیقت یہ انسان پوری کائنات کا چھوٹا سا ماڈل ونمونہ ہے اور یہ چھوٹا عالم بڑے عالم سے برابری کرتا ہے:

أَتَزْعَمُ أَنَّكَ جِرْمٌ صَغِيرٌ وَفِيكَ انْطَوَى الْعَالَمُ الْأَكْبَرُ[۲]

نہ گماں کر کہ تُو ہے ریزۂ خاک حاملِ عالمِ کبیر ہے تُو

انسان کی یہ خصوصیت ہمیں ایک طرف اس کی خلقت کی اہمیت سے آگاہ کرتی ہے تو دوسری طرف خلق کرنے والے کی عظمت وقدرت کی نشاندہی کرتی ہے:

زیبندۂ ستائش آن آفریدگاریست کارد چنین دل آویز، نقشی زماء وطینی

لائقِ حمد ہے وہ خالقِ اکبر جس نے آب وگل سے کیے تخلیق حسین نقش ونگار

امامؑ کا مقصد اس کلام سے ان ہی دو نکتوں کی طرف اشارہ کرنا ہے، ایک خالق کی عظمت دوسرے مخلوق کی بلندی۔

دسواں حصّہ

[وَ الْمَسَاءَةِ وَ السُّرُورِ] وَ اسْتَأْدَى اللهُ سُبْحَانَهُ الْمَلَائِكَةَ وَدِيعَتَهُ لَدَيْهِمْ وَ عَهْدَ وَصِيَّتِهِ إِلَيْهِمْ فِي الْإِذْعَانِ بِالسُّجُودِ لَهُ وَ الْخُنُوعِ لِتَكْرِمَتِهِ فَقَالَ سُبْحَانَهُ [لَهُمْ] اسْجُدُوا لِآدَمَ فَسَجَدُوا إِلَّا

[۱] سورۂ اعراف، آیت ۱۷۹

[۲] تُو گمان کرتا ہے کہ ایک چھوٹا سا جسم ہے جبکہ تیرے اندر ایک بڑا عالم سمایا ہوا ہے۔ دیوان امیرالمومنینؑ کی طرف رجوع کرنا ہے۔

https://downloadshiabooks.com/

إِبْلِيسَ- [وَ قَبِيلَهُ اعْتَرَتْهُمُ] اعْتَرَتْهُ الْحَمِيَّةُ وَ غَلَبَتْ [عَلَيْهِمُ] عَلَيْهِ الشِّقْوَةُ وَ [تَعَزَّزُوا] تَعَزَّزَ بِخِلْقَةِ النَّارِ وَ [اسْتَوْهَنُوا] اسْتَوْهَنَ خَلْقَ الصَّلْصَالِ فَأَعْطَاهُ اللهُ النَّظِرَةَ اسْتِحْقَاقاً لِلسُّخْطَةِ وَ اسْتِتْمَاماً لِلْبَلِيَّةِ وَ إِنْجَازاً لِلْعِدَةِ فَقَالَ إِنَّكَ مِنَ الْمُنْظَرِينَ إِلَى يَوْمِ الْوَقْتِ الْمَعْلُومِ

پھر پروردگار نے ملائکہؑ کو حکم دیا کہ وہ اس کی امانت واپس کریں اور اس کی عہد لی گئی وصیت پر عمل کریں، یعنی اس مخلوق کے سامنے سر جھکا دیں اور اس کی کرامت کا اقرار کرلیں۔ چنانچہ اس نے صاف صاف اعلان کر دیا کہ آدمؑ کو سجدہ کرو اور سب نے سجدہ بھی کرلیا سوائے ابلیس کے کہ اسے تعصب نے گھیر لیا اور بدبختی غالب آ گئی اور اس نے آگ کی خلقت کو عزت کا سبب اور خاک کی خلقت کو ذلت کی وجہ قرار دے دیا۔ مگر پروردگار نے اسے غضب کے مکمل استحقاق، آزمائش کی تکمیل اور اپنے وعدے کو پورا کرنے کے لیے یہ کہہ کر مہلت دے دی کہ ”تجھے وقتِ معلوم کے روز تک مہلت دی جا رہی ہے۔“

شرح و تفسیر

ابلیس کی گمراہی کا آغاز

اس خطبے کے پہلے حصے میں حضرت آدمؑ کی خلقت کے بارے میں جو کچھ بیان ہوا اسی کا تسلسل ہے اور اس سے مربوط ایک اور موضوع کو یہاں امامؑ نے بیان فرمایا ہے جو کئی جہات اور زاویوں سے سبق آموز اور عبرت کا باعث ہے۔ پہلے آپؑ فرماتے ہیں کہ:

” وَ اسْتَأْدَى اللهُ سُبْحَانَهُ الْمَلاَئِكَةَ وَدِيعَتَهُ لَدَيْهِمْ وَعَهْدَ وَ صِيَّتِهِ إِلَيْهِمْ فِي الْإِذْعَانِ بِالسُّجُودِ لَهُ وَ الْخُنُوعِ [1] لِتَكْرِمَتِهِ فَقَالَ سُبْحَانَهُ اُسْجُدُوا لِآدَمَ فَسَجَدُوا إِلَّا إِبْلِيسَ “

” خدائے سبحان نے ملائکہؑ سے چاہا کہ وہ امانت جو ان کے پاس تھی، اُسے ادا کریں اور اس عہد و پیمان پر جو حضرت آدم علیہ السلام کو سجدہ کرنے اور ان کے سامنے اظہارِ خضوع کے بارے میں خدا کے ساتھ باندھا تھا، اس پر عمل کریں۔ فرمایا: تم سب آدم علیہ السلام کو سجدہ کرو۔ سب نے سجدہ کیا لیکن ابلیس نے سجدہ نہیں کیا۔ اس تعبیر سے معلوم ہوتا ہے خدا نے پہلے فرشتوں سے وعدہ لیا تھا کہ جب آدم علیہ السلام خلق ہوں اور وہ کامل ہو جائیں تو ان کے لیے سجدہ کریں۔ یہ وہی چیز ہے جو قرآن

[1] خنوع، مقائیس اللغۃ کے کہنے کے مطابق اصل میں خضوع اور تواضع کے معنیٰ میں ہے اور دوسروں نے بھی اس جیسے معانی سے تعبیر کیا ہے۔

https://downloadshiabooks.com/

مجید کے سورۂ صٓ میں اس طرح ہے:

"اِذْ قَالَ رَبُّكَ لِلْمَلآئِكَةِ اِنِّيْ خَالِقٌ بَشَرًا مِنْ طِيْنٍ ، فَاِذَا سَوَّيْتُهُ وَ نَفَخْتُ فِيْهِ مِنْ رُّوْحِيْ فَقَعُوْا لَهُ سَاجِدِيْنَ" [۱]

"یاد کرو اُس وقت کو جب تمہارے پروردگار نے فرشتوں سے کہا، میں ایک بشر کو مٹی سے خلق کر رہا ہوں، جب میں اُس کو منظم کر دوں اور اپنی روح اس میں پھونک دوں تو تم سب اس کے سامنے سجدے میں چلے جانا۔" فرشتوں کے ذہن میں یہ مطلب موجود تھا؛ یہاں تک کہ حضرت آدمؑ خلق ہوئے اور ایک کامل انسان کی شکل اختیار کر گئے؛ پھر خدا نے فرشتوں کو اپنا وعدہ یاد دلایا اور اسے نبھانے کا حکم دیا:

"وَاِذْ قُلْنَا لِلْمَلَآئِكَةِ اسْجُدُوْا لِاٰدَمَ فَسَجَدُوْٓا اِلَّآ اِبْلِيْسَ" [۲]

"اور (وہ وقت بھی یاد کریں) جب ہم نے فرشتوں سے فرمایا کہ آدم (علیہ السلام) کو سجدہ کرو تو سب نے سجدہ کیا سوائے ابلیس کے۔"

نہج البلاغہ کے بعض شارحین کے مطابق اس طریقۂ کار کی وجہ شاید یہ ہے کہ اگر تمہید و مقدمہ کے بغیر اچانک ان کو کوئی حکم دیا جاتا تو وہ تعجب کرتے اور شاید اس حکم کی تعمیل میں سستی کرتے ،لیکن خدا نے پہلے ان کو اس کام کے لیے آمادہ کرایا تا کہ یہ باور کرایا جا سکے کہ تمام اہم کام مقدمہ سازی اور ضروری تیاریوں کے ساتھ ہی انجام پاتے ہیں۔

اس کے بعد ابلیس کی مخالفت کی وجہ بیان کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

"اِعْتَرَتْهُ الْحَمِيَّةُ [۳] وَ غَلَبَتْ عَلَيْهِ الشِّقْوَةُ وَ تَعَزَّزَ بِخِلْقَةِ النَّارِ وَاسْتَوْهَنَ خَلْقَ الصَّلْصَالِ"

"غم و غصّہ و تکبّر و خود بینی نے اُسے گھیر لیا اور بدبختی و شقاوت نے اس پر غلبہ کر لیا اور اپنی خلقت، آگ سے ہونے پر افتخار کیا اور آدمؑ کی خلقت سوکھی مٹی سے ہونے کو کمتر سمجھا۔"

درحقیقت ابلیس کی گمراہی کی اصل وجہ ایک لحاظ سے اس کی اندرونی خباثت تھی، جو شقاوت سے تعبیر کی گئی ہے اور دوسری طرف تکبّر اور غرور و تعصب اور انانیت تھی، جو اس کی باطنی خباثت کا نتیجہ تھا، جو اس کی فکر پر غالب آئی اور یہی چیز سبب

---

[۱] سورۂ صٓ، آیات ۷۱، ۷۲

[۲] سورۂ بقرہ، آیت ۳۴

[۳] اَلْحَمِيَّةُ، حَمِيَ کے مادّے سے نہی، کے وزن پر ہے۔ اصل میں وہ گرمائش ہے جو سورج یا آگ کی تپش سے یا دوسرے مواد سے اور یا انسان کی بدن کے اندر سے پیدا ہوتی ہے۔ کبھی قوتِ غضب کو حمیّت سے تعبیر کیا جاتا ہے کیونکہ غضب کی حالت میں انسان شعلہ ور ہوتا ہے اور بخار کی حالت جو بدن کی گرمائش کا بنیادی سبب بھی ہے، حمیٰ کہا جاتا ہے۔

https://downloadshiabooks.com/

ہوئی کہ اُس نے حقیقت سے چشم پوشی کی اور آگ کو مٹی پر فوقیت دی جبکہ مٹی تمام برکتوں اور فوائد کا سرچشمہ ہے۔ گویا ابلیس نے اپنے علم و دانش کو خدا کی حکمت سے بالاتر سمجھا۔

البتہ اس قسم کے فیصلے ایسے افراد سے جو اس قسم کے تکبّر وغرور کے حجابوں میں ہوں، تعجب کی بات نہیں ہے بعض اوقات خود پسندی کا شکار اور تکبّر وغرور کے پردوں میں چھپا انسان کسی پہاڑ کو تنکا اور کسی تنکے کو پہاڑ دیکھتا ہے اور دنیا کے بڑے بڑے دانشور غرور وتکبّر وخودخواہی کے پنجے میں گرفتار ہو کر بڑی بڑی غلطیاں کر بیٹھتے ہیں۔ یہاں پر شقاوت سے مراد وہی باطنی رکاوٹیں اور صفاتِ رذیلہ ہیں جو کہ شیطان میں موجود تھیں۔ یہ صفاتِ رذیلہ اس کی اپنی صفات تھیں جو کہ اس کے گزشتہ اعمال کا نتیجہ تھیں، وہ جبری صفات نہیں تھیں، کیونکہ شقاوت، سعادت کی ضد ہے۔ سعادت کا مطلب اصلاح کی طرف حرکت کرنے کے لیے تمام ضروری چیزوں کا فراہم ہونا ہے اور شقاوت سے مراد اس راستے میں رکاوٹ پیدا ہونا ہے۔

البتہ یہ تمام امور خود انسان کے رفتار و کردار اور دوسری موجودات کی مرضی اور ان کے اختیار سے وقوع پذیر ہوتی ہیں، جبری و زبردستی عوامل کی وجہ سے نہیں ہوتیں۔ بہرصورت ابلیس اس بڑے گناہ کی وجہ سے اپنے مقام سے گر گیا اور خدا کی درگاہ سے باہر نکالا گیا اور اپنے گناہ کی شدت کی وجہ سے خدا کی تمام مخلوقات میں سب سے زیادہ قابلِ نفرت اور راندۂ درگاہِ الٰہی قرار پایا۔ لیکن یہ دوری اور لعنت اس کے خواب غفلت سے جاگنے کا سبب نہیں بنی، وہ ہمیشہ غرور وتکبّر کی سواری پر سوار تھا جیسا کہ یہی طریقۂ کار تعصب اور تکبّر کے حامل لوگوں کا ہوتا ہے بلکہ اس نے ایک اور غیر معقول کام انجام دیا وہ یہ کہ حضرت آدمؑ کی اولادوں کو گمراہ کرنے کے لیے کمربستہ ہو گیا اور اپنی حسد و غصے کی آگ کو ٹھنڈا کرنے کے لیے اس نے اپنے گناہوں کا بوجھ اور بھاری بنا دیا اور خدا سے چاہا کہ اُسے قیامت تک زندہ رکھے، چنانچہ قرآن میں آیا ہے:

"قَالَ رَبِّ فَاَنْظِرْنِیْۤ اِلٰی یَوْمِ یُبْعَثُوْنَ"۔[1]

''شیطان نے کہا: پروردگارا! مجھے لوگوں کے پھر سے اٹھائے جانے تک مہلت دے دے۔''

خدا نے بھی اس کی خواہش کو تین وجوہات کی بنا پر قبول کیا:۔

پہلی وجہ یہ کہ وہ مکمل طور پر خدا کے غضب کا حقدار ہو جائے، دوسری وجہ یہ کہ خدا کے بندوں پر امتحان و آزمائش مکمل ہو جائے، تیسری وجہ یہ کہ خدا کو شیطان سے کیا ہوا وعدہ پورا کرنا تھا۔

"فَاَعْطَاهُ اللهُ النَّظِرَةَ اسْتِحْقَاقًا لِلسُّخْطَةِ وَاسْتِتْمَامًا لِلْبَلِيَّةِ وَاِنْجَازًا لِلْعِدَةِ"

لیکن مہلت دینے کے حوالے سے خدا نے شیطان کو معیّن وقت تک مہلت دی، اس کی خواہش کے مطابق مہلت

[1] سورہ حجر، آیت ۳۶

https://downloadshiabooks.com/

نہیں دی۔اور فرمایا:

فَقَالَ اِنَّكَ مِنَ الْمُنْظَرِيْنَ اِلٰى يَوْمِ الْوَقْتِ الْمَعْلُوْمِ [۱]

''تم وقتِ معلوم تک مہلت پانے والوں میں سے ہو۔''

معیّن وقت سے کیا مراد ہے؟ اس کے بارے میں قرآن و نہج البلاغہ کی تفسیر کرنے والوں میں اختلاف ہے۔ بعض نے کہا ہے، اس سے مراد دنیا کا خاتمہ اور احکام و تکلیف شرعی کے زمانے کا اختتام ہے۔ اس صورت میں ابلیس کی درخواست کا کچھ حصہ منظور ہوا ہے، یعنی ابلیس قیامت تک مہلت مانگتا تھا لیکن خدا نے دنیا کے آخر تک اسے مہلت دی ہے۔ دوسرا احتمال اس بارے میں یہ ہے کہ وقتِ معلوم سے مراد ابلیس کی عمر ہے اور اس کی عمر کب تک ہے، یہ صرف خدا جانتا ہے، کیونکہ اگر ابلیس کو اُس وقت سے باخبر کیا ہوتا تو اس کی نافرمانی و سرکشی زیادہ ہو سکتی تھی۔ بعض افراد نے احتمال دیا ہے کہ وقتِ معلوم سے مراد، روز قیامت ہے کیونکہ سورۂ واقعہ میں قیامت کے بارے میں ہے:

''قُلْ اِنَّ الْاَوَّلِيْنَ وَ الْاٰخِرِيْنَ لَمَجْمُوْعُوْنَ اِلٰى مِيْقَاتِ يَوْمٍ مَّعْلُوْمٍ'' [۲]

لیکن یہ احتمال بہت بعید ہے، کیونکہ اس تفسیر کے مطابق یہ معلوم ہوتا ہے کہ خدا نے ابلیس کی پوری درخواست منظور کر لی ہے، جب کہ آیت کا ظاہر یہ ہے کہ اس کی پوری خواہش کو تسلیم نہیں کیا گیا ہے۔ اس کے علاوہ ابلیس کے بارے میں جو آیت ہے، اس میں یوم وقت المعلوم کا لفظ ہے جبکہ سورۂ واقعہ میں ''یومِ معلوم'' کا ذکر ہے۔ یہ دونوں تعبیریں مختلف ہیں، لہٰذا اس سلسلے میں صحیح تفسیر پہلی یا دوسری تفسیر ہے۔ ایک حدیث میں یہ بھی آیا ہے: ''يَوْمِ الْوَقْتِ الْمَعْلُوْمِ'' سے قیام حضرت امام مہدی علیہ السلام کا زمانہ مراد ہے کہ اس وقت ابلیس کی عمر ختم ہو جائیگی۔ [۳] البتہ ابلیس کا مرنا اس بات کا سبب نہیں ہو گا کہ دنیا سے گناہ کے تمام اسباب ختم ہو جائیں گے اور اطاعت و امتحان کا مسئلہ ہی ختم ہو جائے (ایسا نہیں ہے) کیونکہ گمراہی کی اصل وجہ نفس کی خواہش ہے اور وہ اپنی جگہ باقی ہے، بلکہ شیطان کو گمراہ کرنے والی چیز بھی اس کی خواہش نفسانی ہے۔ [۴]

---

[۱] امامؑ کا یہ فرمان سورۂ حجر، آیت نمبر ۳۷ و ۳۸ کی طرف اشارہ ہے (فَقَالَ اِنَّكَ مِنَ الْمُنْظَرِيْنَ اِلٰى يَوْمِ الْوَقْتِ الْمَعْلُوْمِ)

[۲] سورۂ واقعہ، آیت ۵۰

[۳] تفسیر نور الثقلین جلد ۳ صفحہ ۱۴ حدیث ۴۶

[۴] انسان کے منحرف ہونے میں نفسانی خواہشات اور شیطان کی تاثیر کے بارے میں امام علی بن الحسین علیہ السلام نے مناجات خمسۃ عشر کی دوسری مناجات میں راہنمائی فرمائی ہے۔

https://downloadshiabooks.com/

اہم نکات

مقامِ انسانی کی عظمت

اہم ترین دلیلوں میں سے ایک دلیل جو انسان کے تمام مخلوقات سے اشرف اور بہترین ہونے پر دلالت کرتی ہے، انسان کے لیے ملائکہؑ کے سجدے سے مربوط آیات ہیں۔ چنانچہ قرآن کریم کی کئی سورتوں میں اس بات کی تاکید کی گئی ہے۔[1]

ان آیتوں سے یہ بات ظاہر ہوتی ہے کہ بلا استثنا، تمام ملائکہؑ نے حضرت آدمؑ کے سامنے سجدہ کیا اور خضوع واحترام کا اظہار کیا، جو کہ خود ایک واضح دلیل ہے کہ حضرت آدمؑ فرشتوں پر بھی فضیلت رکھتے ہیں۔ بظاہر قرآن کریم کا اس نکتے پر بار بار تاکید کرنے کا مقصد انسانوں کو اپنے معنوی مقام کی طرف توجہ دلانا ہے۔ یہی بات انسان کے نفس اور اس کی ہدایت میں بڑا کردار ادا کرتی ہے۔

حضرت آدمؑ کے لیے سجدے کی کیفیت کیا تھی؟

حضرت آدمؑ کے لیے سجدہ کرنے کا طریقۂ کار کیا تھا؟ کیا خدا کے علاوہ کسی کے لیے سجدہ کرنا جائز ہے؟ اس سلسلے میں مفسرین کے درمیان اختلاف ہے۔ بعض کا عقیدہ ہے کہ یہ سجدہ دراصل خدا کے لیے تھا، آدمؑ جیسی عجیب مخلوق کی خلقت پر اللہ کے لیے سجدہ تھا، لیکن حضرت آدمؑ کے سامنے اور ان کے مقابل میں سجدہ انجام پایا۔ بعض کا کہنا ہے کہ یہ سجدہ خود حضرت آدمؑ کے لیے تھا لیکن عبادت کا سجدہ نہیں تھا جو کہ صرف خدا کے لیے ہے بلکہ تعظیم اور احترام اور خضوع کا سجدہ تھا۔

کتاب عیون اخبار الرضاؑ میں امام علیؑ ابن موسیٰ الرضاؑ سے نقل ہے:

"كَانَ سُجُودُهُمْ لِلّٰهِ تَعَالٰى عُبُوْدِيَّةً وَلِآدَمَ اِكْرَامًا وَطَاعَةً لِكَوْنِنَا فِيْ صُلْبِهِ"

فرشتوں کا یہ سجدہ خدا کے لیے بہ عنوان پرستش اور حضرت آدمؑ کے احترام و تعظیم کے لیے تھا، کیونکہ ہم (اہلِ

---

[1] سورۂ بقرہ: آیت ۳۴۔ سورۂ اعراف: آیت ۱۱۔ سورۂ اسراء: آیت ۶۱۔ سورۂ کہف: آیت ۵۰، سورۂ طٰہٰ: آیت ۱۱۶

https://downloadshiabooks.com/

بیتؑ) آدمؑ کے صلب میں تھے۔[۱]

اس حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ ملائکہؑ کے سجدے کی دو حیثیتیں تھیں، ایک خدا کی عبادت کی حیثیت، دوسری حضرت آدمؑ کے احترام کی حیثیت، گزشتہ تفسیر کی طرح سورۂ یوسف کی آیت میں بھی آیا ہے:

"وَرَفَعَ اَبَوَيْهِ عَلَى الْعَرْشِ وَخَرُّوْا لَهٗ سُجَّدًا"۔[۲]

حضرت یوسفؑ نے اپنے والدین کو تخت پر بلند کیا اور سب کے سب ان کے سامنے سجدے میں جھک گئے۔ امام علی بن موسیٰ الرضا علیہ السلام سے اسی آیت کے ذیل میں حدیث نقل ہوئی ہے، آپؑ فرماتے ہیں:

"اَمَّا سُجُوْدُ يَعْقُوْبَ وَوُلْدِهٖ فَاِنَّهٗ لَمْ يَكُنْ لِيُوْسُفَ وَاِنَّمَا كَانَ مِنْ يَعْقُوْبَ وَوُلْدِهٖ طَاعَةً لِلّٰهِ وَتَحِيَّةً لِيُوْسُفَ كَمَا كَانَ السُّجُوْدُ مِنَ الْمَلَائِكَةِ لِاٰدَمَ"

''حضرت یعقوبؑ اور ان کے بیٹوں کا حضرت یوسفؑ کے لیے سجدہ عبادت والا سجدہ نہیں تھا، بلکہ ان کا سجدہ خدا کی اطاعت اور اُس کی عبادت اور حضرت یوسفؑ کے احترام کے لیے تھا، جس طرح ملائکہ نے حضرت آدمؑ کے لیے سجدہ کیا تھا۔''

شیطان کی خلقت سے متعلق مختلف سوالات

شیطان کی خلقت اور اس کی سابقہ ''عبادت'' اور خدا کے حکم سے سرکشی و نافرمانی پھر اس کو معیّن وقت تک مہلت دینے کے بارے میں بہت سارے سوالات جنم لیتے ہیں، ان تمام سوالات کا مفصل جواب دینے کے لیے ایک الگ اور تفصیلی مقالات کی ضرورت ہے، لیکن یہاں ہم مختصر طور پر کچھ اور اپنے موضوع سے مربوط چند سوالات تحریر کرنے پر اکتفاء کریں گے۔

سوال۱: کیا ابلیس فرشتوں میں سے تھا؟ اگر جواب مثبت ہے تو؟ ملائکہؑ ہر قسم کے گناہوں سے معصوم ہیں تو پھر اتنے بڑے گناہ کا مرتکب کیسے ہوا؟ اگر جواب نفی میں ہے کہ ابلیس ملائکہؑ میں سے نہیں تھا تو پھر قرآن میں اس کا نام فرشتوں کے ساتھ کیوں آیا ہے؟

جواب: یقینی طور پر وہ فرشتوں میں سے نہیں تھا، کیونکہ قرآن نے واضح طور پر کہا ہے:

"كَانَ مِنَ الْجِنِّ فَفَسَقَ عَنْ اَمْرِ رَبِّهٖ"

[۱] تفسیر نور الثقلین جلد اول، صفحہ ۵۸

[۲] سورۂ یوسف، آیت ۱۰۰

https://downloadshiabooks.com/

''ابلیس جنات میں سے تھا پس اس نے خدا کی نافرمانی کی۔''[۱]

لیکن اس سے پہلے وہ خدا کی عبادت واطاعت میں بڑی کوشش کرتا رہا، اسی وجہ سے اس نے فرشتوں کی صف میں جگہ پائی اور اگر کچھ تعبیروں میں مثلاً خطبہ ۱۹۲، قاصعہ میں شیطان کو ملک کہا گیا ہے تو اُس کی وجہ بھی یہی ہے، اس کے جنّ ہونے پر دوسری دلیل یہ ہے کہ وہ خود کہتا ہے:

"خَلَقْتَنِیْ مِنْ نَّارٍ"

''تو نے مجھے آگ سے خلق کیا۔''

اور یہ معلوم ہے کہ جنات کو آگ سے خلق کیا گیا ہے۔[۲] فرشتوں کو آگ سے نہیں بنایا گیا اور جیسا کہ سورۂ رحمٰن میں آیا ہے:

"وَخَلَقَ الْجَآنَّ مِنْ مَّارِجٍ مِّنْ نَّارٍ"[۳]

''خدا نے جنات کو آگ سے پیدا کیا۔'' اہل بیتؑ کی روایات میں بھی اس بات کی طرف اشارہ ہے۔[۴]

تیسری بات یہ کہ خدا نے قرآن میں ابلیس کی اولاد اور ذرّیت کے بارے میں بیان کیا ہے۔[۵] جبکہ فرشتوں میں اولاد پیدا کرنے کا سلسلہ نہیں ہے۔

سوال۲: یہ کیسے ممکن ہے خدا ابلیس کو انسانوں پر اس طرح مسلط کرے کہ انسان اپنے دفاع کرنے کی قدرت نہ رکھتا ہو؟ اس کے علاوہ کیا ضرورت تھی ایسے گمراہ کرنے والے اور لوگوں کو اغوا کرنے والی مخلوق کو پیدا کرنے کی؟ یا یہ کہ اس کو خلق کرنے کے بعد اس کی عمر کو طویل کر دیا اور مہلت دے دی تا کہ وہ حضرت آدمؑ کی اولاد کو بہکانے میں انتہائی کوشش کرے اور کسی بھی موقع کو ہاتھ سے نہ جانے دے؟

جواب: پہلی بات، یہ کہ شیطان شروع میں ایک پاک وجود کی حیثیت سے پیدا ہوا تھا اور کئی سال تک اس نے اپنی پاکیزگی کو بچایا اور اس کی حفاظت کی، یہاں تک کہ اسی اطاعت کی وجہ سے وہ ملائکہؑ کی صف میں شامل ہوا اور ان کی برابری کرنے لگا۔ لیکن آخر کار خودخواہی (انانیت) اور تکبّر وغرور اور اپنی مرضی سے سُوء استفادہ کی وجہ سے گمراہی کے راستے پر چل

---

[۱] سورۂ کہف: آیت ۵۰

[۲] سورۂ صٓ: آیت ۷۶

[۳] سورۂ رحمٰن، آیت ۱۵

[۴] مجمع البیان، جلد ا، ص ۸۲، سورۂ بقرہ، آیت ۳۴ کے ذیل میں۔

[۵] سورۂ کہف، آیت ۵۰

https://downloadshiabooks.com/

پڑا اور انتہائی نچلے درجے پر جا گرا۔

دوسری بات، یہ کہ اس نکتے کی طرف توجہ دینا ضروری ہے کہ انسانوں میں شیطان کا نفوذ اور اس کا وسوسہ بے خبری یا زبردستی نہیں ہے، بلکہ انسان اپنی مرضی سے اس کے لیے دروازہ کھول دیتا ہے اور اپنی جان کی مملکت میں اس کے داخلے کی اجازت دیتا ہے۔ عام لفظوں میں یہ کہیں گے کہ انسان خود شیطان کے لیے اپنی مملکت میں داخلے کے لیے پاسپورٹ اور ویزا دیتا ہے، تب شیطان اس پر اثر دکھاتا ہے۔ قرآن مجید واضح طور پر کہہ رہا ہے:

"اِنَّ عِبَادِیْ لَیْسَ لَکَ عَلَیْهِمْ سُلْطٰنٌ اِلَّا مَنِ اتَّبَعَکَ مِنَ الْغٰوِیْنَ"[۱]

"تو میرے بندوں پر غالب نہیں ہوگا، مگر گمراہوں پر تیرا غلبہ ہوگا جو تیری پیروی کریں۔"

اور دوسری جگہ ارشاد ہے:

"اِنَّمَا سُلْطٰنُهٗ عَلَی الَّذِیْنَ یَتَوَلَّوْنَهٗ وَالَّذِیْنَ هُمْ بِهٖ مُشْرِكُوْنَ"[۲]

"شیطان کا تسلط صرف ان لوگوں پر ہے جو شیطان کو اپنا سرپرست مان چکے ہیں اور اُس کے حکم کو اللہ کے حکم کے برابر مانتے ہیں۔"

تیسری بات، یہ کہ امیر المومنین حضرت علی علیہ السلام نے مذکورہ جملوں میں نہایت خوبصورت اور لطیف انداز میں اس سوال کا جواب دے دیا، آپؑ فرماتے ہیں خدا نے ابلیس کو مہلت دی تا کہ وہ مکمل طور پر خدا کے غضب کا حقدار ہو جائے اور اس طریقے سے خدا نے چاہا کہ بندوں کا امتحان لیا جائے اور شیطان سے جو وعدہ کیا تھا وہ پورا کیا جائے۔ یعنی خدا نے ایک طرف مہلت دینے کے ساتھ اس کی سزا کو سخت بنا دیا، کیونکہ قرآنی آیات سے استفادہ ہوتا ہے کہ جو لوگ گمراہی کے راستے پر گامزن ہیں، خدا ان کو بار بار ہوشیار کرتا ہے اور اگر یہ تنبیہ اثر کرے اور وہ اپنے گناہوں سے باز آ جائیں تو بہت اچھا ورنہ ان کو ان کی حالت پر چھوڑ دیتا ہے اور پھر بہت زیادہ مہلت دی جاتی ہے، تا کہ ان کے گناہوں کا بوجھ زیادہ بھاری ہو جائے۔[۳]

دوسری طرف شیطان کا موجود ہونا انسانوں کے لیے بڑی آزمائش اور عبادت میں مومنین کی ترقی اور تکامل کا سبب ہے، کیونکہ ایسے طاقتور دشمن کا ہونا باخبر و ہوشیار اور راہ حق پر چلنے والے مومنین کے لیے نہ صرف نقصان دہ نہیں ہے، بلکہ ترقی و تکامل ہے، جو عام طور پر ٹکراؤ اور تضادات کی شکل میں ہوتی ہے، جب انسان ایک طاقتور دشمن کے مقابلے میں آتا ہے تو وہ

---

[۱] سورۂ حجر: آیت ۴۲

[۲] سورۂ نحل: آیت ۱۰۰

[۳] سورۂ آلِ عمران: آیت ۱۷۸

https://downloadshiabooks.com/

اپنی پوری مہارت وطاقت وذہانت کو بروئے کار لاتا ہے، دوسرے الفاظ میں ایسے طاقتور دشمن کا وجود انسان کی قوت مدافعت کو بڑھاتا ہے اور مسلسل جدوجہد کی صلاحیت میں اضافہ ہوتا ہے اور اس کے نتیجے میں ترقی حاصل کر لیتا ہے، لیکن وہ لوگ جو نافرمان اور گناہ گار، دل کے بیمار ہیں، ان کی بدبختی اور گمراہی میں اضافہ ہوتا ہے۔ حقیقت میں وہ لوگ اسی تقدیر اور نتیجے کے حقدار ہیں:

"لِيَجْعَلَ مَا يُلْقِي الشَّيْطَانُ فِتْنَةً لِّلَّذِينَ فِي قُلُوبِهِم مَّرَضٌ وَالْقَاسِيَةِ قُلُوبُهُمْ"

''مقصد یہ تھا کہ شیطان کے وسوسوں کو امتحان قرار دیا جائے ایسے افراد کے لیے جن کے دلوں میں بیماری ہے اور سنگدل ہیں۔''

"وَلِيَعْلَمَ الَّذِينَ أُوتُوا الْعِلْمَ أَنَّهُ الْحَقُّ مِن رَّبِّكَ فَيُؤْمِنُوا بِهِ فَتُخْبِتَ لَهُ قُلُوبُهُمْ"

''(نیز) مقصد یہ تھا کہ باخبر لوگ یہ جان لیں کہ یہ خدا کی طرف سے حق ہے اور وہ اس کے نتیجے میں اس پر ایمان لائیں اور خدا کے لیے ان کا دل نرم پڑ جائے۔''[1]

سوال ۳: شیطان کس طرح اپنے آپ کو حضرت آدمؑ سے بہتر سمجھتا تھا؟ اور خدا کی حکمت پر اعتراض کر رہا تھا؟

جواب: اس سوال کے جواب میں یہ کہا جا سکتا ہے کہ انانیت وغرور ایک دبیز پردے کی طرح ہے، جس کی وجہ سے انسان حق وحقیقت دیکھنے سے قاصر رہتا ہے اور اسی انانیت اور غرور نے ابلیس کو حقیقت دیکھنے سے روکا۔ ابلیس نہ صرف گناہ و نافرمانی کرنے پر تل گیا، بلکہ اس نے خدا کی حکمت ومصلحت پر اعتراض کرنا شروع کر دیا اور کہا، کیوں مجھ جیسی بہترین مخلوق کہ جو آگ سے خلق ہوئی ہے، پست تر وجود کو جو کہ مٹی سے خلق ہوا ہے، سجدہ کرے؟ سجدہ کرنے کا حکم کیوں مانوں؟ وہ یہ سوچ رہا تھا کہ آگ مٹی سے بہتر ہے، حالاں کہ مٹی تمام برکتوں اور زندگی کی تمام ضروری اشیاء کا ذریعہ اور زندگی گزارنے کا بہترین وسیلہ ہے اور اپنے اندر ہر قسم کے جواہرات اور قیمتی پتھر رکھتی ہے، جبکہ آگ ایسی نہیں ہے، یہ بات درست ہے کہ آگ بھی زندگی کا ایک عنصر ہے لیکن اصل کردار زمین میں موجود اشیاء کا ہے اور آگ ان اشیاء کے تکامل کا ذریعہ ہے۔

بعض احادیث میں آیا ہے[2] کہ شیطان کے جھوٹے دعووں میں سے ایک یہ تھا کہ وہ آگ کو مٹی سے بہتر سمجھتا تھا۔ جبکہ آگ عام طور پر درختوں یا چرب چیزوں سے حاصل ہوتی ہے اور یہ معلوم ہے درخت مٹی سے ہے اور جانوروں کی چربی و نباتات کا تیل وغیرہ سب کے سب زمین ہی سے حاصل کیے جاتے ہیں۔ اس کے علاوہ حضرت آدمؑ کی برتری صرف مٹی کی

---

[1] سورۂ حج: آیات ۵۳، ۵۴

[2] تفسیر نور الثقلین، جلد ۴، ص ۴۷۲، حدیث ۹۳

https://downloadshiabooks.com/

آگ پر برتری کی وجہ سے نہیں تھی، بلکہ حضرت آدمؑ کی فضیلت ان کی ملکوتی روح کی وجہ سے تھی کہ خدا نے کہا: "وَنَفَخْتُ فِيهِ مِنْ رُّوحِي" "میں نے اپنی روح اُس میں پھونک دی۔" سے تعبیر کر کے اُس کو فضیلت اور مقام دیا ہے۔ اگر مان بھی لیں کہ شیطان کا ابتدائی مادّہ (آگ) حضرت آدمؑ کے ابتدائی مادّہ (مٹی) سے بہتر ہے، پھر بھی یہ سبب نہیں بنتا کہ شیطان حضرت آدمؑ کے سامنے خضوع و سجدہ نہ کرے جو کہ الٰہی روح کا مالک اور خدا کا نمائندہ ہونے کا شرف رکھتے تھے۔ شاید شیطان کو یہ سب پتا تھا لیکن اس کے غرور و تکبّر اور انانیت نے اس کو حقیقت کے اعتراف سے روکے رکھا۔

جاہلوں کی بے بنیاد تاویلیں

بعض فلاسفہ (جنہیں ابن میثم بحرانی نے اپنی شرح نہج البلاغہ میں نقل کیا ہے) یہ تمام موضوعات جو حضرت آدم علیہ السلام کی خلقت، فرشتوں کا سجدہ کرنے اور شیطان کی نافرمانی وسرکشی کے بارے میں نقل ہوئے ہیں، ان سب کی تاویل اور توجیہہ کرتے ہیں اور ان مفاہیم کو تبدیل کر دیتے ہیں، جو ان کے ظاہر سے معلوم ہوتے ہیں، مثلاً وہ کہتے ہیں فرشتوں سے مراد (جنہیں خدا نے حضرت آدمؑ کو سجدہ کرنے کا حکم دیا تھا) بدن کی مختلف قوتیں ہیں، جن کو قوتِ عقل و روح کے مقابل خضوع کرنے کا حکم دیا گیا تھا اور ابلیس سے مراد قوت وہم ہے اور ابلیس کا لشکر وہی ہے جو قوت وہم یعنی ہوائے نفس سے نکلتا ہے جو کہ قوت عقل کے مقابل ہے اور اس بہشت سے مراد جہاں سے حضرت آدمؑ کو نکالا گیا تھا حقیقی معارف اور خدا کے نورِ کبریائی کے مطالع وغیرہ وغیرہ۔[1]

یہ سب تفسیر بالرائے کی واضح مثالیں ہیں اور یہ بات معلوم ہے کہ اپنی رائے سے تفسیر کرنا اور آیات و روایات کو اپنے ذہنی مطالب پر پرکھنا، گمراہ اور فریب کار اور بدعت ایجاد کرنے والوں کا طریقۂ کار رہا ہے، یہ لوگ قرآنی آیات اور احادیث اپنی مرضی کے مفہوم پر ڈھالنا چاہتے ہیں اور وہ معنی جو خدا اور اُس کے نمائندوں نے بتائے ہیں، چھوڑ دیتے ہیں اور اگر تفسیر بالرائے (اپنی رائے سے تفسیر بیان کرنا) شروع ہو جائے تو کوئی بھی قانون ثابت نہیں ہو سکے گا اور ہر چیز ہر کس و ناکس کے باطل نظریات اور ان کی خواہشاتِ نفس کی بھینٹ چڑھ جائے گی، اور قرآن و احادیث ایک موم کے ٹکڑے کی طرح ہو جائیں گے، جسے گمراہ و بے خبر لوگ جس طرح چاہیں اور جس شکل میں چاہیں تبدیل کریں۔

اسی وجہ سے اسلام کے بڑے محققین تاکید کرتے ہیں کہ قرآن و احادیث کو سمجھنے کے لیے طے شدہ قوانین سے استفادہ ضروری ہے اور الفاظ کو ان کے اصلی معنی پر محمول کرنا چاہیے، قرینہ، مجازی معنی پر موجود ہو تو اس معنی پر پرکھا جا سکتا

---

[1] نہج البلاغہ شرح ابن میثم، جلد ۱، ص ۱۹۰ کے بعد۔

https://downloadshiabooks.com/

ہے۔ایسے قرائن ہوں جو عقلا کے ہاں قابل قبول ہوں اور وہ اپنی دلیلوں میں اُنہیں استعمال کرتے ہوں۔[۱]

بہر حال ابلیس کی داستان اور اس کے انجام کا ذکر مولا علیؑ کے اس کلام میں سب کے لیے ایک درس عبرت ہے تا کہ وہ تکبّر،غرور اور خود ستائی کا نتیجہ دیکھ لیں اور ابلیس کا آخری انجام، ابدی لعنت اور بدبختی تک پہنچنا کافی ہے کہ انسان اس خطرناک وادی میں قدم نہ رکھے،اس گفتگو کو ہم بزرگ عالم مرحوم مغنیہ کے کلام پر ختم کرتے ہیں، جوانھوں نے شرح نہج البلاغہ میں فرمایا ہے۔وہ کہتے ہیں کہ حضرت آدمؑ وابلیس کی اس داستان سے مندرجہ ذیل درسِ عبرت حاصل ہوتے ہیں:

۱۔جو کسی بھی فضیلت والے فرد سے حسد کرے یا کسی انسان کے ریاست وحکومت میں شریک ہونے کی بنا پر دشمنی کرے،وہ ابلیس کے دین کو ماننے والا ہے اور قیامت کے دن اس کے ساتھیوں میں شمار ہوگا۔

۲۔معرفتِ دین اور اخلاق حسنہ کی صرف ایک راہ ہے اور وہ حق کے سامنے سرِ تسلیم خم کرنا اور اس پر ثابت قدم رہنا ہے چاہے نتیجہ کچھ بھی ہو۔

۳۔بہت سے لوگ باطل پر اصرار کرتے ہیں،یعنی یہ کہ باطل کو جانتے ہوئے بھی اس پر ڈٹ جاتے ہیں۔اس کی وجہ دشمنی اور ضدی طبیعت ہے،اگر چہ وہ لوگ اس کام کے بُرے نتیجے کو جانتے ہیں،اگر ابلیس توبہ کر لیتا اور اپنی غلط راہ کو ترک کر دیتا تو خدا اس کی توبہ قبول کر لیتا اور وہ اسے معارف بھی کر دیتا،لیکن وہ اپنی تئیں یہ شرط لگا رہا تھا کہ توبہ کرنے کے بعد خدا اسے پھر حضرت آدمؑ کو سجدہ کرنے کا حکم نہ دے،جبکہ خدا نے اس کی توبہ قبول کرنے کے لیے آدمؑ کو سجدہ کرنے کی شرط رکھی تھی۔[۲]

گیارہواں حصّہ

ثُمَّ أَسْكَنَ سُبْحَانَهُ آدَمَ دَارًا أَرْغَدَ فِيهَا [عِيْشَتَهُ] عَيْشَهُ وَآمَنَ فِيهَا مَحَلَّتَهُ وَحَذَّرَهُ إِبْلِيسَ وَ عَدَاوَتَهُ فَاغْتَرَّهُ عَدُوُّهُ نَفَاسَةً عَلَيْهِ بِدَارِ الْمُقَامِ وَ مُرَافَقَةِ الْأَبْرَارِ فَبَاعَ الْيَقِينَ بِشَكِّهِ وَ الْعَزِيمَةَ بِوَهْنِهِ وَ اسْتَبْدَلَ بِالْجَذَلِ وَجَلًا وَ [بِالْاِعْتِزَازِ] بِالْاِغْتِرَارِ نَدَماً ثُمَّ بَسَطَ اللهُ سُبْحَانَهُ لَهُ فِي تَوْبَتِهِ وَلَقَّاهُ كَلِمَةَ رَحْمَتِهِ وَوَعَدَهُ الْمَرَدَّ إِلَى جَنَّتِهِ وَأَهْبَطَهُ إِلَى دَارِ الْبَلِيَّةِ وَتَنَاسُلِ الذُّرِّيَّةِ۔

''اس کے بعد پروردگار نے آدمؑ کو ایک ایسے گھر میں ساکن کر دیا، جہاں کی زندگی خوش گوار اور مامون ومحفوظ تھی اور پھر انہیں ابلیس اور اس کی عداوت سے بھی باخبر کر دیا،لیکن دشمن نے ان کے جنت کے قیام اور نیک بندوں کی رفاقت سے جل

---

[۱] مزید وضاحت کے لیے آیت اللہ مکارم کی کتاب ''تفسیر بالرّای'' کی طرف رجوع کریں۔

[۲] فی ظلال نہج البلاغہ،جلد ۱،ص ۵۱

کر انہیں دھوکا دے دیا اور انہوں نے بھی اپنے یقینِ محکم کو شک اور عزمِ مستحکم کو کمزوری کے ہاتھوں فروخت کر دیا اور اس طرح مسرت کے بدلے خوف کو لے لیا اور ابلیس کے کہنے میں آ کر ندامت کا سامان فراہم کرلیا۔ پھر پروردگار نے ان کے لیے توبہ کا سامان فراہم کر دیا اور اپنے کلماتِ رحمت کی تلقین کر دی اور ان سے جنت میں واپسی کا وعدہ کر کے انہیں آزمائش کی دنیا میں اتار دیا، جہاں نسلوں کا سلسلہ قائم ہونے والا تھا۔

شرح وتفسیر

حضرت آدمؑ کی عبرت انگیز داستان

گزشتہ بحثوں میں فرشتوں اور ابلیس کے امتحان کے بارے میں گفتگو تھی۔ یہاں حضرت آدم علیہ السلام کے امتحان اور اس آزمائش کے نتیجے کے بارے میں بحث ہے۔ قرآن کی آیات سے بخوبی معلوم ہوتا ہے کہ حضرت آدم علیہ السلام زمین پر رہنے کے لیے خلق کیے گئے تھے۔ سورہ بقرہ میں ہے:

"اِنِّيْ جَاعِلٌ فِي الْاَرْضِ خَلِيْفَةً"۔[1]

''میں زمین میں اپنا نمائندہ قرار دینے والا ہوں۔''

نیز قرآن کی دوسری آیات سے سمجھ میں آتا ہے زمین سے مراد جنت کے علاوہ کوئی اور جگہ تھی، البتہ اس سے غرض نہیں کہ جنت کے کچھ بھی معنی مراد لیے جائیں۔ کیونکہ سورۂ بقرہ میں ہے:

"قُلْنَا اهْبِطُوْا بَعْضُكُمْ لِبَعْضٍ عَدُوٌّ وَّلَكُمْ فِي الْاَرْضِ مُسْتَقَرٌّ وَّمَتَاعٌ اِلٰى حِيْنٍ"۔[2]

ہم نے (آدمؑ وحواؑ اور شیطان سے) کہا کہ زمین پر اُتر جاؤ، اگرچہ تم یہاں ایک دوسرے کے دشمن رہو گے۔ زمین کو تمہارے لیے ایک معین مدت تک جائے سکونت قرار دیا۔''

بہرحال یہ بات ضروری تھی کہ حضرت آدمؑ کچھ عرصہ الٰہی آزمائش میں مبتلا رہیں اور امر ونہی، اطاعت، تکلیف و نافرمانی، پشیمانی، توبہ جیسے مفاہیم سے باخبر ہو جائیں اور عملی میدان میں اپنے دشمن کو اچھی طرح پہچان لیں، اسی وجہ سے خدا نے اُنھیں جنت میں بھیجا اور بہترین نعمتوں سے استفادہ ان کے لیے مباح قرار دیا۔ بس ایک درخت کے نزدیک جانے سے

---

[1] سورۂ بقرہ، آیت ۳۰

[2] سورۂ بقرہ، آیت ۳۶

https://downloadshiabooks.com/

منع کیا۔ لیکن شیطان کے وسوسے اور اس کے دھوکے وفریب نے آخرکار اثر دکھایا اور حضرت آدم علیہ السلام سے ترکِ اولیٰ سرزد ہوا اور ممنوعہ درخت سے کھانے کے نتیجے میں جنتی لباس سے محروم ہوئے اور انھیں جنت سے نکال دیا گیا۔ یہی چیز سبب ہوئی کہ وہ خوابِ غفلت سے جاگ جائیں اور خدا کی طرف توبہ کے دروازے سے پلٹ جائیں۔ خدا کا لطف ان کے شامل حال ہوا اور توبہ کرنے کا طریقہ انھیں سکھایا، پھر ان کی توبہ قبول ہوئی اور دوبارہ جنت کی طرف پلٹانے کا وعدہ کیا گیا، لیکن ان کے اس اقدام کا اثر یہ ہوا کہ انھیں نعمتوں سے بھرپور جنت سے الگ کر کے آزمائشوں، زحمتوں اور مشقتوں سے بھری دنیا میں بھیج دیا گیا۔ یہ وہ خلاصہ ہے، جو مولاؑ کے کلام سے سمجھ میں آتا ہے اور پھر دوبارہ خطبے کے متن پر غور کرتے ہیں۔

پہلے مرحلے میں آپؑ فرماتے ہیں:

"ثُمَّ اَسْكَنَ سُبْحَانَهُ آدَمَ دَارًا اَرْغَدَ[1] فِيهَا عَيْشَهُ"

''پھر خدائے سبحان نے حضرت آدمؑ کو ایسے گھر میں رہائش دی، جہاں اُن کی زندگی نعمتوں سے بھری ہوئی تھی اور وہ آرام دہ جگہ تھی۔''

"وَ آمَنَ فِيهَا مَحَلَّتَهُ"

''اور اُس جگہ کو امن وامان کی جگہ قرار دیا۔''

زندگی کے دو بنیادی عناصر یعنی نعمتوں کی فراوانی اور امن وسکون وہاں جمع تھے۔ سورۂ بقرہ میں اللہ فرماتا ہے:

"وَقُلْنَا يٰآدَمُ اسْكُنْ اَنْتَ وَزَوْجُكَ الْجَنَّةَ وَكُلَا مِنْهَا رَغَدًا حَيْثُ شِئْتُمَا"[2]

''ہم نے آدمؑ سے کہا تم اور تمہاری بیوی جنت میں بس جاؤ اور اُس کی پاکیزہ نعمتوں سے جب اور جہاں سے بھی چاہو استفادہ کرو۔''

"وَحَذَّرَهُ اِبْلِيسَ وَ عَدَاوَتَهُ"

''اور اُسی وقت حضرت آدمؑ کو ابلیس اور اس کی دشمنی سے آگاہ کر دیا تھا۔''

اور اس طرح اللہ نے انھیں راہِ سعادت اور چاہِ شقاوت دونوں سے آشنا کر دیا اور ان پر اپنی حجت تمام کر دی تھی اور یہ وہ بات ہے جس کا ذکر سورۂ طٰہٰ میں اشارہ ہے:

---

[1] ارغد، رغد کے مادّے سے صمد کے وزن پر ہے اصل میں اس کے معنیٰ اچھی زندگی اور وسیع زندگی ہے اور نعمت زیادہ ہونا انسانوں کے لیے یا حیوانوں کے لیے بھی استعمال ہوتا ہے۔ (مفردات ومقائیس اللغۃ)

[2] سورۂ بقرہ، آیت ۳۵

https://downloadshiabooks.com/

"فَقُلْنَا يَا آدَمُ إِنَّ هٰذَا عَدُوٌّ لَّكَ وَلِزَوْجِكَ فَلَا يُخْرِجَنَّكُمَا مِنَ الْجَنَّةِ فَتَشْقٰى" [۱]

''ہم نے کہا، اے آدمؑ یہ (ابلیس) تمہارا اور تمہاری زوجہ کا دشمن ہے۔ پس یہ تم دونوں کو جنت سے نکلوا نہ دے، پھر تم زحمت و مشقت میں مبتلا ہو جاؤ گے۔''

یہ بھی اتمامِ حجت تھا کہ دوسرے درختوں سے استفادے کا راستہ کھلا رکھا، لیکن اس راستے کے اس نئے مسافر کو شیطان کے مکر و فریب سے خوب آگاہی نہیں تھی اور بالآخر اس کے دھوکے میں آ گیا، جس کی جانب مولاؑ اشارہ فرما رہے ہیں:

"فَاغْتَرَّهُ عَدُوُّهُ نَفَاسَةً [۲] عَلَيْهِ بِدَارِ الْمُقَامِ وَمُرَافَقَةِ الْاَبْرَارِ"

''دشمن نے انھیں دھوکا دیا، کیوں کہ ابلیس حضرت آدمؑ سے ہمیشہ رہنے والی جگہ اور فرشتوں کی ہم نشینی کی وجہ سے حسد کرتا تھا۔''

اصولی طور پر شیطان کا کام یہی ہوتا ہے کہ خود نیک لوگوں کے برابر ہونے کی اور سعادت مندوں کے راستے پر چلنے کی کوشش نہیں کرتا بلکہ وہ کوشش کرتا ہے دوسروں سے بھی خدا کی نعمتیں چھن جائیں اور ان کی زندگی تاریک ہو جائے۔

پھر امامؑ حضرت آدمؑ کے دھوکا کھانے کی اصل وجہ کی طرف اشارہ فرماتے ہیں:

"فَبَاعَ الْيَقِيْنَ بِشَكِّهٖ"

''آدمؑ نے اپنے یقین کو شک کے بدلے فروخت کیا۔''

"وَالْعَزِيْمَةَ بِوَهْنِهٖ" [۳]

'' اور انھوں نے اپنے دو مضبوط ارادوں کو (جو شیطان کے وسوسوں اور فریب کے مقابلے کے لیے استعمال کر سکتے تھے) سستی کے بدلے فروخت کر دیا۔''

یہ کلام بھی قرآن کریم کی ایک اور آیت کی طرف اشارہ ہے، جہاں خدا فرماتا ہے:

---

[۱] سورۂ طٰہٰ، آیت ۱۱۷

[۲] نفاسۃ، اصل میں ''نفس'' سے ہے جس کے وزن پر یہ لفظ روح کے معنیٰ میں لیا گیا ہے۔ اس وجہ سے کہ تنفس (یعنی سانس لینا) زندگی کا سبب ہے، لہٰذا یہ لفظ زندگی کے معنیٰ میں استعمال ہوا ہے، پھر منافسہ کسی اہم مقصد تک پہنچنے کے لیے کوشش کرنے کے معنی میں ہے اور اسی وجہ سے نفاسۃ حسد اور کنجوسی کے معنوں میں استعمال کیا گیا ہے۔ (مفردات، مقائیس اللغۃ و لسان العرب)

[۳] شکہ اور وھنہ کی ضمیر کے مرجع کے بارے میں دو احتمال ہیں۔ نہج البلاغہ کی شرح کرنے والوں نے اس کو حضرت آدمؑ کی طرف پلٹایا ہے، یعنی آدمؑ نے اپنے یقین کو شک میں اور پکے ارادے کو سستی میں تبدیل کیا اور یہ بھی احتمال ہے کہ دونوں ضمیریں ابلیس کی طرف پلٹ جائیں، کیونکہ شک اور سستی کو ابلیس نے پیدا کیا تھا، یعنی درحقیقت یہاں سبب کی طرف اشارہ ہے مفعول کی طرف اشارہ نہیں، لیکن بہرحال پہلا احتمال زیادہ صحیح لگتا ہے۔

https://downloadshiabooks.com/

"وَلَقَدْ عَهِدْنَآ اِلٰٓى اٰدَمَ مِنْ قَبْلُ فَنَسِيَ وَلَمْ نَجِدْ لَهٗ عَزْمًا"

''ہم نے آدمؑ سے عہد لیا تھا کہ شیطان سے دھوکا نہ کھائیں، لیکن اُنھوں نے وعدے کو فراموش کر دیا اور ہم نے آدمؑ کے اندر پکّا ارادہ نہیں پایا۔'' [۱]

یہ بات درست ہے کہ شیطان نے آدمؑ کے سامنے قسم کھائی کہ وہ اُن کا خیر خواہ ہے اور آدمؑ اور ان کی بیوی کی بہتری چاہتا ہے:

"وَقَاسَمَهُمَآ اِنِّيْ لَكُمَا لَمِنَ النّٰصِحِيْنَ" [۲]

''اور ان دونوں سے قَسم کھا کر کہا کہ بیشک میں تمہارے خیر خواہوں میں سے ہوں۔''

لیکن آدمؑ کی ذمّے داری کیا تھی؟

کیا حضرت آدمؑ کو اللہ کے وعدوں پر اعتماد کرنا چاہیے تھا؟ کہ جو یقین کے سر چشمے کا حاصل ہیں یا پھر شیطان کی باتوں پر جو سراسر شک اور وہم پر مشتمل ہیں۔ اس حقیقت کو بھلانا سبب ہوا کہ حضرت آدمؑ اس نقصان وخسارے کے معاملے کا شکار ہو جائیں اور اللہ کی اطاعت کے سلسلے میں پکے ارادے سے ہٹ کر سُستی کا شکار ہوئے اور یہ بات تمام فرزندانِ آدمؑ کے لیے درسِ عبرت ہے کہ ہر حادثے و واقعے میں صرف اور صرف یقینی بات پر اعتماد کریں اور مشکوک اور مبہم راستوں سے گُریز کریں۔ اور احتیاط کو ہمیشہ ہاتھ سے جانے نہ دیں۔ کسی راستے پر ضروری مطالعہ وغور وخوض کے بغیر قدم نہ رکھیں، کیونکہ ہمیشہ شیطان اپنے فساد انگیز ارادوں کو خوبصورتی کے ساتھ زینت دیتا ہے اور اپنے جلا دینے والے جہنم کو سر سبز وشاداب باغ کی شکل میں دکھاتا ہے۔ ہاں! حضرت آدمؑ کی پوری داستان میں تمام انسانوں کے لیے قیامت تک کے لیے بہت سی عبرتیں اور سبق آموز نکات موجود ہیں۔ پھر امامؑ نے اس نقصان دہ معاملے کے نتیجے کی طرف اشارہ کیا، آپؑ فرماتے ہیں:

"وَاسْتَبْدَلَ بِالْجَذَلِ [۳] وَجَلًا [۴] وَبِالْاِغْتِرَارِ نَدَمًا"

''آدمؑ نے مسرت کے بدلے خوف کو لے لیا اور ابلیس کے کہنے میں آ کر ندامت کا سامان فراہم کر لیا۔''

---

[۱] سورۂ طٰہٰ، آیت ۱۱۵

[۲] سورۂ اعراف، آیت ۲۱

[۳] جذل، جدل کے وزن پر صحاح اللغۃ کے مطابق خوشی کے معنی میں ہے اور مقائیس اللغۃ کے مطابق قول جذل (جسم) کے وزن پر درخت کی جڑ جو درخت کو سیدھا رکھتی ہے، کے معنی میں استعمال ہوا ہے۔ یہ لفظ خوشحال شخص کے لیے اس وجہ سے استعمال کیا گیا ہے کہ وہ شخص سیدھے قد والا ہوتا ہے اور غمگین شخص کی کمر جھکی ہوتی ہے، کبھی جھکی ہوتی ہے کبھی زمین کے ساتھ ملی ہوئی ہوتی ہے۔ اسی مناسبت سے یہ لفظ خوشی کے معنی میں استعمال ہوا ہے۔

[۴] وجل، اجل کے وزن پر اصل میں ڈر اور خوف کے معنی کے لیے وضع ہوا ہے۔

https://downloadshiabooks.com/

اس کام کا نتیجہ یہ ہوا کہ آدمؑ نے اپنی خوشی کو غم اور خوف وگھبراہٹ میں تبدیل کر دیا اور شیطان کا دھوکا اُن کے لیے پشیمانی کا باعث ہوا، لیکن وہ کون سے واقعات تھے، جن کے سبب آدمؑ اپنے ترکِ اولیٰ کی طرف متوجہ ہوئے اور افسوس و پشیمانی سے اپنی انگلی چبانے لگے؟ اس بات کو امامؑ نے اجمالی طور پر بیان فرمایا ہے جبکہ قرآنِ کریم نے اس کی تشریح مختلف سورتوں میں کی ہے۔ جب انہوں نے شیطان کے وسوسوں میں آ کر درخت ممنوعہ سے کھایا، تھوڑی مدت نہ گزری تھی کہ جنت کا لباس ان کے جسم سے الگ ہو گیا اور جسم کے جو حصّے چھپانے چاہئیں تھے وہ ظاہر ہو گئے۔ اس وجہ سے یہ لوگ فرشتوں کے سامنے شرمسار ہونے لگے اور اس سے بڑھ کر بات یہ کہ ان کو جنت سے جلدی نکل جانے کا حکم دے دیا گیا۔ یہ ہے ان لوگوں کی سزا جو خدا کے حکم کو چھوڑ کر شیطانی وسوسوں کا شکار ہوتے ہیں اور اپنی شخصیت اور مقام کو پامال کرتے ہیں اور ان کو جنت سے نکالا جاتا ہے۔ یہاں پر حضرت آدمؑ اپنے ترکِ اولیٰ پر اصرار کرنے کی بجائے جلدی اس کی تلافی کرنے کی فکر کرنے لگے۔

چونکہ حضرت آدمؑ نے خدا کی طرف قدم بڑھانا شروع کیا، اسی وجہ سے خدا کی رحمت اور لطف ان کے شامل حال ہوا اور خدا نے اپنی رحمت کے کلمات حضرت آدمؑ کو سکھائے اور ان سے دوبارہ جنت میں واپس پلٹنے کا وعدہ کیا:

"ثُمَّ بَسَطَ اللّٰهُ سُبْحَانَهُ لَهُ فِيْ تَوْبَتِهٖ وَلَقَّاهُ كَلِمَةَ رَحْمَتِهٖ وَوَعَدَهُ الْمَرَدَّ اِلٰى جَنَّتِهٖ"[1]

"پھر پروردگار نے ان کے لیے توبہ کا سامان فراہم کر دیا اور اپنے کلماتِ رحمت کی تلقین کر دی اور ان سے جنت میں واپسی کا وعدہ کیا۔"

لیکن حضرت آدمؑ کی یہ توبہ جنت میں دوبارہ رہنے کی کوئی وجہ نہیں بن سکی، کیونکہ آدمؑ کو جنت میں باقی رہنے کی کوئی دلیل وضرورت نہیں تھی، کیوں کہ جو کچھ وہاں پر سیکھنا تھا وہ سیکھ لیا اور جو تجربہ وہاں حاصل کرنا تھا وہ حاصل کر چکے تھے۔ اسی وجہ سے خدا نے حضرت آدمؑ کو امتحان گاہ یعنی دنیا اور نسل بڑھانے کے لیے زمین پر بھیج دیا۔

"وَاَهْبَطَهٗ اِلٰى دَارِ الْبَلِيَّةِ وَتَنَاسُلِ الذُّرِّيَّةِ"

"اور انہیں آزمائش کی دنیا میں اتار دیا، جہاں نسلوں کا سلسلہ قائم ہونے والا تھا۔"

---

[1] جنتہ، کی ضمیر خدا کی طرف پلٹتی ہے یا حضرت آدمؑ کی طرف؟ اس میں اختلاف ہے؛ اگر یہ ضمیر حضرت آدمؑ کی طرف لوٹے تو اس صورت میں جنت سے مراد وہی جنت ہوگی جہاں حضرت آدمؑ پہلے تھے، اور اگر ضمیر خدا کی طرف پلٹ جائے تو یہ ضروری نہیں ہے کہ مراد وہی جنت ہو، بلکہ ممکن ہے آدمؑ کی یہ جنت دنیاوی ہو یا ہمیشہ رہنے والی جنت جہاں حضرت آدمؑ کو دوبارہ پلٹایا جائے گا، لیکن ظاہر یہی ہے کہ ضمیر خداوندِ سبحان کی طرف پلٹی ہے۔ توبتہ اور رحمتہ کی ضمیر کے مرجع کے قرینے کے مطابق اگرچہ "مَرَدَّ" کا لفظ ظاہراً اسی سابقہ جنت کی طرف پلٹ جانا ہے لیکن مطلق جنت یا دوسری عبارت میں نوعِ جنت کی طرف پلٹنا، مَرَدَّ، کے لفظ سے غیر ہم آہنگ بھی نہیں۔

https://downloadshiabooks.com/

اس کلام سے اچھی طرح یہ بات معلوم ہوتی ہے کہ دنیا امتحان کی اصل جگہ ہے اور جنت میں جو کچھ ہوا وہ سب دنیا میں آنے کے لیے تمہید و مشق تھا اور اسی طرح تناسل و توالد کا دارومدار بھی دنیا کے ساتھ ہے، نہ کہ جنت کے ساتھ۔

نکات

ا۔ حضرت آدمؑ کی جنّت کون سی تھی؟

کچھ لوگ عقیدہ رکھتے ہیں کہ حضرت آدمؑ بہشتِ موعود اور ہمیشہ رہنے والی جنت میں تھے، جو خدا نے نیک و پاکیزہ لوگوں کے لیے معیّن فرمائی ہے، جبکہ کچھ اور افراد اس بات کا عقیدہ رکھتے ہیں کہ وہ اسی دنیا کے سرسبز و شاداب باغات تھے یعنی وہ دنیا کی ایک جنت تھی۔ اور انھوں نے اپنی اس بات کو چند دلیلوں سے ثابت کیا ہے:

پہلی دلیل یہ ہے کہ قیامت کی جنت ایک ہمیشہ رہنے والی نعمت ہے، اس سے خارج ہونا ممکن نہیں ہے۔

دوسری دلیل یہ ہے کہ ابلیس کے لیے ان تمام گناہوں کی آلودگیوں اور کفر وطغیان کے باوجود کس طرح ممکن ہوا کہ وہ اس پاک و پاکیزہ اور مقدس جگہ پر قدم رکھے؟ اگر کہا جائے کہ ابلیس حضرت آدم علیہ السلام کو وسوسہ دینے کے لیے جنت کے اندر ہرگز نہیں آیا تھا، بلکہ باہر کھڑا ہو کر حضرت آدم علیہ السلام کو وسوسہ دے رہا تھا۔ تو یہ بات سورۂ بقرہ کی آیت:

"وَقُلْنَا اهْبِطُوْا بَعْضُكُمْ لِبَعْضٍ عَدُوٌّ"[1]

اور (بالآخر) ہم نے حکم دیا کہ تم نیچے اتر جاؤ، تم ایک دوسرے کے دشمن رہو گے۔''، کے ساتھ موافق نہیں ہے۔ اس کے علاوہ اہل بیت علیہم السلام کی طرف سے نقل ہونے والی بہت سی روایات میں اس بات کی وضاحت کی گئی ہے کہ آدمؑ کی جنت اسی دنیا کے باغوں میں سے ایک سرسبز باغ تھا۔

ان روایات میں سوال کیا گیا تو معصومؑ نے فرمایا:

"جَنَّةٌ مِنْ جِنَانِ الدُّنْيَا يَطْلَعُ عَلَيْهَا الشَّمْسُ وَ الْقَمَرُ وَلَوْ كَانَتْ مِنْ جِنَانِ الْخُلْدِ مَا خَرَجَ مِنْهَا أَبَدًا"

''وہ جنت اسی دنیا کے حسین باغوں میں سے ایک سرسبز و شاداب باغ تھا۔ جہاں سورج اور چاند کی روشنی پڑتی

[1] سورۂ بقرہ: آیت ۳۶

https://downloadshiabooks.com/

تھی۔اگر وہ جنت خلد ہوتی تو ہر گز حضرت آدمؑ وہاں سے باہر نہیں آتے۔"[۱]

مرحوم شیخ کلینیؒ نے کتاب کافی میں ایک اور حدیث اسی مضمون سے مشابہ "حسین بن میسّر" سے اور انہوں نے حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام سے نقل کی ہے۔[۲]

اس نظریے پر صرف ایک اشکال وارد ہوسکتا ہے اور وہ نہج البلاغہ کی مذکورہ عبارت میں آنے والی تعبیر ہے۔ جہاں آپؑ فرماتے ہیں: "نَفَاسَةً عَلَيْهِ بِدَارِ الْمَقَامِ" شیطان ان سے ہمیشہ رہنے والے گھر کی وجہ سے حسد کرتا تھا، اسی لیے اُنھیں دھوکا دیا اور شبہے میں مبتلا کردیا۔ لیکن ممکن ہے اس تعبیر سے یہ مراد ہو کہ اگر آدمؑ اس ترکِ اولیٰ کے مرتکب نہ ہوئے ہوتے تو لمبی مدت تک اسی جنت میں رہتے اور پھر اس کے بعد اس سرزمین پر قدم رکھتے، لیکن یہ ترکِ اولیٰ باعث ہوا کہ وہ جلد ہی جنت سے نکال کر زمین کی طرف بھیج دیے گئے۔ اس تعبیر سے مراد یہ بھی ہوسکتا ہے کہ شیطان چاہتا تھا حضرت آدمؑ کو ابدی جنت سے محروم کردے، کیونکہ اگر آدمؑ وہاں ہر اعتبار سے خدا کے فرمانبردار ہوتے تو ہمیشہ رہنے والی جنت کی طرف لے جائے جاتے۔

۲۔ کیا حضرت آدم علیہ السلام گناہ کے مرتکب ہوئے؟

وہ لوگ جو انبیاءؑ کے لیے گناہ کا مرتکب ہونا خاص طور پر اس جیسے موارد میں جائز سمجھتے ہیں، ان کو اس بات کے کہنے میں کوئی مضائقہ نہیں کہ حضرت آدم علیہ السلام گناہ کے مرتکب ہوئے، لیکن مکتبِ اہلِ بیتؑ کے پیروکار عقیدہ رکھتے ہیں کہ انبیائے کرامؑ ہر قسم کی خطا اور غلطی سے پاک اور محفوظ ہیں۔ خطائیں چاہے عقیدہ اور دین کی تبلیغ سے مربوط ہوں یا روزمرہ زندگی سے مربوط ہوں، نبوّت سے پہلے سے مربوط ہوں یا نبوّت کے بعد سے بہرصورت انبیاءِ کرامؑ خطاؤں اور گناہوں سے پاک ہیں۔

لہٰذا مکتبِ اہلِ بیت علیہم السلام کے پیروکاروں [۳] کے نزدیک حضرت آدم علیہ السلام سے کسی طرح گناہ اور خطا سرزد نہیں ہوا

---

[۱] بحارالانوار، جلد ۱۱، ص ۱۴۳، حدیث ۱۲

[۲] کتاب کافی، ج ۳، ص ۲۴۷، باب "جنت الدنیا" حدیث ۲

[۳] ابن ابی الحدید کہتا ہے کہ امامیہ اس بات کے قائل ہیں کہ خدا ایسے شخص کو نبوت کے لیے مبعوث نہیں کرتا ہے جو نبوت سے پہلے کسی بُرے کام کو انجام دے، وہ بُرا کام چاہے گناہِ کبیرہ ہو یا گناہ صغیرہ جان بوجھ کر کرے یا غلطی سے، یہ نظریہ مذہب امامیہ سے مخصوص ہے کیونکہ ہمارے علماء (اہلسنّت) نبوت سے پہلے گناہ کبیرہ کے ارتکاب کو ممنوع جانتے ہیں، لیکن گناہِ صغیرہ کا ارتکاب اگر نفرت کا سبب نہ بنے تو اسے جائز جانتے ہیں۔ اس کے بعد وہ اضافہ کرتے ہیں کہ امامیہ یہی نظریہ اپنے بارہ اماموں کے بارے میں بھی رکھتے ہیں اور ان کے لیے بھی انبیاءؑ کی طرح مطلق عصمت کے قائل ہیں۔

(شرحِ نہج البلاغہ ابن ابی الحدید جلد ۷ صفحہ ۱۰)

https://downloadshiabooks.com/

پس خدا نے جو درخت سے حضرت آدم علیہ السلام کو منع کیا تھا وہ نہی تحریمی (جس کام پر حرمت صدق آئے) نہیں تھی، بلکہ حضرت آدم علیہ السلام کے لیے یہ کام صرف مکروہ جیسا عمل تھا۔البتہ اس بات کو مدنظر رکھتے ہوئے کہ انبیاءؑ کا مرتبہ بہت بلند ہے، خصوصاً حضرت آدمؑ جو کہ مسجودِ ملائکہ تھے، ایسی شخصیت سے مکروہ کام کی انجام دہی کی بھی توقع نہیں رہتی، لہٰذا اگر ان سے اس طرح کا کوئی کام سرزد ہوجاتے تو خدا کی طرف سے مؤاخذہ بھی سخت ہوگا۔ چنانچہ کہا جاتا ہے:

"حَسَنَاتُ الْاَبْرَارِ سَيِّئَاتُ الْمُقَرَّبِيْنَ"

''نیک لوگوں کے اچھے کام مقرب بندوں کے لیے گناہ شمار کیے جاتے ہیں۔''

دوسری عبارت میں یہ کہا جاسکتا ہے گناہ دو قسم کے ہیں، ایک مطلق گناہ دوسرا نسبی گناہ۔

مطلق گناہ وہ کام ہے جو ہر صورت میں گناہ ہے، مثلاً جھوٹ بولنا، چوری کرنا، شراب پینا وغیرہ، لیکن نسبی گناہ وہ کام ہے جو عام لوگوں کے لیے گناہ شمار نہیں ہوتا ہے، شاید کچھ افراد کی نسبت وہی کام نیک کام شمار ہو، لیکن یہی مستحب یا مباح کام اگر خدا کے مقرّب بندوں سے انجام پائے تو ان پر عصیان (گناہ) کا اطلاق ہوتا ہے۔ مثلاً نمازِ شب پڑھنا عام لوگوں کے لیے بہت زیادہ قابلِ توصیف عمل ہے، مگر مقربینِ خدا کے لیے صرف نمازِ پنجگانہ پڑھنا اور کبھی کبھی نمازِ شب کا ترک ہو جانا قابلِ مذمت عمل ہے۔

لہٰذا حضرتِ آدم علیہ السلام کا یہ کام نسبی گناہ شمار کیا جاتا ہے اور ترکِ اولیٰ سے بھی یہی معنی مقصود ہیں۔ بعض نے یہ بھی کہا ہے ممنوعہ درخت سے جو ''نہی'' کی تھی، وہ نہی مولوی نہیں تھی، بلکہ وہ نہی ارشادی تھی، مثلاً ڈاکٹر کی ہدایت کہ فلاں کھانا مت کھائیں، وگرنہ آپ کی بیماری طول پکڑے گی۔ ظاہر ہے اگر ڈاکٹر کی ہدایت کی مخالفت کریں تو یہ نہ تو ڈاکٹر کی توہین ہے اور نہ ہی ڈاکٹر کے حکم کی نافرمانی، بلکہ اس کا نتیجہ وہ درد اور سختی ہے جو اس مخالفت کی وجہ سے اُٹھانا پڑے گی، قرآن کی کچھ آیات اسی مطلب کی طرف اشارہ کرتی ہیں:

"فَقُلْنَا يَا آدَمُ إِنَّ هٰذَا عَدُوٌّ لَّكَ وَلِزَوْجِكَ فَلَا يُخْرِجَنَّكُمَا مِنَ الْجَنَّةِ فَتَشْقٰى"

''ہم نے آدمؑ سے کہا، یہ (ابلیس) آپ اور آپ کی زوجہ کا دشمن ہے ہوشیار رہیں، مبادا آپ کو جنت سے باہر نکال دے؛ اگر ایسا ہوگیا تو آپ زحمت و مشقّت میں مبتلا ہوجائیں گے۔''[1]

کچھ روایات میں یہ بات آئی ہے کہ حضرت آدم علیہ السلام نے اس ممنوعہ درخت سے ہرگز نہیں کھایا، بلکہ اس درخت کے جیسے دوسرے درخت سے کھایا تھا۔ لہٰذا شیطان نے وسوسہ پیدا کرتے وقت کہا، خدا نے اس درخت سے آپ کو منع نہیں کیا

[1] سورۂ طٰہٰ، آیت ۱۱۷

https://downloadshiabooks.com/

یعنی دوسرے درخت سے منع کیا ہے:

"وَقَالَ مَا نَهٰكُمَا رَبُّكُمَا عَنْ هٰذِهِ الشَّجَرَةِ"[۱]

''خدا نے اس درخت سے آپ کو منع نہیں کیا''یعنی دوسرے درخت سے منع کیا ہے۔

اس نکتے کی طرف توجہ کرنا بھی ضروری ہے کہ قرآن کہتا ہے کہ ابلیس نے حضرت آدمؑ سے قسم کھاتے ہوئے کہا، میں آپ کا خیر خواہ ہوں اور بھلائی چاہتا ہوں، لہٰذا آپ اس درخت سے کچھ کھالیں:

"وَقَاسَمَهُمَآ اِنِّيْ لَكُمَا لَمِنَ النّٰصِحِيْنَ"[۲]

''اور ان دونوں سے قسم کھا کر کہا کہ بیشک میں تمہارے خیر خواہوں میں سے ہوں۔''

کیونکہ نہ آدمؑ نے اور نہ حواؑ نے اب تک جھوٹی قسم سنی تھی، اسی لیے اس کی جھوٹی قسم کے دھوکے میں آ گئے۔ البتہ اگر وہ غور و فکر سے کام لیتے تو شیطان کا جھوٹ سمجھ میں آ جاتا، کیونکہ اس سے پہلے خدا سے سن چکے تھے کہ شیطان اُن کا دشمن ہے اور دشمن کی قسموں پر یقین نہیں کرنا چاہیے اور دشمن کو اپنا خیر خواہ نہیں سمجھنا چاہیے۔

۳۔ وہ ممنوعہ درخت کیا تھا؟

جس درخت سے حضرت آدم علیہ السلام کو کھانے سے منع کیا تھا، وہ کسی عام درخت کی طرف اشارہ ہے یا معنوی اور اَخلاقی چیز ہے، اگر مادّی یا معنوی ہے تو کس درخت اور کون سی اَخلاقی صفت کی طرف اشارہ ہے۔ اس کے بارے میں مفسرین کے درمیان بحث و گفتگو ہے۔ اگر چہ حضرت امیر المومنینؑ کے اس خطبے میں اس چیز کی طرف (واضح) اشارہ نہیں ہے، لیکن ابلیس کا آدمؑ کو دھوکا دینا اور ان کو وسوسہ کرنے کی داستان کی طرف آپؑ نے اشارہ فرمایا ہے، اِس لیے مناسب ہے کہ بحث کی تکمیل کے لیے یہاں اس موضوع کے بارے میں مختصر بحث ہو۔

قرآن کریم میں چھے مقامات پر اس ممنوعہ درخت کی طرف اشارہ ہوا ہے، البتہ اس کی تشخیص کے بارے میں کوئی گفتگو نہیں ہوئی ہے، لیکن اسلامی روایات اور احادیث اور مفسرین کے کلام میں بہت سی بحثیں موجود ہیں، بعض نے اس کو گندم کے درخت سے تعبیر کیا ہے۔[۳]

اس بات کی طرف توجہ دینی چاہیے کہ عربی زبان میں شجر کا لفظ موٹے درختوں کے لیے اور نیز سبزیات اور چھوٹے

---

[۱] سورۂ اعراف: آیت ۲۰، تفسیر نور الثقلین جلد ۲، صفحہ ۱۱، حدیث ۳۴

[۲] سورۂ اعراف: آیت ۲۱

[۳] وَاَنْۢبَتْنَا عَلَيْهِ شَجَرَةً مِّنْ يَّقْطِيْنٍ، سورۂ صافات: آیت ۱۴۶

https://downloadshiabooks.com/

نہال کے لیے بھی استعمال ہوتا ہے۔ چنانچہ حضرت یونسؑ کی کہانی میں کدو، لوکی کے نہال کے لیے بھی شجر کا لفظ استعمال ہوا ہے، بعض نے شجر سے مراد انگور کی بیل اور بعض دیگر نے انجیر اور دوسروں نے خرما اور بعض نے کافور سے تعبیر کیا ہے۔ معنوی اعتبار سے بعض نے اس سے آل محمد علیہم السلام کے علوم مراد لیا ہے جبکہ بعض دیگر نے حسد مراد لیا ہے اور بعض مفسرین نے متعلق علم سے اس کی تفسیر کی ہے[۱]۔

حضرت امام علی بن موسیٰ الرضا علیہ السلام سے نقل شدہ ایک حدیث میں ہے کہ جب آپؑ سے اس درخت سے متعلق، وایات اور کلمات کے اختلافات کے بارے میں پوچھا تو آپؑ نے فرمایا: یہ سب باتیں صحیح ہیں، کیونکہ جنت کے درخت دنیا کے درختوں سے مختلف ہیں، وہاں پر کچھ درخت انواع واقسام کے پھلوں کے حامل ہیں۔ اس بات سے بڑھ کر جب خدا نے حضرت آدم علیہ السلام کو احترام واکرام سے نوازا اور فرشتوں نے ان کے لیے سجدہ کیا اور انھیں جنت میں جگہ دی گئی۔ حضرت آدمؑ نے دل میں سوچا کہ کیا خدا نے مجھ سے بہتر کوئی مخلوق خلق کی ہے؟ خدا نے محمدؐ وآلِ محمدؐ کے مقام ومرتبہ کو حضرت آدمؑ کے سامنے پیش کیا، جس پر حضرت آدمؑ کے دل میں تمنا ہوئی کہ کاش میں بھی اس مقام پر ہوتا۔[۲]

اس نکتے کا ذکر یہاں ضروری ہے کہ موجودہ تورات میں شجرِ ممنوعہ سے مراد شجرِ علم ودانش ہے (یعنی اچھائی اور بُرائی کی پہچان) اور اسے ہمیشہ رہنے والی زندگی سے بھی تعبیر کیا گیا ہے۔ خدا نے حضرت آدمؑ وحواؑ کو اس سے منع کیا تھا کہ مبادا وہ اس بات سے باخبر ہو جائیں اور وہ دونوں ہمیشہ رہنے والی زندگی حاصل کر کے خداؤں کی طرح بن جائیں۔[۳] یہ تعبیر واضح علامتوں میں سے ہے کہ موجودہ تورات اصلی نہیں ہے بلکہ کم علم وکم فہم افراد کے دماغ کا بنایا ہوا کلام ہے۔ یہ لوگ علم ودانش کو آدمؑ کے لیے عیب سمجھتے ہیں اور آدمؑ کو علم ودانش کے گناہ میں جنت سے راندہ درگاہ سمجھتے ہیں۔ گویا ان کی نظر میں جنت سمجھدار لوگوں کی جگہ نہیں ہے، البتہ کچھ اسلامی روایات اور احادیث میں شجرِ ممنوعہ کو علم ودانش کا درخت کہا گیا ہے۔ یہ روایات تحریف شدہ تورات سے لی گئی ہیں اور جعلی روایات ہیں۔

۴۔ حضرت آدم علیہ السلام کو توبہ کے لیے سکھائے گئے کلمات

امامؑ کے مذکورہ کلام میں ہم صرف اتنا پڑھتے ہیں کہ حضرت آدمؑ نے خدا سے رحمت کے کلمات لیے لیکن ان کلمات کی تشریح کے بارے میں کوئی بات سامنے نہیں آئی۔ قرآن کریم میں بھی اجمالی طور پر بیان ہوا ہے کہ جہاں صرف کلمات کے

---

[۱] تفسیر نور الثقلین، جلد ۱، صفحہ ۶۰، الدر المنثور، جلد ۱، ص ۵۲، ۵۳، سورۂ بقرۂ: آیت ۳۵ کے ذیل میں رجوع کریں۔

[۲] نور الثقلین، جلد ۱، ص ۶۰ (خلاصے کے ساتھ)

[۳] تورات سفرِ تکوین، فصل دوّم، نمبر شمار ۱۷

https://downloadshiabooks.com/

لینے کا ذکر ہے۔ البتہ یہ بھی طے ہے کہ یہ کلمات بہت اہم مطالب پر مشتمل تھے۔ چنانچہ بعض نے کہا ہے کہ ان کلمات سے مراد خدا کے سامنے گناہوں کا اقرار ہے، جو قرآن کریم کے سورۂ اعراف میں بیان ہوا ہے:

"رَبَّنَا ظَلَمْنَآ أَنفُسَنَا وَإِن لَّمْ تَغْفِرْ لَنَا وَتَرْحَمْنَا لَنَكُونَنَّ مِنَ الْخَاسِرِينَ"[۱]

''خدایا ہم نے اپنے اوپر ظلم کیا ہے اگر تو ہمیں معاف نہیں کرے گا اور رحم نہیں کرے گا تو یقیناً ہم نقصان اُٹھانے والوں میں سے ہوں گے۔''

بعض نے اسی گناہ کے اقرار اور بخشش طلب کرنے کو دوسری عبارت میں نقل کیا ہے:

"لَآ اِلٰهَ اِلَّآ اَنْتَ سُبْحَانَكَ وَ بِحَمْدِكَ عَمِلْتُ سُوْءً ا وَ ظَلَمْتُ نَفْسِيْ فَاغْفِرْ لِيْ اِنَّكَ خَيْرُ الْغَافِرِيْنَ"[۲]

اسی مضمون کی کچھ روایات حضرت امام محمد باقر علیہ السلام اور حضرت امامِ صادق علیہ السلام سے نقل شدہ موجود ہیں[۳] لیکن بہت سی احادیث میں ان کلمات سے مراد پنجتن پاکؑ (محمدؐ و علیؑ و فاطمہؑ و حسنؑ و حسینؑ) ہیں۔ چنانچہ کتاب خصال میں ابن عباسؓ پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے پوچھتے ہیں کہ حضرت آدمؑ نے خدا سے جو دریافت کیا تھا، وہ کیا چیز تھی؟

پیغمبر اکرمؐ نے فرمایا:

"سَاَلَهٗ بِحَقِّ مُحَمَّدٍ وَ عَلِيٍّ وَ فَاطِمَةٍ وَ الْحَسَنِ وَ الْحُسَيْنِ اِلَّا تَابَ عَلَيْهِ فَتَابَ اللهُ عَلَيْهِ اِنَّهٗ هُوَ التَّوَّابُ الرَّحِيْمُ"

حضرت آدمؑ نے پنجتن پاکؑ کے وسیلے سے خدا سے چاہا کہ ان کی توبہ قبول ہو جائے اور خدا نے ان کی توبہ قبول فرمائی، یقیناً وہ بڑا ہی توبہ قبول کرنے والا مہربان ہے۔''[۴]

یہ بات قابلِ ذکر ہے کہ یہی معنی کچھ اختلاف کے ساتھ مشہور تفسیر الدّرالمنثور میں جو کہ اہل سنّت کی تفسیر بالروایت ہے، نقل ہوئی ہے۔[۵]

ایک اور روایت میں حضرت امام حسن عسکری علیہ السلام کی تفسیر سے نقل ہوا ہے کہ جب حضرت آدم علیہ السلام غلطی کا شکار

---

[۱] سورۂ اعراف، آیت ۲۳

[۲] بحارالانوار: جلد ۱۱، ص ۱۸۱

[۳] تفسیر نورالثقلین: ج ۱، ص ۶۸

[۴] کتاب خصال تفسیر نورالثقلین: جلد ۱، صفحہ ۶۰

[۵] تفسیر الدرالمنثور: جلد ۱، ص ۶۰ سورۂ بقرہ: آیت ۳۷ کے ذیل میں۔

https://downloadshiabooks.com/

ہوئے اور خدا کی درگاہ سے معافی مانگی اور عرض کیا: پروردگارا، میری توبہ قبول کر اور میرا عذر مان کہ میں اس غلطی کے بُرے اثرات سے مکمل طور پر آگاہ ہو گیا ہوں، خدا نے فرمایا کیا تمہیں یاد نہیں ہے کہ میں نے تمہیں حکم دیا تھا کہ مشکلات و سختیوں اور خطرناک حادثوں میں محمدؐ اور اُن کی آلؑ کے وسیلے سے مجھے پکارو۔ آدمؑ نے عرض کیا، اے میرے خدا! ہاں، مجھے یاد ہے، خدا نے فرمایا وہ لوگ محمدؐ، علیؑ و فاطمہؑ و حسنؑ و حسینؑ ہیں، لہٰذا مجھے ان کے ناموں کے وسیلے سے پکارو تاکہ میں تمہاری درخواست منظور کروں اور تمہیں تمہاری خواہش سے بڑھ کر دوں۔ [۱] ایک اور حدیث میں حضرت عائشہ نے پیغمبر اکرمؐ سے نقل کیا ہے کہ وہ کلمات درحقیقت مندرجہ ذیل دعا تھی:

"اَللّٰھُمَّ اِنَّکَ تَعْلَمُ سِرِّیْ وَ عَلَانِیَتِیْ فَاقْبَلْ مَعْذِرَتِیْ وَ تَعْلَمُ حَاجَتِیْ فَاَعْطِنِیْ سُؤْلِیْ وَ تَعْلَمُ مَا فِیْ نَفْسِیْ فَاغْفِرْلِیْ ذَنْبِیْ اَللّٰھُمَّ اِنِّیْٓ اَسْاَلُکَ اِیْمَانًا یُبَاشِرُ قَلْبِیْ وَ یَقِیْنًا صَادِقًا حَتّٰی اَعْلَمَ اَنَّہٗ لَا یُصِیْبُنِیْٓ اِلَّا مَا کَتَبْتَ لِیْ وَ ارْضِنِیْ بِمَا قَسَمْتَ لِیْ"۔ [۲]

ان تمام روایات میں کوئی تضاد نہیں ہے، کیوں کہ یہ ممکن ہے کہ حضرتِ آدمؑ نے پنجتن پاکؑ کے ناموں سے توسّل کرنے کے ساتھ مذکورہ دعائیں بھی پڑھی ہوں۔ بعض افراد نے مذکورہ مطالب کو حضرتِ آدمؑ کے معنوی و اندرونی حالات سے تعبیر کیا ہے۔ البتہ حضرت آدمؑ کا ان کلمات کو حاصل کرنے سے پہلے ان سے بے خبر ہونا حضرت آدمؑ کا تمام اسماء کے عالم ہونے سے منافات نہیں رکھتا، کیونکہ قوی احتمال یہ ہے کہ اسماء کے بارے میں جاننے سے مراد کائنات کی خلقت کے رازوں سے باخبر ہونا ہے، لیکن اپنی خودسازی اور غلطیوں کا ازالہ کرنا اور خدا کی طرف سیر و سلوک کرنا وغیرہ ایک الگ مرحلہ ہے۔

بارہواں حصّہ

وَ اصْطَفٰی سُبْحَانَہٗ مِنْ وَلَدِہٖ أَنْبِیَاءَ أَخَذَ عَلَی الْوَحْیِ مِیثَاقَھُمْ وَ عَلٰی تَبْلِیغِ الرِّسَالَۃِ أَمَانَتَھُمْ لَمَّا بَدَّلَ أَکْثَرُ خَلْقِہٖ عَھْدَ اللّٰہِ إِلَیْھِمْ فَجَھِلُوْا حَقَّہٗ وَ اتَّخَذُوا الْأَنْدَادَ مَعَہٗ وَ اجْتَالَتْھُمُ الشَّیَاطِیْنُ عَنْ مَعْرِفَتِہٖ وَ اقْتَطَعَتْھُمْ عَنْ عِبَادَتِہٖ فَبَعَثَ فِیْھِمْ رُسُلَہٗ وَ وَاتَرَ إِلَیْھِمْ أَنْبِیَاءَہٗ لِیَسْتَأْدُوْھُمْ مِیْثَاقَ فِطْرَتِہٖ وَ یُذَکِّرُوْھُمْ مَنْسِیَّ نِعْمَتِہٖ وَ یَحْتَجُّوْا عَلَیْھِمْ بِالتَّبْلِیغِ وَ یُثِیْرُوْا لَھُمْ دَفَائِنَ الْعُقُوْلِ وَ یُرُوْھُمْ آیَاتِ الْمَقْدِرَۃِ مِنْ سَقْفٍ فَوْقَھُمْ مَرْفُوْعٍ وَ مِھَادٍ تَحْتَھُمْ مَوْضُوْعٍ وَ مَعَایِشَ تُحْیِیْھِمْ وَ آجَالٍ

---

[۱] شرح نہج البلاغہ مرحوم خوئی: جلد ۲ صفحہ ۱۱۸

[۲] تفسیر الدر المنثور، جلد ۱ ص ۵۹

https://downloadshiabooks.com/

تُفْنِيهِمْ وَ أَوْصَابٍ 53 تُهْرِمُهُمْ وَ أَحْدَاثٍ [تَتَتَابَعُ] تَتَابَعُ عَلَيْهِمْ وَلَمْ يُخْلِ اللهُ سُبْحَانَهُ خَلْقَهُ مِنْ نَبِيٍّ مُرْسَلٍ أَوْ كِتَابٍ مُنْزَلٍ أَوْ حُجَّةٍ لَازِمَةٍ أَوْ مَحَجَّةٍ قَائِمَةٍ رُسُلٌ لَا تُقَصِّرُ بِهِمْ قِلَّةُ عَدَدِهِمْ وَ لَا كَثْرَةُ الْمُكَذِّبِينَ لَهُمْ مِنْ سَابِقٍ سُمِّيَ لَهُ مَنْ بَعْدَهُ أَوْ غَابِرٍ عَرَّفَهُ مَنْ قَبْلَهُ عَلَى ذَلِكَ نَسَلَتِ الْقُرُونُ وَ مَضَتِ الدُّهُورُ وَ سَلَفَتِ الْآبَاءُ وَ خَلَفَتِ الْأَبْنَاءُ.

”اس کے بعد اُس نے ان کی اولاد میں سے اُن انبیاءؑ کا انتخاب کیا، جن سے وحی کی حفاظت اور پیغام کی تبلیغ کی امانت کا عہد لیا، اس لیے کہ آخری مخلوقات نے عہدِ الٰہی کو تبدیل کر دیا تھا؛ اُس کے حق سے ناواقف ہو گئے تھے؛ اُس کے ساتھ دوسرے خدا بنا لیے تھے اور شیطان نے انہیں معرفت کی راہ سے ہٹا کر عبادت سے یکسر جدا کر دیا تھا۔ پروردگار نے ان کے درمیان رسول بھیجے؛ انبیاءؑ کا تسلسل قائم کیا تا کہ وہ ان سے فطرت کی امانت کو واپس لیں اور انہیں بھولی ہوئی نعمت پروردگار کو یاد دلائیں؛ تبلیغ کے ذریعے ان پر اتمامِ حجت کریں اور ان کی عقل کے دفینوں کو باہر لائیں اور انہیں قدرت الٰہی کی نشانیاں دکھلائیں۔ یہ سروں پر بلند ترین چھت، یہ زیرِ قدم گہوارہ، یہ زندگی کے اسباب، یہ فنا کرنے والی اجل، یہ بوڑھا بنا دینے والے امراض اور یہ پے در پے پیش آنے والے حادثات۔ اُس نے کبھی اپنی مخلوقات کو نبی مرسل یا کتاب منزل یا حجت لازم یا طریق واضح سے محروم نہیں رکھا ہے۔ ایسے رسول بھیجے ہیں، جنہیں نہ عدد کی قلّت کام سے روک سکتی تھی اور نہ جھٹلانے والوں کی کثرت۔ ان میں جو پہلے تھا اسے بعد والے کا حال معلوم تھا اور جو بعد میں آیا اسے پہلے والے نے آگاہ کر دیا تھا اور یوں ہی صدیاں گزرتی رہیں اور زمانے بیتتے رہے۔ اور آباء واجداد جاتے رہے اور اولاد واحفاد آتے رہے۔

شرح وتفسیر

پیغمبروں کی بعثت اور ان کی عظیم ترین ذمّے داریاں

مولا علیؑ کے اس کلام میں بعثتِ انبیاؑ کی طرف توجہ دلائی گئی ہے۔ دراصل حضرت آدم علیہ السلام کی خلقت کے بعد دوسرا مرحلہ بعثتِ انبیاؑ کا ہے۔ اس حصّے میں آپؑ بعثتِ انبیاؑ کے بارے میں گفتگو فرماتے ہیں۔

پھر اُن کی دعوت کی کیفیت کی طرف اشارہ فرماتے ہیں اور تیسرے مرحلے میں ان کی تعلیمات کے بارے میں گفتگو ہے اور آخر میں انبیاؑ کی خصوصیات، انھوں نے مشکلات کے مقابل کس طرح استقامت کا مظاہرہ کیا اور ان کا ایک دوسرے سے کیسا رابطہ تھا، اس پر گفتگو کی ہے۔

https://downloadshiabooks.com/

پہلے مرحلے میں فرماتے ہیں:

"وَ اصْطَفٰى سُبْحَانَهُ مِنْ وَلَدِهِ اَنْبِيَاءَ اَخَذَ عَلَى الْوَحْيِ مِيْثَاقَهُمْ [۱] وَ عَلٰى تَبْلِيْغِ الرِّسَالَةِ اَمَانَتَهُمْ"

"خداوندِ سبحان نے اولادِ آدمؑ میں سے پیغمبروں کو چُنا اور اُن سے عہد لیا کہ وحیِ الٰہی کو محفوظ رکھیں گے اور رسالت جو ایک امانت ہے، لوگوں تک پہنچائیں گے۔"

اس بنا پر آغازِ وحی میں انھوں نے خدا سے عہد کیا کہ وحی کو امانت جانتے ہوئے بندگانِ خدا تک ابلاغ کریں گے اور انھوں نے اس عظیم عطا کے مقابل اس عظیم ذمّے داری کو قبول کیا۔ البتہ یہ کہ کس طرح خداوند عالم نے ایک خاص گروہ کو منتخب کیا اور وحی کی حقیقت کیا ہے، کس طرح بعض پر وحی ہوتی ہے، بعض پر نہیں ہوتی؟ اس طرح کے مسائل کو اپنے مقام پر بیان کیا جائے گا۔[۲]

"وَإِذْ أَخَذْنَا مِنَ النَّبِيِّيْنَ مِيْثَاقَهُمْ وَمِنْكَ وَمِنْ نُّوْحٍ وَّإِبْرَاهِيْمَ وَمُوْسٰى وَعِيْسَى ابْنِ مَرْيَمَ وَأَخَذْنَا مِنْهُمْ مِّيْثَاقًا غَلِيْظًا"[۳]

"یاد کرو، جب پیغمبروں سے عہد لیا (اسی طرح) تم سے نوحؑ سے ابراہیمؑ و موسیٰؑ و عیسیٰؑ بن مریمؑ، اور ہم نے ان سب سے عہد لیا کہ اس تبلیغ و رسالت کی ذمّے داریوں میں کوتاہی نہ کرنا۔"

پھر بعثتِ انبیاءؑ کی اصل دلیل کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

"لَمَّا بَدَّلَ اَكْثَرُ خَلْقِهِ عَهْدَ اللهِ اِلَيْهِمْ فَجَهِلُوْا حَقَّهُ، وَ اتَّخَذُوا الْاَنْدَادَ[۴] مَعَهُ، وَ اجْتَالَتْهُمُ[۵] الشَّيَاطِيْنُ عَنْ مَعْرِفَتِهِ، وَ اقْتَطَعَتْهُمْ عَنْ عِبَادَتِهِ"

---

[۱] بنا بر صحاح اللغۃ میثاق مادّہ وثوق سے بمعنی اعتماد اور اطمینان ہے، جو کسی پر اُس کی امانت داری کی وجہ سے کیا جائے۔ (اصل میں موثاق تھا واوٗ یاء میں بدل گیا)۔

[۲] تفسیر موضوعی (پیامِ قرآن) کی طرف رجوع کریں جلد ۷، ص ۳۱۷

[۳] سورۂ احزاب، آیت ۷

[۴] "انداد" جمع "نِد" بروزن ضد، بمعنی مثل ہے، لیکن اصل مادّہ جیسا کہ مقائیس اور دوسرے کہتے ہیں بہ معنی جدا کرنا، فرار کرنا کے ہیں۔ اہلِ لغت کہتے ہیں "ند" ہر طرح کی مثل کو نہیں کہتے بلکہ اسے کہتے ہیں جو آثار اور اعمال میں راہِ مخالفت کو اختیار کرے۔ جس طرح انسان دوسرے انسان کی مثل ہے لیکن اُس کے ساتھ حالتِ جنگ میں نہیں ہے۔

[۵] اجتال، جولان سے ہے دوران کے معنی میں۔ امام علیؑ کے کلام میں "عن" کے ساتھ ذکر ہوا ہے، جس کا مفہوم جولان دینا اور کسی چیز کو واپس پلٹانا ہے۔ ممکن ہے یہ معنی و مفہوم ہو کہ ہر زمانے میں ان کو اس سے دور لے جائے۔

https://downloadshiabooks.com/

''یہ اُس وقت ہوا جب خدا نے اکثر لوگوں سے عہد لیا، مگر وہ پھر گئے اور اُس کے حق کو نہیں پہچانا اور اُس کے شریک کے قائل ہو گئے، شیطانوں نے انھیں معرفتِ خدا سے دور رکھا۔ انھیں ہر طرف کھینچا اور عبادت واطاعت سے دور رکھا۔''

حقیقت میں خدا کی عدم شناخت سبب بنی، جو شرک کے ہولناک درجے میں گرے اور شیطانوں نے انھیں گھیر لیا۔ اور اطاعت اور عبادت خدا سے انھیں روکا۔ وعدہ اور عہدِ الٰہی سے مقصود کیا ہے؟ نہج البلاغہ کے بہت سے شارحین نے عالم ذر کی طرف اشارہ کیا کہ ممکن ہے وہاں خدا نے وعدہ لیا ہو۔ وعدۂ فطرت ہو، کیونکہ امام علیہ السلام بعد کے جملوں میں اس حوالے سے گفتگو فرماتے ہیں۔ [۱] ایک دوسری تعبیر کے مطابق خداوند عالم نے انسان کو پاک فطرت پر خلق کیا اور اندرونی طور پر حقیقتِ توحید سے آشنا کیا ہے۔ لہٰذا یہ نیکیوں سے محبت اور برائیوں سے نفرت رکھتا ہے۔ اگر یہ پاک فطرت باقی رہ جائے تو خدا کے کتنے الطاف وعنایات ہیں، جو اس پر ظاہر ہوں اور وہ کمال کی طرف گامزن ہو۔ انبیاؑ اس کے مددگار رہوں اور اس کی ذمّے داریوں کا وزن ہلکا ہو جائے۔

لیکن فطرت سے انحراف چاہے عقیدۂ توحید میں ہو، جس کا نتیجہ شرک وبت پرستی ہے، چاہے عملی اعتبار سے ہو، جس کا نتیجہ اپنے آپ کو ہوا وہوس کے سپرد کر دینا ہے اور شیاطین کے حوالے کر دینا ہے، یہی سبب بنا کہ خدا نے بہت سے انبیاءؑ کو بہت اہم ذمّے داریاں دے کر معاشرے میں بھیجا، دوسرے حصّے میں امامؑ نے ان کی اَخلاقی وعملی خصوصیات کے بارے میں اشارہ کیا ہے۔

پھر بعثتِ انبیاءؑ کے فلسفے کی طرف اشارہ فرمایا:

''فَبَعَثَ فِیۡہِمۡ رُسُلَهٗ وَ وَاتَرَ اِلَیۡہِمۡ [۲] اَنۡبِیَاءَهٗ لِیَسۡتَاۡدُوۡهُمۡ مِیۡثَاقَ فِطۡرَتِهٖ، وَ یُذَکِّرُوۡهُمۡ مَنۡسِیَّ نِعۡمَتِهٖ، وَ یَحۡتَجُّوۡا عَلَیۡہِمۡ بِالتَّبۡلِیۡغِ، وَ یُثِیۡرُوۡا لَهُمۡ دَفَائِنَ الۡعُقُوۡلِ''

''خداوند عالم نے انسانوں کے درمیان انبیاءؑ مبعوث فرمائے اور رسولوں کو ایک کے بعد ایک بھیجا تاکہ وہ فطرت کے وعدے کا ان سے مطالبہ کریں اور خدا کی وہ نعمتیں جن کو بھلا دیا ہے، یاد دلائیں۔ خدا کے احکامات کو ان تک پہنچا کر اتمامِ حجت کریں اور عقلوں کے پوشیدہ خزانے ان کے لیے آشکار کریں۔''

---

[۱] عالمِ ذر سے متعلق گفتگو میں یہ احتمال ممکن ہے، اس کی تفسیر میں وہی مسائلِ فطری اور وہی استعداد مراد ہو، جو خدا نے دی ہے۔ مزید تفصیلات کے لیے تفسیر نمونہ، جلد ۷، ص ۴ پر رجوع کریں۔

[۲] ''واتر'' مادّہ ''وتر'' سے ہے بمعنی فرد جو مقابل شفع (زوج) کے ہے۔ یہاں واحد کے معنی میں آیا ہے یعنی پیغمبرؑ ایک کے بعد ایک ہدایت کے لیے آئے، بعض کہتے ہیں ایک کے پیچھے ایک فاصلے کے ساتھ آئے۔ (واتر ما علیہ من الصّوم) یعنی ایک دن روزہ رکھا ایک دن افطار کیا۔ یہ متدارک کے مقابل ہے، یعنی بغیر فاصلے کے ایک کے پیچھے ایک کا آنا۔

https://downloadshiabooks.com/

یہاں امامؑ نے انبیاءؑ کے بعثت کے پانچ اہم ترین اہداف کی طرف اشارہ کیا ہے:

پہلا: فطری عہد و پیمان کا مطالبہ ہے۔ خداوند متعال نے توحید کے عقیدے کو انسان کی فطرت میں قرار دیا۔ اگر انسان اس فطرت کو ضائع نہ کرے اور اس سالم فطرت کے ساتھ پرورش پائے اور غلط تربیت اس کو منحرف نہ کرے، مشرک والدین اس کی روح کو آلودہ نہ کریں تو یہ انسان فطرتاً توحید پرست رہے گا اور اس فطرت کے سائے میں حق وعدالت کا پابند رہے گا، گویا اس لیے پیغمبر آتے ہیں کہ وہ افراد جو منحرف ہیں، ان کو فطرتِ توحید کی طرف پلٹائیں۔

دوسرا: وہ نعمتیں جن کو بھلا دیا ہے، یاد دلائیں۔ انسان کے وجود میں مادّی اور معنوی نعمتیں بہت ہیں۔ اگر ان سے صحیح فائدہ اٹھائیں تو یہ انسان سعادت وخوش بختی کے محل ان کی بنیاد پر استوار کرسکتا ہے لیکن ان نعمتوں کا بھلا دینا سبب بنتا ہے کہ ان نعمتوں سے محروم ہوجائے۔ بالکل اسی طرح، جس طرح ایک باغبان صحیح وقت پر پانی نہ دینے کی وجہ سے صحیح موقع پر پھل نہیں اتار سکتا، لہٰذا جب کوئی آکر اس نعمت کو یاد دلائے جو وہ بھلا بیٹھا ہے تو اس نے اس کی بہت بڑی خدمت کی ہے۔ گویا وہ کام انبیاءؑ نے کیا۔

تیسرا: عقلی استدلال کے ذریعے حجت تمام کریں اور آسمانی تعلیمات اور ارشاداتِ الٰہی کو انسانوں تک پہنچائیں۔

چوتھا: علمی خزانوں کو جو عقلِ انسان میں رکھے ہوئے ہیں، انھیں ظاہر وآشکار کرنا، کیوں کہ اللہ نے عظیم اور قیمتی خزانے انسان کی عقل میں قرار دیے ہیں، اگر وہ ظاہر ہوں تو علوم اور معرفت میں ایک خاص ترقی ہوگی لیکن غفلت اور غلط تعلیمات اور گناہوں کی آلودگی ان پر پردہ ڈال دیتی ہے اور ان کو چھپا دیتی ہے۔ پیغمبرؐ اِن پردوں کو ہٹاتے ہیں اور اُس خزانوں کو آشکار کرتے ہیں۔

پانچواں:

"وَيُرُوهُمْ آيَاتِ الْمَقْدِرَةِ"

"خدا کی قدرت کی نشانیوں کو ان کے سامنے بیان کریں۔"

پھر امامؑ ان آیات (نشانیوں) کی تفسیر کرتے ہیں:

"مِنْ سَقْفٍ فَوْقَهُمْ مَرْفُوعٍ، وَمِهَادٍ تَحْتَهُمْ مَوْضُوعٍ، وَ مَعَايِشَ تُحْيِيهِمْ، وَآجَالٍ تُفْنِيهِمْ،

https://downloadshiabooks.com/

وَاَوْصَابٍ[۱] **تُهْرِمُهُمْ،**[۲] **وَاَحْدَاثٍ تَتَابَعُ عَلَيْهِمْ**"

''آسمان کی چھت جو ان کے اُوپر ہے، یہ زمین کا گہوارہ جو ان کے پیروں کے نیچے ہے، اور وہ وسائلِ زندگی جن سے اُن کی حیات وابستہ ہے، وہ آخری لمحۂ حیات اور اجل جو انھیں ختم کردے گی، وہ مشکلات اور پریشانیاں جو بوڑھا کر دیتی ہیں اور وہ پے درپے آنے والے حادثات جن کا انہیں سامنا کرنا پڑتا ہے۔''

حقیقت یہ ہے کہ یہ امور یعنی اسرارِ خلقت، آسمان و زمین، وسائل و اسباب زندگی اور اسی طرح وہ عوامل جو موت، درد و الم کا باعث ہیں، انسان کو خدا کی یاد دلاتے ہیں۔ اسی طرح وہ مختلف حوادث جو عبرت اور انسان کی بیداری کا سبب ہیں، ان کے ذریعے معرفت کی سطح بلند ہوتی ہے اور اُس کی بیداری و آگاہی میں اضافہ ہوتا ہے یا وہ خوابِ غفلت سے بیدار ہوتا ہے۔

"**وَلَمْ يُخْلِ اللّٰهُ سُبْحَانَهُ خَلْقَهُ مِنْ نَبِيٍّ مُرْسَلٍ، اَوْ كِتَابٍ مُنْزَلٍ، اَوْ حُجَّةٍ لَازِمَةٍ، اَوْ مَحَجَّةٍ قَائِمَةٍ**"

''خداوند سبحان نے کبھی انسانی معاشرے کو رسولؐ و پیغمبرؑ، کتابِ آسمانی، دلیلِ قاطع اور روشن راستے سے خالی نہیں چھوڑا۔''

درحقیقت یہ عبارت چار موضوعات کی طرف اشارہ کر رہی ہے۔ ان میں سے ایک یا کچھ خلقِ خدا میں موجود ہیں اور اس طرح سے اتمامِ حجت ہو رہا ہے:

پہلا: انبیائے کرامؑ کا ہونا چاہیے۔ آسمانی کتاب ان کے ہمراہ ہو یا نہ ہو، کیونکہ نبی کا وجود ہر حالت میں ہدایت و بیداری اور اتمامِ حجّت کا سبب ہے۔

دوسرا: آسمانی کتابیں ہیں، جو مختلف امّتوں کے پاس موجود ہیں، چاہے ان کے لانے والے اس دنیا سے چلے گئے ہوں۔

تیسرا: امام اور اوصیاء جو معصوم اوصیاء ہیں، جن کو ''حجتِ لازمہ'' سے تعبیر کیا گیا ہے، لیکن بعض نے احتمال دیا ہے کہ اس سے مراد دلیل عقلی ہے، جبکہ عقلی دلیل تنہا ہدایت کے لیے کافی نہیں، اس لیے یہ احتمال بہت بعید ہے، لیکن اس میں بھی کوئی مضائقہ نہیں کہ دونوں مفہوم اس عبارت میں جمع ہو گئے ہوں۔

چوتھا: سنتِ انبیاءؑ و ائمہؑ اور اوصیاءؑ ہے جسے "**مَحَجَّةٍ قَائِمَةٍ**" کہا گیا ہے۔ "**مَحَجَّةٍ**" لغت میں واضح اور سیدھے

---

[۱] اوصاب مادّۂ وصب سے ہے۔ مفردات کے بقول دائمی بیماری مراد ہے یعنی واصب، ہر وہ چیز جو دائمی ہو، اُس پر اطلاق ہوتا ہے امامؑ کے کلام میں بھی مشکلات و غم جو ہمیشہ ہوں، کے معنیٰ میں استعمال ہوا ہے۔

[۲] تہرمهم، ''هرم'' کے مادّے سے ہے، (بروزنِ حرم)، یعنی ایسی ضعیفی جو بالکل کام کرنے سے معذور کردے۔

https://downloadshiabooks.com/

راستے کے لیے استعمال ہوتا ہے۔ چاہے وہ ظاہری ہو یا معنوی، وہ راہ جو انسان کو اس کے مقصود تک پہنچادے۔[1]

اس طرح خدا نے تمام امتوں، قوموں اور تمام زمانوں کے لیے اتمامِ حجت کیا ہے اور اسبابِ ہدایت عطا فرمانے میں کوئی کمی نہیں رکھی۔ پھر انبیائے کرامؑ کی خصوصیات کو بیان فرماتے ہیں:

"رُسُلٌ لَا تُقَصِّرُ بِهِمْ قِلَّةُ عَدَدِهِمْ، وَلَا كَثْرَةُ الْمُكَذِّبِيْنَ لَهُمْ"

''پیغمبروں کو افراد کی کمی اور دشمنوں کی زیادتی، جھٹلانے والوں کی موجودگی نے اپنی ذمے داریوں کو پورا کرنے سے نہیں روکا۔''

ہاں وہ بلند حوصلہ انسان تھے جو اکیلے ہزار ہزار افراد کے مقابلے میں کھڑے ہو جاتے تھے۔ آگ کے دریا میں جا کر بھی اللہ کی تائید سے سالم نکل آتے۔ بت خانوں کو نابود کرنے اور بت پرستوں کے غیظ و غضب کے سامنے دلائلِ قاطع کے ساتھ کھڑے رہتے، ان کو شرمسار کرتے، دریا میں جاتے اور دوسری سمت سے باہر نکل آتے، کبھی ایسے دشمنوں کے باوجود، جو برہنہ تلواروں کے ساتھ ان کا محاصرہ کر لیتے، ان کے چہرے پر شکن بھی نہ آتی۔ قابلِ توجہ بات یہ ہے کہ پیغمبروں کی معرفت کے بارے میں فرماتے ہیں:

"مِنْ سَابِقٍ سُمِّيَ لَهُ مَنْ بَعْدَهُ، أَوْ غَابِرٍ[2] عَرَّفَهُ مَنْ قَبْلَهُ"

''بعض پیغمبروں کی بشارت دی گئی یا دوسرے پیغمبروں کے ذریعے ان کی شناخت کروائی گئی۔''

اس عبارت میں انبیاءؑ کی شناخت کی اہم ترین روش کو بتایا گیا ہے اور وہ یہ ہے کہ گزشتہ نبی نے آنے والے نبی کا تعارف کرایا اور بعد میں آنے والوں نے پچھلوں کی تصدیق کی۔

آخر میں فرماتے ہیں:

"عَلَى ذٰلِكَ نَسَلَتِ[3] الْقُرُوْنُ، وَمَضَتِ الدُّهُوْرُ، وَسَلَفَتِ الْآبَاءُ، وَخَلَفَتِ الْأَبْنَاءُ"

''صدیاں گزر گئیں، زمانے بیت گئے، آباء و اجداد اس دنیا سے چلے گئے، ان کی اولادیں ان کی جانشین بن گئیں۔''

---

[1] التحقیق فی کلمات القرآن الکریم مادہ حج۔ (۲) غابر کا مادّہ غبار اور غبور سے ہے یعنی ہر وہ چیز جو باقی بچ جائے۔ لہٰذا پستان میں باقی ماندہ دودھ کو غیرۃ کہتے ہیں۔ فضا میں موجود خاک کو غبار کہتے ہیں۔

[2] گزرے ہوئے زمانے اور افراد کو غابر کہتے ہیں (مقائیس، مفردات، لسان العرب)

[3] نسلت القرون میں مادّے نسل یعنی افزائش نسل پہ کنایہ ہے، اس سے کہ قرن ایک کے پیچھے ایک آرہے ہیں ہر قرن دوسرے قرن سے پیدا ہوتا ہے جیسے فرزند و پدر ہوتے ہیں۔

https://downloadshiabooks.com/

نکات

۱۔ پیغمبرؐ باغبان کی مانند ہیں

ایک خوبصورت تعبیر جو اس کلام امامؑ میں بیان ہوئی ہے کہ خداوند عالم نے تمام نیکیوں اور خوش بختیوں کی استعداد انسان میں رکھی ہے، گویا اس کے وجود میں قیمتی و گراں بہا معدن و خزانے رکھے ہیں۔ اس کے اندر مختلف انواع کے معطر پھول اور پھل، مختلف فضائل کی صورت میں قرار دیے ہیں۔ انبیائے کرامؑ جو عظیم باغبان ہیں، ان بیجوں کو پانی دیتے ہیں اور ان کی پرورش کرتے ہیں اور یہ آسمانی معدن شناس اس کے وجود کے خزانے سے صلاحیتوں کو اجاگر کرتے ہیں اور بعد والے انبیاءؑ اُن کے ذریعے آگاہ کیے گئے۔ [۱]

"لِيَسْتَأْدُوهُمْ مِيثَاقَ فِطْرَتِهِ وَيُذَكِّرُوهُمْ مَنْسِيَّ نِعْمَتِهِ۔۔ وَيُثِيرُوا لَهُمْ دَفَائِنَ الْعُقُولِ"

''اور انسان اس جوہر کے خزانوں سے جو اس کے وجود کو آشکار کرتا ہے اور اپنی ذاتی صلاحیتوں کی نعمت جو ان کے اندر چھپی ہوئی ہے، کی قدر و قیمت سے غافل ہے۔''

انبیاءؑ انہی چیزوں کی یاد دہانی کراتے ہیں۔ اس بنا پر نبی انسان کو وہ چیز نہیں دیتے جو اس میں نہیں ہے بلکہ جو چیز اس کے اندر موجود ہے، اُس کی پرورش کرتے ہیں اور اس کے گوہر کو آشکار کرتے ہیں۔ بقول شاعر

گوہر خود را هویدا کن   کمال این است و بس

''اپنے اندر چھپے ہوئے گنجینہ کو ظاہر کر یہی کمال ہے۔''

خویش را در خویش پیدا کن   کمال این است و بس

''خود کو اپنی ذات کے اندر (خودی کو خودی میں) تلاش کر، یہی کمال ہے۔''

بعض معتقد ہیں کہ وہ تمام تعلیمات جو انسان کو دی جاتی ہیں، وہ سب یاد دہانی کی خاطر ہیں، کیوں کہ تمام علوم کی جڑیں انسان کے اندر پوشیدہ ہیں اور معلّم انسان یعنی انبیائے کرام علیہم السلام اور ان کے پیروکار اپنی تعلیمات سے انسان کے اندر موجود علمی صلاحیتوں کو اجاگر کرتے ہیں، گویا تمام علوم زیر زمین پانی کے خزانوں کی طرح ہیں، جنہیں زمین کھود کر یا بو اور رنگ کے ذریعے شناخت کر کے سطح زمین پر لایا جاتا ہے۔ قرآنی آیات میں "تَذَكُّر" کی مثال:

---

[۱] بعض نسخوں میں مسمی مجہول لکھا گیا، یہ عبارت اس نسخے کے مطابق ہے جہاں فعل معلوم ہو۔

https://downloadshiabooks.com/

"لَعَلَّهُمْ يَتَذَكَّرُوْنَ...وَذَكِّرْ فَإِنَّ الذِّكْرٰى تَنْفَعُ الْمُؤْمِنِيْنَ"

علوم پانی کے چشموں کی طرح انسان کے اندر موجود ہیں اور اسے یاد دہانی کے ذریعے ظاہر وعیاں کیا جاتا ہے۔یہ مذکورہ مطلب کے لیے ایک شاہد کی حیثیت رکھتا ہے،اس بارے میں گفتگو بہت طویل ہے،لیکن یہ اس کے بیان کا محل نہیں۔

۲۔وہ حادثات جو بیدار کرتے ہیں

مندرجہ بالا کلام میں اس طرف اشارہ ہوا ہے کہ انبیاؑ تعلیم وتربیت کے علاوہ اس عالم میں انسان کا مقام،اُس کوان حادثات کی جانب جو اُس کی بیداری کا سبب بنتے ہیں متوجہ کرتے ہیں۔زندگی کا اختتام مادّی نعمتوں کی فنا،رنج وغم،عبرت انگیز حادثات،یہ تعبیریں دردناک حادثات کے فلسفے کو انسانی زندگی میں آشکار کرتی ہیں۔اگر یہ نہ ہوں تو انسان اُس خواب غفلت میں رہتا،جس سے بیدار ہونا مشکل ہوتا۔[1]

۳۔انسانی زندگی میں دِین کا کردار

امامؑ اس حصّے میں بہت پُر معنی انداز میں انسانی زندگی میں دین کا کردار بیان کرتے ہیں اور آپؑ نے بتایا کہ اگر انبیائے کرامؑ نہ ہوتے تو یہ دنیا شرک وبت پرستی سے بھری رہتی،شیاطین انسان کو خدا کی معرفت اور اُس کی بندگی سے دور رکھتے،کیونکہ انسان کی عقل اسباب سعادت کی پہچان کے لیے کافی نہیں۔یہ صحیح ہے کہ عقل نور ہے لیکن جب آفتابِ وحی اس پر نورافشانی نہ کرے تو صرف عقل اس خطرناک وادی کو طے نہیں کرسکتی اور اس کے نشیب وفراز سے نہیں گزر سکتی۔

یہاں پر واضح ہوتا ہے کہ"برہمن"جو بعثتِ انبیاءؑ کے منکر ہیں،سخت غلط فہمی میں مبتلا ہیں،کیونکہ اگر انسانی عقل تمام ظاہری وباطنی اَسرار کا ادارک کرسکتی تو گزشتہ،حال اور مستقبل کے رابطے کو جان سکتی اور تشخیص میں غلط فہمی کا شکار نہ ہوتی۔ممکن ہے کہا جائے عقل کا ادراک تمام مشکلاتِ زندگی اور اِس جہان واُس جہان کے مسائل کو درک کرنے میں کافی ہے مگر عقلی ادراکات کا محدود ہونا اور مجہولات کا معلومات سے زیادہ ہونا واضح کرتا ہے کہ عقل پر بھروسا کرنا کافی نہیں۔اس کا انکار نہیں کہ عقل حجتِ الٰہی ہے۔اور اسی خطبے میں امامؑ نے اشارہ فرمایا ہے کہ اسلامی روایات اسے پیغمبرِ باطنی کا عنوان دیتی ہیں۔

معروف حدیث جو حضرت امام موسیٰ کاظمؑ سے منقول ہے:

"اِنَّ لِلّٰهِ عَلَى النَّاسِ حُجَّتَيْنِ حُجَّةً ظَاهِرَةً وَ حُجَّةً بَاطِنَةً فَاَمَّا الظَّاهِرُ فَالرُّسُلُ وَ الْاَنْبِيَاءُ وَ

[1] اس کی مزید تشریح پیامِ قرآن،ج ۴،ص ۴۴۰ کے بعد موجود ہے۔

https://downloadshiabooks.com/

الْاَئِمَّۃُ عَلَیْھِمُ السَّلَامُ وَاَمَّا الْبَاطِنَۃُ فَالْعُقُوْلُ"

"خدا کی طرف سے لوگوں پر دو حجّتیں ہیں: ایک ظاہری حجّت، دوسری باطنی حجّت؛ ظاہری حجّت پیغمبر، رسولؐ وائمہ اور جبکہ باطنی حجت عقل ہے۔" [1]

لیکن واضح رہے کہ باطنی رسول (حجت) کی قوت محدود ہے، جبکہ ظاہری رسول جس نے وحی پر تکیہ کیا ہوا ہے، یہ وحی منبعِ علمِ خدا ہے اور اس کی قوت لامحدود ہے۔ یہاں پر برہمن فلسفیوں کے جواب سے روشن ہے کہ وہ کہتے ہیں پیغمبرؐ جو ہمارے لیے لائے وہ دو صورتوں سے خارج نہیں یا تو ہماری عقل اسے درک کرتی ہے یا نہیں کرتی۔ اگر ہماری عقل درک کرتی ہے تو پیغمبروں کی ضرورت نہیں۔ اگر درک نہیں کرتی یعنی وہ غیر معقول ہے تو بات قابل قبول نہیں، کیوں کہ کوئی بھی انسان غیر معقول باتوں کو نہیں مان سکتا۔

اس استدلال پر جو اعتراض ہے، وہ یہ ہے کہ انھوں نے غیر معقول اور مجہول کے درمیان فرق نہیں رکھا۔ ان کا تصوّر ہے کہ عقل تمام چیزوں کو درک کرتی ہے، جب کہ یہاں تین قسم کی تقسیم ہے۔ جو باتیں ہمارے سامنے ہیں وہ یا عقل کے حکم کے مطابق ہیں یا مخالف یا مجہول ہیں۔ اطمینان کے ساتھ کہا جا سکتا ہے کہ اکثر مطالب کا تعلق تیسری قسم یعنی مجہول سے ہے، پیغمبروںؐ کی کوشش اسی حصّے کے لیے ہے۔ اس کے علاوہ ہم اپنے عقلی ادراکات میں وسوسے کا شکار ہو جاتے ہیں کہ ایسا نہ ہو ہم غلطی پر ہوں۔ یہاں پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی تائید ضروری ہے، گویا عقل نقل کے ساتھ مل کر ہمیں مطمئن کر سکتی ہے تا کہ جس راہ پر چل رہے ہیں، اس پر اطمینان حاصل ہو سکے۔

۴۔ ہر زمانے میں حجّت خدا کا ہونا ضروری ہے

مولا علی علیہ السلام کی تعبیرات میں یہ بات بھی سامنے آتی ہے، جس پر آپ تاکید بھی فرماتے ہیں کہ خدا نے اپنی مخلوق کو حجت ورہنما کے بغیر نہیں چھوڑا۔ اب وہ حجت نبیؐ ہو، کتابِ آسمانی یا امامِ معصومؑ اور اُن کی سنّت وسیرت ہو، اہم بات یہ ہے کہ امامؑ کے کلام میں کتابِ آسمانی اور پیغمبر، ایک ساتھ اور حجتِ الٰہی اور سیرۂ معتبر ایک ساتھ بیان ہُوئے ہیں۔ ہاں ہر آسمانی کتاب کے ساتھ ایک پیغمبر ہو جو کتاب کو واضح کرے اور اسے عملی صورت دے۔ نبیؐ کی جاری سنّت کے ساتھ وصیؑ یا امامؑ ہوتا ہے جو کہ نبیؐ کی میراث کی حفاظت کرے اور اس کے نفاذ کے لیے کوشش کرے۔ یہ وہ ہی ہے جس پر ہمارا اعتقاد ہے۔

حضرت امامِ صادق علیہ السلام فرماتے ہیں:

[1] اصول کافی، ج۱، ص۱۶

https://downloadshiabooks.com/

"لَوْ لَمْ يَبْقَ فِي الْأَرْضِ إِلَّا اِثْنَانِ لَكَانَ أَحَدُهُمَا الْحُجَّةَ"
"اگر زمین پر صرف دو افراد باقی رہ جائیں تو ان میں سے ایک حجّتِ خدا اور امامؑ ہے۔"[۱]
امام علیہ السلام کلماتِ قصار میں فرماتے ہیں:
"اَللّٰهُمَّ بَلَى لَا تَخْلُوا الْأَرْضُ مِنْ قَائِمٍ لِلّٰهِ بِحُجَّةٍ إِمَّا ظَاهِرًا مَشْهُورًا وَ إِمَّا خَائِفًا مَغْمُورًا لِئَلَّا تَبْطُلَ حُجَجُ اللّٰهِ وَبَيِّنَاتُهُ"[۲]
"ہاں! مگر زمین ایسے فرد سے خالی نہیں رہتی کہ جو خدا کی حجّت کو برقرار رکھے، چاہے وہ ظاہر و مشہود ہو یا خائف و پنہاں، تاکہ اللہ کی دلیلیں اور نشان مٹنے نہ پائیں۔"

۵۔ پیغمبروں کی خصوصیات

انبیائے کرامؑ جو خدا کی جانب سے لوگوں کی ہدایت کے لیے مبعوث ہوئے، وہ عام انسان نہیں تھے، بلکہ وہ تمام صفات جو ان کی رسالت کے لیے ضروری تھیں، ان میں موجود تھیں۔ ان میں سے ایک شہامت و بردباری جو تبلیغ کے لیے بہت ضروری ہے، ایسے افراد کے سامنے شہامت و بردباری جو جاہل، ضدی اور سخت دل ہوتے ہیں اور شہامت کا نہ ہونا تبلیغ کی راہ میں بڑی رکاوٹ ہے یہاں تک کہ شہادت تک بردباری و شہامت کا مظاہرہ کرنا، یہ وہی صفت ہے جس کی طرف آپؑ نے گزشتہ باب میں اشارہ فرمایا ہے۔

قابلِ ذکر بات یہ ہے کہ شہامت کی وجہ سے اچھے افراد کی کمی، دشمنوں اور جھٹلانے والوں کی کثرت رسالت کی انجام دہی میں مانع نہیں ہوتی۔ جب بھی انبیاءؑ (خصوصاً رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی سیرت کا مطالعہ کیا جائے تو مولاؑ کے اس قول کی سچائی اور زیادہ واضح طور پر سمجھ میں آجاتی ہے۔

قرآن مجید میں یہ صفت رسالت کی خصوصیات میں سے شمار کی گئی ہے:
"اَلَّذِيْنَ يُبَلِّغُوْنَ رِسَالَاتِ اللّٰهِ وَ يَخْشَوْنَهُ وَلَا يَخْشَوْنَ أَحَدًا إِلَّا اللّٰهَ"[۳]
"وہ لوگ اللہ کے پیغامات پہنچاتے تھے اور اس کا خوف رکھتے تھے اور اللہ کے سوا کسی سے نہیں ڈرتے تھے۔"

---

[۱] اصول کافی، ج۱، ص۱۷۹
[۲] نہج البلاغہ کلمات قصار ۱۴۷
[۳] سورۂ احزاب، آیت ۳۹

https://downloadshiabooks.com/

''منہاج البراعۃ'' کے مؤلف لکھتے ہیں، اس بارے میں امامؑ کی گفتگو واضح و روشن ہے کہ انبیائے کرامؑ کے لیے تقیہ جائز نہیں ہے۔ فخر الدین رازی شیعہ امامیہ کی طرف ایک بے بنیاد تہمت کی نسبت دیتے ہیں، وہ کہتے ہیں: ''شیعہ مقامِ تقیہ میں انبیاؑ سے اظہارِ کفر کو جائز سمجھتے ہیں''، یہ جھوٹ اور باطل ہے۔[۱]

بلکہ بات اس سے بالاتر ہے کہ تقیہ کرنا اماموں کے لیے حتیٰ کہ عام افراد کے لیے جہاں دین کی اَساس خطرے میں ہو، حرام ہے۔ گویا تقیہ کبھی واجب ہے تو کبھی حرام۔ اگر تقیہ نہ کرے تو جسمی نقصان اور جان کو خطرہ ہو تو تقیہ واجب ہے مثلاً اگر دشمنوں کے چنگل میں کوئی مسلمان پھنس جائے اور اظہارِ اسلام کی وجہ سے قتل کر دیا جائے گا اور مسلمانوں کو نقصان ہوگا تو یہاں ضروری ہے کہ وہ اپنے ایمان و عقیدے کو چھپائیں اور اگر عقیدہ چھپانے کی وجہ سے ذلت و رسوائی ہو تو واجب ہے شجاعانہ انداز سے اظہارِ اسلام کرے۔ اس باب میں امام حسینؑ اور آپ کے اصحاب بہترین مثال ہیں۔ انبیائے کرامؑ اگر اپنے عقیدے کو مخفی رکھیں تو ان کی رسالت پر حرف آتا ہے لہٰذا ان کے لیے تقیہ ترک کرنا ضروری ہے۔ یہ نکتہ قابلِ غور ہے کہ تقیہ صرف شیعہ یا دیگر مسلمانوں کا مسئلہ نہیں بلکہ اہلِ عقل کا بنیادی اصول ہے کہ جہاں اظہارِ عقیدہ بغیر کسی فائدے کے جسمانی نقصان کا باعث ہو، وہاں اظہارِ عقیدہ نہ کیا جائے۔[۲]

تیرہواں حصّہ

إِلَى أَنْ بَعَثَ اللهُ سُبْحَانَهُ مُحَمَّداً [صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم] رَسُولَ اللهِ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم لِإِنْجَازِ عِدَتِهِ وَ إِتْمَامِ نُبُوَّتِهِ مَأْخُوذاً عَلَى النَّبِيِّينَ مِيثَاقُهُ مَشْهُورَةً سِمَاتُهُ كَرِيماً مِيلَادُهُ وَ أَهْلُ الْأَرْضِ يَوْمَئِذٍ مِلَلٌ مُتَفَرِّقَةٌ وَ أَهْوَاءٌ مُنْتَشِرَةٌ وَ طَرَائِقُ مُتَشَتِّتَةٌ بَيْنَ مُشَبِّهٍ لِلَّهِ بِخَلْقِهِ أَوْ مُلْحِدٍ فِي اسْمِهِ أَوْ مُشِيرٍ إِلَى غَيْرِهِ فَهَدَاهُمْ بِهِ مِنَ الضَّلَالَةِ وَ أَنْقَذَهُمْ بِمَكَانِهِ مِنَ الْجَهَالَةِ ثُمَّ اخْتَارَ سُبْحَانَهُ لِمُحَمَّدٍ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم لِقَاءَهُ وَ رَضِيَ لَهُ مَا عِنْدَهُ وَ أَكْرَمَهُ عَنْ دَارِ الدُّنْيَا وَ رَغِبَ بِهِ عَنْ مَقَامِ الْبَلْوَى فَقَبَضَهُ إِلَيْهِ كَرِيماً وَ خَلَّفَ فِيكُمْ مَا خَلَّفَتِ الْأَنْبِيَاءُ فِي أُمَمِهَا إِذْ لَمْ يَتْرُكُوهُمْ هَمَلًا بِغَيْرِ طَرِيقٍ وَاضِحٍ وَ لَا عَلَمٍ قَائِمٍ۔

''یہاں تک کہ مالک نے اپنے وعدے کو پورا کرنے اور اپنی نبوت کو مکمل کرنے کے لیے آنحضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو بھیج دیا، جن کے بارے میں انبیاؑ سے عہد لیا جا چکا تھا اور جن کی علامتیں مشہور اور ولادت مسعود و مبارک

---

[۱] منہاج البراعۃ جلد ۲، ص ۶۰

[۲] تقیہ کے بارے میں وضاحت اور اس کے احکامِ خمسہ میں تقسیم (واجب، حرام، مستحب، مکروہ، مباح) اور اس سے مربوط آیات و روایات ملاحظہ کریں، کتاب قواعد فقیہہ، ج ۱، ص ۳۸۳۔

https://downloadshiabooks.com/

تھی۔اُس وقت اہلِ زمین متفرق مذاہب، منتشر خواہشات اور مختلف راستوں پر گامزن تھے۔کوئی خدا کو مخلوقات کی شبیہ بتا رہا تھا۔کوئی اس کے ناموں کو بگاڑ رہا تھا۔اور کوئی دوسرے خدا کا اشارہ دے رہا تھا۔مالک نے آپؐ کے ذریعے سب کو گمراہی سے ہدایت دی اور جہالت سے باہر نکال لیا۔

پھر اللہ سبحانہٗ نے آنحضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو اپنے لقاو قرب کے لیے چُنا۔اپنے خاص انعامات آپؐ کے لیے پسند فرمائے اور دارِ دنیا کی بودوباش سے آپؐ کو بلند تر سمجھا اور زحمتوں سے گھری ہوئی جگہ سے آپؐ کے رخِ انور کو موڑا اور دنیا سے باعزت آپؐ کو اٹھالیا۔آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم تم میں اسی طرح کی چیز چھوڑ گئے، جو انبیاؑ اپنی امتوں میں چھوڑتے چلے آئے تھے۔اس لیے کہ وہ طریق واضح اور نشانِ محکم قائم کیے بغیر یوں ہی بے قید و بند انہیں نہیں چھوڑتے تھے۔‘‘

شرح وتفسیر

ظہورِ اسلام

خطبے کے اس حصّے میں حضرت امام علیؑ چار چیزوں کی طرف اشارہ فرماتے ہیں:

اوّل: بعثتِ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم آپؐ کے فضائل وخصوصیات اور نبوّت کی علامتیں۔

دوّم: آپؐ کے زمانے میں دُنیا کے حالات، دینی اور عقیدتی گمراہیاں اور ان گمراہیوں کے نتیجے میں ظاہر ہونے والی گھٹاٹوپ تاریکیوں سے رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ذریعے نجات۔

سوّم: دارِ دنیا سے رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی رحلت۔

چہارم: آپؐ کی میراث یعنی قرآن مجید۔

پہلے حصّے میں فرماتے ہیں:

’’اِلٰی اَنْ بَعَثَ اللهُ سُبْحَانَهُ مُحَمَّدًا رَسُوْلَ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَ آلِهٖ لِاِنْجَازِ [۱] عِدَتِهٖ وَ اِتْمَامِ نُبُوَّتِهٖ [۲]‘‘۔

---

[۱] اِنْجاز، کا مادّہ نَجز، ہے اور اختتام اور متحقق کرنے کے معنیٰ میں آتا ہے۔

[۲] ’’نبوتہ‘‘ کی ضمیر پیغمبرؐ کی طرف پلٹتی ہے۔لیکن ’’عدتہ‘‘ کی ضمیر دو معنی رکھتی ہے، ایک یہ کہ خدا کی طرف ہے، دوسرے یہ کہ رسولؐ کی طرف ہے۔البتہ پہلا احتمال زیادہ مناسب ہے کیونکہ بعثت نبیؐ، خدا کا وہ وعدہ تھا جو حضرت ابراہیمؑ اور دوسرے انبیائے کرامؑ سے کیا تھا۔یہ احتمال بھی ہے کہ دونوں ضمیریں خدا کی طرف پلٹیں۔

https://downloadshiabooks.com/

''(حالات اسی طرح رہے) یہاں تک کہ خدا نے اپنے عہد اور نبوت کو کامل کرنے کے لیے رسول اکرمؐ کو بھیجا۔''

پھر رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے فضائل کی طرف اشارہ فرماتے ہیں:

''مَأْخُوذًا عَلَى النَّبِيِّينَ مِيثَاقُهُ''

''سب انبیائے کرامؑ سے نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بارے میں عہد لیا گیا تھا کہ اُن پر ایمان لائیں۔''

اور اپنے اپنے پیروکاروں کو اُن کے ظہور کی خوش خبری سنائی:

''مَشْهُورَةً سِمَاتُهُ [1] كَرِيماً مِيلَادُهُ''

''ان کی آمد کی علامتیں قابلِ مشاہدہ اور ان کی میلاد پسندیدہ تھی۔''

یہ تعبیر ممکن ہے آپؐ کے والدین و اجداد کی عظمت کی طرف اشارہ ہو یا اُن برکتوں کی طرف، جو آپؐ کی ولادت کے وقت دنیا کو ملیں۔ تاریخی شواہد کے مطابق آپؐ کی ولادت کے وقت خانۂ کعبہ کے بت گر گئے، فارس کا آتش کدہ بجھ گیا؛ ساوہ کا وہ دریا جس کی کچھ لوگ پرستش کرتے تھے، خشک ہو گیا؛ ظالم و جابر بادشاہوں کے محلات کے کچھ حصے ٹوٹ گئے۔ یہ سب شرو بت پرستی کے مقابلے میں توحید کی راہ کو جدید خطوط پر استوار کرنے کی علامات تھیں۔ پھر فرماتے ہیں:

''وَأَهْلُ الْأَرْضِ يَوْمَئِذٍ مِلَلٌ مُتَفَرِّقَةٌ وَأَهْوَاءٌ مُنْتَشِرَةٌ وَطَرَائِقُ مُتَشَتِّتَةٌ''

''اُن دنوں زمین والے مختلف مذاہب وافکار، ضد و نقیض خواہشیں اور متفرق عقائد کے حامل تھے۔''

''بَيْنَ مُشَبِّهٍ لِلَّهِ بِخَلْقِهِ أَوْ مُلْحِدٍ فِي اسْمِهِ أَوْ مُشِيرٍ إِلَى غَيْرِهِ''

''ایک گروہ خدا کو مخلوق سے تشبیہ دیتا تھا، دوسرا اس کا نام بتوں کے لیے رکھتا تھا یا پھر کسی اور کی طرف اشارہ اور اس کی تبلیغ کرتے تھے۔''

''مُلحِد'' کا مادہ، لحد ہے، مہد کے وزن پر بمعنی گڑھا ہے، جو کسی خاص سمت کی جانب کھودا گیا ہو۔ پھر اسی مناسبت سے ہر اس کام پر اس کا اطلاق ہوا ہے جو حدِ وسط سے منحرف ہو کر کج روی کا شکار ہو۔ شرک و بت پرستی کو بھی اس لیے الحاد اور شرک و بت پرستوں کو ملحد کہا جاتا ہے چوں کہ وہ میانہ روی کو ترک کر کے افراط و تفریط کا شکار ہوتے ہیں۔

'' أَوْ مُلْحِدٍ فِي اسْمِهِ'' کے جملے سے مراد یہ ہے کہ خدا کا نام بتوں کے لیے رکھا جاتا تھا۔ مثلاً ایک بت کا نام ''لَات'' دوسرے کا ''عُزّیٰ'' تیسرے کا ''مَنَات'' رکھا جو ''اَللّٰهُ وَ الْعَزِيزُ وَالْمَنَّانُ'' سے مشتق ہیں یا مراد یہ تھی کہ خدا کے لیے ان صفات کے قائل ہوئے جو مخلوق کے لیے تھیں، اسم کو مسمّیٰ کے مطابق نہیں رکھتے تھے۔ یہ دونوں تفسیریں ممکن

[1] ''سِمَاتُه'' ، ''سِمَةٌ'' کی جمع ہے اور علامت کے معنیٰ میں ہے۔

https://downloadshiabooks.com/

ہیں۔

پھر مولاؑ فرماتے ہیں:

"فَهَدَاهُمْ بِهِ مِنَ الضَّلَالَةِ وَ أَنْقَذَهُمْ بِمَكَانِهِ مِنَ الْجَهَالَةِ"

"خدا نے رسولؐ کے ذریعے گمراہی سے نجات دی، ان کے وجود کی برکت سے لوگوں کو جہالت سے نکالا۔"

ایک اور حصے میں فرماتے ہیں:

"ثُمَّ اخْتَارَ سُبْحَانَهُ لِمُحَمَّدٍ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَ آلِهِ وَ سَلَّمَ لِقَاءَهُ، وَ رَضِيَ لَهُ مَا عِنْدَهُ، وَ أَكْرَمَهُ عَنْ دَارِ الدُّنْيَا وَ رَغِبَ بِهِ عَنْ مَقَامِ الْبَلْوَى" [1]

"پھر خداوند عالم نے آنحضرتؐ کو اپنی ملاقات کے لیے منتخب کیا اور جو مقام اُس کے پاس ان کے لیے تھا وہ اُس نے آنحضرتؐ کے لیے پسند کیا اور اُن کو رحلت کے ذریعے اس دنیا سے آخرت کی جانب منتقل کر کے مشکلات سے نجات دی۔"

"فَقَبَضَهُ إِلَيْهِ كَرِيمًا صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَ آلِهِ"

"بڑے احترام سے ان کی (خدا کا درود و سلام ہو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور آپ کی پاک آلؑ پر) روح کو قبض کیا۔"

"وَ خَلَّفَ فِيكُمْ مَا خَلَّفَتِ الْأَنْبِيَاءُ فِي أُمَمِهَا"

"انھوں نے سابق انبیائے کرامؑ کی طرح اپنے بعد امّت کے لیے جانشین چھوڑا۔"

"إِذْ لَمْ يَتْرُكُوهُمْ هَمَلًا بِغَيْرِ طَرِيقٍ وَاضِحٍ وَ لَا عَلَمٍ قَائِمٍ" [2]

"انھوں نے ہرگز اپنی امّتوں کو سرپرست، واضح راہ وروش اور پرچم ہدایت بلند کیے بغیر نہیں چھوڑا۔"

واضح رہے کہ امامؑ کی مندرجہ بالا تعبیر سے مراد وہی ہے، جو حدیثِ ثقلین میں بیان ہوئی ہے۔ چنانچہ متواتر روایت کے مطابق رسولِ اکرمؐ نے فرمایا: "میں تمہارے درمیان دو گرانقدر چیزیں چھوڑے جا رہا ہوں، کتابِ خدا اور میری عترت" اگر ان دونوں سے متمسک رہو گے تو ہرگز گمراہ نہیں ہوگے، یہ دونوں ایک دوسرے سے جدا نہیں ہوں گے، یہاں تک کہ حوضِ کوثر پر میرے پاس آ جائیں گے۔" [3] کلام کو مکمل کرتے ہوئے آپؑ نے کتابِ خدا (قرآن مجید) کے بارے میں ایک

---

[1] رَغَبَ جب "فی" کے ساتھ جُڑا ہو تو کسی سے محبت کے لیے آتا ہے۔ جب "عن" کے ساتھ ہو تو بے توجہی کے معنی دیتا ہے۔ خدا نہیں چاہتا تھا کہ رسولؐ اس سے زیادہ مشکلات دیکھیں، اس لیے اس پست دنیا سے عالمِ بالا کی جانب بلالیا۔

[2] هَمَل کا مادّہ هُمل ہے بروزن حمل، یعنی کسی چیز کو بے اعتنائی سے چھوڑ دینے کے معنیٰ میں ہے۔

[3] حدیثِ ثقلین کے اسناد اور شیعہ وسنی فریق کے علماء کے نزدیک اس کے تواتر سے متعلق مزید معلومات کے لیے پیامِ قرآن، ج۹ کی طرف رجوع کریں۔

https://downloadshiabooks.com/

جامع گفتگو کی ہے، مگر آپ نے عترت کے بارے میں یہاں گفتگو نہیں فرمائی، البتہ نہج البلاغہ کے دوسرے خطبات میں آپ نے اس بارے میں گفتگو فرمائی ہے، مولا کے اس کلام کے آخر میں "عَلَمٍ قَائِمٍ" کی تعبیر سے مراد ممکن ہے اوصیاءؑ ہوں۔

بہر حال انبیاء کرامؑ کا اپنی اپنی امتوں کی نسبت ہمدری صرف ان کی حیات دنیوی تک محدود نہیں ہوتی، جس طرح ایک دل سوز پدر اپنی نابالغ اولاد کے لیے موت کے لمحے تک فکر مند ہوتا ہے، بلکہ انبیاءؑ کی دلسوزی اور ہمدری دنیا و آخرت دونوں کے لیے ہوتی ہے۔ اس بنا پر آپؐ نے اپنا وصی معیّن کیا تاکہ وہ رسولؐ کی زحمتوں کو ضائع نہ ہونے دے۔

اہم نکات

پہلا نکتہ: بعثت رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے قبل ادیان و مذاہب

مندرجہ بالا عبارت میں ایک مختصر اشارہ عرب کے اُن ادیان و مذاہب کے بارے میں کیا گیا ہے، جو قبل از بعثت عصرِ جاہلیت میں عرب اور غیر عرب (عجم) کے اندر موجود تھے۔ جیسا کہ محققوں اور مورّخوں نے لکھا ہے کہ صرف دنیا میں ہی نہیں، بلکہ خود عرب میں بے شمار ایسے ادیان اور مذاہب پائے جاتے تھے، جو منحرف اور مختلف عقائد کے حامل تھے۔

معروف شارح نہج البلاغہ، ابن ابی الحدید عرب کے ادیان کے متعلق جو عصرِ جاہلیت میں تھے، لکھتے ہیں۔ وہ مذاہب شروع میں دو گروہوں میں تقسیم ہوئے معطّلہ اور غیر معطّلہ۔

گروہ معطّلہ: معطّلہ میں بھی پھر تقسیمات تھیں:

پہلا گروہ: خدا پر بالکل یقین نہیں رکھتا تھا۔ جیسا کہ قرآن نے کہا:

"مَا هِيَ اِلَّا حَيَاتُنَا الدُّنْيَا نَمُوْتُ وَنَحْيٰى وَمَا يُهْلِكُنَآ اِلَّا الدَّهْرُ"

"ہماری دنیوی زندگی کے سوا (اور) کچھ نہیں ہے ہم (بس) یہیں مرتے اور جیتے ہیں اور ہمیں زمانے کے (حالات و واقعات کے) سوا کوئی ہلاک نہیں کرتا (گویا خدا کا مکمل انکار کرتے ہیں)۔"[1]

دوسرا گروہ: خدا پر یقین رکھتا تھا لیکن قیامت کا منکر تھا، وہ کہتے تھے:

"مَنْ يُّحْيِ الْعِظَامَ وَهِيَ رَمِيْمٌ"

---

[1] سورۂ جاثیہ: آیت ۲۴

https://downloadshiabooks.com/

''کون گلی ہوئی ہڈیوں کو زندہ کرے گا۔''[۱]

تیسرا گروہ: خدا اور قیامت پر یقین رکھتا تھا، لیکن بعثت انبیاؑ کا منکر تھا، بتوں کی پرستش کرتا تھا، بت پرست بھی مختلف تھے، بعض بتوں کو خدا کا شریک جانتے تھے اور اسی کلمہ شریک کا لفظ بتوں کے لیے استعمال کرتے تھے۔ حج کے موقع پر کہتے تھے:

"لَبَّیْکَ اللّٰهُمَّ لَبَّیْکَ لَا شَرِیْکَ لَکَ اِلَّا شَرِیْکًا هُوَ لَکَ"

اور ایک گروہ، بتوں کو بارگاہِ خدا میں شفیع قرار دیتا تھا، کہتے تھے:

"وَمَا نَعْبُدُهُمْ اِلَّا لِیُقَرِّبُوْنَا اِلَی اللّٰهِ زُلْفٰی"[۲]

''اور ہم ان کی پرستش نہیں کرتے، مگر اس لیے کہ ہمیں خدا کے نزدیک کریں۔''

جبکہ ایک اور گروہ تشبیہ اور تجسّم کا قائل تھا۔ وہ خدا کے لیے انسان کی مانند صفات و اعضا کا قائل تھا۔ ان میں سے بعض مثلاً امیہ ابن ابی صلت کہتا تھا کہ خدا عرش پر بیٹھا ہے اور اپنے پیروں کو پھیلائے ہوئے ہے۔ (بہت افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ ان افکار کے آثار بعد از بعثتِ رسول بھی اسلام سے بے بہرہ بعض لوگوں میں پائے جاتے تھے۔[۳] ان لوگوں کا یہ گمان تھا کہ خداوند متعال ایک نوجوان کی شکل وصورت میں اپنی مخصوص سواری پر سوار آسمان سے نازل ہوتا ہے جبکہ اس کے پیروں میں سونے کے جوتے اور اس کی صورت کے گرداگرد ایک طلائی پروانہ حرکت کررہا ہوتا ہے یہ اور اس طرح کے کئی دیگر خرافات اور فرسودہ خیالات)

غیر معطّلہ

یہ بہت کم افراد تھے، جن کا خدا پر اعتقاد تھا اور یہ متقی و پرہیزگار لوگ تھے۔ ان میں حضرت عبدالمطلبؑ اور اُن کی اولاد حضرت عبداللہؑ وحضرت ابوطالبؑ اور قس بن ساعدہ اور اس طرح کے دوسرے افراد تھے۔[۴] نہج البلاغہ کے بعض شارحین نے، عرب دانشمندوں کو مندرجہ ذیل چند گروہوں میں تقسیم کیا ہے، وہ جو صرف علمِ الانساب میں معلومات رکھتے تھے، دوسرے وہ جو خواب کی تعبیر بیان کرتے تھے اور بعض انواء کا علم رکھتے تھے، انواء یعنی (خرافات پر مشتمل ستارہ شناسی کی

---

[۱] سورۂ یٰسین: آیت ۷۸

[۲] سورۂ زمر: آیت ۳

[۳] ابن ابی الحدید نے اس مطلب کو جلد ۳، صفحہ ۲۲۷ پر لکھا ہے۔

[۴] شرح ابن ابی الحدید، ج ۱، ص ۱۱۷

https://downloadshiabooks.com/

ایک قسم)۔بعض کاہن تھے، جواپنی تئیں آئندہ کے بارے میں خبر دیتے تھے۔غیر عربوں کے درمیان ایک قوم برہمن تھی، جس کے افراد ہندوستان میں زندگی بسر کررہے تھے،وہ سوائے احکامِ عقلیہ کے کسی اور کے قائل نہیں تھے، یہ لوگ تمام ادیان کے منکر تھے جبکہ ایک دوسرا گروہ ستارہ پرست تھا،سورج پرست تھا، چاند پرست تھا یہ سب بت پرستی کی شکلیں تھیں۔[۱] ان کے علاوہ یہودی، نصرانی، مجوسی تھے، جو انحرافات کا شکار تھے، مجوسی دوگانہ پرست تھے،خیر کا خدا اور شر کا خدا علیحدہ علیحدہ مانتے تھے، یہ مذہب شاید اپنے آغاز میں بعض انبیاؑ کے توسط سے وجود میں آیا تھا، جو خرافات سے بھر چکا تھا، جبکہ بعض محققین نے بیان کیا ہے کہ یہ لوگ خدائے خیر وخدائے شر پر اعتقاد رکھتے تھے،ان کے عقیدے کے مطابق جب خدائے خیر اورخدائے شر کے درمیان جنگ ہوگی اوروہ آپس میں الجھ پڑے تو فرشتوں نے ان کے درمیان بیچ بچاؤ کرایا اوران کے درمیان یوں صلح ہوئی کہ نیچے کا عالم سات ہزار سال کے لیے خدائے شر کے اختیار میں جبکہ عالم بالا سات ہزار سال کے لیے خدائے خیر کے اختیار میں ہوگا۔[۲] ادھر عیسائی تثلیث (تین خدا) کے عقیدے میں گرفتار تھے اور یہودی عجیب وغریب تحریفوں میں گرفتار ہوئے، جوانھوں نے تورات میں کیں، جن کی شرح کی یہاں گنجائش نہیں۔امامؑ نے اوپر والی عبارت میں تمام افراد کو تین گروہوں میں تقسیم کیا ہے۔

پہلا گروہ: یہ تشبیہ اور خدا کے لیے شریک کے قائل ہیں۔مثلاً مجوسی وعیسائی یا وہ لوگ جو خدا کے لیے انسانی صفات کے قائل تھے۔جیسے بہت سارے یہودی اس طرح کا عقیدہ رکھتے ہیں۔

دوسرا گروہ: وہ جو خدا کا نام کسی اور کے لیے قرار دیتے ہیں، بہت سارے بت پرست کہ جنہوں نے خداوند متعال کے اسامی کو بتوں کے لیے انتخاب کیا ہوا ہے اوران کو اپنے اور خدا کے درمیان واسطہ قرار دیتے ہیں۔

تیسرا گروہ: وہ جو غیر خدا کو اشارہ کرتے ہیں، دہریہ جو فطرت کو اس جہان کا خالق مانتے ہیں، یا وہ بت پرست، چاند پرست اور ستارہ پرست جو بتوں اور ستاروں کو اصل یعنی خدا مانتے تھے۔ان حالات میں پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم مبعوث ہوئے اور آفتابِ قرآن روشن ہوا، اعلیٰ ترین مفاہیمِ توحید، دقیق ترین معارف جو خدا سے مربوط تھیں اور اُس کی صفات کے مفاہیم، نبی اکرمؐ کے ذریعے پہنچائے گئے۔تاریخ انبیاءؑ جو انتہا درجے کی خرافات سے پُر کر دی گئی تھی، اس کو پاک کرکے لوگوں کے سامنے حقائق کو بیان کیا۔وہ قوانین جو محروم اور مظلوم لوگوں کی حمایت میں تھے، ان کو اساس وبنیاد قرار دیتے ہوئے عدالت کو قائم کیا۔قرآن مجید کی عبارت کے مطابق رسول اکرمؐ نے معاشرے کو کھلی گمراہی سے نجات دی اور تہذیبِ نفس کی:

[۱] شرح نہج البلاغہ ابن میثم، ج ۱، ص ۲۰۵

[۲] شرح نہج البلاغہ ابن میثم، ج ۱، ص ۲۰۶

https://downloadshiabooks.com/

"هُوَ الَّذِیْ بَعَثَ فِی الْاُمِّیّٖنَ رَسُوْلًا مِّنْهُمْ یَتْلُوْا عَلَیْهِمْ اٰیٰتِهٖ وَ یُزَكِّیْهِمْ وَ یُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ وَ الْحِكْمَةَ وَ اِنْ كَانُوْا مِنْ قَبْلُ لَفِیْ ضَلٰلٍ مُّبِیْنٍ" [۱]

''وہی تو ہے جس نے مکہ والوں میں ان ہی میں کا ایک رسولؐ (محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) بھیجا جو ان کے سامنے اس کی آیتیں پڑھتے اور ان کو پاک کرتے ہیں اور ان کو کتاب اور عقل کی باتیں سکھاتے ہیں اگرچہ اس کے پہلے تو یہ لوگ صریحی گمراہی میں (پڑے ہوئے) تھے۔''

ہاں، نبی مکرمؐ کی بعثت سے دین الٰہی کا چہرہ آشکار ہوا، خرافات دور ہوئے، اور تاریخِ بشریت میں ایک نیا دور رونما ہوا۔ یہ وہ حقیقت ہے جسے وہ لوگ بھی تسلیم کرتے ہیں جو مرکز اسلام سے کوسوں دور ہیں۔

برناڈ شا انگریز فلسفی لکھتا ہے:

میری نظر میں صرف آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا دین ہی وہ دین ہے، جو تاریخ بشریت کے تمام ادوار میں بنی نوع انسانیت کے تمام پہلوؤں سے سازگار اور اس کی اس طرح مکمل ہدایت و رہبری کر سکتا ہے جو تمام اقوام عالم کے لیے قابل قبول ہو۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو انسانیت کا نجات دہندہ کے نام سے یاد کیا جائے، میرا عقیدہ ہے کہ اگر آج بھی آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم جیسے فرد کو اس دنیا کا سرپرست بنایا جائے تو تمام مشکلات با آسانی حل ہو جائیں گی، اور وہ اس جہان کو سعادت مندی اور صلح وصفائی کی طرف لے جائیں گے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم گزشتہ اور آج کے زمانے کے لیے انسانِ کامل ہیں۔ آئندہ بھی ان جیسا فرد کے آنے کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا۔ [۲]

دوسرا نکتہ: انبیائے کرامؑ کا آئندہ کے لیے فکر مند ہونا

امامؑ نے اس خطبے میں جو تعبیر استعمال کی، اس سے بخوبی استفادہ ہوتا ہے کہ تمام انبیا و پیغمبران الٰہی علیہم السلام صرف اپنی زندگی میں ہی نہیں بلکہ اپنے بعد کے زمانے کے لیے بھی امّت کی نسبت فکر مند رہتے تھے۔ لہٰذا آئندہ کے لیے اسبابِ ہدایت چھوڑ کر جاتے تھے، ہر وہ کام جو نبوت و رسالت کے راستے کو آگے بڑھانے کے لیے ہوتا تھا، انجام دیتے تھے۔ یقیناً پیغمبر اسلامؐ نے بھی یہی کیا، کیا یہ ممکن تھا کہ وہ اپنی اُمت کو ایسے ہی تنہا چھوڑ کر چلے جائیں؟ اور واضح راستہ اور سرپرست معیّن نہ فرمائیں، حدیثِ ثقلین جو متواتر ہے اور کتبِ شیعہ و اہلِ سنت میں بیان ہوئی ہے کہ رسولِ اکرمؐ نے فرمایا ہے: ''میں تمہارے

[۱] سورۂ جمعہ: آیت ۲

[۲] فی ظلال نہج البلاغہ، جلد ۱، ص ۶۳

https://downloadshiabooks.com/

درمیان دو گرانقدر چیزیں چھوڑے جا رہا ہوں، کتابِ خدا اور میری عترت۔'' کیا یہ فہمائش کہ ''میں تمہارے درمیان دو گرانقدر چیزیں چھوڑے جا رہا ہوں، کتابِ خدا اور میری عترت۔'' انحرافات سے بچنے اور آئندہ کے لیے فکرمند ہونے کے لیے ایک واضح دلیل نہیں ہے؟

چودھواں حصّہ

كِتَابَ رَبِّكُمْ فِيكُمْ مُبَيِّنًا حَلَالَهُ وَ حَرَامَهُ وَ فَرَائِضَهُ وَ فَضَائِلَهُ وَ نَاسِخَهُ وَ مَنْسُوخَهُ وَ رُخَصَهُ وَ عَزَائِمَهُ وَ خَاصَّهُ وَ عَامَّهُ وَ عِبَرَهُ وَ أَمْثَالَهُ وَ مُرْسَلَهُ وَ مَحْدُودَهُ وَ مُحْكَمَهُ وَ مُتَشَابِهَهُ مُفَسِّرًا [جُمَلَهُ] مُجْمَلَهُ وَ مُبَيِّنًا غَوَامِضَهُ بَيْنَ مَأْخُوذٍ مِيثَاقُ عِلْمِهِ وَ مُوَسَّعٍ عَلَى الْعِبَادِ فِي جَهْلِهِ وَ بَيْنَ مُثْبَتٍ فِي الْكِتَابِ فَرْضُهُ وَ مَعْلُومٍ فِي السُّنَّةِ نَسْخُهُ وَ وَاجِبٍ فِي السُّنَّةِ أَخْذُهُ وَ مُرَخَّصٍ فِي الْكِتَابِ تَرْكُهُ وَ بَيْنَ وَاجِبٍ [لِوَقْتِهِ] بِوَقْتِهِ وَ زَائِلٍ فِي مُسْتَقْبَلِهِ وَ مُبَايَنٌ بَيْنَ مَحَارِمِهِ مِنْ كَبِيرٍ أَوْعَدَ عَلَيْهِ نِيرَانَهُ أَوْ صَغِيرٍ أَرْصَدَ لَهُ غُفْرَانَهُ وَ بَيْنَ مَقْبُولٍ فِي أَدْنَاهُ [وَ] مُوَسَّعٍ فِي أَقْصَاهُ.

''انہوں نے تمہارے درمیان تمہارے پروردگار کی کتاب کو چھوڑا ہے، جس میں حلال و حرام، فرائض و فضائل، ناسخ و منسوخ، رخصت و عزیمت، خاص و عام، عبرت و امثال، مطلق و مقید، محکم و متشابہ سب کو واضح کر دیا تھا۔ مجمل کی تفسیر کر دی تھی گتھیوں کو سلجھا دیا تھا۔ اس میں بعض آیات ہیں، جن کے علم کا عہد لیا گیا ہے اور بعض سے ناواقفیت کو معاف کر دیا گیا ہے۔ بعض احکام کے فرض کا کتاب میں ذکر کیا گیا ہے اور سنّت سے ان کے منسوخ ہونے کا علم حاصل ہوا ہے یا سنّت میں ان کے وجوب کا ذکر ہوا ہے، جب کہ کتاب میں ترک کرنے کی آزادی کا ذکر تھا۔ بعض احکام ایک وقت میں واجب ہوئے ہیں اور مستقبل میں ختم کر دیئے گئے ہیں۔ اس کے محرمات میں بعض پر جہنم کی سزا سنائی گئی ہے اور بعض گناہِ صغیرہ ہیں جن کی بخشش کی امید دلائی گئی ہے۔ بعض احکام ہیں جن کا مختصر بھی قابلِ قبول ہے اور زیادہ کی بھی گنجائش پائی جاتی ہے۔''

https://downloadshiabooks.com/

شرح وتفسیر

قرآن کی خصوصیات

نہج البلاغہ کے خطبوں میں قرآن مجید کی اہمیت اور عظمت کا بارہا ذکر کیا گیا ہے، اوران میں سے ہر بات، کچھ دیگر مطالب کو اپنے دامن میں سمیٹے ہوئے ہے۔ یہاں پر امیرالمومنین علیہ السلام نے قرآن مجید کی جامعیت کے بارے میں ایک مفصّل بحث فرمائی ہے، کیوں کہ حضرت امام علی علیہ السلام کا اصل ہدف یہ تھا کہ لوگوں کو اس نکتے کی طرف توجہ دلائیں کہ اگر رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم مسلمانوں کے درمیان سے چلے بھی گئے ہیں، تو ایک جامع ومفصّل کتاب کو ان کے درمیان یادگار کے طور پر چھوڑ کر گئے ہیں کہ جس میں لوگوں کی زندگی کی مادّی اور معنوی، انفرادی اور اجتماعی نیز تمام ذمّے داریوں کو ہر طرح سے روشن کر دیا گیا ہے، مولاؑ نے خطبے کے آغاز میں فرمایا: "كِتَابَ رَبِّكُمْ فِيكُمْ" [۱]

''پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم تمہارے پروردگار کی کتاب قرآن مجید کو تمہارے درمیان یادگار کے طور پر چھوڑ گئے ہیں۔'' اور پھر آگے چل کر قرآن مجید کی جامعیت اور خصوصیات پر چودہ نکات کی طرف اشارہ کیا ہے:

چودہ نکات

۱۔ حلال اور حرامِ الٰہی

"مُبَيِّناً حَلَالَهُ وَحَرَامَهُ وَفَرَائِضَهُ وَفَضَائِلَهُ" [۲]

''حلال، حرام فرائض، فضائل، اور مستحباتِ الٰہی کو روشن اور واضح کیا۔'' اس جملے میں احکامِ پنجگانہ کی طرف واضح اشارہ ہے، فرائض سے مراد واجبات کی طرف اشارہ ہے اور فضائل سے مراد مستحبات ہیں۔ حرام سے مراد محرمات اور حلال کی

---

[۱] کتاب، منصوب ''کتاباً'' ہے اور یہ 'ما' کے لیے عطفِ بیان کے طور پر آیا ہے، جو "خَلَفَ فِيكُمْ مَا خَلَّفَتِ الْأَنْبِيَاءُ" میں ہے یا پھر کتاب مفعول ہے ''خَلَّفَ'' یا ''اعنی'' کے لیے جو تقدیر میں ہے۔

[۲] "مبیّنا" اسمِ فاعل کی صورت میں ہے اور خلف کے فاعل کے لیے حال ہے، یعنی پیغمبر اکرمؐ اور "حلاله وحرامه" کی ضمیریں قرآن مجید کی طرف پلٹتی ہیں۔ نہج البلاغہ کے بعض مفسرین نے کہا ہے کہ مُبَيِّناً اور بعد میں آنے والے دیگر اوصاف جیسے مُفَسِّراً کِتَابَ اللہ کے لیے حال ہے اور حلالہ کی ضمیر بھی کتابُ اللہ کی طرف یا "رَبِّكُمْ" کی طرف پلٹتی ہے لیکن جو تفسیر کتاب کے متن میں آئی ہے، وہ سب سے مناسب ہے۔

https://downloadshiabooks.com/

میں مباحات اور مکروہات شامل ہیں۔

۲۔ ناسخ ومنسوخ

آیات کے ناسخ ومنسوخ ہونے کو بیان کیا: "وَنَاسِخَهُ وَمَنْسُوخَهُ" ناسخ ومنسوخ سے مراد ہر وہ نیا حکم ہے، جس کے نازل ہونے پر پہلے والا حکم ختم ہو جاتا ہے۔ یہ صرف پیغمبر اکرمؐ کے زمانے میں واقع ہوا، کیوں کہ وحی کا دروازہ کھلا ہوا تھا اور آپؐ کے زمانے میں احکام میں تبدیلی کا امکان تھا۔ اگرچہ کچھ احکام ظاہری طور پر مطلق حکم کی صورت میں تھے، لیکن باطن میں مقید یعنی معیّن وقت کے لیے تھے، جب وقت ختم ہو گیا تو حکم بھی ختم ہو گیا اور اس کی جگہ نیا حکم آیا، جسے ناسخ کہتے ہیں۔ اس کی مثال وہ آیت ہے، جس میں پیغمبر اکرمؐ سے سرگوشی کرنے سے پہلے مسلمانوں کو صدقہ وخیرات دینے کا حکم دیا گیا ہے:

"يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا إِذَا نَاجَيْتُمُ الرَّسُولَ فَقَدِّمُوا بَيْنَ يَدَيْ نَجْوَاكُمْ صَدَقَةً"[۱]

"اے ایمان والو! پیغمبر اکرمؐ سے جب تم سرگوشی کرنا چاہو تو گفتگو کرنے سے پہلے خدا کی راہ میں صدقہ دیا کرو۔"

یہ مسلمانوں کے لیے ایک امتحان تھا کہ جس پر صرف ایک فرد یعنی "امیر المومنین علی ابن ابی طالب علیہ السلام" نے عمل کیا۔ اور جلد ہی ناسخ آیت نازل ہوئی اور ارشاد ہوا:

"أَأَشْفَقْتُمْ أَنْ تُقَدِّمُوا بَيْنَ يَدَيْ نَجْوَاكُمْ صَدَقَاتٍ فَإِذْ لَمْ تَفْعَلُوا وَتَابَ اللَّهُ عَلَيْكُمْ فَأَقِيمُوا الصَّلَاةَ وَآتُوا الزَّكَاةَ وَأَطِيعُوا اللَّهَ وَرَسُولَهُ وَاللَّهُ خَبِيرٌ بِمَا تَعْمَلُونَ"[۲]

"کیا تم صدقات دینے کی وجہ سے تنگدستی اور فقیر ہونے سے ڈر گئے، سرگوشی اور راز کی بات کرنے سے پہلے ہی رک کیوں گئے؟ اب جبکہ اس کام کو انجام نہیں دے سکے ہو تو خداوند عالم نے تمہاری توبہ قبول کیا پس تم نماز قائم کرو، زکوۃ ادا کرو، خدا اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی اطاعت کرو اور جان لو! خداوند عالم جو کچھ تم انجام دیتا ہے اُس سے باخبر ہے۔"

۳۔ مباح اور ممنوع

ہم نے مباح اور ممنوع احکام کی بھی وضاحت کر دی "وَرُخَصَهُ وَعَزَائِمَهُ" اس سے مراد ممکن ہے کہ وہ اصل ہو، جو آج کے علمِ اصول اور علمِ فقہ میں معروف ہے کہ "جب کبھی کوئی واجب یا حرام کا حکم اٹھ جائے تو مباح میں تبدیل ہو جاتا

[۱] سورۂ مجادلہ: آیت ۱۲

[۲] سورۂ مجادلہ: آیت ۱۳

https://downloadshiabooks.com/

ہے۔" جیسے ارشاد ہوا: "وَإِذَا حَلَلْتُمْ فَاصْطَادُوا"۔[۱] جب احرام سے باہر آجاؤ تو شکار کر سکتے ہو۔ یہ بات بھی مسلّم ہے کہ احرام سے نکلنے کے بعد شکار کرنا کوئی واجب نہیں ہے، بلکہ مباح ہے۔ اور کبھی یہ حکم ضد میں تبدیل ہو جاتا ہے، یعنی مباح کے خلاف حکم آجاتا ہے۔

"وَإِذَا ضَرَبْتُمْ فِي الْأَرْضِ فَلَيْسَ عَلَيْكُمْ جُنَاحٌ أَنْ تَقْصُرُوا مِنَ الصَّلَاةِ"۔[۲]

"جب تم رُوئے زمین پر سفر کرو تو اس صورت میں اگر نماز میں کمی کر دو تو تم نے کوئی گناہ نہیں کیا۔ یہ"

بات بھی سب کو اچھی طرح معلوم ہے کہ سفر میں نماز قصر پڑھنا واجب ہے، نہ کہ مباح۔ واجب وحرام کے مباح کے حکم میں تبدیل ہونے کو "رخصت" کہتے ہیں وہ اس لیے کہ ہر دو طرف عمل کرنا جائز ہے۔ کسی کام کے کرنے کا عزم کر لینے کو "عزیمت" کہتے ہیں۔ ان دو اہم اصطلاحات کی تفسیر کے بارے میں یہ احتمال بھی موجود ہے کہ رخصت سے مراد احکامِ واجب یا حرام ہیں، جن میں سے کچھ موارد مستثنیٰ ہو گئے ہیں۔ جیسے

"فَمَنِ اضْطُرَّ غَيْرَ بَاغٍ وَلَا عَادٍ فَلَا إِثْمَ عَلَيْهِ"۔[۳]

"اگر کوئی شخص مجبور ہو اور سرکشی اور زیادتی کرنے والا نہ ہو اور اس (حرام) میں سے کچھ کھالے تو اس پر کوئی گناہ نہیں۔" جیسے جان بچانے کے لیے مردار کے گوشت سے صرف اسی مقدار کو کھا سکتے ہیں جتنی مقدار میں اس کی جان بچ جائے۔

عزائم ایسے احکام ہیں کہ جن میں کسی قسم کا کوئی استثنا موجود نہیں ہے، جیسے:

"وَاعْبُدُوا اللَّهَ وَلَا تُشْرِكُوا بِهِ شَيْئًا"۔[۴]

"اللہ کی عبادت کرو اور کسی چیز کو اُس کا شریک قرار نہ دو۔"

۴۔ خاص وعام

خاص وعام احکام کے بارے میں جو آیات ہیں، ان کی بھی وضاحت کر دی ہے: "وَخَاصَّهُ وَعَامَّهُ"

خاص: وہ احکام ہیں، جن میں ہر مسلمان شامل نہیں ہوتا بلکہ مخصوص افراد شامل ہوتے ہیں، جیسے حجِ بیت اللہ کا حکم، جو صرف مستطیع افراد سے مخصوص ہے:

---

[۱] سورۂ مائدہ: آیت ۲

[۲] سورۂ نساء: آیت ۱۰۱

[۳] سورۂ بقرہ، آیت ۱۷۳

[۴] سورۂ نساء، آیت ۳۶

https://downloadshiabooks.com/

"وَلِلّٰهِ عَلَى النَّاسِ حِجُّ الْبَيْتِ مَنِ اسْتَطَاعَ إِلَيْهِ سَبِيلًا"۔[۱]

''اور لوگوں پر واجب ہے کہ محض خدا کے لیے خانہ کعبہ کا حج کریں جنہیں وہاں تک پہنچنے کی استطاعت (قدرت) ہو۔''

عام: وہ احکام ہیں جو ہر مسلمان کے لیے ہیں۔ جیسے نماز کا حکم جو سب کے لیے ہے، جیسے:

"وَأَقِيمُوا الصَّلَاةَ"

''نماز قائم کرو۔''

یہاں پر یہ احتمال بھی دیا گیا ہے کہ خاص سے مراد ایسی آیات ہیں، جو ظاہراً عمومیت پر دلالت کرتی ہیں، لیکن درحقیقت وہ کسی مخصوص مورد کے لیے ہیں، جیسے آیہ ولایت:

"إِنَّمَا وَلِيُّكُمُ اللّٰهُ وَرَسُولُهُ وَالَّذِينَ آمَنُوا الَّذِينَ يُقِيمُونَ الصَّلٰوةَ وَيُؤْتُونَ الزَّكٰوةَ وَهُمْ رَاكِعُونَ"[۲]

تمہارے مالک اور سرپرست صرف خدا اور اُس کا رسولؐ اور وہ مومنین ہیں، جو پابندی سے نماز ادا کرتے ہیں اور حالت رکوع میں زکوٰۃ دیتے ہیں۔''

یہاں پر اس آیت کا مصداق صرف ایک ہے، اس سے زیادہ نہیں ہے اور وہ امیرالمومنین علی بن ابی طالب علیہما السلام کی ذاتِ گرامی ہے۔ لیکن عام سے مراد وہ آیات ہیں، جو عمومیت پر دلالت کرتی اور سب کو شامل کرتی ہیں، جیسے:

"وَالسَّارِقُ وَالسَّارِقَةُ فَاقْطَعُوا أَيْدِيَهُمَا"۔[۳]

''چوری کرنے والے مرد اور عورت کے ہاتھوں کو کاٹ دو۔''

۵۔ وعظ و نصیحت

''اُس میں نصیحتیں بھی ہیں اور مثالیں بھی ہیں "وَعِبَرَهُ وَأَمْثَالَهُ"۔ "عبر" عبرت کے مادّے سے ہے اور اس کو عبور سے لیا گیا ہے۔ یہی سبب ہے کہ جب کبھی انسان کسی حادثے کو دیکھتا ہے اور وہاں سے گزرتا ہے، تو وہاں سے اُسے مختلف مصادیق ملتے اور سمجھ میں آتے ہیں، جن سے انسان عبرت حاصل کر سکتا ہے۔ قرآن مجید تاریخ انبیاءؑ اور سابقہ قوموں کی

[۱] سورۂ آل عمران، آیت ۹۷

[۲] سورۂ مائدہ، آیت ۵۵

[۳] سورۂ مائدہ: آیت ۳۸

https://downloadshiabooks.com/

عبرتناک داستانوں سے مالا مال ہے، جو تہذیب نفس اور تربیت حاصل کرنے میں مفید ہیں۔

"امثال" قرآن مجید میں آنے والی مثالوں کی طرف اشارہ ہے، جن کی تعداد فراواں ہے، جیسے:

"أَلَمْ تَرَ كَيْفَ ضَرَبَ اللَّهُ مَثَلًا كَلِمَةً طَيِّبَةً كَشَجَرَةٍ طَيِّبَةٍ"[۱]

"کیا تم نے نہیں دیکھا کہ خدا نے اچھی بات (مثلاً کلمہ توحید) کی کیسی (اچھی) مثال بیان کی ہے کہ (اچھی بات) گویا ایک پاکیزہ درخت ہے۔"

اچھی بات گویا ایک پاکیزہ درخت کی مانند ہے، جو پھلوں سے لدا ہوا ہے اور اس سے خاص افراد کی طرف بھی اشارہ ہو سکتا ہے، جن کی زندگی قرآن مجید میں ایک مثال اور آئیڈیل کے طور پر بیان ہوئی ہے، جیسے، خداوند عالم نے مومنین کے لیے فرعون کی بیوی کی مثال بیان فرمائی:

"وَضَرَبَ اللَّهُ مَثَلًا لِلَّذِينَ آمَنُوا امْرَأَتَ فِرْعَوْنَ إِذْ قَالَتْ رَبِّ ابْنِ لِي عِنْدَكَ بَيْتًا فِي الْجَنَّةِ وَنَجِّنِي مِنْ فِرْعَوْنَ وَعَمَلِهِ وَنَجِّنِي مِنَ الْقَوْمِ الظَّالِمِينَ"[۲]

"اور خدا نے مومنین (کی تسلی) کے لیے فرعون کی بیوی (آسیہ) کی مثال بیان فرمائی ہے کہ جب اس نے دعا کی پروردگارا میرے لیے اپنے یہاں بہشت میں ایک گھر بنا اور مجھے فرعون اور اس کی کارستانی سے نجات دے اور مجھے ظالم لوگوں (کے ہاتھ) سے چھٹکارا عطا فرما۔"

۶۔ مطلق ومقید

ایسی آیات کو بھی روشن تر انداز میں بیان کیا گیا ہے اور اُن کی وضاحت فرمائی ہے: "وَمُرْسَلَهُ وَمَحْدُودَهُ"

مطلق: وہ احکام ہیں جو کسی قید و شرط کے بغیر بیان ہوئے ہیں، جیسے:

"أَحَلَّ اللَّهُ الْبَيْعَ"[۳]

"خداوند عالم نے خرید و فروخت کو حلال کر دیا ہے۔"

مقید: ایسا حکم ہے جو کسی شرط اور قید کے ساتھ بیان ہوا ہو، جیسے، وہ کاروبار جو آپ کی رضامندی سے انجام پایا ہو:

---

[۱] سورۂ ابراہیمؑ: آیت ۲۴

[۲] سورۂ تحریم، آیت ۱۱

[۳] سورۂ بقرہ: آیت ۲۷۵

https://downloadshiabooks.com/

"تِجَارَةً عَنۡ تَرَاضٍ مِّنۡكُمۡ "[1]

واضح ہے کہ مطلق ومقید کے درمیان مطلق کو مقید کے ذریعے پابند کرتے ہیں اور مذکورہ بالا مثال میں صرف اس معاملے اور کام کو صحیح جانتے ہیں کہ جس میں طرفین راضی ہوں۔

نیز مطلق سے مراد ایسے احکام کی طرف بھی اشارہ ہوسکتا ہے، جو قیدو شرط کے بغیر بیان ہوئے ہیں اور مقید سے مراد وہ احکام ہوں جو قیدو شرط کے ساتھ بیان ہوئے ہیں، جیسے بے جا قسم کھانے پر اُس کے کفارے میں ایک غلام آزاد کرنا ہے:

"اَوۡ تَحۡرِيۡرُ رَقَبَةٍ"[2]

''یا ایک غلام آزاد کرانا۔''

جب کہ قتلِ خطا کے کفارے کے بارے میں ہم پڑھتے ہیں:

"فَتَحۡرِيۡرُ رَقَبَةٍ مُّؤۡمِنَةٍ"[3]

''ایک بندۂ مومن کو آزاد کرو۔''

۷۔ محکم اور متشابہ آیات

محکم اور متشابہ آیات کو بھی واضح فرمایا ہے، جیسے:

"وَمُحۡكَمَهُ وَمُتَشَابِهَهُ"

محکم: ایسی آیات کی طرف اشارہ ہے، جو مکمل روشن اور واضح ہیں، جیسے:

"قُلۡ هُوَ اللّٰهُ اَحَدٌ"

''کہو اللہ یگانہ ہے۔''

متشابہ: اس سے مراد ایسی آیات کی طرف اشارہ ہے، جو پہلی نظر میں غیر واضح محسوس ہوتی ہیں، اگرچہ دوسری آیات کی مدد سے ان کا ابہام اور پیچیدگی دور ہوجاتی ہے، جیسے:

"اِلٰى رَبِّهَا نَاظِرَةٌ"[4]

---

[1] سورۂ نساء: آیت ۲۹

[2] سورۂ مائدہ: آیت ۸۹

[3] سورۂ نساء: آیت ۹۲

[4] سورۂ قیامت، آیت ۲۳

https://downloadshiabooks.com/

''(اُس دن) آنکھیں اپنے پروردگار کو دیکھ رہی ہوں گی۔''

دیگر آیات کی روشنی میں کہا جاتا ہے کہ خداوند متعال کے لیے نہ کوئی مکان ہے، نہ زمان اور نہ وہ جسم رکھتا ہے اور نہ اُسے دیکھا جاسکتا ہے اس سے ظاہری ابہام برطرف ہوجاتا ہے، جیسے:

"لَا تُدْرِكُهُ الْأَبْصَارُ وَهُوَ يُدْرِكُ الْأَبْصَارَ"

''اسے آنکھیں نہیں دیکھ سکتیں اور وہ آنکھوں کو دیکھتا ہے۔''[1]

۸۔ایک اور خاصیت

قرآن مجید کی کچھ مخصوص آیات جو تشریح طلب تھیں: "مُفَسِّرًا مُجْمَلَهُ وَمُبَيِّنًا غَوَامِضَهُ" ان کی تفصیلات اور تفسیر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بیانِ مبارک سے ہوئی ہیں اور چھوٹی چھوٹی باتیں کہ جن میں باریکیاں تھیں، وہ آپؐ کی تقریروں سے روشن اور واضح ہوجاتی ہیں۔

مجمل: ایسی آیات کی طرح ہیں کہ جن میں نماز کا حکم تو موجود ہے، لیکن رکعات اور ارکانِ نماز کی تفسیر موجود نہیں ہے، مگر پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ان کی تفصیل و تشریح فرماتے ہیں۔

غوامض: اس کی مثال قرآن مجید میں ''حروفِ مقطّعات'' کی ہے کہ جن کی تفصیل احادیث اسلامی میں واضح طور پر بیان ہوئی ہے۔ غوامض میں اور متشابہات میں جو فرق ہے وہ شاید یہ ہو کہ متشابہات کا تعلق ''معنی اور مفاہیم میں ابتدائی نظر کے ابہام'' سے ہے جبکہ غوامض کا تعلق ابتدائی نظر میں ہی کاملاً ابہام سے ہے، یعنی رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی جانب سے تفسیر کی ضرورت ہے، جس کی مثال اوپر بیان ہوچکی۔

۹۔ جہالت کا سہارا

"بَيْنَ مَأْخُوذٍ مِيثَاقُ عِلْمِهِ وَمُوَسَّعٍ عَلَى الْعِبَادِ فِي جَهْلِهِ"

قرآن مجید میں چند حقائق ایسے ہیں، جن کی معرفت حاصل کرنے کے بارے میں سب سے عہد و پیمان لیا گیا ہے، ان کی نسبت کوئی بھی نادانی اور جہل کا سہارا لے کر عذر پیش نہیں کرسکتا؛ اور بعض موضوعاتِ قرآن ایسے ہیں، جن کے بارے میں معرفت رکھنا، ہر خاص و عام کا وظیفہ نہیں۔

[1] سورۂ انعام، آیت ۱۰۳

https://downloadshiabooks.com/

پہلی قسم کے حقائق: جیسے وہ آیات جو خدا کی وحدانیت اور صفات کو بیان کر رہی ہیں، اُن سے تمام مؤمنین کو آگاہ اور باخبر ہونا چاہیے۔

وسری قسم کے حقائق: جیسے وہ آیات جو ذاتِ پروردگار عالم کی حقیقت بیان کرنے کے لیے ہیں، اُس کی ذات کی حقیقت اور تہہ تک پہنچنا کسی کے بس کی بات نہیں اور اُس تک رسائی ممکن نہیں۔ یہ دراصل معاد اور قیامت کی اصل حقیقت کی طرح ہے کہ کوئی اس کے عمق تک نہیں پہنچ سکتا۔ پس جب انسان کی حقیقتِ الٰہی اور قیامت کی اصلیت تک رسائی ممکن نہیں ہے تو اُس کے لیے ان چیزوں پر اعتقاد رکھنا ضروری ہے اور وہ ان کے اعتقادی پہلو سے باخبر رہے، جبکہ جنت اور جہنم کی تفصیلات سے آگاہی ضروری قرار نہیں دی گئی ہے۔

۱۰۔ جز وقتی احکام

"وَبَيْنَ مُثْبَتٍ فِي الْكِتَابِ فَرْضُهُ وَمَعْلُومٍ فِي السُّنَّةِ نَسْخُهُ"

احکام میں سے کچھ محدود زمانے کے لیے ہیں اور ان احکام کے لیے سنّت کا نسخ ہونا پیغمبر اکرمؐ کے ذریعے معلوم اور روشن ہو گیا ہے۔ جیسے (زنائے محصنہ) شادی شدہ مرد یا عورت کے زنا کرنے کی حد جنہیں قرآن مجید میں حبسِ ابد کے نام سے ذکر کیا گیا ہے۔[1] اور یہ بھی جانتے ہیں کہ اس کے بعد کچھ احادیث رجم کے بارے میں وارد ہوئی ہیں، یہ نسخ کے حکم میں آتی ہیں۔

۱۱۔ ایک عمل سنّت میں واجب، لیکن آیات میں متروک

"وَوَاجِبٍ فِي السُّنَّةِ أَخْذُهُ وَمُرَخَّصٍ فِي الْكِتَابِ تَرْكُهُ"

سنّت میں وہ احکام جن پر عمل کرنا واجب ہے، لیکن قرآن مجید میں ان کے ترک کرنے کی اجازت موجود ہے، اس بنیاد پر کہ سنّت آیات کے ذریعے نسخ ہوئی ہے۔ ظہورِ اسلام کے وقت جیسے روزے کا حکم تھا کہ اُس وقت مسلمان صرف رات کے شروع ہونے کے ساتھ ہی افطار کر سکتے تھے۔ اگر اس موقع پر سو گئے یا کسی اور کام میں مصروف ہونے کی وجہ سے روزہ افطار نہ کر سکے تو بیدار ہونے، یا کام سے فارغ ہونے کے بعد روزہ کھولنا یا افطار کرنا ان کے لیے جائز نہیں تھا، لیکن یہ سنّت پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم بعد میں اس آیۂ مجیدہ کے ذریعے منسوخ ہو گئی۔

[1] سورۂ نساء: آیت ۱۵

https://downloadshiabooks.com/

ارشاد ہوا:

"وَكُلُوا وَاشْرَبُوا حَتّٰى يَتَبَيَّنَ لَكُمُ الْخَيْطُ الْأَبْيَضُ مِنَ الْخَيْطِ الْأَسْوَدِ مِنَ الْفَجْرِ "[۱]

''کھاؤ اور پیو یہاں تک کہ صبح کی سفید دھاری رات کی کالی دھاری سے (آسمان پر مشرق کی طرف) تمہیں صاف نظر آنے لگے۔''

۱۲۔ واجبِ موقّت

"وَبَيْنَ وَاجِبٍ بِوَقْتِهِ وَزَائِلٍ فِي مُسْتَقْبَلِهِ"

بعض احکام شروع میں واجب ہوئے، لیکن بعد میں ان احکام کی وجوبیت ختم ہوگئی۔ اس عبارت میں حقیقت میں ''واجباتِ موقّت اور واجباتِ غیر موقّت'' کی طرف اشارہ ہے۔

جیسے ماہِ مبارک رمضان کے روزے جو اسی مہینے میں پورے رکھنا واجب ہیں۔ اگر پورے ہوئے تو دوسرے مہینوں میں واجب نہیں، لیکن جو واجبات دائمی ہیں، وہ گردن سے ساقط نہیں، جیسے امر بالمعروف ونہی عن المنکر، حق اور عدل وانصاف کے لیے قیام کرنا ہر مسلمان پر ہمیشہ واجب ہے۔[۲] بعض نے واجباتِ موقّت سے مراد حج کے فرائض کو لیا ہے، جو کہ پوری زندگی میں ایک بار واجب ہوتا ہے۔ اس کے بعد اس عمل کی وجوبیت ختم ہوجاتی ہے۔ بعض نے اس سے مراد ہجرت کو لیا ہے کہ ابتدائے اسلام میں مسلمانوں کی بہت کم تعداد تھی، اس وجہ سے ان پر ہجرت کرنا واجب ہوگئی۔ لیکن فتح مکہ کے بعد پھر ہجرت کا وجوب ساقط ہوگیا، مگر مکہ کی طرح دوسرے علاقوں میں فتح مکہ سے پہلے والے حالات موجود ہیں اور ہجرت کا مسئلہ بھی اپنی جگہ پر باقی ہے۔

۱۳۔ گناہان

"وَمُبَايِنٌ[۳] بَيْنَ مَحَارِمِهِ مِنْ كَبِيرٍ أَوْعَدَ عَلَيْهِ نِيرَانَهُ، أَوْ صَغِيرٍ أَرْصَدَ لَهُ غُفْرَانَهُ"

تمام محرمات کی اقسام میں سے ہر ایک کو جداگانہ، روشن وواضح کردیا گیا ہے، جن میں گناہانِ کبیرہ بھی ہیں، جن کے

---

[۱] سورۂ بقرہ: آیت ۱۸۷

[۲] اس جملے میں کچھ کلمات محذوف ہیں، تقدیر میں اس طرح ہیں "وَبَيْنَ مَا يَكُونُ وَاجِباً دَائِماً أَبَداً"

[۳] مبائن ''مبتدا'' محذوف کے لیے خبر ہے، تقدیر میں ''ھو مبائن'' ہے اور ضمیر ''ھو'' پوشیدہ ہے جو کتاب کی طرف پلٹتی ہے۔ ایک اور احتمال بھی یہاں موجود ہے مگر مناسب وہی ہے جسے ہم نے بیان کیا۔

https://downloadshiabooks.com/

بارے میں عذاب سے ڈرایا گیا ہے اور گناہانِ صغیرہ بھی ہیں، جن کے بارے میں توبہ اور معافی کا راستہ کھلا رکھا گیا ہے۔

گناہانِ کبیرہ: جیسے شرک [۱] اور قتل نفس [۲] ہے۔ قرآن مجید میں ان گناہوں کی نسبت صریحاً عذاب کا وعدہ دیا گیا ہے۔

گناہانِ صغیرہ: وہی ہیں، جن کا سورۂ نجم آیت ۳۲ میں تذکرہ ہوا ہے جو ''اللّمم'' کے عنوان سے آیا ہے:

"اَلَّذِيْنَ يَجْتَنِبُوْنَ كَبَائِرَ الْاِثْمِ وَالْفَوَاحِشَ اِلَّا اللَّمَمَ" [۳]

''جو صغیرہ گناہوں کے سوا کبیرہ گناہوں سے اور بے حیائی کی باتوں سے بچتے رہتے ہیں۔''

بعض مفسرین نے ''لمم'' کی، گناہ کیے بغیر صرف گناہ کی نیت کرنے یا معمولی گناہ کے طور پر تفسیر کی ہے۔

۱۴۔ قلیل اعمال مقبول اور زیادہ کی اجازت

"وَبَيْنَ مَقْبُوْلٍ فِيْ اَدْنَاهُ، مُوَسَّعٍ فِيْ اَقْصَاهُ"

بعض احکام کی تھوڑی سی مقدار پر عمل قابلِ قبول ہے اور اس عمل کو کثرت سے انجام دینا جائز اور اچھا عمل کہلائے گا۔ یہ مثالیں ان اعمال اور پروگراموں کے بارے میں ہیں کہ جن کو کم مقدار میں انجام دینے کی تاکید ہوئی ہے، مگر لوگ یہ عمل زیادہ سے زیادہ بھی انجام دے سکتے ہیں، اس میں وہ آزاد ہیں۔ نہج البلاغہ کے بعض مفسرین نے یہ مثال تلاوتِ قرآن مجید سے تعبیر کی ہے کہ جس میں تلاوت کا حکم ہوا ہے۔

"فَاقْرَءُوْا مَا تَيَسَّرَ مِنَ الْقُرْاٰنِ" [۴]

جتنی آسانی کے ساتھ قرآن مجید کی تلاوت کر سکتے ہو پڑھ لیا کرو۔ یہاں قرآن مجید میں سے کچھ مقدار کی تلاوت کرنے کی تاکید ہوئی ہے لیکن کوئی زیادہ پڑھنا چاہے تو اسے اختیار دیا ہے۔ (سورۂ مزمّل کی آخری آیتیں تلاوت کی اجازت کی طرف بخوبی اشارہ کرتی ہیں)

اس قسم کے احکام کے برعکس ایسے احکام بھی ہیں جن پر عمل کرنا لازمی اور واجب معیّن ہے جیسے:

"يَا اَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا كُتِبَ عَلَيْكُمُ الصِّيَامُ كَمَا كُتِبَ عَلَى الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِكُمْ لَعَلَّكُمْ

---

[۱] شرک کے بارے میں ارشاد ہوا، سورۂ مائدہ، آیت ۷۲: "مَنْ يُشْرِكْ بِاللّٰهِ فَقَدْ حَرَّمَ اللّٰهُ عَلَيْهِ الْجَنَّةَ وَمَاْوٰهُ النَّارُ"

[۲] قتل نفس کے بارے میں ارشاد ہوا، سورۂ نساء: آیت ۹۳: "وَمَنْ يَقْتُلْ مُؤْمِنًا مُتَعَمِّدًا فَجَزَاؤُهُ جَهَنَّمُ خَالِدًا فِيْهَا"

[۳] سورۂ نجم: آیت ۳۲

[۴] سورۂ مزمّل: آیت ۲۰

https://downloadshiabooks.com/

تَتَّقُونَ ○ أَيَّامًا مَّعْدُودَاتٍ ۚ فَمَن كَانَ مِنكُم مَّرِيضًا أَوْ عَلَىٰ سَفَرٍ فَعِدَّةٌ مِّنْ أَيَّامٍ أُخَرَ ۚ وَعَلَى الَّذِينَ يُطِيقُونَهُ فِدْيَةٌ طَعَامُ مِسْكِينٍ ۖ فَمَن تَطَوَّعَ خَيْرًا فَهُوَ خَيْرٌ لَّهُ ۚ وَأَن تَصُومُوا خَيْرٌ لَّكُمْ ۖ إِن كُنتُمْ تَعْلَمُونَ ○ شَهْرُ رَمَضَانَ الَّذِي أُنزِلَ فِيهِ الْقُرْآنُ هُدًى لِّلنَّاسِ وَبَيِّنَاتٍ مِّنَ الْهُدَىٰ وَالْفُرْقَانِ ۚ فَمَن شَهِدَ مِنكُمُ الشَّهْرَ فَلْيَصُمْهُ ۖ وَمَن كَانَ مَرِيضًا أَوْ عَلَىٰ سَفَرٍ فَعِدَّةٌ مِّنْ أَيَّامٍ أُخَرَ ۗ يُرِيدُ اللَّهُ بِكُمُ الْيُسْرَ وَلَا يُرِيدُ بِكُمُ الْعُسْرَ وَلِتُكْمِلُوا الْعِدَّةَ وَلِتُكَبِّرُوا اللَّهَ عَلَىٰ مَا هَدَاكُمْ وَلَعَلَّكُمْ تَشْكُرُونَ ○"[1]

ماہِ مبارک رمضان کا روزہ تمام مکلّفین پر (جن پر روزہ واجب ہے، ان سب پر پورا ایک مہینہ بغیر کسی کمی وبیشی کے) واجب ہے۔ (اگر کوئی عذرِ شرعی رکھتا ہو تو اس کا مسئلہ جداگانہ ہے۔ مترجم)

نکات

۱۔ قرآن مجید کی جامعیت

امیر المومنین علیہ السلام کے کلام کے اس حصے میں جو چیز بادی النظر میں دکھائی دیتی ہے وہ مسئلہ جامعیت قرآن اور اعجازِ قرآنِ کریم ہے۔ حضرت امام علی علیہ السلام نے چودہ نکات کے ذریعے قرآن مجید کی عظمت کو بیان فرمایا ہے۔ آپؑ نے قرآن مجید کی باریکیوں اور مختلف چھوٹے چھوٹے نکات کو نہایت عمدہ طریقے سے تفصیل کے ساتھ بیان فرمایا ہے اور مسائل اعتقادی عملی مسائل، اَخلاقی مسائل کو واجبات اور محرمات کی رُو سے اور قرآن وسنّت کے درمیان روابط، احکامِ ثابت وموقّت، عام و خاص، مطلق ومقید اور ناسخ ومنسوخ سے متعلق اور ان کے درمیان رابطے کے بارے میں لوگوں کے حالات اور ضروریات کو مد نظر رکھتے ہوئے بہترین انداز میں سمجھایا ہے۔ ان احکام میں غور وفکر سے معلوم ہوتا ہے کہ قرآن کریم کے معانی ومفاہیم اور نکات پر کس قدر باریک بینی سے کام ہوا ہے اور جنہیں انسان کی ضرورتوں کے عین مطابق بیان کیا گیا ہے۔

چنانچہ اعجازِ قرآن کریم کی بحث میں ہم نے کہا ہے کہ جامعیّتِ قرآن کا دقیق، متنوع اور جامع ہونا قرآن مجید کے معجزات میں شامل ہے۔ انسان یہ کیسے یقین کر لیتا ہے کہ ایک بغیر پڑھا لکھا انسان جہالت کے تاریک ماحول سے اٹھ کر آئے، اور فیوضاتِ وحی سے مدد لیے بغیر، صرف اپنی سوچ وفکر پر بھروسا کرتے ہوئے ایسی کتاب ان کے ہاتھ میں دیدے، جو عبرتوں کے واقعات سے بھری ہوئی ہو اور خوبصورت مثالوں سے مزین ہو، گویا جامع احکام اور معارفِ الٰہی سے پُر ہے۔

---

[1] سورۂ بقرہ: آیات ۱۸۳ تا ۱۸۵

https://downloadshiabooks.com/

عمدہ بات یہ ہے کہ امیر المومنین علیہ السلام نے اپنی اس مختصر گفتگو میں اصولِ فقہ کے مکمل ایک دورے کی طرف اشارہ فرمایا ہے اور ایسے مطالب کو نہایت آسان اور تفصیل کے ساتھ بیان فرمایا ہے جو آج کے علمِ اصول میں، جو صدیوں میں تکمیل تک پہنچا ہے، بیان ہوئے ہیں مثلاً حرام وحلال کے مسائل، ناسخ ومنسوخ، رخصت وعزیمت، خاص وعام، مطلق ومقید، محکم ومتشابہ، مجمل ومبین، موقّت وغیر موقّت، واجب ومستحب، مستحب موکد، وغیر موکد سب کو ایک دوسرے سے الگ کر کے اجمالی طور پر ان مسائل کی طرف سب کی توجہ مبذول کرائی ہے۔

۲۔ قرآنِ کریم کا علم کس کے پاس ہے؟

دی گئی مثالوں سے استفادہ ہوتا ہے کہ پیغمبر اکرمؐ کے فرائض میں سے ہے کہ کتاب اللہ میں سے کچھ مجمل آیات یا اس کے غوامض (وہ کلمات جو حروفِ مقطّعات کی طرح غیر واضح ہیں) کو واضح طور پر بیان کریں، تاکہ کسی کے لیے کوئی ابہام باقی نہ رہے۔ اس سلسلے میں قرآنِ کریم میں ارشاد ہوتا ہے:

"مَآ اٰتٰكُمُ الرَّسُوْلُ فَخُذُوْهُ"[1]

''رسول (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) جو تمہیں دیں اُسے لے لو۔''

ممکن ہے یہاں پر بعض کے لیے یہ سوال پیش آئے کہ قرآن مجید کیوں مجمل اور پیچیدگیوں کی تشریح کا محتاج ہے؟ جب کہ یہ کتاب سب کی ہدایت اور آسانی سے سمجھنے کے لیے نازل ہوئی ہے۔ اس سوال کے جواب کے لیے دو نکات کی طرف توجہ دینا ضروری ہے:

نکتۂ اوّل: قرآن مجید اسلام کے بنیادی قوانین بیان کرنے والا ہے، وہ مسائل کے اصول بیان کرتا ہے، تمام جزئیات کو ان کی ظاہری تعبیرات اور مثالوں کے ساتھ بیان نہیں کرتا، ان کی تشریح وتفسیر اور وضاحت کرنا پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ذمے داری ہے۔ مثلاً نماز وحج وروزے کے وجوب اور کسی قدر کلّی احکام کے بارے میں قرآن مجید میں آیا ہے اور ہم جانتے ہیں کہ ان عبادات کی شرائط، اجزا، موانع وفروع بہت زیادہ ہیں، ان سب کی الگ الگ شرح سے ایک مناسب اور ضخیم کتاب تیار ہوسکتی ہے۔ اور اسی طرح معاملات، قضاوت، شہادت، حدود، کلّی طور پر اسلامی سیاسیات سے مربوط مسائل، ان میں سے ہر ایک کی جداگانہ شرح اور وضاحت کی ضرورت ہے۔ یہ کام کثیر تعداد میں لکھی گئی کتابیں بھی انجام نہیں دے سکتیں، بلکہ خدا کے رسولؐ کی ضرورت ہے کہ وہ مقصد الٰہی کو بیان کریں۔

---

[1] سورۂ حشر: آیت ۷

https://downloadshiabooks.com/

نکتۂ دوّم:

مجملات و مبہمات کی تفسیر اور پیچیدگیوں کو سمجھنے کے لیے لوگوں کو رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی طرف رجوع کرنے کی ضرورت کی وجہ سے ان کا رابطہ سنّتِ رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے قائم رہتا ہے، یہی وہ ارتباط ہے، جو لوگوں کو ہر دور میں اپنے ہادیوں ،اماموں اور رہبروں کی طرف راہ دکھاتا ہے اور جوڑے رکھتا ہے، دوسرے لفظوں میں یہ کہ قرآن کریم وہ کتاب ہے، جس کے پڑھنے والے یہ احساس کرتے ہیں کہ اس میں سے کچھ مقدار سمجھنے کے لیے بھی اُستاد کی ضرورت ہے، جب اُستاد کے ساتھ ان کا رابطہ جڑا رہے گا تو اور بھی بہت سے حقائق ان پر واضح ہو سکیں گے۔

اب یہاں پر سوال یہ ہے کہ رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی رحلت کے بعد یہ معلمِ الٰہی مسلمانوں کے درمیان موجود ہے یا نہیں؟ اس میں کوئی شک نہیں ہے کہ ایسی ہستی کا مسلمانوں میں موجود ہونا ضروری ہے ورنہ مشکلات جوں کی توں باقی رہیں گی ۔یہی وہ مقام ہے جہاں ہم معتقد ہیں کہ ہر دور میں ایک ایسے امامِ معصوم کا موجود ہونا ضروری ہے، جن کے پاس تمام قرآن مجید کا علم موجود ہو اور وہ وہی ہستیاں ہیں، جنھیں پیغمبر اکرمؐ نے ثقلین جیسی متواتر روایت میں ''عترت'' کے نام سے یاد فرمایا ہے اور ان ہستیوں اور قرآنِ کریم کے اٹوٹ انگ کو قیامت تک کے لیے ناگزیر قرار دیا ہے:

''اِنِّیْ تَارِكٌ فِیْكُمُ الثَّقَلَیْنِ كِتَابَ اللهِ وَ عِتْرَتِیْ مَا اِنْ تَمَسَّكْتُمْ بِهِمَا لَنْ تَضِلُّوْا اَبَداً، وَاِنَّهُمَا لَنْ یَّفْتَرِقَا حَتّٰی یَرِدَا عَلَیَّ الْحَوْضَ۔''[1]

۳۔کبیرہ و صغیرہ گناہوں کے پہچاننے کا معیار

اس مسئلے میں کہ گناہوں میں سے کون سا بڑا اور کون سا چھوٹا گناہ ہے؟ دانشوروں کے درمیان اختلاف ہے۔ بعض دانشوروں نے ان دونوں کا آپس میں موازنہ کرتے ہوئے نسبتی امور قرار دیا ہے یعنی ان میں سے جس گناہ کی سزا کی اہمیت بیشتر ہو وہ کبیرہ گناہ ہے اور جس کی اہمیت کم ہو وہ صغیرہ گناہ ہے۔ مرحوم طبرسی نے ''مجمع البیان'' میں اس عقیدے کو شیعہ دانشوروں کی طرف نسبت دی ہے،، ظاہراً ان کے کہنے کا مقصد بعض شیعہ دانشور ہیں، کیوں کہ بہت سے شیعہ دانشوروں کا عقیدہ یہ نہیں ہے، بلکہ وہ اس بارے میں دوسرا عقیدہ رکھتے ہیں، جس سے متعلق گفتگو آگے آئے گی۔ کچھ لوگ کہتے ہیں کہ

---

[1] بیان شدہ تمام تعبیرات وہ ہیں جو شیعہ و سنّی منابع سے لی گئی ہیں۔ احقاق: جلد ۹، ص ۳۰۹ تا ۳۷۵، بحار الانوار، جلد ۲۳، ص ۱۱۸، ۱۳۲، ۱۳۴، ۱۵۵۔ پیامِ قرآن، جلد ۹۔

https://downloadshiabooks.com/

گناہانِ کبیرہ ان الفاظ سے ہی معلوم ہوتا ہے کہ وہ واقعاً بڑے گناہ ہیں اور عقل و شرع کے لحاظ سے بھی یہ امور اہمیت کے حامل ہیں۔ جیسے قتلِ نفس، لوگوں کے حقوق غصب کرنا، سود خوری، اور زنا کرنا وغیرہ۔ شاید یہی وجہ ہو کہ روایاتِ اہلِ بیتؑ میں اس گناہ کی شدت اور اہمیت کی وجہ سے انجام دینے والے کو عذابِ الٰہی کا مستحق قرار دیا گیا ہے۔

امام محمد باقر علیہ السلام، امام جعفر صادق علیہ السلام اور امام علی الرضا علیہ السلام سے ایک مشہور معروف حدیث نقل ہوئی ہے:

"اَلْكَبَائِرُ الَّتِيْ اَوْجَبَ اللهُ عَزَّوَجَلَّ عَلَيْهَا النَّارَ"۔[1]

کبیرہ گناہ وہ ہے، جس کے لیے خداوند عالم نے عذاب (جہنم کی آگ کو) واجب قرار دیا ہے اور صغیرہ گناہ وہ ہیں جو کوئی خاص اہمیت نہ رکھتے ہوں۔ بعض احادیث میں گناہانِ کبیرہ کی تعداد سات ہے اور بعض احادیث میں بیس اور بعض میں ستر ذکر ہوئے ہیں، یہ اعداد شاید گناہ کے مدارج کی طرف اشارہ ہوں۔

۴۔ ناسخ و منسوخ اور ان کا فلسفہ

ان دو موضوعات میں بعض مفسرین کے لیے شاید بہت حیرت انگیز بحث موجود ہو، اور شاید تعجب کریں کہ قرآن مجید میں ناسخ و منسوخ کا وجود کس طرح ہے؟ اس سے مراد ایک ایسا حکم آئے جو دوسرے حکم کو منسوخ کردے۔ جیسے بیت المقدس کی طرف سے خانۂ کعبہ کی طرف رخ کرکے نماز پڑھنے کا حکم۔

قوانین میں ناسخ و منسوخ کے وجود کو بنانا اور آراستہ کرنا انسانوں کی سوچ اور فکر ہے۔ اس میں تعجب کی کوئی بات نہیں، کیوں کہ ممکن ہے کہ آج قانون بنالیں اور دوسرے دن غلطیوں کی وجہ سے ختم کردیں، اسے نسخ کریں، لیکن یہ چیز احکام الٰہی میں کیسے تصور کی جاسکتی ہے؟ اس سوال کے جواب میں صرف ایک جملہ کہا جاسکتا ہے اور وہ یہ کہ خداوند عالم کے علم اور آگاہی کی کوئی حد نہیں اور کبھی تبدیل نہیں ہوتا، لیکن کچھ موضوعات میں زمانے کے گزرنے کے ساتھ ساتھ تغیر آجاتا ہے۔

مثال کے طور پر بیمار شخص کے لیے ممکن ہے، کوئی مخصوص دوا آج نفع بخش اور مفید ہو مگر چند روز گزرنے کے بعد یہی دوا بیمار کے لیے نقصان دہ اور خطرناک بھی ہوسکتی ہے اور ایک اچھا ڈاکٹر دوا کو آج استعمال کرنے کے لیے دیتا ہے، چند روز کے بعد بیمار کی دوا بدل دیتا ہے اور اس کا استعمال ممنوع قرار دیتا ہے اور قبلے والی اور اس جیسی دیگر مثالوں میں مقصد یہی ہے کہ ممکن ہے بیت المقدس میں پڑھی جانے والی ایک دن کی نماز میں بھلائی زیادہ ہو، کیوں کہ خانۂ کعبہ ان دنوں بتوں کا مرکز بنا ہوا تھا اور قومیت کا رنگ بھی غالب تھا۔ اگر شروع ہی سے کعبہ کی طرف رخ کرکے نماز پڑھی جاتی تو زیادہ مشکلات کا

---

[1] تفسیر نور الثقلین، ج۱، ص ۴۷۳

https://downloadshiabooks.com/

سامنا کرنا پڑتا، لیکن تیرہ سال بیت المقدس کی طرف رخ کر کے نماز پڑھنے سے اسلام و مسلمین سے بت پرستی کا زنگ دُھل گیا اور جب ہجرت کے بعد مدینے میں توحید کے پہلے گھر کی طرف رخ کر کے نماز پڑھی جاتی ہے تو اس میں اسلام اور مسلمین کے لیے بہت سی مصلحتیں تھیں اور نقصان کچھ بھی نہیں۔ نسخ کے تمام موارد حقیقت میں اسی طرح ہیں۔ البتہ نسخ کی بحثیں بہت زیادہ وسیع ہیں۔ لیکن یہاں مزید گفتگو کی گنجائش نہیں، ہمارا مقصد صرف فلسفۂ نسخ کے بنیادی اصول کو بیان کرنا تھا۔ [۱]

۵۔قرآن مجید کے واقعات اور خوبصورت مثالیں

قرآن مجید کا ایک اہم حصہ گزشتہ امتوں کے واقعات اور خصوصاً انبیاء علیہم السلام کے حالات پر مشتمل ہے، جو کہ ہر زمان و مکان کے لوگوں کے لیے عبرت ناک واقعات اور نمونۂ عمل کی داستانوں اور بہترین تجربات سے مزیّن ہے۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن مجید کی مختلف سورتوں میں ان سے مربوط واقعات کو نقل کیا گیا ہے۔ یہاں تک کہ کبھی ایک پیغمبر کی تاریخ جیسے حضرت ابراہیم، نوح، موسیٰ، عیسیٰ علیہم السلام کا قرآن کے مختلف سوروں میں تکرار کے ساتھ ذکر کیا گیا۔ نہ صرف تکرار بلکہ مختلف زاویوں سے اس کی وضاحت بھی ہوئی ہے ارشاد ہوتا ہے:

"لَقَدْ كَانَ فِي قَصَصِهِمْ عِبْرَةٌ لِّأُولِي الْأَلْبَابِ"۔ [۲]

ان داستانوں میں عقل مندوں کے لیے عبرتناک واقعات موجود ہیں۔ تاریخ کے علاوہ اس جہاں کے کونے کونے میں انسانوں کو سابقہ اقوام کی بچی کچھی تاریخ جو ابھی تک زندہ اور موجود ہے، اس کی طرف قرآن کریم دعوت دیتا ہے، ارشاد ہوتا ہے:

"قُلْ سِيرُوا فِي الْأَرْضِ فَانْظُرُوا كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الَّذِينَ مِنْ قَبْلُ"۔ [۳]

''(اے رسولؐ) تم کہہ دو کہ ذرا رُوئے زمین پر چل پھر کر دیکھو تو کہ جو لوگ اس کے قبل گزر گئے ان (کے افعال) کا انجام کیا ہوا۔''

قرآن مجید ان تاریخوں اور واقعات کے ضمن میں بہت سی مثالوں کے ذریعے انسانوں کی ہدایت اور مدد کرتا ہے اور یہ مثالیں بعض انسانوں کی اصل اور واقعی زندگی کے لیے نمونے ہیں۔ کبھی طبیعی کاموں میں سبزہ زار اور حیوانات کی تشبیہات ہیں، ان مثالوں میں بے انتہا کشش، اثر پذیری اور زندگی کے آثار پائے جاتے ہیں، یہی وجہ ہے کہ انہیں اعجازِ قرآن میں

---

[۱] تفسیر نمونہ: جلد ۱، ص ۳۹۰۔ سورۂ بقرہ: آیت ۱۰۶

[۲] سورۂ یوسف: آیت ۱۱۱

[۳] سورۂ روم: آیت ۴۲

https://downloadshiabooks.com/

سے قرار دیا جا سکتا ہے، اسی طرح قرآن مجید کہتا ہے:

''وَلَقَدْ ضَرَبْنَا لِلنَّاسِ فِي هٰذَا الْقُرْآنِ مِن كُلِّ مَثَلٍ لَّعَلَّهُمْ يَتَذَكَّرُونَ''[۱]

''اور ہم نے تو اس قران میں لوگوں کے (سمجھانے کے) واسطے ہر طرح کی مثل بیان کر دی تا کہ یہ لوگ نصیحت حاصل کریں۔''

ان مثالوں میں تدبر و تفکر کرنا عقل مندوں کی بیداری کی علامت ہے۔ امیر المومنینؑ نے مذکورہ بیان کو جامعیت قرآن کریم کا نام دیتے ہوئے، خصوصاً اس نکتے پر زور دیا اور تمام مسلمانوں کی اس طرف توجہ دلائی ہے۔

پندرہواں حصّہ

وَفَرَضَ عَلَيْكُمْ حَجَّ بَيْتِهِ الْحَرَامِ الَّذِي جَعَلَهُ قِبْلَةً لِلْأَنَامِ يَرِدُونَهُ وُرُودَ الْأَنْعَامِ وَ [يَوْلَهُونَ] يَأْلَهُونَ إِلَيْهِ [وَلَهَ] وُلُوهَ الْحَمَامِ وَ جَعَلَهُ سُبْحَانَهُ عَلَامَةً لِتَوَاضُعِهِمْ لِعَظَمَتِهِ وَإِذْعَانِهِمْ لِعِزَّتِهِ وَ اخْتَارَ مِنْ خَلْقِهِ سُمَّاعاً أَجَابُوا إِلَيْهِ دَعْوَتَهُ وَ صَدَّقُوا كَلِمَتَهُ وَ وَقَفُوا مَوَاقِفَ أَنْبِيَائِهِ وَ تَشَبَّهُوا بِمَلَائِكَتِهِ الْمُطِيفِينَ بِعَرْشِهِ يُحْرِزُونَ الْأَرْبَاحَ فِي مَتْجَرِ عِبَادَتِهِ وَ يَتَبَادَرُونَ عِنْدَهُ مَوْعِدَ مَغْفِرَتِهِ جَعَلَهُ سُبْحَانَهُ وَ تَعَالَى لِلْإِسْلَامِ عَلَماً وَ لِلْعَائِذِينَ حَرَماً [وَ] فَرَضَ حَقَّهُ وَ أَوْجَبَ حَجَّهُ وَ كَتَبَ [عَلَيْهِ] عَلَيْكُمْ وِفَادَتَهُ فَقَالَ سُبْحَانَهُ وَ لِلّٰهِ عَلَى النَّاسِ حِجُّ الْبَيْتِ مَنِ اسْتَطَاعَ إِلَيْهِ سَبِيلًا وَ مَنْ كَفَرَ فَإِنَّ اللّٰهَ غَنِيٌّ عَنِ الْعَالَمِينَ.

''پروردگار نے تم لوگوں پر حج بیت الحرام کو واجب قرار دیا ہے جسے لوگوں کے لیے قبلہ بنایا ہے اور جہاں لوگ پیاسے جانوروں کی طرح بے تابانہ وارد ہوتے ہیں اور ویسا اُنس رکھتے ہیں جیسے کبوتر اپنے آشیانے سے رکھتا ہے۔ حج بیت اللہ کو مالک نے اپنی عظمت کے سامنے جھکنے کی علامت اور اپنی عزت و تکریم کی نشانی قرار دیا ہے۔

اُس نے مخلوقات میں سے اُن بندوں کا انتخاب کیا ہے جو اُس کی آواز سن کر لبیک کہتے ہیں اور اس کے کلمات کی تصدیق کرتے ہیں۔ انہوں نے انبیاؑ کے مواقف میں وقوف کیا ہے اور طواف عرش کرنے والے فرشتوں کا انداز اختیار کیا ہے۔ یہ لوگ اپنی عبادت کے معاملے میں برابر فائدے حاصل کر رہے ہیں اور مغفرت کی وعدہ گاہ کی طرف تیزی سے سبقت کر رہے ہیں۔ پروردگار نے کعبے کو اسلام کی نشانی اور بے پناہ افراد کی پناہ گاہ قرار دیا ہے۔ اس کے حج کو فرض کیا ہے اور اس

[۱] سورۂ زمر: آیت ۲۷

کے حق کو واجب قرار دیا ہے۔ تمہارے اوپر اس گھر کی حاضری کو لکھ دیا ہے اور صاف اعلان کر دیا ہے کہ ''اور لوگوں پر واجب ہے کہ محض خدا کے لیے خانہ کعبہ کا حج کریں جنہیں وہاں تک پہنچنے کی استطاعت (قدرت) ہو اور جس نے باوجود قدرت حج سے انکار کیا تو (یاد رکھیے کہ) خدا سارے جہاں سے بے پرواہ ہے۔''

شرح و تفسیر

خطبے کا آخری حصّہ، حج کی عظمت

یہ بات واضح نہیں کہ امیر المومنینؑ نے عظمتِ قرآن بیان کرنے کے بعد خطبے کے کون سے حصّے میں احکامِ دین کے بارے میں اشارہ فرمایا ہے ہیں، لیکن ہم یہ ضرور جانتے ہیں کہ سیّد رضیؒ جنہوں نے نہج البلاغہ کی جمع آوری کی ہے، ان کا مقصد خطبوں کو بطورِ کامل ذکر کرنا نہیں تھا، بلکہ ہر خطبے سے چیدہ چیدہ حصوں کو جمع کرنا تھا، بہر حال یہاں پر مسئلۂ حج جو اسلامی وظائف اور ضروری ذمّے داریوں میں سے ایک ہے، وہ بھی ایسے خطبے میں کہ جس میں دنیا کی خلقت کا آغاز اور مختلف مراحل سے انسان کے گزرنے کے واقعات کو حضرت پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ظہور تک کو محورِ بحث قرار دیا گیا ہے، ایک مخصوص معنی و مفہوم کی طرف اشارہ ہے کہ حج بیت اللہ، اسلام کا خلاصہ ہے۔

اس موضوع کے مختلف پہلوؤں کو زیرِ بحث لایا گیا ہے، جن میں انفرادی، اجتماعی، تربیتی، اَخلاقی اور سیاسی مسائل سرفہرست ہیں۔ شروع میں، مسئلہ حج کے وجوب کے بارے میں بات کرتے ہوئے بہت دقیق اور باریکیوں کے ساتھ خوبصورت تعبیرات اور مثالوں کے ذریعے گفتگو فرماتے ہیں اور تمام دنیا کے مسلمانوں کو اس عظیم فریضے کا شوق دلاتے ہوئے فرماتے ہیں: ''وَفَرَضَ عَلَيْكُمْ حَجَّ بَيْتِهِ الْحَرَامِ'' خداوند عالم نے اپنے محترم گھر کے حج کو تم سب پر واجب کر دیا ہے اور پھر خانہ کعبہ کی تعریف و توصیف میں فرماتے ہیں، وہ گھر جسے خدا نے تمام انسانوں کے لیے قبلہ قرار دیا ہے: ''اَلَّذِيْ جَعَلَهُ قِبْلَةً لِلْاَنَامِ'' [1] ہم ہر روز صبح و شام کئی مرتبہ اُس کی طرف رخ کر کے نماز پڑھتے ہیں اور جماعت کی صفوں کا مرکزی دائرہ دراصل دنیا کے تمام مسلمانوں کی وحدت کا راز ہے۔ خانۂ الٰہی کی دوسری توصیف یہ ہے کہ یہ مقدّس مکان

[1] ''انام'' سے مراد انسان (جمع) ہیں اور اس سے بعض نے ''صاحبِ عقل مخلوق'' مراد لی ہے (چاہے وہ انسان ہوں یا جنات ہوں) پہلے معنی کی بنیاد پر جملے کا مفہوم یہ ہے کہ ''حج صرف انسانوں سے متعلق ہے'' اور دوسرے معنی کی بنیاد پر حج جنّ و انس دونوں کے لیے ہے بعض اہلِ نظر کے مطابق ''انام'' کی اصل ''ونام'' ہے جس کے معنی ''آواز دینا'' ہے، لہٰذا اس سے مراد یا تو تمام ''ذی روح موجودات'' ہیں یا پھر صرف ''جنّ و انس'' مراد ہیں۔ (تاج العروس مادّۂ انم)

https://downloadshiabooks.com/

عشقِ الٰہی سے سرشار لوگوں کو حقیقی حج کے مراسم کی ادائیگی کے لیے اپنی طرف دعوت دیتا ہے۔

مولا علی علیہ السلام اس مکان کی یوں تعریف فرماتے ہیں:

"يَرِدُونَهُ [۱] وُرُودَ الْاَنْعَامِ وَيَأْلَهُونَ [۲] اِلَيْهِ وُلُوهَ الْحَمَامِ [۳]"

"اطراف واکنافِ عالم سے جس طرح پیاسے اپنی پیاس بجھانے کے لیے پانی تک پہنچ جاتے ہیں، اسی طرح لوگ اس گھر کی طرف کھنچے چلے آتے ہیں، اور کبوتروں کی طرح وہاں پناہ لیتے ہیں۔"

حقیقت میں وہ لوگ جو حج کے معنی کو اچھی طرح جانتے ہیں، وہ اسی طرح سے خانۂ خدا کی زیارت کو آتے ہیں؛ اور اپنے قلب وروح کو اس طریقے سے پاک وپاکیزہ کرتے ہیں اور اپنے پورے وجود سے حج کی معنویت اور روحانیت سے فائدہ اٹھاتے ہیں، نیز شرِ شیاطین، ہوائے نفسانی اور گناہوں کی بلاؤں سے چھٹکارا پانے کے لیے خانۂ کعبہ جا کر پناہ لیتے ہیں؛ عاشقانہ انداز میں لبیک کی آوازیں بلند کرتے ہیں، صفا ومروہ کے درمیان ایسے سعی کر رہے ہوتے ہیں جیسے مجنون؛ ایسا لگتا ہے جیسے شمع کے گرد پروانے چکر کاٹ رہے ہیں۔

حاجیوں کی انعام سے تشبیہ یا تو حجاجِ بیت اللہ کی غیر معمولی تواضع وانکساری کی وجہ سے ہے یا بیت اللہ کی طرف طواف کے لیے تیزی کے ساتھ لپکنے نیز خانہ خدا کی زیارت کے لیے بےقراری اور بےتابی کی کیفیت کی جانب اشارہ ہے۔

اس طرح کی تعبیرات عرب میں اور معنی رکھتی ہیں، جبکہ ہمارے یہاں اس کے معنی کچھ اور ہیں، کبوتر کی مثال، محبت، صلح اور امن نیز رغبت کے ساتھ شوقِ وصال کی علامت کے طور پر استعمال ہوئی ہے۔

قابلِ توجہ بات یہ ہے کہ حج کا آغاز احرام اور تلبیہ "لَبَّيْكَ اللّٰهُمَّ لَبَّيْكَ" کہنا ہے اور یہی لبیک ہے کہ جس کا مفہوم دعوتِ الٰہی کو قبول کرنا ہے۔

جی ہاں! خداوند عالم نے اپنے گھر کے زائرین کو ایک وسیع وعریض مہمان سرا میں دعوت دی ہے اور وہ لبیک کہتے

---

[۱] "یردون" مادّہ "ورود" سے ہے، دراصل اس کے معنی "پیاسے حیوانات کا پانی کے گھاٹ پر آنا" ہے۔ پھر کسی بھی جگہ ہر طرح سے داخل ہونے پر اس کا اطلاق ہوا ہے۔

[۲] یالھون، بعض نے اسے الہ، الوھا کے مادّے سے عبادت کے معنی میں لیا ہے۔ بنا بر ایں یالھون یعنی عبادت کرتے ہیں، اور کبھی یہ بھی کہا گیا ہے کہ یہ تحیر کے معنی میں آیا ہے، کیوں کہ جس وقت انسان ذات وصفاتِ پروردگار کے بارے میں سوچتا ہے تو وہ متحیر ہو جاتا ہے اور کبھی یہ کہا گیا ہے کہ اس کا اصلی مادّہ ولہ ہے کہ اس میں واو ہمزے میں بدل گیا ہے (اوپر جاری جملے ولوہ کی مثال مفعول مطلق کی صورت میں ہونا اس معنی کے لیے مؤید بھی ہے۔ خود اس لفظ کے معنی پناہ لینا ہیں اور شوق سے گریہ وزاری کرنے کے ہیں۔

[۳] حمام، ح پر فتحہ کے ساتھ کبوتر کے معنی ہیں اور حمام، ح زیر کے ساتھ موت کے معنی دیتا ہے اور مذکورہ بالا عبارت میں پہلا معنی مراد ہے۔

https://downloadshiabooks.com/

ہوئے دلی شوق اور عشق سے سرشار، اُس ذات سے ملاقات کی اُمنگ لیے اس گھر کی طرف کھنچے چلے آتے ہیں اور اس کی قربت میں سکون محسوس کرتے ہیں اور ان کے اوپر پہلا اثر یہ ہوتا ہے کہ تقویٰ و معنویت کے اعتبار سے دل اور جان میں تازگی محسوس کرتے ہیں۔ پس! حج کے فلسفوں میں سے ایک فلسفہ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

"وَ جَعَلَهُ سُبْحَانَهُ عَلَامَةً لِتَوَاضُعِهِمْ لِعَظَمَتِهِ وَاِذْعَانِهِمْ لِعِزَّتِهِ"

''خداوند عالم نے حج کو اپنی عظمت کے سامنے علامت انکساری قرار دیا ہے اور اسے اپنی عزت کے اعتراف کی نشانیوں میں سے ایک نشانی قرار دیا ہے۔''

کیوں کہ مناسکِ حج وہ عاجزانہ اعمال ہیں جو حق سبحانہٗ کی بارگاہ میں انجام پاتے ہیں۔ عبادتوں میں سے کسی اور عبادت میں حج کے فریضے کی طرح تواضع و انکساری نمایاں نہیں ہے۔ تمام لباسوں، مال و دولت، زیور، جاہ و حشم، اقتدار و بادشاہت، سب کو چھوڑ کر احرام باندھنا اور بغیر سلے ہوئے دو کپڑے کے ٹکڑوں پر قناعت کرتے ہوئے خانۂ خدا کے گرد طواف، صفا و مروہ کے درمیان سعی، عرفات و منیٰ و مشعر میں وقوف، شیاطین پر پتھر مارنا، سر منڈوانا، یہ سب ایسے اعمال ہیں، جو پروردگار کی عظمت کے سامنے انتہائی تواضع کے انداز میں انجام پاتے ہیں۔ سچ تو یہ ہے کہ یہ عمل ہر انسان کے غرور و تکبّر اور بڑے پن کو پاؤں تلے روند ڈالتا ہے۔ اور پھر اس حقیقت کی طرف اشارہ ہے کہ حاجیوں اور زائروں کی صفوں میں ہونا ایک اعزاز ہے، اور یہ بڑے فخر کی بات ہے کہ خدا نے اپنے بندوں میں سے ایک گروہ کو یہ توفیق عطا کی، اور فرمایا:

"وَاخْتَارَ مِنْ خَلْقِهِ سُمَّاعاً[1] اَجَابُوْا اِلَيْهِ[2] دَعْوَتَهُ وَصَدَّقُوْا كَلِمَتَهُ"

''پروردگار نے اپنی مخلوقات میں سے ایسے سننے والوں کو منتخب کیا ہے کہ جو اس کی دعوت پر لبیک کہتے ہوئے اس کی دعوت کو قبول کرتے ہیں اور اس طرح اُس ذاتِ پاک کے کلمے کی تصدیق کرتے ہیں۔''

احادیثِ مبارکہ میں آیا ہے کہ حضرت ابراہیم اور اسماعیل علیہما السلام جب خدا کے حکم کی تعمیل کرتے ہوئے خانۂ خدا کی بنیاد رکھ چکے، تو خداوند متعال نے حضرت ابراہیمؑ کو حکم دیا کہ لوگوں کو بلند آواز سے حج کی طرف دعوت دو، آپؑ نے عرض کی: پروردگارا! میری آواز ان تک کیسے پہنچے گی؟ خداوند عالم نے فرمایا: آپ آواز بلند کریں پہنچانا میرا کام ہے، حضرت ابراہیمؑ خانۂ کعبہ سے ملحق ایک اونچے ٹیلے پر چلے گئے۔ وہ مقام (خدا کے اذن سے) اتنا بلند ہوا کہ تمام اشیاء حتیٰ کہ پہاڑوں سے بھی کہیں زیادہ اونچائی پر پہنچ گیا اور پھر آپؑ نے کانوں میں انگلیاں ڈالیں اور اونچی آواز میں مغرب و مشرق کی جانب رخ

---

[1] سماع، طلاب کے وزن پر، سامع کی جمع ہے جیسے طالب کی جمع طلاب ہے۔

[2] ''اَجَابُوْا اِلَيْهِ'' ضمیر الیہ خانۂ کعبہ کی طرف یا ذاتِ خدا کی طرف پلٹتی ہے، دونوں صورتوں میں جملے کے مفہوم میں کوئی خاص فرق نہیں آئے گا۔

https://downloadshiabooks.com/

کر کے صدا دی:

"اَيُّهَا النَّاسُ كُتِبَ عَلَيْكُمُ الْحَجُّ اِلَى الْبَيْتِ الْعَتِيْقِ فَاَجِيْبُوْا رَبَّكُمْ [۱]"

''اے لوگو! خانۂ خدا کا حج تم پر واجب کر دیا گیا ہے، خدا کی دعوت کو قبول کرو'' اور حج بیت اللہ کے لیے چلے آؤ۔''

ہر طرف ان کی آواز سنائی دینے لگی۔ اس معجز نما آواز کے بلند ہوتے ہی دنیا کے گوشے گوشے میں ہل چل مچ گئی اور سات سمندر پار کے لوگ، مشرق و مغرب میں رہنے والے، زمین کے آخری گوشے تک کے لوگ، یہاں تک کہ صلبِ پدر اور رحم مادر میں موجود بچوں نے بھی حضرت ابراہیمؑ کی آواز کو حکمِ خدا سے سنا اور سب نے یک زبان ہو کر کہا: "لَبَّيْكَ اللّٰهُمَّ لَبَّيْكَ"۔ بعض روایتوں میں آیا ہے کہ جس نے صدائے ابراہیم خلیلؑ پر جتنی بار لبیک کہا ہے، اتنی ہی مرتبہ وہ حج بیت اللہ انجام دے سکے گا اور جن کو لبیک کہنے کی توفیق نہیں ہوئی، ان کے نصیب میں حج خانۂ خدا نہیں ہوگا۔ [۲]

مولاؑ ایک بار پھر حج کے فلسفے اور اس کے تربیتی اثرات اور نشانیوں کی جانب اشارہ کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

"وَوَقَفُوْا مَوَاقِفَ اَنْبِيَآئِهٖ وَتَشَبَّهُوْا بِمَلٰٓئِكَتِهِ الْمُطِيْفِيْنَ بِعَرْشِهٖ"

''خانۂ خدا کا حج کرنے والے پیغمبروںؑ سے مشابہ نظر آتے ہیں، ان ہستیوں کی طرح مختلف مقامات پر ''وقوف'' کرتے ہیں، گویا فرشتے ہیں، جو عرشِ الٰہی کے گرد چکّر لگا رہے ہوں۔''

''مواقفِ انبیاءؑ'' کی تعبیر اس لیے ہے کہ حضرت ابراہیمؑ کے بعد انبیاؑ کی کافی تعداد اور بعض روایات کے مطابق آپؑ سے پہلے بھی انبیاؑ اس مقدّس مکان کی زیارت کے لیے تشریف لاتے رہے ہیں۔ [۳]

فرشتوں سے اس لیے تشبیہ دی ہے کہ خداوند متعال نے خانۂ کعبہ کے بالکل اُوپر آسمانوں میں ایک گھر بنایا ہے اور فرشتے اُس گھر کے گرد طواف کرتے ہیں [۴]۔

آثار و اَسرارِ حج کے موضوع کو جاری رکھتے ہوئے فرماتے ہیں:

"يُحْرِزُوْنَ [۵] الْاَرْبَاحَ فِيْ مَتْجَرِ عِبَادَتِهٖ وَيَتَبَادَرُوْنَ عِنْدَهٗ مَوْعِدَ مَغْفِرَتِهٖ"

---

[۱] نور الثقلین، جلد ۳، ص ۲۸۸، حدیث ۴۷

[۲] شرح نہج البلاغہ، جلد ۲، ص ۲۴۹ میں مرحوم خوئی نے کافی سے نقل کیا ہے، بحار الانوار، جلد ۹۶، ص ۱۸۷

[۳] احادیث میں آیا ہے کہ خدا کے وہ انبیاؑ جنھوں نے خانۂ الٰہی کی زیارت فرمائی، اُن میں حضرت آدمؑ، نوحؑ، ابراہیمؑ، موسیٰؑ، یونسؑ، عیسیٰؑ، سلیمانؑ نیز پیغمبر اسلامؐ شامل ہیں۔ شرح نہج البلاغہ خوئی، جلد ۲، ص ۲۵۲۔

[۴] شرحِ نہج البلاغہ، ابن ابی الحدید، جلد ۱، صفحہ ۱۲۴

[۵] ''یحرزون'' احراز کے مادّے سے ہے۔ اس کے معنی حفاظت کرنا اور جمع کرنا ہے۔ اسی لیے حرز ایسی جگہ کو کہتے ہیں جو صندوق یا گودام کی طرح محفوظ ہو۔

https://downloadshiabooks.com/

حجاج عبادتِ الٰہی کے اس تجارتی مرکز سے بہت زیادہ نفع کماتے ہیں اور معافی و مغفرت کی وعدہ گاہ تک پہنچنے میں جلدی کرتے ہیں۔

"یُحْرِزُوْنَ" سے مراد جمع کرنا، "اَلْاَرْبَاحَ" سے مراد منافع، اور "مَتْجَرِ" سے مراد تجارتی مرکز ہے۔ یہ سارے الفاظ ایسے لطیف وظریف تعبیرات ہیں کہ جن کے ذریعے معنویت سے سرشار اس مہم ترین اسلامی پروگرام کو روزمرہ کی ایک معمولی اور عام فہم مثال سے تشبیہ دے کر ہر ایک کو اسے سمجھنے میں بڑی آسانی پیدا کر دی ہے۔ اس (حج) سے زیادہ بہترین تجارت اور کون سی ہوگی اور اس سے زیادہ عظیم عمل کون سا ہوگا کہ جو اگر صحیح طرح سے انجام پا گیا، تو انسان تمام گناہوں سے پاک ہو جائے گا، بالکل ایسے، جیسے ابھی شکمِ مادر سے معصوم بچہ پیدا ہوا جیسا کہ احادیثِ مبارکہ میں ایسا ہی بیان ہوا ہے۔ آپؑ مزید فرماتے ہیں:

"جَعَلَهُ سُبْحَانَهُ وَتَعَالٰى لِلْاِسْلَامِ عَلَمًا وَلِلْعَائِذِيْنَ حَرَمًا"

''خداوند متعال نے اس گھر کو اسلام کے لیے ایک پرچم (یا علامت) اور پناہ لینے والوں کے لیے جائے امن قرار دیا ہے۔''

حقیقت یہ ہے کہ خانۂ کعبہ اسلام کا وہ عظیم پرچم ہے، جو ہمیشہ آب و تاب کے ساتھ لہراتا رہے گا۔ اور مسلمان اطراف واکنافِ عالم سے اس کے گرد جمع ہوتے ہیں اور اپنے استقلال وعظمت اور عزت کو اعمالِ حج کے مرہونِ منت سمجھتے ہیں اور ہر سال خانۂ خدا کا دیدار، مسلمانوں کے پیکر میں نئی روح پھونکتا ہے، جو اُن کی رگوں میں تازہ خون کی طرح سرایت کرتا رہتا ہے۔ اس طرح ان تمام فضائل اور اسرارِ حج کے بیان کے ذریعے، خانۂ خدا کی زیارت کے واجب ہونے کی جانب متوجہ کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

"فَرَضَ حَقَّهُ وَ اَوْجَبَ حَجَّهُ وَ كَتَبَ عَلَيْكُمْ وِفَادَتَهُ[1] فَقَالَ سُبْحَانَهُ وَلِلّٰهِ عَلَى النَّاسِ حِجُّ الْبَيْتِ مَنِ اسْتَطَاعَ اِلَيْهِ سَبِيْلًا وَمَنْ كَفَرَ فَاِنَّ اللّٰهَ غَنِيٌّ عَنِ الْعَالَمِيْنَ"

''خداوند متعال نے اس کا حق تم پر واجب، اور اس کے حج کو لازم کر دیا ہے، تم سب کو اس کی زیارت اجتماعی طور پر کرنی ہے۔ سو، وہ لوگ جو استطاعت رکھتے ہیں، اُن سب پر لازم ہے کہ خدا کے گھر کا قصد کریں، اگر کسی نے انکار کیا اور حج کو ترک کیا تو (اس نے اپنا نقصان کیا) اللہ تعالیٰ سب سے بے نیاز ہے۔''

---

[1] ''وفادۃ'' کے بنیادی معنی طلوع کرنا اور ظاہر ہونا ہے اور پھر بعد میں یہ لفظ ''نزول'' اور ''ورود'' کے معنی میں بھی استعمال ہونے لگا ہے۔ وفد ایسے گروہ کو کہتے ہیں، جو کسی ملک کے دورے پر جاتا ہے یا کسی حاکم، فرد یا صاحبِ حیثیت گروہ سے ملاقات کے لیے آتا اور جاتا ہے۔

https://downloadshiabooks.com/

نکات

مسائلِ حج کی بحثیں بہت زیادہ ہیں۔ان سب کو بیان کرنے کے لیے ایک مستقل کتاب درکار ہے،ہم یہاں پر چند اہم نکات کی طرف اشارہ کرنے پر اکتفا کرتے ہیں:

۱۔خانۂ کعبہ کی تاریخ

یہ گھر جس کا دوسرا نام بیت اللہ الحرام ہے۔[۱] اس کی تاریخ بہت تفصیلی ہے،روایات کے مطابق حضرت آدم علیہ السلام کے زمانے کو جب ہم دیکھتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ سب سے پہلے جنہوں نے اس مکان کی بنیاد رکھی وہ حضرت آدمؑ تھے اور اس کے طواف کے لیے آیا کرتے تھے؛ طوفانِ نوحؑ میں یہ گھر ویران ہو گیا تھا؛ بعد میں حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اپنے بیٹے حضرت اسماعیل علیہ السلام کی مدد سے اسے دوبارہ تعمیر کیا؛ جس پر قرآن مجید کی آیا بڑی صراحت کے ساتھ دلالت کرتی ہیں جیسے:

"وَإِذْ يَرْفَعُ إِبْرَاهِيمُ الْقَوَاعِدَ مِنَ الْبَيْتِ وَإِسْمَاعِيلُ"۔[۲]

''اور اس وقت کو یاد کرو جب ابراہیمؑ اور اسماعیلؑ خانہ کعبہ کی بنیادیں بلند کر رہے تھے۔''

"إِنَّ أَوَّلَ بَيْتٍ وُضِعَ لِلنَّاسِ لَلَّذِي بِبَكَّةَ مُبَارَكًا وَهُدًى لِلْعَالَمِينَ"۔[۳]

''روئے زمین پر سب سے پہلے اسی گھر کو بنی نوع انسان کے لیے توحید کا مرکز قرار دیا گیا۔''

لوگوں کے لیے عبادت کے واسطے جو گھر سب سے پہلے بنایا گیا،تو یقیناً وہ یہی کعبہ ہے جو مکے میں ہے، یہ بڑی خیر و برکت والا گھر ہے اور پوری دنیا کے لوگوں کے لیے رہنما ہے۔اور یہ تمام انسانوں کے لیے یکتا پرستی کا سب سے پہلا گھر قرار دیا گیا۔اور جس طرح پہلے ذکر ہوا کہ روایات کے مطابق آسمانوں میں بھی خانہ کعبہ جیسا مرکز فرشتوں کے طواف اور عبادت کے لیے موجود ہے۔ یہاں تک کہا جاتا ہے کہ خانہ کعبہ کی جگہ خشکی کا وہ پہلا نقطہ،محل،مرکز اور نشان ہے، جسے پانی کے نیچے سے اوپر لایا گیا۔[۴] "دَحْوُ الْأَرْض" کا واقعہ بھی اسی حقیقت کو بیان کرتا ہے کہ ابتدا میں رُوئے زمین کا پورا خطہ بارشوں اور سیلابوں کی وجہ سے پانی کے نیچے ڈوبا ہوا تھا،وقت گزرنے کے ساتھ بعض علاقوں میں آہستہ آہستہ پانی کی سطح کم ہونے لگی

---

[۱] بحار الانوار: جلد ۱۲،ص ۸۶

[۲] سورۂ بقرہ: آیت ۱۲۷

[۳] سورۂ آلِ عمران: آیت ۹۶

[۴] شرح نہج البلاغہ خوئی: جلد ۲،ص ۲۳۵

https://downloadshiabooks.com/

اور خشکی کا حصّہ پانی سے باہر نمودار ہو گیا، جس میں سب سے پہلے خانۂ خدا کا مقام پانی سے باہر آیا تھا۔

خانۂ کعبہ کی عظمت اور اہمیت کے سلسلے میں وافر تعداد میں روایات، نہج البلاغہ اور دوسری کتابوں میں وارد ہوئی ہیں، ان میں سے ایک حدیث حضرت امام محمد باقر علیہ السلام سے نقل ہوئی ہے، فرماتے ہیں:

"مَا خَلَقَ اللهُ عَزَّوَجَلَّ بُقْعَةً فِي الْاَرْضِ اَحَبَّ اِلَيْهِ مِنْهَا ، ثُمَّ اَوْمَأَ بِيَدِهِ نَحْوَ الْكَعْبَةِ وَلَا اَكْرَمَ عَلَى اللهِ عَزَّوَجَلَّ مِنْهَا"

"خداوند متعال کی نظر میں زمین پر کوئی مقام ایسا نہیں جو اُسے خانۂ کعبہ سے زیادہ محبوب ہو۔ اس کے بعد امامؑ نے ہاتھ سے کعبہ کی جانب اشارہ کرتے ہوئے فرمایا: "اور اس مقام سے زیادہ مکرم کوئی جگہ خدا کی نظر میں نہیں۔"

اس حدیث کے شروع میں یہ جملہ بھی ذکر ہوا ہے کہ: "اِنَّ النَّظَرَ اِلَيْهَا عِبَادَةٌ" اس گھر کی طرف نگاہ کرنا بھی عبادت ہے۔ [1]

خانۂ کعبہ وحدتِ مسلمین کی علامت ہے اور پوری دنیا میں عبادت گزاروں کی صبح وشام قائم ہونے والی جماعتوں کی صفوں کا مرکزی دائرہ ہے۔ خانۂ کعبہ، مسلمینِ جہاں کا بہت بڑا اجتماعی مرکز ہے اور سال کے بارہ مہینوں میں ان کی سربلندی اور عظمت کے لیے اہم ترین تربیت گاہ ہے کہ جہاں ساری دنیا سے مسلمان آتے ہیں اور معنوی اور مادّی اعتبار سے اس گھر کے غیر معمولی فیوض اور برکات سے بہرہ مند ہوتے ہیں۔

قابلِ توجہ بات یہ ہے کہ حضرت امام محمد باقر اور حضرت امام جعفر صادق علیہما السلام کے بزرگ صحابی حضرت زرارہؓ نے ایک دن حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام کی خدمت میں عرض کیا:

"جَعَلَنِيَ اللهُ فِدَاكَ اَسْئَلُكَ فِي الْحَجِّ مُنْذُ اَرْبَعِيْنَ عَامًا فَتُفْتِيْنِيْ"

میری جان آپؑ پر فدا ہو، چالیس سال سے احکامِ حج سے متعلق آپؑ سے سوال پوچھتا آرہا ہوں اور آپؑ جواب مرحمت فرماتے ہیں، (لیکن سوال وجواب کا یہ سلسلہ ابھی تک ختم نہیں ہوا!) امامؑ نے جواب میں فرمایا:

"يَا زُرَارَةُ بَيْتٌ يُحَجُّ اِلَيْهِ قَبْلَ آدَمَ بِاَلْفَيْ عَامٍ تُرِيْدُ اَنْ تَفْنٰى مَسَائِلُهُ فِيْ اَرْبَعِيْنَ عَامًا"

"اے زرارہؓ! خلقت آدمؑ سے دو ہزار سال پہلے سے جس گھر کی زیارت اور حج کے مراسم انجام پاتے رہے ہیں تم چاہتے ہو کہ اس کے مسائل چالیس سال میں ختم ہو جائیں۔" [2]

[1] فروع کافی: جلد ۴، ص ۲۴۰، باب فضل النظر الی الکعبۃ۔

[2] وسائل الشیعہ: جلد ۸، ص ۷، باب وجوب علیٰ کل مکلّف مستطیع۔

https://downloadshiabooks.com/

اس حدیث سے بخوبی اندازہ ہوتا ہے کہ حضرت آدمؑ سے پہلے زمین پر خانۂ کعبہ فرشتوں یا دوسری مخلوقات کی توجہ کا مرکز تھا کہ جو اُس وقت زندگی بسر کر رہی تھیں۔

۲۔ فلسفۂ حج

امیر المومنین علیہ السلام کے مذکورہ بالا کلام میں فلسفہ و اسرارِ حج کے بارے میں پُر معنی اشارے بیان ہوئے ہیں، اسلامی روایات میں بھی حج سے متعلق بہت سی سبق آموز اور تعلیمی و تربیتی پہلوؤں سے مالا مال مثالیں اور تعبیرات ملتی ہیں، مجموعی طور پر یہ کہا جا سکتا ہے کہ حقیقت میں فریضۂ حج کے عظیم مناسک کے چار اہم پہلو(۱) اخلاقی اور بندگی (۲) سیاسی اور اجتماعی (۳) تہذیب و ثقافت (۴) اقتصادی اور معاشی ہیں۔

۱۔ اخلاقی اور بندگی کے پہلو

یہ فلسفۂ حج کے اہم ترین پہلوؤں میں سے ہے، جس میں نفوس کی تربیت، اَخلاقی تہذیب نیز تقویٰ اور خلوص کی بنیادوں کو مستحکم کرنے کے موضوعات در پیش ہیں۔ اس بارے میں ایک معروف مثال احادیث میں بیان ہوئی ہے:

"يَخْرُجُ مِنْ ذُنُوْبِهِ كَهَيْئَتِهِ يَوْمَ وَلَدَتْهُ اُمُّهُ"[1]

"جو کوئی خدا کے گھر کا حج (اخلاص اور آداب و اَسرار کی رعایت کرتے ہوئے) انجام دے، وہ گناہ سے ایسا پاک ہوگا کہ گویا ابھی اس کی ماں نے اسے جنا ہو"

حج کے عمل سے انسان کی روح و جان پر جو اثر ہوتا ہے، اس کی یہ واضح دلیل ہے کہ یہ عمل انسان کو گناہوں کی تمام آلودگیوں سے پاک کر دیتا ہے اور ان گناہوں کے آثار کو ختم کر دیتا ہے جو ایک عرصے سے اس کے دل کو زنگ آلود کر رہے تھے اور یہ بہت بڑا فائدہ ہے جو بیت اللہ الحرام کے زوّار کو نصیب ہوتا ہے۔ اگر وہ مناسکِ اعمال و اَسرار کو توجہ اور تمام شرائط کے ساتھ ادا کرتا ہے تو اس کا ہر اٹھنے والا قدم اسے خدا کے نزدیک تر کر دیتا ہے اور ہر جگہ اپنے معبود اور محبوبِ حقیقی کو حاضر و ناظر پائے گا۔ اسی لیے کہتے ہیں کہ حج بیت اللہ الحرام گویا انسان کی نئی زندگی ہے جو اُسے پھر سے مل گئی ہے۔ جو کوئی حج کو اس کی تمام شرائط کے ساتھ پا لے گا، تو معنویت اور روحانیت کے آثار وہ اپنے دل میں آخری عمر تک محسوس کرتا رہے گا اور شاید یہی وجہ ہے کہ حج تمام عمر میں صرف ایک مرتبہ مسلمان پر واجب قرار دیا گیا ہے۔

---

[1] بحار الانوار: جلد ۹۹، ص ۲۶

https://downloadshiabooks.com/

۲۔سیاسی اور اجتماعی پہلو

جب بھی کوئی شخص ان مراسم کو جس طرح اسلام نے دستور دیا ہے اور بت شکن زمان حضرت ابراہیم علیہ السلام نے دنیا والوں کو جس طرح حج کے لیے بلایا ہے، اُس طرح انجام دے،تو یہ مسلمین کی عزت، دین کی بنیادیں محکم، وحدتِ کلمہ، اور دشمنانِ اسلام کے مقابل قدرت وشوکت اور تمام مشرکین سے برأت کا سبب بنے گا۔ یہ عظیم الٰہی کانفرنس ہر سال خانۂ کعبہ کے جوار میں تشکیل پاتی ہے، اور مسلمانوں کو خودسازی، کردارسازی، برادرانہ تعلقات میں تقویت دینے اور دشمنانِ اسلام کے غلط پروپیگنڈوں اور الزام تراشیوں کو مسترد کرنے، اور ان کی شیطانی چال، مکروفریب کو باطل کر کے دندان شکن جواب دینے کے لیے یہ عظیم مراسم بہترین فرصت مہیّا کرتے ہیں۔

حج ایک ایسا ہمہ جہت اور معجزنما منظر پیش کرتا ہے، جس میں ایک پُرشکوہ اجتماع، انتہائی جوش وجذبے کے ساتھ معنویات سے بھرپور، ایک ہی سمت میں حرکت کرتا ہوا نظر آتا ہے اور سب یک صدا و یک جان ہو کر "لَبَّيْكَ اللّٰهُمَّ لَبَّيْكَ" کے فلک شگاف نعروں کے ساتھ، ماشاء اللہ ٹھاٹھیں مارتے ہوئے انسانوں کے سمندر کا حیرت انگیز منظر پیش کرتے ہیں، جس کی کہیں کوئی مثال نہیں ملتی۔ مگر افسوس! مسلمان حج کی اس عظیم قدرت وطاقت کو اب تک پوری طرح اپنی روح کا حصّہ نہیں بنا پائے ہیں، ورنہ حج کی برکات وفیوضات کے توسّط سے ہر سال اسلام و مسلمین کے لیے بہت بڑی خدمات انجام دے سکتے ہیں اور نظامِ کفر پر کاری ضرب لگا سکتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ بعض اسلامی روایات میں آیا ہے:

"لَا يَزَالُ الدِّيْنُ قَائِمًا مَا قَامَتِ الْكَعْبَةُ"[1]

''جب تک خانۂ کعبہ قائم ہے آئین اسلام بھی قائم ودائم ہے۔''

بعض دشمنانِ اسلام (جنہوں نے اسلام دشمنی کی قسم کھائی ہوئی ہے) حج کی عظیم قدرت وطاقت کو مسلمانوں کے سیاسی مسائل کا ''مشکل کشا'' سمجھتے ہیں۔ لہٰذا اس ''عظیم پلیٹ فارم'' کو غیر موثر یا کم اثر بنانے کی ہر ممکن کوشش کرتے رہتے ہیں (جیسے مسلمانوں کے باہمی اختلافات کو ہوا دینا)۔

گلاڈسٹون

برطانیہ کے ایک سابق وزیر اعظم اور سیاستدان نے ایک عوامی جلسے میں اپنی ایک مشہور ومعروف تقریر میں کہا: جب تک آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا نام اذانوں میں صبح وشام اسی عظمت کے ساتھ یاد کیا جاتا رہے گا، اور قرآن مسلمانوں کی زندگی کا آئین بنا رہے گا، اور حج ہر سال اسی طرح شان وشوکت اور پُروقار طریقے سے ہوتا رہے گا، تب تک اس دنیا کے

[1] فروعِ کافی، جلد ۴، ص ۲۷۱، باب انہ لو ترك الناس الحج لجاءهم العذاب۔

https://downloadshiabooks.com/

مسیحیوں کے لیے بہت بڑا خطرہ بنا رہے گا، ہم دنیا میں اصلاح کرنے سے عاجز ہو جائیں گے۔(البتہ یہاں اصلاح سے مراد استعماری اصلاح ہے)[1] بعض نے گلاڈسٹون کی بات کو اضافے کے ساتھ یوں بیان کیا ہے کہ اس نے اپنی تقریر میں یہ بات زور دے کر کہی ہے کہ تم مسیحی سیاستدانوں پر واجب ہے کہ مسلمانوں کی اذان سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے نام کو نکال دو انہیں رسولؐ کی یاد سے غافل کردو، قرآن کو جلا دو، اور کعبے کو ویران کردو۔

یورپ کے ایک عیسائی کا یہ جملہ بھی معروف ہے کہ وہ کہتا ہے: صد افسوس ہے مسلمانوں پر کہ اگر مسلمان حج کے معنی ومفہوم کو نہ سمجھ پائیں، اور جس دن مسلمانوں نے حج کو سمجھ لیا، اُس دن سے دوسروں کی بدنصیبی کا آغاز ہوگا۔ یہ ایک روشن حقیقت ہے کہ استعماری طاقتیں قرآن مجید کو ظاہری طور پر جلا نہیں سکتیں اور کعبے کو وہ کبھی ویران نہیں کر سکتے ہیں، ہاں یہ بات عین ممکن ہے کہ وہ مسلمانوں کی اجتماعی غفلت سے بھرپور فائدہ اٹھا کر احکام اسلامی کو مسخ کریں اور حج کے روح پرور مراسم کو بے روح بنا ڈالیں۔

۳۔تہذیبی وثقافتی پہلو

جیسا کہ اسلامی روایات واخبار میں آیا ہے کہ حج بیت اللہ کا یہ عظیم اجتماع آثارِ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور چہاردہ معصومین علیہم السلام کو دنیا کے گوشے گوشے میں پہنچانے اور پھیلانے کا سبب بنتا ہے، اور تمام ممالک کے علمائے دین، بڑے بڑے مسلمان دانشور، فن وادب کے اساتذہ، اسلام پر لکھنے اور بولنے والے جن کی اکثریت مختلف اسلامی ممالک میں کسی نہ کسی صورت مراسم اور اسلامی پروگراموں میں شرکت کرتی ہے ان کے لیے یہ بہترین فرصت ہے کہ حج کے فلسفے، اپنے افکار کے تبادلے، معلومات، اطلاعاتِ اسلامی کی فراہمی، نیز رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور چہاردۂ معصومین علیہم السلام کے آثار کو زندہ کریں اور اس متحرک کاروانِ فکر وعمل کو مختلف معاشروں سے آئے ہوئے نمائندوں کے ذریعے دنیا کے گوشے گوشے تک پہنچائیں۔

۴۔فلسفۂ حج کا اقتصادی پہلو

خطبے کے چوتھے حصّے میں حج کے فلسفۂ اقتصاد پر گفتگو کی گئی ہے جیسا کہ بعض اسلامی روایات میں بھی اشارہ کیا گیا ہے کہ حج مسلمانوں کی اقتصادی قدرت وطاقت کو بڑھا سکتا ہے، مالی بدحالی اور پریشانیوں سے مسلمانوں کو نکال سکتا ہے، ممکن ہے کوئی سوچے، تصور کرے کہ حج کے مراسم کا اقتصادی مسائل سے کیا تعلق ہے؟ لیکن جب ہم اس نکتے پر غور کرتے ہیں کہ آج مسلمانوں کی اقتصادی وابستگی غیروں کے ساتھ خطرناک حد تک بڑھ چکی ہے، تو ایسی صورت میں مراسمِ حج کے ساتھ کانفرنسیں منعقد کرکے ان میں اقتصادی ماہرین کو بلا کر بڑے بڑے سیمینار تشکیل دینے میں کیا چیز مانع ہے؟ ایک عبادتِ الٰہی

[1] رہنمائے حرمین شریفین: جلد ۱، ص ۵۴ نقل از گفتار ماہ۔

https://downloadshiabooks.com/

اور اس کے ساتھ غیر مسلموں کے چنگل سے مسلمانوں کی نجات کے عنوان سے اقتصادی مشکلات کے حل کے بارے میں غور و فکر کریں اور لائحہ عمل ترتیب دیں تاکہ مسلمانوں کو غیر سے وابستگی اور فقر و فاقہ سے نجات دلا سکیں۔

یہاں کوئی ذاتی مسئلہ نہیں ہے کہ کوئی اعتراض کر بیٹھے کہ ''جناب یہ تو دنیا پرستی ہے''، بلکہ ہدف و مقصد پوری اُمت مسلمہ اور عالم اسلام کی فکری اور عملی خود مختاری کا سوال ہے، نیز فقر و فاقہ سے نجات کا بین الاقوامی انسانی المیہ درپیش ہے۔ لہٰذا صرف اور صرف مسلمانوں کی خدمت اور اسلام کی سربلندی و تقویت مقصود ہے۔

مذکورہ بالا گفتگو کی روشنی میں مولا علیؑ کے کلام کی گہرائی کا بخوبی اندازہ لگایا جا سکتا ہے، جو خطبے کے اس حصّے سے سمجھ میں آتا ہے۔ خانہ خدا کا حج کرنے والوں کو عرشِ الٰہی کے گرد فرشتوں کے چکّر لگانے سے تشبیہ دی گئی ہے، نیز مولائے متقیانؑ اعمالِ حج کو خدا کے مقدس مکان میں خدا سے تجارت کرنے سے تشبیہ دے رہے ہیں کہ جس میں حاجیوں کے لیے انواع و اقسام کے (مادّی اور روحانی) فوائد پوشیدہ ہیں۔ [1]

شاید یہی وجہ ہے کہ خطبے کے اس حصے میں صرف حج بیت اللہ الحرام کا ذکر کیا ہے، کیوں کہ یہ ایک ایسی عبادت ہے کہ جس میں سب کے لیے دنیا و آخرت کی اجتماعی، اَخلاقی اور معنوی، عظمت و شوکت نیز قدرت و طاقت کا سرچشمہ موجود ہے۔ اگرچہ حج کے حوالے سے بحث کا دامن اس سے کہیں زیادہ وسیع ہے، لیکن امام علیؑ نے نہج البلاغہ کے دوسرے خطبوں میں بھی حج کے مختلف مسائل بیان فرمائے ہیں، لہٰذا حج سے متعلق مزید وضاحت اُن خطبوں کے ضمن میں عرض کریں گے تاکہ اس کتاب کے تمام کلمات کا کماحقہٗ پیغام پہنچایا جا سکے۔

[1] ہشام بن حکم نے حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام سے ایک روایت نقل کی ہے کہ جس میں فلسفہ چہار گانہ اجمالاً ذکر ہوا ہے۔ وسائل الشیعہ، جلد ۸، ص ۹، فلسفۂ حج کے بارے میں مزید توضیح کے لیے تفسیر نمونہ، جلد ۱۴ ملاحظہ کیجیے۔

https://downloadshiabooks.com/

دوسرا خطبہ

وَمِنْ خُطْبَةٍ لَهُ (عَلَيْهِ السَّلَامُ)

بَعْدَ انْصِرَافِهِ مِنْ صِفِّينَ وَ فِيهَا حَالُ النَّاسِ قَبْلَ الْبِعْثَةِ وَ صِفَةُ آلِ النَّبِيِّ (صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَ آلِهِ) ثُمَّ صِفَةُ قَوْمٍ آخَرِينَ

جس میں بعثت پیغمبرؐ کے وقت لوگوں کے حالات اور آل رسول علیہم السلام کے اوصاف اور دوسرے افراد کی کیفیات کا ذکر ہے۔

حصّہ اوّل

صفین سے واپسی پر آپ علیہ السلام نے فرمایا:

أَحْمَدُهُ اسْتِتْمَاماً لِنِعْمَتِهِ وَ اسْتِسْلَاماً لِعِزَّتِهِ وَ اسْتِعْصَاماً مِنْ مَعْصِيَتِهِ وَ أَسْتَعِينُهُ فَاقَةً إِلَى كِفَايَتِهِ إِنَّهُ لَا يَضِلُّ مَنْ هَدَاهُ وَ لَا يَئِلُ مَنْ عَادَاهُ وَ لَا يَفْتَقِرُ مَنْ كَفَاهُ فَإِنَّهُ أَرْجَحُ مَا وُزِنَ وَ أَفْضَلُ مَا خُزِنَ وَ أَشْهَدُ أَنْ لَا إِلَهَ إِلَّا اللهُ وَحْدَهُ لَا شَرِيكَ لَهُ شَهَادَةً مُمْتَحَناً إِخْلَاصُهَا مُعْتَقَداً مُصَاصُهَا نَتَمَسَّكُ بِهَا أَبَداً مَا أَبْقَانَا وَ نَدَّخِرُهَا لِأَهَاوِيلِ مَا يَلْقَانَا فَإِنَّهَا عَزِيمَةُ الْإِيمَانِ وَ فَاتِحَةُ الْإِحْسَانِ وَ مَرْضَاةُ الرَّحْمَنِ وَ مَدْحَرَةُ الشَّيْطَانِ وَ أَشْهَدُ أَنَّ مُحَمَّداً عَبْدُهُ وَ رَسُولُهُ أَرْسَلَهُ بِالدِّينِ الْمَشْهُورِ وَ الْعَلَمِ الْمَأْثُورِ- وَ الْكِتَابِ الْمَسْطُورِ وَ النُّورِ السَّاطِعِ وَ الضِّيَاءِ اللَّامِعِ وَ الْأَمْرِ الصَّادِعِ إِزَاحَةً لِلشُّبُهَاتِ وَ احْتِجَاجاً بِالْبَيِّنَاتِ وَ تَحْذِيراً بِالْآيَاتِ وَ تَخْوِيفاً بِالْمَثُلَاتِ.

”پروردگار کی حمد کرتا ہوں، اس کی نعمتوں کی تکمیل کے لیے اور اس کی عزت کے سامنے سر تسلیم خم کرتے ہوئے، میں اس کی نافرمانی سے تحفظ چاہتا ہوں اور اس سے مدد مانگتا ہوں کہ میں اسی کی کفایت و کفالت کا محتاج رہوں، وہ جسے ہدایت دیدے وہ گمراہ نہیں ہوسکتا ہے اور جس کا وہ دشمن ہوجائے اسے کہیں پناہ نہیں مل سکتی ہے۔ جس کے لیے وہ کافی ہوجائے وہ کسی

https://downloadshiabooks.com/

کا محتاج نہیں ہے، اس کا پلہ ہر باوزن شے سے گراں تر ہے اور یہ سرمایہ ہر خزانے سے زیادہ قیمتی ہے۔ میں گواہی دیتا ہوں کہ اللہ ایک ہے۔ اس کا کوئی شریک نہیں ہے اور یہ وہ گواہی ہے جس کے اخلاص کا امتحان ہو چکا ہے اور جس کا حاصل عقیدے کا جز بن چکا ہے، میں اس گواہی سے تا حیات وابستہ رہوں گا اور اسی کو روزِ قیامت کے ہولناک مراحل کے لیے ذخیرہ بناؤں گا۔ یہی ایمان کی مستحکم بنیاد ہے اور یہی نیکیوں کا آغاز ہے اور اسی میں رحمان کی مرضی اور شیطان کی تباہی کا راز مضمر ہے۔ اور میں گواہی دیتا ہوں کہ محمدؐ اللہ کے بندے اور اُس کے رسول ہیں۔ انہیں پروردگار نے مشہور دین، ماثور نشانی، روشن کتاب، ضیاء پاش نور، چمکدار روشنی اور واضح امر کے ساتھ بھیجا ہے تا کہ شبہات زائل ہو جائیں اور دلائل کے ذریعے حجت تمام کی جا سکے۔ آیات کے ذریعے ہوشیار بنایا جا سکے اور مثالوں کے ذریعے ڈرایا جا سکے۔''

خطبہ ایک نگاہ میں

یہ خطبہ پانچ اہم مضامین پر مشتمل ہے (جو چار حصّوں میں قابلِ بحث وتحقیق ہے)

پہلا مقام: حمد وثنائے پروردگار اور اُس کے فضل وکرم اور رحمت کے سائے میں پناہ لینا۔

دوسرا مقام: پروردگارِ عالم کی یکتائی کی گواہی اور توحید پر ایمان کے گہرے اثرات۔

تیسرا مقام: نبوت کی گواہی کے ساتھ ہی ساتھ فضائلِ پیغمبرؐ کے ایک اہم حصّے کا بیان، زمانۂ جاہلیت کے حالات، اسلامی معاشرے کی عظیم مشکلات اور بیان ہے ان تکلیف دہ حالات کا جن سے معاشرے کی اصلاح کے سلسلے میں رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو نبرد آزما ہونا پڑا۔

چوتھا مقام: اہل بیت علیہم السلام کا مقام ومرتبہ اور عظمت اور لوگوں کے دینی مشکلات کے بارے میں اُن کے پاس پناہ لینے کی طرف اشارہ ہے۔

پانچواں مقام: بھی اہل بیت علیہم السلام کی عظمت کے بارے میں ہے، جسے ایک اور انداز سے پیش کرتے ہوئے لوگوں کو آلِ محمدؐ کے بارے میں خبردار کیا ہے کہ اس اُمّت کا کوئی فرد بھی ان کے مقام کے برابر نہیں۔ اس کے بعد اہل بیت علیہم السلام کی خصوصیات کو بیان کیا ہے نیز حق اُس کے اہل تک پہنچنے کی خوشی کا اظہار فرمایا ہے۔

وہ حالات جن میں یہ خطبہ دیا گیا

جیسا کہ خطبے کے شروع میں ہم پڑھ چکے ہیں مرحوم سیّد رضیؒ نے واضح کیا ہے کہ یہ خطبہ صفین سے واپسی کے بعد

https://downloadshiabooks.com/

ارشاد فرمایا ہے۔ خطبے کا سیاق و سباق بھی اس بات کی تصدیق کرتا ہے۔ دراصل زمانۂ جاہلیت میں لوگوں کے مزاج اور حالات کے نشیب و فراز، اس حقیقت کو بیان کر رہے ہیں کہ ''زمانۂ جاہلیت کے نظام'' سے ہر لمحہ ہوشیار رہنے کی ضرورت ہے، یہ جہالت دوبارہ زندہ ہوسکتی ہے۔ اِن کے والی و وارث اور پیروکار دوبارہ برسرِ اقتدار نہ آنے پائیں۔ ان لوگوں کا تعلق، بنیادی طور پر لشکرِ شام (میدانِ صفین) سے تھا اور حضرت امام علی علیہ السلام اس بات پر زور دیتے ہیں کہ اللہ کی رسی کو مضبوطی سے تھامے رہیں، کیونکہ خود پیغمبرؐ نے کئی بار فرمایا ہے: میں تمہارے درمیان دو گراں قدر چیزیں چھوڑے جا رہا ہوں، ان (قرآن و اہلِ بیتؑ) سے متمسک رہو گے تو گمراہ نہیں ہو گے۔

واضح رہے کہ ابن ابی الحدید نے عجلت کی وجہ سے خطبے کو سمجھنے میں غلطی کی ہے، وہ کہتے ہیں خطبے کے آخری حصّے کا سیاق و سباق صفین سے واپس پلٹنے کے زمانے سے مناسبت نہیں رکھتا، کیونکہ وہ زمانہ حکمیت کے واقعے عمرو بن عاص کی مکاریوں اور امیر شام کی منہ زوریوں کا زمانہ تھا، جو امیر المومنینؑ کے لشکر میں ظاہر ہوا، ایسی صورتحال آغازِ خلافت سے مناسبت رکھتی ہے، اگر سیّد رضیؒ اس خطبے کو صفین سے واپسی کے زمانے سے نسبت دیتے ہیں تو اُس میں اُن کی کوئی غلطی نہیں، کیونکہ اُنھوں نے سابقہ مورّخین سے لیا ہے اور عین ممکن ہے کہ یہ غلطی اُن مورّخین سے ہوئی ہو۔[1]

بعض دانشمندوں کے مطابق یہ بات ایسے شخص کے بارے میں کہی جانی چاہیے، جو علم کا پہاڑ، بحرِ وقار نیز جہاد و استقامت کا نمونۂ کامل نہ ہو۔ کوئی شخص حضرت علیؑ کی طرح کھلے دل سے اس حادثے کے سامنے ٹھہر نہ سکا۔ بلند روح اور وسیع فکر اجازت نہیں دیتی ہے کہ حالات سے پریشان اور مضطرب ہو، بلکہ اس کے برعکس جیسا کہ ہم نے پہلے کہا ہے کہ امامؑ نے لوگوں کو غفلت سے بیدار کیا ہے۔ یہ خطبہ لوگوں کو تنبیہ کرتا ہے کہ زہریلی تبلیغ کو اور شیطانی حکمرانوں کو قبول نہ کریں اور دورِ جاہلیت کی طرف نہ پلٹیں اور اس طرح جس طرح حق کہتا ہے، اس سے دُور مت ہو جائیں اور آخر تک استقامت کا مظاہرہ کریں۔

ابن ابی الحدید معتقد ہے کہ صفین کے میدان میں امیر شام کی جیت ہوئی ہے جب کہ اس فتح اور مولا علیؑ کے اس قول: ''اَلْآنَ اِذْ رَجَعَ الْحَقُّ اِلٰی اَهْلِهِ'' ''اب حق اپنے حقدار کے پاس پہنچ گیا'' کے ساتھ مناسبت نہیں رکھتا، جبکہ یہ ہماری نظر میں ایک غلط فہمی ہے، اس لیے کہ پہلی بات تو یہ ہے کہ امیر شام ہرگز کامیاب نہیں ہوا، وہ صرف عمرو عاص کی چالاکی سے ایک یقینی شکست سے بچ گیا۔ اور حضرت علیؑ حق کو اس کے اہل (یعنی اپنے اور اہل بیتؑ) کے اختیار میں دیکھنا چاہتے ہیں اور لوگوں کو خبردار کرتے ہیں کہ ہوشیار ہو جاؤ کہیں حق حقدار سے نہ چھینا جائے۔

---

[1] شرح ابن ابی الحدید: ج۱، صفحہ ۱۴۳

https://downloadshiabooks.com/

حکمیّت کی داستان اور عمرو ابن عاص کے ظالمانہ اور مکروہ فیصلے کا قصہ (بعض کے نظریے کے برعکس) میدانِ صفین میں حضرت امام علیؑ کی موجودگی میں نہیں ہوا، بلکہ چند مہینے بعد یہ واقعہ پیش آیا، قابلِ توجہ بات یہ ہے کہ خود ابن ابی الحدید نے دوسرے مقام پر اس معنی کی تصریح اور وضاحت کی ہے۔ اس بنا پر ابن ابی الحدید کا اس خطبے کے آخری جملے کو جنگِ صفین کے بعد نہ ہونے کے لیے دلیل کے طور پر پیش کرنا، غیر معتبر ثبوت اور ایک باطل گواہی ہے۔

شرح و تفسیر

اسلام کے دو بنیادی ارکان

یہ خطبہ نہج البلاغہ کے دوسرے خطبوں کی طرح حمد و ثنائے پروردگار سے شروع ہوتا ہے، لیکن یہاں پر حمد و ستائشِ پروردگار کے لیے تین وجوہات بیان ہوئی ہیں۔ سب سے پہلی یہ کہ نعماتِ الٰہی زیادہ ہوں اور ان کے پورا ہونے کا تقاضا کرنا اور دوسرے ذاتِ خدا کی عزت اور قدرت کے سامنے سرِ تسلیم خم کرنا، تیسرے اُس کے لطف و کرم سے گناہوں سے محفوظ رہنا۔ آپؑ فرماتے ہیں:

"أَحْمَدُهُ اسْتِتْمَامًا [1] لِنِعْمَتِهِ وَاسْتِسْلَامًا [2] لِعِزَّتِهِ وَاسْتِعْصَامًا [3] مِنْ مَّعْصِيَّتِهِ"

''اُس کی حمد و ثنا کرتا ہوں کہ اُس کی نعمتوں کی تکمیل ہونے کی خاطر اور اُس کی عزت و قدرت کے سامنے سرِ تسلیم خم کرتا ہوں اور اُس کی معصیت اور نافرمانی سے محفوظ رہنے کا تقاضا کرتا ہوں۔''

توجہ رہے کہ حمد کا مفہوم ایسی چیز ہے جو شکر سے زیادہ ہو، دوسرے الفاظ میں شکر، ستائش کے ساتھ آمیختہ ہے اور یہ ایک طرف نعمتِ الٰہی کے زیادہ ہونے کا سبب ہے۔ جیسا کہ ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

"لَئِنْ شَكَرْتُمْ لَأَزِيدَنَّكُمْ" [4]

''اگر میرا شکر کرو گے تو میں یقیناً تم پر (نعمت کی) زیادتی کروں گا۔''

---

[1] استتمام، کبھی تمام ہونے کے معنی میں آیا ہے، کبھی مطالبات کے تمام ہونے کے معنی میں، یہاں بعد والے جملوں کے اعتبار سے معنیٰ دوّم مراد ہیں۔

[2] استسلام، اطاعت گزاری و تسلیم کے معنی میں آیا ہے۔ بعض اہلِ لغات کی نظر میں کسی چیز کے بارے میں ''ظاہر و باطن کا ایک ہونا'' اور اطاعت گزاری اس کے لوازمات میں سے ہے۔

[3] استعصام سے مراد مطالبہ کرنا اور دیکھ بھال کرنا، نامناسب امور سے دوری اختیار کرنا ہے۔

[4] سورۂ ابراہیمؑ: آیت ۷

https://downloadshiabooks.com/

اور دوسری طرف عبودیت اور بندگی کے انجام دینے کا پہلو بھی موجود ہے اور یہ وہی عزّتِ پروردگار کے سامنے سرِ تسلیم خم کرنا ہے جبکہ تیسری طرف خدا کی طرف سے ایسا لطف و کرم اور امدادِ غیبی نیز عنایاتِ الٰہی شامل حال ہوتی ہیں، جن سے انسان گناہوں سے محفوظ رہتا ہے۔ حمد و ثنا کے بعد پروردگار سے مدد طلب کرنے کے عمل کو بیان کرتے ہیں اور اُس کی دلیل بھی بیان فرماتے ہیں:

"وَاَسْتَعِيْنُهُ فَاقَةً اِلٰى كِفَايَتِهِ"

"اُس سے مدد مانگتا ہوں، کیونکہ اُس کی مدد اور کفایت کا محتاج ہوں۔"

جی ہاں! جب ایک باخبر بندہ اپنے آپ کو مکمل طور پر اُس ذاتِ بے نیاز کا محتاج دیکھتا ہے تو اپنے ہاتھ کو اُس کے لطف و کرم کے سامنے پھیلاتا ہے اور ہر چیز کے لیے ہر حالت میں اُس سے مدد چاہتا ہے۔ خدا سے مدد مانگنے کے بارے میں مولا امام علی علیہ السلام ایک اور دلیل بیان فرماتے ہیں:

"اِنَّهُ لَا يَضِلُّ مَنْ هَدَاهُ وَلَا يَئِلُ [1] مَنْ عَادَاهُ وَلَا يَفْتَقِرُ مَنْ كَفَاهُ"

"خدا جس کسی کی بھی ہدایت کرے گا وہ گمراہ نہیں ہوگا اور جسے خدا دشمن رکھے کبھی نجات نہیں پائے گا اور جس کسی کی سرپرستی کرے وہ کبھی محتاج نہیں ہوگا۔"

جی ہاں اُس کی قدرت اتنی ہے کہ کوئی اُس کا مقابلہ نہیں کرسکتا اور اُس کا علم اتنا ہے کہ اُس سے خطا ہو نہیں سکتی۔ یہ احتمال بھی ہے کہ یہ تین جملے حمد کے لیے ہی ہوں اور استعانت کے لیے، دوسری دلیل بھی ہے، اِس کلام کے آخر میں خدا کی حمد کے لیے ایک نئی دلیل اور نکتہ بیان کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

"فَاِنَّهُ اَرْجَحُ مَا وُزِنَ وَاَفْضَلُ مَا خُزِنَ"

اگر خدا کی ستائش کا وزن معلوم کیا جاسکے تو یہ ہر چیز سے بھاری ہوگی اور ذخیرہ کرنے کے لیے، ہر خزانے سے زیادہ قیمتی ہوگی۔"

حقیقت میں وہ فوائد اور آثار جو گزشتہ جملوں میں ذکر ہوئے ہیں، وہ اس دنیا سے مربوط ہیں۔ اور آخری دو جملوں میں جو ذکر ہوا ہے، وہ دوسری دنیا کے ساتھ مربوط ہے اور قیامت کے دن کے لیے ایک ذخیرہ ہے۔ اِس بنا پر حمد پروردگار نجاتِ دنیاوی و آخروی کا ذریعہ ہے۔ سبحان اللہ! ان چھوٹے چھوٹے جملوں میں ہر پہلو کو اُس کے تمام نکات کے ساتھ بیان فرمایا ہے۔

---

[1] یئِلُ، مادّہ، وَأل بروزن وعد نجات پانا اور پناہ لینا اور واپس آنا کے معنیٰ میں ہے۔

https://downloadshiabooks.com/

یہی وجہ ہے کہ جب ابن ابی الحدید اس خطبے کی تشریح کے مقام پر پہنچے تو کلمات اور لطائف امیر المومنینؑ میں ڈوب کر بے ساختہ پکار اُٹھے:

"فَسُبْحَانَ مَنْ خَصَّهُ بِالْفَضَائِلِ الَّتِي لَا تَنْتَهِي أَلْسِنَةُ الْفُقَهَاءِ إِلَى وَصْفِهَا وَ جَعَلَهُ أَمَامَ كُلِّ ذِي عِلْمٍ وَ قُدْوَةَ كُلِّ صَاحِبِ خَصِّيَةٍ"

"پاک ہے وہ خدا جس نے علیؑ کو ایسے فضائل سے نوازا ہے کہ بڑے بڑے ادیب و سخنور مولا علیؑ کی توصیف کرنے سے عاجز و حیران رہ گئے ہیں، نیز ہر صاحب فضیلت کے لیے آپ کو رہنما اور پیشوا بنایا۔"

اس کے بعد آپؑ تمام فضائل، نیکیوں اور افتخارات کی جڑ یعنی توحید کی گواہی دیتے ہوئے فرماتے ہیں:

"وَأَشْهَدُ أَنْ لَا إِلَهَ إِلَّا اللهُ وَحْدَهُ لَا شَرِيكَ لَهُ"

"میں گواہی دیتا ہوں کہ خدا کے سوا کوئی معبود نہیں، وہ یکتا اور لاشریک ہے۔"

مولا علی علیہ السلام نے توحید کے سائے میں پناہ اس لیے لی ہے کہ یہ تمام پاک و پاکیزہ افکار اور عقائد نیز اعمالِ صالح کی بنیاد ہے۔ اس کے علاوہ توحید کی پناہ میں جانے کا تذکرہ اس لیے بھی کیا ہے تاکہ علیؑ کو خدا سمجھنے والے اپنی غلط فہمی کو جان لیں اور باطل عقیدے کی اصلاح کر لیں۔ مزید فرماتے ہیں:

"شَهَادَةً مُمْتَحَنًا [1] إِخْلَاصُهَا، مُعْتَقَدًا مُصَاصُهَا" [2]

"یہ میری گواہی دینا توحید کے بارے میں، ایک سادہ گواہی نہیں، بلکہ یہ ایسی گواہی ہے جس کا خلوص پرکھا جا چکا ہے اور جس کا خمیر بغیر کسی شبہے کے میرے عقیدے کی جان بن چکا ہے۔" (صرف میری زبان ہی نہیں بلکہ میرے وجود کا رواں رواں جسم و روح کی گہرائی کے ساتھ گواہی دیتا ہے)

یہ صرف ایک گواہی نہیں ہے جو جلد بازی میں انجام پائی ہو بلکہ یہ ایسی گواہی ہے:

"نَتَمَسَّكُ بِهَا أَبَدًا مَا أَبْقَانَا، وَ نَدَّخِرُهَا لِأَهَاوِيلِ [3] مَا يَلْقَانَا"

"جب تک خدا نے ہمیں باقی رکھا ہم اِس سے جڑے رہیں گے اور پیش آنے والے تمام ہولناک مواقع میں یہ

---

[1] ممتحن، کا مادّہ محن بروزن رہن سے ہے، جس کے معنی آزمائش اور امتحان ہیں، لیکن بعض اہلِ لغت نے اس کے معنی "کنواں کھودتے وقت، مٹی نکالنا" کیے ہیں۔

[2] مصاص، کا مادّہ مص ہے (بروزنِ نص) اصل میں اس کے معنی چکھنا اور چوسنا ہے۔ بات یہ ہے کہ چوسنے کا عمل ایسا ہے کہ جو کسی چیز کے نچوڑ اور خالص اجزاء کو انسان کے بدن میں منتقل کرتا ہے، لہٰذا "مصاص" خالص کے معنی کے لیے استعمال ہوتا ہے۔

[3] "اھاویل"، جمع "اھوال" ہے اور اس کا مفرد "ھول" ہے جس کے معنی ڈر اور وحشت ہیں۔

https://downloadshiabooks.com/

بہترین ذخیرہ ہے۔"

امامِ عالی مقامؑ اس گفتگو میں ایمان کی گہرائی کو بیان کرتے ہوئے زندگی کے ہر میدان میں، قدم قدم پر روحِ توحیدی سے سرشار نیز سراپا پیکرِ توحید نظر آتے ہیں۔ جس نے بھی اس بزرگ ہستی کی زندگی کا مطالعہ کیا، اس حقیقت کو آپؑ کی تمام زندگی میں واضح طور پر دیکھے گا کہ لمحہ بھر کے لیے بھی شرک سے آلودہ نہیں ہوئے، کبھی کسی بت کے سامنے نہیں جھکے، ہمیشہ مزاجِ توحید کے مطابق عمل کیا اور ہر قسم کے شرکِ جلی اور خفی سے بیزار رہے۔ پھر اس اصول کا پابند رہنے کے لیے چار دلیلوں کا ذکر فرمایا:

"فَإِنَّهَا عَزِيمَةُ الْإِيمَانِ، وَفَاتِحَةُ الْإِحْسَانِ، وَمَرْضَاةُ الرَّحْمٰنِ، وَمَدْحَرَةُ[1] الشَّيْطَانِ"

"یہ گواہی ایمان کا بنیادی اور اصلی ستون اور اس کی روح ہے۔ تمام نیکیوں کا سرچشمہ، اللہ کی خوشنودی کا ذریعہ اور شیطان سے دوری کا سبب ہے۔"

چنانچہ عنقریب نکات کے ذیل میں آئے گا کہ عقیدۂ توحید کے بغیر اُصولِ دین پر ایمان کے مراتب کی کوئی قدر و قیمت نہیں۔ اور تمام نیکیاں اور اعمالِ صالح حقیقت توحید سے ہی وابستہ ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ خدا کی خوشنودی اور شیطان سے دوری کا سبب ہے، کیونکہ شیطان کا اہم ہتھیار شرک ہے خواہ وہ شرکِ جلی کی صورت میں ہو یا شرکِ خفی کی صورت میں، نیز اُس کا اظہار کیا جائے یا اُسے مخفی رکھا جائے۔

نہج البلاغہ کے بعض مفسرین نے "فَاتِحَةُ الْإِحْسَانِ" کے معنی کو"اللہ کی عطا کردہ نیک پاداش سے تعبیر کیا ہے جس کی ابتدا توحید ہے، لیکن مذکورہ بالا تفسیر ہماری نظر میں بہتر ہے۔ خدا کی وحدانیت کی گواہی دینے کے بعد دوسرا اہم نکتہ نبوت کی گواہی دینا ہے اور فرمایا:

"وَأَشْهَدُ أَنَّ مُحَمَّدًا عَبْدُهُ وَرَسُولُهُ"

"اور یہ بھی گواہی دیتا ہوں کہ محمد اس کے عبد اور رسول ہیں۔"

جی ہاں! آپ رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہونے سے پہلے اللہ کے خاص بندے تھے اور جب تک کوئی بندہ خاص نہ ہو، رسالت کے مقام تک نہیں پہنچ سکتا۔ یہ دراصل ان لوگوں کے اعتراض کا جواب ہے جو خدا کے رسولوں کو خدا کی حد تک پہنچا دیتے ہیں اور جو چیز (یعنی بندگی) پیغمبروں کے لیے باعث افتخار ہے (کفّار) اُسے اُن سے چھین لینا چاہتے تھے، پھر آپؑ پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی رسالت اور فریضے کے اوصاف بیان کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

[1] "مدحرۃ" کا مادّہ "دحر"، باہر نکال دینا، بے دخل کرنا اور دور کرنے کے معنیٰ میں آتا ہے۔

https://downloadshiabooks.com/

"اَرۡسَلَهُ بِالدِّيۡنِ الۡمَشۡهُوۡرِ وَالۡعَلَمِ الۡمَاۡثُوۡرِ [۱] وَالۡكِتَابِ الۡمَسۡطُوۡرِ، وَالنُّوۡرِ السَّاطِعِ [۲] وَالضِّيَاءِ اللَّامِعِ، وَالۡاَمۡرِ الصَّادِعِ" [۳]

''اللہ نے آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو ظاہر اور آشکار دین و قانون، روشن نشانی، تحریر شدہ کتاب، درخشاں نور، جگمگاتی روشنی، حکم قطعی اور فرمانِ الٰہی کے ساتھ بھیجا کہ جس میں کسی قسم کی پردہ داری نہیں ہے۔''

مذکورہ چھے جملے جو نہایت حیرت انگیز اور گہرے معنی کو اپنے دامن میں سمیٹے ہوئے ہیں، یہ کن مسائل کی جانب اشارہ کر رہے ہیں؟ ان کے بارے میں مختلف قسم کی تفسیریں وجود رکھتی ہیں۔ سب سے پہلے یہ ہے کہ ''دین مشہور'' آئین اسلام کی طرف اشارہ ہے اور ''علمِ ماثور'' سے معجزات کی طرف اشارہ ہے۔ ''کتابِ مسطور'' سے قرآن مراد "وَالنُّوۡرِ سَاطِعِ" سے علومِ الٰہی مراد ہیں، جو رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم تک پہنچے اور "وَالضِّيَاءِ الۡلَّامِعِ" سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی سنت سمجھ میں آتی ہے اور "وَالۡاَمۡرِ الصَّادِعِ" قرآن کی آیت "فَاصۡدَعۡ بِمَا تُؤۡمَرُ" کی مناسبت سے مراد تقیہ کو ترک کرنا اور مخالفین اور مشرکین کے سامنے کھلم کھلا توحید کا اظہار کرنے کی طرف اشارہ ہے:

"وَالنُّوۡرِ السَّاطِعِ" "وَالضِّيَاءِ الۡلَّامِعِ"

یہ قرآن کی مزید صفات کی وضاحت ہے، کیونکہ یہ آسمانی کتاب، انسانی افکار اور معاشروں کے لیے نورانیت کا باعث ہے۔ اس کے بعد پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بھیجنے، قرآن کے آپؐ پر نازل ہونے، نیز معجزات، قوانین اور احکامِ الٰہی کے اصل مقصد کو بیان فرماتے ہیں۔ رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو نبوت عطا کرنے اور آپؐ کی بعثت اور اس کے اہتمام چند اہم مقاصد تھے:

"اِزَاحَةً [۴] لِلشُّبُهَاتِ، وَاحۡتِجَاجًا بِالۡبَيِّنَاتِ، وَتَحۡذِيۡرًا بِالۡاٰيَاتِ، وَتَخۡوِيۡفًا بِالۡمَثُلَاتِ [۵]"

''دنیا والوں کے دل و دماغ سے ہر قسم کے شکوک وشبہات کو دور کیا جائے؛ روشن و واضح دلیل اور منطق کے ساتھ

---

[۱] ماثور، کا مادّہ اثر، ہے، علامت اور نشانی کے معنی میں آتا ہے۔ ایسی نشانی جو کسی چیز میں سے باقی رہ گئی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ گزشتہ انسانوں سے باقی رہنے والے علوم (آثار) کو (جو ہم تک پہنچے ہیں) ''علومِ ماثور'' کا نام دیا جاتا ہے۔

[۲] ساطع کا مادّہ سطوع ہے، یہ منتشر کرنے، اونچا ہونے نیز لہرانے اور اُونچائی پر نمایاں ہونے کے معنی میں استعمال ہوتا ہے، اسی وجہ سے ''نورِ ساطع'' سے ''ہر طرف پھیلی ہوئی روشنی'' مراد لی جاتی ہے۔

[۳] صادع کا مادّہ صدع ہے۔ مضبوط چیزوں میں شگاف پیدا کرنے کے معنیٰ میں آتا ہے۔ نیز ہر قسم کی ''قاطعیت اور مصمم ہونے'' پر اس کا اطلاق ہوتا ہے۔

[۴] ازاحۃ، کا مادّہ زیح، ہے ''بروزن زید''، یہ دور ہونے کے معنی میں آتا ہے، یہی وجہ ہے کہ ''ازاحۃ'' دور کرنے اور ظاہر کرنے'' کے لیے استعمال ہوتا ہے۔

[۵] مثلات، جمع ہے مثلہ کی (بروزنِ عضلہ) یہ مصیبت، بلا اور پریشانی کے معنی میں آتا ہے کہ جو انسان کو لاحق ہوتی ہے اور دوسروں کے لیے سبق آموزی نیز عبرت کا باعث بنتی ہے، (مفرداتِ راغب، تحقیق، صحاح اور مجمع البحرین)

https://downloadshiabooks.com/

استدلال کریں؛ آیاتِ الٰہی کی مدد سے لوگوں کو خدا کی مخالفت سے روکیں اور اُس کی مخالفت کے انجام سے ڈرائیں۔"

ان چار جملوں کی تفسیر میں بھی یہ کہہ سکتے ہیں "اِزَاحَةً لِلشُّبُهَاتِ" سے ان حقائق کی طرف اشارہ ہے، جو الٰہی دلائل کی روشنی میں واضح ہیں۔ اور ہر قسم کے شک و شبہے کو دور کردیتے ہیں "وَاحْتِجَاجًا بِالْبَيِّنَاتِ" سے مراد 'معجزاتِ حسّی' ہیں۔ ان کی ضرورت، ایسے لوگوں کے لیے ہوتی ہے جو "عقلی دلائل" سے مطمئن نہیں ہوتے، لیکن جب کھلی آنکھوں سے معجزہ دیکھتے ہیں تو یقین اور ایمان تک پہنچ جاتے ہیں۔ "وَتَحْذِيرًا بِالْآيَاتِ" سے مراد آخرت کے بُرے انجام سے ڈرانے کی طرف اشارہ ہے۔ "وَتَخْوِيفًا بِالْمَثُلَاتِ" سے مراد دنیاوی سزاؤں سے ڈرانے کی طرف اشارہ ہے جیسا کہ قرآن میں ارشاد ہوا ہے:

"وَيَسْتَعْجِلُونَكَ بِالسَّيِّئَةِ قَبْلَ الْحَسَنَةِ وَقَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلِهِمُ الْمَثُلَاتُ"[۱]

"اور (اے رسولؐ) یہ لوگ تم سے بھلائی کے قبل ہی برائی (عذاب) کی جلدی مچا رہے ہیں (حالانکہ ان کے پہلے (بہت سے لوگوں کی) سزائیں ہو چکی ہیں۔"

اہم نکات

۱۔ توحید، تمام نیکیوں کی جڑ

"اللہ کی وحدانیت کی گواہی" معمولاً دوسرے اصولوں کے مقابلے میں ایک اصول اعتقادی سمجھا جاتا ہے، لیکن یہ ایک بہت سادہ اور سطحی سی سوچ ہے، اس نہایت اہم اسلامی اصول کے بارے میں اسلامی مآخذ اور عقلی تجزیات کی روشنی میں توحید روح کی حیثیت رکھتی ہے، جو تمام اصول اور فروع میں جاری و ساری ہے۔ دوسرے الفاظ میں "اسلام کے تمام اصول اور فروع" دراصل توحید ہی کا مظہر ہیں، نہ صرف اعتقادات اور عبادات کے موضوعات بلکہ اجتماعی، سیاسی اور اخلاقی مسائل پر بھی روحِ توحید حاکم ہے۔

خدا کی وحدانیت، خواہ ذات وصفات میں ہو خواہ افعال و بندگی میں، ایک روشن اور مسلّم امر ہے۔ جہاں تک انبیائے کرامؑ کی نبوت کا معاملہ ہے تو "لَا نُفَرِّقُ بَيْنَ أَحَدٍ مِّن رُّسُلِهِ"[۲] کے مطابق ہم بھی انبیاءؑ اور رسولوں کے درمیان

---

[۱] سورۂ رعد: آیت ۶

[۲] سورۂ بقرہ: آیت ۲۸۵

https://downloadshiabooks.com/

فرق کے قائل نہیں اور معتقد ہیں کہ سب کے سب ایک نظریے کے داعی اور ایک ہی پیغام کو پہنچانے والے ہیں لیکن زمانے کے گزرنے کے ساتھ اور انسانی معاشروں کے ترقی یافتہ ہونے کی بنا پر بعض احکام اور پروگرام نئی شکلوں میں پیش کیے گئے ہیں۔ قیامت کے موضوع پر اس آیت:

"وَكُلُّهُمْ آتِيهِ يَوْمَ الْقِيَامَةِ فَرْدًا"[1]

"اور یہ سب کے سب اس کے سامنے قیامت کے دن اکیلے (اکیلے) حاضر ہوں گے۔"

کے مطابق ہر شخص انفرادی حیثیت میں اللہ کے سامنے پیش ہوگا اور ایک معیار کے مطابق سب کے ساتھ انصاف ہوگا۔ ہر ایک کو اپنے اعمال کے حساب سے جزا ملے گی، سب ثابت اور معیّن ہیں۔ یہ صحیح ہے کہ آسمانی ادیان کے بارے میں الٰہی قوانین کی شاخوں اور پتوں میں تو ضرور فرق ہے، لیکن ان سب کی بنیاد اور اصل ایک ہے، اسی دلیل کی بنا پر ہمارا عقیدہ یہ ہے کہ تمام انبیائے کرام علیہم السلام ایک متحدہ عالمی معاشرے کی جانب، تمام انسانوں کو دعوت دیتے رہے ہیں۔

اور آخر کار پوری کائنات کو ایک عادل حکومت کے زیرِ سایہ جمع ہونا ہے۔ اخلاقی مسائل کے بارے میں، کون ہے جو یہ نہ جانتا ہو کہ اخلاقی فضائل کا تعلق توحید سے ہے اور اخلاقی برائیوں (رذائل) کا تعلق شرک سے ہے۔ ریا کار افراد شرک میں مبتلا ہوتے ہیں، بالکل اسی طرح جس طرح حسد کرنے والے، بخل سے کام لینے والے، لالچ رکھنے والے اور تکبّر کرنے والے شرک میں مبتلا ہوتے ہیں۔ جو کوئی بھی خدا کی توحید افعال کو دل کی گہرائی سے قبول کرتا ہے اور عزت و ذلّت، روزی، زندگی، کامیابی کو خدا سے نسبت دیتا ہے تو ممکن نہیں کہ وہ ریا، حرص، بخل اور حسد کو اپنے دل میں کوئی جگہ دے سکے۔

ایک مختصری بات یہ ہے کہ توحید، تسبیح کے ایک بڑے اور نمایاں دانے کی طرح نہیں ہے کہ جو بقیہ دانوں سے بڑی جسامت رکھتا ہے بلکہ توحید کی مثال تسبیح کے دھاگے جیسی ہے کہ جس میں سارے دانے پرو دیے گئے ہیں۔ اس مقام پر مولا علیؑ کے کلام کی گہرائی مذکورہ بالا جملوں سے بخوبی روشن اور واضح ہو جاتی ہے۔ توحید کی اس قدر اہمیت، اس لیے ہے کہ توحید، ایمان کا بنیادی ستون، توحید ایمان کی اصل بنیاد، تمام نیکیوں کی شروعات، خدا کی خوشنودی کا سبب اور شیطانِ مردود سے دوری کا باعث ہے۔ اگر توحید کی نورانیت انسان کے جسم و جان کو اپنے حصار میں پوری طرح لے لے، اس طرح کہ پورا انسانی معاشرہ اُس کے نور میں ڈوب جائے تو اب جو توحید کے سائے میں ہر چیز کی شکل و صورت اُبھر کر سامنے آئے گی، وہ کچھ اور ہی رنگ کی ہوگی۔ اسی لیے مولائے متقیان علی علیہ السلام جو خود روحِ توحید ہیں، نہج البلاغہ کے اکثر و بیشتر خطبوں میں توحید اور خدا کی وحدانیت کی گواہی کو بار بار یاد دلاتے ہیں اور اس طرح اپنے مکتب کے پیروکاروں کو توحید کی تعلیم دیتے ہیں، تاکہ عالم اسلام

[1] سورۂ مریم: آیت ۹۵

https://downloadshiabooks.com/

کے ہر عام وخاص کے وجود میں ایک ایسا شعلہ بھڑکا دیں، جوان کے دلوں کو (حق کے لیے) بے قرار رکھے، اور توحید کے آبِ حیات سے اُن کی جانوں کی اس طرح آبیاری ہو کہ اُن کا پورا وجود نیکی اور پاکیزگی کی فصلیں اُگانے کے لیے زرخیز ہوجائے اور اس طرح توحید کا اثر ان پر ہو کہ "صِبْغَةُ اللهِ" یعنی اللہ کا رنگ ان کا مزاج بن سکے، نیز یہ صلاحیت ان کے اندر پوری طرح بیدار ہوجائے۔ رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی نبوت کی گواہی، آپؐ کے فرائض کے بارے میں غور وفکر کرنا نیز قرآن میں تدبّر یقینی طور پر ایسا بہترین وسیلہ ہے، جو حقیقتِ توحید کو انسانوں کے وجود کی گہرائی تک پہنچنے کو ممکن بناتا ہے۔

۲۔ امیرالمومنینؑ کی زندگی میں توحید خالص کی تجلی

حضرت علی علیہ السلام اس سے پہلے کہ دوسروں کو اس بزرگ حقیقت، توحید کی طرف دعوت دیتے، بذاتِ خود سراپا توحید کا پیکر تھے۔ پوری زندگی میں ایک لحظہ کے لیے بھی بتوں کو سجدہ نہیں کیا اور اپنے پاکیزہ دامن کو شرک سے بچائے رکھا، جو بھی قدم اٹھایا خدا کے لیے اور جو فعالیت بھی کی وہ صرف رضائے الٰہی کی خاطر۔ اپنی عمر کے آغاز سے پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی آخری سانس تک ہر جگہ آپؐ کی خدمت میں رہے اور دل وجان سے کوشش کی۔ معروف جنگ کی داستان کہ جس میں عمرو ابن عبدود زمین پر گر پڑا اور حضرت علی علیہ السلام چاہتے تھے کہ اس کا کام تمام کردیں، مشہور ہے کہ اسلام کے سپاہیوں نے دیکھا کہ اس حساس لمحے میں حضرت علی علیہ السلام نے اپنا ہاتھ روک لیا (اور عمرو بن عبدود کے سینے سے اُتر کر چند قدم چلے) پھر دوبارہ اس کی طرف متوجہ ہوئے اور اس کا کام تمام کردیا۔ جب اس کی وجہ پوچھی گئی تو فرمایا:

"قَدْ كَانَ شَتَمَ أُمِّي وَتَفَلَ فِي وَجْهِي فَخَشِيتُ أَنْ أَضْرِبَهُ لِحَظِّ نَفْسِي فَتَرَكْتُهُ حَتَّى سَكَنَ مَا بِي ثُمَّ قَتَلْتُهُ فِي اللهِ" [1]

''اس نے میری ماں کو بُرا کہا اور لعاب دہن کو میری طرف پھینکا، مجھے اندیشہ ہوا کہ کہیں میرے آخری وار میں میرا غصّہ شامل نہ ہوجائے، لہٰذا میں اُسے چھوڑ کر پیچھے ہٹ گیا اور جب اطمینان ہوگیا کہ میرا نفس اس کام میں شامل نہیں اور صرف خدا کی مرضی کو پورا کررہا ہوں تو پھر آخری وار کیا اور اُسے قتل کردیا۔''

جب آپؑ کو آپ کے کچھ ساتھیوں نے آپ کو یہ شرک آلود تجویز دی کہ بڑے بڑے لوگوں کو اپنی حکومت کی بنیادوں کو مضبوط کرنے کے لیے استعمال کیجیے اور اپنا وفادار بنانے کے لیے، مسلمانوں کے بیت المال میں سے ایک خصوصی وظیفہ ایسے افراد کے لیے مخصوص کردیں، تو آپؑ نے اس غلط سوچ کی مذمت کرتے ہوئے فرمایا:

[1] مناقب ابن شہر آشوب، جلد ۲، ص ۱۱۵۔ مستدرک الوسائل، جلد ۱۸، ص ۲۸۔ بحار الانوار، جلد ۴۱، ص ۵۱

https://downloadshiabooks.com/

اَتَأْمُرُوْنِّیْ اَنْ اَطْلُبَ النَّصْرَ بِالْجَوْرِ فِیْمَنْ وُلِّیْتُ عَلَیْهِ وَاللهِ لَا اَطُوْرُبِهٖ مَاسَمَرَ سَمِیْرٌ وَمَااَمَّ نَجْمٌ فِی السَّمَاءِ نَجْمًا [۱]

''کیا تم مجھے یہ مشورہ دے رہے ہو کہ اپنی کامیابی کے لیے ظلم سے مددلوں، کسی کا حق غصب کر کے حکومت کروں ،خدا کی قسم جب تک زندہ ہوں اور جب تک یہ دن رات باقی ہیں اور آسمان کے ستارے بھی مسلسل طلوع اور غروب ہوتے رہیں گے،ان چیزوں میں ہاتھ نہیں ڈالوں گا۔''

جب آپؑ نماز کے لیے کھڑے ہوجاتے تو ایسے خدا کی صفاتِ جلال و جمال میں غرق ہوجاتے کہ اُس ذات کے علاوہ کسی کو نہیں دیکھتے، کسی دوسرے کا خیال نہیں آتا۔جیسا کہ غزوۂ اُحد کا مشہور واقعہ ہے، جب حضرت علیؑ کے پائے مبارک میں تیر لگا، جسے عام حالات میں نکالنا ممکن نہ تھا،لہٰذا رسول اکرمؐ نے حکم فرمایا کہ نماز کی حالت میں یہ کام کیا جائے (اور ایسا ہی کیا گیا) نماز کے اختتام پر امیر المومنینؑ نے فرمایا: مجھے بالکل بھی محسوس نہ ہوا [۲] ایسے توحید پرور واقعات،مولائے کائناتؑ کی زندگی میں ان گنت ہیں۔

دوسرا حصّہ

وَ النَّاسُ فِیْ فِتَنٍ انْجَذَمَ فِیْهَا حَبْلُ الدِّیْنِ وَ تَزَعْزَعَتْ سَوَارِی الْیَقِیْنِ وَ اخْتَلَفَ النَّجْرُ وَ تَشَتَّتَ الْأَمْرُ وَ ضَاقَ الْمَخْرَجُ وَ عَمِیَ الْمَصْدَرُ فَالْهُدٰی خَامِلٌ وَ الْعَمٰی شَامِلٌ عُصِیَ الرَّحْمٰنُ وَ نُصِرَ الشَّیْطَانُ وَ خُذِلَ الْإِیْمَانُ فَانْهَارَتْ دَعَائِمُهُ وَ تَنَكَّرَتْ مَعَالِمُهُ وَ دَرَسَتْ سُبُلُهُ وَ عَفَتْ شُرُكُهُ أَطَاعُوا الشَّیْطَانَ فَسَلَكُوْا مَسَالِكَهُ وَ وَرَدُوْا مَنَاهِلَهُ بِهِمْ سَارَتْ أَعْلَامُهُ وَ قَامَ لِوَاؤُهُ فِیْ فِتَنٍ دَاسَتْهُمْ بِأَخْفَافِهَا وَ وَطِئَتْهُمْ بِأَظْلَافِهَا وَ قَامَتْ عَلٰی سَنَابِكِهَا فَهُمْ فِیْهَا تَائِهُوْنَ حَائِرُوْنَ جَاهِلُوْنَ مَفْتُوْنُوْنَ فِیْ خَیْرِ دَارٍ وَ شَرِّ جِیْرَانٍ نَوْمُهُمْ سُهُوْدٌ وَ كُحْلُهُمْ دُمُوْعٌ بِأَرْضٍ عَالِمُهَا مُلْجَمٌ وَ جَاهِلُهَا مُكْرَمٌ.

''یہ بعثت اُس وقت ہوئی ہے جب لوگ ایسے فتنوں میں مبتلا تھے جن سے دین کی رسی ٹوٹ چکی تھی ،یقین کے ستون ہل گئے تھے،اصول میں شدید اختلاف تھا اور امور میں سخت انتشار،مشکلات سے نکلنے کے راستے تنگ و تاریک

[۱] نہج البلاغہ،خطبہ ۱۲۶

[۲] مناقب مرتضویہؑ،تالیف مولانا محمد صالح کشفی حنفی ص ۳۶۴،طبع بمبئی،مطابق نقل احقاق الحق،جلد ۸،ص ۶۰۲۔

https://downloadshiabooks.com/

ہو گئے تھے۔ ہدایت گمنام تھی اور گمراہی سرِعام اور رحمٰن کی معصیت ہو رہی تھی اور شیطان کی نصرت، ایمان یکسر نظر انداز ہو گیا تھا، اس کے ستون گر گئے تھے اور آثار نا قابلِ شناخت ہو گئے تھے، راستے مٹ گئے تھے اور شاہراہیں بے نشان ہو گئی تھیں، لوگ شیطان کی اطاعت میں اس کے راستے پر چل رہے تھے، یہ لوگ ایسے فتنوں میں مبتلا تھے جنہوں نے انہیں پیروں تلے روند دیا تھا اور سموں سے کچل دیا تھا اور خود اپنے پنجوں کے بل کھڑے ہو گئے تھے، یہ لوگ فتنوں میں حیران و سرگرداں اور جاہل و فریب خوردہ تھے۔ پروردگار نے انہیں اس گھر (مکہ) میں بھیجا جو بہترین مکان تھا لیکن بدترین ہمسائے، جن کی نیند بیداری تھی اور جن کا سرمہ آنسو، وہ سرزمین جہاں عالم کو لگام لگی ہوئی تھی اور جاہل محترم تھا۔"

شرح و تفسیر

زمانۂ جاہلیت کا ایک خاکہ

امام علی علیہ السلام نے اس مختصر اور جامع بیان میں بیس سے کچھ زیادہ جملے ارشاد فرمائے ہیں، جن میں زمانۂ جاہلیت کا کچھ اس طرح نقشہ کھینچا ہے کہ ہر پڑھنے والے نے گویا ان واقعات کو الفاظ کے ذریعے نہیں، بلکہ اپنی آنکھوں سے دیکھا ہو۔ بلا مبالغہ یہ بات کہی جا سکتی ہے کہ حضرت امام علی علیہ السلام نے ان مختصر اور جامع جملوں میں ایک پوری کتاب کو سمو دیا ہے اور یہ آپؑ کے بیان کی قدرت، فصاحت و بلاغت، کلام کی گہرائی و جاذبیت نیز غیر معمولی حُسن و کشش کی علامت ہے [1]، کیونکہ جب تک کہ رسول اللہؐ کے اعلانِ اسلام سے پہلے کے حالات کو نہ سمجھا جائے اور لوگوں کی طرزِ معاشرت کو نہ پرکھا جائے، اُس وقت تک پیغمبر اکرمؐ کی نبوت کی عظمت اور انسانی معاشرے کی اصلاح اور ہدایت کے سلسلے میں جو خدمت آپؐ نے فرمائی ہے، اس کے علاوہ آپؐ کے پاکیزہ دین کی حقیقت اور اس کے اثرات کا اندازہ لگانا اور سمجھنا ممکن نہ ہوگا، یوں سمجھ لیجیے کہ اگر انبیاؑ اور ان کی تاریخ کو پہچاننا ہے، نیز پوری تاریخ میں گزرنے والے نامور عظیم انسانوں کی خدمات کی قدر و قیمت کا صحیح اندازہ لگانا ہے تو اُس زمانے اور اُس وقت کے حالات کا آج اپنے زمانے اور حالات سے موازنہ کرنا ضروری ہے۔ اس موازنے کے عمل کو ایک اصول کی حیثیت حاصل ہے۔

[1] اوپر جو کچھ کہا گیا ہے اس میں "وٙ" جو جملہ "والناس فی فتن" میں استعمال ہوا ہے "وٙ" حالیہ ہے یعنی مولاؑ فرما رہے ہیں کہ خداوند عالم نے پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو ان حالات میں مبعوث کیا لیکن نہج البلاغہ کے بعض شارحین کے مطابق یہ واؤ ابتدائیہ ہے اور اس سے مولاؑ کے اپنے زمانے کے لوگ مراد ہیں لیکن یہ احتمال بہت بعید معلوم ہوتا ہے اور بہتر تفسیر پہلی ہی معلوم ہوتی ہے اگرچہ یہ ممکن ہے کہ مولاؑ لوگوں کو خبردار کر رہے ہوں کہ کہیں وہ ہوا پرستی اور خود ستائی میں مبتلا ہو کر دورِ جاہلیت میں نہ پلٹ جائیں۔

https://downloadshiabooks.com/

پہلے چند جملوں میں ارشاد فرماتے ہیں:

"وَالنَّاسُ فِيْ فِتَنٍ انْجَذَمَ [۱] فِيْهَا حَبْلُ الدِّيْنِ، وَ تَزَعْزَعَتْ [۲] سَوَارِي [۳] الْيَقِيْنِ وَ اخْتَلَفَ النَّجْرُ [۴] وَتَشَتَّتَ الْاَمْرُ وَضَاقَ الْمَخْرَجُ وَ عَمِيَ الْمَصْدَرُ"

''خدا نے اپنے پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو اُس وقت بھیجا کہ لوگ فتنوں میں مبتلا تھے؛ ایسے فتنے کہ جن سے دین سے تعلق ختم ہو چکا تھا، یقین متزلزل اور ایمان کے ستون لرز رہے تھے، یہاں تک کہ فطرتِ انسانی کے بنیادی اصول اور احترامات کے معیار بدل چکے تھے۔ لوگوں کے حالات بگڑ چکے تھے، سارے راستے مسدود ہو چکے تھے اور کسی کو کوئی سہارا نظر نہیں آ رہا تھا، نیز پناہ گاہیں آنکھوں سے اوجھل ہو چکی تھیں۔''

ایک طرف شیاطین کے فتنوں، اور خواہشاتِ نفسانی کے غلاموں کے وسوسوں نے ایمان، عقیدے اور دینی تعلیمات کو ریزہ ریزہ کر کے رکھ دیا تھا تو دوسری طرف بے سروسامانی نے سارے معاشرے کو اپنی لپیٹ میں لے لیا تھا اور اختلافات کے شعلے ہر طرف لپک رہے تھے، اور پھر سب سے بڑا المیہ یہ تھا کہ ایسے حالات میں نہ کوئی پناہ گاہ (رہنمائی موجود) تھی اور نہ ہی راہِ فرار۔ اور لوگ مجبور تھے کہ ہر طرح کے انحرافات کا شکار ہوں، نیز گناہ آلود فضا میں قید، لا حاصل ہاتھ پیر مارتے رہیں۔

"حَبْلُ الدِّيْنِ" دین کی رسی کہ جو مفرد کی شکل میں استعمال ہوئی ہے، یہ دینِ حق کی وحدت کی طرف اشارہ ہے کہ تمام تعلیماتِ انبیاؑ کی بنیاد ایک ہے۔ اگرچہ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ بعض مسائل اور احکامات میں کچھ تبدیلیاں نظر آتی ہیں۔ قرآن مجید ایک معنی خیز جملے میں سچے مومنین کی زبان سے، اس موضوع کے بارے میں فرماتا ہے:

"لَا نُفَرِّقُ بَيْنَ اَحَدٍ مِّنْ رُّسُلِهِ" [۵]

''ہم اُس کے رسولوں میں کوئی فرق نہیں کرتے۔''

---

[۱] انجذم کا مادّہ انجذام ہے معنی کٹنے اور الگ ہونے کے ہیں۔ جذام کی بیماری کو اسی لیے جذام کہا جاتا ہے کہ کیوں کہ اس کی وجہ سے اعضاء بدن کٹ جاتے ہیں۔

[۲] تزعزعت کا مادّہ زعزع ہے، معنی حرکت کرانا اور اضطراب پیدا کرنا ہے جیسا کہ کہا جاتا ہے کہ ''زعزع الریح الشجرۃ'' یعنی ہوا نے درخت کو لرزہ بر اندام کیا۔

[۳] سواری کی جمع ساریہ معنی ستون کے ہیں۔

[۴] نجر بروزنِ فجر معنی جڑ ریشہ اور بنیاد کے ہیں اور کبھی کبھار کسی چیز کو کاٹ کر اس کی اصلاح کے معنی میں آتا ہے۔ اور نجار کو اسی لیے نجار کہا جاتا ہے کیوں کہ وہ لکڑیوں کو کاٹ کر انہیں خاص شکل و ہیئت میں تبدیل کرتا ہے۔

[۵] سورۂ بقرہ، آیت ۲۸۵

https://downloadshiabooks.com/

"اِخْتَلَفَ النَّجْرُ" کی عبارت سے عصر جاہلیت کے اختلافات کی طرف اشارہ ہے، جو ظاہری اختلاف نہیں تھا کہ جس کا کوئی سر و پا معلوم نہیں بلکہ اصولی اور بنیادی اختلافات تھے، بلکہ ہم کہہ سکتے ہیں کہ اس عبارت سے مراد یہ ہے کہ بگاڑ یہاں تک پہنچ چکا تھا کہ انسانی فطرت کے بنیادی اور فطری اُصول جیسے توحید اور نیکیوں اور پاکیزگیوں سے عشق، یہ تمام متزلزل ہو چکے تھے یا یوں سمجھ لیجیے کہ ہر گروہ اپنی جگہ ایک نیا دین لیے بیٹھا تھا۔ ہر ایک کا قبلہ الگ الگ تھا۔ دراصل یہ معاشرے میں تمام اختلافات کی بنیادی وجہ تھی۔

"وَتَشَتَّتَ الْاَمْرُ" ممکن ہے یہ جملہ اس زمانے کے مذاہب کے درمیان غیر معمولی اختلاف کی طرف اشارہ ہو (جبکہ امر سے مراد امر دین لیا جائے) اور یہ بھی امکان ہے کہ اس سے مراد تمام اجتماعی امور کی پراگندگی لی جائے، چاہے دین سے مربوط ہوں یا دنیا سے، معاشرتی مسائل ہوں یا گھریلو مسائل۔

دوسرا معنی دورِ جاہلیت سے زیادہ مناسبت رکھتا ہے۔ بدقسمتی یہ ہے کہ انسان شک اور تردّد کے درمیان بے ایمانی، قسم قسم کے اختلافات اور فتنہ و فساد میں غرق ہو اور اس سے بھی بڑی مصیبت یہ ہے کہ معاشرے کا ہر فرد، سراپا مایوسی کی تصویر بنا ہوا ہو۔ یہ اُس زمانے کا حقیقی نقشہ ہے۔

اس کے بعد پانچ جملوں میں اس بے سر و سامانی کے مزید نتائج کو یوں بیان فرماتے ہیں:

"فَالْهُدٰی خَامِلٌ[1] وَالْعَمٰی شَامِلٌ، عُصِیَ الرَّحْمٰنُ وَنُصِرَ الشَّیْطَانُ وَخُذِلَ الْاِیْمَانُ"

''ایسی فضا قائم ہو چکی تھی کہ جس میں ہدایت کو بُھلا دیا گیا تھا۔ گمراہی اور تاریکی نے ہر جگہ ڈیرہ ڈال رکھا تھا (یہی وہ وجہ تھی کہ) خدا (رحمان) کی نافرمانی کی جا رہی تھی، شیطان کا ساتھ دیا جا رہا تھا، اور ایمان کو تنہا چھوڑ دیا گیا تھا۔''

معلوم رہے کہ راہِ خدا کو طے کرنے کے لیے ایک طرف نورِ ہدایت لازم ہے تو دوسری طرف دیکھنے والی آنکھیں۔ جس ماحول میں نہ روشن چراغ ہوں اور نہ بیدار آنکھیں۔ ایسے حالات میں خواہ مخواہ لوگ شیطانی لشکر کی شکل اختیار کر لیتے ہیں اور پورا معاشرہ گناہ میں ڈوب جاتا ہے۔

یہ نکتہ قابلِ توجہ ہے کہ "عُصِیَ الرَّحْمٰنُ" کے جملے میں خدا کے تمام ناموں میں سے رحمٰن کے نام کا سہارا لیا گیا ہے۔ اس بات سے اشارہ ہوتا ہے کہ رحمت خداوندی کا سایہ تمام دوست و دشمن پر محیط ہوتا ہے؛ اُس کی اطاعت فطری اور روشن امور میں سے ہے، مگر دورِ جاہلیت کے اندھے دل والے اس حقیقت کو دیکھنے سے محروم تھے۔ پھر چار دوسرے جملوں میں اس طرح اس کا نتیجہ بیان فرماتے ہیں:

---

[1] خامل، معنی بھولی ہوئی چیز اور بے قیمت چیز۔

https://downloadshiabooks.com/

فَانْهَارَتْ [۱] دَعَائِمُهُ وَتَنَكَّرَتْ مَعَالِمُهُ وَدَرَسَتْ [۲] سُبُلُهُ وَعَفَتْ شُرُكُهُ [۳]

''ان بے سروسامانی کے حالات میں ایمان کے ارکان متزلزل اور ان کی نشانیاں معدوم ہوچکی تھیں۔ ان کے راستے ویران اور ان کی شاہراہیں نظروں سے اوجھل ہوگئی تھیں۔''

دعائم کی عبارت سے مراد ممکن ہے مردانِ حق اور حق کے راستے پر چلنے والے ہوں یا انبیاؑ کی اصولی تعلیمات کی طرف اشارہ ہوسکتا ہے۔

'فَانْهَارَتْ' کی عبارت سے ان تعلیمات کو نظر انداز، درگزر، فراموش کرنے یا انہیں بھلا دینے کی طرف اشارہ ہے۔

'معالم' سے سابقہ آسمانی کتابوں یا انبیاءؑ کے اصولِ تعلیمات کی طرف اشارہ ہوسکتا ہے۔

'سُبُلُ' اور 'شُرُكُ' سے مراد شناخت کے طریقے اور راستے ہیں، خواہ وہ عقلی و فطری راستے ہوں یا وحی کے طریقے اور آسمانی تعلیمات ہوں۔

یہ نکتہ بھی قابلِ توجہ ہے کہ جیسے پہلے اشارہ ہوچکا ہے۔ ''شرک'' سے مراد ''شاہراہ'' ہے۔ عام طور سے چھوٹے راستے اور گلی کوچے کو تو لوگ بھلا سکتے ہیں، لیکن ''شاہراہِ عام'' کا نشان آسانی سے نہیں مٹتا، لیکن اُس وقت کے معاشرے کا حال یہ ہوگیا تھا کہ ہدایت کی شاہراہوں کے نشان بھی مٹ گئے تھے۔ ان حالات کے نتائج سے آگاہ کرتے ہوئے امام علیؑ فرماتے ہیں:

'أَطَاعُوا الشَّيْطَانَ فَسَلَكُوا مَسَالِكَهُ'

''وہ لوگ شیطان کے پجاری بن چکے تھے اور جو اس کی خواہش ہوتی تھی وہ اس راستے پر چلتے تھے۔''

ان حالات اور مشکلات میں لوگ شیطان کے دام میں پھنس چکے تھے اور اس کے من پسند راستوں پر چلتے تھے۔''

'وَوَرَدُوا مَنَاهِلَهُ [۴]'

''اور اس کے گھاٹ پر اتر پڑے اور سیراب ہوئے۔''

وہی نتیجہ ہے جو امام علی علیہ السلام نے بعد کے جملوں میں فرمایا ہے:

---

[۱] انہارت، کا مادہ انھیار، ہے معنی کسی چیز کو گرانے اور مسمار ہونے کے ہیں۔

[۲] درست کا مادّہ دروس ہے، معنی پرانا ہونا، آثار کا مٹ جانا۔

[۳] شرکہ، بروزن حسنہ، کی جمع ہے۔ بعض لوگوں نے اسے اشراک بمعنی شاہراہ کی جمع ہے۔

[۴] مناهل: منھل کی جمع۔ دریا یا ندی کا گھاٹ جہاں سے پانی حاصل کیا جاسکے۔

https://downloadshiabooks.com/

"بِهِمْ سَارَتْ [۱] أَعْلَامُهُ، وَقَامَ لِوَاؤُهُ"

''ان کے ذریعے سے (وہ لوگ جو شیطان کے وسوسوں میں گرفتار تھے) شیطان کی علامات ظاہر ہونے لگی تھیں، اوراُس کا پرچم لہرانے لگا۔''

امام سخن اور قوم کے امامِ برحق، حالات اور مشکلات کو زندہ تشبیہات اور محکم کنایات کے ذریعے، سننے اور پڑھنے والوں کے ذہنوں میں مجسم کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

"فِي فِتَنٍ دَاسَتْهُمْ [۲] بِأَخْفَافِهَا [۳] وَوَطِئَتْهُمْ بِأَظْلَافِهَا [۴] وَقَامَتْ عَلَى سَنَابِكِهَا" [۵]

''گویا زمانے کا ستم، ایسا متحرک فتنہ بن چکا تھا، جو بس اپنی من مانی کرنے پر تلا ہوا تھا، جو اُس کی زد میں آجائے اُسے اپنے پیروں تلے روندنے کو بے چین تھا، پنجوں کے بل کھڑا، نئے حملے کے لیے تیار تھا۔''

کیا یہ کوئی نئے فتنے ہیں یا وہی فتنے جن کی طرف سابق الذکر سطور میں اشارہ وہوا ہے؟ بظاہر وہی فتنے ہیں جن کا اب تک تذکرہ ہوتا رہا ہے اور اس مقام پر ان فتنوں کی کچھ خصوصیات اور ان کے مزید اثرات کو بیان کیا گیا ہے۔ امام المتقینؑ زمانۂ جاہلیت کے فتنوں کو ایک خطرناک وحشی حیوان سے تشبیہ دیتے ہیں، جو اپنے سموں سے اپنے قریب کے افراد کو روند چکا ہے اور اپنے پیروں پر چوکنا کھڑا ہے کہ اگر مدمقابل کوئی بھی حرکت ہو تو اُسے پوری طاقت سے کچل دے۔

"سنابك" سے مراد ایسے حیوانات کا سُم ہے جو مکمل ایک حصے میں ہے (مراد مضبوط اور طاقتور ہے) اس کا اشارہ اس بات کی طرف ہے کہ ایسا فتنہ ہے، جسے شکست نہیں دی جاسکتی اور جس کا منحوس سایہ عوام پر حاوی ہے (دراصل ایسے حیوانات اپنے سموں پر اُس وقت کھڑے ہوتے ہیں کہ جب اُنھیں شدید ترین ردِعمل کا اظہار کرنا ہوتا ہے، گویا حالات اور مشکلات اس طرح معاشرے پر مسلط تھے کہ دم گھٹا جارہا تھا اور سانس لینا دشوار تھا۔ یہی وجہ ہے کہ امام علی علیہ السلام نے آخری جملے میں ان حالات سے یہ نتیجہ اخذ فرمایا ہے:

---

[۱] سارت: ''سور'' کے مادّے سے بنا ہے۔ بالا دستی حاصل کرنا۔

[۲] داست: دوس اور دیاس کے مادّے سے ہے۔ معنی پائمال کر دینا۔ فی فتن داستهم، میں دو احتمال پائے جاتے ہیں۔ اول یہ کہ جار و مجرور کا متعلق محذوف ہو۔ اور اس کی تقدیری حیثیت ''والناس فی فتن'' ہو۔ دوسرا احتمال یہ ہے کہ جار و مجرور کا متعلق سابق الذکر جملے موجود سارت کا فعل ہو۔ البتہ پہلا احتمال زیادہ قوی ہو

[۳] اخفاف: ''خف'' کی جمع بہ معنی چکمہ۔ اونٹ کے پیر کا نچلا حصہ جو چکمہ کی طرح ہوتا ہے۔

[۴] اظلاف: جمع ظلف۔ جانوروں کے سم جو دو ٹکڑوں میں ہوتے ہیں جیسے گائے، بکری وغیرہ کے سُم۔

[۵] سنابک: سنبک کی جمع (قنفد کے وزن پر) ایسے حیوان جن کا ایک سُم ہوتا ہے جیسے گھوڑا۔

https://downloadshiabooks.com/

"فَهُمْ فِيهَا تَائِهُونَ [1] حَائِرُونَ جَاهِلُونَ مَفْتُونُونَ"

"وہ فتنوں میں سرگرداں، حیران و پریشان اور نادان ودھوکا کھائے ہوئے، حواس باختہ ہو چکے تھے۔"

"تَائِهُونَ" اس طرف اشارہ ہے کہ راہِ حق مکمل طور پر بھول چکے تھے، حتیٰ کہ اپنے آپ کو بھول گئے تھے۔

"حَائِرُونَ" نفسیاتی کیفیت کی طرف اشارہ ہے کہ ذہن ساتھ چھوڑ گیا تھا اور وحشت نے ان کو گھیر لیا تھا، کچھ سجھائی نہیں دے رہا تھا کہ کیا کریں اور کدھر جائیں۔

"جَاهِلُونَ" اشارہ ہے اس بات کی طرف کہ اگر نجات حاصل کرنے کا فیصلہ کر بھی لیں تو بھی جہالت اور بے خبری ان کے راستے میں رکاوٹ تھی۔

"مَفْتُونُونَ" اوہام اور خرافات نے ان کا وہ حال کیا تھا کہ سراب کو حقیقت اور حقیقت کو وہم و گمان سمجھنے لگے تھے (کسی پر اعتبار کرنا ممکن نہ تھا) یہ اُس جگہ کی بات ہے: "فِي خَيْرِ دَارٍ [2] وَشَرِّ جِيرَانٍ" جہاں بہترین گھر تھا (یعنی خانۂ کعبہ، انبیاؑ کا مقام) لیکن بدترین ہمسائے وہاں رہتے تھے۔ (جو جان، مال، عزت و آبرو کے دشمن اور دین کے نام و نشان کو مٹانے کے لیے تیار تھے) "نَوْمُهُمْ سُهُودٌ [3] وَكُحْلُهُمْ دُمُوعٌ" بار بار نازل ہونے والی مصیبتوں کی وجہ سے ان کی نیندیں حرام تھیں اور مسلسل آنکھوں میں آنسو تھے، انہیں ہرگز آرام نصیب نہ تھا۔ مسلسل درپیش مصائب و آلام، ان کی آنکھوں سے آنسو تھمنے نہیں دیتے تھے۔ افسوسناک بات یہ ہے کہ ایسی سرزمین پر زندگی بسر کر رہے تھے:

"بِأَرْضٍ عَالِمُهَا مُلْجَمٌ وَجَاهِلُهَا مُكْرَمٌ"

"اس سرِزمین پر عالم کے منہ میں لگام تھی اور جاہل معزز و سرفراز تھا۔"

ظالموں کے ظلم و جور کی وجہ سے دانشمند خاموشی پر مجبور تھے اور لوگوں کی ہدایت کرنے اور انھیں مشکلات سے نجات دینے سے عاجز تھے۔ جاہل باعزت اور معاشرے پر حاکم تھے۔

مفسرین نہج البلاغہ کے مطابق جملہ "فِي خَيْرِ دَارٍ" کی چار مختلف تفاسیر دیکھنے میں آئی ہیں۔ جیسا کہ ہم کہہ چکے ہیں کہ بعض کعبہ اور حرمِ امنِ الٰہی کی طرف اشارہ سمجھتے ہیں (اس بنا پر کہ مذکورہ بالا تمام جملے زمانۂ جاہلیت کی صفت بیان کرتے

---

[1] تائھون جمع ہے تائہ کی، جس کے معنی گمشدہ کے ہیں۔

[2] "فی خیر دار" کے جملے میں، بعض افراد نے "جار و مجرور" کو "مفتونون" سے متعلق جانا ہے، لیکن زیادہ مناسب یہ ہے کہ اس جملے کو "خبر" مانتے ہوئے اس کے "مبتداء" کو "محذوف" مان لیا جائے۔ یعنی جملہ دراصل یوں تھا "والناس فی خیر دار" اور یہ پورا جملہ "حال" مان لیا جائے "عصر جاہلیت" کے لیے، نیز "واوٗ"، "وشرِّ جیران" میں، "مع" (ہمراہ) کے معنیٰ میں استعمال ہوا ہے۔

[3] "سھود" مصدر ہے، جس کے معنی "نیند نہ آنا یا نیند کا کم ہو جانا" ہے۔ (صحاح، مفردات، لسان العرب اور مقائیس اللغۃ)

https://downloadshiabooks.com/

ہوں) حالانکہ بعض سرزمین شام کی طرف اشارہ سمجھتے ہیں کہ یہ بھی بزرگ انبیاءؑ کی سرزمین ہے، مگر اُس وقت شام کے لوگ اس زمین کے بدترین ہمسائے تھے (یہ اس صورت میں ہے کہ مذکورہ جملے حضرت علیؑ کے اپنے زمانے پر دلالت کرتے ہوں) تیسرا احتمال یہ ہے کہ مراد ''کوفہ'' ہو، جہاں حضرت علیؑ رہا کرتے تھے۔ چند انگشت شمار منافقوں، عہد شکنوں اور برے ہمسایوں نے اس پاک زمین پر قبضہ جمایا ہوا تھا اور ان جملوں کی چوتھی تفسیر یہ ہوسکتی ہے کہ ''دنیائے فانی'' مراد ہے، جہاں بُرے لوگ کثرت سے پائے جاتے ہیں۔ پہلی تفسیر سب سے مناسب اور صحیح معلوم ہوتی ہے، مذکورہ بالا عبارات بھی اسی تفسیر سے مطابقت رکھتی ہیں۔

اس بنا پر ''نَوْمُهُمْ سُهُودٌ'' سے لے کر آخر تک کے تمام جملے عصر جاہلیت کی ناامنیوں، پریشانیوں اور اس وقت کے مصائب و مشکلات کی طرف اشارہ ہوں گے۔ عالم وہ پاک افراد تھے کہ جو ظہور پیغمبرؐ کے بعد تیزی سے آپؐ کے گرد جمع ہوگئے جبکہ جاہل وہ فاسد، مفسدین قریش اور ان جیسے لوگ تھے، مگر دوسری تفاسیر کی بنا پر امیر شام کے زمانے کی بدامنی اور عراق و شام کی مشکلات مراد ہونگی لیکن یہ احتمال کمزور ہے، کیونکہ یہ تفسیر رُوحِ خطبہ کے ساتھ کچھ مناسبت نہیں رکھتی۔ اس تفسیر پر گواہ وہ حدیث ہے کہ جسے ابن ابی الحدید نے اپنی کتاب میں پیغمبر اکرمؐ سے نقل کیا ہے کہ آغازِ بعثت میں اپنی حالت بیان کرتے ہوئے آپؐ نے فرمایا:

''کُنْتُ فِیْ خَیْرِ دَارٍ وَشَرِّ جِیْرَانٍ''

''میں ایک بہترین گھر میں تھا مگر بدترین ہمسایوں کے درمیان تھا۔'' [1]

امامِ عالی مقامؑ نے دو جملوں میں نہایت سادگی اور روانی کے ساتھ پورے معاشرے کی بے چینی، بے قراری اور نفسیاتی کیفیت کو بیان کرتے ہوئے فرمایا:

''نَوْمُهُمْ سُهُودٌ، وَ کُحْلُهُمْ دُمُوْعٌ''

''جہاں نیند کے بجائے بیداری اور سُرمے کی جگہ آنسو تھے۔''

یہ تعبیر عصر جاہلیت کی بدامنیوں، اور اس وقت کے مصائب و مشکلات کی طرف ایک لطیف و ظریف اشارہ ہے کہ اگر وہ کہیں سو بھی جائے تو ان کی نیند خوف و ہراس سے بھرپور اور وحشتناک ہوتی تھی اور پھر مسلسل بے خوابی انہیں جھکڑ لیتی۔ مصائب کا دامن اتنا پھیلا ہوا تھا کہ آنکھوں کی زینت سرمہ کی جگہ ان کے سوزناک اور پے در پے گرنے والے آنسوؤں نے لے لیا تھا جو طرح طرح کی مشکلات اور مصائب کے آئینہ دار تھے۔

---

[1] شرح نہج البلاغہ ابن ابی الحدید جلد ۱، صفحہ ۱۳۷

https://downloadshiabooks.com/

یہ فطری بات کہ ایک ایسے تاریک ماحول میں حضرت رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے چند گنے چنے علماء، جو تنہا آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے یار و یاور تھے، خاموشی اختیار کرنے پر مجبور تھے۔ جبکہ قریش کے جاہل اور شرک و الحاد کے سردار حضرات نہایت احترام و عزت کی زندگی جی رہے تھے۔

یہ بھی ممکن ہے کہ عالم سے مراد، وہ چند موحّد اور آگاہ افراد ہوں جو رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی بعثت سے پہلے موجود تھے، جیسے حضرت عبدالمطلبؑ، حضرت ابوطالبؑ نیز جناب قس بن ساعدہ اور جناب لبید بن ربیعہ نیز اُن جیسے دیگر بزرگان۔

نکتہ

دورِ جاہلیت میں لوگوں کی بے حس و مردہ زندگی

حضرت امام علی علیہ السلام نے مذکورہ مختصر اور جامع عبارات میں عرب کے زمانۂ جاہلیت کی بے حس زندگی کا خاکہ کھینچا ہے کہ گہرائی کے ساتھ مطالعہ کرنے سے انسان اپنے آپ کو بھی اس زمانے میں محسوس کرتا ہے گویا کہ تمام بے سروسامانی اور تنگدستی اور اُس زمانے کی بُرائیوں کو اپنی آنکھوں کے سامنے دیکھ رہا ہے۔ مذکورہ بالا بیان کا ایک رخ یہ ہے کہ ایسے معاشرے میں جہاں ہر سو تاریکی چھائی ہوئی ہے، وہاں پیغمبر اسلامؐ کے مقام و مرتبے کی عظمت اور نورِ ہدایت زیادہ واضح اور روشن انداز میں نظر آنا نیز سمجھا جا سکتا ہے، ایسے میں رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمات اور آپؐ کی پاک و پاکیزہ زندگی زیادہ نمایاں اور روزِ روشن کی طرح جگمگاتی اور اپنے اثرات کو منواتی ہے۔ اب ذرا تصور کیجیے کہ ایسے تاریک معاشرے کو رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے زمانے میں تبدیل کرنا تقریباً ناممکن نظر آتا ہے، لہٰذا انسان کو با آسانی یقین آجاتا ہے کہ اگر کوئی طاقت ہے تو وہ صرف معجزے کی قدرت اور وحی کی عظیم طاقت اور دینِ اسلام کے سنہرے اصول اور جامع منشور ہی ہیں جو ایسے معجزانہ اثرات کے حامل ہیں۔

اور دوسرا پہلو اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ مولائے متقیانؑ کے زمانے میں (رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی آنکھ بند ہوتے ہی) آداب و افکارِ اسلامی تبدیل ہونے لگے اور جاہلیت کے زمانے کا مزاج دوبارہ نمایاں ہونا شروع ہو گیا تھا، یہ سب کچھ، خلفاء کے زمانے میں، پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی تعلیمات سے منہ موڑنے کے نتیجے میں ہوا۔ یہی وجہ تھی کہ عالمِ انسانیت کا یہ عظیم معلّم اپنے ہر لفظ میں سراپا فریاد ہے۔ اپنے زمانے کے عوام کو غفلت سے بیدار کرتا، اُن کی آنکھوں کو حقیقت سے آشنا کرتے ہوئے یوں گویا ہوتا ہے کہ ''زمانۂ رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم میں تم کہاں تک پہنچ چکے تھے اور آج کہاں تک گر چکے ہو''۔

https://downloadshiabooks.com/

اسلامی معاشرہ، چاروں طرف سے خطروں میں گھر چکا ہے اور روحِ جاہلیت ایک بار پھر پوری طرح بیدار ہونے کو ہے، جاگو کہ وقت ہاتھ سے جانے کو ہے۔

دلچسپ بات یہ ہے کہ امامِ برحق، اس خطبے کو جنگِ صفین سے واپسی پر بیان فرما رہے ہیں۔موضوع ''جنگ میں (ظاہری) ناکامی'' ہے۔

عربی اور فارسی کا مشہور محاورہ ہے: ''اِیَّاكَ اَعْنِیْ وَ اسْمَعِیْ یَا جَارَۃُ'' یعنی اے لوگو! اے میرے ہمسائے میں رہنے والو! میں تم سے مخاطب ہوں۔میری بات غور سے سنو! اور اچھی طرح سمجھ لو'' یہ ایک کنایہ اور قابلِ فہم بیان ہے۔جس کے ذریعے اپنے ہمدروں کو خبردار کر رہے ہیں۔

یہ انسانی ضمیر کو جھنجھوڑ کر رکھ دینے والے جملوں کا مطالعہ، آج ہم مسلمانوں کے لیے، اور جو کچھ آج کی دنیا نیز مغربی تہذیب وثقافت میں ہوتا نظر آ رہا ہے، جنہیں مشین کے پرزوں کی طرح جکڑ دیا گیا ہے۔یہ درحقیقت لمحۂ فکریہ ہے۔اس لیے کہ یہ لفظ بہ لفظ، آج کی مادّی دنیا کے حالات ومسائل کے عین مطابق نظر آتا ہے۔آج بھی لوگ فتنوں میں ڈوبے ہوئے ہیں، ایمان اور یقین کی بنیادیں متزلزل ہو چکی ہیں۔اَخلاقی بُرائیوں کی آلودگیوں اور بظاہر ہرا راستہ لیکن زہریلی معلومات کی سج دھج میں، حق کی شناخت تک جانے والے راستے کہیں کھو گئے ہیں۔لوگوں کا نظام زندگی درہم برہم ہو چکا ہے، فتنہ وفساد سے دامن بچانا مشکل ہو چکا ہے، گمراہی اور تاریکی نے ہر جگہ اپنا ڈیرہ ڈال رکھا ہے اور ''ہدایت کا کام'' بھولی بسری داستان بن چکا ہے۔نتیجہ یہ کہ فسق وفجور نے انسانی معاشرے کو اچھی طرح سے جکڑ لیا ہے اور اب ساری دنیا شیاطین کے ہاتھ میں ایک کھلونے کی طرح ہے۔

جی ہاں! مولائے کائناتؑ کے زمانے میں، غفلت زدہ عوام نے ایک بار پھر جاہلانہ معیاروں کو اپنا لباس بنا لیا تھا اور اب ہمارا معاشرہ بھی ایسا ہو چکا ہے، لیکن انتہائی تعجب کی بات یہ ہے کہ اُس زمانے کے لوگ کچھ اس طرح خوابِ غفلت میں ڈوب گئے تھے کہ سوائے ایک خاص گروہ کے، کسی پر اس عظیم معلم کی دل خراش فریادوں کا اثر نہ ہوا، وقت گزرتا گیا اور ایک کے بعد زمانۂ جاہلیت کے رسم ورواج زندہ ہوتے گئے، آخر کار وہی ہوا جس کا اندیشہ تھا۔

اسلامی حکومت خلافت بنی امیہ اور بنی عباس کی شکل اختیار کر گئی؛ نہ صرف دنیا میں اسلام کی پیش قدمی رک گئی، بلکہ اسلام اور مسلمانوں کے پیکر کو شدید ترین دھچکے لگے۔

اس موضوع کو پایۂ تکمیل تک پہنچانے کے لیے بہت مناسب ہوگا کہ ہم مختلف زاویوں سے، زمانۂ جاہلیت میں عوام الناس کے حالات ومسائل کا زیادہ گہری نظر سے جائزہ لیں اور حضرت امیر المومنینؑ نے اپنے چھوٹے چھوٹے جملوں میں

https://downloadshiabooks.com/

سمندر کو کوزے میں بند کرنے کی مثال کے عین مطابق جو کچھ فرمایا ہے، اُس کو مزید وضاحت کے ساتھ ہم آیاتِ قرآنی اور تاریخ کے صفحات سے با آسانی سمجھ سکتے ہیں۔

عرب کی جہالت اور دوسری قوموں میں موجود اُس سے ملتی جلتی جہالتوں کو دیکھ کر اندازہ ہوتا ہے کہ یہ دراصل غلط رسم ورواج، عادات واطوار، باطل عقائد اور خرافات، بے شرمی اور بیہودہ مزاج نیز انتہائی سنگدلانہ برتاؤ کا مجموعہ تھا۔ پتھر اور لکڑی سے بُت تراشتے اور اُن کی پرستش کرتے، مشکلات میں اُن ہی سے پناہ مانگتے اور پھر ان بے شعور چیزوں کو خدا کی بارگاہ میں اپنا شفاعت کرنے والا نیز اُن کو زندگی کے تمام اُمور، خوش نصیبی اور بد نصیبی، اور خیر و شر پر حاکم سمجھتے اور مانتے تھے۔

اپنی عزت و ناموس کی حفاظت کے بہانے نہ صرف اپنی لڑکیوں کو زندہ درگور کر دیا کرتے تھے بلکہ لڑکوں کو بھی قتل کرنا اور بتوں پر نذر کے طور پر قربان کر دینا اُن کے دین کا حصہ تھا اور کبھی فقر وفاقہ اور تنگ دستی[1] بھی اس قسم کی بے رحمی کا باعث بنتی تھی۔ ''سونے پہ سہاگہ'' یہ کہ اپنی ان بدکرداریوں کا ان کو کوئی افسوس نہ تھا بلکہ اپنے ایسے اعمال پر فخر ومباہات کیا کرتے اور اُن کو اپنے خاندان کی مثبت اور منفرد صفات شمار کرتے تھے۔ اُن کی نماز اور راز ونیاز کا انداز یہ تھا کہ مسلسل تالیاں پیٹتے اور سیٹیاں بجاتے تھے، یہ تمام کام خانۂ کعبہ میں انجام پاتے، حتیٰ کہ ان کی خواتین اکثر بالکل برہنہ حالت میں کعبے کا طواف کرتیں اور ان نازیبا حرکات کو عبادت شمار کیا جاتا تھا۔[2] جنگ، خون خرابہ اور غارت گری ان لوگوں کے لیے، فخر و مباہات کا باعث تھی، (خلافِ انسانیت، طاقت کا استعمال) اور جہاں تک عورت کی شخصیت کی بات تھی، تو وہ ''ایک بے قیمت مال'' سمجھی جاتی تھی، بنیادی انسانی حقوق سے بھی اُس کو محروم کر رکھا تھا، حتیٰ کہ جوئے کے طور پر اُس پر شرط بھی لگائی جاتی تھی۔

''وَيَجْعَلُوْنَ لِلّٰهِ الْبَنَاتِ سُبْحَانَهُ وَلَهُمْ مَا يَشْتَهُوْنَ''[3]، ''اَمْ خَلَقْنَا الْمَلَآئِكَةَ اِنَاثاً وَّهُمْ شَاهِدُوْنَ''[4]

غضب خدا کا! انہوں نے اللہ کے فرشتوں کو ''خدا کی بیٹیاں'' قرار دیا تھا اور گھر میں لڑکی کے پیدا ہونے کو اپنے لیے ننگ و عار سمجھتے تھے۔ انھوں نے خود ساختہ خرافات پر مبنی دین بنایا ہوا تھا (اپنے مفادات کے مطابق) جس میں ایک

---

[1] سورۂ اَنعام، آیت ۱۳۷، سورۂ اَسراء، آیت ۳۱، سورۂ تکویر آیت ۸

[2] سورۂ انفال، آیت ۳۵۔ سورۂ برأت کی معروف ومشہور شانِ نزول میں یہ بات موجود ہے کہ ''حضرت علیؑ جہاں اور بہت سے کاموں کے ذمے دار تھے، وہاں یہ حکم بھی خدا کی جانب سے ان کو انجام دینا تھا کہ ''حج کے زمانے میں، عریاں حالت میں طواف سے، لوگوں کو منع کیا جائے۔ ''ولا یطوفن بالبیت عریان'' تفسیر نور الثقلین، جلد ۲، صفحہ ۱۷۹ تا ۱۸۱، حدیث ۱۴، ۱۷، ۱۸، ۲۰، تفسیر مجمع البیان، جلد ۵، ص ۳۔

[3] سورۂ نحل، آیت ۵۷

[4] سورۂ صافات، آیت ۱۵۰

https://downloadshiabooks.com/

بات یہ بھی تھی کہ حیوانات کے شکم میں جو بچے ہیں۔ وہ ہم مردوں کا حصہ ہیں اور ہماری بیویوں پر وہ حرام ہیں۔ ہاں اگر وہ مردہ پیدا ہوئے تو پھر سب اُس میں شریک ہوسکتے ہیں۔[۱] جب اپنی بیویوں سے جھگڑا ہوتا اور اُن پر اپنے غصے کا اظہار کرنا ہوتا تو ''ظہار'' کرتے، یعنی بس اتنا ہی کافی تھا کہ بیوی سے کہتے، "اَنۡتِ عَلَیَّ کَظَهۡرِ اُمِّی" ''تیری نسبت مجھ سے ایسی ہی ہے جیسے میری ماں۔''

یہ گفتگو اُن کی نظر اور عقیدے کے مطابق باعث بنتی کہ اُس کی بیوی، اُس کی ماں کی حیثیت اختیار کرے اور اس پر حرام ہو جائے، دوسرے لفظوں میں بغیر طلاق کے طلاق سمجھی جائے اور وہ عورت ایک سزا کے طور پر بطور مطلق غیر واضح صورتِ حال کا شکار رہے اور اُسے معلوم نہ ہو کہ اب کیا کرنا ہے۔[۲] زمانۂ جاہلیت کی ایک دردناک رسم اور خاصیت یہ تھی کہ جنگ، خون خرابہ اور کینہ پروری، خاندانوں اور قبائل میں نسل در نسل چلتی رہتی تھیں۔ باپ، اپنے فرزندوں کے لیے لڑائی جھگڑوں کو ارث میں چھوڑ کر جاتا تھا۔ ایسا بدبختی اور بربادی والا ماحول، جس کی قرآن تصویر کشی کرتا ہے، ارشاد ہوتا ہے:

"وَاذۡكُرُوۡا نِعۡمَتَ اللّٰهِ عَلَيۡكُمۡ اِذۡ كُنۡتُمۡ اَعۡدَآءً فَاَلَّفَ بَيۡنَ قُلُوۡبِكُمۡ فَاَصۡبَحۡتُمۡ بِنِعۡمَتِهٖۤ اِخۡوَانًا‌ ۚ وَكُنۡتُمۡ عَلٰى شَفَا حُفۡرَةٍ مِّنَ النَّارِ فَاَنۡقَذَكُمۡ مِّنۡهَا"

''اللہ کی اُس عظیم نعمت (احسان) کو پہچانو جو اُس نے تم لوگوں پر عطا فرمائی، یاد کرو جب تم آپس میں دشمن تھے، خدا نے تمہارے دلوں میں اُلفت پیدا کر دی اور خدا کی نعمت کی برکت سے تم بھائی بھائی ہو گئے، تم تو آگ کے دہانے پر کھڑے تھے کہ اللہ نے تمہیں اس سے بچا لیا۔''[۳]

عرب کے باطل عقائد میں سے کچھ یہ بھی تھے کہ وہ بارش کے ہونے کو خاص قسم کے ستاروں کے طلوع اور غروب ہونے سے ربط دیتے تھے، پرندوں کے ذریعے نیک اور بد کی فالیں نکالتے تھے۔ وہ جنگل و بیابان میں ''دیو'' کے ہونے پر ایمان رکھتے تھے اور ان جیسے نہ جانے کتنے خام قسم کے خیالات ان کے ذہنوں پر حاوی تھے۔ ایسی تمام باتوں کے مجموعے کو قرآن مجید میں ''ضلالِ مبین'' کا عنوان دیا گیا ہے یعنی ''واضح اور کھلی گمراہی''۔ سبحان اللہ! کیا روشن اور بولتی ہوئی زبان ہے۔ ارشاد ہوتا ہے:

"هُوَ الَّذِىۡ بَعَثَ فِى الۡاُمِّيّٖنَ رَسُوۡلًا مِّنۡهُمۡ يَتۡلُوۡا عَلَيۡهِمۡ اٰيٰتِهٖ وَيُزَكِّيۡهِمۡ وَيُعَلِّمُهُمُ الۡكِتٰبَ

---

[۱] سورۂ انعام: آیت ۱۳۹

[۲] سورۂ احزاب: آیت ۴، سورۂ مجادلہ: آیت ۲

[۳] سورۂ آلِ عمران: آیت ۱۰۳

https://downloadshiabooks.com/

وَالْحِكْمَةَ وَإِنْ كَانُوا مِنْ قَبْلُ لَفِي ضَلَالٍ مُّبِينٍ"۔[1]

''وہی تو ہے جس نے مکہ والوں میں ان ہی میں کا ایک رسولؐ (محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) بھیجا جو ان کے سامنے اس کی آیتیں پڑھتے اوران کو پاک کرتے ہیں اوران کو کتاب اور عقل کی باتیں سکھاتے ہیں اگرچہ اس کے پہلے تو یہ لوگ صریحی گمراہی میں (پڑے ہوئے) تھے۔''

ہاں! تو یہ تھی جاہلیت عرب کی داستان (اور یہ کوئی تعجب کی بات نہیں) اور بالکل ایسی ہی ہیں (معمولی فرق کے ساتھ) گزشتہ صدیوں اور زمانوں کی جاہلیت کی اصل علامات، جن کی شکلیں مختلف ہیں، مگر روح اور مزاج ایک ہیں۔

یہاں سے پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے کام کی اہمیت اور عظمت نیز قرآنِ مجید کے ''معجزانہ بیان وتاثرات'' کا اندازہ ہوتا ہے، جس کا عاجزانہ اعتراف کرتے ہوئے مغرب کا مشہور زمانہ فلسفی و تاریخ دان ''تھامس کارل'' کہتا ہے: ''خدا نے عرب کی، اسلام کے ذریعے کایا پلٹ دی، تاریکی سے روشنی کی طرف اُن کی ہدایت کی، ایک خاموش، جمود کی شکار قوم کو اس طرح خوابِ غفلت سے بیدار کیا کہ اُن کی گمنامی، شہرت میں بدل گئی، سستی کی جگہ حرکت نے لے لی، پست ترین لوگ عرش اعلیٰ پر نظر آئے، عاجزی اور ناتوانی، طاقت وقوت کی مثال بن گئی۔ ظہورِ اسلام کے ذریعے ان کے نور سے دنیا کے چاروں گوشے جگمگا اُٹھے۔ ایک صدی گزرنے نہ پائی تھی کہ مسلمانوں کا ایک پیر ہند میں تھا تو دوسرا اُندلس کو روند رہا تھا۔ آخر کار اسی مختصر مدت میں، اسلام کا نور آدھی دنیا کی آنکھوں کو چکا چوند کر چکا تھا۔[2]

تیسرا حصّہ

"وَمِنْهَا يَعْنِي آلَ النَّبِيِّ عَلَيْهِ الصَّلَاةُ وَالسَّلَامُ:

هُمْ مَوْضِعُ سِرِّهِ وَلَجَأُ أَمْرِهِ وَعَيْبَةُ عِلْمِهِ وَمَوْئِلُ حُكْمِهِ وَكُهُوفُ كُتُبِهِ وَجِبَالُ دِينِهِ بِهِمْ أَقَامَ انْحِنَاءَ ظَهْرِهِ وَأَذْهَبَ ارْتِعَادَ فَرَائِصِهِ.

''یہ لوگ رازِ الٰہی کی منزل اور امرِ دین کا ملجا و ماویٰ ہیں۔ یہی علم خدا کے مرکز اور حکم خدا کی پناہ گاہ ہیں۔ کتابوں نے یہیں پناہ لی ہے اور دین کے یہی کوہ گراں ہیں۔ انہیں کے ذریعے پروردگار نے دین کی ٹیڑھی پشت کو سیدھا کیا ہے اور انہیں کے ذریعے اس کے جوڑ بند کے رعشے کا علاج کیا ہے۔''

---

[1] سورۂ جمعہ: آیت ۲

[2] ''محمدؐ اور قرآن کی بارگاہ میں عرضِ معذرت'' صفحہ ۷۷ ''نقل از تفسیر نمونہ، جلد ۳، ص ۳۱''

https://downloadshiabooks.com/

شرح وتفسیر

آلِ محمد علیہم السلام کا عظیم رتبہ

امام جنّ و بشر، خطبے کے اس حصّے میں، خاندان پیغمبرؐ اور آئمہ اہلبیت علیہم السلام کی توصیف بیان فرماتے ہیں، گویا چھوٹی چھوٹی عبارتوں میں حوضِ کوثر چھلکتا ہے۔ رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے وصال کے بعد، عالم اسلام میں خاندانِ عصمت وطہارت کا مقام کیا تھا؟ چنانچہ امیر المومنین تسلسل کے ساتھ آٹھ جملوں میں، وہ سب کچھ بیان فرمارہے ہیں جو ''حدیث ثقلین، حدیث سفینۂ نوح علیہ السلام اور حدیث نجوم'' میں موجود ہے۔ آیئے دیکھتے ہیں کہ اُس کی تفصیل کیا ہے؟ [۱]

پہلے چھ (۶) جملوں میں ارشاد ہوتا ہے:

هُمْ مَوْضِعُ سِرِّهِ، وَلَجَأُ [۲] أَمْرِهِ، وَعَيْبَةُ [۳] عِلْمِهِ وَمَوْئِلُ [۴] حُكْمِهِ، وَكُهُوفُ كُتُبِهِ، [۵] وَجِبَالُ دِينِهِ [۶]

''وہ ہستیاں، اسرار خدا کا مرکز، اُس کے فرمان کی پناہ گاہ، علم الٰہی کے ظرف، اُس کے احکام کا مقام اور آسمانی

---

[۱] مشہور احادیث جو شیعہ اور سنی کتب اور منابع و ماخذ اصلی میں بیان ہوئی ہیں۔ اُن میں مقامِ اہل بیتؑ کو واضح طور پر بیان کیا گیا ہے۔ حدیثِ ثقلین میں اہلِ بیتِ پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو، قرآن کے بعد ہدایت کا سب سے اہم وسیلہ اور نجات کا باعث بتایا گیا ہے، نیز یہ کہ قرآن اور اہلِ بیتؑ کبھی بھی ایک دوسرے سے جدا نہیں ہو سکتے ہیں۔ دوسری حدیث، ''حضرتِ نوحؑ کی کشتی سے تشبیہ'' کے بارے میں ہے کہ یہ کشتی طوفان کے وقت ڈوبنے سے بچاؤ کا واحد وسیلہ تھی اور تیسری حدیث میں ''اہل بیت علیہم السلام کو آسمان کے ستاروں سے تشبیہ دی ہے''۔ کیونکہ آسمان کے ستارے (خشکی اور پانی میں تاریک راتوں میں) ہدایت اور راستے کی شناخت کا اہم وسیلہ سمجھے جاتے ہیں۔

[۲] ''لجا'' اور ''ملجا'' کے معنی پناہ گاہ ہیں۔

[۳] ''عیبۃ'' یعنی صندوق یا ایسی چیز جس میں کچھ چھپایا جا سکے۔ اصل میں یہ مادّہ ''عیب'' سے لیا گیا ہے، یہی وجہ ہے کہ عام طور سے ''عیوب'' کو چھپایا جاتا ہے، لہٰذا یہ اصطلاح اس معنی کے لیے استعمال ہوتی ہے۔

[۴] ''موئل'' ''وال'' کے مادّے سے (بروزن سھل) ہے، جس کے معنی ہیں ''پناہ گاہ اور نجات کی جگہ''

[۵] توجہ رہے کہ ان (چھے) جملوں اور ان کے بعد والے جملے کے مرجع ضمیر کے بارے میں بھی، نہج البلاغہ کے شارحین کے درمیان بحث وگفتگو ہے۔ بعض کی رائے یہ ہے کہ ''سارے ضمیر پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی طرف اشارہ ہیں، لیکن قرائن سے بخوبی پتا چلتا ہے کہ پہلے (چھے) جملے، خدا کی طرف (بالخصوص، وکھوف کتبہ کی بنیاد پر) اور آخری جملے میں ضمیر ''دین'' کی طرف اشارہ ہے، اس کی وضاحت آگے آئے گی۔

[۶] ''کھوف'' جمع ہے ''کھف'' کی، اس کے معنی ''غار'' ہیں، بعض کی رائے ہے کہ اس کے معنی ''ایک وسیع غار'' ہیں۔ قدیم زمانے میں کیونکہ عام طور سے انسان غاروں میں رہتا اور وہاں پناہ لیتا تھا، اس لیے اس لفظ میں ''پناہ گاہ'' اور ''محفوظ جگہ'' کا مفہوم موجود ہے۔

https://downloadshiabooks.com/

کتابوں کی حفاظت گاہ نیز دین کے لیے مستحکم پہاڑوں جیسی شان کی حامل ہیں۔"

بعض دانشمندوں اور صاحبانِ علم نے، مذکورہ بالا بعض جملوں کو معنی کے لحاظ سے مترادف اور مشابہ کہا ہے، لیکن، ہماری نظر میں حق یہ ہے کہ ہر ایک کے اپنے خاص معنی مراد ہیں اور اس میں علم کے نایاب موتی پنہاں ہیں۔

پہلے جملے میں یہ حقیقت ہے کہ "اسرارِ الٰہی، اہل بیت علیہم السلام کے پاس ہیں" ظاہری بات ہے کہ جس کے شانوں پر دینِ الٰہی کی رہبری اور راہنمائی جیسے اہم فریضے کا بوجھ ہے، اُس کے لیے ضروری ہے کہ تمام اَسرار سے واقف ہو، کیونکہ اُس کے بغیر ممکن نہیں کہ ہدایت، تدبیر اور پورے نظام کے فرائض صحیح طرح سے، مناسب منصوبہ بندی کے ساتھ، بخیر وخوبی انجام پا سکیں۔ اس کے علاوہ یہ کہ ان ہستیوں کی رہبری اور ہدایت کی ذمہ داری کا دائرہ کسی ایک زمانے تک محدود نہیں بلکہ پوری تاریخِ انسانیت پر محیط ہے۔ (پیغمبر اکرمؐ اور آپؐ کے معصوم جانشینوں کی علمِ غیب کی خاصیت کے بارے میں ہم کہہ چکے ہیں کہ علم غیب کا ایک حصہ بالخصوص رہبری کی بنیاد ہے، نیز اس کے بغیر، رہبری کا کام ناقص ہو کر رہ جاتا ہے)۔ [1]

دوسرے جملے سے مراد یہ ہے کہ اہل بیت علیہم السلام حکمِ خدا کی پناہ گاہ ہیں۔ اور کیوں کہ حکم دو طرح کے ہیں: "حکم تکوینی" اور "حکم تشریعی" تو سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ یہاں کیا صرف "حکم تشریعی" مراد ہے یا دونوں مراد ہیں؟ پہلے اور بعد کے جملوں کا ظاہر یہ بتاتا ہے کہ مراد صرف "احکام تشریعی" ہیں، کیونکہ عوام الناس کو پابند کیا جا رہا ہے کہ "ان احکام کو حاصل کرنے اور اُن کے مطابق عمل کرنے کے سلسلے میں ضروری ہے کہ اہل بیتِ پیغمبرؐ کی پناہ حاصل کی جائے۔

تیسرے جملے سے مراد یہ ہے کہ اہلِ بیت علیہم السلام خدا کے علوم کا مخزن ہیں۔ یعنی اگر علم (حقیقی) کے لحاظ سے دیکھا جائے تو اہلِ بیت عصمت وطہارت علیہم السلام کی شخصیات کا دائرہ صرف "اَسرار" اور "احکام" تک محدود نہ تھا بلکہ انسانوں کی ہدایت کے لیے جن تمام علوم کا ہونا ضروری ہے یا دوسرے الفاظ میں "عالمِ بشریت کی ہدایت کے تمام ذرائع اور وسائل کا ماہرِ فن اگر کوئی ہے تو وہ صرف اہلِ بیتؑ ہیں"۔

چوتھے جملے سے مراد یہ ہے کہ اہلِ بیت علیہم السلام احکامِ الٰہی کے مرجع ہیں، یعنی عوام الناس اپنے تمام مسائل اور اختلافات کے حل کے لیے، چاہے وہ فکری مسائل ہوں یا عدالت وقضاوت کی بنیاد پر اختلافات کا حل پیش کرنا ہو، معاشرہ اپنے جملہ معاملات میں، اہلِ بیت علیہم السلام کی طرف رجوع کرنے کا پابند ہے، تاکہ اُن کی روزمرہ زندگی آسودہ ہو سکے اور اگر "موئل حِكَمِه" (حکم بروزن ارَم، جو حکمت کی جمع ہے) پڑھا جائے تو پھر اس جملے کا فرق اس سے پہلے والے جملوں سے مزید واضح اور روشن ہو جاتا ہے، کیونکہ پھر مراد یہ ہوگی "کہ احکامِ الٰہی کے فلسفے اور حکمتیں کیا ہیں؟" جو کہ پیغمبر اسلامؐ اور

[1] تفسیر پیام قرآن، ج ۷، ص ۲۵۔ تفسیر نمونہ، ج ۲۵، ص ۱۴۲۔ ذیل آیت ۲۶ سورۂ جن

https://downloadshiabooks.com/

آپؐ کے معصوم جانشینوں کے علوم کا ایک اہم حصہ شمار ہوتی ہیں۔

پانچواں جملہ: "وَ كُهُوْفُ كُتُبِهِ" اس حقیقت کو بیان کر رہا ہے کہ "تمام الٰہی (آسمانی) کتب کے ظاہر و باطن اہل بیت علیہم السلام کے پاس ہیں، اس سے ملتا جلتا ایک بیان اور بھی ہے، جس میں حضرت امام علی علیہ السلام فرماتے ہیں:

"اَمَا وَاللّٰهِ لَوْ ثُنِيَتْ لِيْ وَسَادَةٌ فَجَلَسْتُ عَلَيْهَا لَاَفْتَيْتُ اَهْلَ التَّوْرَاةِ بِتَوْرَاتِهِمْ... وَ اَفْتَيْتُ اَهْلَ الْاِنْجِيْلِ بِاِنْجِيْلِهِمْ... وَ اَفْتَيْتُ اَهْلَ الْقُرْآنِ بِقُرْآنِهِمْ"[۱]

"خدا کی قسم! اگر میرے لیے کوئی مسند تیار کی جائے، جس پر میں بیٹھا کروں (اور لوگوں کے مسائل کا حل پیش کروں) تو اہلِ توریت کو اُن کی کتاب کے مطابق، انجیل کے پیروکاروں کو اُن کی کتاب سے اور اہلِ قرآن کو عین قرآن کے مطابق (خدا کا حکم بیان کروں گا اور) فتویٰ دوں گا۔"

چھٹے جملے سے مراد یہ ہے کہ اہلِ بیت علیہم السلام دین کے فلک بوس پہاڑ ہیں۔ بظاہر قرآن مجید کی اُن آیات کی طرف اشارہ ہے، جن میں پہاڑوں کا ذکر آیا ہے اور زمین کو متوازن رکھنے میں، اُن کا اہم کردار، نیز ان پر برکات کا نزول جیسے موضوعات بھی زیرِ بحث آئے ہیں۔ سورۂ نحل میں ہم پڑھتے ہیں:

"وَاَلْقٰى فِى الْاَرْضِ رَوَاسِيَ اَنْ تَمِيْدَ بِكُمْ وَ اَنْهٰرًا وَّ سُبُلًا لَّعَلَّكُمْ تَهْتَدُوْنَ"[۲]

"اور اسی نے زمین پر (بھاری بھاری) پہاڑوں کو گاڑھ دیا تاکہ (ایسا نہ ہو) زمین تمہیں لے کر کہیں جھک جائے (اور تمہارے قدم نہ جمیں) اور (اسی نے) ندیاں اور راستے بنائے تاکہ (تم اپنی اپنی) منزلِ مقصود تک پہنچو۔"

اس آیت اور اس سے ملتی جلتی آیات میں، "پہاڑوں کی حکمت" کو بیان کیا گیا ہے۔ جہاں یہ پہاڑ زمین کے اندر اور باہر سے وارد ہونے والے مختلف دباؤ سے نظامِ زمین کو بچاتے اور زمین کو توازن کی حالت میں برقرار رکھتے ہیں، وہاں پہاڑ ایک بہت بڑا ذریعہ اور سبب ہیں، نہروں اور چشموں کے جاری ہونے کا اور تیسری حکمت یہ ہے کہ یہ (فلک بوس) پہاڑ اپنے اندر انواع و اقسام کی معدنیات کو ذخیرہ کیے ہوئے ہیں (جن کے بارے میں معلومات کا حاصل کرنا بجائے خود علم کا ایک اہم شعبہ بن چکا ہے، جو نہ جانے انسانی زندگی کے کتنے شعبوں کو چلا رہی ہیں اور دنیا بھر میں اقتصادیات کا نہایت اہم ستون ہیں) بالکل اسی طرح بلکہ اس مثال سے بھی کہیں زیادہ، روحانی اور مادّی فوائد "معصومینؑ کے وجودِ بابرکات" کے اس دنیا اور اُس میں رہنے والے انسانوں پر ہیں، ان ہستیوں کے ہونے سے انسانی افکار و خیالات کی دنیا میں ایک توازن اور سکون کی

[۱] بحار الانوار، ج ۱۰، ص ۱۱۸، حدیث ۱

[۲] سورۂ نحل، آیت ۱۵۔ مزید معلومات کے لیے تفسیر نمونہ کی، ج ۱۱، آیت ۱۵، کے ذیل کا مطالعہ فرمائیں۔

https://downloadshiabooks.com/

کیفیت پائی جاتی ہے۔ دلوں کو اطمینان میسر آتا ہے اور یہ معصومینؑ معدنِ علم وحکمت کے گراں بہا ذخائر ہیں، جن سے اُمّتِ مسلمہ لحظہ بہ لحظہ سیراب ہورہی ہے۔[۱]

کیا بہترین تشبیہ ہے، ان علم ومعرفت سے بھرپور (چھے) جملوں کے بعد، مزید دو جملوں کا اضافہ کرتے ہوئے امام علیؑ فرماتے ہیں:

بِهِمْ اَقَامَ اِنْحِنَاءَ ظَهْرِهِ، وَاَذْهَبَ ارْتِعَادَ[۲] فَرَائِصِهِ[۳]

''ان ہستیوں (آئمہ اہل بیت علیہم السلام) کے وسیلے سے دینِ اسلام نے اپنا قد بڑا کیا ہے اور اُس کی کمر سیدھی ہوئی ہے، اور دین کے پیکر سے رعشہ، تزلزل اور وحشت کو دُور کیا گیا ہے''۔ (جس طرح پہاڑوں نے زمین کا توازن برقرار رکھا ہے)

''اِنْحِنَاءَ ظَهْرِهِ'' پشت کا خمیدہ ہونا، عربی میں اسے کنائے کے طور پر استعمال کیا گیا ہے، جس طرح ایک انسان پر بہت زیادہ بوجھ لاد دیا جائے تو اُس کی کمر جھک جاتی ہے، بالکل اسی طرح دین کے سلسلے میں دانا دشمن اور نادان دوستوں کی جانب سے مشکلات کا ایک غیر معمولی دباؤ ہوا کرتا ہے، یہ محترم ہستیاں، اُن مشکلات کا سدباب کرتی ہیں، اور دین پر اس دباؤ کے اثرات کی روک تھام کرتی ہیں تاکہ دین کی کمر خمیدہ نہ ہونے پائے، یعنی دین کی اصل شکل وصورت، اس کے اصول اور فروع میں کسی قسم کا بگاڑ پیدا نہ ہو۔

''اِرْتِعَادَ فَرَائِص''، ''بدن کے اُس حصے میں لرزش کا ہونا، جس نے دل کے حصّے کو ڈھانپا ہوا ہے'' یہ بھی عربی زبان کا ایک ''بہترین کنایہ'' ہے، اس سے مراد یہ ہے کہ ایسی وحشت اور اضطراب کی کیفیت جو دین (اسلام) کی مخالفت میں، بے دینوں اور غیر مذہب والوں کی طرف سے اعتراضات وشبہات نیز الزامات اور تہمتیں لگائی جاتی ہیں، البتہ، آئمہ ہدیٰ علیہم السلام کے ذریعے ان کے اثرات کو ناکارہ بنا دیا جاتا ہے اور پھر اطمینان کی پہلے والی کیفیت پھر سے پیدا ہوجاتی ہے۔

---

[۱] تفسیر نمونہ: جلد ۱۱، آیت ۱۵، کے ذیل میں، سورۂ نحل میں رجوع کیجیے۔

[۲] ''ارتعاد'' رعدۃ، کے مادّہ سے ہے۔ اس کے معنی ہیں ''رعشہ'' اور کیونکہ بادلوں کے آپس میں ٹکرانے کی وجہ سے غیر معمولی آواز سے شدید لرزش پیدا ہوتی ہے، اس لیے اسے ''رعد'' کہا گیا ہے، یہی وجہ ہے کہ ارتعاد کے معنی ارتعاش کے ہیں۔

[۳] ''فرائص''، جمع ہے ''فریصہ'' کی۔ یعنی گوشت کا وہ ٹکڑا جو دل کے ساتھ جڑا ہوتا ہے اور خوف اور وحشت کے وقت لرزنے لگتا ہے لہٰذا ''ارتعاد الفرائص'' وحشت اور اضطراب کے لیے کنائے کے طور پر استعمال ہوا ہے۔ نیز فرصت کو اس لیے فرصت کہتے ہیں کہ یہ وقت کا ایک ایسا دورانیہ ہے جو مطلوبہ کام کے لیے مناسب ہے۔ (مقائیس، مفرداتِ راغب اور لسان العرب)

https://downloadshiabooks.com/

چند اہم نکات

۱۔ خاندانِ پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم امتِ اسلامی کی پناہ گاہ

مذکورہ بالا جملوں میں یقیناً کسی قسم کا مبالغہ نہیں۔ یہ وہ حقائق ہیں، جن کی گواہی معصوم اماموں کی زندگی دے رہی ہے۔ خاص طور سے امیر المومنین حضرت علی علیہ السلام، حضرت امام محمد باقر علیہ السلام، حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام اور حضرت امام علی بن موسیٰ الرضا علیہ السلام ایسے حالات اور واقعات کی منہ بولتی تصویریں ہیں، ان اماموں نے بالخصوص اور تمام معصومین علیہم السلام نے بالعموم اپنے اپنے زمانوں میں مسلسل اصلاح کا کام جاری رکھا، کیوں کہ جیسے جیسے اسلام پھیلتا گیا، اور اُس میں دوسری قوموں کی طرف سے انحرافی خیالات، نظریات کا اضافہ بھی ہوتا گیا، نیز اسلام سے متعلق من مانی تشریح اور غلط تفسیروں کی شکل میں اسلامی تعلیمات میں غیر معیاری افکار کو داخل کیا گیا۔

یہ ایک طبعی عمل بھی تھا اور اس موقع سے فائدہ اُٹھاتے ہوئے منافق نیز مفاد پرست عناصر نے بھی بگاڑ پیدا کرنے کی بھرپور کوششیں کیں، لیکن نظامِ امامت نے ہر قدم پر اپنے قول وفعل سے خالص اسلام کو ہر طرح کی تحریف سے پاک رکھا اور حقیقت اسلام کو مسخ ہونے سے بچائے رکھا۔ تاریخ بتاتی ہے کہ ان دین کے ستونوں (آئمہ معصومین علیہم السلام) سے جب کوئی سوال کیا گیا، اعتراض اُٹھایا گیا یا شکوک وشبہات کو اُبھارا گیا تو اُس کا منطقی اور بروقت جواب دے کر سائل کی تشفی کی گئی۔ رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی رحلت ہوتے ہی، ایسے ہولناک طوفانوں نے سر اُٹھایا تھا کہ اگر خدا کے یہ عظیم لنگر (جانشینِ پیغمبرؐ) نہ ہوتے تو حقیقی اسلام کی کشتی کو ڈوبنے سے کوئی بچانے والا نہ تھا۔

ان عظیم ہستیوں نے اسلام کے دفاع میں اپنا سب کچھ لٹا دیا، بعض موقعوں پر علوم اور دانش کے ذریعے، بعض جگہوں پر رازوں پر سے پردہ اُٹھاتے ہوئے نیز حقائق اسلام کی اصل تصویر دکھاتے ہوئے تو، بعض حساس مواقع پر اپنے خون کی بے مثال قربانی پیش کرتے ہوئے حکم قرآن اور سیرت وسنّتِ رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم وآلِ رسول علیہم السلام کو زندۂ جاوید کرتے ہوئے، حقیقتِ دین کا لوہا منوایا اور تمام ظاہری وباطنی دشمنوں نیز سازشیوں کے چہروں سے نقابیں نوچ کر پھینک دیں، جس کی مثال حضرت امام حسین علیہ السلام نے میدانِ کربلا میں رہتی دنیا تک کے لیے قائم کر دی۔ آیئے ایک چھوٹا سا موازنہ کرتے ہیں، ''ملل ونحل کے موضوع پر'' آج تک جو کتابیں موجود ہیں، اُن میں موجود افکار اور منحرف اعتقادات کو سامنے رکھیں اور اُن کے مقابلے میں آئمہ معصومین علیہم السلام کے علوم ومعارف نیز عقائد وافکار کو سامنے رکھیں، جن کے نمونے ''نہج البلاغہ''، ''صحیفہ

https://downloadshiabooks.com/

سجادیہؑ ''ہیں۔ ان میں موجود اعلیٰ مضامین کی مثال نہیں ملتی۔ اس کے علاوہ جو کچھ ''اہل بیت رسول علیہم السلام کی احادیث'' میں سچائی کی روشنی نظر آ رہی ہے اور ''توحید شیخ صدوقؒ'' اور اُس جیسی سیکڑوں کتابوں میں محفوظ ہے، اگر ان علوم وحقائق سے ذہنوں کے لیے کچھ روشنی حاصل کی جائے تو با آسانی مذکورہ بالا بیان اور معصومینؑ کی صفات پر ایمان لایا جاسکتا ہے۔ یہ وہی چیز ہے، جسے ''حضرت علیؑ کی کمیلؓ بن زیاد سے گفتگو'' کے مختلف حصّوں سے سمجھا اور اخذ کیا جاسکتا ہے۔

آپؑ فرماتے ہیں:

''اَللّٰهُمَّ بَلٰی لَا تَخْلُو الْاَرْضُ مِنْ قَائِمٍ لِلّٰهِ بِحُجَّةٍ اِمَّا ظَاهِرًا مَشْهُوْرًا اَوْ خَائِفًا مَغْمُوْرًا لِئَلَّا تَبْطُلَ حُجَجُ اللهِ وَبَيِّنَاتُهُ... يَحْفَظُ اللهُ بِهِمْ حُجَجَهُ وَبَيِّنَاتِهِ حَتّٰى يُوْدِعُوْهَا نُظَرَاءَهُمْ وَ يَزْرَعُوْهَا فِيْ قُلُوْبِ اَشْبَاهِهِمْ''

''جی ہاں! زمین ہرگز ایسی ہستی سے خالی نہیں رہ سکتی کہ جو خدا کی حجت (نشانی) کے ذریعے قیام کرے، خواہ ظاہر اور آشکار ہو یا خائف اور پنہاں ہو، یہ اس لیے ضروری ہے تاکہ دلائلِ الٰہی اور خدا کی روشن نشانیاں کہیں غلط نہ سمجھی جانے لگیں۔ خداوند تعالیٰ اُن (آئمہ معصومین علیہم السلام) کے واسطے سے اپنی حجت اور نشانیوں کو محفوظ رکھتا ہے، تاکہ وہ افراد پھر اپنے جیسوں تک خدا کی نشانیوں کو پہنچا دیں اور ان حقائق کے بیجوں کو ایسی ہستیوں کے دلوں میں بو دیں جو ہر لحاظ سے ان ہی جیسی ہیں۔''[1]

یہ وہی حقیقت ہے کہ جسے پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اپنی ''متواتر روایت'' میں جو شہرت یافتہ ہے، ارشاد فرمایا اور نصیحت بھی فرمائی ہے کہ ''قرآن اور اہلِ بیت اطہار علیہم السلام کا دامن ہاتھ سے نہ چھوڑیں، تو کبھی بھی گمراہ نہ ہوں گے، دراصل اس سے مراد (پورا) دِین ہے۔ اگر ان دو (قرآن اور اہلِ بیت علیہم السلام) میں سے کسی ایک سے دور ہو گئے تو گمراہی یقینی ہے۔

۲۔ آلِ محمد علیہم السلام کون ہیں؟

اب تک کی گفتگو سے، بخوبی اندازہ ہو گیا ہو گا کہ اہل بیت علیہم السلام سے مراد، صرف آئمہ معصومین علیہم السلام ہیں نہ کہ نہج البلاغہ کے بعض مفسرین کی رائے کے مطابق حمزہؓ، عباسؓ اور جعفرؓ حضرات کہ جو پیغمبر اکرمؐ کے زمانے میں تھے اور انھوں نے اپنی قربانیاں دینِ اسلام کی حفاظت کے لیے پیش کیں، صحیح ہے کہ اُن حضرات کی خدمات بہت قیمتی ہیں، لیکن اوپر دیے گئے آٹھ (۸) جملے سوائے معصومین علیہم السلام کے کسی اور کے ساتھ مناسبت نہیں رکھتے۔

[1] نہج البلاغہ، کلماتِ قصار، حکمت ۱۴۷

https://downloadshiabooks.com/

چوتھا حصّہ

زَرَعُوا الْفُجُوْرَ وَ سَقَوْهُ الْغُرُوْرَ وَ حَصَدُوا الثُّبُوْرَ لَا يُقَاسُ بِآلِ مُحَمَّدٍ صلی اللہ علیہ وآلہ مِنْ هٰذِهِ الْأُمَّةِ أَحَدٌ وَ لَا يُسَوّٰى بِهِمْ مَنْ جَرَتْ نِعْمَتُهُمْ عَلَيْهِ أَبَدًا هُمْ أَسَاسُ الدِّيْنِ وَ عِمَادُ الْيَقِيْنِ إِلَيْهِمْ يَفِيْءُ الْغَالِيْ وَ بِهِمْ يُلْحَقُ التَّالِيْ وَ لَهُمْ خَصَائِصُ حَقِّ الْوِلَايَةِ وَ فِيْهِمُ الْوَصِيَّةُ وَ الْوِرَاثَةُ الْآنَ إِذْ رَجَعَ الْحَقُّ إِلٰى أَهْلِهِ وَ نُقِلَ إِلٰى مُنْتَقَلِهِ.

''ان لوگوں نے فجور کا بیج بویا ہے اور اسے غرور کے پانی سے سینچا ہے اور نتیجے میں ہلاکت کو کاٹا ہے۔ یاد رکھو کہ آلِ محمدؐ پر اس امت میں سے کسی کو قیاس نہیں کیا جا سکتا ہے اور نہ ان لوگوں کو ان کے برابر قرار دیا جا سکتا ہے جن پر ہمیشہ ان کی نعمتوں کا سلسلہ جاری رہا ہے۔ آلِ محمدؐ دین کی اساس اور یقین کا ستون ہیں۔ ان سے آگے بڑھ جانے والا پلٹ کر انہیں کی طرف آتا ہے اور پیچھے رہ جانے والا بھی انہیں سے آ کر ملتا ہے۔ ان کے پاس حقِ ولایت کی خصوصیات ہیں اور انہیں کے درمیان پیغمبرؐ کی وصیت اور ان کی وراثت ہے۔ اب جب کہ حق اپنے اہل کے پاس واپس آ گیا ہے اور اپنی منزل کی طرف منتقل ہو گیا ہے۔''

شرح و تفسیر

اہلِ بیت علیہم السلام کا کوئی ہم پلّہ نہیں

اس خطبے کے زمان و مکان (جنگ صفین کے بعد یہ خطبہ تاریخ میں محفوظ ہے) کو مدنظر رکھا جائے تو، اس خطبے کے پہلے تین جملوں (کے ضمیر) سے اندازہ ہوتا ہے کہ موضوعِ گفتگو ''اصحابِ امیر شام'' اور ''گروہِ خوارج'' ہیں، یہ بھی ممکن ہے کہ مراد ''گروہِ منافقین'' ہوں یا پھر، وہ تمام افراد مراد ہیں جو (اپنے مفادات اور جہالت کی بنا پر) حضرتِ امیر المومنین علیہ السلام سے مقابلے کے لیے اُٹھ کھڑے ہوئے تھے بہر حال ایک ایسی تشبیہ استعمال کی گئی ہے، جو اُس وقت کے حالات اور پورے ماجرے کا واقعی نقشہ پیش کرتی ہے۔ آپؑ فرماتے ہیں:

https://downloadshiabooks.com/

زَرَعُوا الْفُجُوْرَ [۱] وَسَقَوْهُ الْغُرُوْرَ [۲] وَحَصَدُوا الثُّبُوْرَ [۳]

''انھوں نے فسق و فجور کا بیج بویا اور آبِ غرور نیز دھوکے بازی کے ذریعے اس کی آبیاری کی، آخرکار (اسلامی معاشرے اور اپنے دل کی سرزمین میں) بدبختی اور ہلاکت کی منحوس فصل کی کٹائی کی، یہ وہی تین (زمین کی تیاری اور بیج کا بونا، فصل کی تیاری اور فصل کی کٹائی) کاشتکاری کے مراحل ہیں، جو آج کل زراعت کے شعبے میں رائج ہیں۔''

ایک بار پھر امامِ عالی مقام آلِ محمدؑ کی صفات کو بیان کرتے ہوئے، واضح اور روشن عبارتوں کے ذریعے اُن کے مقام کی عظمت کو اُجاگر کرتے ہیں، نیز اپنے مخصوص انداز میں خاندانِ رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے چھینے گئے حقوق کی یادآوری فرماتے ہیں:

''لَا يُقَاسُ بِآلِ مُحَمَّدٍ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَآلِهِ مِنْ هٰذِهِ الْاُمَّةِ اَحَدٌ''

''پوری اُمت میں سے کوئی بھی آلِ محمدؑ سے موازنے کے قابل نہیں''۔ اس کی وجہ کیا ہے؟ اس کی دلیل نہایت روشن اور واضح ہے۔''

حضورِ اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم حدیث ثقلین میں کہ جس کا تقریباً تمام علمائے اسلام نے بالاتفاق اپنی احادیث کی کتابوں میں تذکرہ کیا ہے اور آلِ محمدؑ کو قرآن کا ہمدم شمار کرتے ہوئے اعتراف کرتے ہیں کہ ہم جانتے ہیں کہ پوری اُمّت میں سے صرف اہلِ بیتِ رسول علیہم السلام قرآن کے ہم نشین ہیں اور اُن ہستیوں کے سوا کوئی اور اس بات کی قابلیت نہیں رکھتا۔ اس کے علاوہ قرآن کی آیات کی روشنی میں جیسا کہ آیتِ تطہیر ان اہلِ بیتؑ کے معصوم ہونے کی گواہی دے رہی ہے تو آیتِ مباہلہ ان ہستیوں میں سے بعض (حضرت علی علیہ السلام) کے نفسِ رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہونے کا اعلان کر رہی ہے، نیز اور بھی آیات اور روایات ایسی ہیں، جن میں اس موضوع کے ثبوت کے دلائل کثرت سے موجود ہیں۔ اگر علم و معرفت کے میدان میں انواع و اقسام کے علوم و دانش کا جائزہ لیا جائے تو جو علم و حکمت کے انمول خزانے اہلِ بیتِ رسول علیہم السلام سے ہم تک پہنچے ہیں، دوسرے اُس کی گرد

[۱] ''فجور'' کا مادّہ ''فجر'' ہے، یعنی ''کسی چیز میں بہت بڑا شگاف ڈال دینا''۔ صبح کے طلوع ہونے کو ''فجر'' اسی لیے کہا جاتا ہے کہ ''صبح کا نور، رات کی سیاہی کے پردے کو چاک کر دیتا ہے'' اسی طرح ناجائز کاموں کو بھی ''فجور'' کہتے ہیں، کیونکہ یہ کام دیانتداری کے پردے کو چاک کر دیتے ہیں۔

[۲] ''غرور'' یعنی بیداری کی حالت میں غفلت کی کیفیت، یہ دھوکے اور مکر و فریب کے معنی کے لیے بھی استعمال ہوتا ہے۔ ''غَرور'' یعنی ہر وہ چیز جو انسان کو دھوکا دیتی ہے اور غفلت کا شکار کرتی ہے اور بعض مرتبہ یہ ''شیطان'' کے معنی میں بھی استعمال ہوتا ہے، کیونکہ اس سے مراد یہ ہے کہ ''لوگوں کو جھوٹے وعدے دے کر فریب دینا''۔

[۳] ''ثبور'' کا اصل مادّہ ''ثبر'' ہے، اس کا وزن ''صبر'' ہے یعنی ''قید کرنا'' اور اس کے بعد یہ ''ہلاکت اور فساد'' کے معنی میں استعمال ہوتا ہے کہ جو انسان کو اُس کے مقصد تک پہنچنے نہیں دیتا۔

https://downloadshiabooks.com/

تک بھی نہیں پہنچ پائے ہیں۔مثال کے طور پر جو کچھ اسی نہج البلاغہ میں موجود ہے کیا اُس کا عشرِ عشیر کہیں کسی اور کے پاس بھی پایا جاتا ہے؟!! کیا صحیفہ سجادیہؑ کی دُعاؤں کے مجموعے میں سے کوئی ایک دُعا، اُس سے ملتی جلتی کسی اور کے حصّے میں بھی آئی یا کہیں کسی کے پاس پائی گئی ہے؟

جتنی وسعت، گہرائی اور ایک ایک نکتے کی تفصیل، حضرت امام محمد باقر علیہ السلام اور حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام کے مکتب اور آثار میں احکامِ اسلام (مذہبی لٹریچر) کے حوالے سے موجود ہے، کیا نظامِ اسلام سے متعلق ایسا کوئی جامع، عقل وفہم کا مرقع پیش کر سکا ہے!!؟ مختلف مذاہب کے پیروکاروں کے ساتھ کیے جانے والے محیر العقول (عقلوں کو حیرت میں ڈال دینے والے) مناظروں اور ان کے عقائد کی آراء اور نظریات نیز بنیاد کے خام اور ناکارہ ہونے کے دلائل کو خود ان ہی کی کتابوں سے پیش کرنے کے ناقابلِ یقین، تاریخی معرکوں کو سر کرنے والے، حضرات امام علی بن موسیٰ الرضا علیہما السلام کے کارناموں میں سے کسی ایک کارنامے کا کوئی مقابلہ کرنے والا نہیں۔غفلت و جہالت سے بیدار کرنے والے ایسے حیران کن واقعات یا تو معجزے کی شکل میں رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی زندگی میں نظر آتے ہیں، یا پھر آپؐ کے پاکیزہ خاندان میں کرامات کی شکل میں نظر آتے ہیں، یہ صلاحیتیں اور اُن کے مظاہروں کا مقصد اور فلسفہ صرف اور صرف یہ ہے کہ دینِ الٰہی کی حقیقت کو اُجاگر کیا جائے اور انسانوں کو گمراہی سے ہدایت کی طرف لایا جائے، دین کا بول بالا ہو اور ہر انسان نجاتِ ابدی پائے۔اہلِ بیتِ رسول علیہم السلام کے علاوہ پوری اُمتِ مسلمہ میں کوئی ایک فرد بھی ایسا ہے!!؟؟ ''محمدؐ اور آلِ محمد علیہم السلام'' کے بغیر کوئی، کچھ بھی نہیں ؛اسلام ان سے اور یہ اسلام سے پہچانے جاتے ہیں''۔

اس کے بعد ایک جملہ مولائے کائناتؑ نے فرمایا ہے، جو پچھلے جملے کی ''دلیل'' کے طور پر سمجھ میں آتا ہے:

"وَلَا يُسَوَّى بِهِمْ مَنْ جَرَتْ نِعْمَتُهُمْ عَلَيْهِ أَبَدًا"

''کیا ایسا ممکن ہے کہ جو افراد آلِ محمدؐ کی نعمتوں کے دسترخوان سے مستفید ہوتے رہے (اور ہو رہے ہیں) خود اہل بیت علیہم السلام کے برابر ہو جائیں؟''

یقینی طور پر ایسا ہونا ہرگز ممکن نہیں۔اس سے بڑھ کر کیا نعمت ہوگی کہ اگر حضرتِ علی ابن ابی طالب علیہما السلام کی قربانیاں نہ ہوتیں تو پھر ہر عام و خاص، دائرۂ اسلام میں قدم نہیں رکھ سکتا تھا، اس عظیم انسان کی تاریخی زندگی کا لیلۃ المبیت کے واقعے سے لے کر، جنگِ بدر، اُحد، خیبر اور خندق تک ایک ایک لمحہ اِس حقیقت کی غمازی کر رہا ہے۔یاد کیجیے وہ لمحہ کہ رسالت مآب صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا تھا:

"ضَرْبَةُ عَلِيٍّ يَوْمَ الْخَنْدَقِ أَفْضَلُ مِنْ عِبَادَةِ الثَّقَلَيْنِ"

https://downloadshiabooks.com/

نیز اس سے مشابہ مضمون ایک اور جگہ فرمایا:

"لَمُبَارَزَةُ عَلِيٍّ لِعَمْرِو بْنِ عَبْدِ وَدٍّ اَفْضَلُ مِنْ اَعْمَالِ اُمَّتِيْ اِلٰى يَوْمِ الْقِيَامَةِ"[1]

لیلۃ المبیت وہ رات ہے، جس میں مولا علی علیہ السلام نے رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی جان بچانے کے لیے، اپنے آپ کو ڈھال بنایا اور جان تک کی بازی لگانے سے دریغ نہ کیا، جنگ خیبر میں کہ جب مختلف لوگوں کو (علم دے کر) بھیجا گیا لیکن کوئی نتیجہ نہیں نکلا، آخر کار امام علیؑ کو بھیجا گیا اور آپؑ نے درِ خیبر کو اُکھاڑ پھینکا، جنگ اُحد پر ایک نظر ڈالیے، مولائے کائناتؑ نے بے مثال جرأت اور استقامت کا مظاہرہ کرتے ہوئے، نہایت حساس حالات میں رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا ساتھ دیا جبکہ اُس وقت رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم بالکل تنہا رہ گئے تھے اور لشکرِ اسلام تتر بتر ہو چکا تھا۔ اس کے علاوہ، تاریخ اسلام کا لمحہ لمحہ اس بات کا گواہ ہے کہ نہ جانے کتنے ایسے مقامات آئے ہیں کہ جب اسلام اور مسلمانوں کو رسولِ اکرمؐ کے زمانے میں اور اُس کے بعد بھی، ایک بھرپور حمایت اور مدد کی ضرورت تھی، کوئی حسّاس موقع ایسا نہ تھا، جہاں امیر المومنین علیہ السلام کے زورِ بازو اور علم و دانش کی روشنی نے دینِ خدا اور مسلمانوں کی کارفرمائی نہ کی ہو اور یہ حقیقت کسی صاحبِ دانش سے پوشیدہ نہیں ہے۔ خلفائے ثلاثہ کا دور رہا ہو یا بنی امیہ کا تاریک دور یا پھر بنی عباس کا دورِ سیاہ، اگر کہیں اسلام کی شمع جلتی نظر آتی ہے یا مسلمانوں کو بیگانوں کی تہذیب و ثقافت سے بچاؤ کا انتظام کیا جاتا رہا یا پھر زمانۂ جاہلیت کی سنتوں سے مکمل حفاظت کا بندوبست کسی کے ذریعے کیا جا رہا ہے تو وہ وسیلہ اور وہ نظام نظامِ امامت ہے اور وہ ہستیاں آئمہ معصومین علیہم السلام ہیں۔ یہ وہ حقیقت ہے جو کم از کم کسی محقق، دانشور اور تاریخ دان نیز دین شناس سے پوشیدہ نہیں، اگرچہ اہل بیت علیہم السلام کے قسم خوردہ دشمنوں نے ایڑی چوٹی کا زور لگا ڈالا کہ ہر عام و خاص کو کسی طرح، اہلِ بیت علیہم السلام کی حقیقت سے بے خبر رکھا جائے۔

قابلِ توجہ بات یہ ہے کہ مولائے کائنات علیہ السلام مذکورہ بالا جملے میں فرماتے ہیں: اہلِ بیت علیہم السلام کے وجودِ بابرکت کی نعمت کسی خاص زمانے اور دَور سے مخصوص اور محدود نہیں، بلکہ یہ مسلسل اور ابدی ہے، کیونکہ سچ تو یہ ہے کہ آج ہم، بحیثیت مسلمان اسلام کے پاک و پاکیزہ شجر سے جو بھی پھل کھا رہے ہیں اور وقت گزرنے کے ساتھ اسلام کی حقّانیت سے قریب تر ہو تے جا رہے ہیں۔ یہ سب اثرات اور نتائج دراصل پیغمبر اسلامؐ اور خاندانِ پیغمبرؐ کے مرہونِ منت ہیں۔ یہ اُن عظیم ہستیوں کی زحمتیں تھیں، جن کی وجہ سے نہ صرف اسلام آئندہ نسلوں تک بھی منتقل ہوتا رہا۔ اس کے بعد امیر المومنینؑ یوں بیان فرماتے ہیں:

"هُمْ اَسَاسُ الدِّيْنِ وَ عِمَادُ الْيَقِيْنِ"

---

[1] دیکھئے احقاق الحق: جلد ۶، ص ۴، جلد ۱۶، ص ۴۰۲، اور کتاب اعیان الشیعۃ: جلد ۱، ص ۲۶۴۔

https://downloadshiabooks.com/

''اہلِ بیت علیہم السلام دین کی اساس اور بنیاد ہیں اور یقین کے بلند و بالا اور مستحکم ستون ہیں۔''

جی ہاں، یہی وہ خاندان ہے جہاں وحیِ الٰہی نازل ہوئی اور آغوشِ وحی میں ہی اُن ہستیوں کی پرورش ہوئی ہے، اُن عظیم انسانوں کے پاس اگر دین کے معارف ہیں تو وہ سب کے سب رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے اُن تک پہنچے ہیں، اور چونکہ اصل اسلام ان کامل انسانوں کی گفتار و کردار کی شکل میں محفوظ ہے، لہٰذا ان ہستیوں کی شخصیات عوام الناس کے لیے دین اور یقین کا سرچشمہ ہیں۔

اب جب بات اس مقامِ فکر تک آ پہنچی ہے تو اس کے بعد کے جملوں میں امامِ دین و یقین اس طرح سے نتیجہ اخذ فرماتے ہیں:

''اِلَيْهِمْ يَفِيْئُ الْغَالِيْ، وَبِهِمْ يَلْحَقُ التَّالِيْ''

''غلو کرنے والے (حد سے بڑھ جانے والے) اُن (امامِ برحق کی فکر) کی جانب واپس پلٹ جاتے ہیں اور پیچھے رہ جانے والے، ان سے ملحق ہو جاتے ہیں۔''

اور کیوں نہ ایسا ہو کہ جب اہلِ بیت علیہم السلام دین کے صراطِ مستقیم ہیں [1] اور (یہی گواہیِ قرآن کے مطابق) اُمّتِ وسط ہیں [2] کہ جن کے پاس بغیر کسی افراط و تفریط کے دینِ اسلام کے حقیقی احکام، عقائد، اَخلاق اور کامل تعلیمات موجود ہیں، وہ نہ صرف روحِ اسلام شریعت و قرآن کے مزاج سے آشنا ہیں، بلکہ اُسے بیان کرنے اور عملی جامہ پہنانے والے ہیں۔ اگر اسلامی فرقوں کے عقائد کی تاریخ کا ایک جائزہ لیا جائے، تو وہ فرقے جو اہل بیت علیہم السلام سے کسی بھی وجہ سے دور رہے، طرح طرح کے انحرافات، خرافات نیز شکوک و شبہات میں غوطہ زن نظر آتے ہیں، ایک گروہ، اسماء و صفاتِ الٰہی میں جبر، تشبیہ اور الحاد میں مبتلا ہے تو دوسرا گروہ، اسی موضوع کے بارے میں غُلو کی ایسی حد کو پہنچ چکا ہے کہ راہِ عقل و شعور کی نفی کرتے ہوئے کہتا ہے کہ ''ہم کچھ سمجھنے کی صلاحیت نہیں رکھتے۔ (نہ تو اجمالی معرفت حاصل کی جا سکتی ہے اور نہ ہی تفصیلی) اسی گروہ کے مدمقابل ایک اور گروہ ہے، جو (نعوذ باللہ) ذاتِ خداوندِ باری تعالیٰ کو اتنا نیچے لاتا ہے کہ گویا خدا ایک جوان لڑکے کی شکل میں ہے جس کے حسین بال آپس میں اُلجھے ہوئے گیسو کی طرح ہیں۔ ان باطل عقائد اور جاہلانہ افکار سے ہم خدا کی پناہ مانگتے ہیں اور جہاں تک جبر و تفویض کا موضوع ہے تو، ایک گروہ جذبات کی رو میں بہہ کر اس نتیجے تک جا پہنچا کہ انسان تو قسمت کے ہاتھوں بے چارہ اور مکمل طور پر مجبور ہے، تقدیر نے جو کچھ لکھ دیا ہے پس وہی کچھ ہوگا، اُس کو کسی بھی قسم کا کوئی اختیار نہیں دیا گیا، چاہے وہ

---

[1] تفسیر نور الثقلین: جلد ۱، صفحہ ۲۰، ۲۱

[2] تفسیر نور الثقلین: جلد ۱، صفحہ ۱۳۴

https://downloadshiabooks.com/

کفر کا راستہ اختیار کرے یا ایمان کا۔ جبکہ ان سب سے ہٹ کر ایک گروہ اور بھی ہے، جس نے انسان کو مختارِ کل تسلیم کر لیا ہے اور اتنے اختیارات اُسے دے دیے ہیں کہ گویا انسان اور خدا ایک دوسرے کے مد مقابل ہیں اور تفویض کا عقیدہ قبول کرتے ہوئے، شرک اور ذاتِ خدا میں دوگانگی کو اختیار کر بیٹھے ہیں۔

ان تمام باطل گروہوں کے مقابلے میں صرف ایک مکتبِ اہلِ بیت علیہم السلام ہے، جس نے جبر و تفویض کے الحادی عقیدے کی نفی کرتے ہوئے صحیح اسلامی اور فطری عقیدے ''امر بین الامرین'' (نہ جبر ہے نہ تفویض) کو پیش کیا، مسلمانوں کو خطرناک ترین افراط و تفریط اور کفر آمیز عقائد سے ہوشیار کیا۔ اس مقام پر، کلامِ امام معصومؑ کی صداقت کا اعتراف کرنا پڑتا ہے، جیسا کہ آپؑ نے فرمایا:

''غلو کرنے والے اہلبیت علیہم السلام کی جانب پلٹ آئیں، پیچھے رہ جانے والے اپنی رفتار کو بڑھائیں تاکہ کاروانِ ہدایت کے ہم رکاب ہو جائیں۔''

یہاں امام علیہ السلام علم و عرفان نے ایک کاروان کو نظروں میں مجسم کیا ہے، جس کے راہنما اور رہبر صاحبِ بصیرت و حکمت ہیں، جبکہ ان کے ساتھ چلنے والے اپنی من مانی کرتے ہوئے مختلف راستوں کی طرف نکل جاتے ہیں۔ ایک گروہ زیادہ تیزی دکھاتا اور آگے نکل جاتا ہے اور صحرا و بیابان میں راستہ بھٹک جاتا ہے جبکہ دوسرا گروہ ''سستی کے مارے'' پیچھے رہ جاتا ہے اور جنگل کے درندوں کی خوراک بن جاتا ہے۔ آخر میں، ایک مکمل نتیجہ اخذ کرتے اور فرماتے ہیں:

''وَلَهُمْ خَصَائِصُ حَقِّ الْوِلَايَةِ''

''ولایت اور حکومت کا حق صرف اہلِ بیتِ رسولؐ کے لیے مخصوص ہے۔''

اس جملے میں لفظ ''لھم'' کو پہلے بیان کیا گیا ہے۔ عربی قواعد کے مطابق جب کبھی ایسا ہوتا ہے تو اس سے مراد کسی صفت کا، کچھ خاص افراد سے مخصوص ہونا ہے، نیز دوسروں سے اُس صفت یا خصوصیات کی نفی کرنا اور ہونا سمجھا جاتا ہے یعنی دین ہو یا سیاست، عوام ہوں یا خواص، انسانی معاشروں کی انفرادی اور اجتماعی تعلیم اور تربیت نیز نصیحت و ہدایت ایک خدائی عہدہ اور ذمّے داری ہے جو صرف رسولؐ اور اہلِ بیتِ رسولؐ کا حق ہے اور کیوں نہ حقِ ولایتِ اہلِ بیت علیہم السلام سے مخصوص ہو۔ جبکہ قرآن و سنّت میں یہ ہستیاں دین کی بنیاد اور یقین کے ستون کے طور پر متعارف کرائی گئی ہیں۔

اگر اسلام کو بغیر کسی افراط و تفریط کے کوئی ہے جو بیان کر سکے تو وہ صرف خاندانِ پیغمبرؐ ہے اور اس خاندان کی نعمتوں کا فیضِ عام، (خدا کی رحمت کی طرح) ہر عام و خاص تک پہنچ رہا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ پیغمبر اسلامؐ نے اپنے اہل بیت علیہم السلام کے بارے میں (بار بار) وصیت فرمائی ہے اور (حکمِ خدا کے مطابق، دعوتِ ذوالعشیرہ سے لے کر حجۃ الوداع کے دن اعلانِ ولایت تک) اپنی خلافت و جانشینی کو خدا کی جانب سے اہلِ بیت علیہم السلام میں قرار دیے جانے کا اعلان فرمایا ہے:

https://downloadshiabooks.com/

"وَفِيهِمُ الْوَصِيَّةُ وَالْوِرَاثَةُ"

''اور انہیں کے درمیان پیغمبرؐ کی وصیت اور ان کی وراثت ہے۔''

اگر رسولِ گرامی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اپنے اہلِ بیت علیہم السلام کے بارے میں وصیّت فرمائی ہے اور بندگانِ خدا کی راہنمائی کی حسّاس ذمّے داری ان کے سپرد کی ہے تو اس کی وجہ یہی حقائق ہیں، جو اوپر بیان ہو چکے، نہ کہ حسب ونسب اور رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے رشتے داری۔ ظاہر سی بات ہے کہ یہاں پر وصیت اور وراثت کے موضوع کا براہ راست تعلق صرف مقامِ خلافت ونبوت سے ہے اور جن لوگوں نے اس موقع پر ارث سے علومِ پیغمبرؐ کا ارث مراد لی ہے، بالکل صحیح سمجھا ہے۔ اور مقصد یہ ہے کہ یہ وہ لوگ ہیں جو اس مقام کے لیے شائستہ اور پوری طرح قابلیت رکھتے ہیں، اس لیے کہ جو کوئی بنی نوع انسان کا پیشوا اور راہنما بننے جا رہا ہے، اُسے وارثِ علومِ پیغمبرؐ ہونا ہی چاہیے اور رسولؐ کا جانشین ہی اُس کا وصی ہوا کرتا ہے، کیونکہ مال ودولت کا وارث ہونا کوئی فخر کا باعث نہیں، اور پھر ذاتی مسائل میں وصیت کوئی غیر معمولی واقعہ اور ذمے داری شمار نہیں کی جاتی اور جن لوگوں نے وصیت اور وراثت (رسولِ ختمی مرتبت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے صرف ذاتی مسئلے کے طور پر معنی لیے ہیں، دراصل منافقت اور جہالت کی بنا پر اہل بیت علیہم السلام کی حقیقت اور حق جانشینی کے بارے میں تعصب برتا ہے، نیز مقامِ نبوت اور رسالت کے بارے میں بنیادی تحقیق اور حقائق کو نظر انداز کر کے اندازوں اور قیاس آرائیوں سے متاثر ہو کر، خام تصورات کو سوچنے سمجھنے کا معیار بنایا ہے، ذرا غور کیجیے۔ ان جملوں:

"أَسَاسُ الدِّيْنِ وَعِمَادُ الْيَقِيْنِ وَخَصَائِصُ حَقِّ الْوِلَايَةِ"

کے ساتھ جو موضوع، عقلی اور منطقی طور پر مناسبت رکھتا ہے، وہ صرف رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم، کی خلافت اور جانشینی کا مسئلہ ہے، نہ کہ ذاتی مسائل یا کوئی اور موضوع! آخر کار اپنے آخری جملے میں اپنے زمانے کے قدر ناشناس لوگوں کو متوجّہ کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

"اَلْآنَ اِذْ رَجَعَ الْحَقُّ اِلٰى اَهْلِهٖ وَنُقِلَ اِلٰى مُنْتَقَلِهٖ" [1]

''سب اچھی طرح سُن لیں، اس وقت، حق اُس کے اہل تک پلٹ آیا اور اپنے اصلی مقام تک پہنچ چکا ہے۔''

پھر کوتاہی، سُستی، نیز انتشار واختلاف کا شکار ہونا، کیا اس عظیم نعمت سے اب بھی غفلت برتتے رہو گے اور انجان بنے رہو گے؟ وصیت اور وراثت کے بارے میں، مذکورہ بالا سطروں میں، اب تک جو کچھ زیر بحث آچکا، اس سے یہ بات

---

[1] اس جملے میں (قرینے کی وجہ سے) ایک نکتہ محذوف ہے یعنی پورا جملہ یوں ہے'' ''اَلْآنَ اِذْ رَجَعَ الْحَقُّ اِلٰى اَهْلِهٖ لِمَ لَا تُؤَدُّوْنَ حَقَّهٗ''
یہی جملہ وضاحت کے ساتھ نہج البلاغہ کے مصادر میں اس طرح تحریر ہے: ''اَلْآنَ اِذْ رَجَعَ الْحَقُّ اِلٰى اَهْلِهٖ مِنْ اَهْلِ بَيْتِ النُّبُوَّةِ يَجْرِيْ مَا يَجْرِيْ مِنَ الْحَوَادِثِ وَيَقَعُ مَا يَقَعُ مِنَ الْاِخْتِلَافِ'' (مصادر نہج البلاغہ: جلد ۱، صفحہ ۳۰۲) البتہ دونوں عبارتوں کا نتیجہ ایک ہے۔

https://downloadshiabooks.com/

واضح ہو جاتی ہے کہ حق سے مراد اس موقع پر حقِ خلافت اور ولایت ہی ہے۔ اور اگر کوئی اس حق کا اصل مستحق اور اہل ہے تو وہ اہلِ بیت رسول علیہم السلام ہیں، سچ تو یہ ہے کہ اس حق کی مثال ایک لباس جیسی ہے جو صرف اہل بیت علیہم السلام کے قد و قامت کے مطابق اور اُن پر ہی جچتا ہے۔

دو اہم نکات

۱۔قرآن وحدیث کی روشنی میں عظمتِ اہلِ بیتؑ

آیاتِ قرآنی اور روایاتِ اسلامی میں جس انداز سے اہل بیتؑ کا تذکرہ کیا گیا ہے، اُس سے اُن کے کردار و گفتار کی بلندی کا پتا چلتا ہے اور ان ہستیوں کی نورانیت نیز روحانیت سے اپنے اور بیگانے سب ہی حیرت زدہ رہ جاتے ہیں۔

آیتِ تطہیر کا واضح اعلان ہے:

"اِنَّمَا يُرِيْدُ اللّٰهُ لِيُذْهِبَ عَنْكُمُ الرِّجْسَ اَهْلَ الْبَيْتِ وَيُطَهِّرَكُمْ تَطْهِيْرًا"[1]

اے (پیغمبرؐ کے) اہلبیت خدا تو بس یہ چاہتا ہے کہ تم کو (ہر طرح کی) برائی سے دُور رکھے اور جو پاک و پاکیزہ رکھنے کا حق ہے ویسا پاک و پاکیزہ رکھے۔

دوسرے الفاظ میں اہل بیت علیہم السلام معصوم ہیں۔

" فَقُلْ تَعَالَوْا نَدْعُ أَبْنَآئَنَا وَ أَبْنَآءَ كُمْ وَ نِسَآئَنَا وَ نِسَآءَ كُمْ وَأَنْفُسَنَا وأَنْفُسَكُمْ ثُمَّ نَبْتَهِلْ فَنَجْعَلْ لَّعْنَةَ اللّٰهِ عَلَى الْكَاذِبِيْنَ"[2]

آیتِ مباہلہ کی روشنی میں امام علیؑ نفسِ رسولؐ اور جانِ پاک رسولؐ کے مقام پر فائز ہیں یعنی گفتار و کردار میں ہر لحاظ سے رسولؐ جیسے ہیں۔ حضرتِ فاطمہ سلام اللہ علیہا، اور ان کے دونوں فرزند، امام حسن اور امام حسین علیہما السلام رسول اللہؐ سے سب سے زیادہ قریب ہیں، ان ہستیوں کے بارے میں یہ خدا کا اعلانِ عام ہے۔ اس کے علاوہ ایک اعزاز اور، جو غیر معمولی اہمیت کا حامل ہے یہ ہے کہ خدا کی بارگاہ میں ان ہستیوں کی دعائیں مستجاب (فوراً قبول ہوتی) ہیں۔

آیتِ تبلیغ اس حقیقت سے پردہ اُٹھاتی ہے کہ آنحضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے فرائض میں سے سب سے زیادہ اہم

---

[1] سورۂ احزاب: آیت ۳۳

[2] سورۂ آل عمران: آیت ۶۱

https://downloadshiabooks.com/

فریضہ جسے پوری نبوت کی ذمّے داریوں کے برابر قرار دیا گیا ہے، وہ ولایتِ علی ابن ابی طالب علیہما السلام کے اعلان کو دنیا والوں کے کانوں تک پہنچانا تھا۔ یہاں تک کہ آیت میں ارشاد ہوتا ہے:

"وَإِنْ لَمْ تَفْعَلْ فَمَا بَلَّغْتَ رِسَالَتَهُ"

"اور اگر آپ نے (یہ حکم) نہ پہنچایا تو پھر آپ نے اس سلسلے میں اپنی رسالت کا فریضہ انجام نہیں دیا۔[۱]

اور بھی متعدد آیات اس موضوع سے متعلق موجود ہیں، لیکن اس مقام پر اس سے زیادہ کی گنجائش نہیں، اس کے علاوہ کثرت کے ساتھ سیکڑوں کتابوں میں، اہل سنّت کی کتابوں کے مصادر و ماخذ کی تفصیلی معلومات کے ساتھ، آیات کی تشریحات موجود ہیں۔[۲] اسلامی روایات میں، بالخصوص وہ احادیث جو صحاح ستہ (وہ چھے احادیث کی مشہور کتب جو اہل سنّت کی نظر میں سب سے زیادہ معتبر ہیں) میں موجود ہیں، اُن میں اہلِ بیتؑ سے متعلق فضائل اور مناقب اتنی کثرت سے نقل ہوئے ہیں کہ بعض افراد کو شاید یقین دلانا مشکل ہوگا۔ شاید یہی وجہ تھی کہ بعض صاحبانِ علم و فضیلت نے اپنا قیمتی وقت صرف کر کے، ان چھے کتابوں سے فضائل اہل بیتؑ کی جمع آوری کی اور اُس کا خلاصہ کر کے چند جلدوں پر مشتمل ایک چھوٹا سا انسائیکلو پیڈیا تیار کر دیا۔[۳]

نیز بعض نے تو اکثر مصادرِ روایاتِ اہلِ سنّت کے ماخذ سے، ان روایات کی جمع آوری کر ڈالی اور دسیوں جلدوں کی صورت میں جمع کیا۔[۴] لیکن افسوس کہ رسولِ گرامیؐ کی آنکھ بند ہونے کے بعد، حاکمانِ وقت نے کچھ ایسے طور طریقے اپنائے کہ عوام الناس، اہل بیتؑ کے مقام اور عظمت سے زیادہ سے زیادہ ناواقف رہیں۔ جن لوگوں نے اہل بیت اطہار علیہم السلام کو اُن کے حق تک (رحلتِ رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بعد) پہنچنے نہیں دیا، انہی لوگوں نے اس خاندان کے فضائل و مناقب اُمّت تک پہنچنے میں رکاوٹیں ڈالیں۔ حد تو یہ تھی کہ اُموی اور عباسی خلفا کے زمانے میں "اہل بیتؑ کے فضائل بیان کرنے پر مکمل پابندی عائد کی ہوئی تھی، جو خاندانِ رسولؐ کے مناقب اور گفتار و کردار کا تذکرہ کرتے پایا جاتا، اُس کے لیے سخت سے سخت سزائیں مقرر کی گئی تھیں۔ کبھی طویل قید کی سزا تو کبھی ہاتھ پیر سے معذور کر دیے جانے کی سزا اور سر تن سے جدا کر دینا بھی معمولی بات تھی، اس ستم پر اعتراض اور احتجاج کرنے والے کے ساتھ بھی مجرموں والا سلوک روا رکھا جاتا۔ یہ تو خدا کا ارادہ تھا کہ اہل

---

[۱] سورۂ مائدہ: آیت ۶۷

[۲] تفسیر نمونہ میں ہر آیت سے متعلق وضاحت اور ماخذ و مصادر کی جانب اشارہ کیا گیا ہے، مزید تشریحات کے لیے، احقاق الحق: جلد ۳، تفسیرِ پیامِ قرآن جلد ۹ کی طرف رجوع کیجیے۔

[۳] کتاب "فضائل الخمسۃ من الصحاح الستۃ" تحریر، دانشمند، محقق مرحوم فیروز آبادی۔

[۴] عبقات الانوار، تحریر مرحوم آیت اللہ العظمیٰ میر حامد حسین ہندی

https://downloadshiabooks.com/

بیتؑ پیغمبرؐ کے حقائق اور فضائل تاریخ میں سینہ بہ سینہ نیز کتابوں کی شکل میں محفوظ رہ جائیں اور آئندہ آنے والی نسلوں تک، تا روزِ قیامت منتقل ہوتے رہیں، تاکہ تشنگانِ حقیقت وصداقت، اس خاندانِ ہدایت کے در سے سیراب ہوسکیں اور بندگانِ خدا کا رشتہ اپنے ربّ سے برقرار رہے۔

اس موقع پر، ابن ابی الحدید کی بات یاد آگئی وہ کہتے ہیں کہ قابلِ صد احترام انسان کے بارے میں بھلا کیا کہہ سکتا ہوں، وہ ایسی عظیم ہستی تھی، جن کے فضائل کا اعتراف، اُن کے دشمن کرتے تھے اور کرتے ہیں نیز تمام تر کوششوں کے باوجود، مولائے کائناتؑ کے فضائل کو پوشیدہ نہیں کر پائے ہیں۔

ہم جانتے ہیں کہ بنی امیہ کا پورے عالم اسلام پر قبضہ تھا اور تمام تر حیلوں، بہانوں سے جعلی حدیثوں کے گھڑنے، منبروں سے سبّ وشتم کے ذریعے ان کے نور کو خاموش کرنے کی کوشش کی، یہاں تک کہ ان کی تعریف کرنے والوں کو ڈراتے دھمکاتے اور کسی کو یہ اجازت نہ تھی کہ کوئی ان کی فضیلت میں کوئی ایک حدیث بیان کرے یا کوئی ان کا نام لے۔ اس کے باوجود ان کے مقام ومنزلت کو کم نہ کرسکے۔

حضرت امام عالی مقامؑ کے فضائل دشمن جتنا بھی چھپالے، چھپ نہیں سکتے ہیں، بلکہ ان میں اضافہ ہوتا جائے گا۔ وہ ایسے سورج ہیں جسے کوئی اپنی ہتھیلی سے چھپانے سے نہیں چھپا سکتا، وہ ایک ایسی روشنائی ہیں کہ اگر ایک آنکھ پر پردہ ڈال کر چھپالیں تو کئی آنکھیں اُن کے نور سے منور ہوسکتی ہیں۔ [۱]

اس حقیقت کا ایک اور اعتراف، امام شافعی، اپنی بعض کتب میں مختصر اور مفید انداز میں یوں کرتے ہیں:

''میں تو حیرت زدہ رہ گیا ہوں کہ یہ کیسے ممکن ہے کہ ایک انسان، جس کے انتہا کو پہنچے ہوئے دشمن اُس کے فضائل کو پوری طرح پوشیدہ رکھنا چاہتے ہیں اور اُس کے دوست موت کے خوف سے، اُس کے مناقب بیان کرنے سے عاجز ہیں، لیکن مشرق سے مغرب تک پورا جہاں اُس کے محاسن سے لبریز ہے۔'' [۲]

اسی سے ملتا جلتا مضمون، عامر بن عبداللہ بن زبیر نے بھی نقل کیا ہے۔ [۳]

۲۔ نامعقول توجیہات!

قابلِ توجہ بات یہ ہے کہ ابن ابی الحدید اپنی شرح نہج البلاغہ میں جب ''اَلْآنَ اِذْ رَجَعَ الْحَقُّ اِلٰی اَهْلِهِ'' کے جملے

[۱] شرح نہج البلاغہ، ابن ابی الحدید: جلد ۱ صفحہ ۱۷

[۲] علی علیہ السلام فی الکتاب والسنۃ: جلد ۱ صفحہ ۱۰

[۳] الغدیر: جلد ۱۰ صفحہ ۲۷۱

https://downloadshiabooks.com/

پر پہنچ کر کہتے ہیں: اس جملے کا مفہوم یہ ہے کہ اس سے پہلے حق نااہل افراد کے اختیار میں تھا۔ لیکن اُس کی توجیہ میں یہ کہیں گے کہ امام علیؑ بے شک خلافت کے لیے سب سے زیادہ لائق، مناسب اور ترجیح رکھتے تھے، لیکن اس کی وجہ یہ نہیں ہے کہ رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی جانب سے امیر المومنینؑ کے لیے کوئی نص (قرآن وسنّت سے) وارد ہوئی ہے، بلکہ افضلیت کی بنیاد پر ہم یہ نظریہ رکھتے ہیں، کیونکہ تمام مسلمانوں میں، رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بعد علیؑ ہی سب سے زیادہ خلافت اور جانشینی کے قابل اور اہل تھے، البتہ اُنھوں نے ایک مصلحت کی وجہ سے اپنے حقِ خلافت کو ترک کر دیا، کیونکہ ان کا اپنا (مولا علیؑ کا) اور دوسرے مسلمانوں کا یہ خیال تھا کہ اُن کے خلافت سنبھالنے سے اسلام اور اس کی نشر واشاعت کے سلسلے میں مشکلات اور شدید تناؤ پیدا ہونے کا خطرہ ہے، وہ اس لیے کہ عرب علی مرتضیٰ علیہ السلام سے اپنے دلوں میں کینہ وحسد رکھتے تھے۔ لہٰذا، یہ بات بالکل معقول ہے کہ جو حق کسی نے ترک کیا تھا، بعد میں وہ حق اُس کی طرف پلٹ آئے تو اس موقع پر یہ کہا جاتا ہے کہ "اَلْآنَ اِذْ رَجَعَ الْحَقُّ اِلٰی اَهْلِهٖ" یعنی امر صاحب امر کی طرف پلٹ آیا۔[1]

یقینی طور پر تعصب اور جانبدارانہ سوچ، اتنے واضح اور روشن کلام کو سمجھنے میں بہت بڑی رکاوٹ ہے، کیونکہ اگر امام علی علیہ السلام چاہتے تو یوں بھی فرما سکتے تھے، اس سے پہلے، حق اُس کے اہل کے سپرد نہیں کیا گیا تھا، اور اب اُس کے اہل تک پہنچا ہے اور اپنے شائستہ مقام پر پلٹ آیا ہے اور اس سے زیادہ روشن عبارت، کیا ممکن تھی جو کہتے؟

ایک رخ بات کا یہ تھا اور دوسرا رُخ یہ کہ عرب امام علی علیہ السلام سے حسد کرتے اور عداوت رکھتے تھے، سراسر بے بنیاد بات ہے۔ ہاں، یہ ضرور کہا جاسکتا ہے کہ ایک محدود طبقہ ایسا تھا جو دراصل شرک اور کفر کی سرپرستی کرنے والوں سے وابستہ لوگ تھے۔ دوسرے الفاظ میں یوں کہا جاسکتا ہے کہ قریش ویہود کے چند سربراہ اور منافقین ایسے لوگ تھے کہ جنھوں نے جنگ بدر وخیبر اور حنین میں آپؑ کی ذوالفقار کے ضربات کا مزہ چکھا تھا، جس کی وجہ سے ان کے دلوں میں امیر المومنینؑ کی نسبت بغض وعداوت پائی جاتی تھی، جبکہ اکثر مسلمان آپؑ کی نسبت عشق ومحبت سے سرشار تھے۔ اس بات کو اسلام کے معتبر منابع میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ایک معروف حدیث میں یوں دیکھتے ہیں کہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے حضرت امیر المومنینؑ کے شانوں پر اپنا دست مبارک رکھتے ہوئے فرمایا:

"لَا یُبْغِضُكَ اِلَّا مُنَافِقٌ"

---

[1] اس جملے میں (قرینے کی وجہ سے) ایک نکتہ محذوف ہے یعنی پورا جملہ یوں ہے" اَلْآنَ اِذْ رَجَعَ الْحَقُّ اِلٰی اَهْلِهٖ لِمَ لَا تُؤَدُّوْنَ حَقَّهٗ"

یہی جملہ وضاحت کے ساتھ نہج البلاغہ کے مصادر میں اس طرح تحریر ہے: "اَلْآنَ اِذْ رَجَعَ الْحَقُّ اِلٰی اَهْلِهٖ مِنْ اَهْلِ بَیْتِ النُّبُوَّةِ یَجْرِیْ مَا یَجْرِیْ مِنَ الْحَوَادِثِ وَ یَقَعُ مَا یَقَعُ مِنَ الْاِخْتِلَافِ" (مصادر نہج البلاغہ: جلد ۱ صفحہ ۳۰۲) البتہ دونوں عبارتوں کا نتیجہ ایک ہے۔

https://downloadshiabooks.com/

''صرف اور صرف منافق ہے جو تم سے دشمنی رکھتا ہے۔'' [۱]

اہل سنّت کے معروف ترین مصادر میں سے ایک صحیح ترمذی ہے، اس کتاب میں ابوسعید خدریؓ نقل کرتے ہیں:

"اِنَّا کُنَّا لَنَعْرِفُ الْمُنَافِقِیْنَ بِبُغْضِهِمْ عَلِیَّ بْنَ اَبِیْ طَالِبٍ"

''ہم منافقوں کو اُن کی علی ابن ابی طالب علیہما السلام سے دشمنی کے ذریعے سے شناخت کیا کرتے تھے۔'' [۲]

کیا ابن ابی الحدید اس پر تیار ہو جائیں گے کہ اُس زمانے کے بیشتر مسلمانوں کو منافقوں میں شمار کریں۔ یہی وجہ تھی کہ حضرت علیؑ کی خلافت کے لیے بیعت کرنے والوں نے جس والہانہ انداز میں استقبال کیا تھا، ایسا استقبال اس سے پہلے کسی بھی خلیفہ کے بارے میں دیکھنے میں نہیں آیا، جبکہ والہانہ استقبال کرنے والوں میں اکثریت اُن ہی صحابۂ رسولؐ یا ان کے فرزندوں کی تھی جو خلفائے ثلاثہ کے زمانے میں تھے۔ یہ درحقیقت اصل حقائق کو تسلیم نہ کرنے کے لیے ایک نامعقول عذر ہے جو نہ تو قابلِ قبول ہے اور نہ ہی مطابقِ حقیقت ہے۔

اور یہ بات کہ رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی جانب سے امیر المومنین حضرت علی ابن ابی طالب علیہما السلام کی خلافت اور ولایت کے بارے میں کسی قسم کی نص (قرآن وسنّت کی روشنی میں) وارد نہیں ہوئی ہے، یہ بالکل خلافِ حقیقت ہے، جسے ہم سابقہ ابحاث میں (دلائل کے ساتھ) تفصیل سے ثابت کر چکے ہیں۔ [۳]

---

[۱] شواہد التنزیل، جلد ا، صفحہ ۳۲۹۔

[۲] صحیح ترمذی: جلد ۱۳، صفحہ ۱۶۸، طباعت، الصاوی مصر، جلد ۵، صفحہ ۶۳۵، طباعت، داراحیاء التراث العربی

[۳] پیامِ قرآن جلد ۹ کی طرف رجوع کریں۔

https://downloadshiabooks.com/

تیسرا خطبہ

وَمِنْ خُطْبَةٍ لَهُ عَلَيْهِ السَّلَامُ

وَ هِيَ الْمَعْرُوفَةُ بِالشِّقْشِقِيَّةِ وَ تَشْمُلُ عَلَى الشَّكْوَى مِنْ أَمْرِ الْخِلَافَةِ ثُمَّ تَرْجِيحِ صَبْرِهِ عَنْهَا ثُمَّ مُبَايَعَةِ النَّاسِ لَهُ"

جسے شقشقیہ کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔اور یہ خطبہ خلافت کے متعلق کچھ شکایات پھر اس پر صبر کو ترجیح دینے اور لوگوں کو بیعت کی طرف متوجہ کرنے پر مشتمل ہے۔

پہلا حصہ

أَمَا وَ اللهِ لَقَدْ تَقَمَّصَهَا فُلَانٌ وَ إِنَّهُ لَيَعْلَمُ أَنَّ مَحَلِّي مِنْهَا مَحَلُّ الْقُطْبِ مِنَ الرَّحَى يَنْحَدِرُ عَنِّي السَّيْلُ وَ لَا يَرْقَى إِلَيَّ الطَّيْرُ فَسَدَلْتُ دُونَهَا ثَوْباً وَ طَوَيْتُ عَنْهَا كَشْحاً وَ طَفِقْتُ أَرْتَئِي بَيْنَ أَنْ أَصُولَ بِيَدٍ جَذَّاءَ أَوْ أَصْبِرَ عَلَى طَخْيَةٍ عَمْيَاءَ يَهْرَمُ فِيهَا الْكَبِيرُ وَ يَشِيبُ فِيهَا الصَّغِيرُ وَ يَكْدَحُ فِيهَا مُؤْمِنٌ حَتَّى يَلْقَى رَبَّهُ فَرَأَيْتُ أَنَّ الصَّبْرَ عَلَى هَاتَا أَحْجَى فَصَبَرْتُ وَ فِي الْعَيْنِ قَذًى وَ فِي الْحَلْقِ شَجًا أَرَى تُرَاثِي نَهْباً.

"آگاہ ہوجاؤ! خدا کی قسم فلاں شخص نے قمیص خلافت کو کھینچ تان کر پہن لیا ہے، حالانکہ اسے معلوم ہے کہ خلافت کی چکی کے لیے میری حیثیت مرکزی کیل کی ہے۔علم کا سیلاب میری ذات سے گزر کر نیچے جاتا ہے اور میری فکر کی بلندی تک کسی کی بھی فکر اور سوچ پرواز نہیں کر سکتی۔پھر بھی میں نے خلافت کے آگے پردہ ڈال دیا اور اس سے پہلو تہی کر لی اور یہ سوچنا شروع کر دیا کہ کٹے ہوئے ہاتھوں سے حملہ کردوں یا اسی بھیانک اندھیرے پر صبر کر لوں، جس میں سن رسیدہ بالکل ضعیف ہو جائے اور بچہ بوڑھا ہو جائے اور مومن محنت کرتے کرتے خدا کی بارگاہ تک پہنچ جائے۔تو میں نے دیکھا کہ ان حالات میں صبر ہی قرین عقل ہے تو میں نے اس عالم میں صبر کر لیا کہ آنکھوں میں مصائب کی کھٹک تھی اور گلے میں رنج و غم کے پھندے

https://downloadshiabooks.com/

تھے۔ میں اپنی میراث کو لٹتے دیکھ رہا تھا۔''

خطبہ، ایک نگاہ میں

یہ خطبہ نہج البلاغہ کے اہم ترین خطبوں میں شمار ہوتا ہے، اس کا موضوع رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بعد خلافت ہے اور اُس سے متعلق اہم مسائل ہیں۔ مختصر ہونے کے باوجود اس میں، خلفائے ثلاثہ اور حضرت علیؑ کے زمانے سے متعلق تاریخ اسلام کا مکمل جائزہ پیش کیا گیا ہے، صاحبانِ علم و دانش کے لیے انتہائی، دلچسپ اور گہرے مطالب، تجزیے اور تبصرے ہیں، جو مطالعے کے لائق ہیں۔ اس خطبے کی تشریح اور تفسیر کا آغاز کرنے سے پہلے، چند نکات کا جاننا مفید ہوگا۔

خطبے کا نام:

خطبے کے نام کا انتخاب، اسی خطبے کے آخری جملے سے کیا گیا ہے، ابھی خطبہ مکمل نہیں ہوا تھا، گفتگو جاری تھی، لیکن کسی نے امامؑ سے سوال کیا، امامؑ نے اپنی بات کو ترک کر دیا اور سائل کے سوال کا جواب دیا، جب جواب دے چکے تو ابنِ عباسؓ نے خلیفہ اور وقت کے امامؑ سے خطبے کو دوبارہ وہیں سے شروع کرنے کی درخواست کی، جہاں سے اُس کا سلسلہ ٹوٹا تھا، امامِ مظلومؑ نے (انسانی نفسیات کو مدنظر رکھتے ہوئے) فرمایا: "تِلْكَ شِقْشِقَةٌ هَدَرَتْ ثُمَّ قَرَّتْ" اردو زبان میں اس بات کو یوں کہتے ہیں ''دل میں ایک آگ کا شعلہ بھڑکا اور پھر ٹھنڈا ہو گیا''۔ سائل کے سوال نے جہاں امامؑ کی توجہ ہٹائی، وہاں کیفیت اور احساس میں بھی تبدیلی آ گئی۔

خطبے کا زمانہ:

اس خطبے کے زمانے کے بارے میں نہج البلاغہ کی شرح کرنے والوں کے درمیان بحث و گفتگو ہے، بعض محققین جیسے محقق خوئی کی رائے ہے کہ خطبے کے موضوعات، اس کی اسناد اور اس کے راویوں کو پرکھنے سے اندازہ ہوتا ہے کہ، یہ خطبہ امیر المومنینؑ کی اس جہان فانی کی زندگی کے آخری دنوں کی بات ہے، یعنی جب جنگ جمل، صفین، اور نہروان جو گروہِ ناکثین، قاسطین اور مارقین سے لڑی گئیں [1] کا ماجرا انجام پا چکا تھا۔ انصاف تو یہ ہے کہ خطبے کے مضامین بھی اس رائے کی تائید کرتے ہیں۔

خطبے کا مقام:

نہج البلاغہ کی شرح لکھنے والوں نے، اس خطبے کی جگہ کے بارے میں خاموشی اختیار کی ہے، لیکن بعض افراد کا خیال

---

[1] منہاج البراعۃ فی شرح نہج البلاغہ، جلد ۳، ص ۳۲

https://downloadshiabooks.com/

ہے کہ امام المتقینؑ کا یہ خطبہ مسجد کوفہ کی یادگار ہے، جبکہ ابن عباسؓ کی رائے یہ ہے کہ یہ خطبہ ''رحبہ'' [۱] میں تاریخ کا حصّہ بنا ہے، یہ بات ہے اُس وقت کی کہ جب مسئلہ خلافت پر بات چھڑی اور امام علی علیہ السلام کے قلبِ مبارک پر ایک بجلی سی کوندگئی اور آپؑ نے اپنے مخصوص انداز اور ظلم و زیادتی کے خلاف عدالت پسندانہ مزاج کے مطابق آسمانِ شرک والحاد کو ڈھادینے والی شعلہ بیانی کا معجزانہ لب ولہجہ اختیار فرمایا اور پھر آپؑ کی لسانِ مبارک سے کلام جاودانہ سرچشمۂ دانائی اور بینائی و بصیرت بن کے جاری ہوا جو ''خطبۂ شقشقیہ'' کے نام سے نہج البلاغہ کی زینت ہے۔

خطبے کی سند:

خطبے کی سند کے بارے میں بھی اختلافات موجود ہیں، بعض محققین کی رائے کے مطابق یہ خطبہ متواتر خطبوں (جو کثرت سے بیان کیے گئے ہوں) میں شمار کیا جاتا ہے، جبکہ بعض نے اس بات سے ہی انکار کر دیا ہے اور کہا ہے کہ یہ خطبہ امام علی علیہ السلام کا ہے ہی نہیں اور امام علیہ السلام نے کبھی خلافت کے بارے میں کوئی شکایت نہیں کی، بلکہ یہ تو سیّد رضیؒ نے خود سے ہی ایک خطبہ بنالیا ہے۔ [۲] مشہور و معروف شارحِ نہج البلاغہ علّامہ ابن میثم بحرانی کہتے ہیں، یہ دونوں دعوے غلط اور افراط وتفریط کا نتیجہ ہیں؛ اس خطبے کی سند حدِ تواتر تک نہیں پہنچتی۔ اور دوسری طرف یہ دعویٰ کہ یہ خطبہ سیّد رضیؒ کا بنایا ہوا ہے، یہ بھی حقیقت پر مبنی نہیں ہے، حق یہ ہے کہ یہ امام علیؑ ہی کا خطبہ ہے۔

اس خطبے کی سند میں جو شکوک وشبہات گھڑے جارہے ہیں، وہ اس وجہ سے نہیں کہ اس میں کوئی ضعف اور فتور ہے یا نہج البلاغہ کے تمام دوسرے خطبات سے مختلف اور متضاد ہے، بلکہ اس کے برعکس اس خطبے کی ایسی متعدد اسناد موجود ہیں کہ ایسی اسناد نہج البلاغہ کے بعض دوسرے خطبوں کی نہیں ملتیں۔ اس خطبے کے سلسلے میں شکوک وشبہات پیدا کرنے والا واحد سبب یہ ہے کہ یہ خطبہ اور اس کے مندرجات بعض لوگوں کی ذہنیت سے مطابقت نہیں رکھتے، ایسے لوگوں نے بجائے اس کے کہ اپنی ذہنیت کی اصلاح کرتے، خطبے کی سند ہی کو مشکوک بنانے کی سازش کرلی۔ بہرحال نہج البلاغہ کے علاوہ اس خطبے کی اسناد میں سے کچھ درج ذیل ہیں:

۱۔ ابنِ جوزی اپنی کتاب ''تذکرۃ الخواص'' میں لکھتے ہیں: یہ خطبہ امام علیہ السلام نے ایک شخص کے سوال کے جواب میں اُس وقت دیا، جب آپ منبر پر رونق افروز تھے اور اس نے اٹھ کر یہ سوال کیا:

---

[۱] رحبہ، کے معنی وسیع جگہ کے ہیں، بعض کے نزدیک کوفے کے محلات میں سے کسی ایک کا نام ہے، بعض کے نزدیک کوفہ سے آٹھ فرسخ دور ایک آبادی کا نام ہے۔ (مجمع البحرین، مراصد الاطلاع)

[۲] شرح نہج البلاغہ ابن میثم، جلد ۱، ص ۲۵۱

https://downloadshiabooks.com/

"مَا الَّذِیْ اَبْطَاَ بِكَ اِلَی الْآنَ"۔ [1]

''کس سبب سے خلافت آپؑ کو ابھی تک نہیں ملی تھی؟''

یہ بات خود اس بات کی نشان دہی کر رہی ہے کہ ابن جوزی کے پاس یہ خطبہ کسی اور وسیلے سے پہنچا تھا دوسرے یہ کہ اس شخص کا سوال نہج البلاغہ میں نہیں ہے۔ اس طرح یہ حتمی ہے کہ ابن جوزی نے یہ خطبہ کسی دوسرے ذریعے سے حاصل کیا ہے۔

۲۔ مشہور شارح نہج البلاغہ ''ابن میثم بحرانی'' کہتے ہیں، یہ خطبہ مجھے دو کتابوں میں ملا ہے جن کی تاریخ تالیف سیّد رضیؒ کی پیدائش سے پہلے کی ہے، ان میں سے ایک کتاب ''الانصاف'' ہے، جسے ''کعبی'' کے شاگرد ''ابوجعفر ابن قبہ'' نے جو معتزلہ فرقے کی مشہور شخصیت تھے، تحریر کیا ہے اور ان کی وفات سیّد رضیؒ کی ولادت سے پہلے ہوئی تھی۔

۳۔ دوسری کتاب جس میں مجھے یہ خطبہ ملا ہے، وہ ''ابوالحسن علی بن محمد بن فرات'' ہے، جو ''المقتدر باللہ'' کے وزیر تھے، یہ خطبہ ان کی تحریر میں بھی ہے، ان کا انتقال بھی سیّد رضیؒ سے تقریباً ساٹھ ۶۰ سال پہلے ہوا تھا۔ اس کے بعد مزید کہتے ہیں، میرا غالب خیال یہ ہے کہ یہ نسخہ ابنِ فرات کی پیدائش سے بہت پہلے کا ہے۔ [2]

۴۔ ابن ابی الحدید مزید کہتے ہیں میرے استاد ''واسطی'' سن ۶۰۳ھ میں اپنے استاد ''ابنِ خشاب'' سے نقل کرتے ہیں کہ انہوں نے میرے اس سوال کے جواب میں کہ آیا یہ خطبہ واقعی جناب امیر المومنین علیہ السلام کا ہے؟ فرمایا:

''میں خدا کی قسم کھاتا ہوں کہ مجھے اس خطبے کے کلامِ علی علیہ السلام ہونے کا اتنا ہی یقین ہے جتنا اس بات کا کہ تم مصدق ابنِ شبیب واسطی ہو۔''

میں نے بات جاری رکھی اور کہا: بہت سے لوگ کہتے ہیں کہ یہ سیّد رضیؒ کا اپنا کلام ہے۔ انہوں نے جواب میں کہا، ''سیّد رضیؒ یا غیرِ سیّد رضیؒ کہاں اور یہ بیان و اسلوب کہاں! ہم نے سیّد رضیؒ کی تحریریں دیکھی ہیں اور ان کی نثر نگاری کے فن، طریقے اور روِش کو اچھی طرح پہچانتے ہیں، جس کی اس خطبے سے کوئی شباہت نہیں۔'' پھر مزید کہا ''میں خدا کی قسم کھاتا ہوں کہ میں نے یہ خطبہ ایسی کتابوں میں دیکھا ہے، جو سیّد رضیؒ کے پیدا ہونے سے دو سو سال پہلے لکھی گئی تھیں۔ میں نے یہ خطبہ ایسے علما اور اہلِ ادب کی تحریروں میں دیکھا ہے جنہیں میں اچھی طرح جانتا ہوں اور بتا سکتا ہوں کہ کون سی تحریر کس عالم کی لکھی ہوئی ہے اور یہ سب سیّد رضیؒ کے والد کے پیدا ہونے سے بھی پہلے کی ہیں۔

[1] تذکرۃ الخواص، ص ۱۲۴

[2] شرح ابن میثم بحرانی، ج ۱، ص ۲۵۲

https://downloadshiabooks.com/

اس کے بعد ابن ابی الحدید کہتے ہیں:

''میں نے خود یہ خطبہ استاد ''ابوالقاسم بلخی'' کی تحریر میں دیکھا ہے جو معتزلہ کے بزرگ علما میں سے تھے اور ''المقتدر باللہ'' کے ہم عصر تھے، جو سیّد رضیؒ کی ولادت سے بہت پہلے انتقال کر چکے تھے۔ اس کے علاوہ ان کے شاگرد ''ابنِ قبہ'' (جو متکلمینِ امامیہ میں سے تھے) کی کتاب ''الانصاف'' میں بھی دیکھا ہے یہ بھی سیّد رضیؒ کے پیدا ہونے سے پہلے کے ہیں۔''[۱]

مرحوم علامہ امینی نے اپنی مشہور کتاب ''الغدیر'' [۲] میں اس خطبے کو نقل کرنے کے بعد ۲۸ کتابوں سے اس کا حوالہ دیا ہے۔

خطبے کے مضامین

جیسا کہ پہلے بھی اشارہ کیا جا چکا ہے کہ یہ خطبہ اُن تمام مسئلوں اور مشکلات پر مبنی ہے جو بعدِ رسالت مآب صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم مسئلہ خلافت پر پیش آئیں۔ نیز اُن مشکلات کا بھی بیان ہے جو پچھلے خلفا کے دور میں پیش آئیں۔ بہت مختصر لیکن وسیع معنی اور مفہوم رکھنے والے جملوں کے ذریعے آپ نے ان کی تشریح کی ہے اور صراحت کے ساتھ اس حقیقت کو بیان کیا ہے کہ بعدِ رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم آپ ہی اس مقام کے لیے خلافت کے سب سے زیادہ حقدار تھے اور شدید رنج کا اظہار کرتے ہیں کہ کس طرح خلافت اپنے اصل محور سے ہٹ گئی۔ خطبے کے اختتام پر لوگوں کی خود سے بیعت کی تفصیل بیان فرماتے ہیں اور اُن مقاصد کا ذکر فرماتے ہیں جن کی بنا پر آپ نے خلافت قبول کی۔

شرح و تفسیر

مسئلۂ خلافت کے بارے میں اہم تجزیہ

پہلے بھی اس کے بارے میں بتایا جا چکا ہے، یہ خطبہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے وصال کے بعد معاشرے میں اُٹھنے والے ہولناک طوفانوں کو بیان کر رہا ہے، ان طوفانوں اور فتنہ و فساد کو برپا کرنے کا مقصد صرف اتنا تھا کہ کسی طرح خلافت اور امامت کو اس کے اصل مرکز اور محور سے ہٹا دیا جائے۔ جب اُمّت مسلمہ نے، رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی جانشینی کے مسئلے میں نافرمانی کی اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے واضح اعلان کے باوجود نیز حکم خدا (نصِ صریح) کے بیان ہو جانے کے بعد بھی غفلت

---

[۱] شرح ابن ابی الحدید، ج ۱، ص ۲۰۵

[۲] الغدیر، ج ۷، ص ۸۲

https://downloadshiabooks.com/

برتی، یا کسی بھی قسم کی مصلحت کا شکار ہوئے، جس کے نتیجے میں عالمِ اسلام ایک بڑے انتشار کا شکار ہوا اور طرح طرح کی مشکلات پیدا ہونا شروع ہو گئیں۔ خلافت کے پہلے مرحلے کے بارے میں بیان کرتے ہوئے امیر المومنین حضرت علی علیہ السلام فرماتے ہیں:

"اَمَا وَاللّٰہِ لَقَدْ تَقَمَّصَهَا [1] فُلَانٌ وَاِنَّهُ لَيَعْلَمُ اَنَّ مَحَلِّيْ مِنْهَا مَحَلُّ الْقُطْبِ مِنَ الرَّحَا"۔[2]

"قسم خدا کی! جب اس نے لباسِ خلافت کو پہنا تو اس وقت وہ (پہننے والا) یہ بات اچھی طرح سے جانتا تھا کہ مسئلۂ خلافت میں میری حیثیت آٹے کی چکّی میں اُس کی کیل جیسی ہے۔" (کہ جس کے بغیر وہ چکّی چل نہیں سکتی)

یہ یقینی بات ہے کہ "تَقَمَّصَهَا" میں موجود ضمیر "هَا" سے مراد "خلافت" ہے۔ اور "قَمِيْص" شاید اس نکتے کی طرف اشارہ ہے کہ فلاں شخص نے خلافت کے مسئلے کو اپنے جسم کو چھپانے اور اپنے تن کی زینت بنانے کے لیے قمیص کے طور پر استعمال کر ڈالا جبکہ اس عظیم چکّی کو ایک طاقتور محور اور مرکز کی ضرورت تھی، جو چکّی کے نظام کو تیز رفتاری کے ساتھ حرکت کرنے میں مددگار ثابت ہو، نیز اُسے اپنی سمت سے منحرف نہ ہونے دے اور یہ عالمِ اسلام میں پیدا ہونے والے نشیب و فراز میں پورے نظام کی حفاظت کر سکے اور اس کی حرکت، اسلام اور مسلمانوں کے مفادات کے لیے ہو۔

جی ہاں! خلافت قمیص نہیں، بلکہ معاشرے کو چلانے والا محور اور مرکز ہے، لہٰذا خلافت کو ایک محور کی ضرورت ہے نہ یہ کہ کوئی اُس خلافت کو اپنا لباس بنا لے اور ذاتی رائے کے مطابق استعمال کرے۔ اور پھر اس معنی (خلافت کے معنی) کے لیے ایک واضح دلیل پیش کرتے ہیں جو ناقابلِ انکار ہے۔ حضرت امام علی علیہ السلام فرماتے ہیں:

"يَنْحَدِرُ [3] عَنِّي السَّيْلُ، وَلَا يَرْقَىٰ إِلَيَّ الطَّيْرُ"

"میرے وجود سے مسلسل (علم و حکمت کے) چشمے اور سیلاب جاری و ساری رہتے ہیں، عالم وہم و خیال میں بلند ترین پرواز کرنے والا پرندہ، میری روح کی بلندی نیز گفتار و کردار کی گہرائی تک نہیں پہنچ پاتا۔"

"يَنْحَدِرُ" سے مراد اوپر سے گرنا اور بہہ کر نیچے آنا ہے "وَلَا يَرْقَىٰ" سے مراد ہے "اوپر نہیں جاتا" یہاں پر دو مختلف پہلوؤں کو استعمال کیا گیا ہے، جو ایک دوسرے کے مقابلے میں دو متضاد نکات ہیں، جس دلچسپ نکتے کی طرف اشارہ کیا جا رہا ہے، وہ یہ ہے کہ امامؑ کے وجود کو ایک عظیم پہاڑ سے تشبیہ دی گئی ہے، جس میں بلند ٹیلے اور چٹانیں ہیں۔ ان ٹیلوں کی خاصیت

---

[1] تقمص قمیص کے مادّے سے ہے، یعنی کُرتا اور تقمّص کے معنی ہیں، "پیراہن زیب تن کر لینا"۔

[2] الرحی، یعنی چکّی کا پتھّر، جس کے گھومنے سے چکّی کام کرتی ہے اور آٹا پیستی ہے، یہ مادّہ "ناقص وادی" اور "ناقص یائی" دونوں طرح استعمال ہوا ہے۔

[3] ینحدر، انحدار کے مادّے سے ہے۔ اس کے معنی ہیں: بہت کثرت اور زیادہ مقدار میں اونچائی سے نیچے کی جانب بہاؤ گرنا۔

https://downloadshiabooks.com/

یہ ہے کہ وہ اپنے اندر آسمان سے نازل ہونے والی اشیاء اور برکات کو محفوظ کرتے ہیں اور مسلسل رُوئے زمین کی جانب اُن خداداد نعمتوں کو بھیجتے رہتے ہیں، جس کے نتیجے میں درخت، سبزہ نیز پھول اور بُوٹے اُگتے ہیں۔ ان عظیم پہاڑوں اوران کی بلندی تک کوئی پرندہ نہیں پہنچ پاتا، لیکن وہ زمین اور اہل زمین کو مادّی اور روحانی فوائد سے نوازتے رہتے ہیں۔

یہ تشبیہ دراصل اشارہ ہے قرآنی تشبیہ کی جانب جس کا ذکر قرآن میں آیا ہے کہ زمین کو متوازن رکھنے اور اس کو آباد کرنے میں پہاڑ نہایت اہم کردار ادا کرتے ہیں۔

"وَأَلْقَىٰ فِي الْأَرْضِ رَوَاسِيَ أَن تَمِيدَ بِكُمْ وَأَنْهَارًا وَسُبُلًا لَّعَلَّكُمْ تَهْتَدُونَ" [۱]

''اللہ نے زمین پر مستحکم اور ساکن (ثابت) پہاڑوں (کے سلسلے) کو قرار دیا تاکہ زمین کی لرزش کو دور کیا جا سکے اور اُن کے ذریعے سے نہریں بنائیں اور زمین میں راستوں کو ایجاد کیا تاکہ تم لوگوں کی ہدایت کی جا سکے۔''

جی ہاں، اگر زمین پر عظیم پہاڑوں کا جال نہ بچھایا گیا ہوتا تو زمین کا اندرونی دباؤ، چانداور سورج کی کشش اور زمین کی سطح کا مدوجزر نیز طوفانی دباؤ کے اثرات مل کر، انسانی زندگی کے چین اور سکون کو بری طرح درہم برہم کر دیتے اور پھر آسمان سے جو پانی برستا تو ایک عظیم سیلاب کی شکل میں سمندروں میں جا کر گرتا، نہ تو کسی نہر کا وجود ہوتا اور نہ ہی کوئی چشمہ ہوتا۔

رُوئے زمین پر ہر اُمت کے لیے ایک توانا، بیدار اور آگاہ امامِ معصومؑ کا وجود ہر قسم کی برکات نیز اطمینانِ قلبی اور ایمان کی مضبوطی کا باعث ہے، ان الفاظ اور خصوصیات سے اندازہ ہوتا ہے کہ آپؑ کے عظیم استاد حضرت ختمی مرتبت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور ائمہ اطہار علیہم السلام کے سوا کوئی انسان حضرت امیر المومنینؑ کے افکار کی گہرائی، معرفت کی عظمت نیز ان کی دائمی اور آفاقی شخصیت کی حقیقت تک نہیں پہنچ سکتا۔ حضرت امیر المومنین علیہ السلام کے اصحاب و پیروکاروں نے اپنے وجود اور ظرفیت کے مطابق اس علم کے بحرِ بیکراں سے اُن کی علمی گہرائی کا مطالعہ اور استفادہ کیا ہے۔ [۲]

یہ نکتہ بھی قابل توجہ ہے کہ چکّی کے بڑے بڑے پاٹ چلانے کے لیے بھی، نہر کے پانی کا استعمال کیا جاتا رہا ہے اور پھر، یہ نہریں عظیم پہاڑوں کے دامن سے بہہ کر نیچے آتی ہیں، اس کے علاوہ یہ کہ چکّی کے بڑے بڑے پتھروں کو پہاڑوں سے ہی تراش کر حاصل کیا جاتا ہے۔ مختصر یہ کہ عین ممکن ہے یہ سارے معنی ہی مراد لیے جا سکیں، یعنی حضرت امام علی علیہ السلام کا مقصد یہ ہے کہ میں نظامِ خلافت و امامت کا محور بھی ہوں اور اُس کی چکّی کا پتھر بھی ہوں۔ نیز جس طاقت سے وہ پتھر حرکت

---

[۱] سورہ نحل: آیت ۱۱

[۲] حضرت علیؑ کے اس آفاقی کلام کے حقائق اور آپ کی تمام امت مسلمہ پر فوقیت کے بارے میں مزید وضاحت کے لیے اسی کتاب کے مقدمہ کے مندرجات کی طرف رجوع کریں۔

https://downloadshiabooks.com/

میں آتا ہے وہ طاقت بھی میں ہوں۔

یہ کوئی اور چیز نہیں سوائے علم و دانش کے، جس سے وجودِ مبارکِ مولائے کائناتؑ سرشار تھا۔ اسی طرح جیسا کہ پہلے بھی اس بات کی جانب اشارہ کیا جا چکا ہے کہ غور کرنے کی ضرورت ہے کہ پہاڑوں کے دامن میں آسمانی برکات اور فیوض جیسے برف وغیرہ جمع ہوتے رہتے ہیں اور تدریجی طور پر پیاسی زمینوں تک یہ برکات پہنچتی رہتی ہیں، اس تشبیہ سے مراد یہ ہو سکتی ہے کہ حضرت علیؑ سرچشمۂ وحی کے نہایت قریب تھے اور پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے وجود سے فیض یاب ہوتے اور دوسروں تک اُسے پہنچاتے رہتے تھے۔

بعض شارحین نہج البلاغہ کی تعبیر کے مطابق مذکورہ جملے میں لفظ ''سیل'' سے مراد پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی وہ مشہور حدیث ہے:

"اَنَا مَدِيْنَةُ الْعِلْمِ وَ عَلِيٌّ بَابُهَا"[1]

''میں علم کا شہر ہوں اور علی اُس کا دروازہ ہے۔''

جس سے حضرت علیؑ کے ''علمِ بیکراں'' کا اندازہ ہوتا ہے۔ نیز قرآن کی یہ آیتِ مبارکہ:

"قُلْ اَرَاَيْتُمْ اِنْ اَصْبَحَ مَاۗؤُكُمْ غَوْرًا فَمَنْ يَّاْتِيْكُمْ بِمَاۗءٍ مَّعِيْنٍ"[2]

''اے حبیب صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ان لوگوں سے ذرا دریافت تو کرو، اگر وہ تمام پانی جو تم لوگوں کے اختیار میں ہے، زمین اُسے جذب کر لے تو پھر کون ہے جو تم لوگوں کے لیے پانی کا انتظام کرے گا''۔

امام علی بن موسیٰ الرضا علیہما السلام، اس آیت کی تفسیر میں فرماتے ہیں کہ "مَاۗءٍ مَّعِيْنٍ"[3] سے مراد علمِ امام علیہ السلام ہے۔ کچھ چھوٹے چھوٹے سوالات ہیں کہ جو اس موقع پر بعض افراد کے اذہان میں پیدا ہوتے ہیں:

پہلا سوال: حضرت علی علیہ السلام اپنی تعریف اپنی زبان سے کیوں فرما رہے ہیں، جبکہ

"تَزْكِيَةُ الْمَرْءِ لِنَفْسِهٖ قَبِيْحٌ"

''یہ ناپسندیدہ بات ہے کہ کوئی اپنی تعریف خود کرے۔''

جواب: یہ بات بھی واضح رہے کہ خود ستائش اور کسی کو اپنا تعارف کروانا، دو بالکل مختلف چیزیں ہیں۔ جب عوام

---

[1] اس مشہور حدیث کی اسناد کو جاننے کے لیے، کتب اہل سنّت کو دیکھیے، احقاق الحق، جلد ۵، صفحہ ۴۶۷ تا ۵۰۱۔

[2] سورۂ ملک: آیت ۳۰

[3] تفسیر نور الثقلین: جلد ۵، صفحہ ۳۸۶، یہ تفسیر، ظاہری تفسیر یعنی آب جاری کے مفہوم کے ساتھ کسی قسم کا ٹکراؤ نہیں رکھتی، نیز بعض دوسری تفاسیر بھی صحیح ہیں جن میں ''ماء معین'' سے مراد ''امامِ معصومؑ کا اصل وجود'' لیا گیا ہے، کیونکہ یہ آیت مفہوم کے لحاظ سے تینوں معانی سے مناسبت رکھتی ہے۔

https://downloadshiabooks.com/

الناس کسی شخصیت سے واقف نہ ہوں تو ظاہری بات ہے کہ اُس انسان کی بہترین صلاحیتوں سے بھرپور طریقے سے بہرہ مند نہیں ہو سکتے، ایسے موقعوں پر انسان کو تعارف کرانے کی ضرورت پیش آتی ہے، اب یہ تعارف کرانا اصل مقصد ہے، چاہے ایک انسان اپنا تعارف خود کرائے جیسے ڈاکٹر اپنے نسخے اور کلینک کے بورڈ پر اپنی اسناد کا مکمل تذکرہ کرتا ہے تاکہ مشکلات کے حل کے لیے لوگوں کی رہنمائی ہو سکے نہ کہ خودنمائی کا پہلو سامنا آسکے۔

دوسرا سوال: ''یہ جو جملہ ہے

''يَنْحَدِرُ عَنِّي السَّيْلُ، وَلَا يَرْقَىٰ إِلَيَّ الطَّيْرُ''

''میرے وجود سے مسلسل (علم و حکمت کے) چشمے اور سیلاب جاری و ساری رہتے ہیں، عالم وہم و خیال میں بلند ترین پرواز کرنے والا پرندہ، میری روح کی بلندی نیز گفتار و کردار کی گہرائی تک نہیں پہنچ پاتا۔''بس ایک زبانی دعویٰ ہے، بھلا اس کو ثابت بھی کیا جا سکتا ہے!!!؟''

جواب: جی ہاں! اس کو ثابت کرنا پہلے والے سوال سے بھی زیادہ آسان اور روشن تر ہے۔ بات یہ ہے کہ جو کوئی بھی تاریخ اسلام اور تاریخ مسلمین سے تھوڑی سی بھی واقفیت رکھتا ہے، وہ یقیناً حضرت امیر المومنین علی بن ابی طالب علیہ السلام کی بے مثال شخصیت سے بالخصوص ان کے علم و دانش کے بارے میں رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے بیان کی گئی احادیث سے کم و بیش آگاہی رکھتا ہے۔ آنحضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی احادیث کی روشنی میں حضرت علیؑ کے وسیع علم کو بیان کیا گیا ہے۔ اس کے علاوہ مسلمان دانشمندوں کی ایک جماعت نے واضح الفاظ میں اس بات کا اعتراف کیا ہے کہ تمام اسلامی علوم کی بنیاد رکھنے والے حضرت علی بن ابی طالب علیہما السلام ہیں اور آپؑ ہی ان علوم کے بانی سمجھے جاتے ہیں۔ [1]

اس کے علاوہ اگر ماسبق کے زمانے کے حالات کا بغور مطالعہ کیا جائے تو پتا چلتا ہے کہ جب کبھی ایسی مشکل آپڑتی جو کسی سے حل نہیں ہو پاتی تو، مولائے کائناتؑ کا دروازہ کھٹکھٹایا جاتا اور اُن سے درخواست کی جاتی۔ مولائے متقیانؑ پورے عالم اسلام اور پوری انسانیت کے ہمدم بھی تھے اور ہمدرد بھی، حضرت علی علیہ السلام کی چشمِ بصیرت اس بات کی صلاحیت رکھتی تھی کہ ماضی، حال اور مستقبل کو بہ یک وقت دیکھ سکے۔

نہج البلاغہ کے خطبے، مراسلات (خطوط) اور کلماتِ قصار (مختصر جملوں) کا مطالعہ اس حقیقت کو جاننے کے لیے کافی ہیں۔ مسلمان ہو یا غیر مسلم، ہر انصاف پسند انسان ایک مرتبہ نہج البلاغہ کو پوری توجہ کے ساتھ پڑھ لے تو امیر المومنین علیہ السلام کی

---

[1] ابن ابی الحدید، اپنی ''شرح نہج البلاغہ'' میں اس موضوع کے ضمن میں تفصیلی گفتگو کرتے ہوئے اسلامی علوم میں سے ہر ایک کو باری باری ذکر کرتے ہیں اور بتاتے ہیں کہ تاریخی لحاظ سے کس طرح، کون سا علم، حضرت علی علیہ السلام کے ''علمِ بیکراں'' سے جاری و ساری ہوا۔ (شرح ابن ابی الحدید جلد ۱، صفحہ ۱۷ تا ۲۰)

https://downloadshiabooks.com/

عظمتِ علمی کے سامنے سرِ تسلیم خم کرنے پر مجبور ہو جائے گا کہ اس جملے "يَنْحَدِرُ عَنِّي السَّيْلُ وَلَا يَرْقَى إِلَيَّ الطَّيْرُ" علم و دانش کا سیلابِ عظیم میرے کوہسارِ وجود سے نیچے آتا ہے اور بلند پرواز پرندے میری بلندیوں تک پر نہیں مار سکتے، کا مفہوم اس پر بخوبی صدق آتا ہے۔

تیسرا سوال: رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بعد خلافت کے بارے میں جو کچھ ہوا، امام علیؑ اس کی شکایت کیسے کر سکتے ہیں۔ کیا یہ مقامِ صبر و رضا اور مقامِ تسلیم و بُردباری کے مزاج کے خلاف نہیں؟''

جواب: یہ بھی زیادہ پیچیدہ نہیں، دیکھیے، صبر اور تسلیم و رضا ایک بات ہے جبکہ حقائق کو تاریخ میں محفوظ رکھنا اور آئندہ نسلوں تک منتقل کرنا ایک اہم فریضہ ہے اور یہ بات تسلیم و رضا کے مزاج سے نہیں ٹکراتی، بلکہ بعض مرتبہ تو انسانی زندگی اور اصلاحِ احوال کے لحاظ سے سب سے زیادہ حسّاس اور اہم ذمّے داری بن جاتی ہے (جیسے خلافت اور امامت کا مسئلہ کہ جو پورے عالمِ اسلام کا نیز مسلمانوں کے مستقبل کے سنورنے یا بگڑنے کا اہم ترین مسئلہ تھا)۔ درحقیقت لوگوں کی اصلاح، اسلامی معاشرے اور آئندہ آنے والی نسلوں کے لیے ضروری تھا کہ امام علیہ السلام ان حقائق کو بیان فرمادیں تاکہ انہیں بھلایا نہ جاسکے۔

پھر امامِ عالی مقامؑ فرماتے ہیں:

"فَسَدَلْتُ[1] دُونَهَا ثَوْبًا، وَطَوَيْتُ عَنْهَا كَشْحًا".[2]

''(جب میں نے دیکھا کہ اُس نے آگے بڑھنے میں جلدی کی اور خلافت کو اپنے گھیرے میں لے لیا) تو میں نے اُس سے چشم پوشی کرتے ہوئے (ظاہری اقتدار) خلافت سے کنارہ کش ہوگیا۔''

مذکورہ بیان میں بخوبی اس بات کی نشان دہی ہوتی ہے کہ جب امامِ مظلومؑ نے کچھ لوگوں کو خلافت کے سلسلے میں آنحضرتؐ کی وصیّت کے برعکس اقدام کرتے ہوئے پایا اور احتجاج کے نتیجے میں، مسلمانوں کے درمیان فتنہ و فساد برپا ہونے کے حالات پیدا ہوتے ہوئے محسوس کیے، تو پوری متانت اور بزرگواری کے ساتھ خلافت ظاہری اور اقتدار کی رسہ کشی سے درگزر کیا اور ہر قسم کے ٹکراؤ سے گریز کیا، لیکن زندگی کی آخری سانس تک امیر المومنین علی ابن ابی طالب علیہما السلام کی روح بے چین رہی کہ عالمِ اسلام میں پیدا ہونے والے اس عظیم انحراف کی اصلاح کیسے کی جائے۔

---

[1] لفظ، سدلت، سَدْل کے مادّے سے بنا ہے اور اس کا وزن ''عدل'' ہے، اصل میں اس کے معنی ہیں ''کسی چیز کا اوپر سے نیچے کی طرف نازل ہونا اس طرح سے کہ جس چیز پر وہ نازل ہوا ہے، اُس کو پوری طرح ڈھانپ لے، اس بنا پر لفظ، سدلت، کے معنی ''اس کو ترک کردیا اور اُس پر کوئی چیز ڈال دی'' بنتے ہیں۔

[2] ''کشح'' لفظ ''فتح'' کا ہم وزن ہے اور اس کے معنی ہیں ''پہلو'' عربی میں ''طوی عنہ کشحہ'' اس سے اردو میں بے اعتنائی اور کسی چیز سے درگزر کرنا مراد لیا جاتا ہے، جو دراصل ''کنایہ'' کے طور پر استعمال ہوتا ہے۔

https://downloadshiabooks.com/

اسی وجہ سے امام مزید فرماتے ہیں:

''وَطَفِقْتُ اَرْتَئِیْ بَیْنَ اَنْ اَصُوْلَ بِیَدٍ جَذَّاءَ[۱] اَوْ اَصْبِرَ عَلٰی طَخْیَةٍ[۲] عَمْیَاءَ''

''میں مسلسل اسی غور وفکر میں غوطہ زن تھا کہ کٹے ہوئے بازوؤں سے (باوفا ساتھیوں کے بغیر) حملہ کروں یا پھر اس تاریک ماحول میں خاموشی اختیار کرلوں اور صبر سے کام لوں۔''

امیر المومنین علیہ السلام اس جملے کے ذریعے ایک تاریخی حقیقت کی جانب توجّہ دلاتے ہوئے فرماتے ہیں:

''میں اُمّتِ رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بارے میں خدا اور رسول ؐ کی جانب سے عائد کیے گئے فریضے کو لمحہ بھر کے لیے بھی نہیں بُھلا پایا تھا لیکن کرتا تو کیا کرتا؟ میں دوراہے پر کھڑا تھا، پہلا راستہ یہ تھا کہ قیام کرتا اور مخالفوں کے ساتھ لڑتا جبکہ ایک طرف میرے ساتھ دینے والے زیادہ نہ تھے، تو دوسری طرف مسلمانوں میں ایک بڑا شگاف پڑنے کا خطرہ تھا اور منافقین اور اسلام کے دشمن ایسے موقع کی تلاش میں تھے اور دوسرا راستہ یہ تھا کہ اُس جہالت کے تاریک دور میں صبر کرلوں۔''

''طَخْیَةٍ عَمْیَاءَ'' سے کیا مراد ہے؟ اسے سمجھنے سے پہلے ''طَخْیَةٍ'' کے معنی کو جان لیں: کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ اندھیرا ہونے کے باوجود معمولی سا سایہ کوئی حرکت سی، سمجھ میں آرہی ہوتی ہے، یہاں پر مراد یہ ہے کہ اتنی زیادہ تاریکی تھی کہ جب ہاتھ کو ہاتھ سجھائی نہیں دیتا۔

امام المتقین ؑ اور زمانے کے امام ؑ اُمّتِ مسلمہ پر گزرنے والے حالات کے اثرات اور اُس تاریخی المیے کی صورتِ حال کو ان الفاظ میں عیاں کرتے ہیں:

''یَهْرَمُ فِیْهَا الْكَبِیْرُ، وَیَشِیْبُ فِیْهَا الصَّغِیْرُ، وَیَكْدَحُ[۳] فِیْهَا مُؤْمِنٌ حَتّٰی یَلْقٰی رَبَّهٗ''

''ایسا فتنہ کہ جس نے بوڑھوں کو خستہ حال کردیا تھا، بچّوں کو بڑھاپے تک پہنچادیا تھا، نیز ایمان والوں (یعنی جو ہر قسم کے حالات میں خدا کا شکر کرتے اور شاداب رہتے ہیں) کو زندگی کی آخری سانس تک رنجیدہ خاطر کردیا تھا۔'' (اور آج تک اہلِ ایمان غم زدہ ہیں)۔

اس عبارت سے یہ بات اچھی طرح واضح ہوجاتی ہے کہ ایک ایسا گہرا رنج وغم تھا، جس نے پورے معاشرے اور معاشرے کے ہر فرد کو اپنی لپیٹ میں لے رکھا تھا، حال یہ تھا کہ اس تکلیف دہ صورتِ حال میں بچّے، بوڑھے نظر آنے لگے

---

[۱] جذاء، یعنی شکستہ اور کٹ کر جدا ہونا۔

[۲] طخیۃ، یعنی تاریکی، ظلمت اور کبھی ہلکے بادل کے لیے بھی استعمال ہوتا ہے اور ''طخیاء'' یعنی تاریک رات۔

[۳] یکدح، کا مادّہ ''کدح'' ہے جس کے معنی ہیں، محنت اور مشقت کے ساتھ جدو جہد اور کوشش کرنا۔

https://downloadshiabooks.com/

تھے اور عمر رسیدہ لوگ تو مفلوج ہو کر رہ گئے تھے، لیکن مومنین کا درد سب سے زیادہ تھا، کیونکہ وہ ان حالات کے نشیب و فراز نیز بنیادی وجوہات سے واقف تھے، لہٰذا ان کا غم، زندگی اور موت کا غم بن چکا تھا کہ جس میں نہ سانس آتی ہے اور نہ جان نکلتی ہے اور پھر کچھ ہی مدت گزرنے کے بعد یہ درد اور کرب بنی اُمّیہ کی حکومت کی شکل میں ایک مصیبتِ عظمیٰ بن کر نازل ہوا، نہ صرف پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی زحمتیں برباد ہوگئیں، بلکہ صدرِ اسلام کے مومنین (جن کے خلوص کی گواہی قرآنی آیات ہیں) کی قربانیاں بھی بھلادی گئیں۔ بالآخر اُس خطرناک دوراہے پر پہنچ کر، زمانہ شناس امامؑ نے فرض شناسی کا معیار قائم کرتے ہوئے اس ناقابلِ بیان دور کی ان الفاظ میں غمازی فرمائی ہے:

فَرَاَیۡتُ اَنَّ الصَّبۡرَ عَلٰی هَاتَا [۱] اَحۡجیٰ [۲]

''(ہر لحاظ سے بہت غور و فکر کے بعد) اس مصیبت کے مقابلے میں آپؑ نے بردباری اور صبر و شکیبائی کو عقل و خرد سے زیادہ قریب جانا۔''

اب ذرا خدا کے ولی حضرت علیؑ کے بیان کو پڑھیے:

فَصَبَرۡتُ وَفِی الۡعَیۡنِ قَذًی [۳] وَفِی الۡحَلۡقِ شَجًا۔ [۴]

''(یہی وجہ تھی کہ) میں نے صبر سے کام لیا، جبکہ میری حالت زار ایسی تھی جیسے آنکھوں میں خس و خاشاک ہوں اور حلق میں ہڈی پھنسی ہو کہ جسے نہ نگلا جاسکتا ہو اور نہ ہی اُگلا جاسکتا ہو۔''

یہ منہ بولتی عبارت بتا رہی ہے کہ اُمّت مسلمہ کا مظلوم امامؑ، جس کے بارے میں جہاں رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی وصیت کو جھٹلایا گیا ہے، وہاں اُسے خلافتِ ظاہری کے فرائض کو انجام دینے سے روکا گیا ہے تو، تیسری جانب وہ امت کی گمراہی کو اپنی آنکھوں سے دیکھ رہا ہے، ایسی صورتِ حال میں تاریخ کا مظلوم ترین انسان احتجاج بھی کرتا ہے تو اُس کے منہ سے نکلنے والی بات پر نادان دوست اور منافقوں کا گروہ بات کا بتنگڑ بناتے ہیں، ایسی عجیب و غریب کیفیت ہے، جسے بہت ہی موزوں الفاظ

---

[۱] لفظ ھاتا میں ھا علامت تنبیہہ ہے (عربی گرامر کی اصطلاح ہے) اور ''تا'' ''اسمِ اشارہ برائے تانیث'' ہے کہ جس کا اشارہ لفظ ''طخیۃ'' ''تاریکی اور ظلمت'' کی طرف ہے جو گزشتہ جملوں میں ذکر ہو چکا ہے بعض افراد کی نظر میں ''مشار الیہ'' ایک ایسی حالت ہے کہ جو درج ذیل عبارت سے سمجھ میں آتی ہے اور اُس کے معنی کچھ یوں بنتے ہیں (فرایت ان الصبر علی ھذہ الحالۃ احجی) یعنی ''ایسے حالات میں، صبر کرنے کو میں نے عقل کے زیادہ قریب پایا''۔

[۲] احجی، کا اصل مادّہ حجا ہے یعنی عقل لہٰذا، احجی، یعنی زیادہ عقل مندی کے معنیٰ میں آتا ہے۔

[۳] قذی، یعنی آلودگی اور خس و خاشاک۔

[۴] شجی، یعنی ''غم و اندوہ'' شدت اور رنج نیز حلق میں پھنس جانے والی ہڈی کے معنی میں استعمال ہوتا ہے۔

https://downloadshiabooks.com/

میں ''امام الکلام'' حضرت علی علیہ السلام نے بیان کر دیا ہے:

''اَرٰی تُرَاثِیْ نَهْبًا''

''رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی میراث کو تاراج کیا جا رہا تھا اور میں حیرت زدہ تھا کہ آنکھوں کو یقین نہیں آتا تھا اور میرا حلق اتنا خشک تھا کہ آواز نے ساتھ چھوڑ دیا تھا۔''

تاریخی نکات

ا۔ امام علی علیہ السلام نے صبر کو کیوں ترجیح دی؟

تاریخ گواہ ہے کہ منافقین اور اسلام کے دشمن، لحہ بہ لحہ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے وصال کا انتظار کر رہے تھے، اُن میں سے ایک گروہ کا خیال یہ تھا کہ رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی رحلت کے بعد مسلمانوں کی وحدت ٹوٹ جائے گی۔ ایسے حالات پیدا ہوں گے کہ اسلامی انقلاب کے خلاف بغاوت ممکن ہو سکے گی، اور پھر اسلام کے نوخیز پودے کو جڑوں سے اکھاڑ پھینکیں گے، اب ایسے حالات میں اگر حضرت علی مرتضیٰ علیہ السلام اپنا حق لینے کے لیے یا دوسرے الفاظ میں عالم اسلام کو پیغمبر اسلامؐ کے زمانے کے اصل اسلام کی جانب پلٹا دینے کے لیے قیام کرتے اور اس بات کو مدنظر رکھتے ہوئے کہ پہلے سے اس بات کا منصوبہ تیار کر لیا گیا تھا کہ حضرت علی علیہ السلام کو خلافت کے سلسلے میں منظر عام سے ہٹا دیا جائے، تو پھر یقیناً اس اختلاف کے نتیجے میں ٹکراؤ وجود میں آتا اور پورے اسلامی معاشرے کی عام فضا آلودہ ہوتی اور پھر بحرانی حالات میں منافقوں اور دشمنوں کو اپنی شیطانی نیتوں کو عملی جامہ پہنانے کا سنہرا موقع ہاتھ آجاتا، اس بات کا بہترین ثبوت، رسولِ اکرمؐ کی رحلت (شہادت) کے فوراً بعد ''اہلِ ردّہ'' کے نام سے مختلف گروہوں کا اسلامی حکومت کے مقابلے میں قیام کرنا اور مسلمانوں کی وحدت کی وجہ سے ان گروہوں کا سرکوب ہو جانا ہے۔ جیسا کہ تاریخ اسلام کی معروف کتابوں میں آیا ہے:

''لَمَّا تُوُفِّیَ رَسُوْلُ اللهِ(صَلَّی اللهُ عَلَیْهِ وَآلِهٖ) اِرْتَدَّتِ الْعَرَبُ وَ اشْرَاَبَّتِ الْیَهُوْدِیَّةُ وَ النَّصْرَانِیَّةُ وَنَجَمَ النِّفَاقُ وَصَارَ الْمُسْلِمُوْنَ کَالْغَنَمِ الْمَطِیْرَةِ فِی اللَّیْلَةِ الشَّاتِیَةِ''[1]

''جس وقت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی وفات ہوئی، عرب دین سے مرتد ہو گئے (اور جاہلیت کے رسم و رواج کی جانب پلٹنے لگے)، یہود و نصاریٰ نے سر اُٹھانا شروع کر دیا اور منافق نمایاں ہو گئے، بلکہ علی الاعلان میدان میں کود پڑے، جبکہ

[1] سیرۂ ابن ہشام، جلد ۴، صفحہ ۳۱۶

https://downloadshiabooks.com/

مسلمانوں کی ایسی حالت تھی جیسے مویشیوں کا گلّہ جو بغیر چرواہے کے ہے، سردیوں کی تاریک رات ہے، آسمان سے پانی برس رہا ہے اور بیابان وجنگل میں یہ راستہ بھٹک چکے ہیں۔''

یہ پورے قصّے کا ایک رخ ہے جبکہ دوسرا رخ یہ ہے کہ یار و یاور نہ ہونے کے باوجود امام علی علیہ السلام قیام کرتے تو کامیابی کے امکانات کم تھے اور اگر قیام کرتے بھی تو بہت سے نادان لوگ اس قیام کو فریضۂ الٰہی کے بجائے ذاتی مفادات کی جنگ سمجھتے۔

خلافت کا اپنے اصل محور اور مرکز سے ہٹ جانا، اسلام کے لیے ایک ایسا دھچکا تھا جس کی وجہ سے پہنچنے والے نقصانات کو شمار کرنا ہی بڑا مشکل کام ہے اور روز بروز بڑھتی ہوئی مشکلات ہی تھیں۔ اور یہی وہ چیز تھی کہ مولا علی علیہ السلام نے فرمایا:
''خار اور خاشاک سے آنکھیں زخمی ہیں اور حلق میں ایسی ہڈی اٹکی ہوئی ہے کہ جو نہ تو نگلی جاسکتی ہے اور نہ اُگلی جاسکتی ہے''۔

اب تک کی بحث سے ہم یہ بنیادی اصول سیکھتے ہیں کہ جب کبھی آپ اپنے حق کے لیے قیام کریں، احتجاج برپا کریں اور آپ کا یہ آواز بلند کرنا دین کی بنیادوں کو ہلانے کا باعث بننے جارہا ہو تو وہاں آپ اپنے حق کو ترک کرکے ''اصل دین'' کی حفاظت کا بیڑا اُٹھالیں اور ''اصول دین'' کو اپنی زندگی کا ہم وغم بنالیں، نیز کسی بھی صورت میں صبر کا دامن ہاتھ سے نہ چھوڑیں۔

اس سے ملتی جلتی بات خطبہ ۲۶، نہج البلاغہ میں بھی موجود ہے، فرماتے ہیں:

''فَنَظَرْتُ فَإِذَا لَيْسَ لِي مُعِينٌ إِلَّا أَهْلَ بَيْتِي... وَ أَغْضَيْتُ عَلَى الْقَذَى وَ شَرِبْتُ عَلَى الشَّجَى''

''میں نے غور کیا تو دیکھا کہ اس حق (خلافت وولایت) کو حاصل کرنے کے لیے اگر کوئی میرا ساتھ دینے والا ہے تو وہ صرف میرا اپنا خاندان ہے۔ میں نے انہیں موت کے منہ میں دینے سے بخل کیا۔ آنکھوں میں خس وخاشاک تھا، مگر میں نے چشم پوشی کی، حلق میں گویا ہڈی تھی، مگر میں نے غم وغصے کے گھونٹ پی لیے اور تلخ حالات پر صبر کیا۔''

۲۔ خلافت کو ''میراث'' کا نام کیوں دیا گیا؟

مذکورہ بالا عبارات میں ہم نے پڑھا کہ امام علیؑ فرمارہے ہیں:
''میں دیکھتا رہا اور میری نظروں کے سامنے میری میراث کو غارت کردیا گیا۔''

یہاں سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ خلافت کو ''میراث'' کیوں کہا جارہا ہے؟

جواب یہ ہے کہ دراصل خلافت ایک خدائی اور معنوی (روحانی) میراث ہے، جو پیغمبر اسلامؐ سے اُن کے معصوم

https://downloadshiabooks.com/

جانشینوں تک پہنچتی ہے اور اس سے کوئی ذاتی، مادّی نیز ظاہری حکومت کی گدّی مراد نہیں۔ اس مضمون کی حامل قرآن کی آیات بھی موجود ہیں جیسا کہ حضرت زکریا ؑ نے خدا سے ایک فرزند کی درخواست کی، جو اُن کا وارث اور خاندانِ حضرت یعقوب ؑ کا وارث بن سکے اور نبوت کا وارث جو خلق خدا کی پیشوائی کا حق ادا کر سکے:

"فَهَبْ لِي مِن لَّدُنكَ وَلِيًّا يَرِثُنِي وَيَرِثُ مِنْ آلِ يَعْقُوبَ" [۱]

''اے خدا! اپنے پاس سے مجھے ایک ولی عہد اور جانشین عطا فرما جو میرا اور خاندانِ حضرت یعقوب ؑ کا وارث بن سکے۔''

حقیقت تو یہ ہے کہ یہ میراث پوری اُمّت سے تعلق رکھتی ہے، لیکن اسے رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے جانشین اور (معصوم) امام ؑ کے سپرد کیا گیا ہے۔ آسمانی کتب کے بارے میں ہم پڑھتے ہیں:

"ثُمَّ أَوْرَثْنَا الْكِتَابَ الَّذِينَ اصْطَفَيْنَا مِنْ عِبَادِنَا"

''اور پھر ہم نے اپنے بندوں میں سے جن کو منتخب کیا تھا، انھیں (آسمانی) کتاب ورثے میں عطا فرمائی۔'' [۲]

اور اسی انداز میں، رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی معروف حدیث میں بیان ہوا ہے:

"اَلْعُلَمَاءُ وَرَثَةُ الْأَنْبِيَاءِ"

''صاحبانِ علم و دانش، انبیاء ؑ کے وارث ہیں۔'' [۳]

اس حقیقت کا ایک زندہ ثبوت ظاہری حیاتِ حضرت علی علیہ السلام کی منہ بولتی تاریخ ہے۔ آپ ؑ نے گفتار و کردار دونوں لحاظ سے ثابت کر دکھایا کہ نہ تو مال و دولت میں کوئی دلچسپی ہے اور نہ مقام، عہدہ اور خلافت، یعنی ایسی خلافت جس کا خدا کی شریعت سے کوئی تعلق نہ ہو اور صرف دنیاوی اقتدار ہو تو اُس کی اہمیت امام علی ؑ کی نظر میں ایک پرانی اور پھٹی ہوئی نعلین یا بکری کی چھینک سے باہر آنے والے مادّے سے بھی کم تھی، تو پھر کیسے ممکن تھا کہ خلافت ہاتھ سے جانے کی وجہ سے آپ بطور شکایت یہ فرمائیں کہ ''آنکھیں گویا خس و خاشاک سے پُر تھیں اور حلق میں ہڈی اٹک گئی تھی۔''

بعض افراد کا خیال ہے کہ ''لٹی ہوئی میراث'' سے مراد ''فدک'' ہے کہ جسے رسولِ خدا ؐ نے اپنی اکلوتی بیٹی حضرت زہرا سلام اللہ علیہا کو عطا فرمایا تھا اور کیونکہ زوجہ کا مال شوہر کے مال کا حکم بھی رکھتا ہے لہٰذا حضرت علی ؑ نے یہ الفاظ استعمال کیے ہیں۔

---

[۱] سورۂ مریم: آیات ۵، ۶

[۲] سورۂ فاطر: آیت ۳۲

[۳] اصول کافی: جلد ۱، ص ۳۲، ۳۴

https://downloadshiabooks.com/

[1] لیکن یہ خیال بہت ضعیف ہے، کیونکہ یہ پورا خطبہ مسئلہ خلافت کے گرد گھوم رہا ہے اور یہ جملہ بھی اُسی موضوع کی جانب ایک اہم اشارہ ہے۔

۳۔ حضرت امام علیؑ اور گوشہ نشینی

حضرت علی علیہ السلام کو گھر میں گوشہ نشینی اختیار کرنے پر مجبور کیے جانے کا کتنا بڑا نقصان عالم اسلام کو پہنچا ہے۔ صرف علمی لحاظ سے کتنا نقصان ہوا، اس کا اندازہ اس وقت کیا جا سکتا ہے جب ہم نہج البلاغہ کے خطبات، آپ کے اپنے عاملوں کو لکھے ہوئے فرامین اور کلمات قصار کا مطالعہ کرتے ہیں جو حضرتؑ نے اپنے مختصر دورِ خلافت میں دیے جبکہ یہ مختصر سا عرصہ بھی حوادث، مسلسل جنگوں اور دردناک واقعات سے بھرا ہوا تھا۔ غور کیجیے کہ اگر ان ۲۵ برسوں میں بھی جو امامؑ نے گوشہ نشینی میں گزارے، امام علیہ السلام کو امت کی رشد و ہدایت کا موقع ملتا اور علم و دانش کے متلاشی اس علم کے خزینے سے استفادہ کر سکتے تو کتنے عظیم علمی خزینے نہ صرف مسلمانوں بلکہ عالم انسانیت کے لیے یادگار رہ جاتے۔ لیکن کیا کیا جا سکتا ہے کہ اس فیضِ عظیم کو مسلمانوں اور انسانیت سے چھین لیا گیا اور اتنا بڑا نقصان جو کبھی پورا نہیں کیا جا سکتا، وہ تاریخ میں باقی رہ گیا۔

۴۔ امام المتقینؑ نے خلافت کے مسئلے کو کیوں اٹھایا؟

بعض لوگوں کا نظریہ تھا کہ بہتر یہ ہے کہ حضرت علیؑ خلافت کے مسئلے کو کبھی نہیں چھیڑتے، کیونکہ وہ مسئلہ ماضی سے متعلق تھا۔ لہٰذا اس کو بُھلا دینا چاہیے تھا، کہیں ایسا نہ ہو کہ مسلمانوں کے درمیان اختلافات مزید بڑھ جائیں؟ آج بھی بعض گروہ یہ سوچ رکھتے ہیں اور جیسے ہی حضرت علیؑ کی خلافتِ بلافصل کی بات آتی ہے تو کہتے ہیں کہ خاموشی اختیار کیجیے تاکہ مسلمانوں کی وحدت کو نقصان نہ پہنچے۔

آج ہمیں ایسے موضوعات کو بُھلا دینا چاہیے، ہمارا دشمن بہت طاقتور ہے اور ماضی کے مسائل کو زیر بحث لانے سے مشترک دشمن کے ساتھ مقابلہ کمزور پڑ جائے گا اور ہمارا دشمن مزید شیر ہوگا۔ اصولی بات یہ ہے کہ ایسے موضوعات پر بحث و گفتگو کا فائدہ ہی کیا ہے؟ اور پھر ہر مذہب کے ماننے والے اپنے طے شدہ راستوں پر گامزن ہیں۔ بہت بعید ہے کہ ایسی بحث و گفتگو کسی نئی وحدت کا باعث بنے۔ اس سوال کے جواب میں ضروری ہے کہ دو نکات کو مدنظر رکھا جائے:

الف: موجودہ حقائق کو نظر انداز کر دینے سے حقیقت تبدیل نہیں ہوتی اور نہ ہی اُس کو بُھلایا جا سکتا ہے۔ یہ ایک

---

[1] منہاج البراعۃ (شرح نہج البلاغہ) جلد ۳، ص ۴۵

https://downloadshiabooks.com/

روشن حقیقت ہے کہ رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے حضرت علیؑ کی جانشینی کی تاکید کی تھی۔ نیز خلافت کے لیے حضرت علی علیہ السلام سے زیادہ کوئی اہلیت نہیں رکھتا تھا۔ اب کون سے ایسے حالات پیش آئے اور کیونکر یہ تبدیلی رونما ہوئی، یہ بالکل ایک الگ بات ہے۔

اُدھر حضرت علی علیہ السلام جو ہر موقع پر حق کے طرفدار ہیں اور ہر اس چیز سے مقابلہ کرتے ہیں جو حقیقت سے تعلق نہیں رکھتی۔ آپؑ حق بجانب ہیں کہ رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بعد خلافت سے مربوط حقائق کو واضح کریں تاکہ صدیوں اور ہزاروں سال بعد کے محققین انصاف سے کام لیں۔ اگر کوئی حقائق سے کام لے تو وہ یقیناً صراطِ مستقیم پر گامزن ہو سکے گا۔

بہرحال کسی کو حقیقت بیان کرنے سے روکا نہیں جا سکتا اور اگر فرض کر لیا جائے کہ روکنا ہمارے لیے ممکن بھی ہو تو ہمیں ہرگز اس بات کا حق نہیں، کیونکہ یہ ایک بہت بڑے نقصان کا باعث بنے گا اور پھر ہمارے اردگرد جو کچھ ہو رہا ہوتا ہے اور جو کچھ ہونا چاہیے، اُن دونوں میں اکثر مطابقت نہیں پائی جاتی اور کبھی تو ان دونوں میں بہت زیادہ فاصلہ ہوتا ہے۔

عام طور سے جو کچھ ہوا کرتا ہے، ہمیشہ اس کا مطلب یہ نہیں ہوتا کہ یہ وہی کچھ ہے جو ہونا چاہیے، بلکہ اسلام تو ہم کو یہ اصولِ گفتار و کردار دے رہا ہے کہ انسان کو ہمیشہ اُس چیز کے لیے سرگرمِ عمل رہنا چاہیے جو کہ ہر مسئلے میں واقعاً ہونا چاہیے۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ پیغمبر اسلامؐ کے بعد خلافت اور امامت کا موضوع، دینی مباحثوں کا ایک نہایت اہم اور بنیادی موضوع رہا ہے۔ اب چاہے اُسے اصولِ دین کا حصّہ سمجھا جائے، جیسا کہ مکتبِ اہلِ بیت علیہم السلام کی پیروی کرنے والے اس بات کے قائل ہیں یا اس موضوع کو فروعِ دین کا حصّہ سمجھ لیا جائے، جو کچھ بھی سمجھیے، لیکن یہ مسئلۂ خلافت ایک تاریخ ساز موضوع ہے۔ یہ کوئی ذاتی مسئلہ نہیں اور نہ ہی عمومی تاریخ کا ایک معمولی واقعہ ہے، جس کا تعلق ماضی سے ہے، جیسا کہ بعض حقیقت سے ناآگاہ لوگ ایسا سوچتے اور سمجھتے ہیں، بلکہ نسل در نسل اصول اور فروع سے مربوط مسائل پر اثر رکھتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ حضرت علی علیہ السلام نے اپنے دورِ خلافت میں بار بار اس موضوع کو بیان کیا۔

ب: مسلمانوں کی وحدت اور اُن کی صفوں کو درہم برہم کرنے والی جو چیز ہے، وہ تعصب آمیز مسائل کو ہوا دینا، فتنہ انگیزی اور خلافِ حقیقت چیزوں کی بے جا حمایت نیز جارحانہ روّیہ اختیار کرنا ہے، لیکن اگر دو مخالف نظریوں اور مسالک کے افراد علمی اور منطقی انداز میں اصول اور آدابِ گفتگو کا خیال رکھتے ہوئے تبادلۂ خیال کریں تو ایسی گفتگو اور بحث و مباحثہ نہ صرف یہ کہ وحدتِ مسلمین کے لیے نقصان دہ نہیں ہے، بلکہ بہت سے موقعوں پر ایسی گفتگو باہمی غلط فہمیوں کو دور کرتی اور قلبی کدورت کے صاف ہونے کا باعث بنتی ہے۔

یہ کوئی خیالی اور ذہن کی گڑھی ہوئی بات نہیں ہے، کیونکہ ہم نے تجربہ کر کے اس بات کو آزمایا ہے۔ ایران کے ایک صوبے میں ہفتۂ وحدت کی مناسبت سے ایک کانفرنس میں شیعہ اور سُنی صاحبانِ علم و دانش کا ایک اجتماع ہوا۔ ان علماء کے

https://downloadshiabooks.com/

درمیان علمی لحاظ سے، شیعہ وسنّی کے اہم اختلافی موضوعات پر گفت وشنید ہوئی، جس کا نتیجہ قابلِ قدر اور قابلِ ستائش تھا۔

اس لیے کہ زیادہ تر موضوعات میں نتیجہ یہ نکلا کہ شیعہ اور سنّی نظریات بہت حد تک ایک دوسرے کے نزدیک ہیں اور اختلافات بہت کم ہیں۔ سب کو یقین ہو گیا کہ اگر اس انداز میں ایسی بحث اور گفتگو جاری رہے تو مسلمانوں کے یہ دو اہم ستون شایانِ شان حد تک اپنے اختلافات کو جڑوں سے اُکھاڑ پھینکیں گے؛ ''وحدتِ مسلمین'' کو چار چاند لگیں گے نیز اُن کی صفوں میں مزید نظم وضبط میں اضافہ ہوگا۔[۱] یہاں تک کہ آسمانی ادیان کے پیروکاروں کے درمیان بھی موجود اختلافات کو اسی اسلوب اور انداز کو بروئے کار لاتے ہوئے مکمل طور پر دور کیا جاسکتا ہے یا کم ضرور کیا جاسکتا ہے اور جو لوگ اس طرح کی بحث اور بات چیت کے مخالف ہیں، درحقیقت نادانی میں اختلافات کو ہوا دیتے ہیں اور فاصلے مزید بڑھ جاتے ہیں۔

دوسرا حصہ

حَتّٰی مَضَی الْاَوَّلُ لِسَبِیْلِهٖ فَاَدْلٰی بِهَا اِلٰی فُلَانٍ بَعْدَهٗ. ثُمَّ تَمَثَّلَ بِقَوْلِ الْاَعْشٰی:

شَتَّانَ مَا یَوْمِیْ عَلٰی کُوْرِهَا   وَیَوْمُ حَیَّانَ اَخِیْ جَابِرِ

فَیَا عَجَبًا بَیْنَا هُوَ یَسْتَقِیْلُهَا فِیْ حَیَاتِهٖ اِذْ عَقَدَهَا لِاٰخَرَ بَعْدَ وَفَاتِهٖ لَشَدَّ مَا تَشَطَّرَا ضَرْعَیْهَا فَصَیَّرَهَا فِیْ حَوْزَةٍ خَشْنَاءَ یَغْلُظُ کَلْمُهَا وَ یَخْشُنُ مَسُّهَا وَ یَکْثُرُ الْعِثَارُ فِیْهَا وَ الْاِعْتِذَارُ مِنْهَا فَصَاحِبُهَا کَرَاکِبِ الصَّعْبَةِ اِنْ اَشْنَقَ لَهَا خَرَمَ وَ اِنْ اَسْلَسَ لَهَا تَقَحَّمَ فَمُنِیَ النَّاسُ لَعَمْرُ اللّٰهِ بِخَبْطٍ وَ شِمَاسٍ وَ تَلَوُّنٍ وَ اعْتِرَاضٍ فَصَبَرْتُ عَلٰی طُوْلِ الْمُدَّةِ وَ شِدَّةِ الْمِحْنَةِ.

''یہاں تک کہ پہلا شخص اپنے راستے پر روانہ ہو گیا اور اس نے اپنے بعد خلافت اس شخص کو تحفے کے طور پر دے دی۔'' یہاں امامؑ نے مثال کے طور پر اعشی کا شعر پڑھا'' کتنا فرق ہے کل اور آج میں، کل میں بھائی کے ساتھ خوش وخرم تھا اور آج سختیوں اور مصائب میں گھرا ہوا ہوں۔ (رسالتمآب صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے دور میں میرا اتنا احترام کیا جاتا تھا کہ تمام لوگوں سے زیادہ مجھے رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی صحبت کا اعزاز نصیب تھا لیکن آج لوگوں نے مجھے اس حد تک نظرانداز کر دیا کہ خلافت تک کو مجھ سے پوچھے بغیر ایک دوسرے کو سونپ رہے ہیں۔)

حیرت انگیز بات تو یہ ہے کہ وہ اپنی زندگی میں، جس چیز سے لوگوں سے معذرت کر رہا تھا اور درخواست کر رہا تھا کہ

---

[۱] ان نشستوں (کانفرنس) میں زیر بحث آنے والے اہم موضوعات اور باہمی اتفاق کے بارے میں مکمل آگاہی حاصل کرنے کے لیے ''مجلہ پیامِ حوزہ، پیش شمارہ (نمبر شروع ہونے سے پہلے)'' کو دیکھیے۔

https://downloadshiabooks.com/

اسے اس کام (خلافت) سے الگ کر دیا جائے، اسی کو مرتے وقت دوسرے کے لیے طے کر گیا۔ بیشک دونوں نے مل کر شدت سے اس کے تھنوں کو دوہا ہے اور اب ایک ایسی درشت اور سخت منزل میں رکھ دیا ہے، جس کے زخم کاری ہیں اور جس کو چھونے سے بھی سختی کا احساس ہوتا ہے۔ لغزشوں کی کثرت ہے اور معذرتوں کی بہتات! اس کو برداشت کرنے والا ایسا ہی ہے، جیسے سر کش اونٹنی کا سوار کہ مہار کھینچ لے تو ناک زخمی ہو جائے اور ڈھیل دیدے تو ہلاکتوں میں کود پڑے۔ تو خدا کی قسم! لوگ ایک کجروی، سرکشی، تلوّن مزاجی اور بے راہ روی میں مبتلا ہو گئے ہیں اور میں نے بھی سخت حالات میں طویل مدت تک صبر کیا۔''

شرح وتفسیر

خلیفۂ دوّم کا دور

حضرت امام علی علیہ السلام اس خطبے کے دوسرے حصے میں خلیفۂ دوّم کے دور کا تذکرہ کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

''حَتّٰی مَضَی الْاَوَّلُ لِسَبِیْلِهٖ'' حالات اسی طرح گزرتے گئے یہاں تک کہ پہلا فرد اپنی منزل کو سدھارا (دنیا سے کُوچ کر گیا) اسی راستے پر جس راستے پر سب کو جانا ہے۔[1]

پھر مزید اضافہ فرماتے ہیں:

''فَاَدْلٰی بِهَا اِلٰی فُلَانٍ بَعْدَهٗ''

''اُس نے اپنے بعد خلافت کو اُس شخص (یعنی خلیفۂ ثانی) کو تحفے کے طور پر دے دیا۔''

''اَدْلٰی'' (دَلو) کے مادّے سے بنا ہے۔ جس طرح سے کنویں سے پانی نکالنے کے لیے بالٹی اور رسّی کو استعمال کیا جاتا ہے، اسی طرح عربی کا یہ لفظ (دَلو) وہاں استعمال ہوتا ہے جہاں کسی کو (انعام) اجرت یا رشوت دینے کی بات ہو، جیسا کہ قرآن میں ارشاد ہوا: ''وَتُدْلُوْا بِهَا اِلَی الْحُكَّامِ''۔[2] اس مقام پر پہنچ کر ''ابن ابی الحدید معتزلی'' کہتا ہے:

خلیفۂ دوّم کی خلافت دراصل اُن کو خلیفۂ اوّل کا تحفہ تھا، یہ اُن کاموں کے بدلے میں انعام تھا، جو خلیفۂ دوّم نے خلیفۂ اوّل کے لیے انجام دیے تھے، یہ خلیفۂ دوّم ہی تھے جنھوں نے خلیفۂ اوّل کی خلافت کی بنیاد کو مضبوط اور مستحکم کیا تھا اور

[1] سن ۱۳ ہجری قمری میں، تقریباً ۲ سال اور ۳ ماہ (دورانِ خلافت خلیفۂ اوّل، ماہ جمادی الثانی میں دنیا سے کُوچ کر گئے۔ (تاریخ مروّج الذّہب، مصنّف: مسعودی: جلد ۲، ص ۳۰۴، طباعت چہارم)

[2] سورۂ بقرہ: آیت ۱۸۸

https://downloadshiabooks.com/

اُن کے مخالفین کو نیچا دکھایا تھا۔ زبیر کی تلوار کو توڑنے والے، مقدادؓ کو پیچھے ہٹانے والے، اور سقیفہ میں سعد بن عبادہ کو زدوکوب کرتے ہوئے یہ بات کہنے والے کہ سعد کو قتل کر دو۔ خدا اسے قتل کرے، خلیفۂ دوّم کے کام تھے، جب حباب بن منذر نے سقیفہ کے واقعے کے دن یہ بات کہی، خلافت کے بارے میں اچھا خاصہ تجربہ اور آگاہی میرے پاس ہے، تو خلیفۂ دوّم نے اُس کی ناک پر ایک تھپڑ رسید کیا اور اُسے خاموش کرا دیا۔

خاندانِ ہاشم سے جن لوگوں نے حضرت فاطمہؑ کے گھر میں پناہ لے رکھی تھی، اُنھیں خلیفۂ دوّم نے ڈرا دھمکا کر، وہاں سے باہر نکالا، یہاں تک کہ ابن ابی الحدید لکھتا ہے:

"وَلَوْلَاهُ لَمْ يَثْبُتْ لِأَبِي بَكْرٍ أَمْرٌ وَلَا قَامَتْ لَهُ قَائِمَةٌ"

"اگر وہ (خلیفۂ دوّم) نہ ہوتے تو حضرت ابوبکر کا کوئی کام بھی نہ بنتا اور ان کی خلافت کا کوئی ستون اپنی جگہ نہ ہوتا۔"[۱] اس اس کے بعد امام الکلام حضرت علی علیہ السلام عرب کے مشہور شاعر "اعشیٰ" کے ایک شعر کو بطور مثال بیان فرماتے ہیں:[۲]

شَتَّانَ مَا يَوْمِي عَلَى كُورِهَا ۔۔۔ وَيَوْمَ حَيَّانَ أَخِي جَابِرِ

آج میں دل گرفتہ ہوں گھر میں ۔۔۔ کل تھا خوش صحبتِ برادر میں

حضرت امام علی علیہ السلام اس مثال سے یہ بات سمجھانا چاہ رہے ہیں کہ رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے زمانے میں، میں اتنا زیادہ قابلِ احترام تھا کہ جتنا میں خدا کے حبیبؐ سے قریب تھا، کوئی دوسرا اتنا قریب نہ تھا، بلکہ (جیسا کہ خود خدا کے رسولؐ نے فرمایا تھا) میں تو "نفسِ رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم" تھا (یعنی جیسا کہ رسولؐ نے فرمایا تھا کہ اے علیؑ! میں اور تم اس اُمّت کے باپ ہیں) لیکن رسولؐ کے بعد مجھے پیچھے کر دیا گیا اور بالکل تنہا چھوڑ دیا گیا۔

---

[۱] شرح نہج البلاغہ ابن ابی الحدید: جلد ۱، ص ۱۷۴

[۲] اعشیٰ، زمانۂ جاہلیت کا مشہور شاعر ہے، "یونس نحوی" سے سوال کیا گیا سب سے بہترین اور برتر شاعر کون ہے؟ تو "یونس" نے جواب دیا، میں کسی خاص فرد کو معین نہیں کر سکتا لیکن ہر شاعر کو اُس کی خاص صفات میں با کمال سمجھا جا سکتا ہے۔ میرا کہنا یہ ہے، بہترین شاعر "امراءُ القیس" ہے جبکہ وہ سوار ہو، اور بہترین شاعر "نابغہ" ہے جبکہ وہ خوف کی حالت میں ہو، اور بہترین شاعر "زہیر" ہے جبکہ وہ کسی چیز سے دل لگا لے، اور بہترین شاعر "اعشیٰ" ہے، جس وقت وہ مستی (طرب) کی حالت میں ہو۔ جب اسلام کا ظہور ہوا تو "اعشیٰ" زندہ تھا لیکن اُسے اسلام قبول کرنے کی توفیق نہیں ہوئی۔ اس کی نظر کمزور تھی لہٰذا اس کو "اعشیٰ" کا نام دے دیا گیا، عمر کے آخری حصّے میں وہ مکمل نابینا ہو گیا تھا۔ اس کا اصلی نام "میمون بن قیس" تھا۔ مذکورہ بالا شعر میں اس زمانے کی طرف اشارہ ہے کہ جب "اعشیٰ"، "جابر" کے بھائی "حیان" کا ہم نشین تھا۔ "جابر کو" یمامہ" کے بڑوں اور بزرگ شخصیتوں میں شمار کیا جاتا تھا جبکہ "اعشیٰ" کو ایسے بڑے لوگوں کی ہم نشینی حاصل تھی یعنی اعشیٰ خود اُس وقت احترام اور نعمتوں کی فراوانی میں مست تھا اور پھر وہ اپنی اس پُرسکون زندگی کا موازنہ اپنی مکّے اور مدینے کے بیابانوں کی زندگی سے کرتا ہے کہ جب اُسے اپنی چھوٹی چھوٹی ضروریات کو پورا کرنے کے لیے، اونٹ پر سوار ہونا پڑتا تھا اور صحرا کی خاک چھاننی پڑتی تھی، لہٰذا وہ اپنی ان دو طرح کی زندگی کے بارے میں کہتا ہے "ایک یہ مشقّت آمیز زندگی کہاں اور ایک وہ پُرآسائش زندگی کہاں!!"

https://downloadshiabooks.com/

بعض افراد کا خیال ہے کہ مولائے کائناتؑ نے عربی شعر کی مثال سے یہ بات سمجھانا چاہی ہے کہ خلفائے ثلاثہ کے زمانے میں حالات پھر بھی پُرامن اور مشکلات کم تھیں، لیکن حضرت علیؑ کے زمانۂ خلافت میں، رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے زمانے سے زیادہ فاصلہ ہونے کی وجہ سے مشکلات بھی بڑھ چکی تھیں اور دوسری طرف سے دشمنوں اور منافقوں کی طرف سے جنگوں، سازشوں اور اختلافات کو ہوا دینے کا سلسلہ بھی شروع ہو گیا تھا۔ اس رائے کو اُس صورت میں صحیح مانا جاسکتا ہے کہ اگر ''اعشیٰ'' نے اپنے حالات کا ''حیان'' کے حالات کے ساتھ موازنہ کیا ہوتا۔ [1]

اور پھر ''امامِ جنّ وانس'' سب سے زیادہ جس بات پر تعجب کرتے ہیں، وہ یہ ہے کہ فرماتے ہیں:

"فَيَا عَجَبًا! بَيْنَا هُوَ يَسْتَقِيلُهَا فِي حَيَاتِهِ إِذْ عَقَدَهَا لِآخَرَ بَعْدَ وَفَاتِهِ"

''تعجب اور حیرت کی بات یہ ہے کہ جو شخص اپنی زندگی میں عوام الناس سے معذرت کا اظہار کرتا ہے اور خلافت سے کنارہ کشی چاہتا ہے، موت کے وقت ''خلافت کی مسند کو دلہن کی طرح سجا کر'' دوسرے کو بطور انعام پیش کر رہا ہے۔''

یہ کلام امامِ معصومؑ اُس مشہور حدیث کی طرف اشارہ ہے، جس میں حضرت ابوبکر نے اپنی خلافت کے آغاز میں لوگوں کو مخاطب کرتے ہوئے کہا:

"أَقِيلُونِي فَلَسْتُ بِخَيْرِكُمْ"

''مجھے خلافت سے معاف رکھو، میں تم لوگوں میں سے بہترین فرد نہیں ہوں۔''

بعض افراد نے خلیفۂ اوّل کے پہلے خطبے کو یوں نقل کیا ہے: "وَلِّيتُكُمْ وَلَسْتُ بِخَيْرِكُمْ" مجھے خلافت کے

---

[1] شرح نہج البلاغہ، مصنّف: ابن میثم بحرانیؒ: جلد ۱، صفحہ ۲۵۷

https://downloadshiabooks.com/

لیے منتخب کیا گیا ہے جبکہ میں تم سب سے بہتر (اور قابل) انسان نہیں ہوں۔ [1]

یہ روایت جس انداز اور جن الفاظ میں بھی بیان ہوئی ہو، لیکن ایک بات تو ہر زاویے سے ثابت ہو جاتی ہے کہ خلیفۂ اوّل، خلافت کے لیے بذاتِ خود تیار نہیں تھے یا بعض لوگوں کا اندازہ ہے کہ خلافت سے لاتعلقی اور بے نیازی تھی یا یہ کہ حضرت علیؑ کے ہوتے ہوئے اپنے آپ کو اس عہدے کے لیے شائستہ اور حقدار نہیں سمجھتے تھے۔ بہرحال اس میں سے کسی بھی رائے اور نظریئے کو صحیح مانیں، نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ ''خلیفۂ اوّل'' کی یہ گفتگو اور اُن کی زندگی کے آخری دنوں میں خلیفۂ دوّم کو اپنا جانشین معیّن کرنے کا عمل آپس میں کوئی مناسبت نہیں رکھتے۔

یہی وہ نکتہ ہے جس پر امام علیؑ حیران ہیں اور تعجب کا اظہار فرماتے ہیں کہ اگر خلیفۂ اوّل خلافت کے مسئلے میں کوئی دلچسپی نہیں رکھتے تھے تو یہ اچانک، عوام وخواص نیز پوری اُمّتِ مسلمہ سے مشورے کے بغیر اور اُن کی پسند و ناپسند جانے بغیر کیسے راتوں رات، آناً فاناً خلافت کے ایک شخص سے دوسرے تک منتقل ہونے کے سارے مراحل طے ہو گئے اور ''جنّ و بشر میں سے کسی کو کانوں کان خبر بھی نہ ہوئی۔'' (اور خلافت کے اعلان کے بعد عوام الناس کو بیعت کرنے کے لیے کہا گیا) اپنی گفتگو کے اس حصے کے آخر میں فرماتے ہیں: ''لَشَدَّ مَا تَشَطَّرَا ضَرْعَيْهَا''

'' کتنے اطمینان کے ساتھ ان دونوں نے باری باری خلافت سے فائدہ اُٹھایا اور اِس اونٹنی (خلافت) کے تھنوں

---

[1] یہ ایک ایسی حدیث ہے جو کثرت سے کتب شیعہ وسنّی دونوں میں نقل ہوئی ہے: ابنِ ابی الحدید نے اپنی شرحِ نہج البلاغہ میں دونوں الفاظ کے ساتھ اس حدیث کو بیان کیا ہے۔ (شرحِ نہج البلاغہ، ابنِ ابی الحدید: جلد ۱، صفحہ ۱۶۹)

''شیخ محمد عبدہٗ'' بزرگ مصری دانشور اپنی شرحِ نہج البلاغہ میں کہتے ہیں: بعض افراد نے روایت کی ہے کہ ''حضرت ابوبکر'' نے بیعت کے بعد کہا ''اَقِيْلُوْنِيْ فَلَسْتُ بِخَيْرِكُمْ'' ''مجھے معاف کرو میں تم سب سے بہتر نہیں ہوں''۔ لیکن اکثر دانشوروں نے اس روایت کو اس شکل میں قبول نہیں کیا ہے اور ان کا کہنا ہے، روایت یوں ہے ''وَلَّيْتُكُمْ وَلَسْتُ بِخَيْرِكُمْ'' ''مجھے تمہارا سرپرست بنایا گیا ہے جبکہ میں تم لوگوں سے بہتر نہیں ہوں''۔ شرحِ نہج البلاغہ: عبدہ، صفحہ ۸۶، اسی خطبے کے ضمن میں یہ ساری گفتگو موجود ہے۔

کتاب ''دُرّ بحر المناقب'' میں محدّث ''حنفی موصلی'' نے ''ابنِ حسنویہ'' سے، کتاب ''احقاق الحق'' کے حاشیوں میں، اس موضوع سے متعلق ایک تفصیلی حدیث بیان کی ہے، اس حدیث کے آخر میں تحریر ہے کہ حضرت ابوبکر نے کہا ''اَقِيْلُوْنِيْ فَلَسْتُ بِخَيْرِكُمْ وَ عَلِيٌّ فِيْكُمْ'' ''مجھے چھوڑو! کیونکہ میں تم میں سے بہترین شخص نہیں اور جبکہ علیؑ بھی تمہارے درمیان موجود ہیں۔ احقاق الحق: جلد ۸، صفحہ ۲۴۰۔

مشہور مورّخ ''طبری'' لکھتا ہے، بیعتِ ''سقیفہ'' کے بعد حضرت ابوبکر نے خطبہ دیا اور کہا: ''اَيُّهَا النَّاسُ فَاِنِّيْ قَدْ وُلِّيْتُ عَلَيْكُمْ وَلَسْتُ بِخَيْرِكُمْ'' اے لوگو! مجھے تم لوگوں کے لیے خلیفہ چنا گیا ہے، جبکہ میں تم لوگوں میں سے بہترین فرد نہیں ہوں۔ تاریخ طبری: جلد ۲، صفحہ ۴۵۰، طباعت، مؤسسہ علمی بیروت۔

''ابنِ قتیبہ دینوی'' اپنی کتاب ''الامامۃ والسیاسۃ'' میں نقل کرتا ہے کہ حضرت ابوبکر نے روتے ہوئے، لوگوں سے کہا ''لَا حَاجَةَ لِيْ فِيْ بَيْعَتِكُمْ اَقِيْلُوْنِيْ بَيْعَتِيْ'' ''مجھے تم لوگوں کی بیعت کی کوئی حاجت نہیں، میری بیعت کو واپس کردو۔ (الامامۃ والسیاسۃ۔ جلد ۱، صفحہ ۲۰)

https://downloadshiabooks.com/

سے اپنے اپنے حصے کے مطابق دودھ نکالا۔"

"ضَرۡعَ" سے مراد پستان (تھن) ہے اور "تَشَطَّرَا" شطر کے مادے سے ہے، جس کے معنی ہیں "کسی چیز کا کچھ حصّہ" یہ خوبصورت تشبیہ، پڑھنے اور سمجھنے والے کے ذہن کو بات کی گہرائی تک پہنچا دیتی ہے، اس تشبیہ کو وہاں استعمال کیا جاتا ہے، جہاں یہ بتانا مقصود ہو کہ "کچھ لوگ باری باری کسی چیز کو استعمال میں لاتے ہیں"۔ دراصل اُونٹنی کے چار تھن ہوتے ہیں: یہ جوڑی کی شکل میں دو آگے اور دو پیچھے ہوتے ہیں اور عام طور سے دودھ نکالتے وقت، دو دو تھنوں کو ایک ساتھ پکڑ کر دودھ نکالا جاتا ہے۔ کلامِ امامؑ میں "دو تھنوں" کا لفظ استعمال کیا گیا ہے جس کے لیے عربی میں "تَشَطَّرَا" کا لفظ آیا ہے یعنی اُن دو افراد خلیفۂ اوّل و دوّم میں سے ایک نے اپنے حصّے کو استعمال کیا اور بقیہ حصّہ دوسرے کے لیے چھوڑ دیا، بہر حال نتیجہ یہ سمجھ میں آتا ہے کہ یہ سب کچھ اتفاقی طور پر رونما نہیں ہوا، بلکہ پہلے سے سب کچھ طے شدہ تھا۔

ایک سوال کا جواب:

بعض افراد نے اس مقام پر بالکل وہی بات دوہرائی ہے، جو خلیفۂ اوّل کے بارے میں کہی گئی تھی کہ خلیفۂ اوّل لوگوں سے اپنی بیعت واپس لینا چاہتے تھے، کیونکہ وہ ان میں سے سب سے بہتر فرد نہیں تھے۔ اور یہی بات حضرت علی علیہ السلام نے اسی نہج البلاغہ میں قتل خلیفۂ سوّم کے بعد لوگوں سے یوں فرمائی ہے:

"دَعُوْنِیْ وَ الْتَمِسُوْا غَيْرِیْ وَ اِنْ تَرَكْتُمُوْنِیْ فَاَنَا كَاَحَدِكُمْ وَ لَعَلِّیْ اَسْمَعُكُمْ وَ اَطْوَعُكُمْ لِمَنْ وَلَّيْتُمُوْهُ اَمْرَكُمْ وَ اَنَا لَكُمْ وَزِيْرًا خَيْرٌ لَّكُمْ مِنِّیْ اَمِيْرًا"

"مجھے چھوڑ دو، کسی اور کو تلاش کرو، اگر مجھے چھوڑ دو گے تو میں بھی تم میں سے ایک ہو جاؤں گا، اور شاید میں تم سب سے زیادہ سننے والا، نیز اطاعت کرنے والا ہوں گا اُس فرد کا جس کا تم سب انتخاب کرو گے، میں تم لوگوں کا وزیر اور مشاور (مشورہ دینے والا) بن جاتا ہوں، یہ تم لوگوں کے لیے (اُس وقت کے لوگوں کے مزاج کے مطابق یہ بات ان کے لیے زیادہ بہتر تھی، اس سے بہتر ہے کہ میں تم لوگوں پر حاکم (امیر) یا تم لوگوں کا رہبر بن جاؤں۔"

یہاں پر ایک بات ابن ابی الحدید نے کہی ہے اور ایک بات ہماری بھی ہے، وہ کہتا ہے:

"شیعۂ امامیہ اس اعتراض کا جواب دیتے ہوئے کہتے ہیں کہ خلیفۂ اوّل کی گفتگو اور حضرت علی علیہ السلام کی گفتگو میں بڑا فرق ہے۔ خلیفۂ اوّل نے کہا کہ میں تم میں سے بہترین فرد نہیں ہوں لہٰذا خلافت کے لیے صلاحیت نہیں رکھتا، کیونکہ خلیفہ کو سب سے زیادہ صالح ہونا چاہیے، لیکن حضرت علیؑ نے ہرگز ایسی کوئی بات نہیں کہی، وہ نہیں چاہتے تھے کہ خلافت قبول کرنے کے

https://downloadshiabooks.com/

ذریعے، فتنہ انگیزی کرنے والوں کو بہانہ ملے اور وہ لوگ فتنہ برپا کریں۔"[1]

ابنِ ابی الحدید مزید اضافہ کرتے ہوئے کہتا ہے کہ یہ بات اُس صورت میں صحیح ہے کہ اگر افضلیت، امامت کی شرط مان لی جائے یعنی ممکن ہے کہ کوئی اس بات کا قائل ہو کہ ضروری نہیں کہ امامؑ افضل ہو۔

یہ ایسی بات ہے جو عقل و منطق سے بالکل عاری ہے اور اس کا اظہار بھی مضحکہ خیز ہے، لیکن ہم تو یہ کہتے ہیں کہ بات اس سے بھی کہیں آگے بڑھ گئی ہے۔ اگر اسی خطبہ ۹۲ پر کہ جس میں یہ استدلال کیا گیا ہے، ذرا غور کر لیجیے اور اُس میں جو جملے موجود ہیں، نیز جس قسم کی عبارات استعمال کی گئی ہیں، بالخصوص وہ جملے جو عربی قواعد اور قرائن کے مطابق حذف کر دیے گئے ہیں، ان کو بھی مدّ نظر رکھا جائے، تو کلامِ امامؑ کی دلیل واضح اور روشن تر ہو جائے گی۔

آپؑ پوری صراحت کے ساتھ فرماتے ہیں:

"فَاِنَّا مُسْتَقْبِلُوْنَ اَمْرًا لَّهٗ وُجُوْهٌ وَّاَلْوَانٌ لَا تَقُوْمُ لَهُ الْقُلُوْبُ وَلَا تَثْبُتُ عَلَيْهِ الْعُقُوْلُ"

(یہ جو میں کہہ رہا ہوں کہ مجھے چھوڑ دو اور کسی اور کو تلاش کرو، اس کی وجہ یہ ہے کہ) ہم ایسی حقیقت کا سامنا کرنے والے ہیں، جس کے مختلف چہرے ہوں گے اور مختلف پہلو ہوں گے، زندگی کے ان حقائق کو دیکھ کر نہ دلوں کو قرار ہوگا، نہ عقلوں کو استحکام ہوگا۔"

یہ اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بعد سے لے کر اب تک، اسلام کے احکام اور پیغمبر اسلامؐ کی دی گئی تعلیمات میں اتنی زیادہ تبدیلیاں رونما ہو چکی ہیں کہ کوئی چارہ نہیں، مگر یہ کہ میں انقلابی انداز میں حالات کی بہتری کے لیے ضروری اقدامات انجام دوں اور تمہارے مختلف گروہوں کی مخالفت مول لوں۔

پھر اضافہ فرماتے ہیں:

"وَاِنَّ الْاٰفَاقَ قَدْ اَغَامَتْ وَالْمَحَجَّةَ قَدْ تَنَكَّرَتْ"

"کیونکہ حقیقت کے چہرے کو سیاہ بادلوں نے ڈھانپ لیا تھا اور حق کا سیدھا راستہ دھندلا چکا تھا اور اسلام کا حُسن و جمال ناقابلِ پہچان ہو کر رہ گیا تھا۔"

اور اس کے بعد جو جملہ پوری صراحت کے ساتھ مولائے کائناتؑ نے فرمایا ہے، پورے کلام کی جان اس میں جھلک رہی ہے:

" وَاعْلَمُوْا اَنِّيْ اِنْ اَجَبْتُكُمْ رَكِبْتُ بِكُمْ مَا اَعْلَمُ وَلَمْ اُصْغِ اِلٰى قَوْلِ الْقَائِلِ وَعَتْبِ

[1] شرح نہج البلاغہ ابن ابی الحدید: جلد ۱، صفحہ ۱۶۹

https://downloadshiabooks.com/

الْعَاتِبِ"

''آپ لوگ جان لیجیے، اگر میں نے آپ لوگوں کی دعوت (خلیفہ بننے کے مطالبے) کو قبول کر لیا تو میں اپنے علم کے مطابق آپ لوگوں کے ساتھ برتاؤ کروں گا (ایک ان پڑھ انسان کی طرح نہیں) ایسا ہر گز نہیں کروں گا کہ سُنی سنائی باتوں پر کان دھروں اور بے بنیاد فیصلے کروں۔''

لہٰذا تم لوگ اچھی طرح سوچ سمجھ لو میں تم لوگوں کو کسی غلط فہمی میں نہیں رکھنا چاہتا ہوں؛ تم لوگوں کو میری بیعت کرنا بہت مہنگا پڑے گا؛ اگر تمہارے دل و دماغ راضی نہیں تو میرے علاوہ کسی اور کو تلاش کر لو۔ اس بات کا ثبوت بھی موجود ہے کہ حضرت علی علیہ السلام خلافت کے بارے میں افضلیت کو لازم اور واجب سمجھتے ہیں، جیسا کہ ایک دوسرے خطبے میں امامِ عدل و انصاف فرماتے ہیں:

"اَيُّهَا النَّاسُ اِنَّ اَحَقَّ النَّاسِ بِهٰذَا الْاَمْرِ اَقْوَاهُمْ عَلَيْهِ وَاَعْلَمُهُمْ بِاَمْرِ اللّٰهِ فِيْهِ"[1]

''اے لوگو! امامت اور خلافت کے لیے سب سے زیادہ مناسب اور لائق انسان وہ ہوتا ہے، جو اس ذمّے داری کو نبھانے میں اور تمام لوگوں سے ہر لحاظ سے باصلاحیت، ہوشیار اور سمجھدار نیز تجربہ کار ہو اور احکامِ خدا کو جاننے میں دیگر تمام انسانوں سے زیادہ عالم ہو۔''

(عالم، علم سے ہے یعنی قول و فعل اور ایمان میں اتنا سچا ہو کہ اُس سے زیادہ کوئی شخص خدا کے قریب نہ ہو) لہٰذا اگر عدل و انصاف کے ساتھ بات کو پرکھا جائے تو، حضرت علیؑ اور حضرت ابوبکر کے کلام کا آپس میں کوئی مقابلہ نہیں، عربی زبان کی اصطلاح کے مطابق یہ "قِيَاسٌ مَعَ الْفَارِقِ" ہے یعنی دو ایسی چیزوں کا آپس میں موازنہ کیا جاتا ہے، جن میں آپس میں کوئی برابری اور شباہت پائی جائے، لیکن یہاں ایسا کچھ نہیں، ان دونوں کلاموں کا قبلہ بھی مختلف ہے اور مقصد بھی متضاد ہے۔

ایک اور مقام پر ابن ابی الحدید، خلیفۂ اوّل کے کلام کی توجیہہ پیش کرتا ہے، ہم اس بات کو اُس کی توجیہ بیان کرنے کے ساتھ مکمل کر رہے ہیں۔ ابن ابی الحدید کہتا ہے:

''جو لوگ امامت کے بارے میں افضلیت کو شرط نہیں مانتے، ان کی نظر میں اس روایت پر کوئی اعتراض عائد نہیں ہوتا، بلکہ ایسے لوگ تو اس حدیث کو اپنے عقائد میں شمار کرتے ہیں کہ خلیفۂ اوّل نے کہا ہے کہ مجھے امامت کے لیے منتخب کیا گیا ہے جبکہ میں تم میں سب سے بہتر نہیں ہوں، اور جن لوگوں نے "اَقِيْلُوْنِي" کی روایت کو قبول کیا ہے، اُن کے مطابق یہ گفتگو سنجیدہ نہیں تھی، بلکہ اس بات سے خلیفۂ اوّل کا مقصد یہ تھا کہ لوگوں کو آزمائیں اور یہ بات معلوم کرنے کی کوشش کریں کہ

[1] نہج البلاغہ: خطبہ ۱۷۳

https://downloadshiabooks.com/

میرے بارے میں رائے عامّہ کیا ہے؟ کون میرا حمایتی ہے اور کون مخالف ہے، کون خیر خواہ ہے اور کون دشمن ہے۔"[1]

ایسی توجیہات کا بے بنیاد ہونا بھلا کس سے پوشیدہ ہے، کیونکہ کسی فرد کے اعتراف کو ہمیشہ اُس کے واقعی معنی کے آئینے میں سمجھنا چاہیے اور توجیہہ کو سمجھنے اور سمجھانے کے لیے واضح اور روشن قرینہ چاہیے، جو کہ اس مقام پر (خلیفۂ اوّل کے کلام میں) موجود نہیں ہے۔ دوسرے الفاظ میں یہ اعتراف ہر عدالت میں ایک اعتراف کے عنوان سے واقعی اور حقیقی اعتراف سمجھا جائے گا، اور اس کے بارے میں کسی بھی قسم کا کوئی عذر قابلِ قبول نہیں سمجھا جائے گا مگر یہ کہ کوئی واقعی اور واضح دلیل اور ثبوت ہو۔ اور اس کے بعد خلیفۂ دوّم کی شخصیت، اُن کی صفات اور خصوصیات نیز اُن کے زمانے کے حالات، مسائل اور ماحول کو بیان کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

"فَصَيَّرَهَا فِي حَوْزَةٍ[2] خَشْنَاءَ يَغْلُظُ كَلْمُهَا[3] وَ يَخْشُنُ مَسُّهَا يَكْثُرُ الْعِثَارُ[4] فِيهَا، وَ الْاِعْتِذَارُ مِنْهَا"

"اُس (خلیفۂ اوّل) نے ایسے فرد کے ہاتھ میں خلافت دی کہ جو سخت مزاج کا مالک تھا، سخت گیری کی فطرت تھی، بار بار غلطی کرنا اور بار بار معذرت چاہنا اُس کا رویّہ تھا۔"

عربی لفظ "حَوْزَةٍ" سے مراد یہ ہے کہ خلیفۂ دوّم کا پورا مزاج اور شخصیت دراصل چار صفات پر مشتمل ہے:

پہلی صفت: "يَغْلُظُ كَلْمُهَا" کے ذریعے بیان کی گئی ہے، جس کا مطلب یہ ہے کہ ایک ایسا انسان کہ جس کا مزاج یہ ہے کہ اگر کوئی اُس سے ملاقات کرے تو جسمانی اور روحانی لحاظ سے شدید مجروح ہو جاتا ہے۔

دوسری صفت: "وَ يَخْشُنُ مَسُّهَا" کے ذریعے بیان کی گئی ہے، یہی وجہ ہے کہ خلیفۂ دوّم کے بارے میں "حَوْزَةٍ خَشْنَاءَ" شدّت آمیز صفات کا مالک استعمال کی گئی ہے اور اس کے بعد دو جملوں میں اس کی تفسیر کی گئی ہے کہ "گفتگو میں انتہائی سختی اور برتاؤ میں انتہا پسندی پائی جاتی ہے۔

تیسری صفت: بار بار غلطیاں کرنا ہے جیسے "يَكْثُرُ الْعِثَارُ فِيهَا" کثرت سے غلطیاں کرنا اس کا مزاج

---

[1] شرح نہج البلاغہ، ابن ابی الحدید: جلد ۱ ص ۱۶۹

[2] حوزۃ، کا مطلب ہے کہ (حدودِ اربعہ)، علاقہ، دائرہ، اختیارات نیز "طبیعت اور مزاج" یہ حیازت کے مادّے سے لیا گیا ہے، جس کے معنی "جمع کرنا" اور "اخذ کرنا" ہیں۔

[3] کلم، یعنی "زخم اور صراحت" اور کلام کے معنی میں یہ اس لیے استعمال کیا گیا ہے کہ ہر کلام اپنے مدّمقابل پر گہرا اثر رکھتا ہے۔ کہا جاتا ہے کہ تلوار کا زخم بھر جاتا ہے لیکن زبان کا زخم کبھی نہیں بھرتا ہے۔

[4] عثار، یعنی لغزش، غلطی۔

https://downloadshiabooks.com/

تھا، یہ بیان کیا گیا ہے۔

چوتھی صفت: بار بار معذرت چاہنا ہے، جیسے "وَ الْاِعْتِذَارُ مِنْهَا" کثرت سے معذرت چاہنا بھی اُس کے مزاج کی مجبوری تھی۔

خلیفۂ دوّم کا کثرت سے غلطیاں کرنا خاص طور سے احکامِ اسلام بیان کرنے کے بارے میں ہے اور پھر معذرت چاہنا، تاریخ اسلام ان حقائق سے بھری ہوئی ہے، حتیٰ کہ اہلسنّت کے دانشور حضرات کی کثیر کتب اس موضوع پر دستیاب ہیں، ''نکات'' کے ضمن میں ان غلطیوں کا ذکر ہوگا۔ اِن شاءاللہ۔

اس کے بعد حضرت امام علی علیہ السلام اضافہ فرماتے ہیں:

"فَصَاحِبُهَا كَرَاكِبِ الصَّعْبَةِ[۱] اِنْ اَشْنَقَ[۲] لَهَا خَرَمَ[۳]، وَاِنْ اَسْلَسَ[۴] لَهَا تَقَحَّمَ"۔[۵]

''جس کسی کا خلیفۂ دوّم کے اس نظامِ خلافت سے کوئی واسطہ تھا تو اس کی مثال اُس شخص جیسی تھی جو ایک سرکش اونٹ پر سوار ہو، اگر وہ اُس کی مہار کو مضبوطی سے کھینچتا ہے تو اونٹ کی ناک کے نتھنے پھٹ جاتے ہیں اور اگر وہ اونٹ کی مہار کو ڈھیلا چھوڑ دے تو کسی جان لیوا گہری کھائی میں جا گرے گا اور یوں وہ خود اور جو لوگ اُس کے ساتھ ہیں، سب کو موت کے منہ میں دھکیل دیتا ہے۔''

امامِ دین وسیاست اس جملے میں، خلیفۂ دوّم کے زمانۂ خلافت میں اپنا اور مومنین کے ایک گروہ کا حال بیان کرتے ہوئے تشریح فرماتے ہیں، جیسا کہ خلیفہ کی گفتار اور کردار کے حوالے سے جو مزاج اور خصوصیات اوپر بیان کی جاچکی ہیں، ان کے مطابق، اگر کوئی خلیفہ سے مقابلے کے لیے کھڑا ہوتا تو اختلاف، لڑائی جھگڑا ہوتا اور عین ممکن تھا کہ مسلمانوں کے درمیان شگاف پڑ جاتا یا خلیفہ کی جانب سے کچھ نہ کچھ جوابی کارروائی یا خطرے، مخالفت کرنے والے کے لیے ضرور پیش آتے اور اگر، خاموشی اختیار کی جاتی اور اس طرح ہر چیز سے راضی ہونے اور مطمئن ہونے کا اظہار کیا جاتا تو پھر دوسری جانب سے اسلام اور

---

[۱] صعبۃ، یعنی سرکش انسان یا حیوان، اس لفظ کا عربی میں متضاد ذلول، ہوتا ہے یعنی رام اور سدھا یا ہوا ہونا (فرماں بردار) اور یہاں صعبۃ، سے مراد سرکش اُونٹ ہے۔

[۲] اشنق، یعنی اونٹ کی لگام کھینچنا اور اس سے ملتے جلتے معانی کے لیے استعمال ہوتا ہے اور، شناق، جو کتاب کے وزن پر ہے، ایسی رسّی کے لیے استعمال ہوتا ہے جس سے مشکیزے کا منہ باندھا جاتا ہے۔

[۳] خرم، خَرم کے مادّے سے بنا ہے، جس کا وزن نرم ہے اور اس کے معنی پھاڑنا اور شگافتہ کرنا ہیں۔

[۴] اَسلس، سَلَس کے مادّے سے ہے، اس کا وزن قفس ہے اور سلاسۃ کے معنی ہیں سہولت اور آسانی۔ اس لیے اَسلس کے معنی ہوتے ہیں، ''چھوڑ دیا اور مسئلے کو آسان اور معمولی سمجھا''۔

[۵] تَقَحَّمَ، قحوم کے مادّے سے لیا گیا ہے اس کا وزن شعور ہے اور معنی کسی کام یا مسئلے میں بغیر سوچے سمجھے کود پڑنا ہے۔

https://downloadshiabooks.com/

اسلامی خلافت پر بہت سے خطرے منڈلا رہے تھے۔

اُس وقت کا معاشرہ حقیقت میں تو ہمیشہ ان دو خطروں کے درمیان تھا۔ یہی وجہ ہے کہ بعد کے جملوں میں زمانہ شناس امامؑ اپنی بے قراری اور اُس زمانے کے لوگوں کی بڑھتی ہوئی مشکلات اور شکایات کی طرف اشارہ فرماتے ہیں کہ جن پر روز بروز زندگی تنگ ہوتی جا رہی تھی، نیز قرآن وسنّت کو عوام وخواص بھولتے جا رہے تھے جبکہ اسلام اور اُس کی تعلیمات کا بس نام رہ گیا تھا۔

لفظ "صَاحِبُهَا" میں ضمیر "هَا" مطلق خلافت سے متعلق ہے یعنی خلافت کے مزاج اور اس کی طبیعت میں ہمیشہ یہ دو خطرے پنہاں ہیں۔ وہ شخص جو خلافت کی مسند پر بیٹھا ہے، اگر یہ چاہے کہ ہر چیز کے ساتھ اور ہر مسئلے کو پوری طرح اپنی گرفت میں رکھے اور سو فیصد نظم وضبط پر عمل درآمد کروایا جائے تو شدید ردّ عمل آنے کے خطرات موجود ہیں، اور اگر یہ چاہے کہ چشم پوشی، سہولت اور نرمی کا برتاؤ رکھا جائے تو بھی انحرافات اور دوسرے قسم کے خطرات کی گہری کھائی اُس کی منتظر ہے، نیز اسلامی آداب، تہذیب وثقافت اور تعلیمات کے محو ہونے کے خطرے سر پر منڈلا رہے ہوں گے، لیکن قرینہ یہ بتاتا ہے کہ حضرت امام علیؑ کی مراد وہی پہلے معنی ہیں اور اگر پہلے اور بعد کے جملوں پر ذرا غور کر لیا جائے تو یہ بات با آسانی واضح ہو جاتی ہے۔ [۱]

اور پھر امامِ بیداری اور آگہی گفتگو کو آگے بڑھاتے ہوئے اپنی اور لوگوں کی اُس زمانے میں پریشانیوں اور مشکلات کو بیان کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

"فَمُنِيَ [۲] النَّاسُ لَعَمْرُ اللهِ بِخَبْطٍ [۳] وَشِمَاسٍ [۴] وَتَلَوُّنٍ [۵] وَاعْتِرَاضٍ" [۶]

"قسم خدا کی! ان حالات اور مشکلات کی وجہ سے لوگوں کی پوری زندگی غیر متوازن ہو کر رہ گئی تھی، نیز بات یہاں تک پہنچ چکی تھی کہ عوام سرکشی پر اُتر آئیں، حواس باختہ اور پریشان حال نیز غیر منظم حرکات وسکنات انجام دینا ان کی عادت بنتی

[۱] بعض افراد نے یہاں ایک تیسرا خیال ظاہر کیا ہے کہ خلافت سے مراد حضرت امام علیؑ کا اپنا زمانہ ہے۔ آپؑ کے زمانے میں بھی یہی دو طرح کی مشکلیں موجود تھیں، لیکن یہ رائے بہت ہی بعید از قیاس ہے۔

[۲] منی، منو کے مادّے سے ہے اس کا وزن بند ہے۔ اس کے معنی مبتلا ہونا اور مشکل میں پڑ جانا ہے۔

[۳] خبط، اس کا مطلب ہے کہ اونٹ کا زمین پر پیر مارنا نیز لاپروائی کے ساتھ حرکات انجام دینا، اور اس عمل کا لازمی نتیجہ یہ ہے کہ راستہ چلتے پاؤں ڈگمگا جائیں۔

[۴] شماس، یعنی سرکشی اور بد خلقی۔

[۵] تلوّن، یعنی رنگ اور حالت کا بدلنا۔

[۶] اعتراض، اس کے معنی راستے پر چلنا ہے اور غیر مناسب اور بے ہنگم حرکات وسکنات۔

https://downloadshiabooks.com/

جا رہی تھی۔‘‘

اس جملے میں خلیفۂ دوّم کے زمانے میں، عوام الناس کی نفسیاتی کیفیات اور گفتار و کردار (چال چلن) کے چار بنیادی عناصر کو بیان کیا گیا ہے، عین ممکن ہے کہ اس نفسیاتی کیفیت اور بدلتے مزاج کی بنیادی وجہ خود حاکمِ وقت ہو، کیونکہ اکثر، حاکمِ وقت کی گفتار اور کردار براہِ راست عوام کو بنانے یا بگاڑنے میں غیر معمولی حد تک اثر انداز ہوتا ہے۔ قدیم زمانے سے یہ بات کہی جاتی ہے کہ ''اَلنَّاسُ عَلٰی دِیْنِ مُلُوْکِھِمْ'' عوام الناس عام طور سے اپنے حاکموں کے نقشِ قدم پر چلتے اور اُن کے رنگ میں اپنے آپ کو رنگنا پسند کرتے ہیں۔

خلیفۂ دوّم کے زمانے میں عوام کے مزاج میں پیدا ہونے والے چار عناصر درج ذیل ہیں:

پہلی خاصیت: یہ تھی کہ اُس زمانے کے لوگوں کی حرکات و سکنات مطالعے کے ساتھ نہ تھیں، اور نہ ہی غور و فکر کے ساتھ تھیں، لہٰذا معاشرے میں مشکلات اور مسائل کا باعث بنیں۔

دوسری خاصیت: یہ تھی کہ خدائی قوانین (شریعت اور دین) اور اجتماعی نظام سے بیزاری اور سرکشی اُس زمانے کے لوگوں کا مزاج بن چکا تھا۔

تیسری خاصیت: یہ تھی کہ اُس زمانے کے لوگ حالات کے مطابق اپنا رنگ بدلنے لگے تھے، اپنا راستہ بدل لینا، وفاداریاں تبدیل کر دینا، ایک گروہ کو چھوڑ کر دوسرے گروہ کے ساتھ مل جانا ایک عام مزاج بن چکا تھا۔ مختصر یہ کہ زندگی کا کوئی مقصد نہ تھا، بغیر کسی زحمت کے زیادہ سے زیادہ فائدہ حاصل کرنے کی ہوس رکھتے تھے۔

چوتھی خاصیت: یہ تھی کہ حق کے راستے کو ترک کر کے انحراف کا راستہ اختیار کر لیا جاتا تھا۔

تفصیل کے ساتھ اس موضوع پر گفتگو ہوگی کہ بلا شبہ خلیفۂ دوّم کے زمانے میں ’’سیاستِ خارجی‘‘ یعنی خارجہ پالیسی کی بنیاد یہ تھی کہ حجاز کے علاقے سے باہر پیشرفت کی جائے اور اسلامی فتوحات کے سلسلے کو آگے بڑھایا جائے، اس حکومت کے بارے میں یہ ایک ایسی ذہنیت بن گئی تھی کہ جس کو اکثر لوگ پسند کرنے لگے تھے، نیز ہر لحاظ سے اُسے ایک کامیاب حکومت سمجھتے تھے، جبکہ مسلمان معاشرے کے داخلی مسائل اور مشکلات کی طرف کسی کی توجہ نہ تھی۔

مذکورہ بالا جملوں میں مولائے کائناتؑ نے ان مسائل کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا ہے کہ مسلمانوں کا ایک گروہ جہالت، لاعلمی کی وجہ سے پے در پے غلطیاں کرتا رہا۔ یہاں تک کہ قرآن اور سنت پیغمبرؐ کے نص کے مقابلے میں اپنے ذاتی اجتہاد پر عمل کرنا شروع کر دیا۔ کیا اعتقاد اور کیا عمل، بلکہ اخلاقی مسائل میں بھی انحرافات پیدا ہونا شروع ہو گئے۔ آہستہ آہستہ حقیقی اسلام سے فاصلہ بڑھتا چلا گیا، یہی وجہ تھی کہ خلیفۂ سوّم کے زمانے میں مسلمان عوام کی جانب سے شور و غل اُٹھا،

https://downloadshiabooks.com/

حکومت کے خلاف بغاوت ہوئی اور پھر خلفائے اُموی اور عباسی جیسی خودسر حکومتوں کے لیے زمین پوری طرح ہموار ہوگئی، جو کسی بھی طرح رسولِ اسلامؐ کے زمانے میں اسلامی حکومت سے کوئی شباہت نہیں رکھتی تھیں۔ عالم اسلام میں یہ عجیب وغریب تبدیلیاں یقیناً ایک دن میں رونما نہیں ہوئیں، بلکہ یہ سب کچھ تدریجی طور پر خلفائے ثلاثہ کے زمانے سے شروع ہوا اور ان تمام مشکلات اور انحرافات کی بنیاد، رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی رحلت کے بعد رکھی گئی۔

سلسلۂ کلام کو آگے بڑھاتے ہوئے آپؑ فرماتے ہیں:

"فَصَبَرْتُ عَلٰی طُولِ الْمُدَّةِ، وَشِدَّةِ الْمِحْنَةِ"

''ایسے حالات میں صبر کے علاوہ کوئی چارہ نہ تھا، اس کا طویل زمانہ اور درد و رنج شدید تھا۔ نیز صبر و شکیبائی اُس کا علاج تھا۔''

یہ زمانہ بھی خلیفۂ اوّل کے زمانے کی طرح تھا، لیکن خلیفۂ اوّل کا زمانہ مسائل اور مشکلات شروع ہونے کا زمانہ تھا۔ جبکہ خلیفۂ دوّم کے زمانے میں مسائل زیادہ پیچیدہ ہوگئے تھے اور کیونکہ اُن کا زمانۂ خلافت زیادہ طویل تھا، لہٰذا حضرت امام علیؑ فرماتے ہیں کہ خلیفۂ دوّم کے زمانے میں درد اور رنج زیادہ شدید ہوگئے تھے۔

نہج البلاغہ کے بعض شارحین کا کہنا ہے:

''امامِ عالی مقامؑ کا یہاں پر دو باتوں کی طرف اشارہ ہے، جن میں سے ہر ایک امامِ مظلوم کے لیے تکلیف اور اذیت کا باعث بنتی رہی ہے، پہلی مشکل امیر المومنینؑ کو مرکز خلافت اور اس کی ذمّے داریوں کی ادائیگی سے دور رکھا جانا اور خلافت کو آپؑ کی شخصیت سے جدا کرنے کی ظالمانہ کوششیں۔ دوسری مشکل یہ تھی کہ جب ہر لحاظ سے ایک صالح اور باصلاحیت قیادت کو فکری اور عملی میدان میں عوام سے دور رکھا گیا نیز اس ستم ظریفی کے نتیجے میں عوام کو جس محرومیت کا سامنا کرنا پڑا، تو پورے معاشرے کا نظام بگڑ کر رہ گیا، لیکن ان تمام وجوہات اور مشکلات کے باوجود، کچھ ایسی اعلیٰ مصلحتیں وجود رکھتی تھیں، جن کی وجہ سے حقائق کا اظہار اور احتجاج اور دنیا والوں تک پہنچانے کے بعد خاموشی اختیار کرنا ہی سب سے بڑی حکمت عملی سمجھا گیا۔''

https://downloadshiabooks.com/

چند نکات

۱۔ خلیفۂ دوّم کا انداز اور طریقۂ کار

خلیفۂ دوّم کے حالاتِ زندگی کے بارے میں خاص طور سے اُن کے دورانِ خلافت کے واقعات میں، ہمیں اہل سنّت کے علماء اور صاحبانِ علم و دانش کی کُتب (کتب حدیث اور تاریخ) سے جو کچھ ملتا ہے، اُس کی مکمل طور پر امام علیؑ کے کلمات کے ذریعے تصدیق ہوتی ہے۔ ان واقعات کی ایک لمبی چوڑی فہرست ہے، جن میں سے چند ایک واقعات درج ذیل ہیں:

۱۔ مرحوم علامہ امینیؒ نے الغدیر، ج ٦ میں اہلسنّت کی مشہور کتب سے کثیر تعداد میں ماخذ اور مصادر (جیسے سنن دارمی، تاریخ ابن عساکر، تفسیر ابن کثیر، الاتقان جو جلال الدین سیوطی کی تصنیف ہے، نیز ان کی تفسیر دُرّ المنثور، فتح الباری اور دیگر کتب) سے دل ہلا دینے والے واقعات بیان کیے ہیں۔

ایک واقعہ ''صبیغ عراقی'' کے بارے میں نقل کیا گیا ہے۔ کتب تاریخ سے یہ بات واضح ہے:

''صبیغ'' ایک صاحبِ جستجو اور تحقیق میں دلچسپی رکھنے والا انسان تھا، نیز ہمیشہ قرآن کی آیات کے بارے میں سوالات پوچھتا تھا، لیکن خلیفۂ دوّم نے اس کے سوالات کرنے پر اتنی شدّت سے غصّہ کیا جو آج ہمارے لیے نہایت تعجب کا باعث ہے۔ اس کے علاوہ ایک اور واقعے میں ہے کہ کوئی ''خلیفۂ دوّم'' کے پاس آیا اور ان سے کہا، ہم ایک شخص کو جانتے ہیں جو قرآن کے مشکل مقامات کی تاویل کے بارے میں سوال کرتا ہے۔

خلیفۂ دوّم نے کہا، خداوندا مجھے اتنی قدرت دے کہ میرا ہاتھ اس تک پہنچ سکے۔ ایک دن خلیفۂ دوّم بیٹھے تھے، ایک شخص آیا جو سر پر عمامہ رکھے ہوئے تھا، اُس نے خلیفۂ دوّم کی طرف رخ کرتے ہوئے کہا، یا امیر المومنین! "وَالذّٰرِیٰتِ ذَرْوًا فَالْحٰمِلٰتِ وِقْرًا" سے کیا مراد ہے؟ خلیفۂ دوّم نے کہا، یقیناً تم وہی شخص ہو جس کو میں تلاش کر رہا تھا، یہ کہہ کر خلیفۂ دوّم اپنے جگہ سے اٹھے اور اپنی دونوں آستینیں چڑھائیں اور اس کو اتنے کوڑے مارے کہ اس کا عمامہ زمین پر گر پڑا اور پھر اس سے کہا، ''خدا کی قسم اگر تمہارا سر گنجا ہوتا تو تمہاری گردن، تن سے جُدا کر دیتا'' اور پھر حکم دیا کہ اس کو ایک خاص لباس پہناؤ، اونٹ پر بٹھاؤ اور اس کے شہر لے جاؤ اور وہاں اعلان کردو کہ ''صبیغ'' علم کی جستجو میں نکلا تھا اور اس سے غلطی سرزد ہوئی ہے، تاکہ سب اس سے گریز کریں۔ اس واقعے کے بعد وہ اپنی قوم میں ایک حقیر شخص ہو کر رہ گیا تھا، یہاں تک کہ اس دنیا سے

https://downloadshiabooks.com/

رخصت ہو گیا۔ جبکہ اس واقعے سے پہلے وہ اپنی قوم کا بڑا بزرگ اور سرپرست شمار ہوتا تھا۔'' [۱]

ایک دوسری حدیث میں ''نافع'' سے نقل ہوا ہے کہ ''صبیغ'' ہمیشہ قرآن کے بارے میں سوالات کیا کرتا تھا، جب وہ مصر پہنچا تو عمرو بن عاص نے اس کو خلیفۂ دوّم کے پاس بھیجا، خلیفۂ دوّم نے ایک حکم دیا۔ درخت سے تازہ شاخیں توڑ کر لائی گئیں۔ ''صبیغ'' کو خلیفۂ دوّم نے ان شاخوں سے اتنا پیٹا کہ اس کی پشت زخمی ہوگئی اور پھر اُس کو رہا کر دیا۔ کچھ عرصے کے بعد جب زخم ٹھیک ہو گیا، دوبارہ اُس کو پچھلی مرتبہ کی طرح مارا پیٹا، پھر اُس کو چھوڑ دیا۔ جب وہ صحت یاب ہو گیا تو پھر تیسری بار اپنے آدمی کو اس کے پاس بھیجا تا کہ وہی عمل پھر دوہرایا جائے۔ ''صبیغ'' نے خلیفۂ دوّم سے کہا، اگر مجھے قتل کرنے کا ارادہ رکھتے ہو تو مناسب طریقے سے قتل کر دو، کم از کم اذّیت دے کر میری جان مت لو، اور اگر میرا علاج کرنا چاہتے ہو تو اب میں خدا کی قسم ٹھیک ہو چکا ہوں۔ خلیفۂ دوّم نے اس کو اجازت دی کہ وہ اپنے وطن واپس چلا جائے اور ابوموسیٰ اشعری کو لکھا کہ کوئی مسلمان اس کے ساتھ نہ اُٹھے بیٹھے اور نہ ہی بات چیت کرے۔ یہ معاملہ ''صبیغ'' پر بہت گراں گزرا۔ ''ابوموسیٰ'' نے خلیفۂ دوّم کو لکھا کہ وہ مکمل طور پر اپنی باتوں سے توبہ کر چکا ہے، اور اب قرآن کے بارے میں کوئی سوال نہیں کرتا، اس کے بعد خلیفۂ دوّم نے اجازت دے دی کہ لوگ اس کے ساتھ رفت و آمد کر سکتے ہیں۔ [۲]

ایک اور روایت میں ''صبیغ'' کی داستان کو بیان کیا گیا ہے۔ ممکن ہے خلیفۂ دوّم کے ساتھ اس کے مختلف واقعات پیش آئے ہوں، لہٰذا مختلف افراد نے مختلف انداز سے اس داستان کو تحریر کیا ہے کہ صبیغ مدینے میں داخل ہوا اور اس کی عادت تھی کہ متشابہاتِ قرآن کے بارے میں سوال کرتا تھا۔ خلیفۂ دوّم نے کسی کو اُس کے پیچھے بھیجا جب کہ وہ خود پہلے سے کھجور کے درخت کی شاخیں آمادہ کر چکے تھے۔

خلیفۂ دوّم نے اس سے پوچھا، تم کون ہو؟ اُس نے کہا، میں خدا کا بندہ صبیغ ہوں، خلیفۂ دوّم نے ان شاخوں میں سے ایک شاخ اُٹھائی اور اُس کے سر پر مارتے ہوئے کہا کہ میں خدا کا بندہ عمر ہوں، اور پھر اتنا اُس کے سر پر مارا کہ اس کا سر خون آلودہ ہو گیا، صبیغ نے کہا، اے امیر المومنین، بس کافی ہے، جو کچھ میرے دماغ میں تھا صاف ہو گیا (یعنی اب میں قرآن کے متشابہات کے بارے میں سوال نہیں کروں گا) [۳]

قابلِ توجّہ بات یہ ہے کہ ان روایات میں سے کسی میں بھی یہ نکتہ موجود نہیں کہ صبیغ نے کہیں پر بھی آیاتِ قرآنی کے

---

[۱] الغدیر، جلد ۶، ص ۲۹۱

[۲] الغدیر، جلد ۶، ص ۲۹۱

[۳] الغدیر: جلد ۶، صفحہ ۲۹۰

https://downloadshiabooks.com/

بارے میں اپنی ذاتی رائے کا اظہار کیا ہو یا کوئی طعن وتشنیع سے کام لیا ہو، بلکہ صبیغ عام طور پر قرآن کے متشابہات، حروفِ قرآن اور کبھی "والذاریات ذروا" جیسی آیات کے بارے میں سوال کیا کرتا تھا، اور پھر ایسے واقعات صرف صبیغ سے مخصوص نہ تھے۔ عبدالرحمٰن بن یزید نقل کرتا ہے کہ کسی شخص نے "وَفَاكِهَةً وَأَبًّا" کی آیت کے بارے میں سوال کیا، اور جب دیکھا کہ لوگ اس بارے میں گفت وشنید میں مصروف ہیں تو تازیانہ اٹھایا، ان لوگوں پر حملہ کر دیا۔[۱]

۲۔ ایک اور حدیث میں ہے کہ خلیفۂ دوّم سے سوال ہوا اور "وَالْجَوَارِ الْكُنَّسِ" اِس آیت کے بارے میں پوچھا گیا کہ اس کے معنی کیا ہیں؟ خلیفۂ دوّم نے اپنی چھڑی اُٹھائی اور اُس کے عمامے میں داخل کی اور عمامہ زمین پر گرا دیا اور اس سے کہا، کیا تم ''حروری'' ہو؟ حروری اُس زمانے میں ان لوگوں کو کہا جاتا تھا جو اسلام سے خارج ہو چکے تھے اور پھر کہا، ''اُس کی قسم، جس کے ہاتھ میں عمر کی جان ہے، اگر میں تمہارا سر گنجا نہ پاتا تو اتنا تمہیں پیٹتا کہ یہ سوچ تمہارے دماغ سے صاف ہو جاتی۔[۲] عین ممکن ہے کہ سر منڈوانا، اُن خوارج کے گروہ کا شعار رہا ہو جس کی تاریخ حضرت امیرالمومنینؑ کے زمانے سے بھی پہلے ہے۔ یوں سمجھ لیں اُن کا وجود ظہورِ اسلام کے ساتھ ساتھ ہے۔[۳]

سوال یہ ہے کہ جو کوئی قرآن کے بارے میں سوال کرے تو کوئی بھی جواب دیے بغیر لاٹھی یا کوڑے سے اُسے سزا دینی چاہیے؟ فرض کر لیتے ہیں کہ بعض بے دین اور منافق افراد مسلمانوں کے اذہان کو پریشان کرنے کے لیے نامعقول قسم کے سوالات کیا کرتے تھے تو خلیفۂ مسلمین کا فریضہ اس کے بارے میں کیا یہ ہونا چاہیے تھا کہ کوڑے اور لاٹھی سے اس کا جواب دیا جائے یا کہ پہلے علمی اور منطقی اعتبار سے اس کی توضیح کی جائے اور اگر وہ گروہ پھر بھی تسلیم نہ کریں تو انہیں تنبیہہ کی جائے۔ یا یہ طرزِ عمل کس وجہ سے تھا اور وہ سخت غصے اور جھنجھلاہٹ میں مبتلا ہو جاتے تھے یا کوئی دوسری وجہ اور دلیل ان کے پاس تھی جس کی بنا پر وہ ہر ایسے شخص کو مشکوک سمجھ کر اسے نشانہ غیظ بنا دیتے تھے یہاں تک کہ اس کا عمامہ بھی سر سے اتار کر زمین پر پھینک دیتے تھے۔

۳۔ شرح نہج البلاغہ میں ابن ابی الحدید نقل کرتے ہوئے کہتے ہیں:

"دَرَّةُ عُمَرَ أَهْيَبُ مِنْ سَيْفِ الْحَجَّاجِ"

''حضرت عمر کا تازیانہ (کوڑا) حجاج کی تلوار سے زیادہ ہیبت ناک تھا۔''

---

[۱] الدّر المنثور: جلد ۶، صفحہ ۳۱۷

[۲] الدّر المنثور: جلد ۶، صفحہ ۳۲۳

[۳] کنز العمال جلد ۱۱، ص ۳۲۲، حدیث، ۳۱۶۲۷، ملل ونحل شہرستانی، جلد ۱، ص ۱۱۴

https://downloadshiabooks.com/

اور پھر کہتے ہیں حدیث صحیح میں یہ بات موجود ہے:

''رسول خداؐ کے پاس کچھ خواتین آئیں اور انھوں نے اچھا خاصا شور وغل مچایا ہوا تھا، خلیفہ دوّم آئے تو سب ان سے ڈر کر بھاگ گئیں، خلیفہ دوّم نے ان خواتین سے کہا، اے اپنی جانوں کی دشمن، مجھ سے تو ڈرتی ہو اور خدا کے رسولؐ سے نہیں ڈرتیں! تو انھوں نے کہا ہاں، ہاں "اَنْتَ اَغْلَظُ وَاَفَظُّ" تم سخت مزاج اور سخت زبان ہو''۔[۱]

۴۔اسی کتاب میں یہ بھی نقل ہوا ہے:

''خلیفہ دوّم نے سب سے پہلے جسے تازیانہ مارا ہے، وہ ''اُمّ فروہ''، خلیفہ کی بہن ہے، جب خلیفہ کا انتقال ہوا تو خواتین نے گریہ وزاری کی، خلیفہ کی بہن بھی ان کے درمیان تھی، خلیفہ دوّم نے بار بار ان کو منع کیا لیکن وہ روتی رہیں، خلیفہ دوّم نے اُمّ فروہ کو ان خواتین سے علیحدہ کیا اور تازیانے سے مارا، تمام خواتین ڈر کر وہاں سے منتشر ہو گئیں۔''[۲]

۲۔عذر خواہیاں

۱۔اہلِ سنّت کی کتب حدیث میں سے ایک جامع کتاب سنن بیہقی میں شعبی سے ایک روایت نقل ہوئی ہے:

ایک دن خلیفہ دوّم نے خطبہ دیا، حمد اور خدا کی ستائش کے بعد کہا، آگاہ رہنا خواتین کا مہر زیادہ نہ رکھنا، ورنہ اگر مجھے پتا چلا کہ کسی نے رسولؐ سے زیادہ (اپنی ازواج کا مہر) مقدار مہر معین کی ہے تو اضافی مقدار کو میں بیت المال میں شمار کروں گا، یعنی ضبط کرلوں گا اور پھر منبر سے نیچے آ گئے، قریش کی ایک عورت خلیفہ کے پاس آئی اور کہا، ''اے خلیفہ دوّم، کیا کتاب الٰہی (قرآن) کی پیروی زیادہ ضروری ہے یا آپ کی بات کی؟''

خلیفہ دوّم نے کہا، اللہ تعالیٰ کی کتاب کی، لیکن تمہارا مقصد کیا ہے؟ اُس عورت نے کہا، اے خلیفہ تم نے ابھی عورتوں کی مہر کی رقم بڑھانے سے منع کیا ہے، جبکہ خدا فرمارہا ہے:

"وَآتَيْتُمْ اِحْدٰيهُنَّ قِنْطَارًا فَلَا تَأْخُذُوْا مِنْهُ شَيْئًا"

''اگر تم نے (بطور مہر) مالِ کثیر اپنی ازواج میں سے کسی ایک کو دے دیا تھا تو اس میں سے رتی برابر بھی کوئی چیز واپس نہیں لینا۔''[۳]

حضرت عمر نے کہا: "كُلُّ اَحَدٍ اَفْقَهُ مِنْ عُمَرَ"

---

[۱] نہج البلاغہ ابن ابی الحدید، ج۱، ص۱۸۱

[۲] نہج البلاغہ ابن ابی الحدید، ج۱، ص۱۸۱

[۳] سورۂ نساء: آیت ۲۰

https://downloadshiabooks.com/

''ہر کوئی عمر سے زیادہ فقیہ ہے۔''

انھوں نے اس جملے کو دو تین مرتبہ تکرار کیا، منبر پر دوبارہ گئے اور کہا، اے لوگو! میں نے تم لوگوں کو اپنی ازواج کے مہر کی مقدار بڑھانے سے منع کیا تھا، لیکن آگاہ رہنا کہ تم سب آزاد ہو، جیسے چاہو اپنے مال میں سے خرچ کرو، یعنی مہر کم یا زیادہ مقرر کرو۔''[۱]

یہ حدیث اور کئی کتب میں مختصر سی تبدیلی کے ساتھ بیان ہوئی ہے۔[۲]

۲- ذخائر العقبیٰ، مطالب السیؤ ول اور مناقبِ خوارزمی اور ان جیسے سیکڑوں مشہور و معروف مصادر اور ماخذ میں ایک واقعہ بیان ہوا ہے:

ایک حاملہ عورت نے زنا کرنے کا اعتراف کیا تھا، اُسے خلیفۂ دوّم کے پاس لایا گیا، خلیفہ نے اُسے رجم (سنگسار) کرنے کا حکم دیا، راستے میں حضرت علیؑ سے سامنا ہو گیا، آپؑ نے فرمایا: اس عورت کا کیا ماجرا ہے؟ بتانے والوں نے کہا کہ خلیفۂ دوّم نے رجم کرنے کا حکم دیا ہے۔ حضرت علیؑ نے اُس عورت کو واپس کر دیا اور خلیفۂ دوّم سے کہا:

''هٰذَا سُلْطَانُكَ عَلَيْهَا فَمَا سُلْطَانُكَ عَلٰى مَا فِيْ بَطْنِهَا''

تم کو اس عورت پر اختیار ہے (یعنی دلائل کی روشنی میں اُس کو سزا دی جا سکتی ہے) لیکن تمہارے پاس اُس بچے کے بارے میں کیا دلیل ہے، جو شکمِ مادر میں ہے؟ پھر مزید اضافہ کرتے ہوئے فرمایا، شاید تم اس عورت پر چیخے ہو گے یا اُس کو ڈرایا دھمکایا ہوگا (تاکہ گناہ کا اعتراف کرے) خلیفۂ دوّم نے کہا، جی! ایسا ہی ہے، تو امیر المومنین حضرت علی ابن ابی طالب علیہما السلام نے فرمایا: ''کیا تم نے رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ سے نہیں سنا کہ آپؐ نے فرمایا، جو کوئی قید اور زنجیر یا دھمکانے سے اعتراف کرلے تو اس کے اعتراف کا کوئی اثر نہیں (یعنی جرم ثابت نہیں ہوگا) خلیفۂ دوّم نے اُس عورت کو آزاد کرتے ہوئے کہا:

''عَجَزَتِ النِّسَاءُ اَنْ تَلِدْنَ مِثْلَ عَلِيِّ بْنِ اَبِيْ طَالِبٍ، لَوْلَا عَلِيٌّ لَهَلَكَ عُمَرُ''

''دنیا کی مائیں علی ابن ابی طالب علیہما السلام جیسے کو جنم دینے سے عاجز ہیں (سچ تو یہ ہے کہ) اگر حضرت علیؑ نہ

---

[۱] سنن بیہقی: ج ۷، ص ۲۳۳

[۲] جن مصنفین نے اس حدیث کو اپنی کتب میں بیان کیا ہے، اُن میں سے چند درج ذیل ہیں، سیوطی نے ''الدر المنثور'' میں، زمخشری نے ''کشاف'' میں، صاحب کنز العمال نے جلد ۸، ص ۲۹۸ پر اور ابن ابی الحدید نے اپنی شرح نہج البلاغہ جلد ۱، ص ۱۸۲ پر، مذکورہ بالا آیت کے ضمن میں اس حدیث کا تذکرہ کیا ہے۔

https://downloadshiabooks.com/

ہوتے تو عمر (اب تک) ہلاک ہو چکا ہوتا۔''[۱]

۳۔صحاح ستّہ، اہلسنّت کی چھے اہم کتب احادیث کا مجموعہ ہے، جس کی سند کو علمائے اہلسنّت نے معتبر مانا ہے، صحیح ابی داوٗد ان کتب میں سے ایک ہے۔ اسی کتاب میں ابن عباسؓ سے نقل ہے:

''ایک دیوانی عورت کو خلیفۂ دوّم کے پاس لایا گیا، وہ عورت زنا کی مرتکب ہوئی تھی، خلیفۂ دوّم نے اس عورت کے بارے میں لوگوں کے ایک گروہ سے مشورہ کیا اور آخر کار اُسے ''سنگسار'' کرنے کا حکم دے دیا، حضرت علیؑ کا وہاں سے گزر ہوا، آپؑ نے اُس عورت کے بارے میں دریافت کیا، لوگوں نے پورا ماجرا بیان کیا، امام حضرت علیؑ نے اس عورت کو واپس بھیج دیا اور خود خلیفۂ دوّم کے پاس پہنچ گئے، آپؑ نے فرمایا: ''اے عمر، تمہیں نہیں پتا کہ تین گروہ ایسے ہیں، جن سے ذمے داری اُٹھالی گئی ہے، دیوانے پر سے جب تک کہ وہ صحت یاب نہ ہوجائے، سوتے ہوئے انسان پر سے جب تک کہ وہ جاگ نہ جائے اور بچے پر سے جب تک کہ وہ عاقل (سمجھدار) اور بالغ نہ ہو جائے، خلیفۂ دوّم نے کہا، ہاں جانتا ہوں، آپؑ نے فرمایا ''پھر اس دیوانی عورت کو سنگسار کرنے کا حکم کیوں دیا؟'' خلیفۂ دوّم نے جواب کچھ نہیں دیا اور اس عورت کو آزاد کر دیا، نیز تکبیر کہنی شروع کر دی (تکبیر کہنے کا مقصد یہ تھا کہ اپنی غلطی پر قابو پالیا)۔''[۲]

''مناوی'' نے فیض الغدیر نامی کتاب میں اس حدیث کو احمد بن حنبل سے نقل کیا ہے اور اس کے ضمن میں یہ جملہ بھی آیا ہے کہ خلیفۂ دوّم نے کہا:

''لَوْلَا عَلِیٌّ لَهَلَكَ عُمَرُ''۔[۳]

مذکورہ بالا موضوع کے بارے میں، اب تک جو کچھ بیان ہوا وہ ایک سرسری سا جائزہ ہے اور اگر اس موضوع سے متعلق تمام مسائل کو مدنظر رکھا جائے تو یہ ایک مستقل کتاب بن جائے گی۔ علّامہ امینی مرحوم نے اس موضوع پر قلم اُٹھایا ہے اور ایک سو مقامات کی نشاندہی کی ہے اور اپنی کتاب ''الغدیر'' میں اس فصل کا نام ''نَوَادِرُ الْاَثَرِ فِیْ عِلْمِ عُمَرَ'' رکھا ہے۔[۴] دراصل یہ وہی موضوع ہے جس کا تذکرہ مذکورہ بالا خطبے میں ''کثرت کے ساتھ غلطیاں اور ان کی معافیاں'' کے ضمن میں کیا گیا ہے۔

---

[۱] ذخائر العقبیٰ، ص ۸۰، مطالب السئول، ص ۱۳، مناقب خوارزمی، ص ۴۸، اربعین فخر رازی، ص ۴۶۶، الغدیر کے مطابق ج ۶، ص ۱۱۰

[۲] صحیح ابی داوٗد: ج ۴، ص ۱۴۰ (کتابِ حدود: حدیث ۴۳۹۹)

[۳] کتاب السبعۃ من السلف من الصحاح الستۃ مولف فیروز آبادی: صفحہ ۹۵۔

[۴] الغدیر: جلد ۶، ص ۸۳ تا ۳۲۴

https://downloadshiabooks.com/

۳۔ایک سوال اور اُس کا جواب

حضرت امام علی ابن ابی طالب علیہما السلام نے اس خطبے میں خلیفۂ ثانی کے زمانے کی مشکلات اور مسائل کا جو نقشہ کھینچا ہے، عین ممکن ہے یہ نقشہ بعض افراد کی ذہنیت سے مختلف ہو، جو یہ سمجھتے ہیں کہ (تاریخ کی منقولہ کتابوں کے مطابق) خلیفۂ دوّم کا زمانہ بہت کامیاب اور درخشاں دور تھا، لہٰذا تاریخ کے آئینے میں اگر یہ موازنہ کیا جائے گا تو اذہان میں یہ سوال پیدا ہوگا کہ یہ بات کیسے صحیح ہوسکتی ہے؟

اس سوال کا جواب با آسانی سمجھا جا سکتا ہے اگر ایک نکتے پر توجہ کی جائے (جیسا کہ پہلے بھی اس بات کی طرف اشارہ کیا جا چکا ہے) اور وہ نکتہ یہ ہے کہ بے شک خلیفۂ دوّم کے زمانے میں خارجی پالیسی (خارجہ سیاست) یہ تھی کہ زیادہ سے زیادہ (قرآنی تصوّرِ جہاد کی بنیاد پر) ممالک اور ریاستوں کو فتح کیا جائے، لہٰذا ہر سال اور ہر ماہ اسلامی مملکت کی حدود میں اضافہ ہوتا گیا اور یہ وہ چیز تھی جس نے با آسانی لوگوں کو اتنا متاثر کیا کہ عالم اسلام کے اندر کے حالات، مسائل، مشکلات نیز بڑھتے ہوئے انحرافات کی طرف سے غفلت میں روز بروز اضافہ ہوتا گیا، اُدھر مالِ غنیمت میں اضافہ ہوتا گیا۔ یقینی طور پر ایک ذمّے دار سربراہ، رہبر اور رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے جانشین (حضرت علی علیہ السلام) کے لیے یہ سب سے بڑا درد تھا کہ اگر ایک حکومت کی حدود (ذمے داریاں) اُس کی انتظامی صلاحیت اور طاقت سے زیادہ بڑھ جائیں اور آہستہ آہستہ اس حکومت کی بنیادیں کمزور ہوتی جائیں تو آج نہیں تو کل اس حکومت کا خاتمہ ہو جائے گا، آج بھی ''سیاست اور حکومت کی دنیا میں'' ایسے ہی طریقۂ کار کو آزمایا جاتا ہے کہ حکومت اور ملک کے داخلی نیز بنیادی مسائل پر پردہ ڈالنے اور رائے عامّہ کو راضی رکھنے کے لیے خارجہ پالیسی کے ذریعے دیکھنے والوں، سوچنے والوں اور انگلی اُٹھانے والوں کی توجہ کسی اور جانب کر دی جاتی ہے اور یوں با آسانی عوام الناس کے ذہن کو اپنے مفادات کے مطابق تبدیل کر دیا جاتا ہے۔ مختصر یہ کہ امام علیہ السلام نے سختی سے ان بڑھتی ہوئی مشکلات اور اشتباہات کا ذکر کیا ہے، جو خلیفۂ دوّم کے دور میں پیدا ہو رہے تھے۔ ان کا حساب فتوحات کے مسئلے سے بالکل جدا تھا۔

تیسرا حصّہ

حَتّٰى إِذَا مَضٰى لِسَبِيلِهٖ جَعَلَهَا فِيْ جَمَاعَةٍ زَعَمَ أَنِّيْ أَحَدُهُمْ فَيَا لَلّٰهِ وَلِلشُّوْرٰى مَتٰى اعْتَرَضَ الرَّيْبُ فِيَّ مَعَ الْأَوَّلِ مِنْهُمْ حَتّٰى صِرْتُ أُقْرَنُ إِلٰى هٰذِهِ النَّظَائِرِ لٰكِنِّيْ أَسْفَفْتُ إِذْ أَسَفُّوْا وَ طِرْتُ إِذْ طَارُوْا فَصَغَا رَجُلٌ مِنْهُمْ لِضِغْنِهٖ وَمَالَ الْآخَرُ لِصِهْرِهٖ مَعَ هَنٍ وَهَنٍ إِلٰى أَنْ قَامَ ثَالِثُ الْقَوْمِ نَافِجًا

https://downloadshiabooks.com/

حِضْنَيْهِ بَيْنَ نَثِيلِهِ وَ مُعْتَلَفِهِ وَ قَامَ مَعَهُ بَنُو اَبِيهِ يَخْضَمُونَ مَالَ اللهِ خِضْمَةَ الْاِبِلِ نِبْتَةَ الرَّبِيعِ اِلٰى اَنِ انْتَكَثَ عَلَيْهِ فَتْلُهُ وَ اَجْهَزَ عَلَيْهِ عَمَلُهُ وَ كَبَتْ بِهِ بِطْنَتُهُ

''یہاں تک کہ وہ بھی اپنے راستے پر چلا گیا، لیکن خلافت کو ایک جماعت میں قرار دے گیا جن میں ایک مجھے بھی شمار کیا گیا۔ خدا کی پناہ کہ میرا اس شوریٰ سے کیا تعلق تھا؟ ان کے پہلے شخص کے مقابلے میں مجھ میں پہلے دن کون سا عیب و ریب تھا کہ آج مجھے ایسے لوگوں کے ساتھ ملایا جا رہا ہے۔ لیکن اس کے باوجود میں نے انہیں کی فضا میں پرواز کی اور یہ نزدیک فضا میں اُڑے تو وہاں بھی ساتھ رہا اور اونچے اُڑے تو وہاں بھی ساتھ رہا، مگر پھر بھی ایک شخص اپنے کینے کی بنا پر مجھ سے منحرف ہو گیا اور دوسرا دامادی کی طرف جھک گیا اور کچھ اور بھی نا قابلِ ذکر اسباب و اشخاص تھے، جن کے نتیجے میں تیسرا شخص سرگین اور چارے کے درمیان پیٹ پُھلائے ہوئے اٹھ کھڑا ہوا اور اس کے ساتھ اس کے اہل خاندان بھی کھڑے ہوئے جو مال خدا کو اس طرح ہضم کر رہے تھے جس طرح اونٹ بہار کی گھاس کو چر لیتا ہے، یہاں تک کہ اس کی بٹی ہوئی رسی کے بل کھل گئے اور اس کے اعمال نے اس کا خاتمہ کر دیا اور شکم پُری نے منہ کے بل گرا دیا۔''

شرح وتفسیر

خلیفۂ سوّم کا دورِ حکومت

خطبے کے اس حصے میں امام نے خلیفۂ دوّم کے دورِ خلافت ختم ہونے اور خلیفۂ سوّم کے خلافت پر پہنچنے کے اسباب کی طرف اشارہ کیا ہے اور اس واقعے کے دقیق اور باریک تاریخی نکات، پوشیدہ اسرار یا نیم پوشیدہ اسرار سے پردہ اُٹھایا ہے۔ اس حوالے سے اپنے موقف کو کھل کر بیان کیا ہے، نیز اس تسلسل میں امت اسلامی کو خلیفہ سوم کے دور میں انتہائی مشکلات کا سامنا کرنا پڑا اور شور و غل بلند ہوا، جس کے نتیجے میں خلیفہ قتل ہوا۔ ان تمام حقائق کو مختصر، جامع اور کنایات و استعارات نیز تشبیہات کے ساتھ بیان کیا ہے۔

پہلے آپ فرماتے ہیں:

"حَتّٰى اِذَا مَضٰى لِسَبِيلِهِ جَعَلَهَا فِي جَمَاعَةٍ زَعَمَ اَنِّي اَحَدُهُمْ فَيَا لَلّٰهِ وَلِلشُّورٰى"

''یہاں تک کہ وہ بھی اپنے راستے پر چلا گیا لیکن خلافت کو ایک جماعت میں قرار دے گیا جن میں ایک مجھے بھی شمار کیا گیا۔''

https://downloadshiabooks.com/

میں بھی انہی میں سے ایک تھا، اس سے ممکن ہے یہ ان دو معانی کی طرف اشارہ ہو پہلا ظاہری طور پر مجھے بھی خلافت کا حصہ دار قرار دیا جبکہ وہ جانتے تھے گہرائی میں اس کا نتیجہ کیا ہے۔ کون شخص اس شوریٰ سے باہر نکل سکتا ہے۔ دوسری بات یہ تھی اُنہوں نے ظاہری طور پر یہ اظہار کیا کہ میں بھی اُن پانچ افراد کے ہمراہ ہوں جبکہ وہ اندرونی طور پر جانتے تھے کہ میرا موازنہ اُن میں سے کسی ایک کے ساتھ بھی نہیں ہے۔ [۱]

یہ جملہ اُس زمانے کی طرف اشارہ ہے، جب فیروز نے جس کی کنیت ابولولو تھی، خلیفۂ دوّم کو زخمی کر دیا۔ جب خلیفۂ دوّم نے شدید زخمی ہونے کے بعد خود کو موت کے بستر پر پایا۔ اُس وقت بعض اصحاب آ کر کہنے لگے، آپ اپنے بعد کسی کو خلافت کے لیے جانشین منتخب کریں۔ انھوں نے چھے افراد پر مشتمل شوریٰ قرار دی، جس کو ہم بعد میں تفصیل سے بیان کریں گے۔ امام علیؑ، حضرت عثمان، حضرت عبدالرحمٰن ابن عوف، حضرت طلحہ، حضرت زبیر، حضرت سعد ابن ابی وقاص۔ ان افراد کو چاہیے کہ وہ تین دن کے اندر خود میں سے کسی کو خلیفہ منتخب کریں، ابوطلحہ انصاری کو حکم دیا کہ وہ انصار میں سے پچاس افراد کو ان کے ہمراہ اپنے گھر دعوت دیں تاکہ ایک دوسرے سے مشورہ کرسکیں۔ بالآخر باہمی روابط کی بنا پر انھوں نے خلیفہ سوم کو منتخب کیا۔ امام علیہ السلام اس حوالے سے فرماتے ہیں، اس شوریٰ سے میں خدا کی پناہ چاہتا ہوں۔ [۲]

شوریٰ کی کمزوری کو بیان کرتے ہوئے فرمایا:

"مَتَى اعْتَرَضَ الرَّيْبُ فِيَّ مَعَ الْأَوَّلِ مِنْهُمْ، حَتَّى صِرْتُ أُقْرَنُ إِلَى هٰذِهِ النَّظَائِرِ"

''خدا کی پناہ کہ میرا اس شوریٰ سے کیا تعلق تھا؟ ان کے پہلے شخص (خلیفۂ اوّل) کے مقابلے میں مجھ میں پہلے دن کون سا عیب وریب تھا کہ آج مجھے ایسے لوگوں کے ساتھ ملایا جارہا ہے۔

یہ جملہ مولاؑ کی انتہائی افسوسناک حالت کو آشکار کرتا ہے، جن کے حق کو پامال کیا گیا اور اس حقیقت کی طرف اشارہ کرتا ہے کہ اگر وہ لوگ چاہتے کہ خلافت کے حقدار کو مدنظر رکھا جائے تو بغیر کسی تردّد کے میرا تعین کرتے، لیکن انتہائی افسوس کا مقام ہے کہ ان کے دیگر اہداف بھی تھے۔ یقیناً یہ افسوس کا مقام ہے وہ جو نفسِ رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہو، علوم نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا دروازہ ہو، کتاب وسنّت کا عالم ہو اور اسلام کے تمام مسائل سے آگاہ ہو، جس کی زندگی کا آغاز مکتب توحید سے ہوا اور رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی قربت میں پرورش پائی ہو، اُس کو عبدالرحمٰن بن عوف اور سعد بن وقاص کے برابر قرار دیا جائے۔

آگے مزید فرمایا:

---

[۱] مقائیس اللغۃ میں ہے زعم کے اصل معنی یہ ہیں کہ وہ گفتگو جس کی کوئی حقیقت نہ ہو اور گفتگو کرنے والا خود مطمئن نہ ہو۔

[۲] للہ، کا لام مفتوح ہے اور استغاثہ کے لیے آتا ہے اور لام للشوریٰ میں مکسور ہے مستعاث منہ ہے۔

https://downloadshiabooks.com/

"لٰکِنِّیۡ اَسۡفَفۡتُ اِذۡاَسَفُّوۡا، وَطِرۡتُ اِذۡطَارُوۡا۔"[1]

''لیکن میں نے اسلام کی مصلحتوں کو مدنظر رکھتے ہوئے اُن کے ساتھ تعاون کیا۔ جب نیچے آنا پڑا تو نیچے آیا اور کبھی پرواز کرنے لگے تو میں نے بھی پرواز کی۔''

یہ کنایہ ہے اُن پرندوں کی حالت کے بارے میں جو اجتماعی طور پر پرواز کرتے ہیں، کبھی اوپر کی طرف اور کبھی نیچے کی طرف پرواز کرتے ہیں اور زمین کے قریب ہوجاتے ہیں۔ دونوں حالتوں میں ایک دوسرے کے ساتھ ہیں۔ یہ بات واضح ہے کہ خلفا کے دور کے حالات بالخصوص جب وہ ایک دور سے نکلتے تھے تو اُس وقت حالات کا تقاضا تھا کہ ہر قسم کے فتنہ و فساد سے اجتناب کریں، کہیں ایسا نہ ہو جو دشمن کمین گاہوں میں بیٹھے ہیں، وہ سر اُٹھاتے ہوئے اسلام کی جڑوں کو نقصان پہنچائیں۔ اس جملے کی تفسیر میں یہ احتمال بھی پایا جاتا ہے کہ امامؑ کا مقصد یہ تھا، میں ہمیشہ سے حق کی جستجو میں ہوں اور حصولِ حق کے لیے سعی و تلاش کر رہا ہوں۔ وہ لوگ جو آگے آگے تھے اُن کے ہمراہ بھی تھا اور پیچھے پیچھے چلنے والوں کے ساتھ بھی تھا۔

پھر شوریٰ کے نتیجے اور اُس میں انجام پانے والے قبیح فعل کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا:

"فَصَغَا[2] رَجُلٌ مِنۡهُمۡ لِضِغۡنِهٖ[3] وَمَالَ الۡاٰخَرُ لِصِهۡرِهٖ، مَعَ هَنٍ[4] وَهَنٍ"

''اُس شوریٰ کے اراکین میں سے ایک نے مجھ سے عداوت کی بنا پر روگردانی کی، دوسرے نے رشتے داری کو حقیقت پر مقدم سمجھا اور اپنے داماد (حضرت عثمان) کی طرف رُخ کرلیا، اس کے علاوہ اور بھی اسباب تھے، جن کا ذکر کرنا مناسب نہیں۔''

مولا علی علیہ السلام کا مقصد پہلے جملے میں سعد ابن ابی وقاص تھا۔ اُن کی ماں کا تعلق بنی اُمیہ میں سے تھا۔ اُن کے ماموں اور دیگر رشتے دار کفر و اسلام کے درمیان ہونے والی جنگوں میں امام علیؑ کے ہاتھوں قتل ہوئے، اسی بنا پر اُس نے امام علیؑ کے دورِ حکومت میں بھی بیعت نہیں کی (عمر ابن سعد جو واقعۂ عاشورا میں لشکر یزید کا سپہ سالار تھا وہ اسی کا بیٹا ہے) اُس کی دشمنی امام علی علیہ السلام سے مسلّم تھی، اسی لیے اُس نے شوریٰ میں امام علی علیہ السلام کی حمایت نہیں کی۔ اور عبدالرحمٰن بن عوف کے وسیلے سے خلیفہ

---

[1] اسففت مادّہ اسفاف سے مشتق ہے کسی چیز کی قربت حاصل کرنے کے معنی میں ہے، جب پرندہ خود کو زمین کے قریب تر کردیتا ہے، تو یہ تعبیر استعمال ہوتی ہے۔ یہ تعبیر چٹائی وغیرہ کو بنانے کے لیے بھی استعمال ہوتی ہے۔ کیونکہ اس کے ریشے ایک دوسرے کے قریب ہوتے ہیں، شدت کیساتھ نگاہ کرنے کے معنی میں بھی آیا ہے۔

[2] صغا، کا مادّہ صغو ہے بروزن فعل معنی کسی چیز کی طرف مائل ہونے کے ہیں۔

[3] ضغن، بروزن ضمن، عداوت و کینہ کے معنی میں آیا ہے۔

[4] هن، کی شرح آگے آئے گی۔

https://downloadshiabooks.com/

سوّم کی حمایت کی، بعض نے کہا ہے کہ اس شخص سے مراد طلحہ ہے، اُس کی دشمنی امامؑ سے نمایاں تھی، اس نے جنگ جمل میں زبیر کے ہمراہ مورخین کے بقول سترہ ہزار افراد کو قتل کروایا۔ اس احتمال کو ابن ابی الحدید نے تقویت دی ہے، جبکہ نہج البلاغہ کے بعض شارحین کے نزدیک طلحہ اگرچہ شوریٰ کے لیے خلیفۂ دوّم کی جانب سے منتخب ہوئے تھے لیکن وہ مدینے میں نہیں تھے اور وہ شوریٰ کے اجلاس میں شرکت نہ کرسکے۔ شرح نہج البلاغہ خوئی میں شوریٰ میں طلحہ کی غیر موجودگی کو طبری سے نقل کیا ہے۔[۱] جس شخص کو دامادی کی وجہ سے انتخاب کیا، وہ عبدالرحمٰن بن عوف تھے جو خلیفۂ سوّم کی بہن ام کلثوم کے شوہر تھے۔

لیکن یہ جملہ "مَعَ هَنٍ وَ هَنٍ"[۲] تو جہ رہے کہ لفظ "هنٍ" کنایہ ہے بُری صفتوں کے لیے جن کا ذکر کرنا مناسب نہ ہو۔ ممکن ہے دیگر نامناسب اُمور کی طرف اشارہ ہو کہ عبدالرحمٰن بن عوف کو خلیفۂ سوّم کی حمایت کرتے وقت اس چیز کا انتظار تھا، مثلاً مسلمانوں کے بیت المال سے سُوئے استفادہ کرنا یا لوگوں پر حکمرانی کرنے کا خواب یا خلیفۂ سوّم کے بعد خلافت حاصل کرنا یا یہ سب کے سب، اس گفتگو سے یہ بات واضح ہوجاتی ہے کہ شوریٰ ایک نامعقول حالات میں وجود میں آئی۔ اُس میں جس چیز کو نظر انداز کیا گیا، وہی مسلمانوں کی مصلحت تھی، فطری بات تھی اس سے مسلمانوں کے لیے کچھ بھی فائدہ نہیں ہوا، بلکہ خلیفۂ سوّم کے دورِ حکومت میں مسلمانوں کو سنگین نقصانات اٹھانا پڑے۔ پھر امامؑ نے اس شوریٰ کے نتیجے کے حوالے سے فرمایا:

"اِلَىٰ اَنْ قَامَ ثَالِثُ الْقَوْمِ نَافِجًا[۳] حِضْنَيْهِ[۴] بَيْنَ نَثِيلِهِ[۵] وَ مُعْتَلَفِهِ"[۶]

"(یہ صورت حال اسی طرح برقرار رہی) یہاں تک کہ ان میں سے تیسرا ابھی اپنی راہ پر روانہ ہوگیا، جبکہ اس کے شکم کے دونوں پہلو زیادہ کھانے سے باہر آگئے تھے اور اسے سوائے بیت المال کے خورد برد اور اسے ناجائز طریقے سے جمع کرنے کے علاوہ کوئی اور فکر نہیں تھی۔" اس وادی میں چلنے والوں میں وہ تنہا نہیں تھا، بلکہ

---

[۱] شرح نہج البلاغہ خوئی کے مطابق طلحہ شوریٰ میں نہیں تھا بلکہ وہ مدینے میں بھی اس دن نہ تھا۔ انہوں نے طبری سے نقل کیا ہے، (شرح خوئی، جلد ۳، ص ۷۳)

[۲] علمائے لغت نے تصریح کی ہے کہ "هن" بمعنی فلاں ہے اُس وقت بولا جاتا ہے جب انسان اجمالاً کسی چیز کی طرف اشارہ کرے۔ اُس کی بدی کی وجہ سے یا دوسرے دلائل کی بنا پر عمومی طور پر یہ صفت بدی، نامانوس چیزوں کے لیے استعمال ہوتا ہے۔ نیک چیزوں کے لیے استعمال نہیں ہوتا ہے۔

[۳] نافجا، مادّہ نفج سے مشتق ہے بروزن رفع او پر آنے کے معنی میں ہے۔

[۴] حضن، پہلو کے معنی میں ہے، نافجا حضنیہ، اُس شخص کو کہا جاتا ہے جس کا پہلو تکبر یا بسیار خوری کی وجہ سے پھول گیا ہو۔

[۵] نثیل مادّہ نثل سے مشتق ہے بروزنِ نسل ایک چیز کا دوسری چیز سے نکلنے کے معنی میں ہے انسان اور جانور کے فضلہ (پاخانہ) کو بھی کہا جاتا ہے۔

[۶] معتلف، علف کے مادّے سے مشتق ہے، گھاس رکھنے کی جگہ کو کہا جاتا ہے۔

https://downloadshiabooks.com/

"وَقَامَ مَعَهُ بَنُو اَبِيهِ يَخْضِمُونَ[1] مَالَ اللهِ خِضْمَةَ الْاِبِلِ نِبْتَةَ الرَّبِيعِ"

''بنی امیہ میں سے ان کے باپ کے جاننے والے اور خویش و اقارب ان کے ساتھ دینے کے لیے اس طرح کھڑے ہوئے جیسے بھوکا اونٹ گرمیوں کے موسم میں گھاس کے میدانوں میں پہنچ جاتا ہے اور وہاں کی گھاس چبا چبا کر کھاتا ہے۔''

امامؑ نے تین جملوں کے ذریعے خلیفۂ سوم کے حالات زندگی کو بیان کیا ہے۔

پہلے جملے میں فرمایا: عمومی شہرت اور لوگوں کے درمیان زہد اور قداست کی شہرت سے ہاتھ دھو بیٹھے، ان کے دوستوں اور اعوان کی دنیا پرستانہ حرکتوں نے سب کچھ مٹا ڈالا۔

دوسرے جملے میں فرمایا: اس جملے میں اس بات کی نشاندہی کی ہے کہ ان کے کردار نے توقع سے پہلے اُس پر وار کر دیا اور اُس کے کام کو تمام کر دیا۔

تیسرے جملے میں فرمایا: شکم پروری نے اُن کے وزن کو سنگین کر دیا۔ یہاں تک کہ وہ چل بھی نہیں سکتے تھے، اسی حالت میں زمین پر جا پڑے۔

ان تین جملوں میں تمام حکومتی عہدیداروں اور معاشرے کے ذمے داروں کے لیے ایک اہم درس عبرت ہے۔ اگر دنیا کی طرف رُخ کرتے ہوئے اپنے مقام و منصب سے سُوئے استفادہ کیا تو اُن کی سابقہ تمام نیکیاں رائیگاں چلی جائیں گی اور عمومی طور پر لوگ اُن کی مخالفت میں کمر بستہ ہو جائیں گے۔ دنیا پرستی جلدی سقوط کا باعث بنتی ہے۔ یہ نکتہ بھی اہمیت کا حامل ہے کہ جو چیز خلیفۂ سوّم کی خلافت کے وجود میں آنے کا سبب تھی، وہی اس کی نابودی کا سبب بنی۔ ایسے افراد مثلاً سعد بن ابی وقاص، عبدالرحمٰن بن عوف اور طلحہ نے (بنا بریں طلحہ بھی شوریٰ میں موجود تھے) مال و ثروت تک رسائی حاصل کرنے کے لیے اُن کی حمایت کی، ان کو اقتدار کی مسند پر فائز کیا اور جب یہ بات پھیلی تو عوام کی نظروں میں خلیفۂ سوّم کی مقبولیت ختم ہو گئی، جس کے نتیجے میں اُس کی خلافت کا خاتمہ ہوا۔

نہج البلاغہ کے بعض شارحین کے مطابق "اِنْتَکَثَ عَلَيْهِ فَتْلُهُ" تدابیر کو درہم برہم کرنے کے معنی میں آیا ہے۔ جس نے اپنی حکومت کو تشکیل دینے کے لیے مختلف حربے استعمال کیے۔ ممکن ہے اپنے قریبی رشتے داروں کو حکومتی عہدوں پر فائز کرانا اپنی حکومت کی مضبوطی کے لیے تدبیر ہو۔ لیکن اس کا نتیجہ برعکس نکلا، رشتے ختم ہو کر رہ گئے اور اپنے ہی رشتے داروں

---

[1] خضم، تمام دانتوں سے چبا کر کھانے کے معنیٰ میں آیا ہے اور قضم، دانتوں کے سے چبا کر کھانے کو کہا جاتا ہے۔ بعض نے کہا ہے کہ خَضم سے مراد تازہ گھاس کھانے کے ہیں اور قضم سے مراد سوکھی گھاس کھانے کے ہیں۔

https://downloadshiabooks.com/

نے ان کے خلاف لوگوں کو ورغلایا۔

۱۔ خلیفۂ دوّم اور سوّم کے انتخاب کا طریقہ

ہم جانتے ہیں کہ خلیفۂ دوّم کے حق میں صرف ایک ہی ووٹ تھا اور وہ خلیفۂ اوّل کا تھا۔ جب انھوں نے زندگی کے آخری لمحات میں صراحت کے ساتھ اپنا جانشین منتخب کیا۔ بعض تاریخوں میں آیا ہے کہ حضرت ابوبکر نے احتضار کی حالت میں خلیفۂ سوّم کو بلایا تا کہ خلیفۂ دوّم کے حوالے سے وصیت کو تحریر کرے، اُن سے کہا لکھو:

"بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ"

یہ وہ وصیّت ہے، جو ابوبکر نے مسلمانوں کے لیے کی ہے۔ اما بعد!۔۔۔ اتنا کہہ پایا تھا کہ غشی طاری ہوگئی، لیکن خلیفۂ سوّم نے اپنی رائے سے ان جملوں کو یوں لکھا:

"اَمّا بَعۡدُ فَاِنِّیۡ قَدۡ اسۡتَخۡلَفۡتُ عَلَیۡکُمۡ عُمَرَ بۡنَ الۡخَطَّابِ وَلَمۡ اٰلُکُمۡ خَیۡراً"

''میں خلیفۂ دوّم کو تمہارے لیے خلیفہ مقرر کرتا ہوں میں نے کسی بھی نیک کام سے کوتاہی نہیں کی ہے۔''[۱]

جب خلیفۂ سوّم نے ان کلمات کو لکھا، اُس وقت خلیفۂ اوّل کو ہوش آیا تو کہا: پڑھو! خلیفۂ سوّم نے پڑھا: خلیفۂ اوّل نے تکبیر کی آواز بلند کی اور کہا: میں سمجھتا ہوں تم نے جلدی خلیفۂ دوم کا نام لکھ دیا اور وہ تمہارے خوف کی وجہ سے تھا۔؛ اگر مجھے ہوش نہ آتا اور میں مرجاتا تو لوگ اختلافات کا شکار ہوجاتے؛ خلیفۂ سوّم نے کہا، ہاں! ایسا ہی تھا۔ خلیفۂ اوّل نے اس کے حق میں دعا کی۔[۲] اس بات سے واضح ہوجاتا ہے کہ خلیفۂ سوّم نے اس لباس کو خلیفۂ دوّم کے لیے سلوایا تھا۔ اگر بالفرض خلیفۂ اوّل کو ہوش نہ آتا تو یہ وصیّت نامہ خلیفۂ اوّل کے نام سے پھیل جاتا۔ پس تعجب کی بات نہیں ہے کہ خلیفۂ دوم بھی ایسی کیفیت کے ساتھ شوریٰ تشکیل دیں کہ جس کا نتیجہ خلافت خلیفۂ سوّم کی شکل میں نمودار ہو۔ جیسا کہ خلیفۂ دوّم نے سقیفہ میں اس لباس کو خلیفۂ اوّل کے پیکر پر پہنایا اور اُس نے بھی بروقت اس کی پاداش دی۔ اس کلام سے یہ استفادہ ہوتا ہے کہ اگر خلیفۂ اوّل اور خلیفۂ دوّم کی جانب سے جانشینی کے لیے جلدی کرنا لوگوں کو اختلاف سے بچانے کے لیے تھا، تو کیا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم امت کے لیے اس قسم کی کوئی پیش گوئی نہیں کرسکتے تھے جبکہ وہ تمام چپقلش اور ناراضیاں موجود تھیں جو سقیفہ میں بھی ظاہر ہوئیں، یہ کیسے ہوسکتا ہے کہ رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے خلیفہ کے انتخاب کا مسئلہ لوگوں پر چھوڑ دیا ہو اور اس حکم سے خلیفۂ دوّم اور سوّم خارج

---

[۱] آلکم مادّہ، الا، یالو، سے کوتاہی کرنے کے معنی میں ہے۔ (لسان العرب)

[۲] کامل ابن اثیر جلد ۲، صفحہ ۴۲۵

https://downloadshiabooks.com/

ہوں؟ اور کیا خوف وفتنہ کی وجہ سے لوگوں کو شریک نہیں کیا تھا؟ یہ وہ سوالات ہیں جن کا ہر محقق کو جواب دینا چاہیے۔

۲۔ ابولؤلؤ کا واقعہ اور خلیفۂ سوّم کی حکومت کا آغاز

ابن اثیر نے کتاب کامل میں اس طرح نقل کیا ہے ایک دن خلیفۂ دوّم بازار میں جارہے تھے۔ مغیرہ بن شعبہ کا غلام ابولؤلؤ جو نصرانی تھا، اُس نے ان سے ملاقات کی اور کہا، مغیرہ بن شعبہ نے ایک سنگین خراج رکھا ہے، مجھے اس نے مجبور کردیا ہے کہ تمام دن کام کروں اور اُس میں سے خطیر رقم ان کے حوالے کروں؛ مجھے اس کے مدمقابل مددگار کی ضرورت ہے؛ خلیفۂ دوّم نے کہا، خراج کس حد تک ہے؟ کہا، ہر دن دو درہم؛ خلیفۂ دوّم نے کہا، تمہارا کام کیا ہے؟ اس نے کہا، میں ترکھان، نقاش اور لوہار ہوں؛ خلیفۂ دوّم نے کہا، اس حوالے سے تو خراج زیادہ نہیں ہے۔ میں نے سنا ہے کہ تمہارا دعویٰ ہے کہ تم کوئی ایسی چکی تیار کرسکتے ہو، جو ہوا کے ذریعے گندم کو پیس کر آٹا بنادے؟ فیروز عرف ابولؤلؤ نے کہا: ہاں! ایسا کرسکتا ہوں۔ خلیفۂ دوّم نے کہا: پس اس کام کو انجام دو؛ ابولؤلؤ نے کہا: اگر میں زندہ رہا تو آپ کے لیے ایک چکی تیار کرلوں گا، جس کے بارے میں مشرق ومغرب کے لوگ گفتگو کریں گے۔ ابولؤلؤ یہ کہہ کر چلا گیا۔

خلیفۂ دوّم نے کہا، اس غلام نے مجھے دھمکی دی ہے۔ چند دنوں کے بعد خلیفۂ دوّم نماز صبح کے لیے مسجد میں آئے اور چند لوگوں کو مقرر کیا کہ جب صفیں منظم ہوجائیں تو تکبیر کہیں۔ ابولؤلؤ ان لوگوں میں شامل ہوگیا۔ اس وقت اس کے ہاتھ میں ایسا خنجر تھا جو دوہرا تھا (یعنی اس کا دستہ درمیان میں تھا اور پھل دونوں طرف تھا) اس نے موقع سے فائدہ اٹھاتے ہوئے خلیفۂ دوّم پر چھ وار کیے، جن میں سے ایک ان کے زیرناف لگا اور آر پار ہوگیا، اسی زخم سے ان کا انتقال ہوا۔ اسی خنجر سے اس نے ''کلیب'' جو خلیفۂ دوّم کے پیچھے کھڑے تھے، کو قتل کیا اور کچھ دوسرے لوگوں کو قتل اور زخمی کیا۔ [1]

''مروج الذہب'' میں اس واقعے کو نقل کرنے کے بعد لکھا گیا ہے کہ ابولؤلؤ نے خلیفۂ دوّم کو قتل کرنے کے بعد مزید بارہ لوگوں کو زخمی کیا، جن میں سے چھ افراد جاں بحق ہوگئے، اس کے بعد اس نے اسی خنجر سے اپنے گلے پر وار کیا اور خودکشی کرلی۔ [2] لیکن تاریخ یعقوبی میں بتایا گیا ہے کہ خلیفۂ دوّم کے قتل کے بعد ان کے بیٹے عبداللہ نے باپ کے خون کا بدلہ لینے کے لیے حملہ کرکے ابولؤلؤ، اس کی بیوی اور کمسن بیٹی، تینوں کو قتل کردیا۔

اب رہی یہ بات کہ جو بعض مورخ لکھتے ہیں کہ ابولؤلؤ نصرانی یا مجوسی تھا اور قتل خلیفۂ دوّم کے لیے مسجد آیا تھا، کسی

---

[1] کامل ابن اثیر: جلد ۳ صفحہ ۴۹

[2] مروج الذہب: جلد ۲ صفحہ ۳۲۱

https://downloadshiabooks.com/

طرح قرین قیاس نہیں، کیونکہ ایک عیسائی یا مجوسی کا مسجد میں داخل ہونا بہت مشکل تھا۔ بظاہر اس خیال کی ضرورت مورخوں کو اس لیے پڑی کہ وہ خلیفہ کے ایک مسلمان کے ہاتھوں قتل ہونے پر پردہ ڈال سکیں اور اس طرح اس سے پیدا ہونے والی صورت حال سے بچ سکیں ورنہ تمام قرائن اس کی نشاندہی کرتے ہیں اور تمام مورخین نے تصریح کی ہے کہ ابولولو مسلمان تھا۔ اس کا سابقہ مجوسی یا نصرانی ہونا تنہا اس سے مخصوص نہیں، کیوں کہ غالباً خلفا اور اصحابِ رسولؐ میں بھی ایسے لوگ تھے، جو قبول اسلام سے پہلے دوسرے مذاہب کے پیروکار تھے۔

۳۔ چھے آدمیوں کی شوریٰ اور اس کا انجام

خلیفۂ دوّم نے انتقال کے وقت مشورہ کیا اور اس مشورے کو کہ عبداللہ ابن عمر (اپنے بیٹے) کو خلیفہ بنایا جائے، قبول نہیں کیا اور کہا کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم چھے آدمیوں سے راضی تھے۔ ان میں حضرت علی علیہ السلام، حضرت عثمان، طلحہ، زبیر، سعد بن ابی وقاص اور عبدالرحمٰن ابن عوف تھے، اس لیے ان چھے آدمیوں کے مشورے سے خلیفہ مقرر کیا جائے، اور ان میں سے کسی ایک کو خلیفہ بنایا جائے۔ پھر حکم دیا، ان چھے افراد کو بلایا جائے، پھر ان کی طرف دیکھا اور کہا تم سب اس بات کے لیے تیار ہو کہ میرے بعد تم میں سے کوئی خلیفہ بنایا جائے، یہ سب خاموش رہے، پھر اس جملے کو خلیفۂ دوّم نے دہرایا؛ زبیر نے جواب دیا: ہم تم سے کم نہیں ہیں تو خلافت کو حاصل کیوں نہیں کر سکتے؟ (ایک مورّخ نے لکھا ہے کہ اگر زبیر کو خلیفۂ دوّم کی موت کا یقین نہ ہوتا تو یہ جملہ نہ کہتا) پھر خلیفۂ دوّم نے ان چھے میں ہر ایک کے بارے میں کوئی نہ کوئی عیب بیان کیا۔ طلحہ سے کہا: جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم اس دنیا سے گئے تو تیرے اس جملے کی وجہ سے جو تو نے آیۂ حجاب کے بارے میں کہا تھا، ناراض ہو گئے تھے۔ [۱]

حضرت علیؑ سے کہا: تم لوگوں کو سیدھے راستے پر اچھی طرح ہدایت کرتے ہو لیکن صرف تم میں عیب یہ ہے کہ بہت مذاق کرتے ہو، خلیفۂ سوّم سے کہا، میں دیکھ رہا ہوں قریش نے خلافت کو تیرے سپرد کر دیا ہے، تم بنی امیہ اور بنی ابن معیط کو اپنے اوپر حاوی کرو گے اور بیت المال ان کے حوالے کر دو گے، اور عرب کے بھیڑیے صفت کچھ افراد تمہیں بستر پر قتل کریں گے۔ آخر کار ابوطلحہ انصاری کو بلایا اور حکم دیا کہ میرے دفن کے بعد انصار کے پچاس افراد کو جمع کرنا اور ان چھے آدمیوں کو ایک گھر میں جانشین مقرر کرنے کے لیے اکٹھا کرنا۔ جب پانچ کسی ایک پر متفق ہو جائیں اور کوئی ایک ان پانچ کی

---

[۱] آیۂ حجاب سے مراد "فَسْئَلُوهُنَّ مِن وَّرَآءِ حِجَابٍ" ہے جو رسول اکرم صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کی بیویوں کے بارے میں ہے۔ طلحہ نے کہا رسولؐ چاہتے ہیں آج اپنی بیویوں کو ہم سے چھپائیں۔ لیکن جب کل اس دنیا سے رسولؐ چلے جائیں گے تو ہم ان سے شادی کریں گے۔ لیکن یہ حضرت عمر کا کہنا طلحہ کے بارے میں خود اس میں تناقض ہے، کیونکہ پہلے کہا کہ جب رسول اکرم صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم دنیا سے گئے، ان چھے افراد سے راضی تھے۔

https://downloadshiabooks.com/

مخالفت کرے تو اس کو قتل کر دینا۔ اسی طرح چار افراد ایک فرد پر متفق ہو جائیں دو مخالفت کریں تو ان دو کو قتل کر دینا۔ اور اگر تین ایک طرف اور دوسرے تین ایک طرف ہو جائیں تو جن تین افراد میں عبدالرحمٰن بن عوف ہو ان کو ترجیح دینا اور اگر دوسرے تین افراد مخالفت کریں تو ان تینوں کو قتل کر دینا اور اگر تین دن گزر جائیں اور کسی کو یہ جانشین مقرر نہ کر پائیں تو تمام چھے افراد کو قتل کر دینا۔ اور مسلمان خود اپنے لیے خلیفہ مقرر کر لیں۔

طلحہ جانتا تھا حضرت علیؑ اور خلیفۂ سوّم کے ہوتے ہوئے خلافت تک نہیں پہنچ پائے گا، اور حضرت علیؑ سے طلحہ خوش نہیں تھا اس لیے خلیفۂ سوم کی طرف ہو گیا، زبیر نے اپنا حق حضرت علیؑ کو دے دیا، سعد بن ابی وقاص نے اپنا حق اپنے چچازاد بھائی عبدالرحمٰن بن عوف کو دیا، اس بنا پر چھے افراد تین میں تبدیل ہو گئے۔ حضرت علیؑ، حضرت عثمان، عبدالرحمٰن بن عوف، عبدالرحمٰن حضرت علی علیہ السلام سے مخاطب ہوا اور کہا، میں تمہاری بیعت کرتا ہوں تم کتاب خدا، سنت رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور سیرت شیخین پر عمل کریں۔ حضرت علی علیہ السلام نے جواب دیا، میں قبول کرتا ہوں، لیکن میں کتاب خدا، سنت رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور اپنے طریقے پر عمل کروں گا۔

عبدالرحمٰن نے خلیفۂ سوّم سے خطاب کیا اور اس جملے کو دہرایا، خلیفۂ سوم نے اس کو مان لیا، عبدالرحمٰن نے اس جملے کو تین بار تکرار کیا اور وہی جواب سنا۔ لہٰذا خلیفۂ سوّم کو خلافت دے دی گئی۔ یہاں حضرت علی علیہ السلام نے عبدالرحمٰن سے فرمایا ''خدا کی قسم! تُو نے یہ کام صرف اس لیے کیا، کیونکہ تجھے وہی توقع ہے جو خلیفۂ اوّل و دوّم ایک دوسرے سے رکھتے تھے، لیکن تو ہرگز اپنی خواہش کو نہ پا سکے گا۔''[1] اس شوریٰ پر بہت سے سوالات اٹھتے ہیں:

پہلا سوال: اگر یہ انتخاب لوگوں کی آراء سے ہوا تو عام لوگوں کے درمیان کیوں نہ ہوا، اور اگر انتخاب ہوا تو چھے آدمیوں کی شوریٰ کیوں بنی، کیا اور دوسرے معزز افراد موجود نہیں تھے؟

دوسرا سوال: اگر ان سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم راضی تھے تو خلیفۂ دوّم نے طلحہ کے بارے میں جملہ کیوں کہا تھا؟

تیسرا سوال: اگر فرض کر لیں کہ یہ چھے نفر کسی پر یکجا نہ ہوں تو ان کا قتل جائز کیسے ہوا؟

چوتھا سوال: اگر حقیقتاً شوریٰ کی اہمیت تھی تو خلیفۂ سوّم کا نام واضح طور پر خلیفہ کے لیے کیوں لیا گیا، اور خلیفۂ سوّم کو خلیفہ بنانے سے کسی قسم کا خوف تھا تو ان کو شوریٰ کا رکن نہ بنایا ہوتا، تاکہ کوئی دوسرا منتخب ہو جائے؟

پانچواں سوال: اس صورت میں جب تین ایک طرف اور تین دوسری طرف ہوں تو جس طرف حضرت علی علیہ السلام ہوں اس کو کیوں منتخب نہ کیا جائے، جبکہ خلیفۂ دوّم نے خود کہا تھا، حضرت علی علیہ السلام بہترین فرد ہیں لوگوں کی ہدایت کے لیے، لیکن

---

[1] شرح نہج البلاغہ ابن ابی الحدید ج ۱ ص ۱۸۰، ۱۸۸ (تلخیص کے ساتھ)

https://downloadshiabooks.com/

مذاق بہت کرتے ہیں۔

چھٹا سوال: کیا مذاق کرنے سے امور خلافت میں کوئی مشکل پیش آسکتی تھی؟اور کیا یہ اشکال اس کے برابر ہے جو خلیفۂ سوّم پر کیا کہ تو منتخب ہو کر بنی امیّہ کو لوگوں پر مسلط کرے گا اور بیت المال کو غارت کرے گا، یہ وہ اشکالات ہیں جن کا جواب نہیں ہے؟

۴۔خلیفۂ سوّم کے خلاف تحریک کی وجوہات

نہج البلاغہ کی شرح کرنے والوں میں خلیفۂ سوّم کے متعلق صحیح ترین قول ''طبری'' کا ہے، جو لکھتے ہیں: خلیفۂ سوّم اسلام میں نئی باتیں لے کر آئے جس کی وجہ سے مسلمان غصے میں آگئے، بالخصوص امارات کو بنی امیہ کے فاسقوں، سفی ہوں اور ان کے بے دین افراد کو سونپنا، مالِ غنیمت عطا کرنا، ابوذرؓ، عمار یاسرؓ، عبداللہ ابن مسعودؓ پر ظلم وستم کرنا اور اس طرح دوسرے کام جو انہوں نے اپنی خلافت کے آخری زمانے میں انجام دیے۔

ولید بن عقبہ کو کوفے کا والی بنایا، جبکہ کچھ لوگوں نے اس کی شراب خوری پر گواہی بھی دی، ولید کے بعد سعید بن عاص کو والیِ کوفہ بنایا، سعید کا یہ عقیدہ تھا کہ عراق بنی امیہ اور قریش کا ایک باغ ہے۔ حضرت مالکِ اشترؓ نے ان کو جواب دیا: ''تُو گمان کرتا ہے کہ عراق، جس کو خدا نے ہم مسلمانوں کی تلوار کے ذریعے فتح کیا، تیرا اور تیری قوم کا حصہ ہے۔'' اس لیے اشترؓ اور قبیلہ نخع ایک طرف اور دوسری طرف پولیس کے سربراہ میں رنجشیں شروع ہوگئیں اور لوگوں کے اعتراضات سعید کے خلاف بڑھنا شروع ہوگئے۔ پھر وہ خلیفۂ سوّم کے خلاف ہوگئے۔ خلیفۂ سوّم بجائے اس کے کہ تحریک کو منطقی طریقے سے ٹھنڈا کرتے، انہوں نے تحریک کے رہبروں کو شام بھیجنا شروع کر دیا، اُس میں مالک اشترؓ اور صعصعہ بن صوحانؓ بھی شامل تھے۔

اُن کی خلافت کے گیارہویں سال کچھ اصحاب رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم جمع ہوئے، اپنی مشکلات عامر بن عبد قیس کے ذریعے (جو عابد وزاہد انسان تھے) خلیفۂ سوّم تک پہنچائیں۔ خلیفۂ سوّم نے ایسا جواب دیا جس سے ان کی اہانت ہوئی۔ چنانچہ مدینے کی حالت بھی بحران کا شکار ہونے لگی اور اسلام کے دار الخلافے میں شورش کی لہریں موج زن ہونے لگیں۔ خلیفۂ سوّم نے امیر شام، سعید بن عاص اور دوسرے ساتھیوں کو بلایا اور مشورہ کیا، بعض نے مشورہ دیا، لوگوں کو جنگ میں مصروف کردو، بعض نے کہا، مخالفین سے لڑو۔ بعض نے کہا، بیت المال سے عطیات دو، تاکہ غصہ اور مخالفت کم ہوجائے۔ صرف ایک آدمی نے حقیقت بیان کی کہ تم نے بنی امیہ کو لوگوں پر مسلط کیا ہے لہٰذا یا عدالت کرو یا خلافت چھوڑ دو۔ خلیفۂ سوّم نے جہاد والی

https://downloadshiabooks.com/

رائے کو پسند کیا اور حکم دیا لوگوں کو جہاد میں مشغول کرنے کا سامان فراہم کرو۔ (لیکن وقت گزر چکا تھا)

۳۵ھ (خلیفۂ سوّم کی حکومت کا آخری سال) خلیفۂ سوّم اور بنی امیہ کے مخالفوں میں مکاتبہ ہوا۔ خلیفۂ سوّم کو معزول کرنے کے لیے ابوحرب کی سربراہی میں مصر سے دو ہزار افراد پر مشتمل ایک گروہ زید بن صوحانؓ و مالک اشترؒ کی قیادت میں اور کوفے کے بعض بزرگ افراد اور بصرے سے تیسرا گروہ حرقوص بن زبیر کی قیادت میں خانہ کعبہ کی زیارت کے لیے سفر شروع کرتے ہوئے مدینہ پہنچے اور مدینے کے لوگوں کو اپنے عزائم (خلیفۂ سوّم اور ان کے مقرر کردہ حکام کی معزولی) کے بارے میں آگاہ کیا۔ کچھ ہی دیر بعد خلیفۂ سوّم کے گھر کا محاصرہ ہو جاتا ہے ان سے کہا جاتا ہے کہ حکومت چھوڑ دیں۔ لیکن خلیفۂ سوّم نے اپنے والیوں سے مدد چاہی، جمعہ کے روز خلیفۂ سوّم نے مسجد میں نماز پڑھی اور منبر پر آکر خطاب کیا خصوصاً ان افراد سے جو مختلف جگہوں خاص طور پر مصر سے آئے تھے، ان سے کہا، مدینے والے سب جانتے ہیں کہ تم پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے لعنت کی تھی، اس جملہ پر شور شرابا شروع ہوتا ہے اور خلیفۂ سوّم خوف سے بے ہوش ہو کر منبر سے نیچے گرتے ہیں، اور لوگ انہیں اٹھا کر گھر لے جاتے ہیں۔

پھر خلیفۂ سوّم مدد حاصل کرنے کے لیے حضرت علیؑ کے گھر آئے اور کہا: آپؑ میرے چچازاد ہیں، رشتے داری کی وجہ سے آپؑ پر میرا حق ہے، آپؑ کی قدر و منزلت لوگوں کے درمیان قائم ہے اور لوگ آپؑ کی بات بھی مانتے ہیں، آپؑ لوگوں سے کہیں، جس راستے کو چنا ہے، اسے چھوڑ دیں، امامؑ نے فرمایا: کس طرح ان کو راستہ چھوڑنے پر تیار کروں، خلیفۂ سوّم نے کہا، آپؑ لوگوں سے کہیں کہ آج کے بعد خلیفۂ سوّم میرے مشورے پر عمل کریں گے، امامؑ نے فرمایا: میں نے تم سے کتنی بار ایسا کرنے کو کہا، تم نے وعدہ کیا لیکن اس پر عمل نہیں کیا۔

بہرحال امامؑ اس فتنے کو ٹھنڈا کرنے کے لیے تیس ایسے افراد کو جو انصار و مہاجرین میں سے تھے جن کا تعلق مصر سے تھا اور وہ خلیفۂ سوّم کی معزولی کی کوششوں میں دوسروں سے زیادہ فعال تھے، حضرت علیؑ کے کہنے پر وہ مصر چلے جاتے کہ خلیفۂ سوّم شکایات دور کرنے کا وعدہ کر رہے ہیں اور سابقہ حکام کو معزول کر دیں گے، لیکن جب خلیفۂ سوّم گھر آئے، دیکھا مروان بنی امیہ کے کچھ افراد کے ساتھ گھر میں موجود ہے۔ مروان نے خلیفۂ سوّم سے کہا، گفتگو کروں یا خاموش بیٹھا رہوں۔ خلیفۂ سوّم کی اہلیہ نائلہ غصے سے کہتی ہیں، ''خاموش ہو جاؤ، خدا کی قسم! تم خلیفۂ سوّم کے قاتل اور ان کے بچوں کو یتیم کرنے والے ہو، اسے چاہیے کہ لوگوں سے جو جو وعدے کیے ہیں انہیں پورا کر دے اور کسی صورت ان وعدوں سے منحرف نہ ہو۔'' مروان بولا: تم نے جو مسجد میں کہا، وہ تمہاری خلافت کے لیے صحیح نہیں اس پر نظر ثانی کرو اور اس پر عمل نہ کرو۔ یہ خبر جب پھیلی کہ ایسا مشورہ ہوا ہے تو حضرت علیؑ غصے کے عالم میں خلیفۂ سوّم کے گھر تشریف لائے اور فرمایا: میں تمہیں صحیح راستہ دکھاتا ہوں اور

https://downloadshiabooks.com/

مروان تمہیں منحرف کردیتا ہے۔ آج کے بعد اس سے مشورہ لیا کرو، میں آئندہ تمہارے پاس نہیں آؤں گا۔

مصر والے جو واپس چلے گئے تھے، تین دن بعد پلٹ آئے اور وہ خط جو خلیفۂ سوّم کے غلام سے راستے میں پکڑا تھا اس کو حضرت علی علیہ السلام کے سامنے رکھا، جس میں خلیفۂ سوّم نے عبداللہ بن صرح کو جو مصر کا گورنر تھا، حکم دیا تھا، جن لوگوں نے فساد پھیلایا ہے ان کے رہبروں کو کوڑے مارو، ان کے سروں اور چہروں کے بالوں کو منڈوا کر قید کردو اور بعض کے لیے حکم دیا تھا کہ سولی پر لٹکا دو۔ حضرت علیؑ نے اس واقعے کے بارے میں خلیفۂ سوّم کو بتایا، خلیفۂ سوّم نے اس طرح کے کسی خط سے لاعلمی کا اظہار کیا، ایک نے کہا: یہ مروان کا کام ہے، اس پر خلیفۂ سوّم نے کہا، مجھے معلوم نہیں۔

مصریوں نے کہا: کیا مروان اتنا طاقتور ہے کہ خلیفۂ سوّم کے غلام کو بیت المال کے اونٹ پر سوار کر کے خط بھیجے اور جس پر خلیفہ کی مخصوص مہر بھی لگی ہو؟ اتنے خطرناک خط کا بھیجنا اور خلیفۂ سوّم اس سے بے خبر ہیں؟ خلیفۂ سوّم نے پھر کہا، میں اس خط کے بارے میں کچھ نہیں جانتا۔ مصریوں نے کہا: دو باتوں میں سے کوئی ایک بات ضرور ہے، اگر یہ مروان کا کام ہے تو تم خلافت چھوڑ دو، کیونکہ اتنا کمزور خلیفہ کہ دوسرے اس کی اجازت کے بغیر مسلمانوں کے قتل عام کا حکم دیں اور خط پر خلیفہ کی مخصوص مہر بھی ثبت ہو، وہ مسلمانوں پر حکومت کرنے کے لائق نہیں۔ اور اگر یہ کام تمہارا ہے اور جھوٹ بول رہے ہو، پھر بھی تم خلافت کے لائق نہیں ہو۔

خلیفۂ سوّم نے کہا: خلافت وہ لباس ہے جو خدا نے مجھے پہنایا ہے، میں اس کو نہیں اتاروں گا، لیکن توبہ کرتا ہوں۔ مصریوں نے کہا: اگر پہلی دفعہ توبہ کرتے تو ہم قبول کر لیتے لیکن تم نے کتنی مرتبہ توبہ کی اور پھر توبہ کے بعد پھر وہی کام کیا لہٰذا تم خلافت چھوڑ دو۔ اس سے کم پر ہم راضی نہیں اور اگر نہیں چھوڑو گے تو ہم تمہیں قتل کر دیں گے، صورتحال وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ پیچیدہ تر ہوتی چلی گئی، خلیفۂ سوّم نے حضرت علیؑ سے تین دن کی مہلت مانگی تاکہ لوگوں کی شکایات دور کر کے ان کے مسائل حل کریں، لوگوں نے اس کو مان لیا۔

لیکن خلیفۂ سوّم مخفیانہ انداز سے جنگ کا سامان جمع کر رہے تھے (مہلت مانگنے کا مقصد یہ تھا کہ مدینے کے باہر سے ان کی مدد کے لیے لوگ آ جائیں) تین دن کے بعد خلیفۂ سوّم پر محاصرہ تنگ کر دیا گیا، کیونکہ محاصرہ کرنے والے لوگ خوفزدہ تھے کہ کہیں شام و بصرہ سے مدد کے لیے لوگ نہ آ جائیں، اس لیے خلیفۂ سوّم کا پانی بند کر دیا، تاکہ مطالبہ جلد تسلیم کر لیا جائے۔ خلیفۂ سوّم، حضرت علیؑ سے پانی مانگتے ہیں، امام علیؑ نے اپنے بیٹوں کے ذریعے پانی پہنچوایا۔ اس دوران لوگ خلیفۂ سوّم کے گھر میں داخل ہو گئے اور خوں ریزی شروع ہوگئی، کچھ افراد قتل ہوئے، کچھ افراد خلیفۂ سوّم کے کمرے میں داخل ہو گئے اور اُن کو نصیحتیں کرنے لگے، لیکن خلیفۂ سوّم پر کوئی اثر نہ ہوا، پھر انہوں نے ان پر حملہ کر دیا۔

https://downloadshiabooks.com/

یہ خلاصہ تھا جو ابن ابی الحدید نے تاریخ طبری سے نقل کیا ہے۔ ہم نے بھی طوالانی ہونے کے سبب خلاصہ کر دیا۔[1]
بہت سے مورّخ خلیفۂ سوّم کے قتل کو ۱۸ ذی الحجہ سن ۳۵ یا ۳۶ ہجری ذکر کرتے ہیں، حیرت ہے اس پر جو کامل ابن اثیر اور دوسرے مورخین نے لکھا کہ خلیفۂ سوّم کی لاش تین دن تک دفن نہیں ہوئی، اس سے معلوم ہوتا ہے لوگوں کو خلیفۂ سوّم پر کتنا شدید غصہ تھا۔ حضرت علیؑ کی مدد سے ان کے دفن کا بندوبست کیا گیا، کچھ لوگ ان کی نماز جنازہ اور دفن کے مخالف تھے، یہ لوگ راستے میں بیٹھ گئے اور جنازے پر پتھراؤ شروع کر دیا، حضرت علیؑ نے انہیں اس سے روکا۔ نمازِ جنازہ کے بعد ان کو ''حشِ کوکب'' جو بقیع کے باہر کا علاقہ تھا وہاں دفن کر دیا گیا۔ امیر شام کے زمانے میں ''حش کوکب'' کو بقیع میں شامل کر دیا گیا، تا کہ یہ اہانت ختم ہو جائے کہ عثمان بقیع میں دفن نہ ہو سکا۔[2]

یہ تمام باتیں واضح کرتی ہیں کہ لوگ کس حد تک خلیفۂ سوّم اور اُن کی حکومت سے ناراض تھے اور یہ بات ان جملوں سے جو امامؑ نے خطبۂ شقشقیہ میں بیان فرمائے، واضح ہو جاتی ہے۔ وہ جو امام علیہ السلام کی ان تعبیروں کو جو آپؑ نے خطبے میں بیان فرمائی ہیں، قبول نہیں کرتے، درحقیقت خلیفۂ سوّم کی زندگی اور ان کے کاموں سے آگاہی نہیں رکھتے، ورنہ وہ تصدیق کرتے کہ امامؑ نے بالکل صحیح تعبیرات استعمال کی ہیں۔

۵۔ کیا تمام صحابہ، رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے راستے پر گامزن رہے؟

اہل سنّت کے ہاں یہ مشہور ہے کہ تمام صحابۂ رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم قابل احترام و عادل تھے۔ کسی نے کوئی کام خدا و قرآن اور رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے دستور کے خلاف انجام نہیں دیا جبکہ شیعہ اور اہل بیت علیہم السلام کے چاہنے والے اس بات پر اعتقاد رکھتے ہیں کہ تمام صحابہ کو ایک جیسا نہ کہو بلکہ ان کے اعمال کے مطابق اچھا یا برا کہا جائے چاہے حیاتِ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم میں اعمال ہوں یا بعد از رحلت رسولؐ اہل سنت کا یہ نظریہ بہت ساری مشکلات کو جنم دیتا ہے، کیونکہ صحابۂ رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے درمیان ایسے افراد ہیں جو بہت سے مسائل میں ایک دوسرے کی ضد ہیں، جس کی توجیہہ ممکن نہیں ہے۔

مثال کے طور پر جنگ صفین میں امیر شام، مولا علیؑ سے جنگ کرتا ہے جبکہ حضرت علی علیہ السلام کو تمام مسلمانوں نے منتخب کیا، کون سا منصف مزاج مورّخ اس وحشت ناک کام کی توجیہہ پیش کر سکتا ہے۔ یا طلحہ و زبیر نے حضرت علیؑ کے خلاف بغاوت کی اور جنگ جمل میں کتنا خون بہایا گیا، بہت سے مورّخ ۱۷ ہزار سے زیادہ افراد بیان کرتے ہیں، جو جنگ جمل میں

---

[1] شرح نہج البلاغہ ابن ابی الحدید ج ۲، ص ۱۲۹ تا ۱۵۸
[2] کامل ابن اثیر، ج ۳، ص ۱۸۰

https://downloadshiabooks.com/

قتل ہوئے، آیا ان افراد کو ان واقعات کے بعد بھی عادل مانا جا سکتا ہے۔

خلیفۂ سوم کے بارے میں جیسا کہ پہلے بیان کیا جا چکا ہے تمام مورّخین اسلام اجمالاً قبول کرتے ہیں کہ دو اہم وجوہات کی بنا پر انہوں نے یہ سختی برداشت کی، ایک یہ کہ اہم وحساس عہدے بنی امیہ کو سونپے گئے اور دین سے دور افراد کو مسلمانوں پر مسلط کر دیا گیا، جس کے نتیجے میں مختلف علاقوں سے آوازیں بلند ہونا شروع ہو گئیں۔ دوسرے بیت المال کا بے جا استعمال، وسیع پیمانے پر ہدایا و نذورات کا دیا جانا یہ بھی نا قابل توجیہہ ہے۔

آیا اس طرح کے امور انجام دینے کے باوجود تمام صحابہ کے پاک ہونے، ان کی بزرگی و احترام کا قائل ہونا، مناسب ہے یا ہم استثنیٰ کے قائل ہوں، یعنی تمام صحابہ قابل احترام نہیں بلکہ اپنے اعمال کی وجہ سے محترم ہیں۔ اگر آپ توجیہہ کریں صحابہ کے کاموں کی تو کون سا فعل ایسا ہے جس کی توجیہہ نہ کر سکیں؟ اس کلام نے مجھے ایک ایسے واقعے کو یاد دلا دیا جو خود میرے ساتھ پیش آیا، جس کو بھلا نہیں سکتا، ایک سال عمرہ ادا کرنے کے لیے گیا، موقع میسر آیا کہ اہل سنّت کے دانشمندوں سے مل سکوں، خصوصاً رات کے وقت اور مغرب وعشاء کے درمیان مسجد الحرام میں موقع ملتا تھا ان سے گفتگو کرنے کا، ایک رات ان برادران اہل سنّت کے افراد (جن میں بعض معروف افراد بھی تھے) کے ساتھ خانۂ کعبہ کے سامنے بیٹھ کر گفتگو ہوئی، کوشش یہ تھی کہ گفتگو علمی رہے اور منطق واستدلال کے علاوہ نہ ہو، تا کہ دل آزاری کا سبب نہ بنے۔

مسئلہ صحابہ کی تنزیہ اور عدالت کا بھی آ گیا، وہ معتقد تھے کہ چھوٹے سے چھوٹا لفظ بھی استعمال نہ کریں جس سے ان کی توہین کا پہلو سامنے آئے، میں نے ایک سے سوال کیا، اگر آپ صفین میں ہوتے تو آپ امیر شام کے لشکر میں ہوتے یا حضرت علیؑ کے لشکر میں؟ اس نے فوراً کہا، حضرت علیؑ کے لشکر میں۔ میں نے کہا، اگر حضرت علیؑ تمہیں تلوار دیتے اور کہتے ''خُذْ هٰذَا وَاُقْتُلْ مُعَاوِيَةَ'' یہ تلوار لو اور امیر شام کو قتل کر دو۔ تو تم اطاعت کرتے؟ اس نے عجیب سا جواب دیا شاید آپ کو بھی چونکا دے، اس نے کہا: ''كُنْتُ اَقْتُلُهٗ وَلَا اَذْكُرُهٗ بِسُوْءٍ'' میں اس کو قتل کر دیتا لیکن کوئی ایسا کام یا کلام نہ کرتا، جس سے اس کی توہین ہوتی ہو۔ ''تنزیہ صحابہ'' کا قصہ بہت طویل ہے، یہاں گنجائش نہیں کہ اس کو اور زیادہ وضاحت سے بیان کیا جائے۔

چوتھا حصّہ

فَمَا رَاعَنِي اِلَّا وَ النَّاسُ كَعُرْفِ الضَّبُعِ اِلَيَّ يَنْثَالُونَ عَلَيَّ مِنْ كُلِّ جَانِبٍ حَتَّى لَقَدْ وُطِئَ الْحَسَنَانِ وَ شُقَّ عِطْفَايَ مُجْتَمِعِيْنَ حَوْلِيْ كَرَبِيضَةِ الْغَنَمِ فَلَمَّا نَهَضْتُ بِالْاَمْرِ نَكَثَتْ طَائِفَةٌ وَ مَرَقَتْ اُخْرَى وَ قَسَطَ آخَرُونَ كَاَنَّهُمْ لَمْ يَسْمَعُوا اللهَ سُبْحَانَهُ يَقُولُ تِلْكَ الدَّارُ الْآخِرَةُ نَجْعَلُهَا

https://downloadshiabooks.com/

لِلَّذِینَ لا یُرِیْدُونَ عُلُوًّا فِی الْاَرْضِ وَ لا فَسادًا وَ الْعاقِبَۃُ لِلْمُتَّقِینَ بَلیٰ وَ اللہِ لَقَدْ سَمِعُوھا وَ وَعَوْھا وَ لٰکِنَّھُمْ حَلِیَتِ الدُّنْیا فِی اَعْیُنِھِمْ وَ رَاقَھُمْ زِبْرِجُھا.

’’اُس وقت مجھے جس چیز نے دہشت زدہ کردیا، یہ تھی کہ لوگ بجّو کی گردن کے بال کی طرح میرے گرد جمع ہو گئے اور چاروں طرف سے میرے اوپر ٹوٹ پڑے، یہاں تک کہ حسنؑ وحسینؑ کے کچل جانے کا خدشہ پیدا ہوا اور میری ردا کے کنارے پھٹ گئے۔ یہ سب میرے گرد بکریوں کے گلّے کی طرح گھیرا ڈالے ہوئے تھے،لیکن جب میں نے ذمے داری سنبھالی اور اٹھ کھڑا ہوا تو ایک گروہ نے بیعت توڑ دی اور دوسرا دین سے باہر نکل گیا اور تیسرے نے فسق اختیار کرلیا، جیسے کہ ان لوگوں نے یہ ارشادِ الٰہی سنا ہی نہیں ہے کہ ’’یہ دارِ آخرت ہم صرف ان لوگوں کے لیے قرار دیتے ہیں جو دنیا میں بلندی اور فساد نہیں چاہتے ہیں اور عاقبت صرف اہل تقویٰ کے لیے ہے۔‘‘ ہاں ہاں خدا کی قسم! ان لوگوں نے یہ ارشاد سنے بھی ہیں اور سمجھے بھی،لیکن دنیا ان کی نگاہوں میں آراستہ ہوگئی اور اس کی چمک دمک نے انہیں لبھالیا۔‘‘

شرح وتفسیر

بیعت کے موقع پر حضرت امام علی علیہ السلام کا خطبہ

امام علی علیہ السلام خطبے کے اس حصے میں اپنی خلافت کے زمانے،خصوصاً بیعت کے وقت کی طرف اشارہ فرمارہے ہیں۔ کس طرح لوگ عجیب وحیرت انگیز طریقے سے امامؑ کی بیعت کے لیے جمع ہو گئے تھے۔ ایسی بیعت جس کی مثال تاریخ اسلام میں کہیں اور نظر نہیں آتی لیکن جب حق وعدالت کا وقت آیا تو لوگ عدالت کے متحمل نہیں ہو سکے اور آپؑ کے مخالف ہو گئے اور انہوں نے جنگ جمل وصفین اور نہروان کی آگ کو بھڑکا دیا۔ مسلمانوں کی صفوں میں شگاف ڈالا اور امامؑ کے کاموں میں مانع ہوئے تا کہ اسلامی معاشرہ اپنے کمال تک نہ پہنچ سکے، پہلے آپؑ بیان فرماتے ہیں:

https://downloadshiabooks.com/

"فَمَا رَاعَنِیْ [۱] إِلَّا وَالنَّاسُ كَعُرْفِ [۲] الضَّبُعِ [۳] إِلَیَّ یَنْثَالُوْنَ [۴] عَلَیَّ مِنْ كُلِّ جَانِبٍ"

"کسی چیز نے مجھے پریشان نہیں کیا سوائے اس کے کہ اچانک میں نے دیکھا لوگ کثیر تعداد میں میری طرف آرہے ہیں اور ہر طرف سے گروہ درگروہ میرا رخ کر رہے ہیں۔"

تعبیر، یعنی بجّو کا ازدحام اشارہ ہے ایسے مجمع کی طرف جو بہت زیادہ ہو، ایسا مجمع جہاں سر ہی سر نظر آئیں، جو بیعت کرنے آئے تھے، کیونکہ بجّو کا ازدحام ضرب المثل ہے، جو ایسے مواقع کے لیے استعمال ہوتی ہے۔

اس ازدحام سے جو ناگاہ بیعت کے لیے لوگوں کے جمع ہونے کی وجہ سے تھا، امامؑ کی تشویش شاید اس لیے تھی کہ بیعت کے ذریعے ایک اہم ذمہ داری آپ کے کاندھوں پر آرہی تھی بالخصوص دنیا پرستوں کی بیعت کو توڑنے کی پیش بینی "خطبہ ۹۲" میں اس مطلب کو وضاحت کے ساتھ دیکھ سکتے ہیں کہ امامؑ نے لوگوں کی بیعت اور خلیفۂ سوّم کے قتل کے بعد اس طرف توجہ دلائی ہے، ممکن ہے اس فکر کا سبب وہ حاسد لوگ ہوں جن کے دل سیاہ تھے۔ وہ بیعت اور قتل عثمان میں کوئی سلسلہ جوڑ دیں۔ پھر امامؑ بیان کو بڑھاتے ہوئے تین جملوں کا اضافہ کرتے ہیں:

"حَتّٰی لَقَدْ وُطِیءَ الْحَسَنَانِ، وَشُقَّ عِطْفَایَ، مُجْتَمِعِیْنَ حَوْلِیْ كَرَبِیْضَةِ الْغَنَمِ"

"(ہجوم اس قدر زیادہ تھا) ممکن تھا پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی نشانیاں یعنی امام حسن و حسین علیہما السلام پامال ہو جائیں اور میری ردا دو طرف سے پھٹ گئی، یہ سب اس حال میں تھا کہ لوگ بھیڑ بکریوں کی طرح، جو بھیڑیئے کے خوف سے چرواہے کے گرد جمع ہو جائیں، میرے گرد جمع تھے۔"

الحسنان سے مراد اکثر شارحین کے مطابق امام حسن و حسین علیہما السلام ہیں۔ اس وقت ان دونوں معصومینؑ کی عمر تیس سال سے زیادہ تھی، جوان تھے لیکن لوگوں کا ہجوم اس قدر تھا کہ آپؑ دونوں اپنے والد کی حفاظت میں ایک تنگ راستے میں پھنس گئے۔ لیکن بعض مفسروں نے دو اور احتمال دیے ہیں:

---

[۱] راعنی، مادّہ روع سے ہے۔ بروزنِ نوع۔ اس کے معنی خوف و وحشت کے ہیں کبھی حیرانی کے معنی میں بھی آتا ہے۔

[۲] عرف دراصل بمعنی اس چیز کے ہے جو ایک دوسرے کے پیچھے واقع ہو اور کثرت کی صورت میں ہو۔ اس دلیل کی بنا پر جانوروں کی گردنوں پر بھی اطلاق ہوتا ہے کیونکہ کثیر بال جو پشتِ گردن پر ہوں انہیں تشکیل دیتے ہیں۔

[۳] ضبع، مقائیس کے مطابق اس کے تین معنی ہیں (۱) مشہور حیوان بجّو (۲) انسان کا عضو بازو (۳) اونٹنی کی ایک صفت کبھی یہ سال قحطی سے کنایہ ہے، کیونکہ ایسے وقت بجّو انسانوں پر حملہ کرنے لگتے ہیں۔

[۴] ینثالون مادّہ ثول بروزن قول ہے، معنیٰ شہد کی مکھیوں کی کثرت کے ہیں، جب وہ آمد و رفت کے وقت جمع ہوتی ہیں، پھر ہر اس مجمع کے لیے استعمال ہوتا ہے جو بہت زیادہ ہو۔ (مقائیس اللغۃ، صحاح، لسان العرب)

https://downloadshiabooks.com/

پیر کی دو بڑی انگلیاں ہیں جس طرح سیّد مرتضیٰ نے بیان کیا ہے۔ آپ نے اربابِ لغت (ابوعمر) سے نقل کیا ہے۔ اور عرب کے اشعار کی مثال لے کر آئے ہیں۔ لیکن انگلیوں کا پامال ہونا تو ایک کم مجمع میں بھی ہوسکتا ہے تو ازدحام کا ذکر کرنا مناسب نہیں لگتا۔ اور تیسری تفسیر ہے جس کو بعض نے ذکر کیا ہے: وہ یہ ہے کہ دو ہاتھ کی ہڈیاں مراد لی ہیں چاہے وہ بازو کی ہڈیاں ہوں یا کلائی کی، یہ ہڈیاں پامال نہیں ہوتیں، صرف اس صورت میں ممکن ہے جب انسان زمین پر گر جائے اور لوگوں کے پیروں تلے روندا جائے۔

"رَبِيضَةِ الْغَنَمِ" کی تشبیہ، بھیڑیں جو ایک غول کی صورت میں جمع ہوں، لوگوں کی نادانی کی طرف اشارہ نہیں ہے، جیسا کہ بعض شارحین کا خیال ہے بلکہ اس طرف اشارہ ہے، جیسا اوپر بیان کیا جاچکا ہے کہ جس طرح بھیڑیں بھیڑیے کے خوف سے چرواہے کے گرد جمع ہو جائیں۔ خلیفۂ سوّم کے دور میں لوگ منتشر ہو گئے تھے، وہ وحدت کے رشتے میں جڑ گئے اور امامؑ کو اتصال کا ذریعے قرار دیا اور مولاؑ کے گرد جمع ہو گئے، لیکن صد افسوس یہ اطمینان وسکون زیادہ دیر باقی نہ رہ سکا، جب امتحان کی منزل آئی تو اپنے وعدہ کو وفا نہ کر سکے۔

امامؑ آگے فرماتے ہیں:

"فَلَمَّا نَهَضْتُ بِالْأَمْرِ نَكَثَتْ طَائِفَةٌ، وَمَرَقَتْ أُخْرَىٰ [1] وَقَسَطَ [2] آخَرُونَ"

''امرِ خلافت کے قیام کے وقت لوگوں نے عہد توڑ دیا (فضول بہانے بنا کر اطاعت سے منہ موڑ لیا) دین خدا سے فرار کیا۔ دوسرے گروہ نے ظلم کا راستہ اختیار کیا اور حق کی اطاعت سے سرکشی کی۔''

یہ تین گروہ جس طرح اکثر یا سب شارحین نے کہا، وہ ہیں جنھوں نے جنگ جمل ونہروان وصفین کی آگ کو بھڑکایا یعنی ان جنگوں کا سبب بنے۔ جنگ جمل کی آگ لگانے والے (طلحہ وزبیر تھے جنہوں نے حضرت عائشہ کو استعمال کیا) یہ ناکثین تھے یعنی عہد توڑنے والے۔ انھوں نے امام علی علیہ السلام کی بیعت کی لیکن خلافت میں جب ان کی امیدیں (یعنی

---

[1] مرق، مادّہ مروق (غروب کے وزن پر) سے ہے خارج ہونے کے معنی میں ہے، جو کسی شے سے خارج ہوگئی ہو۔ تیر ہدف کی طرف جائے، صحاح اللغۃ اور لسان العرب۔ مفہوم یہ ہے کہ تیر اپنے ہدف سے گزر جائے۔ اس وجہ سے خوارج کو مارقین کہتے ہیں کیونکہ وہ افراطی ومتعصب ولج باز تھے اور امام علیؑ سے زیادہ اپنے آپ کو مسلمان سمجھتے تھے۔

[2] قسط، کبھی ظلم اور حق سے پھر جانے کے لیے آتا ہے قسط (فقط کے وزن پر) ان افراد کو کہتے ہیں جن کے پیر کج ہوں کبھی عدالت کے لیے آتا ہے۔ راغب نے مفردات میں قسط کے معنی حصہ وسہم کے لکھے ہیں۔ جب کسی کا حصہ لیا جائے، اُسے قسط کہتے ہیں یہ ظلم کا مصداق ہے۔ اقساط کسی کے حصے کو ادا کرنا یہ عین عدالت ہے، دونوں معنی ایک ہی اصل سے لیے گئے۔ لسان العرب میں حضرت علیؑ سے حدیث نقل ہوئی ہے کہ (أُمِرْتُ بِقِتَالِ النَّاكِثِينَ وَالْقَاسِطِينَ وَالْمَارِقِينَ) کی ہے پھر لسان العرب اضافہ کرتا ہے۔ (۱) یہی معنی تلخیص المستدرک ذہبی میں بھی آئے ہیں۔ اسد الغابہ، ج ۴، ص ۳۳۔

https://downloadshiabooks.com/

خلافت میں ان کے لیے عہدے اور اختیارات) پوری نہ ہوئیں تو بصرہ آ گئے اور مخالفت کی آگ بھڑکا دی ،نہروان کی آگ لگانے والے مرق یعنی خوارج تھے۔صفین میں حکمین کے بعد امام علیؑ کے خلاف ہو گئے اور علم بغاوت بلند کیا،''مروق'' کے معنی اس تیر کے ہیں جو کمان سے نکل جائے۔ پہلے حق کے دائرے میں تھے، پھر تعصب وخودخواہی کی وجہ سے خارج ہو گئے۔

قاسطین: اہل شام اور امیر شام کا لشکر ہے، کیوں کہ قسط کبھی عدالت اور کبھی ظلم وفسق کے معنی میں آتا ہے۔قابل توجہ بات یہ ہے کہ یہ مثالیں ان تین گروہوں کے بارے میں اسلامی مدارک میں موجود ہیں،جن کی پیش گوئی پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی حدیث مبارکہ میں کر دی گئی تھی۔

حاکم نیشاپوری نے مستدرک الصحیحین میں ابوایوب انصاریؓ سے نقل کیا ہے:

"اَمَرَ رَسُوْلُ اللهِ عَلِيَّ بْنَ اَبِيْ طَالِبٍ بِقِتَالِ النَّاكِثِيْنَ وَالْقَاسِطِيْنَ وَالْمَارِقِيْنَ"

''رسول اللہؐ نے حضرت علیؑ کو ناکثین،قاسطین،مارقین سے جنگ کا حکم دیا۔''[۱]

اسد الغابہ میں بھی دو روایات حضرت علیؑ کے حالات بیان کرتے ہوئے آئی ہیں۔اور تاریخ بغداد میں اسے یوں بیان کیا ہے کہ ابوایوب نقل کرتے ہیں،رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ہمیں حکم دیا کہ'' حضرت علی علیہ السلام کا ساتھ دیتے ہوئے ناکثین، مارقین وقاسطین کے تین گروہوں سے جنگ کرو''۔

ناکثین: جن لوگوں سے حضرت علی علیہ السلام نے جنگ کی وہ اہل جمل،طلحہ وزبیر تھے۔

قاسطین : سے مراد یہی لوگ ہیں کہ جن سے پیکار کے بعد ہم لوٹ رہے ہیں یعنی امیر شام اور عمرو ابن عاص۔ابوایوب فرماتے ہیں:

مارقین: اہل نہروان تھے،(ابوایوب نے)فرمایا:

''خدا کی قسم!نہیں معلوم یہ لوگ کہاں ہیں لیکن ہر حال میں ہم ان سے جنگ کریں گے۔''[۲]

یہ دندان شکن جواب ہے ان لوگوں کے لیے جو جہالت اور ناآگاہی کی وجہ سے امیر المومنینؑ کے دور خلافت میں ہونے والی جنگوں پر اعتراض کرتے ہیں ۔ یہ لوگ بیعت کے وقت حضرت علیؑ کے گرد اس طرح جمع تھے، جیسے شمع کے گرد پروانے لیکن جب عدالت کے نفاذ کا معاملہ آیا تو عدالت کو برداشت نہیں کر سکے۔ایک مدت تک بیت المال غارت ہوتا رہا، بے عدالتی ہوتی رہی ، اور یہ لوگ اس کے عادی ہو گئے۔اس لیے جب عدل قائم ہوا تو اس کو قبول کرنا ایسے لوگوں کے لیے

---

[۱] مستدرک الصحیحین،ج ۳،ص ۱۳۹

[۲] تاریخ بغداد،ج ۱۳،ص ۱۸۷،طبع دار الفکر

https://downloadshiabooks.com/

بہت دشوار تھا، اس وجہ سے صرف وفادار، مومن وخالص افراد اپنے عہد یعنی بیعت پر باقی رہے، لیکن دوسرے لوگ دنیا پرستی کی خاطر خدا و خلیفہ سے کیے ہوئے وعدے کو توڑ گئے یہ وہی چیز ہے جس کی طرف امام علیہ السلام بعد والے خطبے میں ان کی طرف سے مخالفت کی اصل وجہ بیان کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

"كَأَنَّهُمْ لَمْ يَسْمَعُوا كَلَامَ اللهِ سُبْحَانَهُ يَقُوْلُ تِلْكَ الدَّارُ الْآخِرَةُ نَجْعَلُهَا لِلَّذِيْنَ لَا يُرِيْدُوْنَ عُلُوّاً فِي الْأَرْضِ وَلَا فَسَاداً، وَالْعَاقِبَةُ لِلْمُتَّقِيْنَ" [1]

"ایسا محسوس ہوتا ہے، جیسے انہوں نے کلامِ خدا سنا ہی نہیں، جو فرماتا ہے: "سرائے آخرت صرف ان لوگوں کے لیے ہے جو نہ برتری چاہتے ہیں نہ متکبّر ہیں نہ زمین پر فساد کرنے والے ہیں۔ اور عاقبت (نیک) پرہیزگاروں کی ہے۔"

مزید فرماتے ہیں:

"بَلٰى وَاللهِ لَقَدْ سَمِعُوْهَا وَوَعَوْهَا [2] وَلٰكِنَّهُمْ حَلِيَتِ الدُّنْيَا فِيْ أَعْيُنِهِمْ، وَرَاقَهُمْ [3] زِبْرِجُهَا" [4]

"ہاں خدا کی قسم! اس کو انہوں نے سنا تھا اور انہیں یاد تھا، لیکن دنیا کی چکا چوند، روشنی نے ان کی آنکھوں کو خیرہ کر دیا تھا، دنیا کی زینت نے ان کو فریفتہ کر لیا تھا۔"

پہلے آپ انہیں ناواقف افراد کے ساتھ تشبیہ دیتے ہیں کہ جنکی ہٹ دھرمی صرف اور صرف ان کی جہالت کی وجہ سے ہو۔ اور پھر آپ بڑی صراحت کے ساتھ فرماتے ہیں کہ: یہ لوگ حقائق سے کبھی بے خبر نہیں تھے، لیکن خلیفۂ سوّم کے زمانے میں اسلامی فتوحات سے غنائم کی فراوانی کی وجہ سے جب ان کی زندگی عیش پرست ہوگئی تو یہ بات سبب بنی کہ یہ لوگ دین پر دنیا کو ترجیح دیں۔ اور آخرت کو دنیا کی حقیر چیزوں کے بدلے فروخت کر دیا۔

آخرت کو متاعِ دنیا کے عوض ہاتھ سے کھو دیا

[1] سورۂ قصص آیت ۸۳

[2] وعوھا، مادّہ وعی سے ہے نفی کے وزن پر، مقائیس کے مطابق کسی شے کو ضمیمہ کے معنیٰ میں آتا ہے۔ مفردات کے بقول حفظ حدیث یا اس طرح کے معنیٰ میں آتا ہے (دونوں ایک ہی معنیٰ کی طرف پلٹتے ہیں)

[3] راق، روق سے ہے۔ مقائیس کے مطابق کسی شے کو کسی پر مقدم کرنے کے لیے آتا ہے۔ کبھی حسن و جمال کے لیے آتا ہے۔ اس لیے گھر کے پہلے حصے کو (گھر یا حرم مقدسہ کو) رواق کہتے ہیں۔ امامؑ کے کلام میں حسن و جمال کے لیے آیا ہے۔

[4] زبرج، سونے سے زینت اور کبھی کپڑے کے نقش ونگار کے لیے آتا ہے۔ واضح ہے کہ مذکورہ جملے اور اس سے پہلے والے تمام جملوں میں مذکور (ھا) کی ضمیروں کا مرجع تین گروہ ہیں (ناکثین، مارقین، قاسطین) لیکن علامہ مجلسی بحار میں فرماتے ہیں یہ ضمیریں خلفاء ثلاثہ کی طرف پلٹ رہی ہیں۔ لیکن یہ احتمال بعید ہے۔ اس لیے آخر میں علامہ مجلسی اس احتمال کو بیان کرتے ہیں کہ ضمیر ھا ان افراد کی طرف پلٹ رہی ہے جن کا تذکرہ خطبے میں ہوا۔

https://downloadshiabooks.com/

مختصر کلام یہ کہ حقیقت میں یہ تمام تحلیلوں کا ماحصل ہے، جو تین جنگوں کے بارے میں بیان ہوا، جو امام علی علیہ السلام کے زمانے میں ہوئیں۔ جس نے اس کے علاوہ جو کچھ کہا، اس کی شاخیں و پتّے ہیں۔ یہ درحقیقت تمام مسلمانوں کے لیے درس عبرت ہے، تاریخ کے طویل دور میں ہر زمانے میں دنیا پرستی عام رہی ہے اور جو لوگ اس کی لذتوں اور دلفریبی کا شکار ہو گئے، ان میں اختلافات اپنے پورے عروج پر پہنچ گئے اور تمام اصولِ وحدت ان سے رخصت ہو گئے۔ صرف وہ گروہ اس آفت سے محفوظ رہا جس نے تقویٰ اور پرہیزگاری کو شعار بنایا اور خودسازی اختیار کی۔ آج بھی اگر غور کیا جائے تو مسلمانوں کے تمام اختلافات کی بنیادی وجہ وہی ہے جو امامؑ نے آیہ قرآنی کی روشنی میں اپنے مندرجہ بالا مختصر جملوں میں بیان کر دی ہے یعنی دنیا میں بلند مرتبہ حاصل کرنا اور پھر یہاں فساد پھیلانا اور دنیا کی چمک دمک اور اس کی دل فریبی پر فریفتہ ہو جانا اور تاکید فرماتے ہیں کہ آخرت کی کامیابی صرف ان کے لیے ہے جو ذاتی برتری اور زمین میں فساد کرنے کی خواہش نہیں رکھتے۔

نکات

۱۔ حضرت علیؑ کی بیعت عمومی تھی

یہ بیعت اُن تمام بیعتوں سے مختلف تھی جو خلفا کے زمانے میں لی گئیں، اس میں کسی قسم کا کوئی شک نہیں تھا۔ لوگوں نے جوش و خروش کے ساتھ بیعت کی، اُن لوگوں نے بیعت کی جو ظلم کا شکار تھے۔ یہ سقیفہ کی طرح نہیں تھی، جس میں چند افراد نے اپنی رائے عوام پر مسلط کر دی تھی، نہ خلیفۂ دوّم کی بیعت کی طرح تھی، جو صرف پہلے خلیفہ کے کہنے پر عمل میں آئی، نہ خلیفۂ سوّم کی طرح تھی، جس میں چھے آدمیوں کی شوریٰ نے خلیفہ منتخب کیا۔ یہ ایک واقعی اور حقیقی بیعت تھی، اس بیعت نے دوسری بیعتوں کی بھی وضاحت کر دی۔

بعض شارحین نہج البلاغہ نے لکھا کہ خلیفۂ سوّم کے خلاف قیام کرنے والے خلیفۂ سوّم کے قتل کے بعد حضرت امام علیؑ کا رخ کرتے ہیں تاکہ خلافت کے لیے ان کی بیعت کریں، مگر آپؑ تیار نہیں ہوئے جب اصرار کیا تو فرمایا، میں تمہارا امیر بننے سے بہتر ہے وزیر رہوں۔ "اَنَا لَکُمْ وَزِیْراً خَیْرٌ مِّنِّیْ اَمِیْرًا"

آپؑ جانتے تھے ایسی بیعت کے بعد خلیفۂ سوّم کے قتل (الزام) کی تہمت آپؑ پر لگ جائے گی۔ اگر صرف وہ بیعت کرتے تو کچھ لوگ کہتے صرف خلیفۂ سوّم کے قاتلوں نے امام علیؑ کی بیعت کی ہے، آپؑ ان کی پیشانیوں میں دیکھ رہے تھے کہ یہ سب حق کو قبول کرنے کی طاقت نہیں رکھتے، کیوں کہ حق کڑوا ہوتا ہے۔

https://downloadshiabooks.com/

بعد میں جب انصار و مہاجرین امام علیہ السلام کے پاس آئے اور انہوں نے اصرار کیا کہ آپؑ خلافت کو قبول کر لیں، تب امام علیہ السلام کے پاس کوئی چارہ نہ تھا آپؑ منبر پر تشریف لائے، صرف چند افراد کے علاوہ تمام لوگوں نے آپؑ کی بیعت کی، امامؑ نے ان سے اصرار نہیں کیا کہ وہ بیعت کریں۔ ان میں سعد بن ابی وقاص اور عبداللہ بن عمر وغیرہ تھے۔[1]

ہمارے عقیدے کے مطابق اور نا قابل انکار حوالوں کے مطابق امام علی علیہ السلام خدا کی طرف سے رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے جانشین تھے۔ صرف غدیر خم ہی نہیں، بلکہ دوسرے متعدد مقامات پر پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے تاکید فرمائی، یہاں اس کی شرح کی گنجائش نہیں۔ اگرچہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی رحلت کے بعد ایک گروہ مخالف ہو گیا لیکن خلیفۂ سوّم کے قتل کے بعد انھوں نے امام علیؑ کی بیعت کی اور اس طرح حمایت کی کہ کسی بھی انصاف پسند ملت (ڈیموکریسی) میں اس طرح کی حمایت نظر نہیں آتی، صرف رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی حیات میں بیعتِ شجرہ کے مقام پر ایسی بیعت نظر آتی ہے۔ لوگ اس لیے امام علی علیہ السلام کی بیعت کر رہے تھے، کیونکہ وہ امام علی علیہ السلام کے علم و تقویٰ سے آگاہ تھے اور کوئی سیاسی وجہ نہیں تھی جس کی وجہ سے بیعت کر رہے تھے، حالانکہ وہ جانتے تھے کہ وہ اپنے مقاصد کو امام علیؑ کے ذریعے حاصل نہیں کر سکتے۔ اگر پہلے ہی لوگوں کو آزاد چھوڑ دیا جاتا، ان کو اُکسایا نہ جاتا تو ایسا معاشرہ تشکیل پاتا جو عدالت کا پیکر ہوتا، جس طرح قرآن نے بیان کیا ہے، لیکن ہم دیکھتے ہیں کہ دورِ عثمانی میں بیت المال کے پروردہ غاصب اور میدان سیاست میں اپنی سیاست چمکانے والے ایک بڑے گروہ نے یہ سب کچھ نہ ہونے دیا، انہوں نے اپنے مذموم مقاصد کی تکمیل کے لیے لوگوں کے جذبات سے کھیلنا شروع کیا اور ان کے مذہبی احساسات کو اپنی سیاسی بازیگری کا وسیلہ بنا کر جمل و صفین و نہروان میں اسلام کی مضبوط دیواروں میں گہری دراڑیں ڈال دیں۔

۲۔ اجتماعی انحرافات کا سرچشمہ

امام علیؑ مذکورہ جملوں میں فرماتے ہیں کہ آپ کے دور میں (اور حقیقتاً ہر دور میں) انحرافات کا اصل سبب حب دنیا اور دنیا کی رنگینیوں میں گم ہو جانا ہے اور جمل و صفین اور نہروان کا سبب بھی آپ یہی بتاتے ہیں اور قرآن کی آیت کو بیان کرتے ہیں، جس میں کہا گیا ہے کہ آخرت ان کے لیے ہے جو برتری اور زمین پر فساد کا ارادہ نہیں رکھتے۔ یہ چند مختصر جملے ایک حقیقت کو بیان کرتے ہیں جو تمام تاریخ بشریت میں نظر آتی ہے۔ ہر جگہ برتری کی تلاش، جنگوں اور اختلافات کا سبب بنتی ہے۔

---

[1] فی ظلال نہج البلاغہ، ج ۱، ص ۹۴

https://downloadshiabooks.com/

نفس پرستی، خودخواہی زمین پر فساد کا سبب بنتی ہے۔ اسی بنا پر اگر ہم ان شیطانی خصلتوں کا ایمان و اعتقاد کے ذریعے مقابلہ نہ کریں اسلامی معاشرے میں تو ہمیشہ خون بہتا رہے، جنگیں ہوتی رہیں، یہاں تک کہ جو افراد انسانی آزادی، حقوق بشر کے علم بردار ہیں، وہ بھی ان مقاصد کے حصول کے لیے ان چیزوں کو وسیلہ بناتے ہیں اور امامؑ ان کے بارے میں گفتگو فرماتے ہیں، جن کے اعتقاد اور عمل میں تضاد پایا جاتا ہے۔ وہ ظاہری طور پر مسلمان ہیں۔ انہوں نے قرآنی آیات جن میں "تِلْكَ الدَّارُ الْآخِرَةُ" کو سنا ہے اس پر ایمان رکھتے ہیں، لیکن نفس پرستی نے اور دنیا سے محبت نے ان کے ایمان و اعتقاد کو ہلا دیا ہے، جس طرح بڑا طوفان دھچکا لگاتا ہے اور کمزور بند ٹوٹ جاتے ہیں۔ یہ انجام ان تمام لوگوں کا ہے جنہوں نے اپنے ایمان کو کمزور کر دیا اور ہوا و ہوس کو زندگی کا مقصد بنایا ہے۔

۳۔ حضرت علیؑ کے دور میں تین جنگوں کی طرف اشارہ

مذکورہ خطبے میں جنگ جمل، صفین اور نہروان کہ جن کے وابستہ افراد کو ناکثین، مارقین اور قاسطین کے نام سے یاد کیا جاتا ہے، اسی بنا پر ان تینوں جنگوں کا ہم اجمالی جائزہ لیتے ہیں:

جنگ جمل

حضرت علی علیہ السلام کی بیعت کیے ہوئے ابھی تین ماہ بھی نہیں گزرے تھے کہ کچھ لوگ عدالت امام علیؑ کو برداشت نہ کر پائے۔ اور ان کی طرف سے امام علی علیہ السلام کی مخالفت شروع ہوگئی، شام میں امیر شام نے بیعت سے انکار کرتے ہوئے حضرت علی علیہ السلام کی مخالفت کی اور آپؑ سے جنگ کے لیے تیار ہوا۔ حضرتؑ نے کوفہ، بصرہ اور مصر کے حاکموں کو خطوط لکھے تاکہ امیر شام سے جنگ کے لیے اپنی فوجوں کو تیار کریں۔ اس دوران طلحہ و زبیر عمرے کا کہہ کر مکہ چلے گئے اور وہاں حضرت عائشہ جو کہ (آپؑ کی بیعت سے ناراض تھیں) سے ملاقات کی اور انہیں بصرہ لائے تاکہ خونِ خلیفۂ سوّم کا بدلہ لینے کے لیے فتنے کی آگ بھڑکا سکیں، قرائن سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ لوگ نہ خونِ خلیفۂ سوّم کی فکر میں تھے اور نہ اسلام سے کوئی ہمدردی رکھتے تھے۔ کیونکہ قاتلانِ خلیفۂ سوّم بصرے میں نہیں تھے؟ سوائے خلیفۂ سوّم کی طرفداری کرنے اور حضرت امیر المومنینؑ کی مخالفت کے کچھ نہیں تھا؟ اور طلحہ و زبیر خود ان افراد میں سے تھے، جنہوں نے خلیفۂ سوّم کے خلاف جنگ کی واضح رہے کہ ان کی پیمان شکنی (چوں کہ وہ حضرت علیؑ کی بیعت کر چکے تھے) کا ہدف مقام و منصب تک پہنچنا تھا، یہ دونوں حضرت عائشہ کو لے کر ربیع الثانی ۳۶ھ میں بصرہ آئے اور لوگوں کو گمراہ کرنے اور ان سے بیعت لینے لگے، تاکہ اسلامی

https://downloadshiabooks.com/

معاشرے میں رخنہ ڈال سکیں۔

امیر المومنینؑ ان حالات سے بخوبی آگاہ تھے، آپؑ نے وہ لشکر جو شامیوں سے لڑنے کے لیے تیار کیا تھا، اُسے بصرے کی جانب روانہ کر دیا اور ایک خط کوفے کے حاکم ابوموسیٰ اشعری کو طاقتور لشکر تیار کرنے کے لیے لکھا، مگر ابوموسیٰ نے کوئی مثبت جواب نہیں دیا اور ۹ ہزار دوسرے لوگ کوفے سے امام علیہ السلام کی نصرت کے لیے روانہ ہوئے، جمادی الآخر میں دو عظیم لشکر آمنے سامنے ہوئے۔ تاریخ یعقوبی کے مطابق یہ جنگ چار گھنٹے چلی، طلحہ و زبیر کا لشکر شکست کھا گیا، حضرت عائشہ جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی زوجہ تھیں، ان کو اونٹ پر بٹھا کر لائے تھے اور اس لیے اس جنگ کا نام جمل پڑا، اونٹ کے گرد گھمسان کی جنگ ہو رہی تھی امام علیہ السلام نے حکم دیا: جب تک یہ اونٹ سالم ہے جنگ جاری رہے گی اس لیے اونٹ کے پیروں کو کاٹ دو، جب اونٹ کے پیر کٹے تو جنگ ختم ہو گئی، طلحہ و زبیر قتل ہوئے (طلحہ میدان جنگ میں مروان کے ذریعے اور زبیر میدان جنگ سے باہر) ماہِ مبارک رجب کی پہلی تھی کہ امیر المومنینؑ نے حضرت عائشہ کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے احترام میں عزت و احترام کے ساتھ مدینہ روانہ کیا، اس جنگ میں بعض تاریخوں کے مطابق دس ہزار، ایک اور روایت کے مطابق سترہ ہزار افراد دونوں طرف سے قتل ہوئے۔ اس خون کی ذمے داری ان پر ہے جنہوں نے اس جنگ کے لیے اقدامات کیے۔ [1]

جنگ صفین

جنگ جمل کے بعد حضرت علی علیہ السلام کوفہ تشریف لائے، امیر شام کو خط لکھا کہ وہ بیعت کرے اور آپؑ کی اطاعت کرے، لیکن امیر شام نے جواب دینے میں تاخیر کی اور شام کے لوگوں کو خلیفۂ سوّم کے خون کا بدلہ لینے کے لیے اُکسایا، سب جگہوں پر اعلان کرایا کہ خلیفۂ سوّم کے قاتل علیؑ ہیں اور حضرت علیؑ کو خط لکھا کہ وہ جنگ کے لیے تیار ہو جائیں، شام کے لوگوں کو جنگ کے لیے جمع کیا، اُدھر حضرت علیؑ نے کوفہ کے لوگوں کو صفین کی طرف بھیجا، اکثریت نے اتفاق آپ کی دعوت قبول کی اور میدان میں آ گئے۔ امامؑ نے اپنی فوج کو چند دستوں میں تقسیم کیا اور ہر دستے کا ایک کمانڈر مقرر کیا، ہر ایک کی ذمے داری معین کی، امامؑ اور شام کی افواج محرم الحرام کے اختتام سے آٹھ دن پہلے ۳۷ھ میں صفین کے میدان میں پہنچیں۔

یہ تقریباً ایک لاکھ افراد تھے۔ جوں ہی امیر شام کا لشکر پہنچا تو امامؑ کے بعض ساتھیوں نے چاہا کہ جنگ شروع کی جائے، امیر شام نے خط لکھا کہ جنگ میں جلدی نہ کریں، اُدھر امامؑ کی حتی الامکان کوشش تھی کہ جنگ نہ ہو، لہٰذا جنگ سے اپنے لشکر کو روکا، بارہا خط لکھا تاکہ امیر شام اپنی غلطی کو چھوڑ دے اور مسلمانوں کی صفوں میں شامل ہو جائے اور اختلافات کو گفتگو

---

[1] جو واقعہ اوپر بیان ہوا، تاریخ کامل ابن اثیر، جلد ۳ (خلاصہ)

https://downloadshiabooks.com/

کے ذریعے حل کرے، اس طرح کئی مہینے گزر گئے۔ ایک گروہ بے چینی سے امامؑ سے جنگ شروع کرنے پر اصرار کر رہا تھا، مگر امامؑ نے ہر مرتبہ انھیں روک دیا۔

البتہ اس دوران مختلف جھڑپیں بھی ہوئیں، کوشش یہ تھی کہ جنگ مزید نہ پھیلے۔ بالآخر ذی الحجہ ۳۷ھ، میں جنگ شروع ہوئی اور محرم الحرام کے احترام میں جنگ بند رہی، اس دوران امامؑ نے پھر خطوط لکھے اور اپنے نمائندوں کو بھیجا۔ محرم الحرام ختم ہوتے ہی جنگ شدت کے ساتھ دوبارہ شروع ہوگئی، ۸ صفر کی تاریخ ایسی تھی کہ ہر طرف گھمسان کی لڑائی ہونے لگی جورات تک جاری رہی، دس صفر کی صبح دونوں نمازوں کے بعد دونوں طرف کی فوجوں میں سخت جنگ ہوئی۔

لشکر امامؑ پیش قدمی کرتے ہوئے آگے بڑھ رہا تھا اور شامی افواج کو سخت مشکلات کا سامنا تھا، عجیب بات یہ ہے کہ صفر کے مہینے کی درمیانی رات کو جسے "لَیۡلَۃُ الۡھَرِیۡرِ" کہتے ہیں (ہریر کے معنی کتوں کی طرح آواز نکالنا ہے۔ امیر شام کے فوجی امامؑ کے لشکر کے حملوں کی وجہ سے کتوں جیسی آوازیں نکال رہے تھے) جنگ جاری رہی، جب شامی افواج کو مکمل تباہی اور شکست نظر آئی، تو عمرو بن عاص نے، جو دھوکے اور فریب میں مشہور تھا، امیر شام کے حکم پر شکست سے بچنے کی راہیں سوچنا شروع کیں۔ پھر فوج کو حکم دیا کہ قرآن کو نیزوں پر بلند کر دیں، کیوں کہ ہم قرآن کے ماننے والے ہیں اور ہم قرآن کو حاکم قرار دیتے ہیں۔ امامؑ کے لشکر میں موجود منافقوں نے اس موقع سے فائدہ اٹھایا اور لوگوں سے کہا، جنگ روک دو! ہم قرآن سے جنگ نہیں کریں گے اور اس حساس موقع پر لوگوں کو جنگ بند کر دی کرنے کی طرف دعوت دی۔ ایک بڑی تعداد دھوکے میں آ گئی اور امامؑ سے اس حکمیت کو قبول کرنے کا تقاضا کیا۔ مسئلہ حکمیت، ایک دھوکا اور فریب تھا، جو امامؑ پر مسلط کیا گیا، اس خطرناک دھوکے سے تلخ نتیجہ سامنے آیا۔ عمرو بن عاص اور امیر شام کی طرف سے جبکہ ابوموسیٰ اشعری کو جو سادہ لوح انسان تھے، مولا علیؑ کی طرف سے حکم بنایا گیا، عمرو بن عاص نے ابوموسیٰ اشعری کو بھی دھوکا دیا جس پر ابوموسیٰ اشعری نے کہا: علی اور امیر شام دونوں کو خلافت سے علیحدہ کر دیا جائے، عمرو بن عاص نے کھڑے ہو کر کہا: میں علیؑ کو خلافت سے علیحدہ کرتا ہوں اور امیر شام کو خلافت پر نصب کرتا ہوں۔

بعض روایات سے پتا چلتا ہے کہ حضرت علیؑ کے لشکر کو جو حکمین کے جواب سے قبل کوفہ پہنچ چکا تھا اور حکمین کے جواب کا منتظر تھا، جب ابوموسیٰ کے دھوکا کھانے کا انہیں علم ہوا تو انہیں ہوش آیا، مگر اب کچھ نہیں ہوسکتا تھا اور وقت گزر چکا تھا ایک مرکز پر جمع کر کے دوبارہ حملہ کرنا آسان کام نہ تھا۔ [1] یہ ایسی کامیابی ہوتی جس کے نتیجے میں تاریخ اسلام میں ایک اہم تبدیلی رونما ہو جاتی اور مسلمان ہمیشہ کے لیے بنی امیہ کے شر سے محفوظ ہو جاتے، شرک و بت پرستی کی باقیات ختم ہو

[1] شرح نہج البلاغہ ابن ابی الحدید جلد ۲ صفحہ ۲۵۹

https://downloadshiabooks.com/

جاتیں، لیکن اب اس کا موقع ہاتھ سے نکل چکا تھا۔

اس کا پہلا اصل سبب: دشمن کی دھوکا دہی، دوسرا سبب: دوستوں کی سادہ لوحی جبکہ منافق اس انتظار میں تھے کہ ایسا موقع ہاتھ لگے اور وہ اس سے فائدہ اٹھائیں، تیسرا عامل: اختلاف وتفرقہ اور چوتھا عامل: مولا علیؑ کے لشکر میں نظم کا نہ ہونا بیان کیا جاتا ہے۔

جنگ نہروان

خوارج جنگ صفین میں اور حکمیت کے معاملے میں آشکار ہو گئے، یہ اس تباہ کن جنگ کا نتیجہ تھا۔ وہ گروہ جس نے حکمیت کو قبول کیا تھا، بعد میں پشیمان ہوئے اور حکمیت کو قرآن کے خلاف اور کفر کہنے لگے اور ان کی بے غیرتی کی انتہا ہوگئی کہ انھوں نے امامؑ سے مطالبہ کیا کہ وہ توبہ کریں، ورنہ ان کے خلاف کھڑے ہو جائیں گے، امام علی علیہ السلام جو اپنے لشکر میں سخت اختلافات دیکھ رہے تھے (کہ منافق اس اختلاف کو ہوا دے رہے ہیں) فوج کو حکم دیا کہ کوفہ کی طرف پلٹ جائیں، کوفہ میں بارہ ہزار افراد وہ تھے جو انتہائی متعصب اور لشکر سے جدا ہو گئے تھے اور مقام حروریہ جو کوفہ سے دو میل کے فاصلے پر تھا، وہاں چلے گئے۔ اس وجہ سے یہ خوارج حروریہ کہلانے لگے۔ مقام نہروان جو حروریہ کے قریب ہے، اس مقام پر امامؑ سے جنگ کے لیے تیاری کرنے لگے۔ حیرت انگیز بات یہ ہے کہ ان میں کچھ وہ افراد بھی تھے جو امام علیہ السلام کے دیرینہ ساتھی تھے۔

ان میں وہ افراد بھی تھے جن کی پیشانی پر عبادت کی وجہ سے نشانات تھے، قرآن کی تلاوت کی آواز ہر جگہ آتی تھی۔ دراصل یہ وہ احمق عابد تھے جو افراط کا شکار تھے، ظاہراً دین سے منسلک تھے، لیکن حقیقت میں دین سے بے خبر تھے، لہٰذا ان کو مارقین کہتے ہیں۔ جب دونوں لشکر مدمقابل ہو گئے تو امامؑ نے خطاب فرمایا، جس پر مخالف کے لشکر کا ایک بڑا حصہ ان سے جُدا ہو گیا اور "اَلتَّوْبَةَ اَلتَّوْبَةَ يَا اَمِيْرَ الْمُؤْمِنِيْنَ" کی آوازیں بلند کرتے ہوئے امامؑ سے معافی مانگنے لگے اور آپؑ نے انہیں بخش دیا۔ اس طرح ان بارہ ہزار افراد میں سے آٹھ ہزار افراد پلٹ آئے (روایت کے مطابق امامؑ نے ایک طرف پرچم نصب کر دیا اور توابین سے کہا کہ اس کے نیچے جمع ہو جائیں) جب باقی افراد سے امامؑ نا امید ہو گئے کہ یہ اب قابلِ ہدایت نہیں رہے اور جنگ کے سوا کوئی اور چارہ نہیں تو امامؑ نے فرمایا: جنگ میں پہل نہ کی جائے، جمل وصفین کی طرح یہاں بھی آپؑ جنگ شروع نہیں کرنا چاہتے تھے۔ چنانچہ خوارج نے حملہ کیا اور امامؑ کے لشکر نے سخت ردعمل دکھایا اور اپنا دفاع کیا۔ خوارج کے تمام افراد (جن کی تعداد چار ہزار تھی) قتل ہوئے سوائے ان نو (۹) افراد کے جو بھاگ گئے اور امامؑ کی فوج کے ۹ افراد سے زیادہ شہید نہیں ہوئے۔ امامؑ کا یہ سچا کلام جو آپؑ نے جنگ سے قبل ارشاد فرمایا تھا کہ (ان میں دس سے

https://downloadshiabooks.com/

زیادہ باقی نہیں رہیں گے اور تم میں سے دس سے زیادہ شہید نہیں ہوں گے، یہاں واضح و آشکار ہو گیا۔[۱]

یہ جنگ ۹ صفر ۳۸ھ یا ۳۹ھ کو ہوئی اور یہ جنگ ایک گھنٹہ سے زیادہ طولانی نہیں تھی۔[۲]

پانچواں حصہ

اَمَا وَ الَّذِی فَلَقَ الْحَبَّةَ وَ بَرَاَ النَّسَمَةَ لَوْ لَا حُضُورُ الْحَاضِرِ وَ قِیَامُ الْحُجَّةِ بِوُجُودِ النَّاصِرِ وَ مَا اَخَذَ اللهُ عَلَی الْعُلَمَاءِ اَلَّا یُقَارُّوا عَلَی كِظَّةِ ظَالِمٍ وَ لَا سَغَبِ مَظْلُومٍ لَاَلْقَیْتُ حَبْلَهَا عَلَی غَارِبِهَا وَ لَسَقَیْتُ آخِرَهَا بِكَاْسِ اَوَّلِهَا وَ لَاَلْفَیْتُمْ دُنْیَاكُمْ هٰذِهِ اَزْهَدَ عِنْدِی مِنْ عَفْطَةِ عَنْزٍ.

”آگاہ ہو جاؤ! وہ خدا گواہ ہے جس نے دانے کو شگافتہ کیا اور ذی روح کو پیدا کیا اگر حاضرین کی موجودگی اور انصار کے وجود سے حجت تمام نہ ہو گئی ہوتی اور اللہ کا اہلِ علم سے یہ عہد نہ ہوتا کہ خبردار ظالم کی شکم پری اور مظلوم کی بھوک و پیاس پر چین سے نہ بیٹھنا، تو میں آج بھی اس خلافت کی رسی کو اسی کی گردن پر ڈال کر ہنکا دیتا اور اس کے آخر کو اوّل ہی کے پیالے سے سیراب کرتا اور تم دیکھ لیتے کہ تمہاری دنیا میری نظر میں بکری کی چھینک سے بھی زیادہ بے قیمت ہے۔“

شرح و تفسیر

میں نے خلافت اور بیعت کیوں قبول کیا؟

خطبے کے اس حصے میں آپؑ نے بیعت قبول کرنے کی وجوہات واضح طور پر بیان کی ہیں اور اس کی قبولیت کے اہداف و مقاصد انتہائی مختصر جملوں میں بیان فرمائے ہیں۔ اس ضمن میں یہ بھی واضح کیا ہے کہ اگر یہ بڑے مقاصد مدنظر نہ ہوتے تو میں لوگوں پر حکمرانی کرنے کے لیے ذرا بھی اہمیت کا قائل نہیں تھا۔ آپؑ فرماتے ہیں:

---

[۱] نہج البلاغہ خطبہ ۹

[۲] کامل ابن اثیر، جلد ۳، شرح خوئی، نہج البلاغہ، طبری، جلد ۴، فروغ ولایت، مروج الذھب، جلد ۲ (خلاصہ کے ساتھ)۔

https://downloadshiabooks.com/

"اَما وَالَّذِیْ فَلَقَ الْحَبَّةَ، وبَرَءَ النَّسَمَةَ [۱] لَوْلَا حُضُوْرُ الْحَاضِرِ [۲] وَقِيَامُ الْحُجَّةِ بِوُجُوْدِ النَّاصِرِ، وَمَا اَخَذَ اللهُ عَلَى الْعُلَمَاءِ اَنْ لَا يُقَارُّوْا [۳] عَلٰى كِظَّةِ [۴] ظَالِمٍ، وَلَا سَغَبِ [۵] مَظْلُوْمٍ، لَاَلْقَيْتُ حَبْلَهَا عَلٰى غَارِبِهَا [۶] وَلَسَقَيْتُ آخِرَهَا بِكَأْسِ اَوَّلِهَا"

''دیکھو اُس ذات کی قسم! جس نے دانے کو شگافتہ کیا اور انسان کو خلق کیا، اگر بیعت کرنے والوں کے ہجوم کی موجودگی اور مدد کرنے والوں کے وجود سے مجھ پر حجت تمام نہ ہوگئی ہوتی اور وہ عہد و وعدہ جو اللہ نے ہر امت کے علما سے لے رکھا ہے کہ وہ ظالم کی شکم پُری اور مظلوم کی بھوک و پیاس پر سکون و قرار سے نہ بیٹھیں تو میں خلافت کے اونٹ کی باگ ڈور کو اس کی پشت پر ڈال دیتا (اور اُسے چھوڑ دیتا) اور اس کے آخر کو اس پیالے سے سیراب کرتا جس پیالے سے پہلے کو سیراب کیا تھا۔''

یہ جملہ حقیقت میں اُس تعریف اور توصیف کی طرف اشارہ ہے، جو قرآن مجید میں خداوند متعال نے اپنے لیے کی ہے، خدا فرماتا ہے:

"فَالِقُ الْحَبِّ وَالنَّوٰى" [۷]

''خداوند متعال دانے اور گٹھلی کو شگافتہ کرنے والا ہے۔''

یہ مطلب حقیقت میں پروردگار کی خلقت کی اہم ترین قسم یعنی زندگی اور حیات کی خلقت کی طرف اشارہ ہے اور "وبَرَءَ النَّسَمَةَ" اس جملے میں انسان کی روح کی خلقت کا بیان ہے، جو بہت عظیم خلقت ہے۔ قرآن مجید میں اس کے ذکر

---

[۱] نسمہ، اصل میں ہلکی ہوا چلنے کے معنیٰ آتا ہے، کبھی سانس لینے کے معنیٰ میں آتا ہے یا خود انسان کے معنیٰ میں استعمال ہوتا ہے اور مندرجہ بالا کلام میں اس لفظ کے معنیٰ وہی انسان یا روح کے معنیٰ ہیں۔

[۲] حاضر، کوئی شخص یا کوئی چیز موجود ہو تو کہا جاتا ہے۔ اہلِ زبان کے کہنے کے مطابق کبھی یہ لفظ بڑے قبیلے کے معنیٰ میں بھی استعمال ہوتا ہے۔ مذکورہ کلام میں دونوں معنی مراد ہو سکتے ہیں۔

[۳] لایقاروا، قرار کے مادّہ سے معنیٰ سکون اور آرام ہونے کے ہیں لہٰذا جملے کے معنیٰ ہیں خاموش نہ رہیں آرام سے نہ بیٹھیں۔

[۴] کظة، کے معنیٰ وہ بُری حالت ہے جو زیادہ کھانے کی وجہ سے انسان کو درپیش ہوتی ہے۔ مذکورہ بالا جملے میں امامؑ کی مراد دوسروں کے حقوق کو غصب کرنا اور دوسروں پر ظلم و زیادتی کرنا ہے۔

[۵] سغب، اصل میں بھوک کے معنیٰ ہیں اسی لیے قحط والے سالوں کو ''ذو مسغبة'' کہا جاتا ہے جیسا کہ قرآن مجید میں آیت ہے "او اطعام فی یوم ذی مسغبة"، امامؑ کے کلام میں مظلوموں کے حقوق کو ضائع کرنے سے متعلق کنایہ ہے۔

[۶] غارب، اونٹ کی گردن سے لے کر کوہان تک کے درمیانی حصے کو کہا جاتا ہے جب اونٹ کو آزاد کرنا ہو تو عام طور پر اس کی باگ ڈور اُس جگہ اس کی پشت پر ڈال دی جاتی ہے۔

[۷] سورۂ انعام، آیت ۹۵

https://downloadshiabooks.com/

کے بعد کہا گیا ہے:

"تَبَارَكَ اللهُ اَحۡسَنُ الۡخَالِقِيۡنَ" [۱]

یہاں پر امامؑ نے خدا کی اہم ترین خلقت کی قسم کھائی ہے اور یہ قسم اس مطلب کی اہمیت کی طرف اشارہ ہے جس کے لیے یہ قسم کھائی جارہی ہے۔

"لَوۡلَا حُضُوۡرُ الۡحَاضِرِ" یہ جملہ ظاہراً آپؑ کے ہاتھ پر بیعت کرنے والے افراد کی حاضری کی طرف اشارہ ہے۔ اگرچہ بعض شارحین نے خود بیعت کی طرف اشارہ قرار دیا ہے۔ دونوں صورتوں میں معنی میں زیادہ فرق نہیں پڑتا ہے، لیکن اس جملے سے یہ احتمال ہے کہ اس سے مراد خدا کے حضور یا پیغمبرؐ کے زمانے میں حاضر ہونا، جس زمانے میں امام علیؑ کے لیے پیشین گوئی کی تھی۔ یہ سب احتمال بعید ہیں اگرچہ بعض بڑے علما نے اس معنی کو بھی احتمال کے طور پر ذکر کیا ہے۔

بہر صورت مذکورہ جملہ اور "وَ قِيَامُ الۡحُجَّةِ بِوُجُوۡدِ النَّاصِرِ" کا جملہ ان دونوں کے ایک ہی معنی ہیں اور دونوں جملے آپؑ پر حجت تمام ہونے کی طرف اشارہ ہیں۔ اتنے سارے مدد کرنے والوں اور بیعت کرنے والوں کی موجودگی میں آپؑ پر ضروری تھا کہ عدالت کے نفاذ کے لیے قیام کریں۔

"اَلۡقَيۡتُ حَبۡلَهَا عَلٰى غَارِبِهَا" یہ جملہ کسی چیز سے صرفِ نظر کرنے کے معنی میں آتا ہے، کیونکہ اونٹ سے اگر کوئی سروکار نہ ہو تو اس کی باگ دوڑ اس کی پشت پر ڈال دی جاتی ہے اور اس کو آزاد چھوڑ دیتے ہیں۔

"وَلَسَقَيۡتُ اٰخِرَهَا بِكَاۡسِ اَوَّلِهَا"

''جس پیالے سے اوّل کو سیراب کیا تھا اُسی سے آخر کو سیراب کرتا۔'' [۲]

یہ جملہ کنایہ ہے اس بات کی طرف کہ جس طرح میں نے پہلے تین خلفا کے دور میں صبر وتحمل سے کام لیا تھا، بعد میں بھی ایسا کرتا رہوں گا۔

لیکن دو دلائل کی بنا پر میں بیعت قبول کرنے اور قیام کرنے پر مجبور ہوا، کیونکہ ایک طرف اتنے سارے مدد کرنے والوں کا جمع ہونا میرے اوپر حجت تمام ہونے کا سبب بن گیا، دوسری طرف خدا نے ہر قوم کے علما سے عہد و پیمان لیا ہے کہ وہ جب معاشرے میں ظلم و زیادتی دیکھیں یہاں تک کہ ظالم حد سے زیادہ کھانے کی وجہ سے بیمار ہو گئے ہوں اور مظلوم افراد

---

[۱] سورۂ مومنون، آیت ۱۴

[۲] امامؑ کے اس کلام کے لیے گواہ کے طور پر وہ شعر ہے، جو آپؑ نے اُس وقت فرمایا: جب طلحہ و زبیر نے آپؑ کی مخالفت شروع کی اور جنگ جمل کی تیاریاں مکمل ہو گئیں۔ "فِتَنٌ تَحُلُّ بِهِمۡ وَهُنَّ شُوَّارِعُ   تَسۡقِيۡ اَوَاخِرَهَا بِكَاۡسِ الۡاَوَّلِ"

https://downloadshiabooks.com/

بھوکے پیاسے ہوں تو ایسی صورت حال میں خاموش نہیں رہنا چاہیے، بلکہ اس کے لیے قیام کرنا ضروری ہے، تاکہ ظالموں کے ہاتھ کاٹ دیں اور مظلوموں کو رہائی دلا دیں اور خدا کی عدالت معاشرے میں نافذ کریں۔

امامؑ کا یہ کلام تنبیہہ ہے ہر امت کے علما و دانشوروں کو جب دینی حکومت تشکیل دینے کے لیے حالات مناسب ہوں اور خدائی عدالت کا نفاذ کر سکتے ہوں، تو اس وقت ان کی خاموشی جرم ہے۔ (خاموشی توڑ کر قیام کرنا چاہیے) معاشرے میں الٰہی عدالت کو نافذ کریں اور خدا کے فرمان کے نفاذ کے لیے ظالمین کے ساتھ مقابلہ شروع کرنا چاہیے۔ وہ لوگ جو سمجھتے ہیں کہ صرف کچھ واجبات مثل نماز و روزہ و حج وغیرہ انجام دے کر نیز کچھ مستحبات بجالا کر اپنی ذمے داریوں پر عمل کر چکے ہیں وہ انتہائی غلط فہمی کا شکار ہیں۔ معاشرے میں عدالت کا نفاذ اور ظلم و ظالمین سے مقابلہ کرنا اور مظلوموں کی حمایت کرنا بھی ان کی اسلامی ذمے داریوں میں شامل ہے۔

بالآخر امام علیہ السلام اس معرکۃ الآرا سیاسی اور معاشرتی خطبے کے آخری جملوں میں فرماتے ہیں:

"وَلَاَلْفَیْتُمْ [1] دُنْیَا کُمْ هٰذِهٖ اَزْهَدَ عِنْدِیْ مِنْ عَفْطَةِ [2] عَنْزٍ [3]"

(ہاں اگر مذکورہ بالا دلائل نہ ہوتے تو) میں ہرگز بیعت قبول نہ کرتا، اس وقت تم سمجھ جاتے کہ دنیا کی قیمت اس کی تمام تر شان و شوکت اور زرق برق کے ساتھ میری نظر میں بکری کی چھینک سے کمتر ہے۔

اس بات کو مدنظر رکھتے ہوئے کہ "عَفْطَةِ"، صحاح اللغۃ کے مطابق وہ ہی پانی ہے جو بھیڑ یا بکری چھینکنے کے دوران اطراف میں پھینکتی ہے۔ اس سے واضح ہوتا ہے کہ اس مادّی دنیا کی تمام آب و تاب و اہمیت و عظمت دنیاداروں کی نظر میں ہے، امیر المومنینؑ کے نزدیک یہ کتنی حقیر و ناچیز ہے، حقیقت میں خود ایک بھیڑ یا بکری کی کیا قیمت ہوتی ہے، کہ اس کی ناک سے پھینکے ہوئے پانی کی کوئی قیمت ہو، بلکہ یہ ایک گندی چیز ہے۔ یقینی طور پر یہ کلام ان لوگوں کے لیے جو حضرت علیؑ کی روحانی کیفیت سے آگاہ نہیں ہیں، بہت تعجب کی بات ہے، لیکن جو اُن کی معنوی دنیا اور اُن کے عرفانی مراتب سے باخبر ہو جائے، تو دیکھے گا کہ اس کلام میں ذرا سی بھی مبالغہ آرائی نہیں ہے۔

سیّد رضیؒ اس خطبے کے ذیل میں کہتے ہیں:

---

[1] الفیتم، الفی کے مادّے سے ہے۔ کسی چیز کا حصول اور پانا مراد ہے۔

[2] عطفہ، اصل میں مقائیس اللغۃ کے کہنے کے مطابق ہلکی آواز کو کہتے ہیں۔ اسی وجہ سے بھیڑ یا بکری کی چھینک کو، عطفۃ، کہتے ہیں۔ مذکورہ کلام میں مراد ناک کے پانی کے وہ ذرّات ہیں جو چھینک کے دوران پراگندہ ہو جاتے ہیں۔ یہ وہی تفسیر ہے جو مقائیس اللغۃ میں آئی ہے، لیکن دوسرے بعض اہل زبان نے حیوان سے نکلنے والی کچھ دوسری آوازوں کو بھی عطفۃ کہا ہے۔

[3] عنز، کے معنی بکری کے ہیں۔

https://downloadshiabooks.com/

قَالُوْا وَ قَامَ اِلَيْهِ رَجُلٌ مِنْ اَهْلِ السَّوَادِ عِنْدَ بُلُوْغِهٖ اِلٰى هٰذَا الْمَوْضِعِ مِنْ خُطْبَتِهٖ فَنَاوَلَهٗ كِتَابًا قِيْلَ اِنَّ فِيْهِ مَسَائِلَ كَانَ يُرِيْدُ الْاِجَابَةَ عَنْهَا فَاَقْبَلَ يَنْظُرُ فِيْهِ فَلَمَّا فَرَغَ مِنْ قِرَاءَتِهٖ قَالَ لَهُ ابْنُ عَبَّاسٍ يَا اَمِيْرَ الْمُؤْمِنِيْنَ لَوِ اطَّرَدَتْ خُطْبَتُكَ مِنْ حَيْثُ اَفْضَيْتَ فَقَالَ هَيْهَاتَ يَا ابْنَ عَبَّاسٍ تِلْكَ شِقْشِقَةٌ هَدَرَتْ ثُمَّ قَرَّتْ قَالَ ابْنُ عَبَّاسٍ فَوَاللّٰهِ مَا اَسَفْتُ عَلٰى كَلَامٍ قَطُّ كَاَسَفِيْ عَلٰى هٰذَا الْكَلَامِ اَلَّا يَكُوْنَ اَمِيْرُ الْمُؤْمِنِيْنَ بَلَغَ مِنْهُ حَيْثُ اَرَادَ۔

''بعض کا کہنا ہے جب امیر المومنینؑ کی گفتگو یہاں تک پہنچی تو اہلِ عراق سے ایک شخص اُٹھ کھڑا ہوا اور آپؑ کو ایک خط تھما دیا۔ اور کہا گیا ہے کہ اُس خط میں حضرتؑ سے کچھ سوالات پوچھے گئے تھے۔ امام علیؑ اس خط کے مطالعے میں مشغول ہو گئے، جب خط کے مطالعے سے فارغ ہو گئے تو ابن عباسؓ نے عرض کیا کہ اے امیر المومنینؑ اچھا ہوتا خطبے کو جہاں سے چھوڑ دیا تھا دوبارہ وہیں سے شروع فرماتے؟ امامؑ نے جواب دیا۔ افسوس اے ابن عباسؓ، یہ ایک اندرونی آگ تھی جو شعلہ ور ہوئی تھی پھر بجھ گئی۔ (یعنی دوبارہ شروع کرنے کا ارادہ نہیں) ابن عباسؓ کہتے ہیں خدا کی قسم! مجھے کسی کلام پر اتنا افسوس نہیں ہوا، جتنا اس کلام (خطبۂ شقشقیہ) کے مکمل نہ ہونے پر ہوا، کیونکہ علیؑ جہاں پہنچنا چاہتے تھے نہیں پہنچ سکے۔''

شرح و تفسیر

سیّد رضیؒ اس خطبے کے ذیل میں کہتے ہیں: بعض کا کہنا ہے جب امیر المومنینؑ کی گفتگو یہاں تک پہنچی تو اہلِ عراق سے ایک شخص اُٹھ کھڑا ہوا اور آپؑ کو ایک خط تھما دیا۔ اور کہا گیا ہے کہ اُس خط میں حضرتؑ سے کچھ سوالات پوچھے گئے تھے۔ امام علی علیہ السلام اس خط کے مطالعے میں مشغول ہو گئے، جب خط کے مطالعے سے فارغ ہو گئے تو ابن عباسؓ نے عرض کیا کہ اے امیر المومنینؑ اچھا ہوتا خطبے کو جہاں سے چھوڑ دیا تھا دوبارہ وہیں سے شروع فرماتے؟ امامؑ نے جواب دیا۔ افسوس اے ابن عباسؓ یہ ایک اندرونی آگ تھی جو شعلہ ور ہوئی تھی پھر بجھ گئی (یعنی دوبارہ شروع کرنے کا ارادہ نہیں)۔

ابن عباسؓ کہتے ہیں خدا کی قسم! مجھے کسی کلام پر اتنا افسوس نہیں ہوا جتنا اس کلام (خطبۂ شقشقیہ) کے مکمل نہ ہونے پر

https://downloadshiabooks.com/

ہوا، کیونکہ علیؑ جہاں پہنچنا چاہتے تھے نہیں پہنچ سکے۔''

یہاں اہل سواد سے مراد (توجہ رہے کہ سواد سیاھی کے معنی میں ہے) ایسی جگہ کے ہیں جو درختوں اور کھیتوں سے بھری ہوئی ہو تو دور سے وہ سیاہ چیزیں مجسم نظر آتی ہیں۔ اسی طرح سبز رنگ بھی دور سے اور فاصلہ زیادہ ہونے کی وجہ سے سیاہ چیز کی طرح نظر آتا ہے۔ اور حجاز کے رہنے والے خشک اور بنجر زمینوں کو بیاض (غیر آباد) کہہ کر پکارتے ہیں۔

جب کوئی عراق کی طرف سفر کرتے تھے تو وہ دریائے دجلہ وفرات کے کنارے آباد سرسبز علاقوں سے سفر کرتے تھے، تو انہیں دور سے سرسبز کھیت اور درختوں کے جھنڈ سیاہ ہیولے کی شکل میں دکھائی دیتے تھے اور عرب والے ان علاقوں کو ''سواد کی سرزمین'' کہتے تھے اور وہاں کے رہنے والوں کو ''سواد کے رہنے والوں'' کے نام سے یاد کیا جاتا تھا۔

رہ گئی یہ بات کہ اس خط میں کیا تھا اور اس میں کون کون سے سوالات تھے، اس کے متعلق نہج البلاغہ کے بعض شارحین نے چند نکات پر بحث کی ہے، جو آئندہ بیان کی جائے گی۔ ان شاء اللہ۔

''لَوِ اطَّرَدَتْ خُطْبَتُكَ'' کا جملہ اس مطلب کو مدنظر رکھتے ہوئے، اطراد کے معنی ایک چیز دوسری چیز کے پیچھے واقع ہونے کے ہیں، اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ (ابن عباسؓ کہنا چاہتے تھے کہ) اگر یہ خطبہ آگے بڑھتا رہتا تو بہت اچھا تھا۔

''مِنْ حَيْثُ أَفْضَيْتَ'' اس جملے کے معنی ''افضا'' کھلی فضا میں نکلنے کے ہیں۔ گویا اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ انسان جب کوئی اہم بات کرنا چاہتا ہے تو اپنی پوری فکری طاقت کو اکٹھا کرتا ہے۔ جیسے ان تمام طاقتوں کو ایک کمرے میں جمع کیا ہو، لیکن اگر ان کی تمام تر توجہ ختم ہو جائے یا ہٹا دی جائے تو ایسا لگتا ہے کہ بند کمرے سے نکل کر کھلی فضا میں آیا ہو۔

''تِلْكَ شِقْشِقَةٌ هَدَرَتْ ثُمَّ قَرَّتْ'' اس جملے کا مطلب ''شِقْشِقَةٌ'' اصل میں اونٹ کے منہ سے نکلنے والا وہ جھاگ ہے جو گوشت کی طرح ہوتا ہے، جب اونٹ ہیجان کی حالت میں ہو تو یہ منہ سے باہر نکلتا ہے جب اس کا جوش و ہیجان ختم ہو جائے تو یہ اپنی جگہ پلٹ جاتا ہے۔ اس بات کو دیکھتے ہوئے شعلہ زبان خطیب جب جوشِ خطابت میں انتہا کو پہنچ جاتا ہے تو اُس کے منہ سے جھاگ نکلنا شروع ہو جاتا ہے، اس وقت انہیں ''ذُوْشِقْشِقَةٍ'' کہا جاتا ہے۔

یہ جملہ اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ یہ دل جلانے والی راز کی باتیں میں نے اپنے دل میں چھپائی ہوئی تھیں، جب بیان زوروں پر تھا تو میں نے خطبے کی شکل میں اپنا درِدل بیان کر دیا، لیکن اب سائل کے خط کا مطالعہ اور سوالات پر غور کرنے کی وجہ سے وہ کیفیت باقی نہ رہی، لہٰذا اب میں اس گفتگو کو جاری نہیں رکھ سکتا ہوں۔

قابلِ توجہ نکتہ یہ ہے کہ ابن ابی الحدید اپنے استاد (مصدّق بن شبیب) سے نقل کرتے ہیں کہ میں نے یہ خطبہ اپنے

https://downloadshiabooks.com/

استاد ''ابنِ خشاب'' کے سامنے پڑھا اور جب اس مقام پر پہنچا، جہاں ابن عباسؓ نے خطبے کے نامکمل رہ جانے پر افسوس ظاہر کیا تھا، تو ''ابنِ خشاب'' نے کہا، اگر میں اس موقع پر ہوتا تو ابن عباسؓ سے پوچھتا، کیا آپ کے ابنِ عم (امامؑ) کے دل میں اب بھی کہنے کے لیے کچھ رہ گیا تھا، جس کے رہ جانے کا آپ کو افسوس ہے، خدا کی قسم! انہوں نے تو خلفا کے متعلق اوّل سے آخر تک سب کچھ کہہ دیا ہے۔

''مصدق'' کہتے ہیں اس پر میں نے ''ابنِ خشاب'' سے جو نہایت مزاح کرنے والا انسان تھا، پوچھا کہ کیا آپ یہ کہنا چاہتے ہیں کہ یہ خطبہ جعلی ہے؟ ابنِ خشاب نے جواب دیا ''خدا کی قسم! مجھے اس خطبے کا امامؑ کے کلام ہونے کا اتنا ہی یقین ہے، جتنا اس بات کا کہ تم مصدق بن شبیب ہو۔[1]

"قَالَ الشَّرِيْفُ رَضِيَ اللهُ عَنْهُ: قَوْلُهُ عَلَيْهِ السَّلَامُ كَرَاكِبِ الصَّعْبَةِ إِنْ اَشْنَقَ لَهَا خَرَمَ وَ إِنْ اَسْلَسَ لَهَا تَقَحَّمَ يُرِيْدُ اَنَّهُ إِذَا شَدَّدَ عَلَيْهَا فِيْ جَذْبِ الزِّمَامِ وَ هِيَ تُنَازِعُهُ رَأْسَهَا خَرَمَ اَنْفُهَا وَإِنْ اَرْخٰى لَهَا شَيْئاً مَعَ صُعُوبَتِهَا تَقَحَّمَتْ بِهِ فَلَمْ يَمْلِكْهَا يُقَالُ اَشْنَقَ النَّاقَةَ إِذَا جَذَبَ رَأْسَهَا بِالزِّمَامِ فَرَفَعَهُ وَ شَنَقَهَا أَيْضاً. ذَكَرَ ذٰلِكَ ابْنُ السِّكِّيْتِ فِيْ إِصْلَاحِ الْمَنْطِقِ وَ اِنَّمَا قَالَ اَشْنَقَ لَهَا وَلَمْ يَقُلْ اَشْنَقَهَا لِاَنَّهُ جَعَلَهُ فِيْ مُقَابَلَةِ قَوْلِهِ اَسْلَسَ لَهَا فَكَاَنَّهُ (عَلَيْهِ السَّلَامُ) قَالَ: إِنْ رَفَعَ لَهَا رَأْسَهَا بِمَعْنٰى اَمْسَكَهُ عَلَيْهَا بِالزِّمَامِ"

سیّد رضیؒ نے خطبے کے آخر میں اس کے چند جملوں کی تشریح کی ہے۔ امامؑ نے جس چیز کو نافرمان اونٹ سے تشبیہ دی ہے، یہ ہے کہ اگر اس کی ڈوری کو مضبوطی سے اپنی طرف کھینچ لیں تو وہ نافرمان سواری اپنے سر کو اس طرح اِدھر اُدھر کرتی ہے کہ اُس کی ناک پھٹ جاتی ہے اگر لگام کو ڈھیلا چھوڑ دے تو سرکشی کی وجہ سے خود کو کسی گڑھے میں گرا دے گا اور سوار اس کی حفاظت کی طاقت نہیں رکھتا ہے۔ جب "اَشْنَقَ النَّاقَةَ" کہا جاتا ہے، اس سے مراد اونٹ کے سر کو مہار کے ذریعے اپنی طرف کھینچ لانا ہے اور اُس کو اوپر کی طرف اُٹھانا ہے اور اسے "شَنَقَهَا" بھی کہا گیا ہے، اس مطلب کو ابنِ سکیت نے کتاب "اِصْلَاحِ الْمَنْطِقِ" میں لکھا ہے۔

امامؑ نے "اَشْنَقَ لَهَا" کہا ہے اور "اَشْنَقَهَا" نہیں فرمایا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اس جملے کو "اَسْلَسَ لَهَا" کے مقابل میں قرار دیا ہے؛ گویا امامؑ نے فرمایا ہے کہ اگر سواری کے سر کو اوپر اٹھالیا جائے یعنی لگام کو مضبوطی سے کھینچ لے تو اس کی ناک پھٹ جائے گی۔

[1] شرح ابن ابی الحدید، ج۱، ص ۲۰۵، خلاصے کے ساتھ۔

https://downloadshiabooks.com/

اہم نکات

ایک سوال کا جواب

ممکن ہے یہ کہا جائے، مذہب امامیہ اور اہل بیت علیہم السلام کے پیروکاروں کے عقیدے کے مطابق امام خدا اور اُس کے رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی طرف سے منتخب ہوتا ہے نہ کہ لوگوں کی طرف سے، حالانکہ امامؑ مندرجہ بالا مثالوں میں فرماتے ہیں: اگر ایسے حالات پیدا نہ ہوئے ہوتے تو میں خلافت ہرگز قبول نہ کرتا اور اسے چھوڑ دیتا، یہ امامت وخلافت کے انتخاب سے مناسبت رکھتا ہے۔

اس سوال کا جواب ایک نکتے کی طرف توجہ دینے سے واضح ہوجاتا ہے، وہ نکتہ یہ ہے کہ امامت ایک حقیقت ہے اور اس حقیقت کے لیے کچھ لوازمات ہیں یعنی یہ حقیقت کہ خلافت خدا کی طرف سے پیغمبرؐ کے ذریعے تعین ہوتی ہے لیکن اس کو عملی جامہ پہنانا لوگوں کے امور کی تدبیر اور اسلامی معاشرے میں مسلمانوں کے امور کو چلانے کے لیے لوگوں کی قبولیت اور آمادگی سے مربوط ہے اور امامؑ کے لیے مددگار اور حمایت کرنے والے بھی ہونے چاہئیں، جو صرف بیعت اور لوگوں کی حمایت کے ذریعے ہی ممکن ہے۔ اسی وجہ سے امام علی علیہ السلام پہلے تین خلفا کے دور میں تقریباً ۲۵ سال گھر میں گوشہ نشین رہے اور خلافت کے امور میں مداخلت نہیں کرتے تھے، مگر اُس وقت بھی خدا کی طرف سے امامت کا عہدہ آپؑ ہی کے پاس تھا اور اس میں کوئی کمی نہیں تھی۔ اسی طرح دوسرے اماموں کے بارے میں ہے کہ مثلاً حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام کے زمانے میں ابو مسلم خراسانی کی طرف سے آپؑ کو خلافت کی پیشکش کی گئی، لیکن حضرتؑ کو ان کی بے ایمانی اور دھوکے کا علم تھا اس لیے قبول نہیں کیا۔ کبھی لوگ ائمہؑ کو مشورہ دیتے تھے کہ آپؑ حضرات قیام کیوں نہیں کرتے اور اپنے عہدۂ خلافت وامامت کو واپس کیوں نہیں لیتے؟ وہ ان کے جواب میں فرماتے تھے کہ ہماری مدد کرنے والے اور حمایت کرنے والے کافی نہیں ہیں، اس لیے ہم قیام نہیں کرتے ہیں۔ [1]

اس خط میں کون سے سوالات تھے؟

---

[1] اصول کافی جلد ۱ صفحہ ۲۴۲، کتاب کفر وایمان باب فی قلۃ عدد المومنین۔

https://downloadshiabooks.com/

مرحوم شارح بحرانیؒ اپنی کتاب میں ''ابوالحسن کیدری'' سے نقل کرتے ہیں کہ اس خط میں جسے خطبے کے آخر میں امام علی علیہ السلام کے دستِ مبارک میں دیا گیا، دس سوالات تھے، جو درج ذیل ہیں:

سوال ۱: وہ جاندار جو دوسرے جاندار کے پیٹ سے باہر آیا لیکن وہ اس کا بچہ نہیں تھا وہ کیا تھا؟

جواب: امامؑ نے فرمایا وہ حضرت یونسؑ تھے جو مچھلی کے پیٹ سے باہر آئے۔

سوال ۲: وہ چیز کیا تھی جس کی کم مقدار حلال تھی اور زیادہ مقدار حرام؟

جواب: امامؑ نے فرمایا: وہ طالوت کی نہر کا پانی تھا، جس میں سے ان کے لشکر والوں کے لیے صرف تھوڑا سا پانی پینا جائز تھا زیادہ پینا حرام تھا۔

سوال ۳: کون سی عبادت ہے اگر کوئی اُسے انجام دے تو سزا ہے اور انجام نہ دے، تب بھی سزا ہے؟

جواب: آپؑ نے فرمایا: وہ نماز جو مستی کی حالت میں پڑھی جائے۔

سوال ۴: وہ کون سا پرندہ تھا جو نہ انڈے سے نکلا اور نہ اس کی کوئی ماں تھی؟

جواب: آپؑ نے فرمایا: وہ پرندہ ہے جو خدا کے اذن سے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے ہاتھوں خلق ہوا تھا۔

سوال ۵: اگر کوئی شخص ہزار درہم قرض دار ہے اور ہزار درہم اس کی جیب میں ہیں اور کوئی ضامن اس کے قرض کا ضامن بن جائے اور اُس کی جیب میں بھی ہزار درہم ہیں اور ان پر سال گزر جائے تو ان دونوں میں سے کس پر زکوٰۃ واجب ہوگی؟

جواب: آپؑ نے فرمایا، اگر ضامن مقروض کی اجازت سے ضامن ہوا ہے تو اس پر زکوٰۃ واجب نہیں ہے لیکن اگر اس کی اجازت کے بغیر ایسا کیا ہے تو اس پر زکوٰۃ واجب ہے۔

سوال ۶: اگر ایک گروہ حج کے لیے روانہ ہو جائے اور مکے کے کسی گھر میں ٹھہر جائے اور ان میں سے کسی ایک شخص نے گھر کا دروازہ بند کر دیا اور اس گھر میں کچھ کبوتر تھے وہ پیاس کی وجہ سے ان کے واپس آنے سے پہلے مر جائیں تو اس کا کفارہ ان میں سے کس پر واجب ہے؟

جواب: آپؑ نے فرمایا، اُس شخص پر واجب ہے جس نے دروازہ بند کر دیا تھا اور ان کے لیے پانی کا بندوبست نہیں کیا تھا۔

سوال ۷: چار لوگوں نے کسی کے زنا کے بارے میں گواہی دی، امامؑ نے ان کو سنگسار کرنے کا حکم دے دیا، کیونکہ وہ شادی شدہ تھا، ان میں سے ایک نے سنگسار کرنا شروع کیا، باقی تین مردوں نے پتھر نہیں مارا لیکن کچھ اور لوگوں نے اس

https://downloadshiabooks.com/

ایک شخص کی مدد کرتے ہوئے پتھر مارے، اس کے بعد وہ گواہ اپنی گواہی سے پھر گیا اور اپنے جھوٹا ہونے کا اقرار کیا۔ لیکن ابھی تک ملزم مرا نہیں تھا، پھر اس کے مرنے کے بعد باقی تینوں گواہ بھی اپنی گواہی سے پھر گئے تو اُس وقت مقتول کی دیت کس پر واجب ہے؟

جواب: آپؑ نے فرمایا: اُس ایک شخص اور ان کے ساتھ پتھر مارنے میں مدد کرنے والوں پر واجب ہے۔[۱]

سوال ۸: دو یہودی کسی اور یہودی کے خلاف گواہی دے دیں کہ اس نے اسلام قبول کیا ہے کیا ان دونوں کی گواہی قابلِ قبول ہے؟

جواب: آپؑ نے فرمایا: ان کی گواہی قابلِ قبول نہیں ہے، کیونکہ یہ لوگ کلام الٰہی میں تبدیلی اور باطل گواہی دینے کو جائز سمجھتے ہیں۔

سوال ۹: اگر دو نصاریٰ گواہی دیں کہ تیسرا نصاریٰ یا مجوسی مسلمان ہو گیا ہے، کیا ان دونوں عیسائیوں کی گواہی قابل قبول ہے یا نہیں؟

جواب: آپؑ نے فرمایا قبول ہوگی، کیونکہ خدا نے فرمایا ہے:

"وَلَتَجِدَنَّ أَقْرَبَهُمْ مَّوَدَّةً لِّلَّذِينَ آمَنُوا الَّذِينَ قَالُوا إِنَّا نَصَارَىٰ"۔[۲]

''مسلمانوں کے نزدیک ترین دوست ایسے لوگوں کو پاؤ گے جو کہتے ہیں کہ ہم نصاریٰ ہیں۔''

سوال ۱۰: اگر کسی نے دوسرے کا ہاتھ کاٹ دیا اور چار افراد امامؑ کے پاس حاضر ہوں اور گواہی دیں کہ اس کا ہاتھ کٹ چکا ہے اور اسی حالت میں اس نے زنا محصنہ کیا ہے، امامؑ چاہتے تھے اس کو سنگسار کریں لیکن سزا پانے سے پہلے وہ مرجائے تو اُس کا حکم کیا ہے؟

جواب: آپؑ نے فرمایا: جس نے اس کا ہاتھ کاٹا تھا وہ اس کی دیت دے گا، لیکن اگر گواہوں نے گواہی دی تھی کہ اُس نے ہاتھ کاٹنے کے نصاب کے برابر چوری کی ہے تو اس وقت دیت ہاتھ کاٹنے والے پر واجب نہیں ہے۔[۳]

---

[۱] یہ حکم اس وقت ہے جب گواہی دینے والے غلطی کا شکار ہو گئے ہوں، اگر انہوں نے عمداً جان بوجھ کر جھوٹ بولا تھا تو ان سے قصاص لیا جائے گا جس طرح کتاب میں بحث کی گئی ہے۔ یہ نکتہ بھی قابل توجہ ہے کہ جنہوں نے ان کی گواہی کی وجہ سے پتھر مارنا شروع کیا تھا وہ پلٹ سکتے ہیں اور جو غرامت انہوں نے ادا کیا ہے وہ ان چار گواہوں سے مساوی طور پر لے سکتے ہیں۔ اس کے بارے میں مزید معلومات کے لیے کتاب جواہر، ج ۴۱، ص ۲۲۵ کا مطالعہ کر سکتے ہیں یاد رکھیے جو کچھ اس حدیث میں آیا ہے اور جو احکام فقہی کتابوں میں نقل ہوئے ہیں، کچھ اختلاف رکھتے ہیں۔

[۲] سورۂ مائدہ: آیت ۸۲

[۳] شرح نہج البلاغہ ابن میثم بحرانی جلد ۱، صفحہ ۲۶۹ اور مستدرک جلد ۷ صفحہ ۵۵

https://downloadshiabooks.com/

البتہ جو کچھ اوپر ہم نے بیاں کیا ہے وہ ایک مرسلہ حدیث کا مضمون ہے جو کیدری سے نقل ہوئی ہے۔ اور حدیث کی سند کا صحیح ہونا معلوم نہیں ہے۔ لہٰذا اس حدیث کے کچھ احکام میں بحث و گفتگو کی گنجائش ہے۔

خطبۂ شقشقیہ کی خصوصیات

بالآخر ہم اس نتیجے تک پہنچ جاتے ہیں کہ خطبۂ شقشقیہ نہج البلاغہ کے تمام خطبوں کے درمیان بے مثال خطبہ ہے۔ یہ بات اس چیز کی نشاندہی کرتی ہے کہ امام علیؑ نے اس خطبے کو خاص شرائط میں بیان فرمایا ہے تاکہ پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی جانشینی کے متعلق حقائق کو فراموش نہ کیا جا سکے اور تاریخ میں یہ چیزیں محفوظ رہیں۔ اس خطبے میں امام علی علیہ السلام نے معمول سے زیادہ صراحت اور کھل کر بات کی ہے۔ اس کی وجہ بھی یہی ہے، چونکہ حقائق کو مختلف مصلحتوں کا شکار نہیں ہونا چاہیے اور تعصب کے گرد و غبار میں گم نہیں ہونا چاہیے، امام علی علیہ السلام نے مذکورہ خطبے میں درج ذیل چیزوں کے بارے میں وضاحت فرمائی ہے:

(۱) خلافت و حکومت کے لیے اپنی قابلیت اور اہلیت کو واضح طور پر بیان فرمایا ہے، یہ وہی حقیقت ہے جس پر تقریباً تمام اسلامی اور غیر اسلامی دانشوروں اور محققین کا اتفاق ہے، یہاں تک کہ امیر شام جو امام علی علیہ السلام کے بدترین دشمنوں میں سے تھا اور وہ اس بات کا اعتراف کرتا تھا۔ [۱]

(۲) امام علی علیہ السلام کی مظلومیت کا ذکر اس خطبے میں ہے۔ ان تمام مناقب و قابلیت کے باوجود آپؑ کا حق نہیں دیا گیا۔

(۳) حضرت علی علیہ السلام کا کلام واضح طور پر یہ اعلان کر رہا ہے کہ گزشتہ تمام خلفا کا انتخاب کسی دلیل، منبع اور مدرک کی بنیاد پر نہیں تھا، اس کے علاوہ ان کے انتخاب میں کئی معیار کار فرما تھے۔ پہلے مرحلے میں زور زبردستی، دوسرے مرحلے میں ایک شخص کا انتخاب، تیسرے مرحلے میں چھے افراد کی شوریٰ (کونسل) کے انتخاب کو معیار بنایا گیا۔

(۴) گزشتہ خلفا کے دور میں لوگوں کا پیغمبر اکرمؐ کی حقیقی تعلیمات سے دور ہونا اور زمانہ گزرنے کے ساتھ بحرانوں میں شدت آنا یہاں تک کہ مولا علیؑ کی خلافت کے دور تک ایسی کٹھن صورت حال پیدا ہوگئی تھی کہ لوگوں کو اسلام کی حقیقی

---

[۱] یہ مطلب اس مشہور خط میں ذکر ہوا ہے جس کو امیر شام نے محمدؒ ابن ابی بکر کے جواب میں مصر ارسال کیا تھا۔ اس خط کا ذکر بہت سی اسلامی کتابوں من جملہ مروّج الذھب میں آیا ہے، امیر شام واضح طور پر یہ اعلان کرتا ہے کہ میں اور تمہارا باپ (خلیفۂ اوّل) امام علیؑ کی فضیلت اور ان کے اہل ہونے کے قائل ہیں اور ان کے حق کو اپنے اوپر لازم مانتے ہیں۔ لیکن جب پیغمبر اکرمؐ کی رحلت ہوگئی، سب سے پہلے ان کی مخالفت کرنے والے اور ان کا حق غصب کرنے والوں میں تمہارا باپ اور اس کا رفیق (خلیفۂ دوّم) تھے۔ ''مروّج الذھب جلد ۳ صفحہ ۱۲'' یعقوبی نے بھی اپنی تاریخ میں واضح طور پر کہا ہے۔ ''وَكَانَ الْمُهَاجِرُوْنَ وَالْاَنْصَارُ لَا يَشُكُّوْنَ فِيْ عَلِيٍّ علیہ السلام'' مہاجر و انصار علیؑ کی افضلیت اور قابلیت کے بارے میں کسی قسم کے شک سے دوچار نہیں تھے۔ (تاریخ یعقوبی، ج ۲، ص ۱۲۴)

https://downloadshiabooks.com/

تعلیمات کی طرف پلٹنا مشکل ہو گیا، اسی لیے یہ مقصد کامل طور پر حاصل نہ ہو سکا۔

(۵) حضرت علیؑ کی خلافت کے دور میں جو حالات پیدا کیے گئے اور جنگیں شروع ہو گئیں، ان تمام واقعات کی بنیاد دنیا پرستی، مال و مقام اور اقتدار کے ساتھ لگاؤ تھا، جو کہ کچھ افراد کے لیے فطرتِ ثانوی کے طور پر مضبوط ہو چکا تھا۔ خصوصاً خلیفۂ سوّم کی خلافت کے زمانے میں یہ مسئلہ ایک نئی شکل اختیار کر چکا تھا۔

(۶) فطری اور طبعی شکل میں مکمل بیعت صرف حضرت علیؑ کی بیعت کی شکل میں نظر آئی، لیکن منافقین کے ابھارنے کی وجہ سے اور معاشرے کے کچھ بااثر افراد کے مولا علیؑ کی عدالت برداشت نہ کرنے کی بنا پر بعد میں بیعت توڑنے اور عہد شکنی کا سلسلہ شروع ہوا اور آپ کی مخالفت شروع کی گئی۔

(۷) حضرت علی علیہ السلام کا دنیا کے اقتدار اور خلافتِ ظاہری کے ساتھ کسی بھی طریقے سے لگاؤ نہیں تھا۔ کسی بھی وقت حکومت اور اقتدار کو ہدف کی نظر سے نہیں دیکھا، بلکہ ظالمین کے ظلم کو روکنے اور مظلومین کی حمایت کرنے، ظالموں کے ہاتھ مظلوموں کے گریبان سے الگ کرنے اور معاشرے میں نظم و ضبط و عدالت برقرار رکھنے کا وسیلہ سمجھتے تھے۔

(۸) خلیفۂ سوّم کے دور میں جو بغاوتیں شروع ہوئیں اور بالآخر ان کے قتل تک جا پہنچیں حضرت علی علیہ السلام کی نظر میں فطری اور طبعی تھیں، جو ان کے رفتار و کردار اور ان کے طرفداروں (بنی امیہ) کے کرتوتوں کا نتیجہ تھیں، کیونکہ بنی امیہ کے لوگ اہم اسلامی شہروں پر حاکم اور گورنر بن کر مسلط ہو گئے تھے، بیت المال ان کے اختیار میں آ گیا بیت المال مسلمین سے اپنے لوگوں کو عجیب و غریب انداز میں عطا کرنا شروع کیا، جس کا ذکر گزشتہ بحثوں میں بیان ہو چکا ہے، لوگ ان کے طور طریقوں سے باخبر ہو گئے اور بغاوت کے بیج دور دراز کے علاقوں میں کاشت کیے گئے، جیسا کہ مصر، بصرہ، کوفے میں بغاوت شروع ہو گئی۔

(۹) حضرت علی علیہ السلام کی خلافت کے دوران شروع ہونے والی تین جنگیں ان پر مسلط کردہ تھیں۔ ان میں سے کسی بھی جنگ کا آغاز حضرت علیؑ کی طرف سے نہیں ہوا بلکہ وہ تمام جنگیں موقع پرست، اقتدار کے دلدادہ یا جاہل اور بے بصیرت افراد کی طرف سے شروع ہوئیں۔

(۱۰) تنزیہ صحابہ (تمام صحابہ کو عادل اور پاک قرار دینے والی داستان) ایسی چیز ہے جو تاریخ کے حقائق میں سے کسی بھی واقعے کے ساتھ سازگار نہیں ہے۔ اس پر عقیدہ رکھنا تناقص اور کھلے تضاد کا باعث ہے، کیونکہ جنگ جمل کی آگ بھڑکانے والے (بڑے اصحاب) میں سے دو تھے اور جنگ صفین کو شعلہ ور کرنے والے بھی صحابہ تھے اور جنگ نہروان کے لشکر میں بھی کچھ صحابہ تھے۔ ان سب نے اپنے زمانے کے امامؑ کے خلاف بغاوت کی، جنہیں تمام مسلمانوں نے حتیٰ کہ انہی

https://downloadshiabooks.com/

بغاوت کرنے والوں نے بیعت کر کے انتخاب کیا تھا اور انہوں نے اسلامی معاشرے میں شگاف ڈالا اور بغاوت وظلم وزیادتی کے راستے پر چل پڑے۔ کس طرح ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ حضرت علیؑ بھی راہ راست پر تھے اور طلحہ وزبیر اور امیر شام جیسے افراد بھی صراطِ مستقیم پر تھے!!!؟ ایسے موقعوں پر اجتہادی غلطی جیسی تاویلات کا سہارا لینا بالکل غیر منطقی اور غلط ہے۔ اگر ان جیسے قصداً انجام دیے گئے کاموں کے لیے اجتہاد کی تاویل ہوسکتی ہے تو پھر ہر گناہِ کبیرہ کے لیے یہ دلیل پیش کی جاسکتی ہے۔

https://downloadshiabooks.com/

https://downloadshiabooks.com/

چوتھا خطبہ

وَمِنْ كَلَامٍ لَهُ عَلَيْهِ السَّلَامُ

"وَهِيَ مِنْ أَفْصَحِ كَلَامِهِ عَلَيْهِ السَّلَامُ وَفِيهَا يَعِظُ النَّاسَ وَيَهْدِيهِمْ مِنْ ضَلَالَتِهِمْ وَيُقَالُ: إِنَّهُ خَطَبَهَا بَعْدَ قَتْلِ طَلْحَةَ وَالزُّبَيْرِ"

آپؑ کے فصیح ترین کلمات میں شمار ہوتا ہے اور جس میں لوگوں کو نصیحت کی گئی ہے اور انہیں گمراہی سے ہدایت کے راستے پر لایا گیا ہے۔ (یہ خطبہ طلحہ و زبیر کی بغاوت اور قتل کے پس منظر میں فرمایا ہے)

پہلا حصّہ

بِنَا اهْتَدَيْتُمْ فِي الظَّلْمَاءِ وَتَسَنَّمْتُمْ ذُرْوَةَ الْعَلْيَاءِ وَبِنَا أَفْجَرْتُمْ عَنِ السِّرَارِ وُقِرَ سَمْعٌ لَمْ يَفْقَهِ الْوَاعِيَةَ وَكَيْفَ يُرَاعِي النَّبْأَةَ مَنْ أَصَمَّتْهُ الصَّيْحَةُ رُبِطَ جَنَانٌ لَمْ يُفَارِقْهُ الْخَفَقَانُ.

"تم لوگوں نے ہماری ہی وجہ سے تاریکیوں میں ہدایت کا راستہ پایا ہے اور بلندی کے کوہان پر قدم جمائے ہیں اور ہماری ہی وجہ سے اندھیری راتوں سے اجالے کی طرف باہر آئے ہو۔ وہ کان بہرے ہو جائیں جو پکارنے والے کی آواز نہ سن سکیں اور وہ لوگ بھلا دھیمی آواز کو کیا سن سکیں گے جن کے کان بلند ترین آوازوں کے سامنے بھی بہرے ہی رہے ہوں۔ مطمئن دل وہی ہوتا ہے جو یادِ الٰہی اور خوفِ خدا میں مسلسل دھڑکتا رہتا ہے۔"

خطبہ، ایک نگاہ میں

یہ خطبہ جیسا کہ اس کے عنوان میں ذکر ہوا ہے، احتمالاً جنگ جمل اور طلحہ و زبیر کے قتل ہونے کے بعد ارشاد فرمایا ہے۔ طبیعی طور پر اس جنگ کے نتائج اور درسِ عبرت لینے کے بارے میں ہے کہ تمام مسلمانوں کو چاہیے اس واقعے سے سبق لیں اور عبرت حاصل کریں۔ اس خطبے کے اصل موضوعات کا تین حصوں میں خلاصہ کیا جا سکتا ہے:

https://downloadshiabooks.com/

۱۔اس حقیقت کی وضاحت کہ لوگ گمراہی اور اندھیروں میں پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے اہلِ بیتؑ کے وسیلے سے راہ راست پر آئے ہیں اور ترقی کی منازل کو طے کیا ہے۔اسی وجہ سے مسلمان کو ہمیشہ اہلِ بیتؑ کے وعظ و نصیحتوں کو سننے کے لیے تیار رہنا چاہیے۔

۲۔اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ امامؑ ان کی عہد شکنی اور بیعت توڑنے سے باخبر تھے لیکن وہ پردہ چاک کرنا نہیں چاہتے تھے۔

امامؑ فرماتے ہیں کہ میں ان کی عہد شکنی کو پہلے ہی جانتا تھا لیکن میں نے چاہا کہ ان پر پردہ ڈال دوں۔

۳۔خطبے کے آخر میں اس بات کی طرف اشارہ فرماتے ہیں کہ آج پردہ پوشی کی گنجائش نہیں ہے، حقائق کو بیان کرنا ضروری ہے ورنہ اکثر لوگوں کے گمراہ ہونے کا خطرہ ہے۔مجھے اندیشہ اسی بات کا ہے، نہ یہ کہ اپنی جان کے ڈر و خوف کا شکار ہوں۔

شرح و تفسیر

اپنی آنکھیں اور کان کھول دیں

حضرت علی علیہ السلام اس خطبے کے شروع کے جملوں میں ان عظیم نعمتوں کی طرف اشارہ فرماتے ہیں جو اسلام کے سائے میں مسلمانوں کو خصوصاً ابتدائی دور میں نصیب ہوئیں، آپؑ نے تین انتہائی مختصر اور خوبصورت تمثیل کے ساتھ تین جملوں میں ان مطالب کی وضاحت فرمائی ہے:

"بِنَا اهْتَدَيْتُمْ [۱] فِي الظَّلْمَاءِ [۲]، وَتَسَنَّمْتُمْ [۳] ذُرْوَةَ [۴] الْعَلْيَاءِ،

---

[۱] اھتدیتم اھتداء سے لیا گیا ہے۔نہج البلاغہ کے بعض شارحین اور اہلِ لغت کے کہنے کے مطابق وہاں یہ لفظ استعمال کیا جاتا ہے، جہاں انسان اپنی رغبت اور میل سے ہدایت قبول کرے۔مذکورہ بالا عبارت میں مراد یہی معنی ہیں۔

[۲] ظلماء صحراء کے وزن پر بعض محققین کے قول کے مطابق رات کی ابتدائی تاریکی کو کہا جاتا ہے یا دوسری تعبیر میں نور کے بعد والا اندھیرا مراد ہے۔ظلمت کے معنی اس لفظ کے برعکس معنی عام ہیں یعنی ہر قسم کی تاریکی۔امام علی علیہ السلام کے کلام میں اس لفظ کے استعمال سے مطلب یہ ظاہر ہوتا ہے کہ زمانہ جاہلیت تاریکی تھی، اولوالعزم انبیاءؑ کے نور کے بعد۔

[۳] تسنمتم ، سنم ، سے مشتق ہے، قلم ، کے وزن پر۔اس کے معنی اوپر جانے کے ہیں۔اور، سنم ، مرام کے وزن پر۔اس کے معنی اونٹ کے کوہان ہیں۔

[۴] ذروۃ ذرو سے لیا گیا ہے، سرو، کے وزن پر دو معنی کے لیے آیا ہے۔ایک چیز کا دوسری چیز پر احاطہ و مسلط ہونا، اسی وجہ سے پہاڑ کی چوٹیوں کو "ذروہ" کہا جاتا ہے۔اسی طرح اونٹ کے کوہان کو بھی ذروہ کہا گیا۔دوسرے معنی بہانے اور پھیلانے کے ہیں۔

https://downloadshiabooks.com/

وَبِنَا اَفْجَرْتُمْ [۱] عَنِ السِّرَارِ"[۲]

''ہماری وجہ سے تمہیں (زمانۂ جاہلیت کی) گمراہی سے نجات ملی اور ہدایت یافتہ ہوئے ہو، اور ہماری مدد سے ترقی کی بلندیوں کو پہنچ چکے ہو اور ہمارے (پیغمبرؐ کے اہلِ بیتؑ کے) نور کی شعاعوں میں تمہاری سعادت کی صبح کی روشنی چمکنے لگی اور تاریکیاں ختم ہوگئیں۔''

پہلے جملے میں امامؑ زمانۂ جاہلیت کی تاریکی اور جہالت وفساد اور ظلم وزیادتیوں کی طرف اشارہ فرماتے ہیں، جو ہر جگہ پھیل چکی تھیں۔ پیغمبر اکرمؐ کے وجود کی بدولت لوگ صراطِ مستقیم پر آ گئے اور تیزی کے ساتھ منزلِ مقصود کی طرف چلنا شروع کیا۔

دوسرے جملے میں ترقی اور پیشرفت کو ایک اونٹ کے ساتھ تشبیہ دیتے ہیں، جو اونچے کوہان والا ہے (اس بات کی طرف توجہ دیتے ہوئے "تَسَنَّمْتُمْ" نام لیا گیا ہے، جس کے معنی اونٹ کا کوہان ہیں) آپؑ فرماتے ہیں: آپ لوگ جس ترقی وتکامل کے کوہان پر سوار ہو گئے ہیں، یہ ترقی مسلمانوں کو اسلام کی برکت سے حاصل ہوئی، تمام مشرقی ومغربی تاریخ لکھنے والے اپنی کتابوں میں اسلامی تمدن کے بارے میں بحث کے دوران اس ترقی کا اعتراف کرتے ہیں۔

تیسرے جملے میں زمانۂ جاہلیت کے حالات کو مہینے کی آخری راتوں کے ساتھ تشبیہ دی ہے، جن راتوں میں چاند مکمل طور پر غائب ہو جاتا ہے، کیونکہ سرار کے معنی وہی مہینے کی آخری راتیں ہیں۔ آپؑ فرماتے ہیں: پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور اُن کے اہل بیتؑ کی بدولت تاریک پردے شگافتہ ہو گئے اور مسلمان سعادت اور خوش بختی کی صبح میں داخل ہو گئے۔

حقیقت میں اس کلام کا سرچشمہ قرآن کریم ہے، جہاں پر اسلام اور ایمان اور وحی الٰہی کو نور کے ساتھ شباہت دی ہے۔ کبھی قرآن میں خداوند سبحان فرماتا ہے:

اَللّٰهُ وَلِيُّ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا يُخْرِجُهُمْ مِّنَ الظُّلُمٰتِ اِلَى النُّوْرِ [۳]

''خدا ان لوگوں کا سرپرست ہے جو ایمان لائے ہیں، خدا ان کو اندھیروں سے نور کی طرف نکالتا ہے۔''

دوسری جگہ فرماتا ہے:

---

[۱] افجرتم، فجر کے اصل سے لیا گیا ہے۔ اس کے اصل معنی ایک چیز کو وسیع انداز میں شگافتہ کرنے کے ہیں۔ صبح کی روشنی رات کی تاریکی کو شگافتہ کرتی ہے اسی وجہ سے صبح کو فجر کہا جاتا ہے اور ''افجرتم'' کے معنی کسی سفیدی یا روشنی میں داخل ہونا ہے۔

[۲] سرار، سر، کے اصل سے مشتق ہے جو کہ چھپ جانا ہے، ظاہر وآشکار کے معنی کے مقابل ہے۔ لفظ سرار عام طور پر مہینے کی آخری راتوں کو کہا جاتا ہے جن میں راتیں مکمل طور پر اندھیری وتاریک ہو جاتی ہیں۔

[۳] سورۂ بقرہ: ۲۵۸

https://downloadshiabooks.com/

"قَدْ جَاءَكُمْ مِنَ اللهِ نُورٌ وَ كِتَابٌ مُبِينٌ يَهْدِي بِهِ اللهُ مَنِ اتَّبَعَ رِضْوَانَهُ سُبُلَ السَّلَامِ وَ يُخْرِجُهُمْ مِنَ الظُّلُمَاتِ إِلَى النُّورِ بِإِذْنِهِ"[1]

''یقیناً خدا کی طرف سے نور اور روشن کتاب تمہاری طرف آئی ہے۔ خدا اِن کی برکت سے اُن لوگوں کو راہِ سلامتی و ہدایت کی طرف راہنمائی کرتا ہے، جو اُس کی خوشنودی کے راستے کی پیروی کرتے ہیں اور اپنے اذن سے ان کو تاریکی سے روشنی کی طرف نکالتا ہے (منتقل کر دیتا ہے)'' اور کبھی فرماتا ہے:

"وَإِنَّهُ لَذِكْرٌ لَكَ"[2]

''اور یہ (قرآن) تمہارے لیے نصیحت ہے۔''

اس کے بعد امامؑ ان افراد کی مذمت کرتے ہوئے جو حقائق کو درک نہیں کرتے ہیں اور ان افراد کی تعریف کرتے ہوئے جو کہ حقائق کو درک کرنے والے ہیں، فرماتے ہیں:

"وُقِرَ سَمْعٌ لَمْ يَفْقَهِ الْوَاعِيَةَ"

''بہرے ہو جائیں وہ کان جو وعظ و نصیحت کی بلند آوازوں کو نہیں سنتے ہیں اور درک کرنے کی صلاحیت نہیں رکھتے ہیں۔''

"وُقِرَ" کا لفظ مکمل بہرا ہونے، نیز کم سننے کے معنی میں بھی استعمال ہوتا ہے اور "وَاعِيَة" سے مراد چیخنا اور چلانا ہے۔ یہ کلام اشارہ ہے قرآن کریم کی واضح، صریح اور دل ہلا دینے والی آیات کی طرف جو کہ اہم اعتقادی اور عملی و اخلاقی مسائل اور پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی روشن سنّت کے بارے میں وارد ہوئی ہیں۔

اور "لَمْ يَفْقَهِ" درک نہ کرنے اور "لَمْ يَسْمَعْ" نہیں سننے کے لیے استعمال ہوا ہے، اس وجہ سے ہے کہ صرف سننا فائدہ مند نہیں ہے، بلکہ اہم چیز درک کرنا ہے۔

پھر آپؑ فرماتے ہیں:

---

[1] سورۂ مائدہ: ۱۵، ۱۶

[2] سورۂ زخرف: ۴۴

https://downloadshiabooks.com/

"وَ كَيْفَ يُرَاعِي النَّبْأَةَ[1] مَنْ أَصَمَّتْهُ الصَّيْحَةُ."[2]

"جسے چیخ و پکار نے بہرا کر دیا ہو کیسے ممکن ہے میری ہلکی آواز سن سکے، مراد یہ ہے کہ جنہوں نے خدا اور رسولؐ کے فرمان کو پامال کیا ہو، میری بات کیسے سن سکتے ہیں؟ اس گروہ کے مقابل میں ایک اور گروہ موجود ہے، جو حق کے طرفدار ہیں۔ ان کے بارے میں آپؑ فرماتے ہیں:

"رُبِطَ جَنَانٌ[3] لَمْ يُفَارِقْهُ الْخَفَقَانِ."[4]

"سکون و قرار ہو ان دلوں کے لیے جو خوفِ خدا سے خالی نہیں ہیں۔" (حقیقت کو درک کرتے ہیں اور اس کے آگے خاضع و متواضع ہیں یعنی سرِ تسلیم خم ہیں)

نکتہ

ہدایت خاندانِ وحی کے سائے میں

جو کچھ مولا علی علیہ السلام کے مذکورہ بالا کلام میں ہم نے پڑھا ہے، وہ اس اہم تاریخی حقیقت کی طرف اشارہ ہے جسے زمانۂ جاہلیت میں عرب والوں کی حالتِ زار کو اسلام کے طلوع کے بعد والی تعمیر و ترقی کی طرف نسبت دینے سے پتا چلتا ہے کہ عرب والوں کی جاہلیت کے دور میں دینی عقائد، ابتدائے خلقت اور معاد کے مسائل معاشرتی نظام، خاندانی نظام، اخلاقی اقدار اور اقتصادی حالات کے اعتبار سے کس حالت میں تھے۔ اسلام آنے کے بعد اور قرآن نازل ہونے کے بعد کس سطح تک پہنچے؟ ان دونوں سطحوں کے درمیان اتنا زیادہ فرق ہے، جس کو صرف معجزہ ہی کہا جا سکتا ہے، اس کے لیے کوئی اور تعبیر نہیں ملتی ہے۔

---

[1] نباۃ، اصل میں نباء سے مشتق ہے جس کے معنی ایک جگہ سے دوسری جگہ آنے کے ہیں۔ اس لحاظ سے خبر کسی جگہ سے دوسری جگہ منتقل ہوتی ہے۔ اسی لیے خبر کو عربی میں نباء کہا جاتا ہے۔ اور نباۃ کا مطلب ہلکی آواز ہے کیونکہ آواز بھی ایک جگہ منتقل ہوتی ہے۔ (اسی مناسبت سے نباۃ کہا) (مقائیس اللغۃ)۔

[2] نہج البلاغہ کے بعض شارحین نے وضاحت کی ہے، اصمتہ الصیحۃ، سے مراد یہ نہیں ہے کہ وحی کی چیخ نے ان کو بہرہ بنا دیا ہے۔ بلکہ اس کا مطلب ہے کہ یہ لوگ وحی کے مطالب سے کراہت کرتے ہیں، اس آیت کی طرح (اَفَاَنْتَ تُسْمِعُ الصُّمَّ وَلَوْ كَانُوْا لَا يَعْقِلُوْنَ) (سورہ یونس: ۴۲)

[3] جنان، کے معنی دل کے ہیں، کیونکہ دل انسان کے سینے میں چھپا ہوا ہے اور یہ لفظ جن کے اصل سے لیا گیا ہے، فن، کے وزن پر اصلی معنیٰ چھپنے سے لیے ہیں۔ اسی مناسبت سے بہت سے درختوں سے ڈھکے باغ کو جنت کہتے ہیں کیونکہ درختوں کی وجہ سے زمین چھپی ہوئی اور ماں کے پیٹ میں جو بچہ ہے اس کو، جنین، اور بھوتوں کے گروہ کو جن کہا جاتا ہے۔ پاگل کو اس مناسبت سے مجنوں کہتے ہیں کہ اس کی عقل پر پردہ پڑا ہوا ہے یا جن نے اس میں نفوذ کیا ہے۔

[4] خفقان، اصل میں اضطراب کے معنیٰ ہیں۔ اس وجہ سے کہ خوف و ڈر اضطراب کا سبب ہے، اسی لیے یہ لفظ جوف کے معنی میں استعمال ہوا ہے مندرجہ بالا کلام میں خفقان سے مراد خدا کا خوف ہے۔ (جو مومنین کے دل میں ہوتا ہے)

https://downloadshiabooks.com/

جو کچھ امامؑ نے اس حصے میں زمانہ جاہلیت کی تاریکی کے بارے میں جو کہ اس وقت کے پورے معاشرے کو اپنی لپیٹ میں لیے ہوئے تھی اور اسلام کے ظہور کے ساتھ سعادت اور خوش بختی کی صبح کی روشنی ظاہر ہوگئی اور یہ لوگ تمدن وثقافت اور معرفت کی بلندیوں تک پہنچ گئے۔

امامؑ نے جو فرمایا ہے وہ صرف مختصر اشارہ تھا، اس کی مکمل تشریح اور وضاحت کے لیے تاریخ تمدن اسلام کے بارے میں لکھی گئی کتابوں کا مطالعہ کرنا چاہیے۔ یہی مطالب نہج البلاغہ کے بہت سے خطبوں میں زیادہ تفصیل کے ساتھ بیان ہوئے ہیں۔

دوسرا حصّہ

مَا زِلْتُ أَنْتَظِرُ بِكُمْ عَوَاقِبَ الْغَدْرِ وَ أَتَوَسَّمُكُمْ بِحِلْيَةِ الْمُغْتَرِّينَ حَتَّى سَتَرَنِي عَنْكُمْ جِلْبَابُ الدِّينِ وَ بَصَّرَنِيكُمْ صِدْقُ النِّيَّةِ أَقَمْتُ لَكُمْ عَلَى سَنَنِ الْحَقِّ فِي جَوَادِّ الْمَضَلَّةِ حَيْثُ تَلْتَقُونَ وَ لَا دَلِيلَ وَ تَحْتَفِرُونَ وَ لَا تُمِيهُونَ.

"میں روزِ اوّل سے تمہاری غداری کے انجام کا انتظار کر رہا ہوں اور تمہیں فریب خوردہ لوگوں کے انداز سے پہچان رہا ہوں، مجھے تم سے دینداری کی چادر نے پوشیدہ کر دیا ہے لیکن صدق نیت نے میرے لیے تمہارے حالات کو آئینہ کر دیا ہے، میں نے تمہارے لیے گمراہی کی منزلوں میں حق کے راستوں پر قیام کیا ہے، جہاں تم ایک دوسرے سے ملتے تھے لیکن کوئی راہنما نہ تھا اور کنواں کھودتے تھے لیکن پانی نصیب نہیں ہوتا تھا۔"

شرح وتفسیر

تمہاری عہد شکنی جانتا تھا، مگر!!!

امام علی علیہ السلام خطبے کے اس حصے میں جنگ جمل سے زندہ بچ جانے والوں سے خطاب کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

https://downloadshiabooks.com/

"مَا زِلْتُ اَنْتَظِرُ بِكُمْ عَوَاقِبَ الْغَدْرِ، وَاَتَوَسَّمُكُم [1] بِحِلْيَةِ الْمُغْتَرِّيْنَ" [2]

''میں ہمیشہ تمہاری عہد شکنی اور بے وفائی کا منتظر تھا اور دھوکا کھانے والوں کی نشانیاں تمہارے اندر دیکھتا تھا۔''

روایات میں یہ بات آئی ہے کہ طلحہ و زبیر مولا علی علیہ السلام کے ہاتھوں بیعت کرنے کے کچھ عرصہ بعد آپؑ کی خدمت میں آئے اور عمرے کے لیے جانے کی اجازت چاہی، امامؑ ان میں نفاق اور عہد توڑنے کے آثار دیکھ رہے تھے، اس لیے ان سے دوبارہ عہد و پیمان اور بیعت لے لی، لیکن جس طرح ہم جانتے ہیں وہ اپنے وعدے پر پابند نہ رہے اور انہوں نے جنگ جمل کی آگ بھڑکائی۔ اس آگ میں مسلمانوں میں سے دس ہزار سے زیادہ لوگ لقمۂ اجل بن گئے۔ یقیناً دوسرے بہت سے افراد اس سازش میں شریک تھے باوجود اس کے کہ آپؑ کے ہاتھوں پر بیعت کیے ہوتے تھے، انہوں نے وعدہ خلافی اور عہد شکنی کرنا شروع کر دی۔ حضرت علی علیہ السلام نے اس خطبے میں انہی افراد کو مخاطب قرار دیا ہے۔

ابن ابی الحدید اپنے کسی کلام میں نقل کرتے ہیں کہ امام علی علیہ السلام نے اس دن جب زبیر نے بیعت کی، فرمایا کہ میں اس بات سے ڈرتا ہوں کہ تم اپنے وعدے کی خلاف ورزی کرو گے اور عہد شکنی کرتے ہوئے بیعت توڑ دو گے۔ زبیر نے عرض کیا، آپؑ مت گھبرائیں ایسی کوئی بات مجھ سے ہرگز سرزد نہیں ہوگی۔ حضرت امامؑ نے فرمایا: کیا خدائے سبحان کو اس بات کا گواہ بناؤ گے؟ زبیر نے کہا، ٹھیک ہے۔ کچھ دن بعد طلحہ و زبیر دونوں آپؑ کی خدمت میں آئے اور عرض کرنے لگے، آپ جانتے ہیں خلیفۂ سوّم کے دور حکومت میں ہم پر کتنا ظلم ہوا اور آپؑ یہ بھی جانتے ہیں کہ وہ بنی امیہ کے طرفدار تھے، اب خدا نے اس خلافت کو آپؑ کے حوالے کیا ہے۔ ان شہروں میں سے بعض کی گورنری ہمارے حوالے کر دیں۔ حضرت امامؑ نے فرمایا:

''خدا کی تقسیم پر راضی رہو، مجھے اس معاملے میں سوچنے کی مہلت دیدو اور یہ جان لو کہ میں اس الٰہی امانت میں کسی کو شامل نہیں کرتا ہوں جب تک اس کی ایمانداری اور امانتداری سے راضی اور مطمئن نہ ہو جاؤں۔''

یہ لوگ آپؑ کی خدمت سے اقتدار ملنے کی امید سے مایوس ہو کر باہر آئے، زیادہ عرصہ نہیں گزرا تھا انھوں نے (مکہ جانے کے لیے) عمرے کی اجازت لے لی۔

اس سے بھی عجیب بات یہ تھی کہ ابن ابی الحدید کے قول کے مطابق جب امام علی علیہ السلام کا خط امیر شام تک پہنچا، جس میں لکھا تھا، تمام لوگوں نے میری بیعت کی ہے اور تم بھی میرے لیے لوگوں سے بیعت لے لو۔ اور شام کے بزرگوں کو میرے

---

[1] اتوسمکم، وسم سے لیا گیا ہے رسم کے وزن پر اس کے معنی اثر اور نشانی ہیں۔ اس کا مفہوم یہ ہے کہ شروع سے ہی عہد و پیمان توڑنے کے آثار تمہارے اندر دیکھ رہا تھا۔

[2] مغترین، غرور کے اصل سے فریب اور دھوکے کے معنی میں ہے۔

https://downloadshiabooks.com/

پاس بھیج دو، تو (اس خط کی وجہ سے) امیر شام بہت گھبرا گیا اور ایک خط زبیر کے نام لکھا اور اس کو امیر المومنین کہہ کر خطاب کیا اور کہا، شام کے تمام افراد سے تمہارے لیے بیعت لے لی ہے، جلدی کوفہ اور بصرے کی طرف جاؤ۔ اگر ان دو شہروں کو فتح کرو گے تو کوئی مشکل باقی نہیں رہے گی اور تمہارے بعد طلحہ کے لیے بیعت لے لی ہے جاؤ جا کر لوگوں کو خلیفۂ سوّم کے خون کا بدلہ لینے کے بہانے اُکساؤ۔ [۱]

اس کے بعد آپؑ فرماتے ہیں:

"حَتّٰى سَتَرَنِيْ عَنْكُمْ جِلْبَابُ [۲] الدِّيْنِ، وَبَصَّرَنِيْكُمْ صِدْقُ النِّيَّةِ"

"لیکن تمہارا دین کے پردے میں ہونا اور دین کی ظاہر داری کی حفاظت سبب ہوا کہ میں نے تم سے چشم پوشی کی (اور تمہارا راز فاش نہیں کیا) حالانکہ میرے دل کی شفافیت تمہارے اندرونی حالات کی خبر دے رہی تھی۔" (تمہاری سازشوں اور دھوکوں سے خدا کے لطف کی وجہ سے باخبر تھا)

حقیقت میں یہ دو جملے اُن دو سوالوں کے جواب ہیں جو بار بار آپؑ سے پوچھے جاتے تھے:

پہلا سوال یہ تھا کہ اگر امامؑ ان کی عہد شکنی کے منتظر تھے اور اس بات کی نشانیاں نظر آ رہی تھیں تو آپؑ نے اس راز کو فاش کیوں نہیں کیا؟ دوسرا سوال یہ تھا کہ آپؑ کو ان کے باطن سے آگاہی کیسے حاصل ہوئی؟

امامؑ پہلے سوال کے جواب میں فرماتے ہیں:

دین کے پردے میں مخفی ہونا باعث ہو گیا کہ یہ راز چھپا رہے۔

اور دوسرے سوال کے جواب میں آپؑ فرماتے ہیں:

میرے دل کی شفافیت نے مجھے ان کے اندرونی حالات سے آگاہ کیا۔

نہج البلاغہ کے بعض شارحین نے جملہ اوّل کی تفسیر میں دوسرا احتمال دیا ہے، وہ یہ کہ امامؑ کا مقصد یہ ہے، تم لوگوں کی مجھے درست نہ پہچاننے کی وجہ تمہارے دلوں پر خیالات کا پردہ اور دین کی درست شناخت کا نہ ہونا ہے یا مقصد یہ ہے کہ (میری دیانت اور ایمانداری مجھے نہ پہچاننے کی وجہ بن گئی) لیکن تفسیر میں تاویل کی زحمتوں کو دیکھتے ہوئے اس سے پہلے جملوں کے ساتھ تناسب نہیں ہے، لہٰذا پہلی تفسیر زیادہ صحیح لگتی ہے۔

آخر میں آپؑ فرماتے ہیں:

---

[۱] ابن ابی الحدید جلد ۱ صفحہ ۲۳۰، ۲۳۱

[۲] جلباب پردہ، قمیص، اسکارف و چادر کے معنوں میں آیا ہے۔

https://downloadshiabooks.com/

"اَقَمْتُ لَكُمْ عَلٰى سُنَنِ الْحَقِّ فِي جَوَادِّ[۱] الْمَضَلَّةِ[۲] حَيْثُ تَلْتَقُوْنَ وَ لَا دَلِيْلَ وَ تَحْتَفِرُوْنَ وَ لَا تُمِيْهُوْنَ[۳]"

''میں گمراہ کرنے والے راستے پر کھڑا ہوں، تاکہ تمہیں حق کے راستے کی طرف رہنمائی کروں، جب تم لوگ آپس میں جمع ہو گئے تھے مگر تمہارے درمیان رہبر نہیں تھا اور اس آبِ حیات (رہبر) کو تم تلاش کر رہے تھے اور کہیں سے حاصل نہیں کر پا رہے تھے۔''

حقیقت میں امامؑ نے ان لوگوں کو خلافتِ خلیفۂ سوّم کے دور میں خصوصاً ان کے آخری دنوں میں ایسے مسافروں سے تشبیہ دی ہے جو گمراہ ہو کر پیاسے چل رہے ہوں اور پانی کی تلاش میں زمین جگہ جگہ کھود رہے ہوں اور پانی میسر نہ ہو۔ ایسی صورتِ حال میں حضرت امامؑ ان کی مدد کو آتے ہیں اور ان کی صراطِ مستقیم کی طرف راہنمائی فرماتے ہیں اور ان کو ہدایت کے سرچشمے سے سیراب کرتے ہیں۔ ان کی توجہ دلاتے ہیں کہ اُس تاریک اور طوفانی دور میں اگر میں نہ ہوتا تو تم لوگ دینی اور دنیوی اعتبار سے کیسی کیسی عظیم مشکلات سے دوچار ہو جاتے۔

نکات

۱۔ باطنی بصیرت

امامؑ نے یہاں پر ایک اہم نکتے کی طرف اشارہ فرمایا ہے، وہ یہ ہے کہ دل کی شفافیت اور سچی نیت، بصیرت اور روشن بینی صاف نظر آنے کے اسباب میں سے ہیں۔ پاک دل مومنین کچھ معاملات کو درک کر لیتے ہیں جو دوسروں سے چھپے ہوئے ہوتے ہیں یہ ایک حقیقت ہے، جس کی طرف قرآن مجید نے اشارہ کیا ہے، نیز احادیث میں بھی اس مطلب کو بیان کیا گیا ہے۔ قرآن کہتا ہے:

"اِنْ تَتَّقُوا اللّٰهَ يَجْعَلْ لَكُمْ فُرْقَانًا"

---

[۱] جوادّ، اجاردہ کی جمع ہے، اس کے معنی ہیں بڑا اور وسیع راستہ۔

[۲] مضلتہ، ضلال کے اصل سے ایسی جگہ جو انسان کو گمراہی کی طرف لے جاتی ہے لہٰذا، جوادّ المضلتہ، کے معنی ہوں گے نامعلوم اور گمراہ کرنے والے راستے۔

[۳] تمیھون، مَوْہ کے اصل سے (نوع کے وزن پر) پانی دینا اور کسی چیز کا پانی والا ہونے کے معنی ہیں، ماء کا لفظ اسی ''موْہ'' سے لیا گیا ہے اور اماہ، کے معنی پانی تک پہنچنے کے ہیں، لہٰذا لا تمیھون کا مطلب ہے تم لوگ پانی تک نہیں پہنچتے ہو۔ (خواہ جتنی بھی کوشش کرو کنواں کھودنے کی)

https://downloadshiabooks.com/

''اگر تقویٰ اختیار کرو گے تو خدا تمہیں حق اور باطل کی پہچان کا وسیلہ عطا کرے گا۔''[۱]

یعنی انسان تقویٰ کے باطنی نور کے ذریعے حق اور باطل کو انتہائی مخفی چہروں سے بھی پہچان سکتا ہے۔

مشہور حدیث میں پیغمبر اکرمؐ سے نقل ہوا ہے:

"اِتَّقُوْا فِرَاسَةَ الْمُؤْمِنِ فَاِنَّهٗ يَنْظُرُ بِنُوْرِ اللهِ"

''مومن کی ہوشیاری اور ہوشمندی سے ڈرو، کیونکہ وہ خدا کے نور کی مدد سے دیکھتا ہے۔''[۲]

دوسری حدیث میں جو کہ امام علی بن موسیٰ الرضا علیہما السلام سے نقل ہے، اُس میں ہم پڑھتے ہیں:

"مَا مِنْ مُؤْمِنٍ اِلَّا وَلَهٗ فِرَاسَةٌ يَنْظُرُ بِنُوْرِ اللهِ عَلٰى قَدْرِ اِيْمَانِهٖ وَمَبْلَغِ اِسْتِبْصَارِهٖ وَعِلْمِهٖ وَقَدْ جَمَعَ اللهُ لِلْاَئِمَّةِ مِنَّا مَا فَرَّقَهٗ فِيْ جَمِيْعِ الْمُؤْمِنِيْنَ وَ قَالَ عَزَّوَجَلَّ فِيْ كِتَابِهٖ: اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيَاتٍ لِلْمُتَوَسِّمِيْنَ"

''کوئی بھی مومن نہیں مگر یہ کہ اس میں خاص قسم کی ذہانت و ہوشیاری ہوتی ہے، خدا کے نور سے اپنی بصیرت اور ایمان وعلم کی مقدار کے مطابق دیکھتا ہے اور خداوند عالم نے وہ تمام ہوشیاری اور فراست جو مومنین کو عطا کی ہے، تمام ائمہ اہل بیت علیہم السلام کو بدرجۂ کمال عطا کی ہے، اسی مطلب کے بارے میں خدا اپنی کتاب میں فرماتا ہے،''ان میں نشانیاں ہیں ہوشیار وزیرک لوگوں کے لیے۔''

اس کے بعد آپؑ نے اضافہ کیا، متوسّمین میں سب سے پہلے رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہیں ان کے بعد امیر المومنینؑ، ان کے بعد امام حسنؑ و امام حسینؑ، ان کے بعد قیامت تک امام حسینؑ کے فرزندوں میں سے ائمہؑ ہیں۔[۳]

قابلِ توجہ بات یہ ہے کہ امام رضاؑ نے یہ تمام مطالب اس سوال کے جواب میں فرمائے جب کسی نے آپؑ سے پوچھا تھا کہ کس طرح آپ لوگوں کے دلوں سے باخبر ہوتے ہیں اور خبر دیتے ہیں؟ حقیقت میں دنیا کے حقائق کے اوپر پردہ نہیں ہے۔ یہ ہم ہیں جو اپنی ہوا و ہوس اور شیطانی وسوسوں کی وجہ سے اپنے دل کی آنکھوں کے سامنے پردہ حائل کر دیتے ہیں۔ اگر ایمان اور تقویٰ کے نور کے ذریعے ان پردوں کو ہٹا دیں تو سب کچھ واضح ہماری آنکھوں کے سامنے آجائیں۔

جیسا کہ پیغمبر اکرمؐ سے ایک حدیث میں یہ بات آئی ہے:

---

[۱] سورۂ انفال: آیت ۲۹

[۲] اصول کافی جلد ۱۔صفحہ ۲۱۸

[۳] بحار الانوار، جلد ۲۴، ص ۱۲۸، حدیث ۱۳

https://downloadshiabooks.com/

"لَوْلَا اَنَّ الشَّيَاطِيْنَ يَحُوْمُوْنَ اِلٰى قُلُوْبِ بَنِيْ آدَمَ لَنَظَرُوْا اِلَى الْمَلَكُوْتِ" [1]

''اگر شیطان نے آدمؑ کی اولاد کے دلوں پر تسلط حاصل نہ کیا ہو، تو یہ بنی نوع انسان عالم ملکوت (اس کائنات کے باطن) کو دیکھ سکتے۔''

۲۔لوگوں کے عیبوں پر پردہ ڈالنا

زیادہ تر لوگ چھپے ہوئے عیبوں کے حامل ہوتے ہیں، کبھی انسان ان عیوب سے عام طریقے سے یا اپنی ذہانت اور ایمانی بصیرت کی وجہ سے باخبر ہوتا ہے، (اس وقت) ہر شخص خصوصاً معاشرے کے رہبروں کی ذمے داری یہ ہے کہ کوشش کرنی چاہیے کہ جب تک کسی فرد کے ان پوشیدہ عیوب کی وجہ سے معاشرے کا وجود خطرے میں نہیں پڑتا۔ اس کے عیوب کی پردہ پوشی کی جائے، کیوں کہ عیبوں سے پردہ اٹھانے پر ایک طرف تو لوگوں میں ایسے افراد کا احترام ختم ہوجاتا ہے تو دوسری طرف افراد کو اس پردہ دری کی وجہ سے گناہ کرنے میں زیادہ جسارت پیدا ہوتی ہے، کیونکہ جب تک بُرائیوں پر پردہ پڑا ہوا ہو لوگ ان کے انجام دینے میں احتیاط سے کام لیتے ہیں۔ اگر کسی شخص کی رُسوائی ہوجائے تو وہ بے پروا ہوکر بُرائی انجام دیتا ہے، ان تمام مطالب سے بڑھ کر اصلاً عیوب سے پردہ اُٹھانا معاشرے میں بُرائیاں عام ہونے کا سبب ہوتا ہے۔ اس کے نتیجے میں دوسرے افراد بھی گناہوں میں ملوث ہوتے ہیں، اسی وجہ سے بہت سی احادیث میں اس مطلب کی زیادہ تاکید کی گئی ہے۔

ایک حدیث میں ہم پڑھتے ہیں کہ ایک مومن کے دوسرے مومن پر جو حقوق ہیں، ان میں سے ایک یہ ہے:

وَاَ كْتُمُ سِرَّهُ وَعَيْبَهُ وَاَظْهِرْ مِنْهُ الْحُسْنَ" [2]

''اُس کے رازوں کو اور بُرائیوں کو چھپائے اور اچھائیوں کو عام کرے۔''

دوسری حدیث میں امام صادق علیہ السلام سے منقول ہے:

"مَنْ سَتَرَ عَلٰى مُؤْمِنٍ عَوْرَةً يَخَافُهَا سَتَرَ اللهُ عَلَيْهِ سَبْعِيْنَ عَوْرَةً مِنْ عَوْرَاتِ الدُّنْيَا وَ الْآخِرَةِ"

''جو بھی کسی مومن کے ایسے عیب کو چھپائے، جس کے ظاہر ہونے سے وہ ڈرتا ہو، خدا اس کے ستر (۷۰) عیب

---

[1] بحار الانوار جلد ۶۷، ص ۵۹ (باب القلب وصلاحہ)

[2] اصول کافی: جلد ۲، صفحہ ۲۴۹، حدیث ۳

https://downloadshiabooks.com/

(بُرائیاں) دنیا اور آخرت میں چھپائے گا۔"[1]

حضرت امام علی علیہ السلام نے اپنی گفتگو میں اس اسلامی دستور کی طرف ایک لطیف اشارہ فرمایا ہے اور اس حکم کی نسبت اپنی پابندی کو واضح کیا ہے، البتہ جیسا کہ ہم نے کہا ہے کہ عیبوں پر پردہ ڈالنا اس وقت تک ہے، جب تک پردہ پوشی معاشرے کے لیے مشکلات کا باعث نہ ہو۔ اگر ایسا ہو تو اس وقت ہماری ذمے داری عیوب کو ظاہر کرنا ہے، لیکن اس استثنائی حکم کا سہارا لیتے ہوئے لوگوں کے راز اور عیوب کو فاش نہیں کرنا چاہیے، جب تک اس استثنیٰ کی جگہ مکمل واضح وروشن نہ ہو جائے۔

تیسرا حصّہ

"اَلْيَوْمَ أُنْطِقُ لَكُمُ الْعَجْمَاءَ ذَاتَ الْبَيَانِ عَزَبَ رَأْيُ امْرِءٍ تَخَلَّفَ عَنِّي مَا شَكَكْتُ فِي الْحَقِّ مُذْ أُرِيتُهُ لَمْ يُوجِسْ مُوسٰى علیہ السلام[2] خِيفَةً عَلَى نَفْسِهِ بَلْ أَشْفَقَ مِنْ غَلَبَةِ الْجُهَّالِ وَ دُوَلِ الضَّلَالِ الْيَوْمَ تَوَاقَفْنَا عَلَى سَبِيلِ الْحَقِّ وَ الْبَاطِلِ مَنْ وَثِقَ بِمَاءٍ لَمْ يَظْمَأْ۔"

"آج میں تمہارے لیے اپنی اس زبان خاموش کو گویا بنارہا ہوں جس میں بڑی قوت بیان ہے۔ یاد رکھو کہ اس شخص کی رائے گم ہوگئی ہے جس نے مجھ سے روگردانی کی ہے۔ میں نے روزِ اوّل سے آج تک حق کے بارے میں کبھی شک نہیں کیا۔ میرا سکوت حضرت موسیٰ علیہ السلام کے سکوت کی طرح ہے، حضرت موسیٰؑ کو اپنے نفس کے بارے میں خوف نہیں تھا، بلکہ انہیں دربار فرعون میں صرف یہ خوف تھا کہ کہیں جاہل جادوگر اور گمراہ حکام، عوام کی عقلوں پر غالب نہ آجائیں۔ آج ہم حق و باطل کے راستے پر آمنے سامنے ہیں اور یاد رکھو! جسے پانی پر اعتماد ہوتا ہے وہ پیاسا نہیں رہتا ہے۔"

شرح وتفسیر

آج میں حقائق کو آشکار کرتا ہوں

اس کلام میں آئے ہوئے بہت سے جملوں میں سے ہر ایک، اہم نکتے کی طرف اشارہ ہے۔ ایسا لگتا ہے ان جملوں

---

[1] اصول کافی، جلد ۲، ص ۲۰۰ حدیث ۵۰

[2] اصول کافی، جلد ۲، ص ۲۰۰، حدیث ۵

https://downloadshiabooks.com/

کے ذیل میں اور بھی جملے تھے کہ سیّد رضیؒ مرحوم نے کلامِ حضرت علی علیہ السلام کی تلخیص کے دوران ان میں سے کچھ جملوں کو چھوڑ دیا ہے، کیونکہ سیّد رضیؒ کا طریقہ یہ تھا کہ خطبوں سے انتخاب کرتے تھے اور کچھ مقدار چھوڑ دیتے تھے کبھی زیادہ اور کبھی کمتر حصے، بہرصورت پہلا نکتہ جس کی طرف حضرت امامؑ اشارہ فرماتے ہیں:

"اَلْيَوْمَ اُنْطِقُ لَكُمُ الْعَجْمَاءَ ذَاتَ الْبَيَانَ"

"میں آج خاموش حقائق وحوادث جو کہ کئی زبانیں رکھتے ہیں، آپ کے لیے زبان پر لاتا ہوں۔" (تاکہ حقائق ظاہر ہو جائیں)

"عَجْمَاءَ" کے معنی بے زبان حیوان ہے، لیکن کبھی دوسرے حوادث اور مسائل کہ جن سے متعلق گفتگو نہ کی جاتی ہے کے لیے بھی کہا یہ اطلاق ہوتا ہے، لہٰذا نہج البلاغہ کے بہت سے شارحین کا عقیدہ ہے کہ یہاں پر "عَجْمَاءَ" سے مراد، اُن واقعات اور عبرت آمیز حوادث کی طرف اشارہ ہے، جو آپؑ کے دور میں رونما ہوئے یا پچھلی خلافتوں کے دور میں ہوئے، ان میں سے ہر ایک زبان حال رکھتے ہیں اور اپنی بے زبانی کے ذریعے لوگوں کو نصیحت کرتے ہیں۔ حضرت امامؑ ان حادثوں کے پیغام کو بالکل سادہ و سلیس زبان میں یہاں پر اور دوسرے مواقع پر بیان فرماتے ہیں اور ان حوادث کے عبرت آموز نکتوں کی تشریح فرماتے ہیں۔

یہ احتمال بھی دیا جاتا ہے کہ اس سے مراد خود آپؑ کی صفات یا خدا کے احکام ہیں۔ یہ بھی ایک طرح سے خاموش ہیں اور امامؑ ان کی تشریح فرماتے ہیں۔

دوسرے جملے میں امام علیہ السلام قطعی انداز میں فرماتے ہیں:

"عَزَبَ رَأْيُ امْرِئٍ تَخَلَّفَ عَنِّي، مَا شَكَكْتُ فِي الْحَقِّ مُذْ أُرِيتُهُ"

"جو بھی میرے احکام کی خلاف ورزی کرتا ہے وہ حق سے دور ہو گیا ہے، کیونکہ جس دن سے مجھے حق کی نشاندہی کی گئی ہے ہرگز اس میں شک و تردّد کا شکار نہیں ہوا۔" (لہٰذا جو بھی میں کہتا ہوں وہ حق ہے اور جو بھی اس کی خلاف ورزی کرے وہ حق سے دور ہو گیا ہے)

حقیقت میں اس کلام کا شروع اور آخر ایک دوسرے کی علت و معلول یا دلیل اور دعوے کی حیثیت رکھتا ہے۔ اس بات کی طرف توجہ رکھتے ہوئے کہ حضرت امامِؑ حق کی گود میں پروان چڑھے ہیں اور پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی آغوش میں پرورش پائی ہے، ہمیشہ وحی کے کاتب اور پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے معجزات کے عینی شاہد تھے، ان سب سے بڑھ کر بابِ مدینۃ العلم تھے اور تمام علوم ظاہری اور باطنی سے آگاہ تھے۔ اسی وجہ سے آپؑ کا کلام حقیقت پر مبنی ہے اور (معاذ اللہ) ہرگز فضول دعویٰ نہیں ہے۔

https://downloadshiabooks.com/

نہج البلاغہ کے بعض دوسرے شارحین نے جملہ "عَزَبَ رَأْيُ امْرِئٍ..." کے بارے میں ایک اور احتمال دیا ہے، وہ یہ ہے کہ اس جملے سے بددعا کرنا مقصد ہے، یعنی (حق سے دور ہو جائے اس شخص کی رائے جو میرے دستور کی خلاف ورزی کرتا ہے) لیکن پہلی تفسیر زیادہ مناسب لگتی ہے۔

تیسرے جملے میں آپؑ نے ایک سوال کا جواب دیا ہے، وہ سوال یہ تھا کہ حضرت امام علیؑ جنگ جمل کے حادثے کے بعد کیوں پریشان تھے؟ اس سلسلے میں آپؑ فرماتے ہیں کہ میری پریشانی ہرگز اپنے لیے نہیں تھی بلکہ اس وجہ سے تھی کہ پیغمبرؐ کی زوجہ کے میدان میں اُترنے، خلیفۂ سوم کے قصاص کے دعوے اور دشمن کے لشکر میں کچھ اصحاب پیغمبرؐ کی موجودگی سے (جنہوں نے آپؑ سے پیمان شکنی کی تھی) عوام کا ایک گروہ گمراہ نہ ہو جائے۔

"لَمْ يُوجِسْ مُوسَىٰ عليه السلام خِيفَةً عَلَىٰ نَفْسِهِ، بَلْ أَشْفَقَ مِنْ غَلَبَةِ الْجُهَّالِ وَ دُوَلِ الضَّلَالِ"

بالکل اسی طرح جس طرح حضرت موسیٰ علیہ السلام جب جادوگروں کے روبرو ہوئے ہرگز اپنی جان کے لیے خوف نہیں کھا رہے تھے بلکہ اس وجہ سے پریشان تھے کہ گمراہ حکومتوں کا غلبہ نہ ہو جائے جن کی وجہ سے عوام گمراہی کا شکار ہو جائیں۔

یہ جملہ سورۂ طٰہ کی کئی آیتوں کی طرف اشارہ ہے، جہاں خدا فرماتا ہے:

"قَالُوا يَا مُوسَىٰ إِمَّا أَنْ تُلْقِيَ وَ إِمَّا أَنْ نَكُونَ أَوَّلَ مَنْ أَلْقَىٰ، قَالَ بَلْ أَلْقُوا، فَإِذَا حِبَالُهُمْ وَ عِصِيُّهُمْ يُخَيَّلُ إِلَيْهِ مِنْ سِحْرِهِمْ أَنَّهَا تَسْعَىٰ فَأَوْجَسَ فِي نَفْسِهِ خِيفَةً مُوسَىٰ"[1]

''جادوگروں نے کہا، اے موسیٰؑ کیا تم پہلے اپنی لاٹھی مارو گے؟ یا ہم؟ موسیٰ علیہ السلام نے کہا تم پہلے پھینکو۔ اس وقت ان کی لاٹھیاں اور رسیاں ان کی جادو کی وجہ سے ایسا لگتا تھا کہ چل رہی ہوں۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اپنے دل میں ہلکے سے خوف کا احساس کیا (کہیں ایسا نہ ہو کہ جادوگروں کے جادو کی وجہ سے لوگ گمراہ ہو جائیں)۔''

چوتھے جملے میں آپؑ جنگ جمل سے زندہ بچنے والوں کو تنبیہ کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

"اَلْيَوْمَ[2] تَوَاقَفْنَا عَلَىٰ سَبِيلِ الْحَقِّ وَ الْبَاطِلِ"

''آج میں اور تم حق اور باطل کے راستے پر کھڑے ہیں، یا دوسری عبارت میں ہم حق اور باطل کے دوراہے پر موجود ہیں، ہم ایک طرف بجانب حق جا رہے ہیں اور تم دوسری طرف بجانب باطل جا رہے ہو۔ ہم حق پر قائم ہیں اور افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے تم لوگ باطل کی ہلاکت گاہ کی جگہ کھڑے ہو۔''

---

[1] سورۂ طٰہ: آیات ۶۵ تا ۶۷

[2] یہ بات یاد رکھیے کہ ''تواقفنا'' وقوف کے لفظ سے ہے اس کے معنی کھڑے ہونا ہے۔ (اور یہاں پر بولنے میں قاف، فاء سے پہلے ہے)

https://downloadshiabooks.com/

اپنی آنکھیں صحیح طریقے سے کھولو اور دیکھو کہ تم لوگوں نے اپنے زمانے کے خلیفہ کے خلاف بغاوت کی ہے اور اپنی بیعت کے احترام کا لحاظ نہیں رکھا اور خدا کے ساتھ عہد شکنی کی ہے! اور مسلمانوں کی صفوں میں شگاف پیدا کر دیے ہیں! اور کچھ لوگوں کے خون بہائے ہیں۔ اسی وجہ سے قیامت کے دن خدا کے سامنے اپنے لیے سخت مسئولیت اور گناہ کے مرتکب ہوئے ہو۔ اپنے نظریات پر نظر ثانی کرو اور بہتر ہے کہ سوچو۔

بالآخر حضرت امامؑ اپنے اس آخری جملے میں فرماتے ہیں:

"مَنْ وَثِقَ بِمَاءٍ لَمْ يَظْمَأْ"

''جو بھی پانی ملنے کی امید رکھتا ہو وہ پیاسا نہیں ہوتا ہے۔ عام طور پر جھوٹی پیاس انسان پر اُس وقت غالب آتی ہے جب پانی ملنے سے ناامید ہو جائے اور پانی نہ ملنے کا خوف اور ڈر ہو۔''

یہ کلام اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ جو بھی قابلِ اعتماد و مطمئن رہبر اور رہنما رکھتا ہو، شک اور تردّد اور شیطانی وسوسوں کا شکار نہیں ہوتا ہے اور اضطراب و پریشانی سے دوچار نہیں ہوتا، کیونکہ اسے معرفت کے صاف و شفاف چشمے کے پاس ہونے کا احساس ہوتا ہے، مشکلوں میں اُس کی پناہ لیتا ہے اور اُسی سے حکم اور دستور العمل لیتا ہے۔ تم لوگ بھی اپنے رہبر کو پہچان لو اور اس پر اعتماد کرو اور اطمینان کے ساتھ حق کے راستے پر قدم رکھو اور شک اور شیطان اور نفسِ امارہ کے وسوسوں سے نجات پاؤ۔

نکتہ

حق اور باطل کی جنگ

مندرجہ بالا کلام میں حق اور باطل کو دو راستوں سے تشبیہ دی گئی ہے۔ ایک گروہ باطل کے راستے پر چلتا ہے اور ایک گروہ حق کے راستے پر چلتا ہے۔ اگر ہم ان دو الفاظ حق و باطل کی تفسیر واضح اور مختصر عبارت میں کرنا چاہیں تو اس طرح بتا سکتے ہیں کہ حق وہی اصل حقائق ہیں (جو واقعاً موجود ہیں) اور باطل بے بنیاد خیالات اور سراب کی طرح ہے، جسے دیکھنے والا پانی تصور کرتا ہے، اسی بنا پر ذاتِ پاک خداوند ہر حقیقت سے واضح تر و ظاہر تر ہے۔ خدا سب سے پہلی حقیقت ہے، جسے حق کہنا مناسب ہے اور خدا کی ذات کے علاوہ باقی چیزیں جتنی بھی ہیں اُسی ذات سے نسبت رکھتی ہیں، اسی حساب سے حق کہنے کے لائق ہیں اور جو چیز اُس ذات سے دور ہوگی اور اجنبی ہوگی وہ باطل ہے۔ (ممکن الوجود) عالمِ امکان خدا کی نسبت حق ہے

https://downloadshiabooks.com/

اور اس ذات کی نسبت عدم عالم امکان باطل ہے۔ ہر وہ راستہ جو انسان کو خدا کی طرف لے جاتا ہے اور اُس کے وجود کو تکامل و ترقی دیتا ہے اور ہمیشہ رہنے والی زندگی کے نئے مرحلے اس کو دیتا ہے، وہ حق ہے اور ہر وہ چیز جو انسانوں کو خدا سے دور کرتی ہے اور بے بنیاد خیالات اور بے اساس توہمات کی پابند بناتی ہے وہ باطل ہے۔

یہ کائنات میدان جنگ ہے، جہاں حق و باطل کا معرکہ ہمیشہ ہوتا رہتا ہے۔ قرآن کریم نے اس مقابلے کی خصوصیات واضح کرنے کے لیے نیز اس مقابلے کے آخری نتیجے کے بیان کے لیے سورۂ رعد میں خوبصورت اور پُرمعنی مثال بیان فرمائی ہے۔ حق کو ایسے پانی سے تشبیہ دی ہے جو آسمان سے نازل ہوتا ہے اور سیلاب کی شکل میں پہاڑوں کے دامن سے نیچے آتا ہے اور باطل کو اس جھاگ سے تشبیہ دی جو پانی کے اوپر اس کے آلودہ ہونے کی وجہ سے ظاہر ہوتا ہے لیکن کچھ دیر میں پانی میدان میں پہنچ جاتا ہے، آلودگی نیچے بیٹھ جاتی ہے اور جھاگ ختم ہوجاتا ہے اور جو مایۂ حیات اور مایۂ آبادی ہے یعنی پانی، باقی رہتا ہے۔[1]

[1] سورۂ رعد، آیت ۱۷، ان مثالوں کی دقیق تشریح کے لیے تفسیر نمونہ، جلد ۱۰، اسی آیت کے ذیل میں مطالعہ کریں۔

https://downloadshiabooks.com/

پانچواں خطبہ

وَمِنْ کَلَامٍ لَهُ عَلَيْهِ السَّلَامُ

"لَمَّا قُبِضَ رَسُوْلُ اللهِ وَ خَاطَبَهُ الْعَبَّاسُ وَ اَبُوْ سُفْيَانَ بْنُ حَرْبٍ فِيْ اَنْ يُّبَايِعَا لَهُ بِالْخِلَافَةِ وَ ذَالِكَ بَعْدَ اَنْ تَمَّتِ الْبَيْعَةُ لِاَبِيْ بَكْرٍ فِي السَّقِيْفَةِ وَفِيْهَا يَنْهٰى عَنِ الْفِتْنَةِ وَيُبَيِّنُ عَنْ خُلُقِهِ وَعِلْمِهِ [1]

جو آپؑ نے وفاتِ پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے موقع پر ارشاد فرمایا کہ جب عباسؓ اور ابوسفیان نے آپ سے بیعت لینے کا مطالبہ کیا تھا۔(یہ زمانہ وہ تھا، جب سقیفہ بنی ساعدہ میں حضرت ابوبکر کی بیعت ہو چکی تھی مولائے کائناتؑ نے اس بیعت کو قبول نہیں کیا۔اس پر آپؑ نے یہ خطبہ ارشاد فرمایا اور فتنہ وفساد سے منع فرمایا اور اپنے خدشات سے آگاہ کیا)

خطبہ، ایک نگاہ میں

یہ خطبہ ان محدود خطبوں میں شمار ہوتا ہے، جو مولا علی علیہ السلام نے اپنی ظاہری خلافت کے زمانے سے پہلے ارشاد فرمایا ہے۔اس پورے خطبے نیز سیّد رضیؒ کے بیان کردہ مقدمے سے یہ بات واضح ہوئی ہے کہ پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی رحلت کے بعد عباسؓ اور ابوسفیان آپؑ کی خدمت میں آئے شاید عباسؓ ابوسفیان کے ورغلانے سے آئے تھے انہوں نے آپؑ کو قیام کی پیشکش کردی اور چاہا کہ آپؑ کے ہاتھوں پر خلیفہ ہونے کے عنوان سے بیعت کریں، لیکن امام علی علیہ السلام نے زمانے کے حالات سے مکمل طور پر باخبر ہونے اور اسلام کی بقا اور منافقوں کی سازشوں کی ناکامی کی خواہش کے ساتھ نہ صرف اس بیعت کو ٹھکرا دیا، بلکہ آپؑ نے ان کو خبردار بھی کیا کہ اس قسم کے کاموں (فتنوں) سے گریز کریں۔اس بنا پر بے خبر و جاہل لوگ یا سازشی لوگ آپؑ کی خاموشی پر انگلی اُٹھاتے تھے، ان کو جواب دیا، خطبے کے آخر میں شہادت کے ساتھ آپ کا عشق اور خدا سے

---

[1] یہ خطبہ نہج البلاغہ کے علاوہ دوسرے حوالوں سے بھی نقل ہوا ہے۔ان میں نہج البلاغہ کے منابع میں سے (کتاب المحاسن والمساوی)(بیہقی) جلد ۲ صفحہ ۱۳۹ میں نقل ہوا ہے۔(تذکرہ الخواص، وسبط بن الجوزی) اور احتجاج طبرسی جلد ا صفحہ ۱۲۷ پر بھی نقل ہوا ہے۔ابن ابی الحدید کے قول سے بھی واضح ہوتا ہے کہ یہ خطبہ اور دوسرے حوالوں سے ان تک پہنچا ہے)

https://downloadshiabooks.com/

ملاقات سے اپنا لگاؤ بیان فرماتے ہیں اور بہت سے علوم اور رازوں کی طرف اشارہ فرماتے ہیں جو کہ اسرار میں محسوب ہوتے ہیں اور ان سے پردہ اٹھانے کی اجازت نہیں ہے۔

پہلا حصّہ

اَیُّهَا النَّاسُ شُقُّوا اَمْوَاجَ الْفِتَنِ بِسُفُنِ النَّجَاةِ وَعَرِّجُوا عَنْ طَرِیْقِ الْمُنَافَرَةِ وَضَعُوْا تِیْجَانَ الْمُفَاخَرَةِ اَفْلَحَ مَنْ نَهَضَ بِجَنَاحٍ اَوِ اسْتَسْلَمَ فَاَرَاحَ هٰذَا مَاءٌ آجِنٌ وَلُقْمَةٌ یَغَصُّ بِهَا آكِلُهَا وَ مُجْتَنِی الثَّمَرَةِ لِغَیْرِ وَقْتِ اِیْنَاعِهَا كَالزَّارِعِ بِغَیْرِ اَرْضِهٖ۔

’’اے لوگو! فتنوں کی موجوں کو نجات کی کشتیوں سے چیر کر نکل جاؤ اور منافرت کے راستوں سے الگ رہو۔ باہمی فخر و مباہات کے تاج اتار دو کہ کامیابی اسی کا حصہ ہے جو اٹھے تو بال و پر کے ساتھ اٹھے ورنہ کرسی کو دوسروں کے حوالے کر کے اپنے کو آزاد کر لے۔ یہ پانی بڑا گندہ ہے۔ اور اس لقمے میں اچھو لگ جانے کا خطرہ ہے اور یاد رکھو کہ بے وقت پھل چننے والا ایسا ہی ہے جیسے نامناسب زمین میں زراعت کرنے والا۔‘‘

شرح وتفسیر

فتنہ برپا کرنے والوں سے ہوشیار رہو

نہج البلاغہ کے مشہور شارح ’’ابنِ میثم‘‘ اس خطبے کے شروع میں فرماتے ہیں:

’’امیر المومنینؑ کے اس کلام کے ارشاد فرمانے کی وجہ یہ ہے کہ سقیفہ بنی ساعدہ میں خلیفہ اوّل کے لیے بیعت لی گئی۔ اس وقت ابوسفیان فساد وفتنہ برپا کرنے کی غرض سے اور مسلمانوں کے درمیان خانہ جنگی شروع کرانے کے لیے پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے چچا حضرت عباسؓ کے پاس گیا اور اُن سے کہا، ایک گروہ نے خلافت کو بنی ہاشم سے نکال کر بنی تمیم میں قرار دیا ہے (خلیفہ اوّل بنی تمیم سے تھے) یہ بالکل واضح ہے کہ کل یہ غصیلا شخص جو کہ (بنی عدی) سے ہے ہمارے اوپر حکومت کرے گا (خلیفہء دوّم کی طرف اشارہ ہے) کھڑے ہو جائیں اور چل کر حضرت علیؑ کے ہاتھوں خلافت کے عنوان سے بیعت کر لیتے ہیں۔

آپ پیغمبرؐ کے چچا ہیں اور میری بات بھی قریش کے پاس مقبول ہے۔ اگر وہ لوگ ہمارے مقابلے کے لیے آئے تو

https://downloadshiabooks.com/

ہم ان سے جنگ کریں گے اور ان کو شکست دیں گے۔ اس گفتگو کے بعد دونوں امیر المومنینؑ کے پاس آئے۔ ابوسفیان نے عرض کیا، اے ابوالحسنؑ، خلافت کے مسئلے سے غافل نہ رہو۔ کب تک ہم بے نام ونشان قبیلہ تمیم کے تابع رہیں گے (وہ ان باتوں کے ذریعے چاہتا تھا کہ امام علیؑ خلافت حاصل کرنے کے لیے اٹھ کھڑے ہوں) امام علی علیہ السلام جانتے تھے کہ وہ دین کی خاطر یہ باتیں نہیں کر رہا تھا، بلکہ فساد وفتنہ برپا کرنا چاہتا ہے۔ [۱] اس لیے آپؑ نے یہ خطبہ ارشاد فرمایا۔''

مشہور مؤرخ ابنِ اثیر اپنی کتاب ''کامل'' میں لکھتا ہے کہ امام علیؑ نے اسی مقام پر ابوسفیان سے فرمایا:

''خدا کی قسم! تمہارا مقصد فتنہ برپا کرنے کے علاوہ کچھ نہیں ہے۔ تم ہمیشہ سے اس سوچ میں تھے کہ اسلام اور مسلمانوں کے لیے شر برپا کروں، ہم تمہاری نصیحتوں کے محتاج نہیں ہیں۔'' [۲]

یہاں سے حالات وواقعات اچھی طرح سے روشن ہوتے ہیں کہ کن حالات میں آپؑ نے یہ خطبہ ارشاد فرمایا تھا، اس وضاحت سے خطبے کے تمام جملے روشن وواضح ہوجاتے ہیں۔

چار اہم نکات

خطبے کے پہلے حصے میں امامؑ نے چار اہم نکات کی طرف اشارہ فرمایا ہے:

پہلا نکتہ

"اَیُّهَا النَّاسُ شُقُّوْا اَمْوَاجَ الْفِتَنِ بِسُفُنِ النَّجَاةِ، وَعَرِّجُوْا [۳] عَنْ طَرِیْقِ الْمُنَافَرَةِ [۴] وَضَعُوْا تِیْجَانَ الْمُفَاخَرَةِ"

''اے لوگو! فتنوں کی بھاری موجوں کو نجات کی کشتیوں کے ذریعے شگافتہ کرو، اور اختلافات وتفرقہ بازی اور دشمنی کے راستے سے باز رہو اور اپنے سروں پر تکبّر وفخر اور بڑائی کے تاج اتار ڈالو۔''

''اے لوگو'' کا خطاب واضح کرتا ہے کہ آپؑ کی خدمت میں صرف یہی دو افراد نہیں تھے، بلکہ دوسرے افراد بھی موجود تھے۔ کچھ احادیث اس بات کی تائید کرتی ہیں۔

---

[۱] شرح ابن میثم: جلد ۱، صفحہ ۲۷۶

[۲] کامل ابن اثیر: جلد ۲، صفحہ ۳۲۶

[۳] عرجوا، کا مادّہ تعریج ہے اس کے معنی کسی چیز کی طرف مائل ہونا ہیں۔ یہاں پر کنارے ہونے کے معنیٰ ہیں۔

[۴] منافرۃ، کے معنی جج کے پاس جھگڑا فساد کا مقدمہ کرنا ہے۔

https://downloadshiabooks.com/

یہ نکتہ قابل توجہ ہے کہ حضرت امام علیؑ فتنوں کو موجوں سے تشبیہ دیتے ہیں اور اُن سے مقابلہ کرنے کے لیے نجات کی کشتیوں سے کام لینے کی سفارش کرتے ہیں۔ نجات کی کشتی سے مراد وہ بڑی مضبوط کشتیاں ہیں، جو موجوں کو پھاڑنے اور مسافروں کو نجات کے ساحل تک پہنچانے کی صلاحیت رکھتی ہیں۔ یہاں کشتیِ نجات سے خدا کے نمائندے خصوصاً پیغمبر اکرمؐ کے اہل بیتؑ مراد ہیں۔ [۱] یعنی ہم جو کہیں گے اس کو غور سے سنو اور اس چیز پر عمل نہ کرو جو خود چاہتے ہو۔ اس مفہوم کی تائید اس بات سے ہوتی ہے کہ بعد والے جملوں میں آپؑ نے اختلافات ایجاد کرنے کو اور فخر و مباہات اور اپنے گروہ یا قبیلے کی بڑائی جتانے کو ایک خطرناک راستے سے تشبیہ دی ہے اور فرماتے ہیں۔ جتنا ہو سکے جلدی اُس سے الگ ہونا چاہیے۔ یہ بات یاد رہے کہ منافرت کے اصل معنی دو افراد کا ایک دوسرے پر فخر کرنا ہے۔ پھر فیصلہ کرنے کے لیے کسی تیسرے شخص کے پاس جانے کے معنی میں استعمال ہوا ہے۔

حقیقت میں امام علیہ السلام نے اس قیمتی کلام میں انسانی معاشرے کی دکھتی رگ پر انگلی رکھ دی ہے، خون آلود جنگیں، آپس کے جھگڑے، کشمکش و قتل و غارت، بدامنی ہمیشہ تفاخر اور ایک دوسرے پر بڑائی جتانے سے پیدا ہوتی ہیں۔ اگر یہ بت توڑ دیے جائیں تو انسانی معاشرے کی بہت سی مشکلات حل ہو جائیں گی۔ دنیا میں امن و امان قائم ہو جائے گا۔

یہ بات صحیح ہے کہ جاہ طلب افراد ہمیشہ معاشرے کے حقوق کے دفاع اور اقدار کی حفاظت کے پردے میں اپنے آپ کو چھپا کے رکھتے ہیں۔ لیکن کون نہیں جانتا ہے کہ یہ سب ان کا اپنے اقتدار اور مقام حاصل کرنے اور دوسروں پر تسلط حاصل کرنے کا وسیلہ و بہانہ ہیں۔

دوسرا نکتہ

دوسرے نکتے میں فرماتے ہیں:

''اَفْلَحَ مَنْ نَهَضَ بِجَنَاحٍ، اَوِ اسْتَسْلَمَ فَاَرَاحَ'' [۲]

''وہ شخص جو پر و بال (یار و مددگار) رکھتے ہوئے قیام کرے، وہ کامیاب ہوا ہے یا مقابلہ کرنے کی طاقت کافی نہ

---

[۱] پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے مشہور حدیث میں آیا ہے ''مَثَلُ اَهْلِ بَيْتِي كَسَفِينَةِ نُوحٍ مَنْ رَكِبَهَا نَجِيَ وَمَنْ تَخَلَّفَ عَنْهَا غَرِقَ'' میرے اہل بیتؑ کی مثال حضرت نوح کی کشتی کی ہے جو بھی اس پر سوار ہوا نجات پا گیا اور جو اس سے پیچھے رہ گیا وہ غرق ہو گیا۔ ابن ابی الحدید کا کہنا کہ یہ حدیث صحیح ہے لیکن حضرت امامؑ کا اشارہ اس حدیث کی طرف نہیں ہے۔ ان کی یہ بات غلط ہے۔ مولاؑ کا مقصد یہ ہے کہ جو میں کہوں اس پر عمل کرو نہ یہ کہ جو تم چاہتے ہو۔

[۲] توجہ رہے کہ ''اراح'' کبھی فعل لازم اور کبھی فعل متعدی کے معنوں میں آیا ہے۔ پہلی صورت میں اس کے معنی اپنے آپ کی راحت ہے، دوسری صورت میں دوسروں کو راحت پہنچانے کے معنیٰ ہیں۔

https://downloadshiabooks.com/

ہونے کی وجہ سے امن پسندی کے راستے پر چلے تو وہ بھی کامیاب ہے(خود بھی آرام وراحت سے ہے اور دوسروں کو بھی آسانیاں فراہم کرتا ہے)''

درحقیقت حضرت امامؑ یہاں پر اس بنیادی نکتے کی طرف اشارہ فرماتے ہیں کہ اپنا حق لینے کی کچھ شرائط ہیں، اگر وہ شرائط اور حالات موجود ہوں تو قیام کرنے سے دریغ نہیں کروں گا، لیکن جب حالات سازگار نہ ہوں تو عقل و منطق اور ہمارا دین کہتا ہے کہ قیام کرنا نہ صرف ترقی کا سبب نہیں ہے بلکہ معاشرے میں شگاف اور اختلافات اور خود کو اذیّت دینا اور دوسروں کو بھی زحمت میں مبتلا کرنے اور طاقت کو بیکار ضائع کرنے کا باعث ہے اور یہ ایک ہمیشہ رہنے والا بنیادی اصول ہے جس پر تمام معاشرتی کاموں میں خصوصاً سیاسی قیام و انقلابوں میں توجہ کرنی چاہیے۔

تیسرا نکتہ

تیسرے نکتے میں فرماتے ہیں

"هٰذَا مَاءٌ آجِنٌ [۱]، وَلُقْمَةٌ يَغَصُّ [۲] بِهَا آكِلُهَا"

''لوگوں پر کی جانے والی حکومت ایک گندا پانی ہے یا گلے میں پھنسی ہوئی ہڈی ہے۔''

جس حکومت کے حصول کے لیے کچھ لوگ اپنا گریبان چاک کرتے ہیں اور ہر ناجائز کام اس مقصد کے حصول کے لیے جائز سمجھتے ہیں، اس چیز سے حضرت امامؑ پردہ اُٹھاتے ہوئے فرماتے ہیں۔

یہ بات درست ہے کہ انسانی زندگی کا دارومدار پانی اور کھانا ہے لیکن کون سی غذا اور کون سا پانی؟ حضرت امام علیہ السلام نے یہاں پر حکومت کی کیفیت کو آلودہ و گندا و بدبودار پانی اور گلے میں پھنسے ہوئے لقمے سے تشبیہ دی ہے اور یقیناً ایسا ہی ہے۔ انسان جتنا بھی حاکموں اور معاشرے کے صاحبِ اختیار لوگوں کی زندگی کا نزدیک سے مطالعہ کرتا ہے تو وہ ان کی زندگی کی مشکلات اور شدید بے چینی اور ان کے بُرے انجام سے زیادہ باخبر ہوتا ہے۔ نہ یہ لوگ سکھ کا سانس لے سکتے ہیں نہ ان کے لیے قابل توجہ اور حقیقی شان وشوکت نظر آتی ہے۔

البتہ رہبرانِ حق ان سب حقیقتوں سے واقف ہوتے ہوئے بھی صرف خوشنودی خدا کے لیے اور دین خدا کی سربلندی کے لیے ان مشکلات اور تکلیفوں کا سامنا کرتے ہیں اور اپنا آرام وآسائش بندگانِ خدا کی خدمت کے لیے ترک کر

[۱] ''آجن'' اَجَن کے اصل سے ضرب کے وزن پر اور اُجون تغیر اور تبدیلی کے معنی ہیں اور بدبودار پانی کو جس کا رنگ اور بو یا مزہ تغیر ہوا ہو، اُسے آجن کہا جاتا ہے۔

[۲] "یغصّ"، غَصص کے اصل سے ہوس کے وزن پر ہے اس کے معنی گلے میں پھنسنا ہے۔

https://downloadshiabooks.com/

دیتے ہیں۔

یہ بھی احتمال دیا جاتا ہے کہ یہاں پر "هٰذا" کا اشارہ اس حکومت کی نوعیت کی طرف اشارہ ہو جس کی پیشکش ابوسفیان کر رہا تھا۔

یہ بات درست ہے کہ حکومت پانی کی طرح اقوام کے لیے مایۂ زندگی ہے اور اس اعتبار سے کہ ہمیشہ انسانی معاشروں میں حکومت واقتدار دنیا پرست لوگوں کا مطمح نظر رہی ہے۔ طبیعی طور پر اسی حکومت کے لیے یہ لوگ نیک افراد کے ساتھ اختلافات وجھگڑے کرتے رہے ہیں۔ اور یہ زندگی دینے والا آبِ حیات ان کے ہاتھوں گندا ہوتا رہا ہے اور یہ حکومت جو غذا کی طرح انسانی معاشرے کے لیے طاقت وقدرت کا سبب ہے، ایک نامطلوب شکل اختیار کر لیتا ہے یہاں تک کہ بہت سے اولیا ومردانِ حق اس سے شکایت کرتے تھے اور اسے ناپسندیدہ جانتے تھے اور واضح طور پر کہتے تھے کہ اگر خدا کا حکم نہ ہوتا اور اس کی رضایت نہ ہوتی تو وہ اس کے لیے تیار نہ ہوتے۔ جیسا کہ خطبۂ شقشقیہ کے ذیل میں جہاں پر امامؑ حکومت اور اقتدار کو ذاتی طور پر ایک بکری کی چھینک سے نکلنے والے پانی کے ذرّات سے بھی کمتر جانتے ہیں۔

چوتھا نکتہ

چوتھے نکتے میں اس مسئلے کی خصوصیات میں سے ایک کو بیان کرنا شروع کیا ہے کہ جو بھی کسی اہم کام کے لیے (مثلاً دینی والٰہی حکومت تشکیل دینا) قیام کرتا ہو تو ضروری ہے کہ مناسب حالات میں اقدام کرے یا خود حالات کو سازگار ومناسب بنا سکتا ہو تو بنائے، ورنہ اندھادھند قیام کرنا، ناکامی اور شکست کے علاوہ کوئی نتیجہ نہیں رکھتا، امامؑ اس سلسلے میں فرماتے ہیں:

"وَمُجْتَنِي الثَّمَرَةِ لِغَيْرِ وَقْتِ إِينَاعِهَا[1] كَالزَّارِعِ بِغَيْرِ أَرْضِهِ"

''جو پھل کو پکنے سے پہلے درخت سے چن لے، یہ شخص اس آدمی کی طرح ہے جو بیج کو نامناسب زمین (مثلاً خشک بیابان یا نمک زار میں) ڈال دے (اُس نے اس کام کی وجہ سے اپنے سرمائے اور طاقت کو ضائع کیا ہے اور اُس کو کوئی فائدہ نہیں پہنچا ہے)''

نہج البلاغہ کے بعض شارحین نے احتمال دیا ہے کہ "بِغَيْرِ أَرْضِهِ" کی ضمیر زراعت کرنے والے کی طرف پلٹتی ہے، اِس وقت اس جملے کا مفہوم یہ ہوگا کہ وہ شخص اس انسان کی طرح ہے جس نے دوسروں کی زمین میں بیج ڈال دیا ہو، اُس کا

[1] ایناع، ینع سے ہے (منع کے وزن پر) اس کے معنی کسی چیز کا اپنی حد تک پہنچنا ہیں۔ یہ لفظ عام طور پر پھل پکنے کے معنی میں استعمال ہوتا ہے جب اس کو بابِ افعال میں لے جاتے ہیں تب بھی وہی معنی ہیں۔

https://downloadshiabooks.com/

فائدہ اُسے نہیں ہوگا، بلکہ دوسروں کو ہوگا، لیکن حضرت امامؑ نے اس مطلب کو کچے پھل چننے کی طرح قرار دیا ہے، اسی سے اس تفسیر کی کمزوری واضح ہوتی ہے۔ یہ کلام حقیقت میں ہمیشہ رہنے والے ان اصولوں میں سے ایک ہے، جن میں حکومت تشکیل دینے کے لیے بنیادی درس ہے، اس کا مطلب یہ ہے کہ حق وعدالت کے متوالے کو ہرگز اپنے وقتی احساسات کا شکار نہیں ہونا چاہیے اور محدود وسائل سے کبھی کسی ایسے کام میں ہاتھ نہ ڈالے، جس کے لیے حالات سازگار نہ ہوں، بلکہ صبر وتحمل کے ساتھ حوصلے سے حالات کی درستی اور ذرائع کی فراہمی اور طاقت وقوت کو اکٹھا کرنے میں لگا رہے۔ یہ کام جتنا بھی وقت مانگے، جیسا کہ باخبر باغبان (مالی) کبھی کچے پھل کی طرف نہیں جاتا ہے، چاہے جتنا بھی اس کو اپنے کھانے کے لیے یا فروخت کرنے کے لیے میووں کی ضرورت ہو۔ نیز باخبر کسان نامناسب زمین میں اپنا بیج نہیں ڈالتا، بلکہ صبر وحوصلے کے ساتھ زمین میں ہل چلا کر نرم کرتا ہے، نمک زار زمین کو زراعت کے لیے تیار کرتا ہے۔ اس کے بعد بیج ڈالنے کے کام میں مشغول ہوتا ہے۔

نکتہ

پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بعد امام علی علیہ السلام نے کیوں قیام نہیں کیا؟

بہت سے افراد سوال کرتے ہیں کہ اس بات کے باوجود کہ امام علی علیہ السلام پیغمبرؐ کی جانشینی کے لیے سب سے لائق ومناسب تر تھے، اس کے علاوہ پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے کئی بار آپؑ کی خلافت کی تاکید فرمائی تھی تو آپؑ اپنے اس مُسلّم حق (جو واقعاً اُمّتِ اسلامی کا حق تھا) کو لینے کے لیے کھڑے کیوں نہ ہوئے اور اپنی طاقت کا مظاہرہ کیوں نہیں کیا، بلکہ آپؑ نے خاموشی اختیار کی، اس طرح میدان دوسروں کے ہاتھ میں آ گیا۔ اس سوال کا جواب واضح طور پر مختصر عبارت میں اسی خطبے میں آیا ہے، حقیقت میں آپؑ نے اپنے قیام نہ کرنے کی کئی وجوہات کو بیان کیا ہے:

پہلی وجہ: وہ لوگ جو آپؑ کو قیام کا مشورہ دے رہے تھے، مثلاً ابوسفیان، یقیناً مخلص نہیں تھے یا عباسؓ جیسے افراد دوسروں کے فریب میں آئے ہوئے تھے، جو اچھی نیت نہیں رکھتے تھے۔ اسی وجہ سے حضرت امامؑ نے اس خطبے میں ان کو فتنہ وفساد برپا کرنے والا اور اپنی بڑائی جتانے والا کہا ہے۔

دوسری وجہ: اس راہ میں امامؑ اپنے آپ کو اکیلا دیکھ رہے تھے، محدود افراد کے علاوہ آپ کا کوئی مددگار نہیں تھا، اسی وجہ سے نہج البلاغہ کے بعض خطبوں میں آپؑ صراحت کے ساتھ فرماتے ہیں:

https://downloadshiabooks.com/

''میری مدد کرنے والے صرف میرے اہل بیتؑ ہیں اور میں نہیں چاہتا ہوں ان کی زندگی خطرے میں ڈالوں'' [۱] ان تمام باتوں سے بڑھ کر لوگوں پر حکمرانی کرنا آپؑ کا منشاو مقصد نہیں تھا، کیونکہ آپؑ اُسے گندا پانی اور گلے میں پھنسنے والا لقمہ سمجھتے تھے، بلکہ حق وعدالت کے نفاذ کے لیے (اور ظالموں کو ظلم سے روکنے کے لیے) اور باطل کو دفع کرنے کے لیے وسیلہ اور ذریعے جانتے تھے۔ [۲] لیکن جب آپؑ کو اندازہ ہوا کہ یہ قیام اس مقصد تک نہیں پہنچاتا ہے، بلکہ مسلمانوں کی صفوں میں اختلافات ایجاد کرنے کا سبب بنتا ہے اور عین ممکن تھا کہ منافقین جو ہمیشہ موقع کی تلاش میں تھے، اٹھ کھڑے ہوتے اور اسلام کی بنیاد کو خطرے میں ڈال دیتے۔ ایسے حالات میں خاموشی کے علاوہ کوئی چارہ نہیں تھا۔

تیسری وجہ: ابن ابی الحدید کہتا ہے کہ روایت میں یہ بات آئی ہے کہ ایک دن حضرت فاطمہ سلام اللہ علیہا نے امامؑ کو قیام کرنے کی رغبت دلائی، اسی وقت مؤذن کی آواز بلند ہوگئی۔

''اَشْهَدُ اَنَّ مُحَمَّدًا رَّسُوْلُ اللهِ''

امام علیہ السلام نے اپنی زوجۂ مکرمہ کی طرف رخ کر کے فرمایا:

''اَيَسُرُّكِ زَوَالُ هٰذَا النِّدَآءِ مِنَ الْاَرْضِ''

''کیا آپ پسند کرتی ہیں یہ آواز زمین سے مٹ جائے؟''

حضرت فاطمہ زہرا سلام اللہ علیہا نے عرض کیا: نہیں، آپؑ نے فرمایا: پس بات وہی ہے جو میں کہتا ہوں (ضروری ہے صبر وتحمل کریں) [۳]

ان تمام مطالب سے ہٹ کر ہر کام کے لیے (خصوصاً معاشرتی اور سیاسی بڑے انقلاب لانے کے لیے) مخصوص حالات کی ضرورت ہوتی ہے۔ اس کام کے مقدمات تیار وفراہم کرنا ضروری ہوتا ہے، اس کے بغیر قیام کی صورت میں ناکامی اور شکست اور اپنی طاقت کے ضائع ہونے کے علاوہ کوئی نتیجہ نہیں ملے گا اس کی مثال ایسے فرد کی طرح ہے جو درخت سے کچے پھل اُتارے یا غیر مناسب زمین میں بیج ڈالے۔

چوتھی وجہ: امامؑ چونکہ ان تمام حقائق سے آگاہ تھے، اسی وجہ سے آپؑ نے اپنی الٰہی ذمے داری اس چیز میں دیکھی کہ سکوت وخاموشی کو قیام پر ترجیح دی جائے۔

---

[۱] خطبہ ۲۶ کا مطالعہ کریں۔

[۲] خطبہ ۳۳ کا مطالعہ کریں۔

[۳] شرح ابن ابی الحدید، جلد ۱۱، ص ۱۱۳

https://downloadshiabooks.com/

دوسرا حصّہ

فَاِنْ اَقُلْ یَقُوْلُوْا حَرَصَ عَلَی الْمُلْکِ وَ اِنْ اَسْکُتْ یَقُوْلُوْا جَزِعَ مِنَ الْمَوْتِ هَیْهَاتَ بَعْدَ اللَّتَیَّا وَ الَّتِی وَ اللّٰهِ لَابْنُ اَبِیْ طَالِبٍ اٰنَسُ بِالْمَوْتِ مِنَ الطِّفْلِ بِثَدْیِ اُمِّهٖ بَلِ انْدَمَجْتُ عَلٰی مَکْنُوْنِ عِلْمٍ لَوْ بُحْتُ بِهٖ لَاضْطَرَبْتُمْ اضْطِرَابَ الْاَرْشِیَةِ فِی الطَّوِیِّ الْبَعِیْدَةِ۔

''میری مشکل یہ ہے کہ میں بولتا ہوں تو کہتے ہیں کہ اقتدار کا لالچ رکھتے ہیں اور خاموش ہو جاتا ہوں تو کہتے ہیں کہ موت سے ڈر گئے ہیں۔ افسوس! میں تمام مراحل دیکھ چکا ہوں، خدا کی قسم! ابوطالب کا فرزند موت سے اس سے زیادہ مانوس ہے جتنا بچہ اپنی ماں کی چھاتی سے مانوس ہوتا ہے، البتہ میرے سینے کی تہوں میں ایک ایسا پوشیدہ علم ہے جو مجھے مجبور کیے ہوئے ہے، ورنہ اسے ظاہر کر دوں تو تم اسی طرح لرزنے لگو گے جس طرح گہرے کنویں میں رسی تھرتھراتی اور لرزتی ہے۔''

شرح و تفسیر

اِن بہانہ ڈھونڈنے والوں سے کیا برتاؤ کیا جائے؟

حضرت امام علیہ السلام اس خطبے کے دوسرے حصے میں بہانہ طلب، جاہل اور حسد کرنے والوں کے متضاد اعتراضات کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرماتے ہیں، خلافت کے سلسلے میں جو بھی موقف اختیار کروں یہ کالے دل والے اور جاہل لوگ کچھ نہ کچھ اعتراض کرتے ہی ہیں:

"فَاِنْ اَقُلْ یَقُوْلُوْا: حَرَصَ عَلَی الْمُلْکِ، وَاِنْ اَسْکُتْ یَقُوْلُوْا: جَزِعَ مِنَ الْمَوْتِ"

''اگر میں خلافت کے سلسلے میں اور اپنی شائستگی اور دوسروں کے ناشائستہ ہونے کے بارے میں گفتگو کروں اور اپنے پاس آنے والوں کو مثبت جواب دیتا ہوں تو یہ لوگ کہتے ہیں کہ وہ لوگوں پر حکمرانی کرنے میں طمع (لالچ) رکھتا ہے۔ اگر سانس روک لوں اور خاموش رہوں تو یہ لوگ کہیں گے وہ موت سے ڈرتا ہے۔''

جی ہاں! یہی بیوقوف وضدی افراد کا طریقہ کار ہے۔ نیک بندہ جو بھی کام کرے یہ لوگ اُس پر کوئی نہ کوئی اعتراض کریں گے، یہاں تک کہ اس سلسلے میں متضاد باتیں اور فضول بکواس سے بھی پرہیز نہیں کرتے۔ تب اگر قیام کریں تو بھی اشکال کرتے ہیں، اگر خاموشی سے بیٹھ جائیں تو بھی اعتراض کرتے ہیں، اگر زحمت وکوشش کریں تب بھی اعتراض، مسائل اور

https://downloadshiabooks.com/

معاملات کے بارے میں بے پروا ہو جائیں، تب بھی دوسری قسم کی باتیں کرتے ہیں۔ اسی وجہ سے حقیقی مومن کبھی بھی ایسی بے کار و متضاد باتوں کی طرف توجہ ہی نہیں کرتے ہیں۔

اس کا وہی مطلب ہے، جو امام صادق علیہ السلام سے ایک حدیث میں نقل ہوا ہے:

"اِنَّ رِضَی النَّاسِ لَا یُمْلَكُ وَاَلْسِنَتَهُمْ لَا تُضْبَطُ"

''تمام لوگوں کی رضایت ہاتھ نہیں آسکتی ہے اور ان کی زبانیں کبھی بند نہیں ہوں گی۔''[1]

اسی معنی کے قریب ایک مطلب خطبہ ۱۷۲ میں بھی آیا ہے، جہاں پر آپؑ فرماتے ہیں کہ بعض لوگوں نے مجھ سے کہا ، اے ابوطالب علیہ السلام کے فرزند آپ حکومت کے لیے لالچی ہیں، میں نے جواب دیا، تم لوگ مجھ سے زیادہ لالچی ہو (کیونکہ) میں اپنے مناسب حق کا طلبگار رہوں اور تم اس راہ میں رکاوٹ بنتے ہو۔ (لیکن تم لوگ ایسے مقام کو چاہتے ہو، جس کے لیے ہرگز شائستگی نہیں رکھتے ہو اور اس کام میں صرف دنیا پرستی کارفرما ہے)

پھر اسی گفتگو کے سلسلے میں ان لوگوں کو جواب دینا شروع کرتے ہیں، جنہوں نے آپؑ کی خاموشی کو موت سے ڈرنے کی طرف نسبت دی تھی، آپؑ فرماتے ہیں، تعجب ہے اتنی ساری مختلف جنگوں میں، جنگ بدر، اُحد، حنین، خیبر و احزاب میں میری بہادری اور زحمتیں دیکھنے اور سننے کے باوجود کون میری طرف موت سے خوف و ڈر کی نسبت مجھ پر الزام لگا سکتا ہے۔ فرماتے ہیں:

"هَیْهَاتَ بَعْدَ اللَّتَیَّا وَ الَّتِیْ! وَاللّٰهِ لَابْنُ اَبِیْ طَالِبٍ آنَسُ بِالْمَوْتِ مِنَ الطِّفْلِ بِثَدْیِ اُمِّهٖ"

''خدا کی قسم! ابوطالبؑ کے بیٹے کو موت سے (اور خدا کی اطاعت اور امرِ خدا کے نفاذ میں شہید ہونا) اس سے زیادہ محبت و لگاؤ ہے جتنی شیرخوار بچے کو اپنی ماں کی چھاتی سے محبت ہوتی ہے۔''

"بَلِ انْدَمَجْتُ[2] عَلٰی مَكْنُوْنِ عِلْمٍ لَوْ بُحْتُ[3] بِهٖ لَاضْطَرَبْتُمْ اضْطِرَابَ الْاَرْشِیَةِ[4] فِیْ

---

[1] بحارالانوار، جلد ۶۷، ص ۲ اور ''تفسیر نورالثقلین'' جلد ۱، ص ۴۰۵

[2] اِنْدَمَجْتُ، اندماج کے مادّے سے ہے۔ یعنی پوشیدہ ہونا، یہاں اُن اسرار پوشیدہ کی طرف اشارہ ہے جو ان کے قلب مقدس میں پوشیدہ تھے۔

[3] بُحْتُ، اصل ''بَوح'' سے (لوح کے وزن پر) آشکار کرنا اور کتمان کو چھوڑ نا مراد ہے۔ اسی وجہ سے کھلی فضا کو ''باحہ'' اور حلال کام کو ''مُباح'' کہتے ہیں ''بَلِ انْدَمَجْتُ عَلٰی مَكْنُوْنِ عِلْمٍ لَوْ بُحْتُ بِهٖ لَاضْطَرَبْتُمْ اضْطِرَابَ الْاَرْشِیَةِ''۔

[4] ''اَرْشِیَة'' ''رِشا'' کی جمع ہے (رَضاء کے وزن پر) لمبی رسی کے معنی ہیں، اور ''رشوہ'' کو اسی وجہ سے رشوہ کہتے ہیں کہ یہ اک رسی کی طرح ہے، جو ڈول کے ساتھ باندھ کر کنویں سے پانی نکالا جاتا ہے رشوت دینے والا اس کے ذریعے اپنے مقصد تک پہنچ جاتا ہے۔ ''فِی الطَّوِیِّ الْبَعِیْدَة''۔

https://downloadshiabooks.com/

الطَّوِيّ[1] الْبَعِيدَةِ"

''لیکن اگر میں خاموش ہوں تو اس کی وجہ یہ ہے کہ میرے سینے میں علوم اور معارف اور راز ہیں، اگر میں ان کو ظاہر کردوں تو تم لوگ کنویں میں لٹکائی گئی رسی کی طرح لرز جاؤ گے۔''

نکات

امام علیہ السلام کی بہادرانہ جدوجہد

امامؑ اپنی بہادری اور شجاعت اور ایثاروقربانیاں جو آپؑ نے مختلف غزوات اور اسلامی جنگوں میں اور دوسرے مقامات پر دکھائیں مثلاً "لَيْلَةُ الْمَبِيْتِ" (اُس رات، جب حضرت علیؑ پیغمبر اکرمؐ کے بستر پر سوئے اور آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو دشمنوں کے چنگل سے رہائی دلائی) وغیرہ کی طرف مختصر اشارہ کرتے ہوئے اعتراض کرنے والوں کو یاد دلاتے ہیں کہ میں کسی بھی حادثے اور واقعے سے نہیں ڈرتا اور اپنی زندگی میں ہر امتحان سے سرخ رُو ہو کر نکلا ہوں، لہٰذا میری خاموشی خوف وڈر کی وجہ سے ہرگز نہیں ہوسکتی ہے، بلکہ اسلام اور اُمّتِ مسلمہ کی مصلحت اس خاموشی میں ہی دیکھتا ہوں۔ لیکن اس مطلب کو بیان کرنے میں عرب کی مشہور ضرب المثل کی طرف اشارہ فرماتے ہیں: "بَعْدَ اللَّتَيَّا وَ الَّتِيْ"

اس کہاوت کی داستان اس طرح ہے کہ ایک شخص نے شادی کی، اتفاقی طور پر اس کی بیوی چھوٹے قد کی، کم عمر وبداخلاق اور غیر متناسب تھی، اس آدمی نے اس عورت کے ہاتھوں بہت مصیبتیں برداشت کیں اور بالآخر اُسے طلاق دے دی۔ دوسری مرتبہ ایک لمبی عورت سے شادی کی اور اس عورت نے پہلی عورت سے زیادہ اُسے مصیبتیں اور پریشانیاں اور اذیتیں دیں۔ آخر میں مجبوراً طلاق دینا پڑی؛ اس کے بعد اس نے کہا:

"بَعْدَ اللَّتَيَّا وَ الَّتِيْ لَا اَتَزَوَّجُ اَبَداً"

اس چھوٹے قد والی عورت اور دوسری لمبے قد والی عورت کے بعد میں ہرگز شادی نہیں کروں گا۔ اس کا یہ جملہ چھوٹے بڑے حادثے کے موقع کے لیے ضرب المثل ہو گیا۔

امامؑ کا مقصد اس کلام سے یہ ہے کہ میں نے اپنی زندگی میں ہر قسم کے حادثوں کا شجاعت ودلاوری اور ذہانت کے ساتھ مقابلہ کیا ہے اور ان کو پیچھے چھوڑ دیا ہے، لہٰذا میرے لیے خوف وڈر کی کوئی وجہ نہیں ہے۔

---

[1] طوی، اصل طیّ سے ہے، اس کے معنی لپیٹنا اور طے کرنا ہے، یہاں مراد کنواں ہے۔

https://downloadshiabooks.com/

میں موت سے کیوں ڈروں؟

دوسرا نکتہ جو امام علیہ السلام فرماتے ہیں:

''میرا لگاؤ موت سے شیر خوار بچے کے شیرِ مادر سے لگاؤ اور رغبت سے زیادہ ہے۔''

یہ بات درست ہے کہ ماں کا پستان بچے کی زندگی کا سرمایہ ہے۔ بچہ اپنا کھانا پینا حتیٰ کہ دوا بھی اُسی سے لیتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ جب ماں بچے کے منہ سے پستان نکال لیتی ہے تو وہ اس طرح روتا ہے اور پریشان ہوتا ہے، گویا پوری دنیا اُس سے چھین لی گئی ہو اور اگر اُس کے منہ میں پستان دوبارہ دیا جاتا ہے تو وہ اتنا خوشحال ہوتا ہے، گویا پوری دنیا اُس کے حوالے کر دی ہو۔ تاہم یہ محبت اور لگاؤ جیسا بھی ہو، وہ اس کی فطرت میں شامل ہے، لیکن امام علیہ السلام کا اور تمام الٰہی عارفوں کا موت سے اور خدا سے ملاقات سے (خصوصاً خدا کی راہ میں شہید ہونے سے) جو عشق و لگاؤ ہے، اور عقل اور عشق کی رُو سے موت کو ایک وسیع جہاں میں نئی زندگی کا آغاز سمجھتے ہیں، مرنا ان کے لیے عالمِ بقا کی طرف دیکھنے کی کھڑکی ہے، جیل کی سلاخوں کو توڑ کر آزاد ہونا ہے، پنجرے کے دروازوں کو کھول کر عالمِ بالا پرواز کرنا ہے اور پروردگار کے نزدیک ہونا ہے، کون سا عاقل زندان سے آزاد ہونے سے خوش نہیں ہوگا [1] اور کون سا انسان اس محدود اور پست اور ہر قسم کی محنت و مشقت اور برائیوں سے بھری ہوئی دنیا سے نجات پانا اور روشنیوں سے بھری ہوئی دنیا میں قدم رکھنے کو بُرا مانے گا؟ جی ہاں وہ لوگ موت سے ڈرتے ہیں جو موت کو ہر چیز کا خاتمہ مانتے ہیں یا یہ لوگ موت کو اپنی بدکاریوں کی سزا کا آغاز سمجھتے ہیں۔

[1] ایک معروف شاعر نے اس مسئلے کو ایک خوبصورت مثال کے ضمن میں بیان کیا ہے اور وہ کہتا ہے کہ معرفت کم رکھنے والے کچے پھل کی طرح ہیں جو شاخوں سے چپک کے رہتے ہیں لیکن عارف لوگ پکے ہوئے میوے کی مانند ہیں جو شاخ سے بہ آسانی جدا ہوتا ہے۔

این جہان ہمچون درخت است ای کرام! — مابر او چون میوہ ہای نیم خام!
سخت گیرد خامہا، مر شاخ را — زان کہ در خامی نشاید کاخ را
چون بپخت گشت شیرین لب گزان — سست گیرد شاخہ ہا را بعد از آن
چون از آن اقبال شیرین شد دہان — سست شد بر آدمی ملک جہان
دنیا سر سبز ایک شجر ہے — انسان اس پیڑ کا ثمر ہے
نا پختہ ثمر ہے شاخ بستہ — پک جانے پہ ٹوٹتا ہے رشتہ
پک جائے تو پھل ہو خوب میٹھا — ہے کام و دہن کو لطف دیتا
انسان ہو جو معرفت سے محروم — دنیا کی طلب ہے اس کا محصول
دنیا کی سمجھتے ہیں حقیقت — جو لوگ ہیں صاحب معرفت
کرتے ہیں وہ موت سے محبت — ہے موت ہی دائمی سعادت

https://downloadshiabooks.com/

حضرت امامؑ اتنے سارے کارنامے اور علوم و معارف رکھنے کے باوجود موت سے کیوں ڈر جائیں؟ لہٰذا قسم اور تاکید کے ساتھ فرماتے ہیں کہ ابو طالبؑ کے بیٹے کو موت سے لگاؤ شیر خوار بچے کا اپنی ماں کی چھاتی سے لگاؤ اور محبت سے بڑھ کر ہے۔ آپؑ اپنے ایک اور کلام میں فرماتے ہیں:

"فَوَاللهِ مَا اُبَالِیْ دَخَلْتُ اِلَی الْمَوْتِ اَوْخَرَجَ الْمَوْتُ اِلَیَّ"

''خدا کی قسم! مجھے پروانہیں ہے، میں موت کی طرف بڑھ جاؤں یا موت میری طرف آ جائے۔''

جب مرنا خدا کی رضا کے لیے ہو اور اس مقدس مقصد کے لیے ہو۔ [۱] اسی بنا پر جب ابن ملجم کی ضربت آپؑ کے سرِ اقدس پر لگی، تو بے ساختہ آپ کی زبان مبارک سے وہ تاریخ ساز جملہ نکلا جس سے آپؑ کی عظمت کی بلندی ظاہر ہوتی ہے، فرمایا:

"فُزْتُ وَرَبِّ الْكَعْبَةِ"

''کعبے کے پروردگار کی قسم! میں کامیاب ہو گیا۔'' (گویا آج مجھے رہائی مل گئی) [۲]

میں کیوں خاموش ہوا؟

امام علیہ السلام فرماتے ہیں کہ میری خاموشی جن اسرار اور رازوں سے باخبر ہونے کی وجہ سے ہے، اگر ان کو میں ظاہر کروں تو تم کنویں میں لٹکائی ہوئی رسی کی طرح لرز جاؤ گے۔ یہ بات واضح ہے کہ کنواں جتنا زیادہ گہرا ہو، اُس کی گہرائی میں ڈول اور رسی کی حرکت زیادہ ہوتی ہے، کیونکہ ایک طرف کا تھوڑا سا ہلنا رسی کی دوسری طرف وسیع طور پر حرکت کا سبب بنتا ہے۔

لیکن ان رازوں سے کیا مراد ہے؟ یہ نہج البلاغہ کے شارحین کے درمیان موضوع گفتگو ہے اور اس سلسلے میں بہت زیادہ احتمالات کا اظہار کیا ہے۔ کبھی پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی وصیت کے مطابق اس ضمن میں امام علی علیہ السلام کی خاموشی اور آپؑ کا جنگ سے دور رہنا مراد لی ہے اور کبھی آپؑ کی خاموشی سے اسلامی معاشرے کو ہونے والے فوائد اور نقصانات سے آگاہی مراد لی ہے۔

بعض دوسرے افراد آپؑ کا آخرت کے حالات کے بارے میں آگاہ و باخبر ہونے کی طرف اشارہ قرار دیتے ہیں، یعنی آپؑ فرمانا چاہتے ہیں کہ اگر میں دوسری دنیا کے بارے میں جو کچھ جانتا ہوں اگر تمہارے لیے ظاہر کر دوں تو تم لوگ

---

[۱] نہج البلاغہ، خطبہ ۵۵

[۲] بحار الانوار جلد ۴۲، ص ۲۳۹

https://downloadshiabooks.com/

لرز اٹھو گے۔ بعض اس مطلب کو قضا و قدر کے حتمی مسئلے کی طرف اشارہ قرار دیتے ہیں۔ اس مسئلے کے بارے میں غلط فہمی کی وجہ سے کچھ لوگ گمراہ ہو گئے۔

لیکن یہ چاروں احتمالات اس خطبے کے آگے اور پیچھے کے جملے اور خطبے کے مقام کے درمیان کوئی ہم آہنگی نہیں۔ بہتر یہ ہے کہ اس جملے کو اصحاب پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور اسلام کے دعویداروں میں پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی رحلت کے بعد پیدا ہونے والی تبدیلیوں کی طرف اشارہ قرار دیں۔ وہ صحابہ جنہیں لوگ کل تک اسلام اور حق کے علمبردار سمجھتے تھے، آج وہی افراد گمراہی و باطل کے پرچم اٹھانے والوں میں سے ہو جاتے ہیں۔ کل تک یہ لوگ پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی پشت پناہی میں دشمنوں سے لڑتے تھے، آج منافقوں کے جھنڈے کے سائے میں آ گئے ہیں اور دین کو دنیا کے عوض اتنا بیچ دیتے ہیں کہ باخبر لوگ ان کے اس کام سے تعجب کرتے ہیں۔

آپؑ فرماتے ہیں، میں آئندہ پیش آنے والے حوادث اور لوگوں کے حال دگرگوں ہونے سے اچھی طرح واقف ہوں اور اگر انہیں بیان کر دوں تو تم خوفزدہ ہو جاؤ گے۔ یہی چیزیں ہیں جس نے مجھے خاموشی اور صبر و تحمل پر مجبور کیا ہے۔ کون یقین کر سکتا ہے کہ طلحہ و زبیر جیسے بلند مرتبہ صحابی جنگ جمل کی آگ بھڑکانے والوں میں سے ہوں گے اور کون یقین کر سکتا ہے کہ پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی زوجہ اور اُمّ المومنین حضرت عائشہ منافقوں کا ساتھ دیں گی اور دس ہزار سے زیادہ افراد کے خون میں شامل ہو جائیں گی۔ ایسی ہی بہت سی اہم باتیں ہیں جن سے میں واقف ہوں، ان حالات میں، میں کس طرح ایسے افراد پر تکیہ کروں اور ان پر اعتماد کر کے قیام کروں جب کہ میں ان کے رازوں سے پوری طرح واقف ہوں۔

https://downloadshiabooks.com/

چھٹا خطبہ

وَمِنْ كَلَامٍ لَهُ عَلَيْهِ السَّلَامُ

لَمَّا أُشِيرَ عَلَيْهِ بِأَنْ لَّا يَتْبَعَ طَلْحَةَ وَ الزُّبَيْرَ وَ لَا يَرْصُدَ لَهُمَا الْقِتَالَ وَ فِيهِ يُبَيِّنُ عَنْ صِفَتِهِ بِأَنَّهُ (عَلَيْهِ السَّلَامُ) لَا يُخْدَعُ [1]

جب آپؑ کو طلحہ و زبیر سے جنگ اور ان کا پیچھا نہ کرنے کا مشورہ دیا گیا تو یہ خطبہ ارشاد فرمایا۔

خطبہ، ایک نگاہ میں

جب طلحہ و زبیر نے عہد و پیمان کو توڑا اور حضرت عائشہ کے ہمراہ بصرہ میں آکر اُس جگہ پر قابض ہو گئے، تو بعض لوگ یہ سوچتے تھے کہ امامؑ اُن سے برسرِ پیکار نہ ہوں، اُن کو ان کی حالت پر رہنے دیں اور خلافت کی جڑوں کو مضبوط کریں۔ کچھ عرصے کے بعد وہ لوگ سرِ تسلیم خم کر دیں، امامؑ اس کلام کے آغاز میں وضاحت کے ساتھ فرماتے ہیں کہ یہ ایک بہت بڑی غلطی ہے، میں ہاتھ پر ہاتھ رکھ کر نہیں بیٹھوں گا تاکہ اس سے دُشمن طاقتور ہو جائے اور مجھے غفلت میں رکھے۔ پھر دوسرے جملے میں اپنے وفادار اصحاب سے استفادہ کرتے ہوئے اُن کے ساتھ جنگ کرنے کے لیے اپنے مضبوط ارادے کو بیان کرتے ہیں اور وضاحت کے ساتھ فرماتے ہیں کہ میرا یہ طریقہ اختتامِ زندگی تک جاری رہے گا۔ اور آخری جملے میں اس حقیقت کی طرف اشارہ کرتے ہیں کہ یہ مخالفتیں کوئی نئی نہیں ہیں، رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے وصال کے بعد سے ہی یہ مخالفتیں شروع ہوئیں جو اب تک جاری ہیں۔

---

[1] یہاں مفسرین کے درمیان بحث ہے کہ کس نے اس قسم کی گفتگو کی ہے۔ مرحوم شیخ مفیدؒ نے کتاب الجمل میں اسامہ بن زید سے اس گفتگو کو نسبت دی ہے۔ بعض مورّخ اور غیر شیعہ شارح اسے امام حسن علیہ السلام سے منسوب کرتے ہیں لیکن یہ بات واضح ہے کہ یہ روایت امیر المومنینؑ کے امام حسنؑ اور دیگر خاندان کے ساتھ موجود روابط سے مناسبت نہیں رکھتی، یہ احتمال بھی ہے کہ یہ مشورہ اور گفتگو ایک شخص یا فرد کی نہ ہو بلکہ حالات سے بے خبر عافیت پسندوں کا گروہ ہو۔

https://downloadshiabooks.com/

وَ اللهِ لَا اَکُوْنُ کَالضَّبُعِ تَنَامُ عَلٰی طُوْلِ اللَّدْمِ حَتّٰی یَصِلَ اِلَیْهَا طَالِبُهَا وَ یَخْتِلَهَا رَاصِدُهَا وَ لٰکِنِّیْ اَضْرِبُ بِالْمُقْبِلِ اِلَی الْحَقِّ الْمُدْبِرَ عَنْهُ وَ بِالسَّامِعِ الْمُطِیعِ الْعَاصِیَ الْمُرِیبَ اَبَداً حَتّٰی یَاْتِیَ عَلَیَّ یَوْمِیْ فَوَاللهِ مَا زِلْتُ مَدْفُوعاً عَنْ حَقِّیْ مُسْتَاْثَراً عَلَیَّ مُنْذُ قَبَضَ اللهُ نَبِیَّهُ صَلَّی اللهُ عَلَیْهِ وَ سَلَّمَ حَتّٰی یَوْمِ النَّاسِ هٰذَا۔ [1]

خدا کی قسم! میں اس بجُّو کی مانند نہیں ہوسکتا، جس کا شکاری مسلسل کھٹکھٹا تا رہتا ہے اور وہ آنکھ بند کیے پڑا رہتا ہے، یہاں تک کہ گھات لگانے والا اسے پکڑ لیتا ہے۔ میں حق کی طرف آنے والوں کے ذریعے انحراف کرنے والوں پر اور اطاعت کرنے والوں کے سہارے معصیت کا رتشکیک کرنے والوں پر مسلسل ضرب لگاتا رہوں گا، یہاں تک کہ میرا آخری دن آجائے۔ خدا گواہ ہے کہ میں ہمیشہ اپنے حق سے محروم رکھا گیا ہوں اور دوسروں کو مجھ پر مقدم کیا گیا ہے، جب سے سرکارِ دو عالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی رحلت ہوئی ہے اور آج تک یہ سلسلہ جاری ہے۔

شرح وتفسیر

دشمن کے مقابل غفلت کا شکار نہیں ہونا چاہیے

حضرت علی علیہ السلام نے اُن لوگوں کے جواب میں فرمایا، جو پیمان توڑنے والے طلحہ وزبیر کا پیچھا نہ کرنے کی تجویز دے رہے تھے۔

وَاللهِ لَا اَکُوْنُ کَالضَّبُعِ [2] تَنَامُ عَلٰی طُوْلِ اللَّدْمِ [3] حَتّٰی یَصِلَ اِلَیْهَا طَالِبُهَا، وَ یَخْتِلَهَا [4] رَاصِدُهَا [5]

---

[1] مصادر نہج البلاغہ کے مولف نے دیگر منابع کی طرف اشارہ کیا ہے، جن میں اس خطبے کا ذکر ہے من جملہ تاریخ طبری، امالی شیخ طوسی، ''صحاح اللغتہ'' غریب الحدیث مولف ابوعبید القاسم بن سلام۔

[2] ضبع، بروزن سبع، یہ گفتار کے معنی میں ہے اور کبھی قحط کے سال کو ضبع کہتے ہیں اس لیے کہ ہر چیز کو ختم اور برباد کر دیتا ہے۔

[3] لدم بہت سارے اہل لغت کے نزدیک پتھر کو زمین میں ٹھونسنے یا دوسری چیز کو ٹھونسنے کو کہا جاتا ہے۔ اُس آواز کے ساتھ جو تیز نہ ہو۔ فطری بات ہے اگر ایسی آواز بار بار آئے تو یہ نیند کا باعث بنتی ہے۔ ''حَتّٰی یَصِلَ اِلَیْهَا طَالِبُهَا، وَ یَخْتِلَهَا''

[4] وَ یَخْتِلَهَا، خَتَلَ کے مادّے سے مشتق ہے جو کہ مکر و فریب کے معنی میں ہے، مخاتلہ شکار کی طرف آہستہ چلنا تا کہ وہ فرار نہ کرے۔

[5] راصد، رَصَدَ کے مادّے سے مشتق ہے۔ دیکھ بھال کرنے اور کمین گاہ میں بیٹھنے کے معنیٰ میں ہے۔ نجومی لوگوں کی جانب سے ستاروں کی طرف دینے والی نسبت کو رَصد کہا جاتا ہے اور اُس کی جگہ کو رصدگاہ کہا جاتا ہے۔

https://downloadshiabooks.com/

''خدا کی قسم! میں اس بجّو کی مانند نہیں ہوسکتا، جس کا شکاری مسلسل کھٹکھٹا تا رہتا ہے اور وہ آنکھ بند کیے پڑا رہتا ہے، یہاں تک کہ گھات لگانے والا اسے پکڑ لیتا ہے۔''

یہ ضرب المثل کا پسِ منظر یہ ہے کہ مشہور ہے، بجّو ایک بے وقوف جانور ہے جسے آسانی سے شکار کیا جاسکتا ہے وہ یوں کہ شکاری آرام سے اپنے پاؤں یا کسی پتھر یا لکڑی کے ٹکڑے کو اس کے بل پر مارتا ہے اس وقت وہ خواب میں ہوتا ہے اور یہاں تک کہ شکار ہو جاتا ہے، جو لوگ غفلت کی بنا پر دشمن کے قابو میں آجاتے ہیں، اُنہیں بجّو سے تشبیہ دی جاتی ہے۔

یہ مثال اُس زمانے کی تاریخی حقیقت کو واضح کرتی ہے کہ جنہوں نے طلحہ وزبیر کا پیچھا نہ کرنے کی تجویز امامؑ کو بہت ہی سادگی سے دی تھی، کیونکہ یہ لوگ اُن کے عزائم سے واقف نہیں تھے وہ پہلے بصرے پر پھر کوفے پر قابض ہونا چاہتے تھے۔ اگر وہ دونوں امیر شام کے پاس چلے جاتے تو واضح ہے امیر شام اُن کے ہاتھوں پر بیعت کرتا اور شام میں اُن کے لیے بیعت لیتا اور اس طرح سے عالمِ اسلام کا ایک بڑا حصہ عہد و پیمان توڑنے والوں کے اختیار میں آجاتا اور امام علی علیہ السلام کے ہاتھوں میں صرف مدینہ رہ جاتا۔

امیر شام نے خلیفۂ سوّم کے خون کا انتقام لینے کا نعرہ بلند کر کے لوگوں کے جذبات کو مزید بھڑکایا اور جاہل لوگوں کو حضرت امامؑ کے خلاف اکساتے اور بھڑکاتے رہے۔ اگر امیر المومنین حضرت علی علیہ السلام جلدی عمل درآمد نہ کرتے تو منافقین اپنے عزائم کو فوراً عملی جامہ پہناتے، امام علیہ السلام کی تیز حکمت عملی کی وجہ سے جدائی طلب لوگوں کی سازش ناکام رہی اور آسان طریقے سے بصرہ و کوفہ اور تمام عراق کو نجات مل گئی۔ شام کے ظالموں اور بعض نااہل لوگوں کی طرف سے مخالفت کا اگر سامنا نہ ہوتا تو امام علیہ السلام کی حکمت عملی سے شام بھی ظالموں کے چنگل سے آزاد ہو جاتا، وہاں کا ماحول بھی پاک و صاف ہو جاتا اور عالم اسلام مکمل طور پر آنجنابؑ کے ماتحت ہو جاتا، لیکن افسوس کا مقام ہے، جیسا کہ خطبۂ شقشقیہ کے ذیل میں بیان ہوا، جہالت، نادانی اور تنگ نظری کی بنا پر دشمن کے مکروفریب نے اپنا اثر دکھا دیا اور شامیوں کے خلاف جنگ فتح و کامرانی کے سائے میں ہی روکنا پڑی۔

پھر اس گفتگو کے تسلسل میں امامؑ دوسرے نکتے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے پہلی گفتگو کو مکمل کرتے ہیں:

وَلٰكِنِّي اَضْرِبُ بِالْمُقْبِلِ اِلَى الْحَقِّ الْمُدْبِرَ عَنْهُ، وَبِالسَّامِعِ الْمُطِيعِ الْعَاصِيَ الْمُرِيبَ اَبَداً، حَتّٰى يَأْتِيَ عَلَيَّ يَوْمِي

''میں غفلت کا شکار ہوئے بغیر دشمن کی تمام حرکات وسکنات پر انتہائی ہوشیاری کے ساتھ قابو پاسکتا ہوں اور حکمت عملی کو ہاتھ سے جانے نہیں دیتا، اہل حق کی تندو تیز تلواروں کے ساتھ، حق سے روگردانی کرنے والوں کے خلاف نبرد آزما

https://downloadshiabooks.com/

رہوں گا، میرا ہمیشہ سے یہی طریقہ رہا ہے۔ یہاں تک کہ میری اِس زندگی کا خاتمہ ہو جائے۔''

یعنی یہ کہ ایک معاشرے میں تمام لوگ حق کے پیروکار نہیں ہوتے، بعض لوگ بے ایمان یا ایمان میں سُستی کا شکار ہوتے ہیں، خواہشات کی پرستش اور مقام ومنزلت کے حصول کے لیے سعی وتلاش کرنے والے موجود ہیں، جو ایک عالم وعادل رہنما کے وجود کو اپنے غیر شرعی مفادات کے حصول میں رکاوٹ سمجھتے ہیں، لوگوں کو ورغلاتے ہیں، نیز ان کے خلاف مکرو فریب، تہمت، اور غلط تشہیر کے ہتھکنڈے استعمال کرتے ہیں، بیدار اور آگاہ قائد کے لیے ضروری ہے کہ وہ اس قسم کے افراد کو مہلت نہ دیں۔ ایک سرطانی عضو کی طرح ان لوگوں کو معاشرے کے جسم سے جدا کر کے نابود کریں، اگر اُن کے خطرات زیادہ نہ ہوں تو ان کو محدود کریں، حق کے پرستار اور عادل حاکم کے حکم پر سرِ تسلیم خم کرنے والے ہمیشہ سے اسلحہ اُٹھائے اس گروہ کے خلاف نبرد آزما ہیں۔

حضرت علی علیہ السلام تیسری اور آخری گفتگو میں مزید فرماتے ہیں:

"فَوَ اللّٰہِ مَا زِلْتُ مَدْفُوْعًا عَنْ حَقِّیْ، مُسْتَأْثِرًا عَلَیَّ، مُنْذُ قَبَضَ اللّٰہُ نَبِیَّہُ حَتّٰی یَوْمِ النَّاسِ ھٰذَا"

''(یہ عہد وپیمان توڑنے والے میرے لیے نئے چہرے نہیں ہیں) خدا کی قسم! رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے وصال سے لے کر آج تک ہمیشہ مجھے اپنے حق سے روکا گیا، اور دوسروں کو مجھ پر مقدم کیا ہے۔''

یہ طلحہ وزبیر کی طرف اشارہ ہے کہ ان کا واقعہ کوئی نیا نہیں ہے، یہ ایسا ایک منظم گروہ ہے جس کی ریشہ دوانیاں جاری رہیں اور رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے وصال سے لے کر آج تک ان کا پروپیگنڈا میرے خلاف جاری ہے۔

"مَدْفُوْعًا اور مُسْتَأْثِرًا" کی تعبیر اُس مزاحمت کی طرف اشارہ ہے، جسے دشمن نے حضرت امامؑ کے خلاف ہمیشہ روا رکھا اور امام علیہ السلام کو پیچھے چھوڑ کر دوسروں کو اُن پر ہمیشہ مقدم کیا ہے، کیونکہ وہ آپؑ کے عدل وانصاف کو برداشت نہیں کر سکتے تھے یا آپؑ کی فضیلتوں کی وجہ سے رشک کرتے تھے۔

"حَتّٰی یَوْمِ النَّاسِ ھٰذَا" کی تعبیر اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ جب میں اکیلا تھا، تب بھی میرے حق کو چھینا گیا اور آج بھی لوگوں نے زبردستی میرے ہاتھوں پر بیعت کی ہے اور ایک گروہ میری مخالفت پر اتر آیا ہے، اگرچہ میں خلافت کی ظاہری مسند پر بیٹھا ہوں، پھر بھی میرا حق اس سے کہیں برتر وبالاتر ہے۔

مرحوم شیخ مفیدؒ نے کتاب ''ارشاد'' میں امیر المومنینؑ کے اس قول کو ذکر کیا ہے:

ھٰذَا طَلْحَۃُ وَ الزُّبَیْرُ لَیْسَا مِنْ اَھْلِ النُّبُوَّۃِ وَ لَا مِنْ ذُرِّیَّۃِ الرَّسُوْلِ(صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَآلِہٖ

https://downloadshiabooks.com/

وَسَلَّمَ) حِيْنَ رَاَيَا اَنَّ اللّٰهَ قَدْ رَدَّ عَلَيْنَا حَقَّنَا بَعْدَ اَعْصُرٍ فَلَمْ يَصْبِرَا حَوْلًا وَاحِدًا وَلَا شَهْرًا كَامِلًا حَتّٰى وَثَبَا عَلٰى دَأْبِ الْمَاضِيْنَ قَبْلَهُمَا لِيَذْهَبَا بِحَقِّيْ وَيُفَرِّقَا جَمَاعَةَ الْمُسْلِمِيْنَ عَنِّيْ"[1]

"طلحہ وزبیر نہ خاندان نبوت سے تھے اور نہ رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی اولادوں میں سے، جب اُنہوں نے دیکھا کہ خداوند متعال نے کئی برس کے بعد ہمارے حق کو واپس کر دیا ہے تو ان سے برداشت نہ ہوا، یہاں تک کہ ایک سال، بلکہ ایک مہینہ بھی اُنہوں نے صبر نہیں کیا، ہمارے خلاف اُٹھ کھڑے ہوئے، پہلے لوگوں کی سیرت کو اپنایا۔ میرے حق کو چھیننے اور اُمّت مسلمہ کو مجھ سے دور کرنے کے لیے کوششیں کیں۔"

نکتہ

تمام ذمّے داروں کے نام پیغام

حضرت امام عالی مقام ؑ نے اس گفتگو میں تمام ایماندار اور ہوشیار ذمے داروں اور اسلامی ممالک کے ذمے داروں کے نام ایک ایسا تاریخی درس دیا ہے، جس پر دشمن کے خطرات سے نمٹنے کے لیے پورا پورا دن، گھنٹوں اور ہر لمحے سوچنے کی ضرورت ہے۔ فرصت کے لمحات کو اتنی آسانی سے نظر انداز نہیں کرنا چاہیے۔ بیوقوف اور سست لوگوں کے مشورے پر عمل نہیں کرنا چاہیے۔

حضرت امام علی علیہ السلام نے ان حساس لمحات کو ہاتھ سے جانے دینے والوں کو بجّو سے تشبیہ دی ہے اور یہ تشبیہ چند حوالوں سے توجہ طلب ہے:

بجّو دشمن کے حاضر ہونے کا احساس کر لیتا ہے لیکن شکاری کی آواز سے سو جاتا ہے، ایسی نیند جس کی انتہا اسیری اور موت ہے۔ اور بجّو اپنے ہی گھر میں شکار ہوتا ہے۔

بجّو بغیر کسی مقابلے کے دشمن کے چنگل میں پھنستا ہے اور وہ لوگ جو جلد گزرنے والے لمحات کو خوش فہمی، یا غفلت وسستی، یا غور وفکر میں زیادہ وقت لگانے کی وجہ سے وقت ضائع کرتے ہیں، وہ بھی اس بجّو کی طرح ہیں، جو خوابِ غفلت کی وجہ سے اپنے ہی کاشانے میں شکار ہو جاتے ہیں اور خود سے مقابلے کا اظہار بھی نہیں کر سکتے۔

اس گفتگو کا مقصد ہرگز یہ نہیں ہے کہ انسان حالات پر نظر نہ رکھے اور غور وفکر یا مشورے کے بغیر کوئی قدم اٹھائے،

[1] ارشاد شیخ مفید جلد ۱،ص ۲۴۳ انتشارت علمیہ اسلامیہ

https://downloadshiabooks.com/

بلکہ بہترین مشورہ دینے والوں اور ہوشیار لوگوں سے مشورہ کریں اور مسائل کی اہمیت کو سمجھتے ہوئے وقت سے پہلے اقدام کریں۔

https://downloadshiabooks.com/

ساتواں خطبہ

وَمِنْ كَلَامٍ لَهُ عَلَيْهِ السَّلَامُ
يَذُمُّ فِيهَا أَتْبَاعَ الشَّيْطَانِ

جس میں شیطان کے پیروکاروں کی مذمت کی گئی ہے۔

اِتَّخَذُوا الشَّيْطَانَ لِأَمْرِهِمْ مِلَاكاً وَاتَّخَذَهُمْ لَهُ أَشْرَاكاً فَبَاضَ وَفَرَّخَ فِي صُدُورِهِمْ وَدَبَّ وَدَرَجَ فِي حُجُورِهِمْ فَنَظَرَ بِأَعْيُنِهِمْ وَنَطَقَ بِأَلْسِنَتِهِمْ فَرَكِبَ بِهِمُ الزَّلَلَ وَزَيَّنَ لَهُمُ الْخَطَلَ فِعْلَ مَنْ قَدْ شَرِكَهُ الشَّيْطَانُ فِي سُلْطَانِهِ وَنَطَقَ بِالْبَاطِلِ عَلَى لِسَانِهِ [1]

''ان لوگوں نے شیطان کو اپنے امور کا مالک و مختار بنالیا ہے اور اس نے انہیں اپنا آلۂ کار قرار دے دیا ہے اور ان کے سینوں میں انڈے دے کر بچے نکالے ہیں اور وہ انہیں کی آغوش میں پلے بڑھے ہیں۔ اب شیطان انہیں کی آنکھوں سے دیکھتا ہے اور انہیں کی زبان سے بولتا ہے، انہیں لغزشوں کی راہ پر لگا دیا ہے اور ان کے لیے غلط باتوں کو آراستہ کر دیا ہے، جیسے کہ اس نے انہیں اپنے کاروبار میں شریک بنالیا ہو اور اپنی غلط باتوں کو انہیں کی زبان سے ظاہر کرتا ہو۔''

شرح و تفسیر

شیطان کے پیروکار

یہ خطبہ مختصر ہونے کے ساتھ شیطان کے پیروکاروں کی دقیق وضاحت، نفسِ انسانی میں ان کے نفوذ اور پھر اُن کے

---

[1] مصادر نہج البلاغہ میں آیا ہے کہ یہ خطبہ زمخشری نے ربیع الابرار کی جلد ۱ ص ۱۰۹ پر درج کیا ہے، نیز ابن اثیر نے النھایہ اور غریب الحدیث، جلد ۱، ص ۵۹، میں اس کے بعض حصوں کا ذکر کیا ہے۔

https://downloadshiabooks.com/

آثار اور موت کے پیغامات کی واضح طور پر نشاندہی کرتا ہے۔ اور غافلوں کو اپنے چنگل میں پھنساتا ہے، پھر اُن کو کس طرح اپنے مفادات کے لیے استعمال کرتا ہے، یہ درحقیقت تمام پیروانِ حق کے لیے ایک انتباہ ہے کہ شیطان کے تدریجی نفوذ پر توجہ رکھیں۔ اس کے نفوذ کے معمولی آثار بھی آشکار ہو جائیں تو مقابلے کے لیے اُٹھ کھڑے ہوں، اگرچہ اس خطبے میں طلحہ، زبیر یا امیر شام کے لشکر، نہروان کے خوارج جو پچھلے زمانے میں شیطان کے چنگل میں گرفتار ہوئے تھے، کے بارے میں گفتگو کی گئی ہے، لیکن یہ صرف اُن پر منحصر نہیں ہے، بلکہ یہ عمومی طور پر اُن تمام لوگوں کے لیے حکم ہے جو شیطان کے فریب میں آجاتے ہیں، اس خطبے میں شیطان کے اپنے پیروکاروں میں مرحلہ وار نفوذ کرنے کے طریقے کو امام علی علیہ السلام نے اپنی مخصوص فصاحت و بلاغت کے ساتھ خوبصورت اور قابلِ فہم مثالوں کے ذریعے بیان فرمایا ہے۔ اس سے زیادہ حُسنِ بیان کا تصور نہیں کیا جاسکتا۔

پہلے مرحلے میں فرماتے ہیں: شیطان کا نفوذ ہر انسان کے وجود میں اجباری نہیں، بلکہ اختیاری ہے۔ یہ انسان ہے جو اُسے سبز باغ دکھاتا ہے، اپنے وجود میں اُس کے لیے داخل ہونے کا موقع فراہم کرتا ہے۔ فرماتے ہیں:

"اِتَّخَذُوا الشَّيْطَانَ لِأَمْرِهِمْ مِلَاكًا"

''(اس بُری صفت کی سیرت رکھنے والوں نے) شیطان کو اپنے امور کا معیار قرار دیا ہے۔''

ملاک، مادّہ مِلک سے مشتق ہے، یعنی کسی چیز کی بنیاد۔ مثلاً کہا جاتا ہے جسم کا مالک دل ہے یعنی اُس کی بنیاد اور جڑ کو تشکیل دیتا ہے۔

یہ وہی چیز ہے، جس کا قرآن مجید میں بھی واضح طور پر ذکر ہوا ہے، ارشادِ ربّ العزت ہے:

"إِنَّهُ لَيْسَ لَهُ سُلْطَانٌ عَلَى الَّذِينَ آمَنُوا وَعَلَى رَبِّهِمْ يَتَوَكَّلُونَ. إِنَّمَا سُلْطَانُهُ عَلَى الَّذِينَ يَتَوَلَّوْنَهُ وَالَّذِينَ هُمْ بِهِ مُشْرِكُونَ"

''اس میں شک نہیں کہ جو لوگ ایماندار ہیں اور اپنے پروردگار پر بھروسہ رکھتے ہیں ان پر اس کا قابو نہیں چلتا، اس کا قابو چلتا ہے تو بس ان ہی لوگوں پر جو اس کو دوست بناتے ہیں اور جو لوگ اس کو (خدا کا) شریک بناتے ہیں۔ [1]

بنابرایں مذکورہ کلام، آیاتِ قرآنی کی طرح ایک ایسا جواب ہے اُن لوگوں کے لیے جو فرزندانِ آدمؑ پر شیطان کی حکمرانی سے متعلق اعتراض کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ خداوند متعال نے اس خطرناک موجود کو بنی نوع انسان پر مسلط کر دیا ہے، جبکہ اُن سے کہا گیا ہے کہ وہ شیطان کی پیروی نہ کریں، قابلِ ذکر ہے کہ شیطان دیوار اور چھت سے داخل نہیں ہوتا، بلکہ

[1] سورۂ نحل، آیات ۹۹، ۱۰۰

دستک دیتا ہے جس نے دروازے کو کھولا، وہ اسی کے دل کے گھر میں داخل ہوتا ہے اور جس نے دروازے کو نہیں کھولا وہ واپس پلٹ جاتا ہے، یہ صحیح ہے کہ وہ دستک دیتے وقت بہت شدید اصرار کرتا ہے لیکن اس کے مدمقابل فرشتگان الٰہی بھی خبردار کرتے ہیں اور مدد بھی کرتے ہیں۔

دوسرے مرحلے میں فرماتے ہیں: جب یہ گمراہ افراد شیطان کو اپنا رہبر بنا لیتے ہیں تو شیطان بھی ان کو منتخب کر لیتا ہے:

"وَاتَّخَذَهُمْ لَهُ اِشْرَاكًا"۔[۱]

"(وہ اس طرح کہ) انہیں اپنے کاموں میں شریک اور اپنا ہم سفر بنالیتا ہے۔"

"پھر اس مرحلے میں پچھلے سربستہ جملے کی وضاحت کرتے ہوئے فرمایا:

فَبَاضَ وَفَرَّخَ فِيْ صُدُوْرِهِمْ"۔[۲]

"اُس نے اُن کے سینوں کے اندر تخم گزاری کی، پھر اُسے چوزے میں تبدیل کر دیا۔"

اس خوبصورت مثال میں امامؑ نے شیطانی اوصاف رکھنے والوں کے سینوں کو ابلیس کے آشیانے اور اس کے انڈے دینے کی جگہ سے تشبیہ دی ہے اور اس کے بعد مزید اضافہ کیا:

"وَدَبَّ وَدَرَجَ فِيْ حُجُوْرِهِمْ"

"یہ شیطانی چوزے اُن کے سینوں کے اندر سے نکلتے ہیں اور انہیں کی آغوش میں حرکت اور پرورش پاتے ہیں۔"

نہج البلاغہ کے بعض شارحین نے وضاحت کی ہے کہ "دَبَّ" مادّہ، دبیب سے کمزور حرکت اور "وَدَرَجَ" نسبتاً طاقتور حرکت مراد ہے، اُس مختصر حرکت کی مانند جو بچے ماں کے دامن اور باپ کی آغوش میں کرتے ہیں۔ "دَرَجَ" کی تعبیر ممکن ہے اس حقیقت کی طرف بھی اشارہ ہو کہ شیطانی افکار اور صفات عمومی طور پر انسان کے وجود میں اچانک پیدا نہیں ہوتیں، بلکہ تدریجی طور پر پیدا ہوتی ہیں۔[۳] جیسا کہ قرآن مجید کے کئی مقامات پر اسے "خُطُوَاتِ الشَّيْطَانِ" سے تعبیر کیا گیا ہے اور شیطان کے قدم سے مومنین کو خبردار کیا ہے۔ اس سے بخوبی نشاندہی ہوتی ہے کہ شیطان ہر ہر قدم پر انسان کو بہکانے اور ضلالت و گمراہی کی طرف کھینچتا ہے۔

---

[۱] اشراک شریک اور شُرُک دونوں کی جمع ہے (بروزن نمک) جال کے معنی میں ہے۔

[۲] یہ جملہ فاء تفریع سے شروع ہوا ہے جو اس بات کی نشاندہی کرتا ہے کہ یہ پہلے مجمل جملے کی شرح ہے۔

[۳] سورۂ بقرہ، آیات ۱۴۸ و ۲۰۸۔ سورۂ انعام، آیت ۱۴۲۔ سورۂ نور، آیت ۲۱

https://downloadshiabooks.com/

تیسرے مرحلے میں فرماتے ہیں: اُن کا کام یہاں تک پہنچا:

"فَنَظَرَ بِأَعْيُنِهِمْ وَنَطَقَ بِأَلْسِنَتِهِمْ"

''شیطان اُن کی آنکھوں سے دیکھتا ہے اور اُن کی زبان سے گفتگو کرتا ہے۔''

بالآخر یہ شیطانی انڈے چوزے میں تبدیل ہوکر، پرورش پاکر، اور مضبوط ہوکر ایک ایسے شیطان میں تبدیل ہوجاتے ہیں، جو اُن کے تمام رگ وپے میں داخل ہوجاتا ہے۔ اس طریقے سے وہ دو چہرہ والی شخصیت کا حامل بن جاتا ہے، ایک رُخ سے انسان اور دوسرے رُخ سے شیطان نظر آتا ہے، اُن کے ظاہر انسانوں کی مانند اور اندرونی طور پر وہ شیطان ہیں، اُن کی آنکھ، کان، زبان، ہاتھ اور پیر سب کے سب شیطان کے ماتحت ہیں اور فطری بات ہے کہ ہر چیز کو شیطانی رنگ سے دیکھتے ہیں اور اُن کے کان شیطان کے نغمے سننے کے لیے تیار رہتے ہیں۔

چوتھے مرحلے میں فرماتے ہیں: جب یہ انسان بتدریج اس مرحلے تک پہنچے:

"فَرَكِبَ بِهِمُ الزَّلَلَ وَزَيَّنَ لَهُمُ الْخَطَلَ" [1]

''تو شیطان نے انہیں آلودگیوں اور گناہوں کے رہوار پر سوار کرایا، ایسا رہوار جو انہیں ضلالت وگمراہی اور مختلف گناہانِ کبیرہ کی طرف دھکیل دیتا ہے، اور فاسد، بے ہودہ اور باطل گفتگو اُن کی نظر میں زینت ہیں۔''

یہ گفتگو امامؑ کے دوسرے کلام سے مشابہ ہے، جہاں فرمایا:

"أَلَا وَإِنَّ الْخَطَايَا خَيْلٌ شُمُسٌ حُمِلَ عَلَيْهَا أَهْلُهَا"

خطائیں اور گناہ اُن سواریوں کی مانند ہیں، جو سرکش اور بے لگام ہیں اور گنہگار لوگ اُن پر سوار ہوتے ہیں۔

پانچویں مرحلے میں فرماتے ہیں:

"فِعْلَ مَنْ قَدْ شَرِكَهُ الشَّيْطَانُ فِي سُلْطَانِهِ، وَنَطَقَ بِالْبَاطِلِ عَلَى لِسَانِهِ" [2]

ان کے اعمال ایسے شخص کے اعمال کی طرح ہیں، جسے شیطان نے یرغمال بنالیا ہے اور ان کی زبان پر باطل جملے جاری کردیے ہیں، اُن کے اعمال بخوبی گواہی دیتے ہیں کہ شیطان نے اُن میں نفوذ کیا ہے اور اپنے راستے پر چلانا چاہتا ہے۔

---

[1] یہ تفسیر اس بنا پر ہے کہ بھم میں حرف بائ تعدیہ کے لیے ہو، لیکن اگر ہم باء کی استعانت کے معنیٰ میں تفسیر کریں تو جملے کا مفہوم یہ ہوگا اُن کی مدد کے لیے شیطان خود خطا اور لغزش کی سواری پر سوار ہوتا ہے۔ لیکن جملہ "وَزَيَّنَ لَهُمُ الْخَطَلَ" کو مدنظر رکھتے ہوئے اور فرکب میں فاء تفریع کے لیے ہو تو پہلی تفسیر زیادہ مناسب ہے۔ (غور کریں)

[2] مصادر نہج البلاغہ میں آیا ہے کہ یہ خطبہ زمخشری نے ربیع الابرار کی جلد ۱، ص ۱۰۹ پر درج کیا ہے، نیز ابن اثیر نے النھایہ، میں غریب الحدیث، جلد ۱، ص ۵۹ پر اس کے بعض حصوں کا ذکر کیا ہے۔

https://downloadshiabooks.com/

اُن کی گفتگو اور نگاہ شیطان کی ہے، اُن کے مجموعی کردار میں شیطان کا نقش بخوبی دکھائی دیتا ہے۔ درحقیقت حضرت امام علیؑ چاہتے ہیں اس مرحلے میں اس قسم کے افراد کی شناخت ہوجائے جو شیطانی کردار رکھتے ہیں۔

اگرچہ نہج البلاغہ کی معروف شرحوں میں کوئی ایسی وضاحت نہیں ملتی، جو اس بات کی نشاندہی کرے کہ اس خطبے میں حضرت امامؑ کا مقصد کون لوگ تھے اور کس گروہ کے بارے میں گفتگو کی گئی ہے، لیکن معلوم یہی ہوتا ہے کہ کچھ افراد مثلاً طلحہ و زبیر اور اُن کے حواری، امیر شام کا لشکر، خوارج اور اُن کے ہم فکر افراد کی جانب امامؑ کے اس کلام میں اشارہ ہے، لیکن یہ مسلّم ہے کہ یہ دقیق اور پُرمغز گفتگو صرف اُن کے ساتھ مختص نہیں ہے، بلکہ اس میں تمام وہ لوگ بھی شامل ہیں جو شیطان کے راستے پر چلتے ہیں اور اُس کے پابند ہیں۔

شیاطین کے بارے میں اہم نکتہ

شیطان کے بارے میں بحث بہت طولانی اور پیچیدہ ہے، شیطان کو خلق کرنے کا فلسفہ، شیطان انسانوں میں کس طرح نفوذ کرتا ہے، شیطان کی طویل عمری، داستانِ حضرت آدم علیہ السلام و شیطان، شیطان کے لشکری، شیاطین جنّ و انس، انسانوں میں شیطان کے نفوذ کی علامت وغیرہ۔ ان تمام مسائل کی تفصیل کا یہاں محل نہیں ہے، صرف ان مباحث پر روشنی ڈالتے ہوئے اشارہ کریں گے، جن کے لیے مذکورہ خطبے کے مضامین پر اکتفا کیا ہے۔

آیاتِ قرآنی سے بخوبی استفادہ ہوتا ہے کہ شیطان شروع میں ایک شریر کی حیثیت سے خلق نہیں ہوا تھا، بلکہ وہ پاکیزہ مخلوق تھا، جو فرشتوں کے درمیان میں تھا (اگرچہ فرشتہ نہیں تھا) لیکن اس نے اپنی ذات سے شدید محبت، خودخواہی اور تکبّر کی وجہ سے آدمؑ کو سجدہ کرنے کے حوالے سے حکمِ خداوندی سے انکار کیا اور نہ صرف گناہ کا مُرتکب ہوا، بلکہ خدا کے علم وحکمت پر بھی اعتراض کردیا، خدا کے دستور کو حکیمانہ نہیں سمجھا اور کفر وضلالت کی وادی میں قدم رکھ دیا۔

اُس نے خداوندمتعال سے درخواست کی کہ اسے قیامت تک زندہ رکھے، خداوندمتعال نے بھی وقتِ معلوم تک زندہ رکھنے کو قبول فرمایا اور یہ اس لیے تھا تاکہ اپنے بندوں کو شیطان اور اُس کے لشکر کے ذریعے آزما سکے یا دوسری تعبیر میں جیسا کہ انسان کے وجود میں خواہشات نفسانی اور عقل وایمان کا معرکہ رکھا ہے، جو خدا کے حکم کی تعمیل کے لیے قوّت وطاقت کا سبب ہے، اسی طرح شیطان کے وسوسوں اور انسان کا شدید مقابلہ اُس کے مقابل تکامل کا سبب بنتا ہے، کیونکہ دُشمن کا وجود حرکت، طاقت وقوت، پیش قدمی اور تکامل کا سبب ہے۔

لیکن اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ انسان کے وجود میں شیطان جبری طور پر نفوذ کرے، بلکہ یہ خود انسان ہے کہ اُسے

https://downloadshiabooks.com/

وسوسے کی اجازت دیتا ہے، قرآن مجید میں ارشادِ ربانی ہے:

"اِنَّ عِبَادِیْ لَیْسَ لَكَ عَلَیْهِمْ سُلْطَانٌ"

''میرے بندوں پر جبری حکمرانی نہیں ہے۔'' [۱]

دوسری جگہ پر فرمایا:

"إِنَّهُ لَيْسَ لَهُ سُلْطَانٌ عَلَى الَّذِينَ آمَنُوا وَعَلَى رَبِّهِمْ يَتَوَكَّلُونَ"

''اِس کی حکمرانی اُن لوگوں پر نہیں ہے جو صاحبانِ ایمان اور اپنے پروردگار پر بھروسا رکھتے ہیں۔'' [۲]

اور اللہ تعالیٰ شیطان کے قول کو یوں نقل کرتا ہے:

"وَمَا كَانَ لِيَ عَلَيْكُمْ مِنْ سُلْطَانٍ إِلاَّ أَنْ دَعَوْتُكُمْ فَاسْتَجَبْتُمْ لِي فَلَا تَلُومُونِي وَلُومُوا أَنْفُسَكُمْ"

''وہ قیامت کے دن اپنے پیروکاروں سے کہے گا، تم لوگوں پر میری حکمرانی نہیں تھی، صرف یہ کہ میں نے تمہیں دعوت دی اور تم نے میری دعوت کو قبول کیا۔ پس مجھے ملامت نہ کرو بلکہ خود کو ملامت کرو۔'' [۳]

یہ نکتہ بھی اہمیت کا حامل ہے کہ خداوند متعال نے شیاطین کے وسوسوں کو ناکام بنانے کے لیے لشکروں کو خلق کیا ہے۔ من جملہ اُن میں سے عقل وخرد، فطرت، وجدان اور پیغمبرانِ الٰہی اور فرشتے ہیں، جو شیاطین کے وسوسوں کے مدمقابل اہلِ ایمان کے محافظ ہیں، جو کوئی اُن کے نقشِ قدم پر چلے تو اُن کی مدد کرتے ہیں اور شیطان کے وسوسوں کو دور کرتے ہیں اور جو کوئی خود کو شیاطین کے راستے پر ڈال دے اور ان سے انکار و گستاخی کرے تو وہ اُس کی حمایت کرنے سے ہاتھ اُٹھاتے ہیں۔

یہ نکتہ بھی قابلِ ذکر ہے کہ شیطان کی یہ کوشش ہوتی ہے کہ وہ انسان کے دل کی گہرائی پر نفوذ کرے اور اس طرح اُس کے کردار پر اثر چھوڑے، جیسا کہ اُوپر کے خطبے میں اشارہ ہوا ہے، گویا اُس نے سینوں کے اندر انڈے دیے ہیں، اور اپنے چوزوں کی پرورش کرتا ہے، پھر انہیں خود انسان اپنی آغوش میں پرورش کرتا ہے، یہاں تک وہ اُس کے وجود کے ساتھ ایک ہو جاتے ہیں۔ پھر آنکھ، کان، زبان، ہاتھ اور پیر سب شیطانی رنگ پکڑتے ہیں اور شیطانی آثار پیدا ہوتے ہیں۔

غرر الحکم میں امیر المومنینؑ کا فرمان ہے:

---

[۱] سورۂ اسراء: آیت ۶۵

[۲] سورۂ نحل: آیت ۹۹

[۳] سورۂ ابراہیمؑ آیت ۲۲

https://downloadshiabooks.com/

"اِحْذَرُوْا عَدُوًّا نَفَذَ فِي الصُّدُوْرِ خَفِيًّا وَنَفَثَ فِي الْآذَانِ نَجِيًّا"

''اس دُشمن سے بچو! جوسینوں میں پوشیدہ نفوذ کرتا ہے اور کانوں میں آہستہ سے پھونکتا ہے۔''

اس سے ملتی جلتی بات تھوڑے سے فرق کے ساتھ نہج البلاغہ کے خطبہ ۸۳ میں بھی آئی ہے اور خطبہ ۱۲۱، میں یوں کہا گیا ہے:

"اِنَّ الشَّيْطَانَ يُسَنِّيْ لَكُمْ طُرُقَهٗ وَيُرِيْدُ اَنْ يَحُلَّ لَكُمْ دِيْنَكُمْ عُقْدَةً عُقْدَةً"

''شیطان اپنے راستوں کوتمہارے لیے آسان بنا کر پیش کرتا ہے اور وہ چاہتا ہے کہ تمہارے دین کے عہد و پیمان کی ہر گرہ کو کھول دے۔''

بہرصورت سابقہ خطبے کو بیان کرنے کا مقصد تمام انسانوں کو خبردار کرنا ہے کہ اس برے دشمن کے حوالے سے جس نے جب آدم علیہ السلام خلق ہوئے تو ان سے اور ان کی اولاد سے اپنی دشمنی کا اعلان کیا ہے، مقصد یہ ہے کہ انسان خدا کے بے انتہا لطف وکرم پر بھروسا کرتے ہوئے نیز عقل، فطرت، وجدان اور انبیائے الٰہی کے پیغامات سے الہام لیتے ہوئے فرشتوں سے مدد چاہتے ہوئے خود کو شیطان کے نفوذ سے محفوظ کرے۔

آخری نکتہ جس کی طرف مختصر اشارہ کرنا ضروری ہے اور وہ یہ ہے کہ قرآن مجید کی بعض صریح آیتوں کی روشنی میں شیاطین صرف ابلیس اور اُس کے پوشیدہ لشکر پر منحصر نہیں ہیں، بلکہ بعض انسانوں کو بھی شیطان کہا گیا ہے، کیونکہ اُن کا کام بھی شیاطین کا کام ہے۔ آیۂ مجیدہ:

"وَ كَذٰلِكَ جَعَلْنَا لِكُلِّ نَبِيٍّ عَدُوًّا شَيَاطِيْنَ الْاِنْسِ وَ الْجِنِّ يُوْحِيْ بَعْضُهُمْ اِلٰى بَعْضٍ زُخْرُفَ الْقَوْلِ غُرُوْرًا"[1]

''اور اے رسولؐ جس طرح یہ کفّار تمہارے دشمن ہیں) اسی طرح (گویا) ہم نے (خود آزمائش کے لیے) شریر آدمیوں اور جنوں کو ہر نبی کا دشمن بنایا وہ لوگ ایک دوسرے کو فریب دینے کی غرض سے چکنی چپڑی باتوں کی سرگوشی کرتے ہیں۔''

---

[1] سورۂ انعام، آیت ۱۱۲

https://downloadshiabooks.com/

https://downloadshiabooks.com/

آٹھواں خطبہ

وَمِنْ كَلَامٍ لَهُ عَلَيْهِ السَّلَامُ

يَعْنِي بِهِ الزُّبَيْرَ فِي حَالٍ اقْتَضَتْ ذَالِكَ وَيَدْعُوهُ فِي الدُّخُولِ فِي الْبَيْعَةِ، ثَانِياً

يَزْعُمُ أَنَّهُ قَدْ بَايَعَ بِيَدِهِ وَلَمْ يُبَايِعْ بِقَلْبِهِ فَقَدْ أَقَرَّ بِالْبَيْعَةِ وَادَّعَى الْوَلِيجَةَ فَلْيَأْتِ عَلَيْهَا بِأَمْرٍ يُعْرَفُ وَإِلَّا فَلْيَدْخُلْ فِيمَا خَرَجَ مِنْهُ.

جب ایسے حالات پیدا ہو گئے اور اسے دوبارہ بیعت کے دائرے میں داخل ہونا پڑے گا جس سے نکل گیا ہے، زبیر کا خیال یہ ہے کہ اس نے صرف ہاتھ سے میری بیعت کی ہے اور دل سے بیعت نہیں کی ہے۔تو بیعت کا تو بہرحال اقرار کرلیا ہے۔اب صرف دل کے کھوٹ کا ادّعا کرتا ہے تو اسے اس کا واضح ثبوت فراہم کرنا پڑے گا ورنہ اسی بیعت میں دوبارہ داخل ہونا پڑے گا جس سے نکل گیا ہے۔

خطبہ، ایک نگاہ میں

طلحہ وزبیر اور اُن کے عہد و پیمان توڑنے کے متعلق سابقہ خطبوں میں کسی حد تک اُن کی داستان آپ پڑھ چکے ہیں۔اُنہوں نے اپنی رضا اور رغبت سے بیعت کی، یہاں تک کہ آپؑ کی خدمت میں پہنچے اور عمرے پر جانے کے لیے اجازت طلب کی، اُس وقت حضرت امامؑ نے فرمایا: تم عمرہ کرنے کا عزم وارادہ نہیں رکھتے ہو، انہوں نے قسم اُٹھا کر کہا کہ ہم اس کے علاوہ اور کوئی مقصد نہیں رکھتے ہیں۔حضرت امامؑ نے اُنہیں تجویز دی کہ وہ ایک دفعہ پھر تجدیدِ بیعت کریں، انہوں نے بھی تاکید کے ساتھ تعبیرات میں تجدید بیعت کی، حضرت امامؑ نے انہیں عمرے پر جانے کی اجازت دی، جب وہ نکلے تو آپؑ نے حاضرین سے فرمایا: خدا کی قسم! ان کو تم فتنہ وفساد میں مشاہدہ کروگے جو کہ جنگ وخوں ریزی کریں گے اور اس میں یہ لوگ

https://downloadshiabooks.com/

قتل ہوں گے۔ [۱]

زبیر نے اپنی پیمان شکنی کے لیے ایک بہانہ بنایا اور وہ یہ کہ اس نے امامؑ کے ہاتھ پر مجبوراً صرف ہاتھ سے بیعت کی، جب کہ اس کا دل اس بیعت کے لیے راضی نہیں تھا، امامؑ نے اس کے جواب میں اس خطبے کو ارشاد فرمایا۔ یہ نکتہ غور طلب ہے کہ بعض لوگوں نے اس گفتگو کو امام حسن مجتبیٰ علیہ السلام کے ساتھ نسبت دی ہے کہ اُنھوں نے اپنے والد امام علیؑ کے کہنے پر عبداللہ ابن زبیر کے خطبے کے بعد جنگ جمل کے دن خطبہ ارشاد فرمایا، لیکن یہ بعید نہیں ہے کہ امام علیؑ نے اس گفتگو کو زبیر کے ادّعا کے جواب میں بیان فرمایا ہو اور حضرت امام حسنؑ نے جمل کے دن اپنے خطبے میں اس سے استفادہ کیا ہو۔ [۲]

"یَزْعُمُ اَنَّہٗ قَدْ بَایَعَ بِیَدِہٖ، وَلَمْ یُبَایِعْ بِقَلْبِہٖ، فَقَدْ اَقَرَّ بِالْبَیْعَۃِ، وَ ادَّعَی الْوَلِیْجَۃَ، فَلْیَأْتِ عَلَیْھَا بِاَمْرٍ یُعْرَفُ، وَاِلَّا فَلْیَدْخُلْ فِیْمَا خَرَجَ مِنْہُ"

"وہ دعویٰ کرتا ہے کہ اُس کی بیعت ہاتھ کے وسیلے سے تھی نہ کہ دل سے، پس اس نے بیعت کا اقرار کر لیا ہے، لیکن مدّعا ایک پوشیدہ امر ہے (یعنی نیت) بنا بر ایں اُس کے لیے ضروری ہے کہ وہ اپنے دعویٰ کے لیے دلیل قائم کرے، ورنہ جس چیز سے خارج ہوا ہے اُس میں داخل ہو جائے اور اپنی بیعت پر دوبارہ لوٹے اور اس کی نسبت سے وفادار رہے۔"

شرح وتفسیر

عُذرِ گناہ بدتر از گناہ

جو کچھ پہلے ذکر ہوا، اُس کو مدنظر رکھتے ہوئے حضرت امام علیؑ نے اس گفتگو کو زبیر کے جواب میں فرمایا جو کہ چاہتا تھا اپنی پیمان شکنی کے لیے کوئی توجیہہ پیش کرے، کیوں کہ امیر شام نے اُس کو خروج کرنے پر اُکسایا اور کوفہ و بصرہ پر مسلط ہونے کے لیے کہا اور اُنہیں دھوکا دیا کہ وہ چاہتا ہے کہ شام کی سرزمین کو اُن کے اختیار میں دے دے۔ [۳] طلحہ و زبیر نے ریاست طلبی کے لیے حضرت امامؑ کے ساتھ عہد و پیمان کو توڑا، زبیر نے اس کام کی توجیہہ میں کہا، میں نے ہاتھ سے بیعت کی ہے نہ کہ دل سے۔

---

[۱] ابن ابی الحدید، جلد ۱، ص ۲۳۲

[۲] کتاب مصادر نہج البلاغہ، جلد ۱، ص ۳۳۴، ۳۳۵ پر رجوع کریں۔

[۳] شرح ابن ابی الحدید، جلد ۱، ص ۲۳۱

https://downloadshiabooks.com/

حضرت امامؑ نے دندان شکن جواب دیا ہے۔ایسا جواب جو تمام حقوقی اور قانونی مباحث میں کل بھی اور آج بھی قابل قبول ہے اور قضاوت کے مسائل میں ایک بنیاد کی حیثیت رکھتا ہے،فرماتے ہیں:

"يَزْعُمُ اَنَّهٗ قَدْ بَايَعَ بِيَدِهٖ،وَلَمْ يُبَايِعْ بِقَلْبِهٖ"

''اُس کا کہنا یہ ہے کہ ہاتھ سے بیعت کی لیکن دل سے بیعت نہیں کی۔''

پھر مزید فرمایا:

فَقَدْ اَقَرَّ بِالْبَيْعَةِ،وَ ادَّعَى الْوَلِيجَةَ[۱]

''وہ اس گفتگو کے ذریعے بیعت کا اقرار کرتا ہے جو اپنے ہاتھ سے بیعت کی ہے اور کبھی بھی اپنے دل سے بیعت نہیں کی ہے۔''

درحقیقت اُس کی گفتگو مرکب ہے اقرار اور ادّعا سے،اقرار سنا جائے گا اور قابلِ قبول ہے،لیکن ادّعا کے لیے دلیل قائم کرنا ضروری ہے۔لہٰذا اس کے آگے فرماتے ہیں:

:"فَلْيَأْتِ عَلَيْهَا بِأَمْرٍ يُعْرَفُ،وَاِلَّا فَلْيَدْخُلْ فِيمَا خَرَجَ مِنْهُ"

''اُس کو چاہیے کہ وہ اس امر کی گواہی کے لیے قابلِ قبول قرینہ پیش کرے اور وہ ثابت کرے کہ اُس نے جبر واکراہ کے ساتھ بیعت کی ہے اور اُس کی زبان اور دل کے درمیان ہم آہنگی نہیں تھی،ورنہ جس سے وہ خارج ہوا ہے اس کی طرف دوبارہ پلٹ کر اپنی بیعت پر وفادار ہو جائے۔''

بہت سارے لوگوں نے دیکھا تھا کہ طلحہ وزبیر نے اپنی مرضی سے آ کر حضرت امامؑ کے ہاتھوں پر بیعت کی تھی۔وہ سب سے پہلے افراد تھے اور یہ امر بھی مسجد میں انجام پایا تھا،لہٰذا یہ بیعت ہر حوالے سے قابل قبول ہے۔اگر کوئی اس سے ہٹ کر ادّعا کرے تو اُسے چاہیے کہ وہ اپنے ادّعا کے لیے مضبوط اور آشکار دلیل لائے۔اس کے علاوہ سب جانتے تھے کہ امام علیؑ کی بیعت کے حوالے سے کوئی جبر واکراہ نہیں تھا۔تھوڑے سے سرکردہ افراد نے بیعت نہیں کی امامؑ نے اُن کے لیے کوئی مزاحمت ایجاد نہیں کی۔اس نکتے کو مدنظر رکھتے ہوئے ظاہر وباطن کے درمیان عدم ہم آہنگی کوئی ایسی چیز نہیں کہ جسے آسانی سے قبول کیا جائے۔[۲]

جیسا کہ پہلے کہا گیا ہے کہ تمام حقوقی اور عدالتی محافل میں یہ ایک اصل اور بنیاد ہے،اگر کوئی ظاہری طور پر کسی سے

---

[۱] ولیجۃ مادّہ ولوج سے دخول کے معنی میں ہے۔کبھی چھپ کر داخل ہونے کو کہا جاتا ہے۔

[۲] کامل ابن اثیر،جلد ۳،ص ۱۹۱،مطبوعہ بیروت

https://downloadshiabooks.com/

قرارداد باندھے تو اُس پر وفادار ہونا چاہیے۔ اکراہ واجبار، دل وزبان کے درمیان جدائی، ظاہر و باطن میں اختلاف کا ادّعا قابل قبول نہیں ہے۔ ورنہ ہر ایک دوسروں کے ساتھ قرارداد کو آسانی سے توڑ سکتا ہے، خریدار، بائع، شادی کرنے والا، وقف کرنے والا جس وقت یہ دیکھے کہ قرارداد، اُس کی مصلحت میں نہیں ہے تو کہہ دے کہ ہم نے صرف زبان سے اقرار کیا ہے، دل اس عمل میں میرے ساتھ نہیں تھا۔ اس صورت میں پتھر پتھر پر بند نہیں ہوتا کی اصطلاح کے مطابق تمام افراد کا حکومتوں اور ملّتوں کے درمیان ہونے والے قراردادوں سے اعتبار ختم ہو جاتا ہے، اور اس کو کوئی قبول نہیں کرتا۔

یقیناً زبیر بھی اس حقیقت کو جانتا تھا، لیکن ان لوگوں کو جو اُس کے بیعت کے توڑنے پر اعتراض کر رہے تھے، جواب دینے کے لیے ایک نا قابلِ قبول دلیل کا سہارا لے رہا تھا۔ اُس دور کے لوگ، بالخصوص عرب بیعت کے لیے انتہائی اہمیت کے قائل تھے اور بیعت توڑنے کو بہت بڑا گناہ جانتے تھے۔

https://downloadshiabooks.com/

نواں خطبہ

وَمِنْ كَلَامٍ لَهُ عَلَيْهِ السَّلَامُ

فِيْ صِفَتِهِ وَصِفَةِ خُصُوْمِهِ وَيُقَالُ إِنَّهَا فِيْ أَصْحَابِ الْجَمَلِ

جس میں اپنے اور بعض مخالفین کے اوصاف کا تذکرہ فرمایا ہے اور شاید اس سے مراد اہلِ جمل ہیں۔

وَقَدْ أَرْعَدُوا وَأَبْرَقُوا وَمَعَ هٰذَيْنِ الْأَمْرَيْنِ الْفَشَلُ وَلَسْنَا نُرْعِدُ حَتّٰى نُوقِعَ وَلَا نُسِيلُ حَتّٰى نُمْطِرَ.

یہ لوگ بہت گرجے اور بہت چمکے، لیکن آخر میں ناکام ہی رہے، جب کہ ہم اُس وقت تک گرجتے نہیں ہیں جب تک دشمن پر ٹوٹ نہ پڑیں اور اس وقت تک لفظوں کی روانی نہیں دکھلاتے جب تک کہ برس نہ پڑیں۔ [1]

شرح و تفسیر

کھوکھلے نعرے بازی

مندرجہ بالا کلام میں جو تعبیرات آئی ہیں، ان سے یہ استفادہ ہوتا ہے کہ امامؑ نے ان کلمات کو جنگ جمل کے بعد بیان فرمایا ہے، اور اُن باتوں کی طرف بھی اشارہ ہے جو طلحہ و زبیر اور اُن کے حواریوں نے جنگ کے آغاز میں بیان کی تھیں۔ شور و غل کی صدائیں بلند کیں، لیکن آخر انجام ان کے حق میں آگے نہیں بڑھا اور ذلّت کے ساتھ شکست ہوئی اور طلحہ و زبیر کو اس راہ میں جان سے ہاتھ دھونا پڑے۔ امامؑ فرماتے ہیں:

[1] مصادر نہج البلاغہ لکھنے والے کہتے ہیں کہ نہج البلاغہ میں سیّد رضیؒ کے علاوہ ''واقدی'' نے بھی جنگ جمل کے خطبوں میں سے اسے حضرتؑ کا ایک خطبہ قرار دیا ہے۔ کتاب الجمل، ص ۱۷۷ میں مرحوم شیخ مفید نے واقدی کی کتاب الجمل سے نقل کیا ہے، ابن اعثم کوفی نے اپنی کتاب فتوحات میں بھی اس کا ذکر کیا ہے۔

https://downloadshiabooks.com/

"وَقَدْ اَرْعَدُوْا وَ اَبْرَقُوْا، وَمَعَ هٰذَیْنِ الْاَمْرَیْنِ الْفَشَلُ"

''اُنہوں نے گھن گرج اور چمک دکھائی، لیکن بالآخر شکست سے دوچار ہوئے۔''

یہ خوبصورت تشبیہ اُن بادلوں کی طرف اشارہ ہے جو رعدو برق (گرج چمک) کے ہمراہ ظاہر ہوتے ہیں اور لوگوں کو بارش کی خوشخبری دیتے ہیں، لیکن برسنے کے بجائے منتشر ہو جاتے ہیں۔

پھر حضرت امامؑ نے مزید فرمایا:

"وَلَسْنَا نُرْعِدُ حَتّٰی نُوقِعَ، وَلَا نُسِیْلُ حَتّٰی نُمْطِرَ"

''ہم جب تک دشمن پر بجلی بن کے نہیں گریں گے اور دشمن کو دھکیل نہیں دیتے، انہیں صرف باتوں کے دریا میں غرق نہیں کر سکتے۔''

یہاں یہ بتانا چاہتے ہیں کہ ہم جب تک دشمن پر کاری ضرب نہ لگائیں، ہمارے جوش میں کمی نہیں آئے گی اور میدان کارزار میں جب تک دشمن کا کام تمام نہیں کریں گے، شوروغل کی صدائیں بلند کرنے کا کوئی فائدہ نہیں ہے۔

درحقیقت یہ دونوں مختصر جملے دو مختلف گروہوں کو اجتماعی، عسکری اور سیاسی حوالے سے ظاہر کرتے ہیں۔ کچھ لوگ باتونی ہیں، جب میدان میں نکلتے ہیں تو شورشرابہ کرتے ہیں، لیکن عین لڑائی کے وقت میدانِ عمل میں سُستی، ناتوانی اور ناکامی کے علاوہ کچھ نہیں حاصل کر سکتے۔

دوسرا گروہ اہلِ کردار و عمل کا ہے؛ گفتگو کم کرتے ہیں اور کارنامے بہت زیادہ ہیں؛ خاموش رہتے ہیں لیکن مفید اور دلیر ہیں۔ انبیائے الٰہی، اولیائے خدا، راہِ حق کے مجاہدین اسی دوسرے گروہ سے ہیں۔ لیکن اہلِ باطل اور شیطان کے لشکر اکثر پہلے گروہ سے ہیں۔

یہاں ایک اہم نکتے کی طرف توجہ دینا ضروری ہے اور وہ یہ کہ رعدو برق (گرج چمک) بارش سے پہلے اور سیلاب بارش کے بعد ہے۔ گویا ایک ایسا گروہ ہے جو رعدو برق دکھاتے ہیں لیکن بعد میں بارش نہیں ہوتی۔ اُن سے بھی بدتر وہ گروہ ہے، جو بارش سے پہلے سیلاب لانا چاہتا ہے، یعنی اس گروہ کے افراد شکست و ناکامی کے بعد فتح و کامرانی کے دعویدار ہیں، یہ دونوں نااہل اور بے منطق افراد کے طریقے ہیں، پہلا گروہ جھوٹے دعویدار اور دوسرا گروہ جھوٹا پروپیگنڈا کرنے والے بے شرم و بے حیا لوگ ہیں۔

بعض روایات سے استفادہ ہوتا ہے کہ جب حضرت امامؑ کے پیغام رسانوں نے اُنہیں الٰہی ذمے داریوں کی بجا آوری اور مسلمانوں کے معاشرے کی طرف واپس لوٹنے اور بیعت پر عمل پیرا ہونے کی طرف دعوت دی، تو اُنہوں نے

https://downloadshiabooks.com/

حضرت امامؑ کے ساتھ جنگ کا اعلان کر دیا اور انتہائی بے شرمی سے پیغام بھیجا، جنگ کے لیے تیار ہو جاؤ! اور صراحت کے ساتھ حضرت امامؑ کو خبردار کیا، ان کے اس پیغام سے امامؑ ناراض ہوئے، اُن کی اس ناسمجھی اور دھمکیوں کا جواب دیتے ہوئے فرمایا: اب تک کوئی مردِ میدان پیدا نہیں ہوا اور کسی میں جرأت نہیں ہوئی جو مجھے جنگ کی خوفناکیوں سے ڈرا سکے۔ اس کے بارے میں خطبہ ۲۲ اور ۱۷۴ میں ذکر آئے گا۔

امامؑ کے مبارک کلام میں بارش سے خالی رعد و برق کے ذریعے خوف زدہ کرنے والوں کے ان چیلنجوں کی طرف اشارہ ہے جو اندر سے خالی اور احمقانہ جوشیلے نعرے لگاتے ہیں۔ [1]

نکات

۱۔ باعمل لوگ

جیسا کہ حضرت امامؑ کے مندرجہ بالا کلام میں آیا ہے اور پہلے اشارہ ہوا ''اولیاء اللہ'' کی مدیریت کی اصل بنیاد عمل ہے، وہ کبھی بھی شور و غل کرنے والے نہیں ہوتے، بلکہ انہوں نے اپنی بات کو ہمیشہ عمل سے ثابت کیا ہے۔

یہ ہستیاں ان اخلاقی خصوصیات کو اپنے اصحاب و انصار میں بھی منتقل کرتی تھیں۔ وہ قیل و قال کے بجائے سعی و تلاش کو اپناتے ہیں، اس معنی کا عملی نمونہ جنگ بدر کی داستان میں نظر آتا ہے، جب ابوسفیان کے لشکر نے مسلمانوں کی کم تعداد کو دیکھا تو انہیں یقین نہیں آ رہا تھا کہ رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اتنی کم تعداد کے ساتھ اُن کے مقابلے کے لیے آئیں گے اور وہ یہ سمجھ رہے تھے کہ اس سے زیادہ لوگ میدان میں آئے ہوں گے، جو میدان کے کسی حصے میں اُترائی یا چڑھائی میں روپوش ہوں گے، اس بنا پر ابوسفیان نے اپنے ایک سپاہی ''عمیر'' کو حکم دیا کہ وہ میدان کے اطراف میں کڑی نظر رکھے کہ کیا مسلمانوں کی تعداد وہی ہے، جو میدان میں نظر آ رہی ہے، عمیر سواری پر سوار ہو کر میدان کے گرد گھوما اور تمام جگہوں کو غور سے دیکھا، رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور اُن کے اصحاب و انصار کے چہروں پر نظر دوڑائی اور پھر ابوسفیان کے پاس آ کر کہنے لگا:

''مَا لَهُمْ كَمِيْنٌ وَلَا مَدَدٌ وَلٰكِنْ نَوَاضِحُ يَثْرِبَ قَدْ حَمَلَتِ الْمَوْتَ النَّاقِعَ اَمَا تَرَوْنَهُمْ خُرْسًا لَا يَتَكَلَّمُوْنَ، يَتَلَمَّظُوْنَ تَلَمُّظَ الْاَفَاعِيْ، مَا لَهُمْ مَلْجَأٌ اِلَّا سُيُوْفُهُمْ، مَا اَرَاهُمْ يُوَلُّوْنَ حَتّٰى يُقْتَلُوْا وَلَا يُقْتَلُوْنَ حَتّٰى يَقْتُلُوْا بِعَدَدِهِمْ فَارْتَئُوْا رَاْيَكُمْ فَقَالَ لَهُ اَبُوْ جَهْلٍ كَذَبْتَ وَجَبُنْتَ''

[1] مرحوم علامہ مجلسیؒ نے بحار الانوار، جلد ۳۲، ص ۲۰ اور ۱۸۸ پر چند روایات کے ضمن میں اُن کی دھمکیوں کی طرف اشارہ کیا ہے۔

https://downloadshiabooks.com/

''اُن کے پاس نہ کوئی کمیں گاہ ہے اور نہ ان کی مدد کرنے کوئی اور آنے والے ہیں۔ میرا خیال ہے کہ مدینے کے اُونٹ تمہارے لیے موت کا تحفہ لے کر آئے ہیں۔ کیا تم نہیں دیکھتے ہو کہ محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے سپاہی خاموش کھڑے ہیں اور گفتگو نہیں کررہے ہیں؟ اور خطرناک سانپوں کی مانند زبان کو منہ کے اطراف میں گھمارہے ہیں۔ انہیں یقین ہے کہ میدان کارزار میں ان کی تلواریں ہی انہیں بچا سکتی ہیں اور میں نہیں سمجھتا کہ وہ میدان چھوڑ کر بھاگیں گے، بلکہ صبر و استقامت سے کام لیں گے، یہاں تک کہ قتل ہوجائیں اور وہ لوگ قتل نہیں ہوں گے کہ جب تک اپنی تعداد کے برابر تمہارے لشکریوں کو قتل نہ کردیں گے یہ میرا عقیدہ ہے اور تم اپنے عزم وارادے پر بھی دوبارہ غور کرلو۔ ابوجہل اس پیغام سے کانپ اٹھا، لیکن ظاہری حالت کی حفاظت کرتے ہوئے کہا، تم جھوٹ بولتے ہو اور ڈر گئے ہو، جب کہ ایسی کوئی بات نہیں ہے۔''[1]

جنگ بدر کے نتیجے نے ثابت کیا کہ جو عمیر نے مسلمانوں کی حالت دیکھ کر نتیجہ اخذ کیا تھا، وہی صحیح تھا اور ابوجہل کا خیال درست نہیں تھا، یہ بات اس چیز سے کوئی تضاد نہیں رکھتی کہ انسان میدان جنگ میں بہادرانہ انداز میں رجز پڑھے اور دشمن کو اپنے الفاظ سے خوفزدہ کردے مشکل اُس وقت ہوتی ہے جب تمام جوش وجذبہ صرف رجز خوانی کی حد تک رہ جائے اور عملی طور پر کوئی نتیجہ نہ ہو۔ ہونا یہ چاہیے کہ ہمیشہ کام کی بنیاد عمل ہو، جب کہ گفتگو فرعی حیثیت رکھتی ہو، نیز عمل کے لیے معاون اور مددگار کی حیثیت میں استفادہ ہو، پہلے گروہ کے نمونے طلحہ وزبیر اور اُن کے حواری تھے اور دوسرے گروہ کا نمونہ حضرت امام علی علیہ السلام اور اُن کے ساتھی تھے۔ نہج البلاغہ کے خطبہ ۱۲۴ میں اس حوالے سے ایک روشن تعبیر دیکھنے میں آتی ہے کہ امامؑ نے اپنے سپاہیوں کو جنگی دستور دیتے ہوئے فرمایا:

''اَمِيتُوا الْاَصْوَاتَ فَاِنَّهُ اَطْرَدُ لِلْفَشَلِ

---

[1] بحارالانوار، جلد ۱۹، ص ۲۲۴

''جنگ کے دوران آواز کو خاموش رکھیں جو سُستی کو بہتر طریقے سے دور کرتی ہے۔''[۱]

۲۔شوروغل اور مفید و موثر تبلیغات کے درمیان فرق

ممکن ہے کہ بعض لوگوں کے لیے ان دونوں باتوں کا سمجھنا مشکل اور دشوار ہو کہ ایک طرف تو بے عمل گفتگو، فضول اور ہلکی باتوں سے روکا جا رہا ہے اور باعمل خاموشی کی تلقین کی جا رہی ہے اور دوسری طرف تبلیغ کے لیے بلند اور پُرشکوہ الفاظ استعمال کیے گئے ہیں اور دوستوں کا حوصلہ بڑھانے اور دشمنوں کی ہمتیں پست کرنے کے لیے میدانِ مقابلہ میں پُرشکوہ اور مفاخرانہ رجز، جو غزواتِ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور جمل، صفین اور نہروان میں امیر المومنین علی علیہ السلام نے دشمن کے مقابلے میں پڑھے۔ اس کے علاوہ دیگر ائمہ خصوصاً امام حسین علیہ السلام اور آپؑ کے اصحابؓ کے رجز جو انہوں نے میدانِ کربلا میں پڑھے، اسی طرح وہ دھمکی آمیز خطوط جو رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم یا امیر المومنینؑ نے اپنے دشمنوں کو لکھے جن میں بہت سخت الفاظ استعمال کیے گئے ہیں۔ ان دونوں مختلف رویّوں کی صحیح توضیح کس طرح ہو سکتی ہے؟

حقیقت یہ ہے کہ دونوں کی توضیح تھوڑے سے غور و فکر سے واضح ہو جاتی ہے، جس چیز کی ممانعت کی گئی ہے وہ صرف باتیں بنانا اور عمل نہ کرنا ہے، جس طرح ایسی بجلی جو چمکتی تو بہت ہے لیکن گرجتی نہیں اور ایسا بادل جس میں گرج تو بہت ہو لیکن وہ کبھی نہ برسے، گفتگو ہی سے واضح ہو جاتا ہے کہ ان تمام باتوں پر عمل کا کوئی امکان نہیں، زمین و آسمان قلابیں ملانا شیاطین اور

---

[۱] موجودہ دور کے ایک شاعر نے اس بات کو ایک بہت خوبصورت مثال سے واضح کیا ہے کہ صرف باتیں بنانے والی قوم کس طرح دشمن کی گرفت میں آجاتی ہے اور باعمل اور باکردار قومیں آزادی کی نعمت سے لطف اٹھاتی ہیں۔ وہ کہتے ہیں:

روزی می گفت بلبلی با باز — کزچہ حال تو خوشتر است از من
تو کہ زشتی وبد، عبوس ومہب — تو کہ لالی و گنگ و بستہ دہن!
مست وآزادروی سدت شھان — باد و صد ناز میکنی مسکن
من بدین ناطقی و خوش خوانی — با خوش اندامی و ظریفی تن
قفسم مسکن است ور وزم شب — بھرہ‌ام غصہ است و رنج و محن
بازگفتا کہ راست کمی گوئی — لیکن سرش بود بسی روشن
دأب تو گفتن است و ناکر دن — خوی من کردن است ناگفتن
اِک روز عندلیب نے شہباز سے کہا — تجھ سے زیادہ ہوں میں حسیں اور خوش ادا
پیہم سناتی رہتی ہوں نغمے بھی جاں فزا — تُو ہے مہیب صورت وخوں خوار، باخدا
اس پر تیرے ناز اٹھاتے ہیں بادشاہ — میں ہوں قفس میں قید مصیبت میں مبتلا
شہباز نے کہا کہ نہیں اس کا کوئی حل — تو صرف خوش نوا ہے، میں طائر ہوں باعمل
یہ زندگی عمل سے عبارت ہے عندلیب — اور جہدِ مستقل سے ہی راحت ہے عندلیب

https://downloadshiabooks.com/

ان کے پیروکاروں کا محبوب مشغلہ ہے،لیکن ان کے مقابلے میں ایسی جرأت مندانہ اور حق پر مبنی دھمکیاں، جو باغیوں اور سرکشوں کو اہلِ حق کی طرف سے دی جائیں، جن پر وہ عمل بھی کرنے کے لیے تیار ہوں اور یہ سب حقیقت پسندانہ ہوتو یہ نہ صرف مذموم نہیں ہیں، بلکہ دشمنوں سے جنگ کا ایک حصہ ہیں۔ البتہ یہ نکتہ واضح رہے کہ جنگ و نبرد کے دوران رجز خوانی اور دشمنوں کو دھمکانے میں پھرتیلے انسان کی توانائیاں صرف ہوتی ہیں جس کی وجہ سے دشمن پر حملہ کرنے کی طاقت اور توانائی میں کمی واقع ہوتی ہے،اسی بنا پر ان کاموں سے منع کیا گیا ہے۔

https://downloadshiabooks.com/

دسواں خطبہ

وَمِنْ كَلَامٍ لَهُ عَلَيْهِ السَّلَامُ

أَلَا وَإِنَّ الشَّيْطَانَ قَدْ جَمَعَ حِزْبَهُ، وَ اسْتَجْلَبَ خَيْلَهُ وَ رَجِلَهُ، وَإِنَّ مَعِي لَبَصِيرَتِي: مَا لَبَّسْتُ عَلَى نَفْسِي، وَ لَا لُبِّسَ عَلَيَّ. وَايْمُ اللهِ لَأُفْرِطَنَّ لَهُمْ حَوْضاً أَنَا مَاتِحُهُ لَا يَصْدِرُونَ عَنْهُ، وَ لَا يَعُودُونَ إِلَيْهِ.[1]

آگاہ ہو جاؤ! کہ شیطان نے اپنے گروہ کو جمع کر لیا ہے اور اپنے پیادہ وسوار سمیٹ لیے ہیں، لیکن پھر بھی میرے ساتھ میری بصیرت ہے، نہ میں نے کسی کو دھوکا دیا ہے اور نہ کوئی دھوکا کھایا ہے اور خدا کی قسم! میں ان کے لیے ایسے حوض کو چھلکاؤں گا، جس کا پانی نکالنے والا بھی میں ہی ہوں گا اور یہ نہ نکال سکیں گے اور نہ پلٹ کر آ سکیں گے۔

خطبہ، ایک نگاہ میں

یہ خطبہ بھی جنگ جمل کے ہولناک حوادث اور داستان کی طرف اشارہ ہے۔ امامؑ نے طلحہ اور زبیر کے لشکر کو شیطان سے تشبیہ دی ہے، پھر اس حوالے سے اپنی خصوصیات کی طرف بھی اشارہ کیا ہے، پھر اس کے بعد مختصر اور انتہائی سخت جملوں کے ذریعے سے جو دشمن کے لیے دھمکیوں کے ساتھ ہیں، اپنے آئندہ کے منصوبے کو بیان کیا، اور ایک پیشگوئی کے ذریعے اس خونیں جنگ کے نتیجے کو پہلے ہی سے بیان کر دیا ہے۔

[1] مصادر نہج البلاغہ میں آیا ہے کہ مرحوم مفیدؒ نے اس خطبے کو کتاب ارشاد کے ص ۱۱۸ پر نقل کیا ہے۔

https://downloadshiabooks.com/

شرح وتفسیر

مسلمانوں کے لیے انتباہ

جیسا کہ پہلے اشارہ ہوا، حضرت امامؑ کے اس خطبے میں گفتگو جنگ جمل کے بارے میں ہے۔ اس خطبے میں اور خطبہ نمبر ۲۲ میں جو ہم آہنگی اور ارتباط ہے اور اس سے زیادہ اس خطبے میں اور خطبہ ۱۳۷ میں جو یکسانیت ہے، گویا یہ واضح کرتا ہے کہ اس خطبے کا اُس خطبے میں ادغام ہوا ہے، اس امر میں کوئی تردید باقی نہیں رہتی کہ اس خطبے کا اصل ہدف جنگ جمل کی طرف اشارہ ہے، جن لوگوں نے اسے جنگ صفین اور لشکر شام سمجھا ہے، گویا اُنھوں نے اس ہم آہنگی کو مدّ نظر نہیں رکھا ہے۔

پہلا محور: اس خطبے میں پہلا محور طلحہ وزبیر کے لشکر کو شیطان کے لشکر سے تشبیہ دینا ہے۔ آپؑ فرماتے ہیں:

"اَلَا وَاِنَّ الشَّيْطَانَ قَدْ جَمَعَ حِزْبَهُ وَاسْتَجْلَبَ خَيْلَهُ وَرَجِلَهُ"

''آگاہ رہو! شیطان نے لشکر کو اپنے اردگرد اکٹھا کیا ہے اور اس کے سوار اور پیادہ سپاہی بلائے گئے ہیں۔''

کس طرح وہ لوگ شیطان کے لشکر سے نہیں ہوں، جبکہ اُنھوں نے اپنے امامؑ کے ساتھ عہد و پیمان کو توڑ ڈالا اور حصولِ اقتدار کی خاطر امّت مسلمہ میں منافقت اور اختلاف کو پھیلایا، اور ایک ایسی آگ جلائی جس میں بہت سارے لوگ جل گئے۔ آخرالامر وہ خود بھی اسی کا شکار ہوئے، حزب سے تعبیر کرنا اُن کے اہداف، شیطان کے اہداف کے ساتھ ہم آہنگ ہونے کی طرف اشارہ ہے۔ خَيْلَ کی تعبیر وہ لشکر جو سوار ہو، رَجِلَ لشکرِ پیادہ اُن کے لشکر کے مختلف ہونے کی طرف اشارہ ہے۔ قرآن مجید کی آیتوں میں بھی حزبِ شیطان کی طرف اشارہ ہوا ہے جیسا کہ ارشاد ربّ العزت ہے:

"اِنَّمَا يَدْعُوا حِزْبَهُ لِيَكُوْنُوا مِنْ اَصْحٰبِ السَّعِيْرِ"[1]

''شیطان اپنے گروہ کو اس لیے دعوت دیتا ہے، تاکہ وہ اہلِ دوزخ میں سے ہو جائیں''۔

دوسری جگہ آپؑ نے فرمایا:

"وَاَجْلِبْ عَلَيْهِمْ بِخَيْلِكَ وَرَجِلِكَ"[2]

شیطان کے سوار اور پیادہ لشکر کی طرف اشارہ کیا ہے اور انسانوں کو آزمانے کی خاطر شیطان کو مخاطب کیا

---

[1] سورۂ فاطر، آیت ۶

[2] سورۂ اسراء، آیت ۶۴ ترجمہ: اپنے لشکر کے سوار اور پیادوں کو ان پر مسلط کر دو۔

https://downloadshiabooks.com/

ہے۔قرآن میں بار باران خطرات کا ذکر کرنا اس لیے ہے کہ اہل ایمان اپنی آنکھوں اور کانوں کو کھول لیں، کہیں ایسا نہ ہو کہ وہ شیطان کے جال میں پھنس جائیں اور اُس گروہ میں سے ہوجائیں اور اُس کے سوار اور پیادہ لشکر میں قرار پائیں، لیکن شرمناک انجام نے طلحہ وزبیر اور اُن کے ساتھی اور پیروکاروں کو اپنی لپیٹ میں لیا، حصولِ اقتدار اور خواہشات پرستی کی وجہ سے وہ اس جال میں پھنس گئے۔

دوسرا محور: اس میں آپؑ نے اپنی خصوصیات کو بیان فرمایا:

"وَإِنَّ مَعِي لَبَصِيرَتِي مَا لَبَّسْتُ عَلَى نَفْسِي وَلَا لُبِّسَ عَلَيَّ"

''میں اپنی آگاہی اور بصیرت کے ہمراہ ہوں، نہ حقیقت کو اپنے لیے مشتبہ کیا اور نہ کوئی دوسری چیز کبھی مجھ پر مشتبہ ہوئی۔''

کسی بھی شخص کی گمراہی کا سرچشمہ درحقیقت ان تین چیزوں میں سے ایک ہے:

پہلی چیز: جو کام بھی کرنا چاہتا ہے اُس کے حوالے سے بصیرت اور آگاہی نہ رکھتا ہو اور بے خبری میں کسی معرکے میں داخل ہوجائے جو رضائے الٰہی اور فرمانِ حق کے خلاف ہو۔

دوسری چیز: آگاہی ہو، مگر خواہشات کی وجہ سے حقیقت کی آنکھوں پر کوئی پردہ آجائے، اور انسان کو اشتباہ سے دوچار کردے۔ بہت سارے ایسے بھی ہیں جو کسی چیز کے بارے میں جانتے ہیں کہ یہ گناہ ہے لیکن نفس کے وسوسوں اور شیطانی سوچوں کی بنا پر اپنے لیے کوئی جواز پیدا کرتے ہیں اور کبھی اُس گناہ کو ایک واجب ذمے داری تصور کرتے ہوئے اور اُس سے آلودہ ہوجاتے ہیں۔حق تعالیٰ فرماتا ہے:

"وَهُمْ يَحْسَبُونَ أَنَّهُمْ يُحْسِنُونَ صُنْعًا" [1]

''اور وہ اس خام وخیال میں ہیں کہ وہ یقیناً اچھے اچھے کام کررہے ہیں۔''

تیسری چیز: جنّ وانس خود شیاطین کو اجازت دیتے ہیں کہ وہ ان میں نفوذ کریں اور حقیقت کو ان پر مشتبہ کردیں، ان تینوں صفات میں سے ایک بھی آپؑ کے بابرکت وجود میں نہیں تھی، کیونکہ آپؑ نے تمام لغزشوں اور انحرافات کے دروازوں کو اندر اور باہر سے وسوسہ ڈالنے والوں کے لیے بند کردیا تھا اور ایسی ہوشیاری سے جو تقویٰ کے ساتھ مربوط تھی، حقیقت کو درک کرتے تھے اور اُسی کے سائے میں آگے بڑھتے تھے۔

نہج البلاغہ کے بعض شارحین نے کہا ہے "إِنَّ مَعِي لَبَصِيرَتِي" کی تعبیر اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ اس بصیرت سے میں نے رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو پہچانا، اور تمام اہم واقعات میں اُن کے ساتھ تھا۔ وہی بصیرت آج بھی میرے ہمراہ ہے اور

---

[1] سورۂ کہف، آیت ۱۰۴

https://downloadshiabooks.com/

میری راہ میں ایک ضوفشاں چراغ کی مانند ہے۔اس جملے کو آیۂ مجیدہ کی طرف اشارہ سمجھتے ہیں کہ ربّ ذوالجلال فرماتا ہے:

"قُلْ هٰذِهٖ سَبِيْلِيْۤ اَدْعُوْۤا اِلَى اللّٰهِ عَلٰى بَصِيْرَةٍ اَنَا وَمَنِ اتَّبَعَنِيْ" [۱]

"کہو کہ یہ میرا راستہ ہے، میں اور میرے پیروکار کامل بصیرت کے ساتھ لوگوں کو خدا کی طرف دعوت دیتے ہیں۔"

حضرت امام علی رضا علیہ السلام کی ایک حدیث مبارکہ ہے:

"لَنَا اَعْيُنٌ لَا تَشْبَهُ اَعْيُنَ النَّاسِ وَفِيْهَا نُوْرٌ لَيْسَ لِلشَّيْطَانِ فِيْهَا نَصِيْبٌ" [۲]

"ہمیں ایسی چشمِ بینا عطا کی گئی ہے جو عام انسانوں کی چشم سے مشابہ نہیں ہے اور اس میں ایسا نور ہے کہ شیطان کی اس تک رسائی نہیں ہے"۔

بعض شارحین اس کے معتقد ہیں کہ دوسرا اور تیسرا جملہ جن میں آپ فرماتے ہیں،"نہ میں نے خود (جان بوجھ کر) کبھی اپنے آپ کو دھوکا دیا نہ مجھے کبھی کسی نے دھوکا دیا، پہلے جملے،جس میں آپؑ فرماتے ہیں، اِنَّ مَعِيْ لَبَصِيْرَتِيْ "میری بصیرت اور آگاہی ہمیشہ میرے ساتھ رہی ہے"، کی تفسیر ہے۔لیکن جو تفسیر پہلے کی گئی ہے وہ زیادہ قابلِ قبول ہے، یہ نکتہ بھی قابلِ غور ہے کہ امامؑ پہلے فرماتے ہیں:"میں نے کبھی اپنے آپ کو دھوکا نہیں دیا" اس کے بعد فرماتے ہیں، نہ کبھی کسی نے مجھے دھوکا دیا ہے، یہ ایک فطری ترتیب ہے کہ پہلے انسان خود اپنے آپ کو اپنے نفس کے دھوکے اور فریب سے بچائے تا کہ دوسرے دھوکے اور فریب اس پر حاوی نہ ہو سکیں۔

تیسرا محور: اس میں جنگ جمل کے انجام کی واضح نشاندہی کی اور اپنے مخالفوں کو سخت تنبیہہ کرتے ہوئے فرمایا:

"وَاَيْمُ [۳] اللّٰهِ لَاُفْرِطَنَّ [۴] لَهُمْ حَوْضًا اَنَا مَاتِحُهٗ [۵] لَا يُصْدِرُوْنَ عَنْهُ وَلَا يَعُوْدُوْنَ اِلَيْهِ"

"خدا کی قسم! میں ان کے لیے ایک ایسا حوض چھلکاؤں گا جس سے صرف میں ہی پانی نکال سکوں گا (اور اس کا انجام یہ ہوگا کہ دوسرے تمام اس میں غرق ہو جائیں گے) اور دوسرے اس سے کبھی باہر نہیں آسکیں گے اور اگر کچھ باہر آ گئے تو

---

[۱] سورۂ یوسف، آیت ۱۰۸

[۲] بحار الانوار، جلد ۲۶، ص ۶۶

[۳] ایم، بعض صاحبان لغت کے مطابق یہ لفظ یمین کی جمع ہے اور قسم کے معنی میں آتا ہے۔

[۴] افرطنّ مادّہ افراط سے حد سے زیادہ تجاوز کرنے کے معنی میں ہے۔تفریط کے مدمقابل کبھی کسی چیز کے حد اکثر کو انجام دینے کے معنی میں بھی آیا ہے۔اُوپر کے جملے میں اسی معنی کی طرف اشارہ ہے۔

[۵] ماتح دراصل کسی چیز کو کھینچنے کے معنی میں ہے، پھر اُس شخص کو جو پانی بھرنے کے لیے رسی کو کنویں میں ڈال دیتا ہے اُسے ماتح کہا گیا ہے۔ماتح کے مدمقابل اُس شخص کو کہا جاتا ہے جو کنویں کے نیچے جا کر برتن کو پانی سے پُر کرتا ہے۔بعض کے کہنے پر نیچے کے مدمقابل اُوپر والے کو ماتح کہا جاتا ہے جو پانی کو کنویں کے اوپر کی طرف کھینچتا ہے اور وہ جو نیچے ہے اُسے ماتح یعنی نیچے سے اوپر کی طرف پانی لے کر جاتا ہے۔

https://downloadshiabooks.com/

کبھی دوبارہ اس طرف پلٹ کر نہیں آسکیں گے (اور کبھی دوبارہ ایسی جگہ قدم رکھنا بھول جائیں گے)''

درحقیقت امامؑ نے میدان جنگ کو ایک ایسے حوض یا کنویں سے تشبیہ دی ہے، جسے حدِ امکان تک پانی سے بھر دیا گیا ہو جس سے چھٹکارہ ناممکن ہو اور عمل کا دارومدار مکمل طور پر ایک فرد کے ہاتھ میں ہو جملہ انا ماتحہ میں ماتح کے معنی ایسے شخص کے ہیں جو کنویں سے پانی اوپر کھینچتا ہو۔

مولاؑ ارشاد فرما رہے ہیں کہ صرف میں ہی اس سے فائدہ اٹھانے والا ہوں، اس سے اس نتیجے کی طرف بھی اشارہ ہے کہ لشکریانِ جمل (طلحہ و زبیر کا لشکر) ایسی آفت میں گرفتار ہو جائیں گے کہ انہیں راہِ فرار نہیں ملے گی اور اگر کچھ تھوڑا سا گروہ مفرور ہونے میں کامیاب ہو بھی گیا تو انہیں ایسا عبرتناک سبق مل چکا ہوگا کہ دوبارہ کبھی ایسی جرأت نہیں کریں گے اور تمام زندگی اس سبق کو فراموش نہیں کرسکیں گے۔ ''لَاُفْرِطَنَّ'' کے جملے کا مفہوم یہ ہرگز نہیں ہے کہ میں اس بارے میں افراط کروں گا، بلکہ ارشاد یہ ہے کہ میں حدِ امکان تک یہ کوشش کروں گا کہ دشمنوں کی تمام راہوں اور چالوں کو روک دوں (غور کیجیے) اسی وجہ سے حضرت عائشہ جو جنگ جمل کی اصل بنیاد اور بانی تھیں، آئندہ تمام عمر باقی کسی جنگ میں حصہ نہ لے سکیں اور ایسے واقعات کو دوبارہ دوہرانا بھول گئیں۔

نکتہ

شیطان کے لشکر

اوپر کے خطبے سے معلوم ہوتا ہے کہ شیطان گمراہ کرنے کے منصوبے میں تنہا نہیں ہے، بلکہ کئی لشکر ہیں، جنہیں اوپر کے خطبے میں سوار اور پیدل خیل ورجل سے تعبیر کیا گیا ہے۔ اسی طرح معاونین اور ہم عقیدہ بھی ہیں، جنہیں حزبِ شیطان کہا گیا ہے، جیسا کہ ہم نے کہا کہ یہ دونوں تعبیرات قرآنی ہیں کہ خیل کبھی گھوڑوں اور کبھی گھوڑا سوار کے معنی میں آیا ہے، جبکہ یہاں دوسرے معنی مراد ہیں، البتہ شیطان کے پاس آج کل کی مسلح افواج اور عصری تقاضوں کی مانند سوار اور پیدل لشکر نہیں ہیں، لیکن ہم جانتے ہیں کہ اُس کی اپنی ہی صنف اور بنی آدم میں سے لوگوں کو گمراہ کرنے کے لیے معاونین ہیں۔ یہاں تک کہ موجودہ مختلف احزاب سوار اور پیدل لشکر جو ظالم و جابر حکمرانوں کے ماتحت ہیں، وہی حزب شیطان کے سوار اور پیدل لشکر ہیں۔ کچھ گروہ جو تیز اور کارآمد ہیں، شیطان کے سوار لشکری ہیں اور وہ جو کمزور اور کم اثر ہیں، وہ شیطان کا پیدل لشکر ہے۔ کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ ایک انسان جو خود شیطان کے لشکر کا سپہ سالار ہو، اس حقیقت سے آگاہ نہ ہو، بلکہ بزعمِ خود اپنے آپ

https://downloadshiabooks.com/

کو ''حزب اللہ'' میں شامل تصور کرتا، ہو جبکہ درحقیقت وہ ''حزبُ الشیطان'' میں شامل ہوتا ہے، راہِ حق کے راہ رو خود کو خدا کے حوالے کریں اور اُسی کی سر پرستی مین آ جائیں، تا کہ قولِ خدا:

''اَللّٰهُ وَلِيُّ الَّذِيْنَ آمَنُوْا يُخْرِجُهُمْ مِنَ الظُّلُمَاتِ إِلَى النُّوْرِ''

کے مطابق شیطانی وسوسوں کی تاریکیوں سے نکل کر ایمان اور تقویٰ الٰہی کے نورانی راستے پر گامزن ہو جائیں اور خود کو مکمل طور پر الٰہی عنایت کے سائے میں قرار دیں، تا کہ بہ قولِ خداوندی:

''اِلٰهِيْ لَا تَكِلْنِيْ إِلَى نَفْسِيْ طَرْفَةَ عَيْنٍ أَبَدًا''

''خدایا! مجھے ایک لمحہ کے لیے بھی میرے حال پر نہ چھوڑنا۔''

خدا ان کے امور کی اصلاح کا ذمّے دار ہو اور ان کی ہدایت کا ضامن ہو۔ اس مقام تک رسائی حاصل کرنے کی شرط وہی ہے، جو مولاؑ نے اوپر کے خطبے میں بیان فرمائی، یعنی تا حدِ امکان بصیرت، معرفت اور شناخت کو اپنے ہمراہ رکھے۔ اپنی ذات کی دھوکا دہی سے اجتناب اور دوسروں کے وسوسوں اور فریب میں قرار پانے سے خبردار رہے۔

https://downloadshiabooks.com/

گیارہواں خطبہ

وَمِنْ كَلَامٍ لَهُ عَلَيْهِ السَّلَامُ

لِابْنِهِ مُحَمَّدِ بْنِ الْحَنَفِيَّةِ لَمَّا أَعْطَاهُ الرَّايَةَ يَوْمَ الْجَمَلِ

میدانِ جمل میں لشکر کا علم دیتے ہوئے اپنے فرزند محمد بن حنفیہ رضی اللہ عنہ سے فرمایا:

تَزُولُ الْجِبَالُ وَ لَا تَزُلْ عَضَّ عَلَى نَاجِذِكَ أَعِرِ اللهَ جُمْجُمَتَكَ تِدْ فِي الْأَرْضِ قَدَمَكَ ارْمِ بِبَصَرِكَ أَقْصَى الْقَوْمِ وَ غُضَّ بَصَرَكَ وَ اعْلَمْ أَنَّ النَّصْرَ مِنْ عِنْدِ اللهِ سُبْحَانَهُ۔

خبردار! پہاڑ اپنی جگہ سے ہٹ جائے، تم نہ ہٹنا، اپنے دانتوں کو بھینچ لینا، اپنے سر کو اللہ کے حوالے کر دینا، زمین میں قدم گاڑ دینا، نگاہ آخری صفوں پر رکھنا، آنکھوں کو بند رکھنا اور یہ یاد رکھنا کہ مدد اللہ ہی کی طرف سے آنے والی ہے۔

خطبہ، ایک نگاہ میں

روایات سے استفادہ ہوتا ہے کہ امیر المومنینؑ نے بہت کوشش کی کہ جمل کے میدان میں کوئی خون خرابہ نہ ہو اور مسلمانوں کا وہاں خون نہ بہے، لیکن جب آپ پر جنگ مسلط کی گئی تو آپؑ نے اس دن پرچم اسلام اپنے فرزند ارجمند محمد بن حنفیہ رضی اللہ عنہ کے ہاتھ میں دیا اور نمازِ صبح سے ظہر تک پھر صلح کی کوشش، جنگ سے باز رکھنے اور لوگوں کو اپنے کیے ہوئے عہد و پیمان کی طرف پلٹنے کی ترغیب اور دعوت دیتے رہے اور حضرت عائشہ سے مخاطب ہوتے ہوئے فرمایا:

''خداوند متعال نے قرآن مجید میں آپ کو اور پیغمبر اکرمؐ کی تمام بیویوں کو اپنے گھروں میں رہنے کا حکم دیا ہے، آپ اُن کے ہاتھوں میں نہ کھیلیں، اللہ سے ڈریں! اور اُس کے فرمان پر اطاعت کرتے ہوئے گھر واپس جائیں۔''

اس کے بعد بیعت شکن طلحہ و زبیر کی طرف رخ کر کے فرمایا: تم لوگ اپنی ناموس اور بیویوں کو تو گھر میں محفوظ چھوڑ آئے ہو اور رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی گھر والی کو سب کے سامنے میدان میں لے کر آگئے ہو! اور لوگوں کو ورغلاتے ہوئے کہتے ہو کہ ہم خونِ عثمان کا بدلہ لینے کے لیے یہاں آئے ہیں، کیا خلافت کو سقیفہ کی خود ساختہ شوریٰ اور کمیٹی کے حوالے کرنا چاہتے ہو؟

https://downloadshiabooks.com/

(جب کہ لوگوں نے اپنا انتخاب کر دیا ہے اور تم دونوں بھی ان لوگوں میں سے ہو، جنہوں نے سب سے پہلے خلیفۂ وقت کے ہاتھ پر بیعت کی تھی) پھر زبیر سے فرمایا: اے زبیر! کیا تجھے وہ وقت یاد ہے کہ ایک دن ہم مدینے میں کسی جگہ بیٹھے ہوئے باتیں کر رہے تھے اور تم مسکرا رہے تھے۔ اُس وقت رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے تم سے پوچھا تھا کہ کیا علیؑ سے محبت کرتے ہو؟ تو تم نے جواب میں کہا تھا کہ کس طرح میں ان سے محبت نہ کروں، ہم دونوں میں رشتے داری کی محبت اور خدا کی محبت دوسروں سے زیادہ ہے۔ یہاں پر رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا تھا: آنے والے وقتوں میں تم ان سے لڑو گے اور ظالموں میں شمار ہو گے، تو تم نے کہا تھا، اس قسم کے کام کی انجام دہی سے خدا کی ذات سے پناہ مانگتا ہوں، امیر المومنین علیہ السلام نے نصیحت جاری رکھی اور پروردگار کے حضور عرض کیا: پروردگارا تو شاہد اور گواہ رہنا، میں نے ان پر حجت تمام کی ہے اور ان کو مہلت دی۔ پھر قرآن مجید کو اٹھایا اور مسلم مجاشعی کے ہاتھ میں دے کر ان سے فرمایا: تم جا کر اس آیت کو ان کے لیے پڑھو:

"وَإِنْ طَائِفَتَانِ مِنَ الْمُؤْمِنِينَ اقْتَتَلُوا فَأَصْلِحُوا بَيْنَهُمَا"۔[۱]

"اگر مومنین میں سے دو گروہوں میں جھگڑا اور فساد ہو جائے تو ان کی آپس میں صلح کرا دو۔"

مسلم مجاشعی دشمن کی فوج کے نزدیک ہو گئے اور قرآن مجید کو سیدھے ہاتھ میں اٹھا کر آیۂ کریمہ کی تلاوت کی، جواب میں دشمنوں نے ان پر حملہ کر دیا اور ان کا دایاں ہاتھ کاٹ دیا، انہوں نے فوراً قرآن مجید کو بائیں ہاتھ میں لیا اور انہوں نے ان کا دوسرا ہاتھ بھی قطع کر دیا۔ مسلم نے قرآن کریم کو دانتوں میں لیا اور گرنے سے بچا لیا تو دشمنوں نے انہیں شہید کر دیا، اس موقع پر امام علیؑ نے فرمایا:[۲]

"اب ہم پر دشمن سے جنگ کرنا واجب، خون بہانا مباح اور ان کی گردنیں اڑانا لازم ہو گیا ہے۔"

بہر حال اس خطبے میں امام علی علیہ السلام فنونِ جنگ کے اہم راز اور نکات جن سے ایک مسلمان سپاہی ذہنی وجسمانی طور پر مضبوط ہوتا ہے، بیان فرماتے ہیں۔ یہ کلام سات جملوں پر مشتمل ہے:

پہلے جملے میں لڑائی کے میدان میں مقاومت کے لیے ایک مکمل دستور دیا ہے، پھر دوسرے تا پانچویں جملے میں جنگ کی جزئیات، باریکیاں اور وہ امور جو استقامت و کامیابی پر مشتمل ہیں، کی طرف اشارہ ہے، ساتویں اور آخری جملے میں اللہ کی طرف توجہ اور اُس ذات پر توکّل اور اس بات کا یقین ہو کہ کامیابی ہر حال میں اسی کی طرف سے عطا ہوتی ہے، تا کہ قدرت اور قوتِ ایمان کے ساتھ جنگی سختیاں اور مشکلات قابل تحمل ہو جائیں، اور دشمنوں سے مقابلے کے لیے گھمسان کی لڑائی اعلیٰ

---

[۱] سورۂ حجرات، آیت ۹

[۲] منہاج البراعۃ خوئی، جلد ۳، ص ۱۶۷، ۱۶۹

https://downloadshiabooks.com/

ترین حد تک پہنچ جائے۔

شرح وتفسیر

چٹان کی طرح کھڑے رہو

جس طرح اوپر اشارہ ہوا کہ اس خطبے میں جنگ جمل کے بارے میں گفتگو کی گئی ہے، امام علیؑ نے پرچم اسلام کو اپنے شجاع فرزند محمد بن حنفیہ رضی اللہ عنہ کے سپرد کیا اور جنگی دستورات میں سے اہم، مؤثر و دلنشین اور انتہائی مختصر باتیں سات جملوں میں ان کے لیے بیان فرمائی ہیں:

۱۔ پہلا جملہ جو آپؑ نے فرمایا:

تَزُوْلُ الْجِبَالُ وَلَا تَزُلْ [۱]

”اگر پہاڑ بھی اپنی جگہ چھوڑ دیں، تم اس وقت بھی اپنی جگہ سے حرکت نہ کرنا۔“

دراصل جنگ کے میدان میں سب سے بڑا مسئلہ استقامت کے ساتھ جمے رہنا ہے کہ جس کے بغیر کامیابی تک پہنچنا ممکن نہیں، اور امام علیؑ نے اپنی گفتگو کے آغاز میں اسی اہم مسئلے کی طرف اشارہ فرمایا ہے، یہ جملہ شاید مومن کے بارے میں نقل ہونے والی اس معروف حدیث کے مضمون کی طرف اشارہ ہے کہ جس میں فرماتے ہیں:

”اَلْمُؤْمِنُ كَالْجَبَلِ الرَّاسِخِ لَا تُحَرِّكُهُ الْعَوَاصِفُ“

”باایمان آدمی اس پہاڑ کی طرح جم جاتا ہے، جسے تند و تیز طوفان اور ہوا ہلا نہیں سکتے۔“

پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ایک اور حدیث بیان فرماتے ہیں:

”اَلْمُؤْمِنُ اَشَدُّ فِيْ دِيْنِهِ مِنَ الْجِبَالِ الرَّاسِيَةِ وَ ذٰلِكَ اَنَّ الْجَبَلَ قَدْ يُنْحَتُ مِنْهُ وَ الْمُؤْمِنُ لَا يَقْدِرُ اَحَدٌ عَلٰى اَنْ يَنْحَتَ مِنْ دِيْنِهِ شَيْئًا“ [۲]

”مومن اپنے دین پر پہاڑوں سے زیادہ مضبوطی سے جمے ہوئے کھڑے ہیں، کیوں کہ پہاڑ کو کبھی توڑا یا کاٹا

---

[۱] نہج البلاغہ کے بعض شارحین نے کہا ہے کہ اوپر کی عبارت معنی کے لحاظ سے ایک جملہ شرطیہ ہے اور تقدیر میں ”لو زالت الجبال لا تزل“ پوشیدہ ہے۔ (شرح ابن میثم، جلد ۱، ص ۲۸۷)

[۲] سفینۃ البحار، مادّہ امن۔

https://downloadshiabooks.com/

جا سکتا ہے، مگر مومن کے دین سے کوئی چیز توڑی یا کاٹی نہیں جا سکتی ہے''۔

اس کے بعد امامؑ اس کلّی روش سے آگے نکل کر اُن جزئیات کو بھی بیان کرتے ہیں، جو اس سلسلے میں مؤثر اور کارساز ہیں۔

۲۔ دوسرا جملہ فرمایا: "عَضَّ عَلٰی نَاجِذِكَ" یعنی اپنے دانتوں کو بھینچ لینا۔ "نَاجِذ" کبھی ان دانتوں کے معنی میں آتا ہے جو "انیاب" یعنی کچے دانت کے بعد پیدا ہوتے ہیں، اور کبھی عقل ڈاڑھ کے معنی میں آیا ہے، اور کبھی پورے دانتوں کے معنی میں اور یہاں معنی سوم تمام دانت مراد ہیں، کہتے ہیں کہ دانتوں کو بھینچ لینے سے دو فائدے حاصل ہوتے ہیں:

پہلا فائدہ: یہ کہ ڈر اور وحشت اس سے دور ہو جاتی ہے یہی وجہ ہے کہ انسان جب خوف و وحشت سے لرزہ براندام ہو، اس وقت دانتوں کو مضبوطی سے بھینچ لے تو لرزہ کم یا پھر مکمل طور پر ختم ہو جاتا ہے۔

دوسرا فائدہ: سر کی ہڈیوں کو آپس میں محکم کر دیتا ہے اور دشمن کے پے در پے وار کے مقابل نقصان کم پہنچتا ہے۔ نہج البلاغہ کے کسی دوسرے خطبے میں اس جیسے معنی والا ایک اور جملہ بھی آیا ہے فرماتے ہیں:

"وَعَضُّوا عَلَى الْأَضْرَاسِ فَإِنَّهُ أَنْبَأُ لِلسُّيُوفِ عَنِ الْهَامِ"[1]

''دانتوں کو بھینچ لو، اس لیے کہ یہ سر پر تلوار کے وار کا اثر کم کر دیتا ہے۔''

۳۔ تیسرے جملے میں انتہائی خوبصورت مثالوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

"أَعِرِ اللهَ جُمْجُمَتَكَ"

''اپنے سر کو عاریتاً خدا کے حوالے کر دو۔''

یہ اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ خدا کی راہ میں ایثار و قربانی اور شہادت کے لیے تیار رہو، یہی آمادگی شجاعت و شہامت اور استقامت کی علامت و سبب ہے۔ نہج البلاغہ کے بعض شارحین نے اس جملے سے حضرت محمد بن حنفیہ رضی اللہ عنہ کے جنگ جمل سے صحیح سلامت واپس پلٹ آنے کی بشارت اور پیش گوئی مراد لی ہے، یعنی یہ فرمایا ہے کہ تم اس میدانِ جنگ سے صحیح و سالم بچ کر نکل آؤ گے، کیوں کہ عاریت کا مفہوم جنگ میں گھرے آدمی کا بچ کر واپس آنا ہے۔

۴۔ چوتھے جملے میں آپؑ نے فرمایا:

"تِدْ فِي الْأَرْضِ قَدَمَكَ"

''اپنے قدموں کو زمین میں کیل کی طرح گاڑ دو۔''

یہ اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ میدان سے عقب نشینی اور فرار کا سوچنا بھی نہیں، بلکہ دشمنوں کے سامنے ثابت

---

[1] نہج البلاغہ، خطبہ ۱۲۴

https://downloadshiabooks.com/

قدم رہنا۔اسی طرح مومنین کوقرآن مجید یہ حکم دیتا ہے:

"يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا إِذَا لَقِيتُمْ فِئَةً فَاثْبُتُوا"

''اے ایمان والو! جب میدانِ جنگ میں کسی گروہ کا سامنا ہو جائے تو اپنے قدم جمائے رکھو۔''[1]

جملہ اوّل میں اور اس جملے میں فرق ہے، ممکن ہے جملہ اوّل فکری لحاظ سے غیر متزلزل اور اس کیفیت کو بیان کرتا ہو اور جملہ دوّم ظاہری اور جسمانی طور پر پیچھے ہٹنے اور فرار نہ کرنے کو ظاہر کرتا ہو۔

۵۔ پانچویں جملے میں ارشاد فرماتے ہیں: "اِرْمِ بِبَصَرِكَ أَقْصَى الْقَوْمِ"

''تمہاری نظر دشمن کی فوج کی آخری صفوں پر ہونی چاہیے۔''

یہ نگاہ پورے جنگ کے میدان میں اور دشمن کے لشکر کی نقل وحرکت پر نظر رکھنے کا سبب بنتی ہے اور جنگی ساز وسامان میدان میں جہاں پر بھی موجود ہیں، پیشِ نظر رکھ سکتے ہیں اور ان کی تعداد و کیفیت سے آگاہی حاصل ہو سکتی ہے، اور اپنے جنگی یا دفاعی ساز وسامان کی درست طریقے سے چھان بین کر سکتے ہیں۔

۶۔ چھٹے جملے میں آپؑ فرماتے ہیں: "وَغُضَّ بَصَرَكَ" اپنی نظروں کو جمائے رکھو۔ دشمن کے تمام لشکر اور جنگی ساز وسامان (ایمونیشن) کو دیکھنے کے بعد ان کے اور فوج کی نقل حمل پر اپنی نظریں جمائے رکھو! اور اس میں کوتاہی نہ کرو۔ اس جملے کے دو معنی ہیں:

حقیقی معنی: یہ کہ خود میدان میں جا کر جنگی علاقوں کی بار بار اور دور، دور تک جانچ پڑتال کرو، اور ان علاقوں پر مسلسل نظر رکھو! تم پر کبھی ان کے لاؤلشکر اور جنگی ساز وسامان کی وجہ سے خوف ورعب نہیں آنا چاہیے، اور تم صرف اپنے اطراف میں مشغول نہ رہو۔

یہاں اس بات کی طرف توجہ رہے کہ ''غُضّ'' آنکھوں کو بند کرنے کے معنی میں نہیں آیا ہے، بلکہ دشمن کی جنگی قوت و طاقت کا غلط اندازہ، اور جانچ پڑتال میں کوتاہی نہ کرنا ہے۔

کنائی معنی: دشمن کی تعداد اور ساز وسامان سے لاپروا ہو جاؤ، اور ان پر اپنی نظر گاڑے رکھو، شجاعت و شہامت اور یقین کے ساتھ دشمن کی صفوں پر زوردار حملے کرو، اس معنی کی تائید میں نہج البلاغہ کے ایک خطبے میں یہ جملہ آیا ہے فرماتے ہیں:

---

[1] سورۂ انفال، آیت ۴۵

https://downloadshiabooks.com/

"وَغُضُّوا الْاَبْصَارَ فَاِنَّهُ اَرْبَطُ لِلْجَاْشِ وَاَسْكَنُ لِلْقُلُوبِ"۔[۱]

''اپنی نظریں نیچی رکھو، تاکہ تمہارا دل قوی تر ہو جائے اور تمہاری روح کو آرام ملے۔''

۷۔ساتویں اور آخری جملے میں فرماتے ہیں:

"وَاعْلَمُوا اَنَّ النَّصْرَ مِنْ عِنْدِ اللهِ سُبْحَانَهُ"

''تم جان لو کہ مدد اور کامیابی دینے والی صرف اللہ ہی کی ذات ہے۔''

اس جملے میں ایک بہت اہم اور بنیادی، معنوی اور روحانی نکتہ موجود ہے، جو نفوس کی قوت اور ان کے آرام کا سبب بنے گا، یہ جو کچھ بیان ہوا، صرف مقدمہ اور اسباب ظاہری شمار ہوتا ہے، لیکن اس میں سب سے زیادہ جو چیز، اہم تر ہے وہ خدا وند متعال کا ارادہ ہے اور مدد و کامیابی کا حصول اُسی ذات سے ممکن ہے، اُس پر توکل کرو، اُس سے دل لگاؤ، توفیق کی اس سے دعا کرو، وہ ہر چیز پر قدرت رکھتا ہے، اور توانا ہے۔ مجاہد اور باایمان لوگوں پر وہ رحیم و مہربان ہے، قرآن مجید میں ارشاد ہوتا ہے:

"وَمَا النَّصْرُ اِلَّا مِنْ عِنْدِ اللهِ الْعَزِيزِ الْحَكِيمِ"۔[۲]

''کامیابی صرف خداوند حکیم ہی کی طرف سے ہوتی ہے۔''

قابل توجہ بات یہ ہے کہ قرآن مجید اس آیت کے شروع میں فرشتگان الٰہی کی طرف سے نصرت کا ذکر کیا ہے، مگر آیت کے آخری حصے میں فرماتا ہے، یہ گمان بھی نہ کرنا کہ کامیابی اور مدد کرنا فرشتوں کے ہاتھ میں ہے، بلکہ مدد و کامیابی عطا کرنا صرف قادرِ مطلق و توانا پروردگار کے ہاتھ میں ہے۔

نکات

حضرت محمد بن حنفیہؒ کون ہیں؟

آپؒ حضرت امیر المومنینؑ کے فرزند ارجمند تھے اور حنفیہ ان کی والدہ کا لقب تھا، جن کا نام خولہ تھا، آپ قوم بنی حنیفہ کے ایک عزت دار گھرانے کی بیٹی تھیں اور اسلامی جنگوں میں سے کسی ایک جنگ میں اسیر ہو کر آئیں اور خلیفہء وقت

---

[۱] نہج البلاغہ، خطبہ ۱۲۴

[۲] سورۂ آل عمران، آیت ۱۲۶

https://downloadshiabooks.com/

چاہتے تھے کہ انہیں بیچ ڈالیں، آپؑ نے انہیں خرید کر آزاد کر دیا اور بعد میں ان سے عقد کیا، اوران سے حضرت محمد بن حنفیہ رضی اللہ عنہ کی ولادت ہوئی، حضرت محمد بن حنفیہ رضی اللہ عنہ کو شجاعت و شہامت امام علیؑ سے ورثے میں ملی تھی، کہتے ہیں کہ کبھی کبھی محکم و مضبوط زرہوں کو ہاتھ سے ٹکڑے ٹکڑے کر دیتے تھے، یہی وجہ تھی جنگ جمل میں امام علی علیہ السلام نے اسلام کے پرچم کو ان کے سپرد کر دیا، اور جنگ صفین میں آپؑ کے بائیں ہاتھ کے فوجی دستوں کی سالاری حضرت محمد بن حنفیہ رضی اللہ عنہ اور حضرت محمد رضی اللہ عنہ بن ابی بکر اور ہاشم مرقال رضی اللہ عنہ کر رہے تھے۔ آپؓ امام حسن اور امام حسین علیہما السلام سے بہت محبت کرتے اور ان کی نسبت انتہائی احترام و متواضع رہتے تھے اور دیگر فرزندان علی و فاطمہ علیہا السلام کا بھی بہت احترام کرتے تھے، ایک دن کسی نے آپؓ سے کہا کہ علیؑ آپ کو خطرناک ترین جنگوں میں بھیج دیتے ہیں اور حسن و حسین علیہما السلام کو بٹھائے رکھتے ہیں، جب کہ وہ بھی آپ کے بھائی ہیں، آپ رضی اللہ عنہ نے ان کو جواب دیا، حسن و حسین علیہما السلام امیر المومنینؑ کی آنکھوں کی طرح ہیں اور میں آپؑ کے بازوؤں کی طرح ہوں اور انسان ہمیشہ طاقتور بازوؤں کی مدد سے ہی اپنی آنکھوں کی حفاظت اور دفاع کرتا ہے۔

بعض نے آپؓ پر تہمت لگائی کہ امام حسین علیہ السلام کی شہادتِ عظمیٰ کے بعد آپ نے امامت کا دعویٰ کیا، یہاں تک کہ دعوائے مہدویت بھی کر ڈالا، لیکن شیخ مفیدؒ نے اس بارے میں روشن و واضح کر دیا کہ حضرت محمد بن حنفیہ رضی اللہ عنہ نے کبھی امامت کا دعویٰ نہیں کیا، اور نہ کبھی کسی کو اپنی طرف بلایا، بلکہ دوسروں نے آپ رضی اللہ عنہ کی نسبت ایسی جھوٹی باتیں کی ہیں، اور ان جھوٹے لوگوں نے اپنی طرف سے امامت کا عہدہ آپ رضی اللہ عنہ کے لیے قرار دیا گویا کہ وہ لوگ آپ رضی اللہ عنہ کی امامت یا مہدویت کے قائل ہو گئے، اور کیسانیہ کی قوم اس قسم کے دعوے کرنے میں شامل ہے۔

حضرت محمد بن حنفیہ رضی اللہ عنہ نے ۸۱ ہجری میں ۵۶ سال کی عمر میں اس دار فانی کو وداع کیا۔ آپؓ کے محل دفن میں اختلاف ہے، بعض کا خیال ہے کہ طائف میں اجل کو لبیک کہا، اور وہیں دفن ہوئے، بعض کہتے ہیں کہ جنت البقیع میں آپؓ کو سپرد خاک کیا گیا، کبھی کہا، آپؓ کی وفات کی جگہ مدینے کے قریب ایک پہاڑی کو قرار دیا گیا ہے، جسے کوہِ رضوی کہتے ہیں اور اس مقام پر آپؓ دفن ہیں۔ [1]

آپؓ کے مقامِ عظمت وجلالت میں ہے کہ حضرت امام حسین علیہ السلام جب مدینے سے مکے کی طرف روانہ ہونے لگے تو مدینے میں آپ رضی اللہ عنہ کو اپنا نمائندہ اور اپنا وصی بنایا، تاکہ وہاں کی خبریں آپؑ تک پہنچاتے رہیں اور اپنے الٰہی وصیت نامے کو جو کہ معروف ہے، اور مقاتل میں موجود ہے، حضرت محمد بن حنفیہ رضی اللہ عنہ کے سپرد فرمایا۔

---

[1] رجال مامقانی ''سفینۃ البحار''، مفتاح السعادہ، اور شرح ابن ابی الحدید۔

https://downloadshiabooks.com/

دشمن پر فتح پانے کی اہم ترین شرائط

قرآن مجید کی آیات اور اسلامی روایات سے بخوبی استفادہ ہوتا ہے کہ کامیابی کا راز صبر و استقامت سے میدان عمل میں جم کر رہنے میں ہے۔ قرآن مجید فتح پانے والوں اور دشمن کی اذیتوں کے مقابل صبر کرنے والوں کی توصیف کرتے ہوئے کہتا ہے کہ اللہ کی تائید و نصرت ان کے ساتھ ہے۔ ارشاد ہوتا ہے:

"اِنْ يَّكُنْ مِّنْكُمْ عِشْرُوْنَ صَابِرُوْنَ يَغْلِبُوْا مِئَتَيْنِ وَاِنْ يَّكُنْ مِّنْكُمْ مِائَةٌ يَّغْلِبُوْا اَلْفًا مِّنَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا بِاَنَّهُمْ قَوْمٌ لَّا يَفْقَهُوْنَ"[1]

"جب بھی تم میں سے دشمن کے مقابل بیس افراد استقامت سے کھڑے ہوں گے تو دشمن کے دوسو افراد پر غالب آئیں گے (یعنی بیس افراد دوسو پر بھاری ہیں) اور اگر سو افراد کھڑے ہو گئے تو وہ ایک ہزار کافروں پر کامیابی حاصل کریں گے۔ یعنی ایک سو افراد ایک ہزار پر بھاری ہیں، کیوں کہ کافروں کے گروہ سوچنے سمجھنے سے قاصر ہیں"۔

نہج البلاغہ کے کلمات قصار میں آیا ہے:

"وَ عَلَيْكُمْ بِالصَّبْرِ فَاِنَّ الصَّبْرَ مِنَ الْاِيْمَانِ كَالرَّأْسِ مِنَ الْجَسَدِ وَ لَا خَيْرَ فِيْ جَسَدٍ لَا رَأْسَ مَعَهُ وَلَا فِيْ إِيْمَانٍ لَا صَبْرَ مَعَهُ"[2]

"تمہارے لیے صبر و استقامت کرنا ضروری ہے، کیوں کہ یہ ایمان کی نسبت ایسے ہے جیسے سر کا بدن کے ساتھ رشتہ ہے، وہ بدن جس پر سر نہ ہو اس کا کوئی فائدہ نہیں، اسی طرح وہ ایمان جس کے ساتھ صبر و استقامت نہ ہو کوئی فائدہ مند نہیں۔"

مذکورہ خطبے میں تکرار کے ساتھ اسی معنی پر زور دیا گیا ہے، کبھی فرمایا کہ "اگر پہاڑ لرزنے لگے تو تم میں کسی قسم کی لغزش نہیں آنی چاہیے"، کبھی فرماتے ہیں، "اپنے قدموں کو زمین میں گاڑ دو!" باقی جملے بھی اس معنی کے لیے بال و پر ہیں، کیوں کہ دانتوں کو بھینچ لینا، سر کو خدا کے حوالے کرنا، نصرت و مدد کو جاننا کہ خدا کی طرف سے ہے، یہ سب انسان کو صبر و استقامت اور ڈٹے رہنے میں بہت مدد دیتے ہیں، اور مسلمانوں کو مختلف جنگوں میں اپنے سے بہت بڑے لشکروں کے مقابلے میں جو فتوحات حاصل ہوئی ہیں، ان کی اصل وجہ صبر و استقامت کے ساتھ اپنے صحیح موقف پر جمے رہنا ہے، یہی چیز آنے والی نسلوں میں بھی باقی رہنی چاہیے تا کہ اسلام دشمن قوتوں پر فتوحات کے بیشتر مواقع دیکھنے کو ملیں۔

---

[1] سورۂ انفال، آیت ۶۵

[2] نہج البلاغہ، کلمات قصار، ۸۲

https://downloadshiabooks.com/

بارھواں خطبہ

وَمِنْ كَلَامٍ لَهُ عَلَيْهِ السَّلَامُ

لَمَّا أَظْفَرَهُ اللهُ بِأَصْحَابِ الْجَمَلِ، وَ قَدْ قَالَ لَهُ بَعْضُ أَصْحَابِهِ وَدِدْتُ أَنَّ أَخِي فُلَاناً كَانَ شَاهِدَنَا لِيَرَى مَا نَصَرَكَ اللهُ بِهِ عَلَى أَعْدَائِكَ فَقَالَ لَهُ ﷺ أَهَوَى أَخِيكَ مَعَنَا فَقَالَ نَعَمْ قَالَ فَقَدْ شَهِدَنَا وَلَقَدْ شَهِدَنَا فِي عَسْكَرِنَا هَذَا أَقْوَامٌ فِي أَصْلَابِ الرِّجَالِ وَ أَرْحَامِ النِّسَاءِ سَيَرْعَفُ بِهِمُ الزَّمَانُ وَ يَقْوَى بِهِمُ الْإِيمَانُ۔ [1]

''جب پروردگار نے آپؑ کو اصحاب جمل پر کامیابی عطا فرمائی اور آپؑ کے بعض اصحاب نے کہا کہ کاش ہمارا فلاں بھائی بھی ہمارے ساتھ ہوتا تو وہ بھی دیکھتا کہ پروردگار نے کس طرح آپؑ کو دشمن پر فتح عنایت فرمائی ہے، تو آپؑ نے فرمایا، کیا تیرے بھائی کی محبت بھی ہمارے ساتھ ہے؟ اس نے عرض کی، بیشک۔ فرمایا: تو وہ ہمارے ساتھ تھا اور ہمارے اس لشکر میں وہ تمام لوگ ہمارے ساتھ تھے جو ابھی مردوں کے صلب اور عورتوں کے رحم میں ہیں اور عنقریب زمانہ انہیں منظر عام پر لے آئے گا اور ان کے ذریعے ایمان کو تقویت حاصل ہوگی۔''

خطبہ، ایک نگاہ میں

سیّد رضیؒ کی گفتگو سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ یہ خطبہ بھی جنگ جمل کے واقعے سے مربوط ہے، یہ بیان اس وقت سامنے آیا کہ جب لشکر اسلام کو فتح و کامیابی نصیب ہوئی اور امام علیؑ کے دوستوں میں سے کسی ایک نے جو اپنے بھائی سے بہت محبت کرتے تھے، ان کی جگہ کو خالی دیکھا تو ان کے دل میں تمنا پیدا ہوئی کہ کاش میرا بھائی بھی اس فتح و کامیابی کی خوشی کی محفل میں

[1] اس خطبے کی سند وہی ہے جو سیّد رضیؒ کے کلام میں آئی ہے، لیکن اس جیسی گفتگو محاسن برقی کی کتاب ''مَصَابِيحُ الظُّلَمِ'' میں بھی ملتی ہے کہ جنگ نہروان میں خوارج کو شکست فاش اور انہیں درہم برہم کرنے کے بعد امیر المومنینؑ کے دوستوں میں سے ایک نے عرض کیا، یا امیر المومنینؑ ہم آج بہت خوش ہیں کہ اس جنگ میں آپؑ کے ہم رکاب ہو کر خوارج کو قتل کیا، اس جگہ امام علیؑ نے مذکورہ خطبے میں اس مثال کو ذکر فرمایا۔ شرح نہج البلاغہ، ابن ابی الحدید معتزلی۔ جلد ا، ص ۳۳۹۔

https://downloadshiabooks.com/

ہوتا اور خوشی مناتا، اور عظمت الٰہی کے آثار کو اس فتح و کامیابی مشاہدہ کرتا۔

یہاں پر امیر المومنینؑ نے ایک عمیق اور پاکیزہ بیان کے ذریعے صحابی کے بھائی کی معنوی اعتبار سے موجودگی کا جو ان کے ہم فکر اور ہم عقیدہ تھے، اعلان فرمایا، کیوں کہ اسلام کے نقطۂ نظر سے تمام انسانوں کے درمیان کوئی نہ کوئی رشتہ ہے، جس میں جڑے ہوتے ہیں، مثال کے طور پر نسلی، زبانی، سیاسی، اور اقتصادی منافع یعنی تجارتی رشتہ وغیرہ، ان سب میں بہترین اور افضل ترین رشتہ اس مکتب کا رشتہ ہے، جس کا اس خطبے میں ذکر کیا گیا ہے۔

امام علی علیہ السلام اس خطبے میں فرماتے ہیں: وہ تمام لوگ جو دنیا کے دور و نزدیک کے علاقوں میں موجود ہیں، اور بہت سی مجبوریوں کی وجہ اس میدان میں اور اس جیسے دیگر میدانوں میں موجود نہیں ہیں، لیکن ہمارے ساتھ ہم فکر، ہم مزاج اور ہم عقیدہ ضرور ہیں اور اس طرح وہ لوگ جو کل اور آئندہ دور میں صلبِ پدران اور ماؤں کے رحم سے نکل کر اس دنیا میں قدم رکھیں گے اور ہمارے ساتھ ہم فکر اور ہم عقیدہ اور ہم مزاج ہوں گے، درحقیقت حق و باطل کی لڑائی کے اس میدان میں وہ لوگ ہمارے ساتھ موجود ہیں اور اس کی برکات و حسنات میں شریک ہیں۔

شرح وتفسیر

مکتب کا رشتہ

مذکورہ گفتار سے واضح ہوا کہ حضرت امام علی علیہ السلام نے اپنے دوستوں میں سے ایک، جو یہ تمنا کر رہے تھے کہ کاش ان کا بھائی بھی اس جشن میں شریک ہوتا ان کے جواب میں فرمایا:

"فَقَالَ لَهُ عَلَيْهِ السَّلامُ: أَهَوَى أَخِيكَ مَعَنَا؟"

''کیا تمہارے بھائی کی سوچ وفکر ہمارے ساتھ ہے؟''

"فَقَالَ نَعَمْ"

انہوں نے جواب دیا، جی ہاں!

امامؑ نے فرمایا:

"فَقَدْ شَهِدَنَا"

''وہ بھی مسلّم طور پر ہمارے ساتھ اس میدان جنگ میں موجود تھا۔''

https://downloadshiabooks.com/

پھر اس میں آپؑ نے مزید اضافہ فرمایا:

"وَلَقَدْ شَهِدَنَا فِيْ عَسْكَرِنَا هٰذَا اَقْوَامٌ فِيْ اَصْلَابِ الرِّجَالِ وَاَرْحَامِ النِّسَاءِ"

''نہ صرف وہ موجود تھا، بلکہ تمہیں یہ بتادوں کہ ایسے گروہ بھی ہمارے لشکر میں موجود تھے جو ابھی باپ کی پشت اور ماؤں کے رحم میں ہیں اور ابھی پیدا ہی نہیں ہوئے۔''

"سَيَرْعَفُ بِهِمُ الزَّمَانُ، وَيَقْوىٰ بِهِمُ الْاِيْمَانُ"

''آئندہ زمانوں میں ایسی قوم وجود میں آئے گی اور ظاہر ہوگی کہ لشکرِ ایمان ان کے وسیلے سے قوی اور فتح مند ہو جائے گا۔''

جی ہاں! یہ لوگ آئندہ ہر زمان اور مکان میں دور و نزدیک کے اعتبار سے ہمارے ساتھ مکتبی رشتہ رکھتے ہیں، اگرچہ تقدیرِ الٰہی سے ظاہری طور پر ہمارے اور ان کے درمیان جدائی ہے، لیکن عالم معنی و عالم ارواح میں سب ایک ساتھ ہیں اور کامیابیوں، برکات اور حسناتِ الٰہی میں سب شریک ہیں۔

"سَيَرْعَفُ بِهِمُ الزَّمَانُ" کا لفظی ترجمہ یہ ہے کہ ان لوگوں کا زمانہ ایسا ہوگا کہ جیسے خون رعاف یعنی اپنے ناک سے قطرہ قطرہ خون کو ٹپکائے گا، خونِ رعاف [1] (نکسیر کا وہ خون جو ناک سے باہر آتا ہے) اس سے مراد وہی خون ہے جو انسان کی رگوں میں موجود ہے اور وہ باہر ظاہر نہیں ہوتا، لیکن ایک وقت ایسا آئے گا کہ وہ دیکھنے میں آئے گا، سادگی اور آسانی سے خون بہے گا، وہ لوگ بھی اس عالم میں پوشیدہ اور باطنی طور پر موجود ہیں، مگر خداوند متعال کی زمانہ بندی کے دستور کے مطابق آہستہ آہستہ پوشیدہ مرحلے سے نکل کر ظہور پیدا کریں گے اور اپنے اپنے فرائض انجام دیں گے۔ ان کی خصوصیات یہ ہیں کہ "وَيَقْوىٰ بِهِمُ الْاِيْمَانُ" دین و ایمان کو ان سے طاقت ملتی ہے، اور وہ خدا کی راہ میں آئینِ حق کے لیے اقدام کر تے ہیں اور زمانی و مکانی اعتبار سے جو ذمے داریاں ان کے کندھوں پر رکھی جاتی ہیں، انہیں درست انجام دیتے ہیں۔ نہج البلاغہ کے شارحین کے درمیان، غائب لوگوں کی اس جنگ میں موجودگی کے بارے میں کافی بحث ہے۔

سوال: آیا ان کی موجودگی روحانی اعتبار سے ہے؟ یعنی وہ ارواح جو جسموں میں آنے سے پہلے وہاں موجود ہیں؟ یا ان کی موجودگی بالقوہ ہے؟ یعنی یہاں ارواح ضرور موجود ہیں مگر ظاہراً نظر نہیں آتیں۔

لیکن امامؑ کے فرمانے کا مقصد یہ ہے کہ وہ لوگ حسنات کی تقسیم، نتیجہ و انعامات الٰہی کے حوالے سے موجود ہیں یعنی جن لوگوں کی فکر و سوچ ہمارے ساتھ ہے، وہ ہمارے گروہ حزب اللہ میں شامل ہیں اور الٰہی عنایات میں ہمارے ساتھ حصے

---

[1] رعاف، ناک سے نکلنے والا خون (فرہنگ عمید)۔

https://downloadshiabooks.com/

دار ہیں اور حق و باطل کے میدانوں میں معنوی طور پر حاضر ہوتے ہیں۔ یہ لوگ اپنے زمانے میں فرائض انجام دیں گے، جس طرح آج ہم اپنی ذمے داری ادا کر رہے ہیں، اگر چہ تقدیر الٰہی نے ہمارے اور ان کے درمیان جدائی ڈال دی ہے، لیکن عقائد اور عملی اقدامات ایک ہی ہیں، یہی وجہ ہے کہ کام کی انجام دہی پر حصہ و انعام میں سب برابر کے شریک ہیں، بلکہ حقیقت میں وہ ایک ایسا اکیلا وجود ہے، جو ہر زمانے کے اعتبار سے ظہور کرتا ہے، البتہ شیطانی لشکر بھی اسی طرح ہیں۔ وہ شیطانی راستے پر چلتے ہوئے اقدام کرتے ہیں، ان کے عقائد فاسد، ان کے اعمال آلودہ اور ان کا کام ظلم و ستم اور بربریت ہے اور وہ اس راہ میں یک جان ہیں، جرم و سزا میں شریک ہیں، اس کی مزید شرح آگے آئے گی۔

اہم نکتہ

محکم ترین رشتے داری

اس خطبے میں جو واقعات ذکر ہوئے ہیں، وہ علوم اسلامی کے اہم ترین موضوعات بیان کرتے ہیں اور ایسے مطالب سے پردہ اٹھاتے ہیں، جنہیں دنیاوی اور مادّی چھان بین سے ہرگز بیان نہیں کیا جا سکتا، امام علیؑ مومنین کے درمیان جو اہم ترین رشتہ قرار دیتے ہیں، وہ مکتب و مذہب ہے جو ہر شے سے بالا تر ہے، یعنی یہ ذاتی، زبانی، سماجی فوائد اور خاندانی رشتے داری سے افضل و اکمل رشتہ ہے، اور اس الٰہی رشتے کی شعاعیں تمام مکان اور زمان کے لوگوں کو اپنے دائرہ اختیار میں لے کر تمام گزرے ہوئے اور آج و آئندہ کے لوگوں کو ایک روحانی نظام کے تحت جمع کر رہی ہیں۔ فرماتے ہیں کہ آج کے تمام مومنین، اور وہ جو رحمِ مادر میں ہیں، ابھی پیدا نہیں ہوئے ہیں یا وہ لوگ جو سالہا سال بعد باپوں کے صلب سے ماؤں کے رحم میں منتقل ہو کر پیدا ہوں گے اور بڑے ہوں گے، وہ سب اس جنگ جمل کی لڑائی کے میدان میں موجود تھے، کیوں کہ یہ جنگ ذاتی اور قدرت حاصل کرنے کے لیے نہیں تھی، بلکہ حق و باطل کے طرف داروں کے درمیان تھی اور یہ دو قوتیں میٹھے اور تلخ پانی کی لائنوں کی طرح صور پھونکے جانے تک جاری رہیں گی، اور سچے باایمان مومنین ہر مکان اور زمانے میں حق کی راہ پر چلتے ہوئے باطل کے ساتھ مقابلہ کریں گے اور تمام جنگی نتائج، فخر و مباہات، برکات اور انعام و اکرام میں سب شریک ہیں۔

یہ دلیل بھی واضح ہے کہ یہ (آج اور کل آنے والے) سب لوگ ایک حقیقت کی تلاش میں ہیں اور ایک مطلب اور مقصد کو طلب کرتے ہوئے اس راہ میں قدم سے قدم ملاتے ہوئے آگے بڑھیں گے، اور صرف ایک ہدف کے لیے تلوار چلائیں گے، وہ ہدف خداوند متعال کی رضایت ہے، اس بنیادی اساس پر غور کرنے سے بہت سے ایسے مسائل جو قرآن مجید

https://downloadshiabooks.com/

اور روایات میں وارد ہوئے ہیں جو کہ بعض افراد کے لیے معمہ ہیں، حل ہو جاتے ہیں۔ قرآن مجید میں قومِ ثمود کے بارے میں ارشاد ہے:

"فَكَذَّبُوهُ فَعَقَرُوهَا فَدَمْدَمَ عَلَيْهِمْ رَبُّهُمْ بِذَنْبِهِمْ فَسَوَّاهَا"۔[۱]

''توانہوں نے اس (حضرت صالح علیہ السلام) کو جھٹلا دیا، پھر اس (اونٹنی) کی کونچیں کاٹ ڈالیں تو ان کے رب نے ان کے گناہ کی وجہ سے ان پر ہلاکت نازل کر دی، پھر (پوری) بستی کو (تباہ کر کے عذاب میں سب کو) برابر کر دیا۔''

تاریخ میں یہ بات واضح طور پر آئی ہے کہ اونٹنی کی کونچیں کاٹنے والا ایک ہی شخص تھا، لیکن وہاں دوسرے بھی تھے جو اس کے کام پر خوش تھے، لہٰذا ایک شخص کے فعل کو پوری قوم سے نسبت دی گئی ہے اور عذاب میں سب مبتلا ہو گئے، یہ مفہوم ہمیں امیر المومنینؑ کے کسی دوسرے کلام میں بھی ملتا ہے۔ فرماتے ہیں:

"أَيُّهَا النَّاسُ إِنَّمَا يَجْمَعُ النَّاسَ الرِّضىٰ وَ السُّخْطُ وَ إِنَّمَا عَقَرَ نَاقَةَ ثَمُودَ رَجُلٌ وَاحِدٌ فَعَمَّهُمُ اللهُ بِالْعَذَابِ لَمَّا عَمُّوهُ بِالرِّضَا"۔[۲]

''اے لوگو! ایک کام کی نسبت کسی قوم کا اجتماعی طور پر راضی ہونا یا ان کی ناراضی ان کو فردِ واحد بنا دیتی ہے لہٰذا اس کی سزا و جزا بھی اجتماعی ہوتی ہے، جیسے ناقۂ صالح علیہ السلام کو قوم ثمود کے ایک فرد کے سوا کسی نے اسے ہاتھ تک نہ لگایا تھا، لیکن عذاب الٰہی اور اس کی سزا نے قوم ثمود کے تمام کافروں کو گھیرے میں لے لیا اور انہیں تباہ و برباد کر دیا، کیوں کہ وہ سب کے سب اس شخص کے عمل پر راضی تھے۔''

جابر بن عبداللہ انصاری رضی اللہ عنہ کے واقعے میں ہے کہ آپؓ چہلم شہدائے کربلا علیہم السلام کے دن سیّد الشہداء امام حسین علیہ السلام کے قبر مطہر کی زیارت کے لیے آئے، اور وہاں گریہ وزاری کرنے لگے، اور اپنی درد بھری زیارت میں امام حسین علیہ السلام اور آپؑ کے اصحابِ باوفا کو خطاب کرتے ہوئے کہا:

''میں گواہی دیتا ہوں کہ آپؑ نے نماز قائم کی، زکوٰۃ ادا کی، امر بہ معروف اور نہی عن المنکر کا حکم دیا اور ملحدین سے جنگ کی، آخری سانس تک خدائے یکتا کی پرستش کرتے رہے۔''

اس کے بعد کہا:

"وَالَّذِي بَعَثَ مُحَمَّدًا بِالْحَقِّ لَقَدْ شَارَكْنَاكُمْ فِيمَا دَخَلْتُمْ فِيهِ"

[۱] سورۂ والشمس، آیت ۱۴

[۲] نہج البلاغہ، خطبہ ۲۰۱

https://downloadshiabooks.com/

''اُس ذات کی قسم! جس نے محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو حق کے ساتھ مبعوث کیا، جس طرح آپؑ اللہ کی نعمتوں اور صلے کے مستحق ہیں، ہم بھی آپؑ کے ساتھ اس میں شریک اور حصے دار ہیں۔''

یہ بات ایسی تھی کہ جابر رضی اللہ عنہ کے انتہائی قریبی دوست عطیہ کو، جو آپؓ کے ساتھ آئے تھے، اس پر حیرت ہوئی اور کہا:

''اے جابرؓ! ہم نے کیا کیا ہے جو ان کے ساتھ شریک ہیں؟ نہ ہم کسی درے سے نیچے گئے ہیں اور نہ کسی پہاڑی کو سر کر کے آئے ہیں اور نہ ہم نے کوئی تلوار چلائی ہے، جب کہ امام حسینؑ اور ان کے باوفا دوستوں کے سر تن سے جدا ہو گئے ہیں، ان کے بچے یتیم اور بیویاں بیوہ ہو گئیں۔'' جابرؓ نے اس اہم نکتے کو واضح کرنے کے لیے، عطیہ کو پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ایک مستند حدیث یاد دلائی اور کہا، میں نے حبیبِ خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے سنا ہے کہ آپؐ نے فرمایا:

"مَنۡ اَحَبَّ قَوۡمًا حُشِرَ مَعَهُمۡ وَمَنۡ اَحَبَّ عَمَلَ قَوۡمٍ اُشۡرِكَ فِيۡ عَمَلِهِمۡ"

''اگر کوئی کسی قوم کو پسند کرتا ہے تو وہ کل انہیں کے ساتھ محشور ہوگا، اور اگر کوئی ان کے عمل کو پسند کرے تو وہ ان کے عمل میں شریک ہے۔''

جابرؓ نے مزید کہا:

''خدا کی قسم! جس نے آنحضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو نبوت پر فائز کیا، ہمارے دوستوں کی نیت بھی امام حسینؑ اور ان کے دوستوں کے ساتھ، اسی معنی میں ہے۔''[1]

قرآن مجید کی بہت سی آیتوں میں مدینۂ منورہ کے (پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے زمانے میں رہنے والے) یہودیوں کو مخاطب کرتے ہوئے انہیں ان بداعمالیوں اور نافرمانیوں پر سرزنش کی گئی ہے، جو حضرت موسیٰؑ کے دور کے یہودیوں نے کی تھیں، جب کہ اس واقعے کو صدیاں بلکہ ہزاروں سال گزر گئے ہیں اور اُس دور کے لوگوں اور موجودہ دور کے لوگوں کے درمیان بھی اتنے ہی فاصلے ہو گئے تھے، لیکن چوں کہ ان کی بداعمالیوں پر یہ لوگ راضی تھے اور انہی بُرے اعمال کو پابندی سے انجام دیتے تھے، اس وجہ سے تمام فاصلے ختم ہو گئے اور یہ سب حضرت موسیٰ علیہ السلام کے مقابل مجرموں کی صف میں کھڑے کر دیے جائیں گے۔ آیاتِ قرآنی میں حیلہ و بہانہ کرنے والے یہودیوں کے بارے میں آیا ہے:

"قُلۡ قَدۡ جَآءَكُمۡ رُسُلٌ مِّنۡ قَبۡلِيۡ بِالۡبَيِّنٰتِ وَ بِالَّذِيۡ قُلۡتُمۡ فَلِمَ قَتَلۡتُمُوۡهُمۡ اِنۡ كُنۡتُمۡ صٰدِقِيۡنَ"[2]

---

[1] بحار الانوار، جلد ۶۵، ص ۱۳۱

[2] سورۂ آل عمران، آیت ۱۸۳

https://downloadshiabooks.com/

"اے رسولؐ! کہہ دیجیے کہ تم یہ بتاؤ کہ مجھ سے پہلے بہت سے پیغمبر تمہارے پاس واضح وروشن معجزات اور جس چیز کی تم نے فرمائش کی ہے وہ بھی لے کر آئے تھے، اگر تم سچ بولتے ہو تو تم لوگوں نے انہیں کیوں قتل کیا۔"

عمدہ بات یہ ہے کہ اس آیت کے ذیل میں حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام سے ایک حدیث نقل ہوئی ہے، جس میں آپؑ فرماتے ہیں:

"خداوند متعال جانتا تھا کہ پیغمبر اکرمؐ کے زمانے کے یہودی پہلے انبیاؑ کے قاتل نہیں ہیں، لیکن چوں کہ یہ لوگ ان قاتلوں کے ہم فکر و ہم عقیدہ تھے، اس وجہ سے ان کو بھی قاتل کہا گیا ہے، کیوں کہ یہ لوگ اُن کے برے افعال و اعمال کو پسند کرتے اور ان پر راضی تھے، اس وجہ سے اللہ ان پر بھی عذاب کرے گا۔" [1]

محدث بزرگ شیخ حر عاملیؒ نے وسائل الشیعہ کی گیارہویں جلد میں، کتاب امر بہ معروف و نہی از منکر کے ضمن میں کئی روایات نقل کی ہیں۔ اس قسم کی طرزِ فکر سے مطالعہ کرنے والوں کے سامنے انتہائی وسیع علوم کے ابواب کھل جاتے ہیں اور ہمیں آیات و روایات کو سمجھنے اور حق کے راستے پر چلنے میں مدد اور یہ انداز اہم امور ملاحظہ کرنے کے قابل بنا دیتا ہے۔ [2]

[1] بحار الانوار، جلد ۹۷، ص ۹۴

[2] وسائل الشیعہ، جلد ۱۱، کتاب الاوامر بالمعروف، باب ۵

https://downloadshiabooks.com/

https://downloadshiabooks.com/

تیرہواں خطبہ

وَمِنْ كَلَامٍ لَهُ عَلَيْهِ السَّلَامُ

فِيْ ذَمِّ اَهْلِ الْبَصْرَةِ بَعْدَ وَقْعَةِ الْجَمَلِ.

جس میں جنگ جمل کے بعد اہل بصرہ کی مذمت فرمائی ہے۔

"كُنْتُمْ جُنْدَ الْمَرْاَةِ وَ اَتْبَاعَ الْبَهِيْمَةِ رَغَا فَاَجَبْتُمْ وَ عُقِرَ فَهَرَبْتُمْ اَخْلَاقُكُمْ دِقَاقٌ وَ عَهْدُكُمْ شِقَاقٌ وَ دِيْنُكُمْ نِفَاقٌ وَ مَاؤُكُمْ زُعَاقٌ وَ الْمُقِيْمُ بَيْنَ اَظْهُرِكُمْ مُرْتَهَنٌ بِذَنْبِهِ وَ الشَّاخِصُ عَنْكُمْ مُتَدَارَكٌ بِرَحْمَةٍ مِنْ رَبِّهِ كَاَنِّيْ بِمَسْجِدِكُمْ كَجُؤْجُؤِ سَفِيْنَةٍ قَدْ بَعَثَ اللهُ عَلَيْهَا الْعَذَابَ مِنْ فَوْقِهَا وَ مِنْ تَحْتِهَا وَ غَرِقَ مَنْ فِيْ ضِمْنِهَا". [1]

"افسوس تم لوگ ایک عورت کے سپاہی اور ایک جانور کے پیچھے چلنے والے تھے جس نے بلبلانا شروع کیا تو تم لبیک کہنے لگے اور وہ زخمی ہوگیا تو تم بھاگ کھڑے ہوئے۔ تمہارے اخلاقیات پست، تمہارا عہد ناقابل اعتبار۔ تمہارا دین نفاق اور تمہارا پانی کھارا ہے، تمہارے درمیان قیام کرنے والا گویا گناہوں کے ہاتھوں رہن ہے اور تم سے نکل جانے والا گویا رحمتِ پروردگار کو حاصل کر لینے والا ہے، میں تمہاری اس مسجد کو اس عالم میں دیکھ رہا ہوں جیسے کشتی کا سینہ، جب خدا تمہاری زمین پر اوپر اور نیچے ہر طرف سے عذاب بھیجے گا اور سارے اہل شہر غرق ہو جائیں گے۔"

[1] مرحوم محقق خوئی لکھتے ہیں، یہ خطبہ جنگ جمل کے بعد آپؑ نے ارشاد فرمایا ہے اور مرحوم طبرسی نے کتابِ احتجاج میں اور علی بن ابراہیم قمی اور محدث بحرانی نے، اسے تھوڑے سے اختلاف کے ساتھ لکھا ہے ہے، مصادر نہج البلاغہ میں سیّد رضیؒ سے پہلے دانشوروں کے گروہ کی طرف سے بھی آیا ہے جن میں دینوری، نے الاخبار الطوال میں اور مسعودی نے، مروج الذہب میں اور ابن قتیبہ، نے عیون الاخبار میں ابن عبدربہ نے عقد الفرائد میں یہ خطبہ نقل کیا ہے۔ مصادر نہج البلاغہ، ج۱، ص ۳۴۴۔

https://downloadshiabooks.com/

خطبہ، ایک نگاہ میں

یہ خطبہ بھی انہی خطبوں کی طرح ہے، جن میں جنگ جمل کا واقعہ بیان کیا گیا ہے اور اہل بصرہ کی عہد شکنی کی مذمت ہے، جو طلحہ و زبیر کے دھوکے میں آ کر آنکھیں بند کر کے ان کے پیچھے سیاست چمکانے کے لیے میدان میں کود پڑے اور پہلی مرتبہ مسلمانوں میں پھوٹ ڈال کر آپس میں لڑوادیا، ان کے گناہوں کی وجہ سے وہ شدید قسم کے لعن طعن کے مستحق ہو گئے، اس کے علاوہ انہیں آنے والے وقتوں میں عذابِ الٰہی کی خبر دی گئی، اور اس میں باقی تمام لوگوں کے لیے درس عبرت موجود ہے تا کہ آئندہ کوئی ایسے بُرے اعمال کا مرتکب نہ ہو۔

شرح وتفسیر

جنگ جمل کی افواج کے اوصاف

خطبے کے اس حصے میں اہل بصرہ کے برے اعمال اور مذموم صفات کی طرف خصوصی طور پر اشارہ فرماتے ہوئے ان سے خطاب فرمایا۔ امامؑ نے اس فرمان میں سات اوصاف کی طرف اشارہ فرمایا ہے:

پہلا وصف:

"كُنْتُمْ جُنْدَ الْمَرْأَةِ"

''تم ایک عورت کی فوج ہو۔''

جنگ جمل کی آگ بھڑکانے والوں میں طلحہ و زبیر سب سے آگے تھے، تاریخی شواہد یہ بھی کہتے ہیں کہ اس جنگ کے بھڑکانے میں امیر شام کا بھی ہاتھ تھا، لیکن اس میں کوئی شک نہیں ہے کہ جو اس تباہ کن جنگ میں لوگوں کی شرکت کا سبب بنا، وہ حضرت عائشہ کا پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ساتھ رشتہ تھا، ان کی وہاں موجودگی اور سب سے اہم بات، جس سے لوگ دھوکا کھا گئے وہ ام المومنین کا لقب تھا، یہ ایک ایسا حیلہ تھا کہ ماں کی حفاظت اور دفاع کے لیے وصیِ رسولؐ، امام زمان امیر المومنینؑ کے خلاف لوگوں کو جمع کیا گیا اور جنگ کا شعلہ بھڑکایا گیا، اسی لیے امیر المومنینؑ نے اہلِ بصرہ کو عورت کی فوج کہہ کر خطاب فرمایا۔

https://downloadshiabooks.com/

دوسرا وصف:

"وَاَتْبَاعَ الْبَهِيمَةِ"

"تم چوپائے، یعنی حضرت عائشہ کے اونٹ کی پیروی کرتے رہے۔"

اس بیان کی دلیل میں فرماتے ہیں:

"رَغَا[1] فَاَجَبْتُمْ وَعُقِرَ[2] فَهَرَبْتُمْ"

"جب تک اونٹ بولتا رہا اور صدائیں نکالتا رہا، اس کی پکار کا جواب دیتے رہے اور جنگ کرتے رہے۔ لیکن جیسے ہی اونٹ کو گرایا گیا اور اس کی ٹانگیں کاٹ دی گئیں تو ماں کو چھوڑ کر بھاگ کھڑے ہوئے۔"

بعض مورخین نے کہا ہے کہ حضرت عائشہ کا اونٹ جنگ جمل میں پرچم کی حیثیت رکھتا تھا، تمام فوجی اونٹ کے ارد گرد جمع تھے اور اپنی تلواروں سے مخالفین پر بڑھ چڑھ کر حملے کرتے تھے اور اس لشکر (طلحہ و زبیر) کے جنگجو آخری دم تک اس اونٹ (پرچم نا کثین) کے زیر سایہ جنگ کرتے ہوئے مارے گئے۔

بعض روایتوں میں آیا ہے کہ جمل کے روز قریش میں سے ستر (۷۰) افراد حضرت عائشہ کے اونٹ کی مہار پکڑنے والوں میں سے تھے، جو یکے بعد دیگرے قتل ہو گئے۔ جس گروہ نے سب سے زیادہ جانفشانی کی اور اونٹ کا دفاع کیا وہ "قبیلۂ بنی ضبّہ" اور "ازد" کے جنگجو تھے، امیر المومنینؑ نے دیکھا کہ ان کا اصلی محور وہی اونٹ ہے، آپؑ نے بلند آواز سے اپنی فوج کو پکار کر کہا:

"وَيْلَكُمْ اِعْقِرُوْا الْجَمَلَ فَاِنَّهُ شَيْطَانٌ"

"افسوس ہو تم لوگوں پر! اونٹ کو مار دو! اور اس کی کونچیں کاٹ ڈالو! یہی شیطان ہے۔"

پھر فرمایا: اس اونٹ کو مار ڈالو! ورنہ عرب کے لوگ ختم ہو جائیں گے اور تلواریں اسی طرح چلتی رہیں گی۔ بس پھر کیا تھا، امامؑ کے جنگی سپاہیوں نے اونٹ پر حملہ کیا اور ایک بجلی کے جھٹکے کی طرح کے حملے میں اونٹ کے پاؤں کاٹ دیے، مخالف فوج بوکھلا گئی اور ان کے پاؤں زمین سے اکھڑ گئے۔ جیسے ہی اونٹ زخمی ہو کر زمین پر گرا، ایک زوردار نعرہ لگا اور یوں حضرت عائشہ کے لشکر کو شکست ہوئی اور لشکرِ بصرہ نے راہِ فرار اختیار کی۔

---

[1] رغا اصل میں رُغاء، بروزن دعاء سے ہے اور اونٹ یا سم دار حیوانات کی آواز کے معنی میں آتا ہے۔

[2] عقر کا مادّہ عقر ہے، بروزن فقر، اس کے معنی ریشے، جڑ کے ہیں، یہ کلمہ اونٹ کے ہاتھ پاؤں کاٹنے کے وقتوں میں استعمال کرتے ہیں، یہ ہلاک کرنے کے معنی میں بھی آتا ہے۔

https://downloadshiabooks.com/

بعض روایتوں میں آیا ہے کہ حضرت امام علی علیہ السلام نے حکم دیا کہ اونٹ کی لاش کو آگ میں جلا کر اس کی راکھ کو ہوا میں اڑا دو، اور آپؑ نے فرمایا: خدا لعنت کرے اس (اونٹ) پر کہ جو سامری کے بچھڑے سے شباہت رکھتا تھا، پھر آپؑ نے اس آیت کی تلاوت فرمائی:

"وَانْظُرْ إِلَىٰ إِلٰهِكَ الَّذِي ظَلْتَ عَلَيْهِ عَاكِفًا لَنُحَرِّقَنَّهُ ثُمَّ لَنَنْسِفَنَّهُ فِي الْيَمِّ نَسْفًا"[۱]

"(اے سامری!) اپنے بنائے ہوئے معبود کو دیکھ کہ جس کی تُو عبادت کیا کرتا تھا، ہم اسے جلا کر راکھ کر دیں گے، پھر دریا میں ڈال دیں گے۔"

دلچسپ بات یہ ہے کہ لشکرِ بصرہ کی قوت اور جوش و خروش کو بڑھانے کے لیے حضرت عائشہ نے پیغمبر اکرمؐ کی روش سے استفادہ کرتے ہوئے مٹھی بھر خاک اٹھائی اور امام علیؑ کے لشکر کی طرف پھینکتے ہوئے زور سے کہا: "شاهت الوجوه" "تمہارے چہرے سیاہ ہو جائیں۔" پیغمبر اکرمؐ کا یہ عمل جنگ بدر[۲] میں دشمنان اسلام کو شکست دینے کے لیے ایک معجزانہ عمل تھا، حالانکہ جنگ جمل کا انجام ذلت، رسوائی اور شکست پر ہوا۔

تیسرا، چوتھا اور پانچواں وصف:

"أَخْلَاقُكُمْ دِقَاقٌ، وَعَهْدُكُمْ شِقَاقٌ، وَدِينُكُمْ نِفَاقٌ"

"(ان کی اخلاقی اقدار کی مذمت کرتے ہوئے فرماتے ہیں) تمہارا اخلاق پست، گھٹیا، تمہارا عہد و پیمان بے اعتبار اور ٹوٹنے والا، تمہارا دین نفاق اور دو چہرے والا ہے۔"

دقاق، دقت کے مادّے سے ہے، یہاں اس کے معنی بے کار، عیب دار اور پستی کے ہیں۔ یہ بصرہ والوں کی دنیا پرستی، گناہ آلودگی، دھوکے بازی کی طرف اشارہ ہے۔ پہلے امام علیؑ کی بیعت کی، پھر عہد شکنی کرتے ہوئے بیعت توڑ کر دشمن کے ساتھ مل گئے۔ ان کا نفاق یہ ہے کہ ظاہر میں یہ لوگ اسلام اور ناموسِ رسالتؐ کا دفاع کرنے والے، مگر ان کے باطن میں ان کو رسوا کرنا اور جانشین رسولؐ اور امامِ برحق کے ساتھ دشمنی کرنا ہے اور یہ سب کام شام کے منافقوں اور فسادیوں کے صلاح مشورے سے انجام پایا تھا اور اسی عہد شکنی اور منافقت کی وجہ سے بصرے میں جنگ جمل کے لشکریوں کو ناکثین (دھوکا دینے والے) کہتے ہیں۔

---

[۱] سورۂ طٰہٰ، آیت ۹۷

[۲] ابن ابی الحدید، جلد ا، ص ۲۵۲ تا ۲۶۶ (لیکن اس حوالے میں غلطی سے جنگ حنین کا نام لکھا گیا ہے)

https://downloadshiabooks.com/

چھٹا وصف:

اس میں آپؑ نے اہل بصرہ کی مذمت میں فرمایا:

"وَمَاؤُكُمْ زُعَاقٌ"

''تمہارے علاقے کا پانی تلخ اور کھارا ہے۔''

جہاں کا پانی کھارا ہو، وہاں کے دریائی اور سمندری مضافات گندگی اور آلودگیوں سے بھرے رہتے ہیں، یہ بات سب کو معلوم ہے اور روحی وجسمی لحاظ سے لوگوں کے جسمانی نقصان اور ان کی فکر وروح پر بھی بُرے اثرات مرتب ہوتے ہیں، بنابرایں بصرہ والوں کے پانی کی جو یہاں مذمت ہوئی ہے وہ درحقیقت ان کی اخلاقی آلودگیوں کی مذمت ہے کہ ان کے اخلاق کتنے برے ہیں۔

ساتواں وصف:

اس میں آپؑ نے فرمایا:

"وَالْمُقِيمُ بَيْنَ أَظْهُرِكُمْ [1] مُرْتَهَنٌ بِذَنْبِهِ"

''اور جو کوئی تم لوگوں کے درمیاں قیام کرے تو وہ گناہوں کی دلدل میں پھنس جاتا ہے۔'' (کیوں کہ یا تو وسوسۂ شیطانی اسے گناہ کی طرف دعوت دیتا ہے یا وہ تمہارے گناہوں کے آگے چپ سادھ لیتا ہے)

"وَالشَّاخِصُ [2] عَنْكُمْ مُتَدَارَكٌ بِرَحْمَةٍ مِنْ رَبِّهِ"

''اور جو کوئی تم سے دوری اختیار کرے اور تمہاری صفوں سے نکل جائے تو وہ رحمتِ پروردگار کو پالیتا ہے۔'' (کیوں کہ وہ اس ظلم وفساد کے ماحول سے، جو عذابِ الٰہی کا منتظر ہے، دور ہو جاتا ہے)

دوسری روایت میں کچھ اس طرح بیان ہوا ہے جسے مرحوم کلینی رحمۃ اللہ علیہ نے ''اصول کافی'' میں امام علی النقی علیہ السلام سے نقل کیا ہے، کہ حضرت امام علی النقی علیہ السلام نے اپنے دوستوں میں سے ایک، جن کا نام جعفر تھا، اُن سے فرمایا:

''میں نے تمہیں عبدالرحمٰن بن یعقوب کے پاس دیکھا ہے، کیوں؟'' (عبدالرحمٰن بن یعقوب اسلامی عقائد کے

---

[1] "بَيْنَ أَظْهُرِكُمْ" اس کے معنی تمہارے درمیان کے ہیں ''اظہر'' ظہر کی جمع ہے جس کے معنی پشت کے ہیں۔ یہ مثال خاص کر ایسے موارد میں استعمال ہوتی ہے کہ جب کوئی کسی اجتماع یا ہم اعتقاد لوگوں میں زندگی بسر کرتا ہو اور وہ سب اس کے حمایتی ہوں، اس کے علاوہ کوئی اس کی پیروی کرتا ہو یا نہیں کرتا ہو، لوگوں کے درمیان کے معنی میں بھی آیا ہے، لسان العرب میں اس تفسیر کو ابن اثیر نے نقل کیا ہے۔

[2] شاخص، شخص کے مادّے سے ہے اور یہ بلندی کے معنی میں ہے اور پھر انسان کی قد وقامت دور سے نمایاں نظر آتی ہے، اور اسی بناء پر مسافر شخص کو ''شاخص'' کہا جاتا ہے اور مذکورہ عبارت کے بھی یہی معنی ہیں۔

https://downloadshiabooks.com/

منکرین میں سے تھے)

جعفر نے عرض کیا:

''مولا، عبدالرحمٰن بن یعقوب میرا اماموں ہے۔''

آپؑ نے فرمایا: اس کے بارے میں کیا تم نہیں جانتے کہ وہ خداوند متعال کی نسبت بہت بے ہودہ باتیں کرتا ہے؟ اور اللہ کی مخلوقات کی صفات کے ذریعے توصیف کرتا ہے، جب کہ ایسا نہیں ہے۔''

پھر فرمایا:

''تم یا ان کے ساتھ رہو، ہمیں چھوڑ دو یا ہمارے ساتھ رہو، ان کو چھوڑ دو۔''

جعفر نے کہا: مولاؑ، جب وہ میرے عقیدے کا نہیں ہے تو وہ کچھ بھی کہتا رہے، میں اس کے ساتھ کیوں شمار کیا جاؤں گا، کیوں کہ میں نے کوئی گناہ نہیں کیا؟ امامؑ نے فرمایا:

''اَمَا تَخَافُ اَنْ تَنْزِلَ بِهٖ نَقِمَةٌ فَتُصِيْبَكُمْ جَمِيْعاً''

''کیا تم اس بات سے نہیں ڈرتے ہو کہ کوئی عذاب اس پر نازل ہو اور وہ تم سب کو اپنے لپیٹ میں لے لے۔''[1]

یہی وجہ ہے کہ جب کسی علاقے میں خصوصاً اعتقادی فساد پھیل جائے اور مؤمنین اس کا مقابلہ نہ کرسکیں اور ان کی آلودگیوں سے بچنا چاہتے ہیں تو ان کو چاہیے وہاں سے ہجرت کر جائیں، اور ابتدائے اسلام میں مسلمانوں کی حبشہ یا دیگر علاقوں میں ہجرت کا فلسفہ بھی عین اسی معنی میں تھا۔ حضرت امام علی علیہ السلام فرماتے ہیں: ''مُرْتَهَنٌ بِذَنْبِهٖ'' وہ خود اپنے گناہ کے قیدی ہیں، یہ اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ گناہ انسان کو اپنا غلام بناتا ہے اور اسے اغوا کر لیتا ہے، جس طرح قرآن مجید میں ہے:

''كُلُّ نَفْسٍۭ بِمَا كَسَبَتْ رَهِيْنَةٌ''[2]

''ہر انسان اپنے اعمال کے بدلے گروی ہے۔''

بہرحال یہ جملہ انسانی اخلاق پر ہونے والے اثرات کی ایک واضح دلیل ہے، یا ان تمام آلودہ جگہوں کو پاک و صاف کیا جائے یا وہاں سے ہجرت کر کے کسی دوسری جگہ چلا جائے۔ پھر امام علیہ السلام نے بصرہ کے لوگوں کی دنیا پرستی کی سزا یا عذاب کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا:

[1] اصول کافی، جلد ۲، ص ۳۷۵، باب مجالسة اہل معاصی، اس باب میں متعدد روایات اور بھی اسی مضمون کی پائی جاتی ہیں۔
[2] سورۂ مدثر، آیت ۳۸

https://downloadshiabooks.com/

"کَأَنِّیْ بِمَسْجِدِکُمْ کَجُؤْجُؤِ سَفِیْنَۃٍ قَدْ بَعَثَ اللّٰہُ عَلَیْھَا الْعَذَابَ مِنْ فَوْقِھَا وَ مِنْ تَحْتِھَا، وَ غَرِقَ مَنْ فِیْ ضِمْنِھَا"

''میں تمہاری مسجدوں کی بلندی کو اس طرح دیکھ رہا ہوں، جیسے سمندر میں چلنے والی کشتیوں کا سینہ پانی کی سطح پر بلند ہوتا ہے، اور خداوند عالم نے تمہارے شہر کے اوپر اور زمین کے نیچے سے عذاب بھیج دیا ہے اور تمام چیزوں کے ساتھ وہ لوگ جو وہاں بستے ہوں گے، سب پانی میں غرق ہو جائیں گے۔''

یہ گفتگو ایک ایسے شدید طوفان کی طرف اشارہ ہے، جو اس شہر اور اس میں رہنے والوں کو نابود کر دے گا۔ زمین کے اوپر سے طوفانی سیلاب ان کو برباد کر دے گا اور زمین کے اندر سے پانی پھوٹے گا اور طوفانِ نوحؑ کی طرح ہر جگہ کو گھیر لے گا، جو چیز شہر میں باقی بچے گی وہ ان کی مسجدوں کی بلندیاں ہیں، اس کے لیے تشبیہ "کَجُؤْجُؤِ سَفِیْنَۃٍ" کو کشتی کے سینے سے دی ہے، ممکن ہے کہ یہ مسجد کے مناروں اور دیواروں کی بلندی کی طرف اشارہ ہو، جو نیم دائرے کی شکل میں ہوتا ہے اور بالکل کشتی کے سینے کی طرح ہے۔

قابل توجہ بات یہ ہے کہ اس خطبے کے ذیل میں دوسری روایات قابلِ غور ہیں۔ "مَا یُرٰی مِنْھَا اِلَّا شُرَفُ الْمَسْجِدِ" صرف مسجد کی بلندیاں دکھائی دیتی ہیں، یہ پیشگوئی جو یہاں بیان ہوئی، وہ کس زمانے میں پوری ہوئی؟ اس بارے میں نہج البلاغہ کے شارحین کے پاس کافی شواہد موجود ہیں۔ ابن ابی الحدید کہتے ہیں:

''یہ پیش گوئی دو مرتبہ پوری ہوئی ہے جب تمام شہر بصرہ پانی میں غرق ہو گیا تھا، ایک مرتبہ قادر باللہ کے زمانے میں [۱] اور دوسری مرتبہ قائم بامر اللہ کے زمانے میں۔ [۲] یہ دونوں بنی عباس کے خلفا گزرے ہیں، ان دونوں کے دور میں یہ حادثے رونما ہوئے ہیں، جن میں تمام بصرہ غرق ہوا اور جامع مسجد کا کچھ حصہ پانی سے نکلا ہوا تھا بالکل اس پرندے کی طرح، جس کا سینہ پانی کی سطح پر ابھرا رہتا ہے، جس طرح امیر المومنینؑ نے خبردار فرمایا: دریائے فارس سے بڑی اور اونچی اونچی موجیں اٹھیں [۳] اور اطراف کے پہاڑوں سے سیلابی پانی کا ریلا بہنے لگا یہ تمام گھروں اور جو کچھ اس کے راستے میں آیا ان سب کو بہا کر لے گیا اور بصرے کے بہت سارے لوگ بھی مارے گئے، یہ وہ دو تباہ کن حادثے بصرے کے لوگوں میں بہت مشہور ہیں اور اس کی داستان وہ لوگ اپنی ہر آنے والی نسل کو سناتے ہیں۔'' [۴]

[۱] قادر باللہ ۳۸۱ھ میں تخت خلافت پر بیٹھا (الکامل فی التاریخ، جلد ۹، ص ۱۰)
[۲] قائم بامر اللہ ۴۲۲ھ میں تخت پر پہنچا ہے (الکامل فی التاریخ، جلد ۹، ص ۴۱۷)
[۳] یہاں یہ نکتہ قابل توجہ ہے کہ ابن ابی الحدید، ساتویں صدی ہجری میں زندگی کرتے ہیں اور خلیج فارس کو بحر الفارس سے تعبیر کرتے ہیں۔
[۴] شرح نہج البلاغہ۔ ابن ابی الحدید، جلد ۱، ص ۲۵۳

https://downloadshiabooks.com/

سیّد رضیؒ نے اس خطبے کے اختتام پر آخری جملوں کے بارے میں تین روایتیں نقل کی ہیں:

پہلی روایت:

"وَاَیْمُ اللّٰهِ لَتَغْرَقَنَّ بَلْدَتُکُمْ حَتّٰی کَاَنِّیْ اَنْظُرُ اِلٰی مَسْجِدِهَا کَجُؤْجُؤِ سَفِیْنَةٍ اَوْ نَعَامَةٍ جَاثِمَةٍ"

''خدا کی قسم! تمہارا شہر غرق ہونے والا ہے، یہاں تک کہ گویا میں اس کی مسجد کو ایک کشتی کے سینے کی طرح یا ایک بیٹھے ہوئے شتر مرغ کی شکل میں دیکھ رہا ہوں۔''

دوسری روایت:

" کَجُؤْجُؤِ طَیْرٍ فِی لُجَّةِ بَحْرٍ "

''جیسے پرندے کا سینہ گہرے سمندر کی سطح آب پر تیر رہا ہے۔''

تیسری روایت:

"وَفِیْ رِوَایَةٍ اُخْرٰی بِلَادُکُمْ اَنْتَنُ بِلَادِ اللّٰهِ تُرْبَةً: اَقْرَبُهَا مِنَ الْمَاءِ، وَ اَبْعَدُهَا مِنَ السَّمَاءِ، وَ بِهَا تِسْعَةُ اَعْشَارِ الشَّرِّ، اَلْمُحْتَبَسُ فِیْهَا بِذَنْبِهٖ، وَ الْخَارِجُ بِعَفْوِ اللّٰهِ، کَاَنِّیْ اَنْظُرُ اِلٰی قَرْیَتِکُمْ هٰذِهٖ قَدْ طَبَّقَهَا الْمَاءُ، حَتّٰی مَا یُرٰی مِنْهَا اِلَّا شُرَفُ الْمَسْجِدِ، کَاَنَّهٗ جُؤْجُؤُ طَیْرٍ فِیْ لُجَّةِ بَحْرٍ"

''تمہارا شہر خاک کے اعتبار سے سب سے زیادہ بدبودار ہے، جو کہ پانی سے سب سے زیادہ قریب ہے اور آسمان کی نسبت سب سے زیادہ دور ہے، دس میں سے نو برائیاں تم میں پائی جاتی ہیں، یہاں کی پریشانیاں گناہوں کی وجہ سے ہیں، اور اس سے نکل جانے والا عفوِ الٰہی میں داخل ہو گیا، گویا میں تمہاری اس بستی کو دیکھ رہا ہوں کہ پانی نے اسے اس طرح ڈھانپ لیا ہے کہ مسجد کی بلندیوں کے علاوہ کچھ نظر نہیں آ رہا ہے اور وہ بلندیاں بھی ایسی ہیں جس طرح پانی کی گہرائی میں پرندے کا سینہ۔''

توجہ!

قابل توجہ بات یہ ہے کہ پہلی اور دوسری روایت میں کوئی خاص فرق نہیں ہے، سوائے اس کے کہ پہلی روایت قسم سے شروع ہوئی ہے اور صراحت کے ساتھ اس شہر کے غرق ہونے کا ذکر کیا ہے اور اس غرقابی کے نتیجے میں مسجد کے زیرِ آب آنے کے لیے دوسری روایت میں فرماتے ہیں:

https://downloadshiabooks.com/

وَاَیْمُ اللہِ لَتَغْرِقَنَّ بَلْدَتُکُمْ حَتّٰی کَاَنِّیْ اَنْظُرُ اِلٰی مَسْجِدِھَا کَجُؤْجُؤِ سَفِیْنَۃٍ اَوْ نَعَامَۃٍ جَاثِمَۃٍ [۱]

''خدا کی قسم! تمہاری زمین سیلاب کے پانی میں غرق ہوجائے گی، گویا میں (بلندترین نقطہ) مسجد کو دیکھ رہا ہوں کہ کشتی کے سینے کی طرح یا ایسے شتر مرغ کی طرح ہے جس نے خود کو زمین سے چپکا لیا ہے۔''

دوسری روایت میں بہت کم فرق ہے صرف کشتی کے سینے اور پرندے کے سینے کی تشبیہ کے علاوہ کچھ ذکر نہیں ہوا ہے، فرماتے ہیں: "کَجُؤْجُؤِ طَیْرٍ فِیْ لُجَّۃِ [۲] بَحْرٍ" پرندے کے سینے کی طرح جو پانی پر بیٹھا ہے، لیکن تیسری روایت میں اس روایت سے جو اصل خطبے میں نقل ہوئی ہے، کافی فرق نظر آتا ہے۔ اس روایت میں اہلِ بصرہ کی مذمت تین جملوں میں کی گئی ہے:

پہلا جملہ: "بِلَادُکُمْ اَنْتَنُ بِلَادِ اللہِ تُرْبَۃً" تمہارے شہر کی خاک خدا کے شہروں میں سب سے بدبودار خاک ہے، کیونکہ

"اَقْرَبُھَا مِنَ الْمَاءِ، وَاَبْعَدُھَا مِنَ السَّمَاءِ"

''یہ شہر پانی کے سب سے زیادہ نزدیک ہے، اور تمام شہروں سے زیادہ آسمان سے دور ہے۔''

دنیا کے دریا و سمندروں کی سطح ایک جیسی ہوتی ہے اور تمام بندرگاہیں عموماً فاصلے اور سورج کے اعتبار سے بھی ایک ہی طرح کی ہیں، لیکن یہاں پر بعید نہیں کہ امام علیؑ کا اشارہ اسلامی ممالک کے شہروں کی طرف ہو کہ شہر بصرہ ان تمام ممالک کے شہروں کی نسبت سطح زمین سے نیچے ہے اور جو شہر سطح سمندر کے نزدیک ہوں گے ان پر بہت کم سورج کی روشنی پڑتی ہے، کیوں کہ وہاں اس پاس کی ہوا انتہائی غلیظ، بدبودار ہوتی ہے اور جن جانوروں اور کیڑے مکوڑوں کو روشنی اور دھوپ کی کم ضرورت ہوتی ہے، ان آلودگیوں میں کثرت سے پائے جاتے ہیں، اس لیے کہ جراثیم ختم کرنے کے لیے وہاں تیز دھوپ کی ضرورت پڑتی ہے۔

دوسرا جملہ: "وَبِھَا تِسْعَۃُ اَعْشَارِ الشَّرِّ" برائیوں کے دس میں سے نو حصوں نے تم لوگوں کو گھیر رکھا ہے، ممکن ہے یہ بات وہاں کے لوگوں کی اخلاقی پستی اور حالت زار کی طرف اشارہ ہو یا ان کی بندرگاہ کی خاصیت کی طرف اشارہ ہو، کیوں کہ بصرہ مختلف لوگوں کے آمد و رفت کی آماجگاہ بن گیا، اور مغربی لوگوں کے علاوہ دوسرے لوگ جو اخلاقی آلودگیوں میں مبتلا ہوتے ہیں

---

[۱] جاثمہ کا مادّہ جثوم ہے، یہ جمع ہونے اور زمین پر سینے کے بل بیٹھنے اور جس طرح آدمی زمین پر بیٹھتا ہے اور حرکت نہیں کرتا، یا تھکے ہوئے آدمی یا نیم بے ہوشی میں بیٹھنے والے یا سونے والے پر اس کا خصوصی اطلاق ہوتا ہے۔

[۲] لُجَّۃٌ کے معنی وسیع اور گہرے پانی اور موجیں ہیں، اصل میں یہ کسی چیز کے رفت و آمد کے لیے استعمال ہوتا ہے، یہی وجہ ہے کہ سمندری تیز و تند لہروں کو لجۃ کہا جاتا ہے۔ اور وہ افراد جو کسی چیز کو حاصل کرنے کے لیے بے تابی کرتے ہیں انہیں **لجوج** کہا جاتا ہے اور لفظ لجوج کبھی دریائی لہروں کے لیے بھی استعمال ہوتا ہے۔

https://downloadshiabooks.com/

اور باہر ممالک سے وہاں آتے ہیں، لہٰذا تاریخ میں ہم پڑھتے ہیں کہ اسلام کی ابتدائی صدیوں میں بہت سے دردناک حادثات وواقعات اسی شہر بصرہ میں رونما ہوئے ہیں۔

تیسرا جملہ: "اَلْمُحْتَبَسُ فِيْهَا بِذَنْبِهٖ، وَ الْخَارِجُ بِعَفْوِ اللهِ" [1] جو بھی ان آلودگیوں میں گرفتار ہوں گے، وہ اپنے گناہوں کی وجہ سے ہی ہوں گے اور جو وہاں سے نکل گیا وہ عفو رحمت پروردگار کا حق دار ہوگا، ہم پھر اسی تشبیہاتی جملے کی طرف چلتے ہیں (جو تشبیہ گزشتہ روایتوں میں موجود تھی) فرماتے ہیں:

"كَاَنِّیْ اَنْظُرُ اِلٰی قَرْيَتِكُمْ هٰذِهٖ قَدْ طَبَّقَهَا الْمَاءُ، حَتّٰى مَا يُرٰى مِنْهَا اِلَّا شَرَفُ [2] الْمَسْجِدِ، كَاَنَّهٗ جُؤْجُؤُ طَيْرٍ فِيْ لُجَّةِ بَحْرٍ"

"گویا میں دیکھ رہا ہوں کہ سیلاب کے پانی نے تمہارے شہر کو غرق کر دیا ہے اور شہر میں پانی اتنا بھر چکا ہے کہ مسجد کے میناروں اور دیواروں کی بلندیاں اس طرح نظر آتی ہیں، جس طرح پرندے دریا کے تیز وتند لہروں اور گہرے سمندر میں بیٹھے ہوں۔ اس کے علاوہ کچھ نظر نہیں آتا۔"

مختلف روایات میں ان تعبیرات کے ذکر کا مقصد یہ ہے کہ حدیث کے راویوں نے کچھ تعداد نقل کر کے اس کے معنی کر دیے ہیں، یا حدیث کو پورا نقل کرنے میں کوتاہی کی ہے، ورنہ یہ احتمال کہ امامؑ نے تکرار کے ساتھ اس جملے کو کئی جگہ بیان فرمایا ہے اور ہر جگہ عبارت مختلف ہے، یہ کیسے ممکن ہے؟

نکات

پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی جنگ جمل کے بارے میں پیش گوئی

قابلِ ذکر بات یہ ہے کہ پیغمبر اکرمؐ سے جنگ جمل کی داستان اور حضرت عائشہ کا امامِ وقت، وصیِ رسولؐ کے خلاف قیام کرنے سے متعلق پیش گوئیاں اور ان کو خبردار کرنے کے سلسلے میں متعدد روایات بھی تاریخ میں موجود ہیں، من جملہ ان میں

[1] یہ تفسیر اس صورت میں ہے کہ بذنبہ، اور بعفو اللہ میں باء سببیہ ہو، لیکن اگر" باء" الصادق کے لیے ہو تو جملے کا مفہوم یہ ہوگا کہ جو وہاں گناہ میں آلودگیوں میں پڑا ہے تو وہاں کے باقی رہنے والے بھی ان گناہوں سے محفوظ نہیں رہ سکتے، اور وہ جو وہاں سے چلا جائے گا وہ عفوِ الٰہی کے ساتھ نجات پائے گا، لیکن اس کے معنی اوّل ادبی نقطہ نگاہ سے مناسب تر ہیں۔

[2] شرف، ہدف کے وزن پر ہے، بلندی کے معنی میں آتا ہے، شرف، بروزنِ ہنر، اونچی عمارتوں کی چھتوں کے اردگرد تزئین کے لیے لگانے والے دندانوں کے معنی میں ہے۔

https://downloadshiabooks.com/

سے ایک روایت یہ ہے کہ جب حضرت عائشہ جنگ جمل کے لیے نکلنے لگیں تو ایک اونٹ کو تلاش کیا گیا تا کہ ہودج کو اس پر رکھا جا سکے، یعلی بن امیہ نامی ایک شخص، ایک اونٹ لاتا ہے جسے وہ عسکر کہہ کر پکارتا تھا اور وہ سواری کے لیے بھی مناسب تھا۔ حضرت عائشہ نے اسے دیکھا تو بہت خوش ہوئیں اور اونٹ کے مالک نے موقع سے فائدہ اٹھاتے ہوئے اس کی تعریف و توصیف اور قدرت و طاقت کے بارے میں بتانا شروع کر دیا اور باتوں باتوں میں اونٹ کا نام عسکر بتا دیا، جیسے ہی حضرت عائشہ نے اونٹ کا نام عسکر سنا تو چونک اُٹھیں اور بے ساختہ زبان پر کلمہ استرجاع جاری کیا:

"اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیۡہِ رَاجِعُوۡنَ"

اور جلدی سے کہا کہ اس اونٹ کو واپس لے جاؤ، مجھے اس کی ضرورت نہیں ہے۔ جب ان سے اس کی وجہ پوچھی گئی تو بتایا، ''رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے مجھے اس نام کے کسی اونٹ پر سوار ہونے سے منع فرمایا ہے۔'' اس کے بعد حکم دیا کہ کوئی دوسرا اونٹ ڈھونڈ کر لایا جائے، مگر اس کام کے لیے دوسرا مناسب اونٹ کافی تلاش کے بعد بھی نہ مل سکا، مجبوراً اسی اونٹ کی ظاہری چال ڈھال اور وضع قطع کو تبدیل کر کے ان کے پاس لے آئے اور کہا کہ آپ کے لیے یہ پہلے سے قوی اور طاقتور اونٹ لائے ہیں، اس پر آپ خوش ہو گئیں۔

ابن ابی الحدید اس واقعے کو نقل کرنے کے بعد ابو مخنف سے ایک اور واقعہ بھی لکھتے ہیں، ابو مخنف کہتا ہے:

حضرت عائشہ بصرہ کی طرف جاتے ہوئے راستے میں ''حَوۡاَبۡ'' کے نام سے مشہور ایک آبادی سے گزریں، وہاں کے کتوں نے ان پر بھونکنا شروع کیا، کتوں کا بھونکنا اس قدر شدید تھا کہ کارواں والوں کے اونٹ بھڑک گئے، اور انہوں نے آگے بڑھنے سے انکار کر دیا، حضرت عائشہ کے ساتھیوں میں سے کسی نے کہا: حواب کے کتوں کو دیکھو! کہ کتنے ہیں اور کس قدر بھونک رہے ہیں، حضرت عائشہ نے جلدی سے اونٹ کی مہار کھینچی اور رک گئیں اور کہا کہ کیا یہ مقامِ حواب ہے؟ جواب دیا گیا، ہاں یہ حواب ہے۔ تو بی بی عائشہ نے فرمایا: مجھے اس جگہ سے جلدی واپس لے چلو، کیوں کہ میں نے پیغمبر اکرمؐ سے اس جگہ پر رونما ہونے والے واقعے کے بارے میں سنا ہے اور آپؐ نے مجھے خبردار کیا تھا اور مجھے اس جگہ پر آنے سے روکا تھا، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے مجھ سے فرمایا ''اُس دن سے ڈرو! جس دن راستہ چلتے چلتے مقام حواب کے کتے تمہارے اوپر شدت سے بھونکیں گے۔'' آج یہ واقعہ میرے ساتھ پیش آیا ہے اس لیے مجھے یہاں سے واپس لے چلو۔

قافلے میں سے ایک شخص آگے بڑھا اور حضرت عائشہ کے ارادے کو بدلنے کے لیے کہنے لگا کہ آپ بے فکر رہیے ہم حواب کی جگہ کو پیچھے چھوڑ آئے ہیں۔ حضرت عائشہ نے پوچھا: تمہارے پاس کوئی گواہ ہے؟ جس پر قافلے کے لوگ آس پاس کے گاؤں سے پچاس عرب بدوؤں کو پیسے دے کر جھوٹی گواہی کے لیے لائے اور کہا کہ تم لوگ کہنا یہ جگہ حواب نامی علاقہ

https://downloadshiabooks.com/

نہیں ہے، ان سب نے یک زبان ہو کر کہا کہ یہ مقام حواب نہیں، بی بی وہ جگہ پیچھے رہ گئی ہے۔ حضرت عائشہ ان کی باتوں میں آ گئیں اور آپ نے اپنا سفر جاری رکھا۔

عجیب بات یہ ہے کہ اتنی چھوٹی سی بات وہ بھی ایک مرتبہ کی کہی ہوئی، جس نے حضرت عائشہ کو اپنی زندگی کا سب سے بڑا مشن چھوڑ کر واپس ہونے پر مجبور کیا، لیکن وہ تمام روایات جو پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے امیر المومنین علیہ السلام کے بارے میں صراحت کے ساتھ بیان فرماتے ہوئے سنی تھیں جبکہ بہت سی احادیث کی تو خود راوی ہیں، ان سب روایات نے خلیفۂ وقت وصی رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے خلاف قیام سے کیوں نہیں روکا؟ یہ خود عجائبات میں سے ایک عجوبہ ہے، اس واقعے سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ حضرت عائشہ آسانی سے فریب کاروں کی باتوں میں آ جاتی تھیں اور اپنا عقیدہ و نیت فوراً بدل دیتی تھیں۔

اہل بصرہ کی مذمّت

مذکورہ خطبے میں اہلِ بصرہ کی مذمت میں جو کچھ بیان ہوا، اس میں کچھ حصہ بصرہ کی آب و ہوا، شہر کی جائے وقوع اور سماجی وجغرافیائی کیفیت سے بھی متعلق ہو سکتا ہے (کیونکہ بصرہ ایک بندرگاہ تھی اور ایسی جگہ پر ہر قسم کے لوگ جو ہر قسم کی فکری اور اخلاقی برائیوں سے آلودگی کے ساتھ موجود ہوتے ہیں اور یہ ہر جگہ ہوتا ہے) لیکن وہاں نیک لوگوں کا ایسا گروہ بھی تھا جو اس قسم کے بدکردار لوگوں سے کوئی موافقت اور رشتہ نہیں رکھتا تھا (اچھے اور برے لوگ ہر جگہ اور ہر دور میں ہوتے ہیں) اس مذمت کا اشارہ اُن افراد کی طرف ہے جو اُس زمانے میں تھے، اور جو بآسانی طلحہ اور زبیر کے نفاق کا شکار ہو گئے اور امام ؑ سے کی گئی بیعت کو توڑ ڈالا اور اسی بنا پر سب کے سب اس راہِ خطا پر چل پڑے اور خطا کاروں میں شامل ہو گئے، اسی وجہ سے اس بات کی کوئی ممانعت نہیں کہ دوسرے نو (۹) معنوں میں وہاں نیک اور باکردار افراد ہوں۔

یہی وجہ ہے کہ بعض روایات میں اس شہر کی تعریف وتوصیف بھی آئی ہے، من جملہ ان میں سے ایک امیر المومنینؑ کے کسی خطبے میں یہ نقل ہوا ہے کہ جس میں آپؑ اس شہر میں رونما ہونے والے حادثات کا ذکر کرتے ہوئے اہل بصرہ سے مخاطب ہو کر فرماتے ہیں: ''خداوند متعال نے مسلمانوں کے شہروں میں کسی شہر کو کوئی ایسی شرافت اور کرامت نہیں بخشی جو تمہیں ان سے زیادہ عطا نہ کی ہو، تمہارے اس شہر کے قراء قرآن مجید کے بہترین قاری ہیں، اس شہر کے زاہد لوگوں کا شمار بہترین زاہدوں میں ہوتا ہے، اور عبادت گزار دنیا کے بہترین عبادت گزاروں میں سے ہیں، اس شہر کے تاجر سب سے زیادہ سچے اور ایمان دار تاجروں میں سے ہیں، اس شہر کے بچے ذہین ترین، اور اس شہر کی خواتین قناعت پسند ہیں۔''[1] اس میں کوئی قباحت نہیں

---

[1] شرح ابن ابی الحدید، جلد ۶، ص ۲۲۵

https://downloadshiabooks.com/

کہ کوئی قوم اور ملت تعلیم و تربیت، خودسازی، تہذیبِ نفوس کے اثر سے پھلے پھولے اور ترقی کرے اور اخلاقی برائیوں کو چھوڑ کر فضائل و شرف کی طرف قدم بڑھائے، خاص طور پر ان کے اخلاقی مفاسد ور سوائی، جنگ جمل کے بے مقصد پیغام کی طرح ان کو احساس کمتری کا شکار نہ کردے، بلکہ ایسا جھنجوڑے کہ ان میں ہلچل مچ جائے اور وہ بیدار رہوں۔

دائرۂ اخلاق کی تاثیر

امیر المومنینؑ کے تعبیرات سے اس خطبے میں دو اور نکات روشن ہوتے ہیں:

نکتہ اوّل:

انسانوں کی اخلاقی خصلتوں کا طبیعی اور جغرافیائی حالات کے زیر اثر آنا، فرماتے ہیں:

"مَاؤُكُمْ زُعَاقٌ...بِلَادُكُمْ اَنْتَنُ بِلَادِ اللهِ تُرْبَةً اَقْرَبُهَا مِنَ الْمَاءِ وَ اَبْعَدُهَا مِنَ السَّمَاءِ"[1]

نکتہ دوّم:

انسانی اخلاق پر سماجی حالات کا کیا اثر ہے، فرماتے ہیں:

"وَالْمُقِيْمُ بَيْنَ اَظْهُرِكُمْ مُرْتَهَنٌ بِذَنْبِهِ"

لیکن یہ بات مسلّم ہے کہ یہ تاثیریں کسی حد تک ماحول فراہم کرنے کے لیے ہیں اور یہ علت تامّہ نہیں ہے، یہی وجہ ہے کہ اس قسم کی تاثیروں میں ہمیشہ اچھے اور شائستہ افراد پیدا ہوتے ہیں جبکہ اس کے برعکس وہ علاقے جہاں آب و ہوا موافق اور اخلاق و خصلتیں سالم ہوں، ان پر سماجی تاثیریں بہتر مرتب ہوتی ہیں، یعنی شرپسند اور فساد و فتنہ پھیلانے والے بھی ایسے ماحول میں رہ کر اچھی سیرت کے مالک ہو سکتے ہیں۔

[1] بحار الانوار، جلد ۳۲، ص ۲۵۶

https://downloadshiabooks.com/

https://downloadshiabooks.com/

چودہواں خطبہ

وَمِنْ كَلَامٍ لَهُ عَلَيْهِ السَّلَامُ

فِيْ مِثْلِ ذَالِكَ "اَرْضُكُمْ قَرِيْبَةٌ مِنَ الْمَاءِ، بَعِيْدَةٌ مِنَ السَّمَاءِ. خَفَّتْ عُقُوْلُكُمْ، وَ سَفِهَتْ حُلُوْمُكُمْ، فَاَنْتُمْ غَرَضٌ لِنَابِلٍ، وَاُكْلَةٌ لِاٰكِلٍ، وَفَرِيْسَةٌ لِصَائِلٍ" [1]

اس خطبے میں مذکورہ مطالب کے بارے میں مزید فرماتے ہیں: تمہاری زمین پانی سے قریب تر اور آسمان سے دور ہے، تمہاری عقلیں ہلکی اور تمہاری دانائی احمقانہ ہے، تم ہر تیرانداز کا نشانہ، ہر بھوکے کا لقمہ اور ہر شکاری کا شکار ہو۔

خطبہ، ایک نگاہ میں

جنگ جمل کے اختتام پر خطبے کا یہ حصہ جو ابھی ذکر ہوا، آپؑ نے ارشاد فرمایا ہے۔ یہ تینوں حصے ایک ہی خطبے میں آ سکتے تھے، لیکن سیّد رضیؒ نے ان کو الگ الگ کر کے ذکر کیا ہے، بہرحال اس حصے میں بصرہ کے لوگوں کو سرزنش کرتے ہوئے فرمایا: یہ لوگ عقل اور فکر کی کمی کی وجہ سے منافقت پھیلانے والوں کا آلہ کار بن جاتے ہیں اور ہوس پرستوں کی خواہشات کے بھینٹ چڑھ جاتے ہیں اور انہیں خبردار کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ تم لوگ اپنی آئندہ کی فکر کرو اور یہ کام دوبارہ نہ ہونے پائے۔

[1] مصادرِ نہج البلاغہ میں اس طرح آیا ہے کہ مرحوم شیخ مفید نے کتاب جمل میں، ص ۲۱۷ پر واقدی سے اس طرح نقل کیا ہے کہ جب حضرت امام علی علیہ السلام فتح یاب ہوئے تو جنگی غنائم کو لشکر میں تقسیم کرنے کے بعد اوپر کا خطبہ ارشاد فرمایا۔ اس خطبے کو کچھ کمی وزیادتی کے ساتھ، ابوحنیفہ دینوری نے کتاب الاخبار الطوال میں اور ابن قتیبہ نے عیون الاخبار میں نقل کیا ہے، (مصادر نہج البلاغہ، جلد ۱، ص ۳۴۸)

https://downloadshiabooks.com/

شرح وتفسیر

پھر اہلِ بصرہ کی مذمّت

جس طرح پہلے بیان ہوا کہ یہ حصہ بھی اسی خطبے کا ایک جز ہے جو تشریح طلب ہے۔امیر المومنینؑ جنگ جمل کے بعد اہل بصرہ کی خصلتوں کے بارے میں بطور اعتراض فرماتے ہیں۔مختصر یہ کہ بصرہ والے وہاں کے جغرافیائی حالات کے پیش نظر کچھ خاص شرائط اور بری صفات کے ساتھ جو غالباً لازم وملزوم ہیں، زندگی گزارنے پر مجبور ہیں،ان مطالب کو سات (۷) نکات میں بیان کرتے ہوئے پہلے اور دوسرے جملے میں فرماتے ہیں:

"اَرْضُكُمْ قَرِيْبَةٌ مِنَ الْمَاءِ، بَعِيْدَةٌ مِنَ السَّمَاءِ"

''تمہاری زمین سمندر کے پانی کے قریب ہے اور آسمان کی روشنی سے محروم ہے۔''

ان دو جملوں میں ان کے مادّی حالات کی طرف اشارہ ہوا ہے یعنی شہر کا دریا اور بہت بڑے نالوں کے نزدیک ہونا اور فطری طور پر آسمان کی روشنی سے دور ہونا ہے، یا ان جملوں کا مطلب ان کے معنوی حالات کی طرف اشارہ ہے کہ تمہارے دلوں کی سرزمین امامؑ کے وجودِ مبارک کے آب حیات کے نزدیک تو ہے، لیکن توفیق ورحمت الٰہی کے آسمان سے دور ہے، یا ان میں سے ایک جملہ مادّی حالات کی طرف اور دوسرا جملہ معنوی اعتبار سے حالات کو بیان کر رہا ہے۔

اس بارے میں نہج البلاغہ کے شارحین نے کافی بحثیں کی ہیں، لیکن ظاہری عبارت سے معلوم ہوتا ہے کہ اس کے اصل معنی وہی ہیں جو زمین وآسمان کا ظاہری مفہوم ہے، اس کے معنیِ اوّل یہی ہیں کہ ان کی زمین پانی کے نزدیک ہونے کہ وجہ سے زندگی میں ساحلِ سمندر کی مشکلات موجود ہیں۔خصوصاً بصرہ کی سرزمین کہ جس کے کنارے سے بہت بڑا نالہ بہتا ہے جس کا پانی جا کر دریا میں گرتا ہے اور شدید مدّ وجزر پیدا ہوتے ہیں۔

اس بحث کو ہم یہاں پر ختم کر دیتے ہیں، مگر یہ نکتہ کہ آسمان سے دور ہے، یہ کیسے ممکن ہے؟ اس بارے میں نہج البلاغہ کے شارحین کا ایک گروہ کہتا ہے کہ علمائے نجوم کی فراہم کردہ اطلاعات کے مطابق یہ ثابت ہوتا ہے کہ زمین کا وہ آباد علاقہ جو آسمان سے بہت دور ہے وہ بصرہ کے قریب ایک گاؤں ہے کہ جس کا نام ابلہ ہے، لیکن اس دور کے دانشوروں کے نزدیک یہ بات ظاہراً قابل قبول نہیں ہے، کیوں کہ بصرہ کی زمین دنیا کے تمام بندرگاہوں کی طرح سطح سمندر کے برابر ہے، اور ہم اچھی

https://downloadshiabooks.com/

طرح جانتے ہیں کہ دنیا کے تمام سمندر ایک دوسرے سے ملے ہوتے ہیں اور ایک سطح پر برقرار ہیں، جب کہ ایسے علاقے بھی ہیں کہ وہاں سمندر کی سطح زمین سے بہت نیچے ہے، لیکن ایک امکان یہ بھی ہے کہ یہاں امامؑ کی مراد تمام زمین سے نہ ہو، بلکہ ان شہروں سے مراد ہو جہاں مسلمانوں کی حکومت تھی اور اس زمانے میں مشہور تھے۔

تیسرے اور چوتھے جملے میں فرماتے ہیں:

"خَفَّتْ عُقُوْلُكُمْ، وَ سَفِهَتْ حُلُوْمُكُمْ"

''تمہاری عقلیں بھاری، موٹی اور تمہارے افکار نادان اور احمقوں کی طرح ہیں۔''

امامؑ کے اس بیان پر واضح دلیل وہی بات ہے جس کا اس سے پہلے والے خطبوں میں ذکر ہو چکا ہے کہ لوگ آسانی کے ساتھ طلحہ و زبیر کی ہوس و خواہشات کے آگے سرِ تسلیم خم کر گئے، اور حضرت عائشہ کے اونٹ کو بچانے کے لیے ہزاروں کو قتل کروا دیا اور جنگ کا انجام رسوائی کے ساتھ ہوا اور اپنے کیے پر پشیمان ہوئے۔

یہاں ان دو کلموں کے درمیان یعنی عقول عقل، کی جمع ہے اور حُلُوْمُ جمع ہے حُلُمْ کی، ان دونوں میں جو فرق ہے، مفردات راغب میں یوں آیا ہے کہ حُلُمْ اور حِلمْ دونوں عقل کے آثار ہیں۔ دوسرے لفظوں میں عقل انسان کی قوت ادراک کا نام ہے؛ نفس کو قابو میں رکھنا اور کام کے انجام کے بارے میں فکر کرنا اسی قوت کے نتائج ہیں۔ مگر بصرہ کے لوگ چونکہ عقل سے پیدل تھے اور فطری طور پرست اور کاہل تھے اور اس وجہ سے غلط تبلیغ کرنے والے ہوس پرستوں کے جال میں جلدی پھنس جاتے تھے، اور یہ دیکھے بغیر کہ یہ لوگ حق پر ہیں یا نہیں ان کے کھودے ہوئے گڑھے میں کود پڑتے تھے۔

اسی لیے امامؑ پانچویں، چھٹے اور ساتویں جملے میں فرماتے ہیں

حضرت امام علی علیہ السلام ان جملوں میں فرماتے ہیں:

"فَأَنْتُمْ غَرَضٌ[۱] لِنَابِلٍ[۲] وَ أُكْلَةٌ لِآكِلٍ، وَ فَرِيْسَةٌ[۳] لِصَائِلٍ[۴]"

''تم لوگ تیر اندازوں کے لیے بہترین ہدف ہو، مفت خوروں کے لیے نرم لقمہ ہو اور شکار کھیلنے والوں اور درندوں کے لیے بہترین شکار ہو۔'' ظاہر ہے کہ سادہ لوح افراد اور بے عقل لوگ دین و ایمان کے شکاریوں، مال و مقام کے بھوکوں اور سیاسی ہوس پرستوں کے ہاتھوں میں گرفتار ہو جاتے ہیں۔

---

[۱] غرض، ہدف کے معنی میں آیا ہے اور حملے کے وقت نشانے پر نظر رکھنے اور ہر قسم کے ہدف پر بھی اس کا اطلاق ہوتا ہے۔

[۲] نابل، کا مادّہ نبل ہے تیر پھینکنے کے معنی میں آتا ہے۔

[۳] فریسۃ، کا مادّہ فرس ہے بروزنِ فرض، اس کے معنی کوٹنا ہیں جیسے وحشی جانور اپنے شکار کو زمین میں پٹختا ہے۔

[۴] صائل، کا مادّہ وصول وصولۃ ہے۔ اس کے معنی غیظ و غضب کے ساتھ حملہ کرنا ہے۔

https://downloadshiabooks.com/

پس انسانی معاشرے کو ان مکاروں اور فتنہ گروں سے بچانے کا واحد راستہ یہ ہے کہ لوگوں کے سوچنے کی صلاحیت کو بہتر کیا جائے اور ان کو سماجی اور سیاسی مسائل سے آگاہ کیا جائے، یہی وہ چیز ہے جس پر اسلامی تعلیمات میں زور دیا گیا ہے اور نماز جمعہ کے خطبہ کا ایک فلسفہ یہی ہے کہ مستقل طور پر لوگوں کو حالات سے باخبر رکھا جائے اور ان شر پسندوں سے بچایا جائے۔

اگر بصرہ کے لوگ اپنے بُرے کاموں کو سمجھتے اور حالات کے تقاضوں کو مدنظر رکھتے تو طلحہ اور زبیر جیسے سیاسی شعبدہ بازوں کے دامِ فریب میں نہ پھنستے، جنہوں نے امامؑ کی بیعت کی اور پھر خود اس سے منحرف ہو گئے اور امامؑ کے خلاف جنگ کے لیے اٹھ کھڑے ہوئے، ہزاروں افراد کو قتل کروایا اور آخر میں خود قتل ہو کر ذلت اور رسوائی کا شکار ہو گئے۔

ان تین جملوں "فَأَنْتُمْ غَرَضٌ لِنَابِلٍ" تم تیر اندازوں کے لیے بہترین ہدف ہو۔ "وَأُكْلَةٌ لِآكِلٍ" کھانے والوں کے لیے بہت نرم اور آسان لقمہ ہو اور "وَفَرِيسَةٌ لِصَائِلٍ" شکاریوں اور درندوں کے لیے بہترین شکار ہو، ان تینوں کے درمیان کیا ربط ہے؟ کیا امامؑ نے ایک ہی بات کو تین مختلف انداز میں بیان کیا ہے یا ہر جملہ ایک مختلف مفہوم کا حامل ہے۔۔۔اس پر غور کرنا چاہیے۔لیکن یہ بعید از قیاس نہیں کہ یہ جملے مختلف پہلوؤں اور فاصلوں کا اظہار کرتے ہوں۔

جیسے جملہ اوّل دور سے نشانہ لینے کی طرف اشارہ کرتا ہے یعنی اگر تم سیاسی بازیگروں کی دسترس سے دور بھی ہو، تب بھی وہ تمہیں شکار کر لیں گے۔ جملہ سوّم قریب سے ہونے والے حملے کی طرف اشارہ ہے جبکہ جملہ دوّم میں ان جملوں میں شکار ہونے کا نتیجہ بیان کیا گیا ہے یعنی تم ان کا آسان لقمہ بن جاتے ہو۔(غور کیجیے)

یہ بات قابل توجہ ہے کہ ان جملوں میں امامؑ نے جن لوگوں کو سرزنش کی ہے، یہ وہی گروہ ہیں جنہوں نے منافقت کی اور منافقوں کے آلۂ کار بن گئے، ورنہ بصرے میں اُس زمانے اور آنے والے زمانوں میں بھی ایسی شخصیات رہی ہیں، جن کی امامؑ نے تعریف و توصیف کی ہے۔

https://downloadshiabooks.com/

پندرہواں خطبہ

وَمِنْ كَلَامٍ لَهُ عَلَيْهِ السَّلَامُ

فِيمَا رَدَّهُ عَلَى الْمُسْلِمِينَ مِنْ قَطَائِعِ [۱] عُثْمَانَ

اس موضوع سے متعلق کہ آپؑ نے خلیفۂ سوّم کی جاگیروں کو مسلمانوں کو واپس دے دیا۔

وَ اللهِ لَوْ وَجَدْتُهُ قَدْ تُزُوِّجَ بِهِ النِّسَاءُ، وَ مُلِكَ بِهِ الْإِمَاءُ لَرَدَدْتُهُ فَإِنَّ فِي الْعَدْلِ سَعَةً، وَ مَنْ ضَاقَ عَلَيْهِ الْعَدْلُ فَالْجَوْرُ عَلَيْهِ أَضْيَقُ [۲]

خدا کی قسم! اگر میں کسی مال کو اس حالت میں پاتا کہ اسے عورت کا مہر بنا دیا گیا ہے یا کنیز کی قیمت کے طور پر دیدیا گیا ہے تو اسے بھی واپس کرادیتا، اس لیے کہ انصاف میں بڑی وسعت پائی جاتی ہے اور جس کے لیے انصاف میں تنگی ہو اس کے لیے ظلم میں اور بھی تنگی ہوگی۔

خطبہ، ایک نگاہ میں

حضرت علیؑ نے یہ خطبہ بیعت کے بعد ارشاد فرمایا اور ان تمام لوگوں کو متنبہ کیا، جنہوں نے خلیفۂ سوّم کے زمانے میں بیت المال کو لوٹا، یا خلیفہ نے انہیں بخش دیا۔ آپؑ نے ان سب کو اطلاع دی کہ یہ تمام مال بیت المال میں واپس جمع کرادیں، اگر واپس نہیں لوٹایا تو زبردستی لیا جائے گا۔ اس طرح امامِ عالی مقامؑ نے طمع گروں کی امیدوں پر پانی پھیر دیا، اور خطبے کے آخر میں ایک مختصر اور جامع جملے میں عدالت کی اہمیت کو بیان فرمایا۔

[۱] قطائع، جمع قطیعہ ہے۔ وہ زمین مراد ہے جو بیت المال سے تعلق رکھتی ہے، جسے حاکم اپنے منظورِ نظر افراد کو خراج کی صورت میں بخش دیتا ہے، عثمان کے دور میں بنی امیہ اور ان کے اردگرد چکر لگانے والے خصوصی طور پر بیت المال کے ایک بڑے حصے سے بہرہ مند ہوتے تھے۔

[۲] مصادر نہج البلاغہ میں آیا ہے کہ یہ خطبہ کتاب ''الاوائل'' مؤلف: ابوھلال عسکری، ''دعائم الاسلام'' مؤلف: قاضی نعمان مصری اور جناب مسعودی کی کتاب ''اثبات الوصیۃ'' میں بھی کمی بیشی کے ساتھ آیا ہے۔ (مصادر نہج البلاغہ، جلد ۱، ص ۳۵۰۔)

https://downloadshiabooks.com/

شرح وتفسیر

خدا کی قسم، غصب شدہ مال کو واپس لوٹاؤں گا

جیسا کہ خطبے سے ظاہر ہوتا ہے کہ یہ خطبہ خلافتِ ظاہری کے آغاز میں ارشاد فرمایا ہے۔ ابن ابی الحدید، ابن عباسؓ سے نقل کرتے ہیں کہ یہ خطبہ حضرت امام علی علیہ السلام نے اپنی بیعت کے دوسرے دن ارشاد فرمایا، البتہ ابن عباسؓ کی عبارت سیّد رضیؒ کی عبارت سے تھوڑی مختلف ہے، لیکن مطلب ایک ہی ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ یہ گفتگو اس پانی کی طرح تھی جو (لوگوں کے سینوں میں) جلتی ہوئی آگ پر پھینکا گیا ہو، جس سے (برسوں سے) ان کے سینوں میں سلگتی ہوئی آگ بجھ گئی، جنہیں خلیفہ سوّم کے زمانے میں ہونے والی ناانصافیوں پر شدید اعتراض تھا۔ یہاں تک کہ ایک طبقہ اسلامی حکومت اور اس کے قوانین سے رُوگرداں ہو گیا تھا، امامؑ کے اس عمل سے سب کو سکون ہوا کہ اب اسلامی تاریخ کا ایک نیا باب رقم ہوگا اور وہ حکومت اسلامی جو اپنی راہ سے بھٹک گئی تھی، اب اصل راہ پر آ جائے گی۔ اگر یہ جملے ارشاد نہ کیے گئے ہوتے اور ان پر عمل نہ کیا گیا ہوتا تو مدینے میں امن و امان قائم نہ ہوتا اور خلیفہ سوّم اور ان کے دوستوں پر حملہ کرنے والوں سے بھی بڑا مشتعل ہجوم اکٹھا ہو جاتا اور پہلے سے بھی بہت زیادہ خوں ریزی ہوتی۔

بہرحال خطبے کے آغاز میں فرماتے ہیں:

وَاللهِ لَوْ وَجَدْتُهُ قَدْ تُزُوِّجَ بِهِ النِّسَاءُ، وَمُلِكَ بِهِ الْإِمَاءُ، لَرَدَدْتُهُ

”خدا کی قسم! اگر مجھے وہ مال بھی ملے گا (جو بیت المال سے ناجائز طریقے سے لیا گیا ہے یا بغیر کسی وجہ کے اسے بخش دیا گیا ہے) جو عورتوں کے مہر میں یا کنیزوں کی خریداری میں خرچ کر دیا گیا ہے (اور لوگوں کی زندگی کا حصہ بن گیا ہے) تب بھی میں اسے واپس لے کر بیت المال میں جمع کروا دوں گا، اور پچھلی بے اعتدالیوں اور ناانصافیوں کی ہرگز اجازت نہیں دوں گا۔“ اس کے بعد مزید فرمایا:

فَإِنَّ فِي الْعَدْلِ سَعَةً وَمَنْ ضَاقَ عَلَيْهِ الْعَدْلُ، فَالْجَوْرُ عَلَيْهِ أَضْيَقُ

ممکن ہے کہ کچھ لوگوں کو اس کام سے جو معاشرے میں عدل کا ضامن ہے، تکلیف پہنچے اور انہیں گھٹن اور تنگی کا احساس ہو لیکن یہ ایک بڑی غلط فہمی ہے، کیوں کہ عدالت معاشرتی بہبودی کا ذریعہ ہے، جس کسی کے لیے عدالت میں تنگی محسوس ہو، ظلم مزید تنگی کا سبب بنے گا۔

https://downloadshiabooks.com/

امامؑ نے اس کلام کے ابتدائی جملوں میں پہلے مصمم ارادکیا کہ آپؑ وہ تمام اموال جو بیت المال سے ناجائز اور غاصبانہ طریقے سے حاصل کیا گیا تھا واپس لے کر بیت المال میں جمع کروادیں گے، خواہ یہ مال ایسے خاص اور اہم مصارفِ زندگی مثلاً عورتوں کا مہر، یا کنیزوں کی خریداری ہی میں کیوں نہ صرف ہوا ہوتا کہ لوگوں کو علم ہو جائے کہ اس سے قبل جو عمل کیا گیا تھا وہ اسلامی قوانین کے مطابق نہیں تھا اور آئندہ اس قسم کا کوئی عمل نہیں دوہرایا جائے گا۔

اس کے بعد امامؑ اپنے اس مصمم ارادے کی منطق اور دلیل کے ذریعے وضاحت فرماتے ہیں: ''یہ عدل کا سب سے روشن اور خوبصورت پہلو ہے کہ اس کی وجہ سے معاشرے کے ہر طبقے میں سکون اور راحت کا احساس ہوتا ہے۔ اسے عوام کی رضا حاصل ہوتی ہے اور ظلم اور تشدد کی آگ سرد پڑ جاتی ہے، بالآخر امامؑ ان لوگوں کو جن کے ہاتھ اس ناجائز اور غاصبانہ دولت سے آلودہ تھے اور جن کے لیے یہ نظامِ عدل سخت تکلیف دہ اور ناقابلِ قبول تھا، انہیں سمجھاتے ہوئے فرماتے ہیں: یہ تمہارے لیے بھی فائدہ مند ہے، کیونکہ اگر کسی کے لیے عدل تکلیف دہ ہو تو ظلم اس سے کہیں زیادہ تکلیف دہ ہوگا، کیونکہ عدل کی صورت میں وہ اپنے حلال اور جائز مال کے مالک رہیں گے صرف حرام اور ناجائز مال واپس کرنا پڑے گا لیکن ظلم کی صورت تمام مال خطرے میں پڑ سکتا ہے چاہے وہ جائز ہو یا ناجائز، یہ صحیح ہے کہ ممکن ہے ظلم کچھ قلیل عرصے کے لیے ظالم کے لیے فائدہ مند ہو لیکن طویل مدت کے لیے فائدہ مند نہیں ہوسکتا، تاریخ گواہ ہے کہ جب ظالم حکمران اپنے انجام کو پہنچے تو اپنے ہی ظالمانہ قوانین کا شکار ہوئے، یہاں تک کہ نزدیک ترین افراد اور دوستوں نے بھی ان سے خیانت کی اور آستین کا سانپ قرار پائے۔

یہاں یہ بات قابلِ توجہ ہے کہ بقول کلبی (معروف مورّخ) جسے ابن ابی الحدید کے مطابق امامؑ نے اس خطبے کو ارشاد فرمانے کے بعد حکم دیا کہ وہ تمام اسلحہ جو خلیفۂ سوّم کے گھر مسلمانوں پر حملہ کرنے کے لیے جمع کیا گیا تھا اور وہ تمام مال جو بیت المال میں سے ناجائز طریقے سے لیا گیا تھا واپس بیت المال میں جمع کروایا جائے، لیکن جو اموال اس نے جائز طریقے سے حاصل کیا ہے ان سے ہرگز تعرض نہ کیا جائے، اس کے ساتھ ہی یہ بھی حکم جاری فرمایا کہ تمام مال جو خلیفۂ سوّم نے بغیر کسی استحقاق کے لوگوں کو بخش دیا تھا بیت المال میں واپس جمع کروایا جائے، یہ حکم نامہ عمرو بن عاص کو بھی ملا، جو اس وقت شام میں تھا۔ اس نے وقت ضائع کیے بغیر امیر شام کو خط لکھا کہ جو کچھ تجھ سے ہوسکے فوراً انجام دے، کیوں کہ فرزند ابوطالب علیہ السلام نے اس حکم نامے کے ذریعے تجھے تمام مال و دولت سے علیحدہ کر دیا ہے، بالکل اسی طرح، جس طرح کسی درخت سے عصا بنانے کے لیے اس پر سے چھال اتار دی جاتی ہے۔

امامؑ کے اس جملے ''مَنْ ضَاقَ عَلَيْهِ الْعَدْلُ، فَالْجَوْرُ عَلَيْهِ أَضْيَقُ'' (جس پر عدل کا برداشت کرنا دشوار ہو اس کے لیے ظلم برداشت کرنا زیادہ سخت اور دشوار ہوگا) کا کیا مطلب ہوسکتا ہے، مفسرین نہج البلاغہ نے اس سلسلے میں کئی

https://downloadshiabooks.com/

تفسیریں پیش کی ہیں، جن میں سے ایک اوپر بیان کی جا چکی، دوسری تفسیر یہ ہے کہ قیامِ عدل اس لیے لازم ہے کہ یہ خداوند متعال کی خوشنودی کا سبب ہے۔ ساتھ ہی مخلوقِ خدا کی بھی خوشنودی حاصل ہوتی ہے، اس کے علاوہ یہ نظام ہستی سے بھی ہم آہنگ ہوتا ہے جبکہ ظلم خدائے متعال اور لوگوں کی ناراضی اور دنیا و آخرت میں تباہی کا باعث بن جاتا ہے، مزید یہ کہ اگر کسی شخص سے کوئی چیز عادلانہ طریقہ سے لی جائے اور یہ عمل اس کے لیے تکلیف دہ ہو، تو یقیناً اگر ظالمانہ طریقے سے لیا جائے اس کے لیے کہیں زیادہ تکلیف دہ ہوگا۔ ایک اور بات یہ ہے کہ اگر کوئی شخص عدل و انصاف کا متحمل نہیں ہوسکتا اور اس سے نفرت کرتا ہے تو کیسے ممکن ہے کہ وہ ظلم و جور کو برداشت کر سکے، عین ممکن ہے کہ یہ چاروں تفسیریں اس مختصر اور جامع جملے میں جمع ہوں۔

نکات

انسانی معاشرے میں عدل کے آثار

نہج البلاغہ میں بار بار عدالت و انصاف کے مسئلے کا ذکر کیا گیا۔ بنیادی طور پر امیر المومنینؑ انسانی معاشرے کے بانیوں میں سے ہیں۔ مشہور مسیحی قلم کار جارج جرداق کے مطابق آپؑ عدالتِ انسانی کی آواز ہیں، جو تاریخ کے گلے سے نکلتی ہے، اس بنا پر اس کی کتاب کا نام "اَلْاِمَامُ عَلِیٌّ صَوْتُ الْعَدَالَۃِ الْاِنْسَانِیَّۃِ" ہے، اسلامی روایات حضرت علی علیہ السلام کی گفتگو سے ہم آہنگ دکھائی دیتی ہیں، امام سجاد علیہ السلام کی ایک گفتگو میں ہے کہ فرماتے ہیں:

"اَلْعَدْلُ اَحْلٰی مِنَ الْمَاءِ یُصِیْبُہُ الظَّمْاٰنُ"

عدل اس پانی سے زیادہ شیریں ہے، جو تشنہ کاموں کی پیاس بجھاتا ہے۔"

"جس طرح پیاسے کی زندگی پانی میں ہے، اسی طرح انسانی معاشرے کی زندگی عدالت میں ہے۔" [۱]

ایک دوسری روایت امام جعفر صادق علیہ السلام سے ہے:

"اَلْعَدْلُ اَحْلٰی مِنَ الشَّھْدِ وَ اَلْیَنُ مِنَ الزُّبْدِ وَ اَطْیَبُ رِیحاً مِنَ الْمِسْكِ"

"عدل شہد سے زیادہ شیریں، مکھن سے زیادہ نرم، اور مشک سے زیادہ خوشبودار ہے۔" [۲]

---

[۱] بحار الانوار، جلد ۲۷، ص ۳۶

[۲] بحار الانوار، جلد ۲۷، ص ۳۹

https://downloadshiabooks.com/

امیر المومنین علیہ السلام کی ایک دوسری حدیث میں روایت ہے:

"اَلْعَدْلُ اَسَاسٌ بِهٖ قِوَامُ الْعَالَمِ"

''عدل وہ بنیاد ہے جس پر پوا عالم قائم ہے۔''[۱]

ایک اور بہت خوبصورت اور پُرمعنی جملے میں حضرتؑ ارشاد فرماتے ہیں:

"مَا عُمِّرَتِ الْبُلْدَانُ بِمِثْلِ الْعَدْلِ"

''شہر اور حکومتیں عدل کے بغیر آباد نہیں ہو سکتے۔''

جیسا کہ اوپر احادیث میں ارشاد ہوا ہے کہ اصولی طور پر کائنات کے ستون عدل پر قائم ہیں، عدل کے معنی ایک جامع مفہوم میں کسی چیز کو اس کی صحیح جگہ پر رکھنے کے ہیں، یہ زمین و آسمان، نظام شمسی کے سیارے اور دوسری کہکشاؤں میں بکھرے ہوئے ستارے جو اس عظیم کائنات میں پھیلے ہیں، سب کے سب خالقِ کائنات کے بنائے ہوئے قوانین کے تحت حرکت پذیر ہیں۔ الیکٹرون، پروٹون، ایٹم کے اجزا اور ان کی حرکات ایک منظم قانون کے تحت عمل پیرا ہیں۔ خود وجودِ انسانی کی بناوٹ اور ساخت میں اگر اعضا و جوارح میں اعتدال نہ ہو تو نتیجہ بیماری اور موت کی شکل میں سامنے آئے گا۔ یہی اصول اور قانونِ اعتدال کائنات کی ہر شے خواہ نباتات ہوں یا حیوانات یا دیگر موجوداتِ عالم سب پر محیط ہے، دانش مندوں نے ثابت کیا ہے کہ زمین پر حیات و زندگی کا برقرار رہنا ایک انتہائی پیچیدہ اور اس طرح منظم نظام سے وابستہ ہے کہ اگر لحہ بھر کے لیے بھی یہ اعتدال کے راستے سے ہٹ جائے تو تمام عالم دِگرگوں ہو جائے گا اور حیات فنا ہو جائے گی صرف موت کے ویرانے رہ جائیں گے۔

حدیث نبوی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم میں آیا ہے:

"بِالْعَدْلِ قَامَتِ السَّمٰوٰتُ وَالْاَرْضُ"[۲]

''زمین و آسمان عدل سے قائم ہیں۔''

کیا یہ ممکن ہے کہ ایسے عظیم مجموعے میں انسان اور انسانی معاشرہ، جو اس نظام کا ایک انتہائی معمولی حصہ ہے، بغیر عدل و انصاف کے اپنا وجود باقی رکھ سکے؟ کیا یہ ممکن ہوگا کہ بغیر عدل جو بے اعتدالیاں اور ناہمواریاں معاشرے میں ظاہر ہوں گی، ان میں زندگی گزاری جا سکے، ممکن ہے کہ ظلم ایک مختصر مدت کے لیے کسی شخص یا ملک کے لیے منافع بخش ہو، لیکن

[۱] بحار الانوار، جلد ۷۵، ص ۸۳

[۲] تفسیر صافی، سورۂ رحمٰن، آیت ۷ کے ذیل میں۔

https://downloadshiabooks.com/

باقی مدت میں اس کے تباہ کن اثرات سے انکار ممکن نہیں۔

خلیفہ سوّم کی عجیب بخششیں

اس مسئلے میں تمام مورخین کا اتفاق ہے کہ خلیفہ سوّم نے بیت المال سے عجیب بخششیں کیں اور اپنے طرف داروں اور دوستوں پر عنایات کی انتہا کر دی، سنّتِ پیغمبرؐ اور اپنے پیش رو دو خلفا کی روش کے خلاف بیت المال کی اس طرح تقسیم کی گئی کہ ان کے خلاف عوام الناس اُٹھ کھڑے ہوئے اور بالآخر اس کا نتیجہ ان کے قتل کی شکل میں ظاہر ہوا۔ تو جہ رہے کہ یہ سطریں اس لیے لکھی جا رہی ہیں کہ یہ تفصیل تواریخ میں کثرت سے وارد ہوئی ہے، جس میں سے کچھ خطبۂ شقشقیہ کی شرح میں لکھی گئی ہے۔

مرحوم علامہ امینیؒ الغدیر کی آٹھویں جلد میں اہل سنت کے معروف منابع سے استفادہ کرتے ہوئے عنایاتِ عثمان کو اس طرح جمع کیا ہے کہ ہر پڑھے لکھے انسان کو اس کا مطالعہ تعجب میں مبتلا کر دے گا، مسعودی نے ''مروج الذھب'' میں عجیب سطریں لکھی ہیں، جو تقسیم کی گئی اسے خلیفہ سوّم کا جود و کرم قرار دیتے ہیں، کس چیز کا جود و کرم اور سخاوت اور کس کے مال سے؟ اس کے بعد آپ لکھتے ہیں خلیفہ سوّم کے زمانے میں کچھ لوگ زمینوں اور مکانات کے مالک تھے، ان میں سے ایک زبیر ہیں کہ جنھوں نے بصرہ میں ایک گھر بنایا، جو صدیوں تک قائم رہا۔ مسعودی وضاحت کرتے ہیں کہ ۳۳۲ھ تک وہ گھر آباد تھا اور تاجروں اور سرمایہ داروں اور بحرین سے آنے والے تاجروں کے لیے اس گھر کو مہمان خانے میں تبدیل کیا گیا تھا اور زبیر نے ایک گھر مصر میں اور دوسرا اسکندریہ میں بنایا تھا جس کا ہر شخص کو علم تھا۔

یہ سب اُس وقت کی بات ہے کہ جب وہ مدینے میں زندگی بسر کرتے تھے، اُس زمانے میں وسائل کی کمی اور طویل راستوں پر سفر کی دشواریاں ہر ایک کے علم میں ہیں، پھر یہ عالیشان محلات کی تعمیر اور ان کا استعمال کس طرح ممکن ہوا، یقیناً یہ خلیفہ سوّم کی عنایات کے بغیر ممکن نہیں ہوسکتا تھا۔ مسعودی آخر میں لکھتے ہیں کہ جب زبیر دنیا سے چلے گئے تو پچاس ہزار دینار، ہزار گھوڑے، اور ایک ہزار غلام اور کنیزیں یادگار چھوڑ کے گئے، اس طرح طلحہ، عبدالرحمان بن عوف، سعد بن ابی وقاص اور بعض دوسرے اصحاب کی دولت کے بارے میں عجیب وغریب باتیں لکھی ہیں کہ ان سب کو خلیفہ سوّم کے توسط سے بیت المال سے اس طرح نوازا گیا تھا کہ انسان کو خوف پیدا ہوتا ہے۔ [1]

یہاں دو چیزیں روشن ہو جاتی ہیں ایک یہ کہ لوگ خلیفہ سوّم کے کیوں مخالف ہوئے؟ دوسری بات یہ کہ بعض افراد

---

[1] مروج الذھب، جلد ۲، ص ۳۳۲

https://downloadshiabooks.com/

(جیسے طلحہ وزبیر، امیر شام اور دوسرے مکہ و مدینہ کے سرداروں) کی مخالفت کی کیا وجہ تھی؟ کیا یہی مذکورہ خط ہے، جس کی چند سطروں میں آپؑ فرماتے ہیں کہ "میں تمام زمینیں اور بیت المال سے غصب شدہ اموال جو خلیفۂ سوم کے افراد نے ضبط کیے ہیں، بیت المال میں واپس کروں گا خواہ انہیں عورتوں کے مہر میں ہی کیوں نہ دیا گیا ہو، یہ مناسب نہیں کہ بغیر کسی حق کے دولت حاصل کرنے والے افراد غریبوں کو خوفزدہ کریں۔"

ایک اہم سوال کا جواب

بعض کہتے ہیں کہ کیا یہ بہتر نہ ہوتا کہ حضرت علی علیہ السلام گزشتہ دور کی خرابیوں کو نظر انداز کر کے عدل کی ابتدا اپنی ظاہری خلافت کے ایام میں ہی شروع کرتے، تاکہ مفاد پرست و موقع پرست لوگوں کی دشمنیاں ظاہر نہ ہوتیں؟ اس سوال کا جواب خود امیر المومنینؑ کی گفتگو میں موجود ہے، چوں کہ بعض روایات میں جو اس خطبے کے دوسرے حصوں میں آئی ہیں، اسی طرح ہیں:

"اَلَا اِنَّ کُلَّ قَطِیْعَةٍ اَقْطَعَهَا عُثْمَانُ وَ کُلَّ مَالٍ اَعْطَاهُ مِنْ مَالِ اللّٰهِ فَهُوَ مَرْدُوْدٌ فِیْ بَیْتِ الْمَالِ فَاِنَّ الْحَقَّ الْقَدِیْمَ لَا یُبْطِلُهُ شَیْءٌ وَلَوْ وَجَدْتُهُ" [1]

"آگاہ رہو کہ وہ تمام زمینیں جنہیں خلیفۂ سوم نے لوگوں کو بخش دیا اور وہ تمام مال جو بیت المال سے دیا ہے وہ سب واپس کردو، کیوں کہ کوئی گزشتہ حق کو باطل نہیں کرسکتا ہے۔"

واضح رہے کہ جب بیت المال کے خائن اور غاصب افراد معاشرے میں باحیثیت ہو جائیں اور بغیر کسی قسم کے احساسِ جرم کے نیک اور باکردار لوگوں کا مذاق اُڑانے لگیں تو معاشرہ تباہی کا شکار ہو جاتا ہے، یہ لوگ کسی حالت میں بھی صحیح عدل برداشت نہیں کرتے اور یہ منطق بھی قابلِ قبول نہیں کہ پچھلے خائن اور غاصب افراد کو بخش دیا جائے اور موجودہ غاصبوں کا احتساب کیا جائے، اس قسم کی دورخی حکمتِ عملی لوگوں کو انصاف کے حصول سے مایوس کر دیتی ہے۔ اسلامی فقہ کا اصول یہی ہے کہ غصب شدہ اموال ان کے حق داروں کو واپس کیے جائیں، خواہ یہ حق پہلے غصب کیے گئے ہوں یا موجودہ دور میں کیے جارہے ہوں۔ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ اس قسم کے مسئلے پیش آتے رہتے ہیں، جن کے لیے فقہ اسلامی مین کوئی جگہ نہیں ہے۔

[1] شرح نہج البلاغہ ابن ابی الحدید، جلد ۱، ص ۲۶۹

https://downloadshiabooks.com/

https://downloadshiabooks.com/

سولھواں خطبہ

وَمِنْ کَلَامٍ لَهُ عَلَيْهِ السَّلَامُ

لَمَّا بُويِعَ بِالْمَدِينَةِ وَفِيهَا يُخْبِرُ النَّاسَ بِعِلْمِهِ بِمَا تَؤُولُ إِلَيْهِ أَحْوَالُهُمْ، وَفِيهَا يُقَسِّمُهُمْ إِلَى أَقْسَامٍ

جب آپؑ کی مدینے میں بیعت کی گئی تو آپؑ نے لوگوں کو بیعت کا اصل ہدف اور اس کے فوائد سے آگاہ کرتے ہوئے اس کی قسمیں بیان فرمائیں۔

پہلا حصہ

"ذِمَّتِي بِمَا أَقُولُ رَهِينَةٌ، وَ أَنَا بِهِ زَعِيمٌ. إِنَّ مَنْ صَرَّحَتْ لَهُ الْعِبَرُ عَمَّا بَيْنَ يَدَيْهِ مِنَ الْمَثُلَاتِ، حَجَزَتْهُ التَّقْوَى عَنْ تَقَحُّمِ الشُّبُهَاتِ أَلَا وَإِنَّ بَلِيَّتَكُمْ قَدْ عَادَتْ كَهَيْئَتِهَا يَوْمَ بَعَثَ اللهُ نَبِيَّهُ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَآلِهِ وَسَلَّمَ.

وَالَّذِي بَعَثَهُ بِالْحَقِّ لَتُبَلْبَلُنَّ بَلْبَلَةً، وَلَتُغَرْبَلُنَّ غَرْبَلَةً، وَلَتُسَاطُنَّ سَوْطَ الْقِدْرِ، حَتَّى يَعُودَ أَسْفَلُكُمْ أَعْلَاكُمْ، وَأَعْلَاكُمْ أَسْفَلَكُمْ، وَلَيَسْبِقَنَّ سَابِقُونَ كَانُوا قَصَّرُوا، وَ لَيُقَصِّرَنَّ سَبَّاقُونَ كَانُوا سَبَقُوا. وَاللهِ مَا كَتَمْتُ وَشْمَةً، وَلَا كَذَبْتُ كِذْبَةً، وَلَقَدْ نُبِّئْتُ بِهَذَا الْمَقَامِ وَهَذَا الْيَوْمِ [1]

"میں اپنے قول کا خود ذمّے دار اور اس کی صحت کا ضامن ہوں اور جس شخص پر گزشتہ اقوام کی سزاؤں نے عبرتوں کو واضح کر دیا ہو، اسے تقویٰ، شبہات میں داخل ہونے سے یقیناً روک دے گا۔ آگاہ ہو جاؤ آج تمہارے لیے وہ آزمائشی دور

---

[1] یہ خطبہ درج ذیل کتابوں میں نقل ہوا ہے: ۱۔ شیخ طوسیؒ نے تلخیص الشافی، جلد ۳، ص ۵۳ پر نقل کیا ہے۔ ۲۔ جاحظ، نے البیان والتبیان، جلد ۳، ص ۴۴ پر نقل کیا ہے۔ ۳۔ العقد الفرید، جلد ۴، ص ۱۳۲ پر نقل ہوا ہے۔ ۴۔ ارشاد شیخ مفید۔ ۵۔ کتاب الجمل۔ ۶۔ عیون الاخبار، ۷۔ مسعودی، اثبات الوصیۃ ۸۔ کنز العمال۔ ۹۔ کلینی نے روضۂ کافی میں ص ۶۷ پر نقل کیا ہے ۱۰۔ یعقوبی نے اپنی تاریخ میں ۱۱۔ مجلسی نے بحار الانوار میں نقل کیا ہے۔

https://downloadshiabooks.com/

پلٹ آیا ہے، جو اُس وقت تھا جب پروردگار نے اپنے رسولؐ کو بھیجا تھا، قسم ہے! اُس پروردگار کی جس نے آپؐ کو حق کے ساتھ مبعوث کیا تھا کہ تم سختی کے ساتھ تہ و بالا کیے جاؤ گے۔ تمہیں با قاعدہ چھانا جائے گا اور دیگ کی طرح چمچے سے الٹ پلٹ کیا جائے گا، یہاں تک کہ اسفل اعلیٰ ہو جائے اور اعلیٰ اسفل بن جائے اور جو پیچھے رہ گئے ہیں وہ آگے بڑھ جائیں اور جو آگے بڑھ گئے ہیں وہ پیچھے آ جائیں۔ خدا گواہ ہے کہ میں نے نہ کسی کلمے کو چھپایا ہے اور نہ کوئی غلط بیانی کی ہے اور مجھے اس منزل اور اس دن کی پہلے ہی خبر دے دی گئی تھی۔"

خطبہ، ایک نگاہ میں

یہ سب سے پہلے خطبوں میں سے ہے، جو امیر المومنین علیہ السلام نے خلیفۂ سوّم کے قتل کے بعد حکومتِ ظاہری کے موقع پر مدینے میں ارشاد فرمایا، اس خطبے کے صدور کے زمان اور مکان پر توجہ دینے سے اس کے مفہوم کی تفسیر زیادہ آسان ہو جاتی ہے، یہ خطبہ چار محوروں کے گرد گھومتی ہے:

۱۔ سب سے پہلے ان لوگوں کو تنبیہ کرتے ہیں جنہیں آمائشوں کا سامنا ہے اور اس زمانے کو پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے زمانے سے تشبیہ دیتے ہیں۔ اپنی خلافت میں پیش آنے والی تبدیلیوں کو پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے زمانے کی تبدیلیوں کی طرح شمار کرتے ہیں لوگ جہالت سے ہدایت کی طرف منتقل ہوئے اگر چہ یہ بہت مشکل اور سخت امتحان کا مرحلہ تھا۔ وہ انحرافات جو پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بعد پیدا ہوئے۔ بیت المال کی تقسیم میں اقربا پروری، مسلمانوں کے مال میں لوٹ مار اور عصر جاہلیت کے باقیات کو عہدوں سے نوازنا، ایک نئے انقلاب کا تقاضا کرتے تھے جن کے بانی علی بن ابی طالب علیہما السلام تھے۔

حضرت علی علیہ السلام خطبے کے اس حصے میں تاریخ اسلام میں گذشتہ اقوام کی حالت اور ان کے انجام سے عبرت لینے سے متعلق بتاتے ہیں۔

۲۔ خطبے کے دوسرے حصے میں خطا اور گناہ کا تقویٰ اور پرہیز گاری سے موازنہ کیا ہے اور آخر میں بتایا ہے کہ گناہوں پر کیوں قابو نہیں پایا جا رہا ہے اور تقویٰ و پرہیز گاری کا راستہ قابلِ اختیار ہے، پس لوگوں کو اس چیز کے چنگل سے ڈرایا جو عاقبت کے لیے خطرہ ہے۔

۳۔ خطبے کے تیسرے حصے میں حق و باطل کے مسئلے کی طرف ایک مختصر اور جامع اشارہ فرمایا اور خبردار کیا کہ حق کے طرف داروں کی کمی اور باطل کے طرف داروں کے زیادہ ہونے سے نہ ڈریں، حق کے راستے کو سامنے رکھیں اور کامیابی اور اللہ کی مدد کے انتظار میں رہیں۔

https://downloadshiabooks.com/

۴۔ خطبے کا آخری حصہ نصیحتوں کے سلسلے میں ہے کہ زندگی میں ہر وقت ایک اہم عنوان کی حیثیت سے اس کی طرف انسان متوجہ رہے، چنانچہ افراط اور تفریط سے دور رہنے کی نصیحت اور قرآن وسنّت پر قائم رہنا، معاشرے میں اپنی حیثیت کو پہچاننا، (اتحاد وصلاح بینِ ذات) کی طرف دعوت دینے کو لازمی قرار دینا اور گناہوں سے توبہ کرنا اور تمام فیوض وبرکات کو اُس ذاتِ واجب الوجود کی طرف سے جاننا نہایت ضروری ہے۔

شرح وتفسیر

ہوشیار ہوجاؤ! بڑی آزمائش کا سامنا ہے

جیسا کہ اشارہ ہوا کہ نہج البلاغہ کے بعض مفسرین جیسے ابن ابی الحدید نے تصریح کی ہے کہ یہ خطبہ امامؑ کے اہم ترین خطبوں میں سے ایک ہے، جسے بیعت کے بعد ارشاد فرمایا، اور آئندہ اہم مسائل کے بارے میں لوگوں کو خبردار کیا اور انحرافات وممکنہ پیش آنے والی خرافات سے نجات کے بارے میں نشاندھی کی، سب سے پہلے مطلب کی اہمیت کو بیان فرمایا:

"ذِمَّتِیْ بِمَا اَقُوْلُ رَهِيْنَةٌ وَاَنَابِهٖ زَعِيْمٌ [۱]"

"میں اپنی گفتگو کے بارے میں ضامن ہوں اور اس کی سچائی کی ضمانت دیتا ہوں۔"

اپنی گفتگو کی حقانیت کی سو فیصد ضمانت دیتا ہوں اور خود کو اس کا ذمّے دار سمجھتا ہوں اور تم لوگ اسے اطمینان سے قبول کرو اور اس کی پابندی کرو، اس تعبیر کا ذکر، سننے والوں کو متوجہ کرنے، اس گفتگو کی اہمیت بتلانے کے لیے ہے۔ آپؑ مزید فرماتے ہیں:

"اِنَّ مَنْ صَرَّحَتْ لَهُ الْعِبَرُ عَمَّا بَيْنَ يَدَيْهِ مِنَ الْمَثُلَاتِ [۲] حَجَزَتْهُ [۳] التَّقْوٰى عَنْ تَقَحُّمِ الشُّبُهَاتِ"

---

[۱] زَعِيْمٌ، کا مادّہ زعم ہے۔ راغب اپنی کتاب مفردات میں اس کے معنیٰ کرتے ہیں کہ ایک ایسی گفتگو کہ جس میں غلط بیانی کا احتمال پایا جاتا ہو، اور جو شخص کسی کی کفالت کرتا ہے اسے زعیم کہا جاتا ہے۔

[۲] مثلات جمع مثلہ ہے بروزنِ عضلہ، اصل میں ایک چیز کا دوسری چیز سے مقائسہ کرنے کا نام ہے، بعد میں اللہ کے عذاب اور عقوبات پر اطلاق ہوتا ہے تاکہ انسان ہوشیار ہو، اور ان گناہوں سے باز رہے۔

[۳] حَجَزَ کا مادّہ حَجز ہے، بروزن عَجز، یہ دو چیزوں کے درمیان حائل ہونے کے معنیٰ میں آتا ہے۔

https://downloadshiabooks.com/

جو اپنے گزشتہ لوگوں کے حالات سے عبرت حاصل کرے، اس کی آنکھوں کے سامنے سے غفلت کا پردہ ہٹتا ہے بہ نسبت ان افراد کے جو ان کے انتظار میں ہیں۔ روحِ تقویٰ ان کے اندر پیدا ہوتی ہے اور تقویٰ الٰہی اور انہیں گھیر لیتا ہے ،شبہات سے انہیں محفوظ رکھتا ہے۔

یہ اس طرف اشارہ ہے کہ آئیں اور گزشتہ تاریخ کو کھولیں کہ بہت ساری قومیں حق سے انحراف اور قسم قسم کے گناہوں سے آلودہ ہونے کی وجہ سے اللہ کے غیظ وغضب کا شکار ہوئیں۔ ہوشیار رہو! آ ؤ بعثتِ پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور آپؐ کے قیام اور جاہل قوموں کی آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے مقابلے میں سازشوں کی جانچ پڑتال کریں اور ان کے برے اعمال کا انجام دیکھیں تاکہ تمہارا مستقبل روشن ہو، اور تقویٰ و پرہیز گاری کے چراغ سے شبہات کی تاریکیاں دور ہوں اور نفسِ امارہ اور شیطان کے خطرناک حملوں سے بچنے کے لیے اطمینان بخش محاذ ملے، پھر امامؑ جیسے رہبر نے صراحت کے ساتھ پردوں کو اٹھایا۔

"اَلَا وَاِنَّ بَلِیَّتَکُمْ قَدْ عَادَتْ کَهَیْئَتِهَا یَوْمَ بَعَثَ اللّٰهُ نَبِیَّهٗ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَآلِهٖ وَسَلَّمَ"

"آگاہ ہو جاؤ! تمہاری آزمائشیں اور بلائیں اسی طرح ہیں، جس طرح بعثت رسولؐ کے وقت تھیں، ہوشیار رہو امتحان کا مرحلہ سخت ہے۔" (صرف وہی مخلص اور پرہیزگار کامیاب ہوگا، جو عبرت حاصل کرے گا)

مولا علیہ السلام نے اس حقیقت کو بھی وضاحت کے ساتھ بیان کیا کہ خلیفۂ سوم کے دور بالخصوص عمر آخری حصے میں بیت المال سے خاص دلچسپی پیدا ہوئی تھی، غیر صالح افراد کو انتہائی اہم مناصب پر مامور کیا گیا، جن کی وجہ سے ایسے مفاسد پھیلے، جن سے اسلامی معاشرہ بگڑ گیا اور اتحادِ اسلامی میں گہرے اختلافات پیدا ہو گئے۔ گویا عہدِ جاہلیت دوبارہ پلٹ آیا اور روزِ بیعتِ مولا علی علیہ السلام اسی طرح تھا کہ جس طرح روز بعثت رسالت مآب صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم، تاکہ ایک نیا انقلاب بالکل ویسا ہی انقلاب جیسا کہ سرکار ختمی مرتبتؐ نے برپا کیا تھا ایسا انقلاب جو لوگوں کو اسلام نابِ محمدی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی طرف متوجہ کرے۔ ظاہر ہے ایسا انقلاب ان لوگوں کے لیے جن کے ناجائز منافع خوری اور مفادات خطرے میں پڑ جاتے ہیں۔ اٹھ کھڑے ہوں اور امتحان کی بھٹی گرم ہو جائے اسی لیے امیر المومنین علیہ السلام جیسے باخبر اور پیش بین رہبر نے لوگوں کو پہلے سے خبردار کر دیا اور ان خطرات سے جو درپیش تھے آگاہ کرتے ہوئے بیدار کر دیا۔ توجہ رہے کہ بعض مفسرین نے لفظ بلّیہ کا معنی، بلائیں اور مشکلات بتایا ہے، حالانکہ "بلیّہ" آزمائش اور امتحان کے معنی رکھتا ہے، اور امامؑ کی تمام تعبیریں اس خطبے کے تسلسل میں گواہ ہیں۔ پھر اس امتحانِ الٰہی کی تشریح دو مثالوں کے ذریعے فرماتے ہیں، پہلی مثال میں آپؐ نے فرمایا:

"وَالَّذِیْ بَعَثَهٗ بِالْحَقِّ لَتُبَلْبَلُنَّ بَلْبَلَةً [۱] وَلَتُغَرْبَلُنَّ غَرْبَلَةً [۲]

---

[۱] بَلْبَلَة، اختلاط اور آمیزش، یہ معنی مناسب ہیں۔

[۲] غَرْبَلَة، اچھے اور برے میں تمیز کرنے کے لیے آتا ہے۔

https://downloadshiabooks.com/

''اُس خدا کی قسم! جس نے اپنے پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو حق کے ساتھ بھیجا کہ تمہیں سختی کے ساتھ تہ و بالا کیا جائے یہاں تک خالص کو ناخالص سے جدا کیا جائے گا۔''(حق کو باطل سے اور پیروانِ حق کو پیروانِ باطل سے جدا کیا جائے گا)

اِس طرز کا مظاہرہ ہر الٰہی انقلاب میں ہوتا ہے کہ کامیابی کے وقت معاشرے کی چھانٹی ہوتی ہے، طاقتور اور خائنوں کو پیچھے چھوڑا جاتا ہے اور صالح اور کمزور افراد آگے آجاتے ہیں، جیسے پیغمبر اسلامؐ نے اپنے انقلاب کی کامیابی کے بعد انجام دیا، ابوسفیان اور طاقتور مفسدین اور ان جیسوں کو بالکل پیچھے چھوڑ دیا گیا، صہیب و خبابؓ اور بلالؓ عہدوں پر فائز ہوئے۔اسی طرح امیر المومنین علیہ السلام کی بیعت کے بعد خود غرض لوگوں کو، جنہوں نے خلیفۂ سوّم کے دور میں طاقت کے بل بوتے پر بیت المال کو لوٹا تھا، الگ کیا گیا اور پاکیزہ اور مخلص لوگوں کو عہدوں پر فائز کیا گیا۔

دوسری مثال میں فرماتے ہیں:

وَلَتُسَاطُنَّ سَوْطَ[1] الْقِدْرِ، حَتَّى يَعُوْدَ اَسْفَلُكُمْ اَعْلَاكُمْ، وَاَعْلَاكُمْ اَسْفَلَكُمْ

''جس طرح دیگ میں پکنے کے لیے ڈالی ہوئی چیزوں کو چمچ کے ذریعے ہلا کر اوپر نیچے کیا جاتا ہے، تمہیں اسی طرح سے الٹ پلٹ دیا جائے گا، یہاں تک کہ اوپر کو نیچے اور نیچے کو اوپر کر دیا جائے گا۔''

ہر دنیاوی انقلاب کا دستور یہی ہے کہ اعلیٰ لوگوں کو نچلا اور نیچ قسم کے لوگوں کو بلند مقام دیا جاتا ہے، مگر الٰہی انقلابات میں مفسدین کو تختِ قدرت سے نیچے لایا جاتا ہے، اور کمزور اور صالح لوگوں کو قدرت سے نوازا جاتا ہے۔اس گفتگو کو تسلسل دیتے ہوئے امامؑ فرماتے ہیں:

''وَلَيَسْبِقَنَّ سَابِقُوْنَ كَانُوْا قَصَّرُوْا، وَلَيُقَصِّرَنَّ سَبَّاقُوْنَ كَانُوْا سَبَقُوْا''

''جو لوگ اسلام میں آگے آگے تھے، پیچھے کر دیے گئے دوبارہ عہدوں پر آنا چاہتے تھے اور جو لوگ حیلے بہانوں سے آگے گئے تھے انہیں پیچھے کر دیئے گئے۔''

پہلے جملے سے ان لوگوں کی طرف اشارہ ہے، جو اصحاب امام علی علیہ السلام ہیں، جو خلیفۂ سوّم کے زمانے میں گوشہ نشین ہو گئے، لیکن امامؑ کے دور میں امورِ مسلمین کو انجام دے رہے تھے، اور دوسرے جملے کا اشارہ طلحہ و زبیر جیسے لوگ ہیں کہ اسلام میں کسی وقت پیش پیش تھے، مگر کوتاہیوں کے اثر سے پیچھے ہو گئے تھے۔

بعض نے خیال ظاہر کیا ہے کہ ان جملوں سے آئندہ زمانے مراد ہیں کہ جن میں یہی حالات دوبارہ پیدا ہوں گے اور بنی امیہ کے افراد حکومت سنبھالیں گے اور اسلام کی صفِ اوّل کے لوگوں کو پیچھے دھکیل دیں گے اور دورِ جاہلیت کے باقی

---

[1] سوط، بمعنی مخلوط کرنا، اوپر کی عبارت میں سوطِ قدر، سے مراد غذائی اجناس کو دیگ میں مخلوط کرنا ہے۔

https://downloadshiabooks.com/

ماندہ افراد کو اقتدار میں جگہ دیں گے، لیکن توجہ رہے کہ یہ خطبہ بیعت کے تقریباً فوراً بعد بغیر فاصلے کے ارشاد فرمایا ہے، اس لیے پہلے معنی زیادہ مناسب ہیں۔ ایک بار پھر قسم کے ذریعے اس مطلب کی تاکید فرماتے ہیں:

"وَاللّٰهِ مَا كَتَمْتُ وَشْمَةً [1] وَلَا كَذَبْتُ كِذْبَةً، وَلَقَدْ نُبِّئْتُ بِهٰذَا الْمَقَامِ وَهٰذَا الْيَوْمِ"

''خدا کی قسم! ہرگز حقیقت کو نہیں چھپاؤں گا اور ہرگز جھوٹ نہیں بولوں گا، آج کے بارے میں مجھے پہلے ہی خبر دی گئی ہے۔''

یعنی پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ان تمام معاملات کی پیشگوئی فرمائی اور مجھے خبر دی اور میں آگاہی کے ساتھ تم سے مخاطب ہوں، یہ تمام گفتگو اس لیے کی گئی کہ لوگ بیدار رہوں اور سازشوں جیسے جنگ جمل و صفین و نہروان کے سامنے سر تسلیم خم نہ کریں، جان لیں کہ سخت آزمائشوں کا سامنا ہے اور مکمل مکافاتِ عمل کا سامنا کرنا پڑے گا، مگر افسوس امام علی علیہ السلام جیسے آگاہ شخص کے بار بار خبردار کرنے سے بھی کسی گروہ کے دل پر اثر نہیں ہوا اور امتحان کے کٹہرے میں شرمندگی کا سامنا کرنا پڑا۔ ظاہراً امامؑ کے ان جملوں کے بیان کا مقصد وہی غیبی خبر دینا ہے کہ رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے انہیں آئندہ کے حالات کے بارے میں بتایا تھا، جیسا کہ ہم پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور امامؑ کے علمِ غیب کی بحث میں کہہ چکے ہیں، ایسے معصوم رہبر اور امام جو تمام دنیا اور صدیوں کے ساتھ تعلق رکھتے ہوں، گزشتہ اور آئندہ کے بارے میں علمِ غیب سے خالی نہیں ہو سکتے، کیوں کہ آج کے حالات کا گزشتہ اور آئندہ کے ساتھ تعلق اور قریبی رابطہ ہے، یہی وہ لوگ ہیں جو آئندہ کے بارے میں ان خدشات کو حقائق سے مربوط اور بیان کرنا لازمی سمجھتے ہیں، تا کہ عوام الناس اپنے مسائل سے ہوشیاری کے ساتھ نبرد آزما ہوں، اور شیاطین کے دام اور دردناک حوادث کے جال میں نہ پھنسیں۔ یہ وہی کام ہے، جو نہج البلاغہ کی گواہی کے مطابق حضرت امام علی علیہ السلام نے انجام دیا اور امتِ اسلامی کو پیش آنے والے خطرات سے آگاہ کیا۔ واضح رہے کہ اس قسم کے موارد میں کچھ نے نصیحت حاصل کی اور کچھ کو پریشانی لاحق ہوئی۔

---

[1] وَشْمَةً خالی کرنے کے معنی میں ہے اور سوئی سے خالی کر کے اس میں کوئی نہ کوئی رنگ بھر دینا ہے، تا کہ کھال کے نیچے منتقل ہو جائے۔ پھر چیز کا ذرّہ، جیسے پانی کا قطرہ یا مختصر کلمے پر بھی اطلاق ہوتا ہے۔ یہاں پر مختصر کلمہ درست معنی ہے۔

https://downloadshiabooks.com/

نکات

تاریخ اپنے آپ کو دوہراتی ہے

معروف ہے کہ تاریخ کے تمام حالات تکرار ہوتے ہیں، جو مختلف شکلوں میں ظاہر ہوتے ہیں، اسی دلیل کی بنا پر وہ لوگ جو تاریخ گزشتہ پر گہری نظر رکھتے ہیں، وہ موجودہ اور آئندہ کے حالات سے بہتر آگاہی حاصل کر سکتے ہیں۔ اسی دلیل کی بنا پر قرآن مجید، گزشتہ پیغمبرانِ الٰہی اور قوموں کے حالات کی تفصیل سے پُر ہے، جو آج اور کل کے لیے نمونہ ہیں۔ حضرت امام علی علیہ السلام نے خطبے کے اس حصے میں ایک اہم نکتے کی طرف توجہ دلائی ہے، آپؑ فرماتے ہیں کہ اگر چاہتے ہو کہ تقویٰ کی طاقت سے تاریکیوں سے نکل جاؤ تو گزرے ہوئے حالات پر نظر رکھو اور عبرت حاصل کرو۔ پھر وضاحت فرماتے ہیں: آج کے تمہارے حالات (امامؑ کے بیعت کے دن) اس طریقے سے ہیں کہ جیسے پیغمبر اکرمؐ کی بعثت کے دن کے حالات تھے، حق کی مخالفت میں وہی گروہ بندیاں، وہی انحرافات و رُوگردانیاں اور وہی مختلف شکلوں میں معاملات کو بگاڑنے والے، اس لیے ہوشیار رہو اور اپنے امامؑ کے دست و بازو بنو تاکہ آوارہ اور بھٹکے ہوئے لوگوں کے ہتھے نہ چڑھ جاؤ، اگر ہم بعثتِ رسالت مآبؐ اور خلافتِ امیرالمومنینؑ کا گہری نظر سے موازنہ کریں تو دونوں میں گہری مماثلت نظر آتی ہے۔

دورِ جاہلیت کی باقیات اور منافقین کی کوششیں تھیں کہ تعلیمات پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو تدریجاً ختم ہو جائیں بالخصوص یہ کہ اہم مراکز میں نفوذ پیدا کی جائے اور اسے اپنے کنٹرول میں لائیں اور غیروں کی ثقافت جیسے (جاہلی ثقافت) کو اسلام کی ثقافت کے ساتھ مخلوط کریں۔ چنانچہ ان کے واضح آثار حکومت بنوامیہ کے زمانے میں مکمل طور پر ظاہر ہوئے۔ یہ بات درست ہے کہ اسلام کے کچھ اثرات خلیفۂ سوّم کے زمانے میں محفوظ تھے، لیکن وہ بھی تدریجاً اپنا مفہوم کھو چکے تھے، جیسا کہ بنی اُمیّہ کے زمانے میں نماز، روزہ، حج قائم تھے، مگر کیا نماز، کیا روزہ، اور کیا حج تھا؟!!

حقیقت کا بیان یا مصلحت کی رعایت

اکثر لوگ سوچتے ہیں کہ مصلحت لوگوں سے حقیقت کو چھپانے کا نام ہے، اور اکثر نامناسب طریقہ عمل کی نشاندہی

https://downloadshiabooks.com/

کرتے ہیں، حالانکہ رہبروں اور عام لوگوں کی مصلحت (سوائے استثنائی اور خاص مقامات کے) یہ ہے کہ لوگوں کے لیے حقائق آشکار ہوں اور لوگ جانتے اور سمجھتے ہوئے میدانِ عمل میں قدم رکھیں، حقائق اور خبروں کو مخفی کرنا یا پوشیدہ رکھنا اور لوگوں کو اندھیرے میں رکھنا ہمیشہ خود غرض اور آمروں کی روش ہے کہ جو اپنے مفاد کے سوا کوئی اور چیز مدنظر نہیں رکھتے۔ وہ اپنے کام میں مخلص نہیں ہیں، اس کے برخلاف الٰہی رہبروں اور پیشواؤں کا ہدف یہ ہوتا ہے کہ لوگوں کو دنیاوی و معنوی پریشانیوں سے آزادی دلائی جائے۔ ان کی کوشش یہ ہوتی ہے کہ خلوص کے ساتھ تمام حقائق کو لوگوں کے سامنے رکھیں، کیوں کہ یہ روش حمایت کو اپنی طرف جذب کرتی ہے، انہیں شخصیت عطا کرتی ہے اور عوام سے یہ رابطہ ان کی قیادت کو زیادہ مضبوط کرتا ہے۔ توجہ رہے کہ امامؑ نے اس خطبے اور نہج البلاغہ کے بہت سارے خطبوں میں نہ صرف موجود حقائق کو ان سے نہیں چھپایا، بلکہ آئندہ کے حالات جنھیں مخبرِ صادق حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے سنا تھا، انہیں ان لوگوں پر آشکار کر دیا اور یہ وضاحت کے ساتھ فرماتے ہیں کہ ایک کلمہ بھی جو تمہاری آگاہی کے لیے لازم تھا، نہیں چھپایا اور تم سے متمنی ہوں کہ پیش آنے والے خطرات کا ہوشیاری سے مقابلہ کرو اور شیاطین کے دام میں نہ پھنسو۔

دوسرا حصہ

أَلَا وَإِنَّ الْخَطَايَا خَيْلٌ شُمُسٌ حُمِلَ عَلَيْهَا أَهْلُهَا وَ خُلِعَتْ لُجُمُهَا فَتَقَحَّمَتْ بِهِمْ فِي النَّارِ أَلَا وَ إِنَّ التَّقْوَى مَطَايَا ذُلُلٌ حُمِلَ عَلَيْهَا أَهْلُهَا وَ أُعْطُوا أَزِمَّتَهَا فَأَوْرَدَتْهُمُ الْجَنَّةَ حَقٌّ وَ بَاطِلٌ وَلِكُلٍّ أَهْلٌ فَلَئِنْ أَمِرَ الْبَاطِلُ لَقَدِيماً فَعَلَ وَلَئِنْ قَلَّ الْحَقُّ فَلَرُبَّمَا وَلَعَلَّ وَلَقَلَّمَا أَدْبَرَ شَيْءٌ فَأَقْبَلَ.

"یاد رکھو کہ خطائیں وہ سرکش سواریاں ہیں، جن پر اہل خطا کو سوار کر دیا جائے اور ان کی لگام کو ڈھیلا چھوڑ دیا جائے اور وہ سوار کو لے کر جہنم میں پھاند پڑیں اور تقویٰ اُن رام کی ہوئی سواریوں کی مانند ہے، جن پر لوگ سوار کیے جائیں اور ان کی لگام ان کے ہاتھوں میں دے دی جائے تو وہ اپنے سواروں کو جنت تک پہنچا دیں۔ دنیا میں حق و باطل دونوں ہیں اور دونوں کے اہل بھی ہیں، اب اگر باطل زیادہ ہو گیا ہے تو یہ ہمیشہ سے ہوتا چلا آیا ہے اور اگر حق کم ہو گیا ہے تو یہ بھی ہوتا رہا ہے اور اس کے خلاف بھی ہوسکتا ہے، اگرچہ ایسا کم ہی ہوتا ہے کہ کوئی شے پیچھے ہٹ جانے کے بعد دوبارہ منظر عام پر آجائے۔"

قَالَ السَّيِّدُ الشَّرِيفُ: وَأَقُولُ: إِنَّ فِي هٰذَا الْكَلَامِ الْأَدْنَى مِنْ مَوَاقِعِ الْإِحْسَانِ مَا لَا تَبْلُغُهُ مَوَاقِعُ الْاِسْتِحْسَانِ وَإِنَّ حَظَّ الْعُجْبِ مِنْهُ أَكْثَرُ مِنْ حَظِّ الْعُجْبِ بِهِ وَفِيهِ مَعَ الْحَالِ الَّتِي وَصَفْنَا زَوَائِدُ مِنَ الْفَصَاحَةِ لَا يَقُومُ بِهَا لِسَانٌ وَلَا يَطَّلِعُ فَجَّهَا إِنْسَانٌ، وَلَا يَعْرِفُ مَا أَقُولُ إِلَّا مَنْ ضَرَبَ فِي

https://downloadshiabooks.com/

هٰذِهِ الصَّنَاعَةِ بِحَقٍّ وَجَرَىٰ فِيهَا عَلَىٰ عِرْقٍ وَمَا يَعْقِلُهَا إِلَّا الْعَالِمُونَ

سیّد رضیؒ کا کہنا ہے:

''اس مختصر سے کلام میں اس قدر خوبیاں پائی جاتی ہیں، جہاں تک کسی کی داد و تعریف نہیں پہنچ سکتی ہے اور اس میں حیرت و استعجاب کا حصہ پسندیدگی کی مقدار سے کہیں زیادہ ہے، اس میں فصاحت کے وہ پہلو بھی ہیں، جن کو کوئی زبان بیان نہیں کر سکتی ہے اور ان کی گہرائیوں کا کوئی انسان ادراک نہیں کر سکتا ہے، اور اس حقیقت کو وہی انسان سمجھ سکتا ہے جس نے فنِ بلاغت کا حق ادا کیا ہو اور اس کی بنیادوں سے باخبر ہو، اور ان حقائق کو اہل علم کے علاوہ کوئی نہیں سمجھ سکتا ہے۔''

شرح و تفسیر

گناہ سرکش گھوڑوں کی مانند ہیں

گزشتہ بحث کو تسلسل دیتے ہوئے اُس بحرانی کیفیت کے بارے میں جو بیعتِ امامؑ کے بعد عالم اسلام میں ایک نئے انقلاب کی صورت میں تھی، اس سلسلے میں خبردار کرتے ہوئے ایک خوبصورت تشبیہ کے ضمن میں ایک اہم نکتے کی طرف اشارہ فرمایا ہے، اگر لوگ اس کو بروئے کار لائیں تو گناہوں کی آلودگی سے بچ سکتے ہیں۔ وہ انجان راہوں میں نہیں بھٹکیں گے اور اپنی منزلِ مقصود تک پہنچ جائیں گے اور وہ اس صورت میں کہ گناہ پر ابتداہی میں قابو پائیں۔ اور اس کے دائرے سے دور ہوں، کیوں کہ جب انسان گناہوں اور دوسری غلطیوں میں گرفتار ہوتا ہے، تو وہ گناہ تسلسل کے ساتھ اسے اپنی طرف کھینچتا ہے اور اس کا اختیار ہاتھ سے نکل جاتا ہے اور خطرناک بدبختیوں کی وادی میں جا گرتا ہے۔ آپؑ فرماتے ہیں:

"أَلَا وَإِنَّ الْخَطَايَا خَيْلٌ شُمُسٌ [1] حُمِلَ عَلَيْهَا أَهْلُهَا، وَخُلِعَتْ لُجُمُهَا، فَتَقَحَّمَتْ بِهِمْ فِي النَّارِ"

''آگاہ رہو کہ گناہ اور خطائیں سرکش گھوڑوں کی طرح ہیں جو اپنے سواروں کو سوار کرتے ہیں، اور لگام اُن کے ہاتھ میں نہیں ہوتی اور وہ آخر میں اسے دوزخ میں پھینک دیتے ہیں۔''

کیا خوبصورت تشبیہ ہے کہ سرکش گھوڑے پر سوار ہونا ذاتی طور پر خطرناک ہے، اگر لگام ہاتھ سے چھوٹ جائے تو اور زیادہ خطرناک ہے اور یہ سوار اگر اس سرزمین میں ہو جو دریا کے کنارے ہے، تو پھر زیادہ خطرناک ہے۔ اصل میں بات یہ

[1] شموس و شماس کے مادّے سے ہے، جو ناپائیداری کے معنیٰ میں ہے اور سورج کو شمس اس لیے کہتے ہیں کہ برابر حرکت میں رہتا ہے اور اوپر کی عبارت میں شمس بہ معنائے انسان کج خلق و سرکش ہونے کے ہیں۔

https://downloadshiabooks.com/

ہے کہ انسان ایک گناہ کا مرتکب ہونے سے دوسرے گناہ کا بے اختیار مرتکب ہوتا ہے، اور پھر ایک اور گناہ کا، مثال کے طور پر اگر کوئی خیانت کا ارتکاب کرے اور اسے چھپالے تو مواخذے کا موجب قرار دیا جاتا ہے، اپنی خیانت کو چھپانے کے لیے اسے بار بار جھوٹ بولنا پڑتا ہے اور ہر طریقے سے الٹی سیدھی قسمیں کھاتا ہے یا دوسرے افراد کو تہمت لگاتا اور جب وہ اپنے آپ کو رسوا دیکھتا ہے تو ممکن ہے کہ وہ کسی ایسے شخص کا خون کرڈالے جو اس کی خیانت کے بارے میں اطلاع رکھتا ہے، تاکہ اس کے راز فاش نہ ہو جائیں اور اسی طرح یکے بعد دیگرے گناہوں میں مبتلا ہوتا رہتا ہے، کیوں کہ سرکش گھوڑے کی طرح لجام کو ہاتھ سے چھوڑ دیا گیا ہے۔ آپؑ مزید فرماتے ہیں:

"اَلَا وَاِنَّ التَّقْوٰی مَطَایَا ذُلُلٌ [1] حُمِلَ عَلَیْهَا اَهْلُهَا، وَاُعْطُوْا اَزِمَّتَهَا، فَاَوْرَدَتْهُمُ الْجَنَّةَ"

"تقویٰ رام کی ہوئی سواریوں کی مانند ہے، جن پر ان کے سواروں کو سوار کیا گیا ہو۔ اس طرح کہ باگیں ان کے ہاتھ میں دے دی گئی ہوں اور وہ اُنہیں اطمینان سے لے جا کر جنت میں اتار دیں"۔

جی ہاں! اعمالِ صالح تسلسل کے ساتھ ایک دوسرے کا پیچھا کرتے ہیں۔ ایک اچھا عمل دوسرے اچھے عمل کا سبب اور وہ بھی دوسرے نیک عمل کے انجام دینے کا سبب ہوتا ہے۔ مثال کے طور پر کسی نے اپنے بیٹے کی اچھی تربیت کی اور وہ بھی خیرات و برکات کرنے کا سبب ہوا اور اپنے دوستوں اور آس پاس کے لوگوں پر اثر انداز ہوا اور وہ لوگ بھی نیک کام انجام دینے والے ہو گئے، اسی تربیت سے معاشرہ اصلاح و سعادت مندی کی طرف سفر کرتا ہے۔

توجہ رہے کہ امامؑ نے خیل الشمس کو گناہوں کے مقام پر سرکش گھوڑوں کے مفہوم میں استعمال فرمایا ہے، اور مقامِ تقویٰ میں "مطایا ذلل" کو رہوار گھوڑوں کے معنی میں استعمال کیا ہے۔ یہ ایک گہرا نکتہ ہے کیوں کہ "خیل" اصل میں مادۂ خیال سے ہے اور مغرور و متکبر افراد جو خیالات میں گرفتار ہیں، انہیں "مختال" کہا گیا ہے، اسی وجہ سے گھوڑے کو "خیل" کہا گیا ہے کہ اکثر ایسے گھوڑے سوار دوسروں پر فخر ومباہات کرتے ہیں۔ اس کے برعکس "مطایا" جمع مطیہ مادّہ مطو سے ہے، بروزنِ عطف، سفر میں جدت اور نجات کے لیے ہے۔

اس بنا پر مطیہ، تیز دوڑنے والے گھوڑے کے معنی میں ہے، جو سیدھا اپنے مقصد کی طرف سفر کرتا ہے اور سرکشی نہیں کرتا اور انسان کو راستے سے نہیں بھٹکاتا، اس مقام پر امامؑ کا عروج فصاحت نمایاں ہے، یہاں تک چھوٹے کلمات اور تعبیرات بھی۔ اس کے بعد امامؑ نے اللہ کی جانب سے آزمائشیں جو آپؑ کی حکومت کے زمانے میں اور جو پوری زندگی میں پیش آنے والی تھیں، اُن سے خبردار کیا ہے اور گزشتہ بحث کو امتحان میں کامیابی و تقویٰ اور گناہ کے گھوڑوں کی شکل میں مکمل

---

[1] ذلل کی جمع ذلول ہے اور رام کرنے کے معنیٰ میں ہے۔

https://downloadshiabooks.com/

کیا ہے۔ آپؑ فرماتے ہیں:

"حَقٌّ وَبَاطِلٌ وَلِكُلٍّ أَهْلٌ"

"ہمیشہ حق و باطل کا وجود ہوتا ہے اور ہر کسی کے لیے طرف دار و حمایتی موجود ہیں۔"

جی ہاں! انسانی زندگی کو ابتدائی دنوں سے ہی ان دو گروہوں (حق و باطل) کا آمنا سامنا ہے اور ان کا ایک دوسرے سے جھگڑے کا معاملہ کافی طویل ہے، جو ایک پوری تاریخ کو سمیٹے ہوئے ہے۔

امامؑ ان تمام میں صرف ایک نکتے کی طرف اشارہ کرتے ہیں، آپ علیہ السلام فرماتے ہیں:

"فَلَئِنْ أَمِرَ الْبَاطِلُ لَقَدِيماً فَعَلَ"

"اگر باطل حکومت کرے تو کوئی تعجب کی بات نہیں، کافی عرصے سے یہی ہو رہا ہے۔"

"وَلَئِنْ قَلَّ الْحَقُّ فَلَرُبَّمَا وَلَعَلَّ"

"اگر حق اور اس کے پیروکار کم ہیں تو یہ بھی پہلے سے ہوتا رہا ہے۔"

حق و باطل کی داستان اور ان دونوں کی ایک دوسرے سے جنگ انسانی تاریخ کی ایک طویل داستان ہے۔ اس جنگ کے ہتھیار اور نتائج اپنے دامن میں اتنی گنجائش رکھتے ہیں کہ دوسرے خطبوں کی شرح میں اس موضوع پر زیادہ مناسب گفتگو کی گئی ہے، انشاء اللہ آئندہ بیان کریں گے، یہاں اسی پر اکتفا کرنا لازمی ہے۔ امیر المومنین علیہ السلام کی نظر میں بھی اہمیت اس بات کی ہے کہ نہ باطل کے طرف داروں کی کثرت سے کسی کو خوفزدہ کیا جا سکتا ہے اور نہ حق کے حمایتی کم ہونے سے مایوس ہونا چاہیے، کیوں کہ اکثر تاریخ میں باطل کے طرف دار زیادہ ہوتے ہیں اور بہت مرتبہ ایسا ہوا ہے کہ حق کے تھوڑے سے حمایتی باطل کے حامیوں کی کثرت پر غالب آجاتے ہیں، جیسا کہ لشکرِ بنی اسرائیل کے سپہ سالار طالوت کی زبان میں قرآن مجید ارشاد فرماتا ہے:

"كَمْ مِنْ فِئَةٍ قَلِيلَةٍ غَلَبَتْ فِئَةً كَثِيرَةً بِإِذْنِ اللهِ" [1]

"بہت سے قلیل گروہ اللہ کے حکم سے کثیر گروہوں پر غالب آئے ہیں۔"

دوسرے الفاظ میں ایک دوسری آیت میں اسی معنی کو زیادہ نمایاں کیا گیا ہے:

"قُلْ لَا يَسْتَوِي الْخَبِيثُ وَالطَّيِّبُ وَلَوْ أَعْجَبَكَ كَثْرَةُ الْخَبِيثِ" [2]

---

[1] سورۂ بقرہ، آیت ۲۴۹

[2] سورۂ مائدہ، آیت ۱۰۰

https://downloadshiabooks.com/

''کہو کہ پاک اور ناپاک کبھی برابر نہیں ہو سکتے ہیں، اگر چہ کثرت ناپاکی نے تمہیں تعجب میں ڈالا ہے۔''

یہی مفہوم نہج البلاغہ کے دوسرے خطبوں میں صراحت کیساتھ آیا ہے، چنانچہ خطبہ ۲۰۱ میں آیا ہے:

''اَيُّهَا النَّاسُ لَا تَسْتَوْحِشُوا فِي طَرِيقِ الْهُدَىٰ لِقِلَّةِ أَهْلِهِ''

''اے لوگو! حق وصداقت اور ہدایت کے راستے پر گامزن افراد کی قلت اور کمی سے خوفزدہ نہ ہو جانا۔''

توجہ رہے کہ افراد کی کثرت سے نہ حق کی دلیل ثابت ہو سکتی ہے اور نہ نجات و کامیابی کی، بلکہ قرآن و حدیث اور صاحب رائے کی منطق میں کامیابی کیفیت میں ہوتی ہے، نہ کہ کمیّت میں، اس وجہ سے باطل حکومتیں ختم ہو گئیں، ان کے آثار ناپید ہو گئے اور سوائے ننگ و عار کے ان کے نام کچھ باقی نہ رہا، لیکن حق کی حکومت اور اولیاء اللہ کے آثار و برکات اس کائنات کے آخر وقت تک قائم رہیں گے۔

بہر حال حق و باطل کی جنگ اور لشکر باطل کی کثرت حقیقت میں ایک آزمائش الٰہی ہے کہ حق کے طلب گار ایسے ہی وقت پہچانے جاتے ہیں، کیوں کہ وہ باطل گروہوں کے ہم خیال نہیں ہو سکتے۔ وہ مفت کی روٹی نہیں توڑتے، روح تقویٰ و پرہیز گاری انہیں حق کی طرف لے جاتی ہے۔ اگر چہ حق کے ماننے والے اقلیت میں ہوں۔ یہ ایک مفصل داستان ہے پھر بھی اس تک پہنچ جائیں گے۔

دوسرا نکتہ جس کی امامؑ نے تاکید فرمائی، جو اس خطبے کے آخری حصے میں مختصر مگر جامع طریقے سے ذکر ہے، فرماتے ہیں:

''وَلَقَلَّمَا اَدْبَرَ شَیْءٌ فَاَقْبَلَ''

''فرصت کے اوقات کو ضائع نہ کرو اس لیے کہ) کم ہی ایسا ہوتا ہے کہ کوئی چیز پیچھے ہٹ جانے کے بعد دوبارہ منظر عام پر آجائے۔''

لوگوں کے دو گروہ ہوتے ہیں حق پرست اور باطل پرست، اب اگر باطل گروہ کی کثرت ہے تو اس پر تعجب نہ کرو کہ ایسا پہلے سے ہوتا رہا ہے اور حق پرست پہلے بھی کم تعداد میں رہے ہیں اور ممکن ہے کہ اپنی قلت کے باوجود حق پرست باطل پرستوں پر غالب آجائیں۔ اگر چہ ایسا کم ہی ہوتا ہے، عموماً باطل پرست اپنی ظاہری طاقت کے بل بوتے پر دنیاوی کامیابی حاصل کر لیتے ہیں، البتہ تمام مسلمانوں کا عقیدہ خواہ وہ شیعہ ہوں یا غیر، آخر کار لشکر حق ظہور حضرت امام مہدیؑ کے ساتھ کامیاب ہوگا اور باطل ہمیشہ شکست کھائے گا، اور الٰہی حکومت پوری دنیا میں چھا جائے گی۔

بعض روایات کے مطابق اسی خطبے کے ذیل میں ایک جملہ امام صادقؑ نے امیر المومنینؑ سے نقل کیا ہے، آپؑ نے

https://downloadshiabooks.com/

فرمایا:

"وَبِنَا فَتَحَ لَا بِكُمْ وَمِنَّا نَخْتِمُ لَا بِكُمْ"

''حکومتِ حق کا آغاز ہم سے ہوا ہے تم سے نہیں (عصرِ پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی طرف اشارہ ہے) اور ہم پر ہی اختتام پزیر ہوگا نہ کہ تم پر (حضرت امام مہدی علیہ السلام کے ظہور کی طرف اشارہ ہے)''

ابن ابی الحدید اس جملے کے بعد وضاحت کرتے ہیں: ''اکثر محدثین اعتقاد رکھتے ہیں کہ اس حدیثِ مبارکہ میں حضرت امام مہدی علیہ السلام کی طرف اشارہ ہے کہ آپؑ آخر زمانے میں ظہور فرمائیں گے اور حضرتِ فاطمہ سلام اللہ علیہا کی اولاد میں سے ہوں گے، اور ہمارے معتزلہ ان کا انکار نہیں کریں گے۔''[1]

بہرحال مذکورہ جملوں میں اشارہ ہے کہ فرصت کے دنوں کو ضائع مت کرو اور اب جب کہ حق کی حکومت اور اس کے عدل کو اسلامی معاشرے میں نافذ کرنے کے لیے ماحول فراہم ہے، تو انسان اور جنّات کے شیاطین کے وسوسے میں گرفتار نہ ہو اور غیر شرعی طریقوں سے مفاد سے حاصل کرنے والوں کی سازشوں سے ڈرو۔ کیوں کہ اگر یہ فرصتیں ضائع ہوگئیں تو دوبارہ آنا مشکل ہوگا۔ البتہ امامؑ کی زندگی کی تاریخ بھی بتاتی ہے کہ آپؑ کے زمانے کے لوگوں نے اس تنبیہ سے نصیحت نہ لی، انہوں نے فرصتوں کو ضائع کیا اور اُس دن جب لشکرِ شام نے مکمل شکست کھائی تو اسلامی لشکر والے عمرو عاص کی شاطرانہ چال سے دھوکا کھا گئے، جس کے نتیجے میں بنی امیہ و بنی مروان کی حکومتیں قائم ہوئیں اور جن کی حکومت کی تباہ کاریوں کی مثالیں تاریخ میں بہت کم ملتی ہیں، حجاجیوں (حجاج بن یوسف جیسے لوگوں) نے اسلامی اقدار کو مکمل طور پر برباد کر دیا۔

اس مقام پر سیّد رضیؒ کی وضاحت سے استفادہ کریں گے کہ امامؑ اپنے خطبے کے غیر معمولی عجائبات کو بہت سی خوبصورت تعبیرات کے ذریعے واضح فرماتے ہیں۔ سیّد رضیؒ فرماتے ہیں، اس گفتگو کے بارے میں جو کہ فصاحت کی حقیقت سے زیادہ نزدیک ہے ایسے رموز پوشیدہ ہیں کہ ہر کوئی اس کے قریب نہیں پہنچ سکتا، اس سے قبل کہ ہم ان عجائبات پر گفتگو کریں، اس سے بڑھ کر اور تعجب کا مقام یہ ہے کہ آپؑ کی فصاحت کی گہرائی اتنی ہے کہ نہ زبان اس کی تشریح پر قدرت رکھتی ہے نہ کوئی فرد اس کی گہرائیوں کو سمجھ سکتا ہے، اور حقیقت یہ ہے کہ جو کچھ مولا نے فرمایا ہے اس کا ادراک صرف وہی لوگ کر سکتے ہیں، جو فصاحت میں کمال رکھتے ہیں۔

"وَمَا يَعْقِلُهَا إِلَّا الْعَالِمُوْنَ"

''عقل مندوں کے علاوہ اسے کوئی نہیں سمجھ سکتا۔''

---

[1] شرح ابن ابی الحدید، جلد ۱، ص ۲۸۱

https://downloadshiabooks.com/

تیسرا حصہ

ومن هذه الخطبة وفيها يقسم الناس إلى ثلاثة اصناف

شُغِلَ مَنِ الْجَنَّةُ وَ النَّارُ اَمَامَهُ سَاعٍ سَرِيعٌ نَجَا وَ طَالِبٌ بَطِيءٌ رَجَا وَ مُقَصِّرٌ فِي النَّارِ هَوَى الْيَمِينُ وَ الشِّمَالُ مَضَلَّةٌ وَ الطَّرِيقُ الْوُسْطَى هِيَ الْجَادَّةُ عَلَيْهَا بَاقِي الْكِتَابِ وَ آثَارُ النُّبُوَّةِ وَ مِنْهَا مَنْفَذُ السُّنَّةِ وَ إِلَيْهَا مَصِيرُ الْعَاقِبَةِ هَلَكَ مَنِ ادَّعَى وَ خَابَ مَنِ افْتَرَى مَنْ اَبْدَى صَفْحَتَهُ لِلْحَقِّ هَلَكَ وَ كَفَى بِالْمَرْءِ جَهْلًا اَلَّا يَعْرِفَ قَدْرَهُ لَا يَهْلِكُ عَلَى التَّقْوَى سِنْخُ اَصْلٍ وَ لَا يَظْمَأُ عَلَيْهَا زَرْعُ قَوْمٍ فَاسْتَتِرُوا فِي بُيُوتِكُمْ وَ اَصْلِحُوا ذَاتَ بَيْنِكُمْ وَ التَّوْبَةُ مِنْ وَرَائِكُمْ وَ لَا يَحْمَدْ حَامِدٌ إِلَّا رَبَّهُ وَ لَا يَلُمْ لَائِمٌ إِلَّا نَفْسَهُ."

یہ اسی خطبے کا ایک حصہ جس میں لوگوں کو تین حصوں میں تقسیم کیا گیا ہے۔

"وہ شخص کسی طرف دیکھنے کی فرصت نہیں رکھتا جس کی نگاہ میں جنت وجہنم کا نقشہ ہو، تیز رفتاری سے کام کرنے والا نجات پالیتا ہے اور سست رفتاری سے کام کر کے جنت کی طلب گاری کرنے والا بھی امیدوار رہتا ہے لیکن کوتاہی کرنے والا جہنم میں گر پڑتا ہے، دائیں بائیں گمراہیوں کی منزلیں ہیں اور سیدھا راستہ صرف درمیانی راستہ ہے، اسی راستے پر کتابِ خدا اور نبوت کے آثار ہیں اور اسی سے شریعت کا نفاذ ہوتا ہے اور اسی کی طرف عاقبت کی بازگشت ہے۔ غلط ادّعا کرنے والا ہلاک ہوا اور افترا کرنے والا ناکام ونامراد ہوا، جس نے حق کے مقابلے میں سر نکالا وہ ہلاک ہوگیا اور انسان کی جہالت کے لیے اتنا ہی کافی ہے کہ اسے اپنی ذات کا بھی عرفان نہ ہو، جو بنیاد تقویٰ پر رکھی جاتی ہے اس میں ہلاکت نہیں ہوتی ہے اور اس کے ہوتے ہوئے کسی قوم کی کھیتی پیاس سے برباد نہیں ہوتی ہے، اب تم اپنے گھروں میں چھپ کر بیٹھ جاؤ اور اپنے باہمی امور کی اصلاح کرو، توبہ تمہارے سامنے ہے۔ تعریف کرنے والے کا فرض ہے کہ اپنے رب کی تعریف کرے اور ملامت کرنے والے کو چاہیے کہ اپنے نفس کی ملامت کرے۔"

https://downloadshiabooks.com/

شرح وتفسیر

راہِ نجات یہ ہے

اس خطبے کی گزشتہ ابحاث میں بیعت کے بعد امتحان کا بازار گرم ہونے کے متعلق گفتگو ہو رہی تھی اور لوگوں کو حق و باطل اور تقویٰ اور گناہ کے بارے میں امامؑ عالی مقام ہوشیار فرما رہے تھے، اس بحث کو آگے بڑھاتے ہوئے مولاؑ نے اس حصے میں ہوا و ہوس سے نجات اور منزلِ سعادت تک پہنچنے کے طریقے بتائے ہیں اور کچھ جامع و پُرمعنی بیانات کے ذریعے بہت سے اہم مطالب کی جانب اشارہ کیا ہے، سب سے پہلے لوگوں کو سعادت اور نجات کی راہ میں تین گروہوں میں تقسیم فرمایا ہے۔ امامؑ فرماتے ہیں:

"شُغِلَ مَنِ الْجَنَّةُ وَ النَّارُ اَمَامَهُ! سَاعٍ سَرِيْعٌ نَجَا، وَ طَالِبٌ بَطِيْءٌ رَجَا، وَ مُقَصِّرٌ فِي النَّارِ هَوىٰ"

''جس کی نگاہ میں جنت اور دوزخ ہیں اور وہ اُن پر مکمل یقین بھی رکھتا ہے تو وہ اُن کاموں سے پرہیز کرتا ہے جو وہاں فائدہ نہیں پہنچاتے اور اپنے مستقبل کی فکر میں رہتا ہے۔'' اور اس راہ میں لوگوں کی تین قسمیں ہیں:

جو لوگ خوب محنت کرتے ہیں اور تیزی سے آگے بڑھتے ہیں وہ اہل نجات ہیں اور جو لوگ سستی سے قدم اُٹھاتے ہیں، پھر بھی نجات کی اُمید رکھتے ہیں اور وہ لوگ جو کوتاہی سے کام لیتے ہیں اور اس راہ میں مُقصّر ہیں، وہ لوگ دوزخ کی آگ اور بدبختی کی کھائی میں گر جاتے ہیں۔ بعض کے مطابق یہ تین گروہ وہی ہیں، جن کی جانب قرآنِ کریم کی سورۂ فاطر میں ارشاد ہوتا ہے:

"ثُمَّ اَوْرَثْنَا الْكِتَابَ الَّذِيْنَ اصْطَفَيْنَا مِنْ عِبَادِنَا فَمِنْهُمْ ظَالِمٌ لِّنَفْسِهٖ وَ مِنْهُمْ مُّقْتَصِدٌ وَ مِنْهُمْ سَابِقٌ بِالْخَيْرَاتِ بِاِذْنِ اللّٰهِ" [1]

''پھر ہم نے اس (آسمانی) کتاب کو اپنے برگزیدہ بندوں کی میراث بنا دیا، پس اُن میں سے کچھ نے اپنے آپ پر ظلم کیا اور کچھ نے میانہ روی اختیار کی اور ایک گروہ نیکیوں کے معاملے میں بہ اذنِ خدا سب سے آگے نکل گیا۔''

بعض نے کہا ہے کہ یہاں اُن تین گروہوں کی طرف اشارہ ہے، جن کا سورۂ واقعہ میں ذکر ہوا ہے:

"وَ كُنْتُمْ اَزْوَاجًا ثَلَاثَةً فَاَصْحَابُ الْمَيْمَنَةِ مَاۤ اَصْحَابُ الْمَيْمَنَةِ وَ اَصْحَابُ الْمَشْئَمَةِ مَاۤ

[1] سورۂ فاطر، آیت ۳۲

https://downloadshiabooks.com/

اَصۡحٰبُ الۡمَشۡـَٔمَةِ وَ السّٰبِقُوۡنَ السّٰبِقُوۡنَ اُولٰٓئِكَ الۡمُقَرَّبُوۡنَ"[1]

''اور تم لوگ تین گروہوں میں رہو گے؛ ایک گروہ سعادت مند لوگوں کا ہے، اور کیا ہی سعادت مند اور کامیاب لوگ ہیں؛ دوسرا گروہ، شقی لوگوں کا ہے یہ اور کیا ہی شقی لوگ ہیں؛ تیسرا گروہ آگے بڑھ جانے والے، آگے بڑھ جائیں گے اور وہی لوگ مقربین ہوں گے۔''

بہر حال بشری سماج میں تین گروہوں کا ہونا ہمیشہ کی بات ہے، جب امتحان کا بازار گرم ہو جاتا ہے (جیسا کہ مولا علیؑ کی خلافت کے زمانے میں ہوا) تو ان تینوں کو پہچاننا اور بھی آسان ہو جاتا ہے۔

ایک گروہ (اگر چہ ایسے لوگ کم ہی ہوا کرتے ہیں) بلا تردید اور کسی تزلزل وغیرہ کے بغیر، سفر کو طے کرتے ہوئے مقصد کی جانب تیزی سے قدم اُٹھاتے ہوئے چلے جاتے ہیں، ایک اور گروہ جو قدرے ضعیف ایمان رکھتا ہے اور پہلے گروہ کی طرح یقینِ کامل کی منزل پر نہیں ہوتا، بے یقینی کی کیفیت اُس کے افراد کو شکوک وشبہات میں مبتلا رکھتی ہے، نیکیوں کے ساتھ ساتھ بُرے اعمال بھی ان سے سرزد ہوتے رہتے ہیں۔ یہ نیکی کے راستے پر آہستہ آہستہ آگے بڑھتے ہیں اور لطفِ الٰہی کی امید رکھتے ہیں کہ دستِ قدرت ان کا ہاتھ تھام لے اور انہیں مقصد تک پہنچا دے، مگر تیسرا گروہ ایسا ہے کہ ہوائے نفسانی نے اُن کو گھیر رکھا ہے اور اُنہوں نے ایمان اور تقویٰ کو الوداع کہہ دیا ہے اور گمراہی میں پڑے ہوئے ہیں۔ وہ بدبختی کی کھائی میں گر جاتے ہیں۔ یہ تعبیر ایک بات کو واضح طور پر سمجھا دیتی ہے کہ صرف معاد اور قیامت پر ایمان ہے جو انسان کو گناہ اور فساد سے بچائے رکھتا ہے، اور جس قدر بھی یہ ایمان مضبوط ہوگا، اس کے حامل پر اس کا اثر اُتنا ہی زیادہ ہوگا۔

بعض نے کہا ہے کہ یہ جملہ:

"شُغِلَ مَنِ الْجَنَّةُ وَالنَّارُ اَمَامَهُ"

ایک ایسا جملۂ خبریہ ہے جو اِنشاء کا معنی رکھتا ہے، یعنی جو لوگ جنت اور دوزخ کو اپنے سامنے مجسم شکل میں دیکھتے ہیں، اُنہیں دنیا کی رنگینیوں اور ہوا و ہوس سے چشم پوشی کرنی چاہیے، مگر درج ذیل جملے کی تفسیر جملہ خبریہ کے انداز میں بھی کی جا سکتی ہے اور اس میں کوئی حرج نہیں ہے، یعنی اس طرح کے مومن لوگ ہوا و ہوس سے چشم پوشی کریں گے۔ پھر اوپر بیان کئے گئے تین گروہوں کی وضاحت کے بعد مولاؑ لوگوں کو سیدھی راہ پر چلنے اور منحرف کرنے والے راستوں سے دوری اختیار کرنے کی دعوت دے رہے ہیں، جس کے ساتھ نشانیاں بھی بیان فرمائی ہیں۔ فرماتے ہیں:

[1] سورۂ واقعہ، آیات ۷ تا ۱۱

https://downloadshiabooks.com/

"اَلْیَمِیْنُ وَالشِّمَالُ مَضَلَّۃٌ [۱] وَالطَّرِیْقُ الْوُسْطٰی ھِیَ الْجَادَّۃُ"

''دائیں اور بائیں جانب منحرف ہونا گمراہی کا سبب ہے اور درمیانہ اور سیدھا راستہ ہی اللہ کا کشادہ راستہ ہے۔''

یہ بات اُسی مشہور مثال کی جانب اشارہ ہے کہ جو ہم کہتے ہیں کہ ہدف کی جانب جانے والا راستہ، ایک سے زیادہ نہیں ہے اور اُس کے دونوں طرف ہزاروں منحرف کرنے والے گمراہی کے راستے ہیں جو انسان کو گمراہ کردیتے ہیں۔ ممکن ہے کہ دائیں اور بائیں کی تعبیر سے مراد افراط و تفریط ہو کہ ایک گروہ کے افراد، افراط کا راستہ چن لیتے ہیں اور منزل کی ایک جانب کھڑے ہوتے ہیں اور ایک گروہ تفریط کا راستہ چن لیتا ہے اور دوسری طرف کھڑا ہوجاتا ہے۔ ایسے لوگ منزل تک ہرگز نہیں پہنچ پاتے۔ صحیح راستہ وہی ہے جس کا قرآن مجید میں صراطِ مستقیم کے نام سے ذکر کیا گیا ہے۔ اور ایک جگہ ارشادِ الٰہی ہے:

"وَكَذٰلِكَ جَعَلْنٰكُمْ اُمَّةً وَّسَطًا" [۲]

''ہم نے تم کو ایک میانہ روی کرنے والی امت قرار دیا، یعنی اعتدال کی حد میں جو افراط و تفریط سے خالی ہو۔''

جیسا کہ علم الاخلاق کے بڑے علما نے کہا ہے، تمام صفاتِ فضیلہ ایک حد اعتدال کے طور پر صفاتِ رذیلہ کے درمیان حائل ہیں، جو کہ یا افراط کی جانب نظر آتی ہیں یا پھر تفریط سے بھرپور ہوتی ہیں۔ اس طرح سے انھوں نے تمام تر اخلاقی صفات کو اس تقسیم میں جمع کردیا ہے یا پھر دوسری تعبیر کے مطابق یہ وہی اخلاقی عدالت کا مسئلہ ہے جو انسان کو حدِ اعتدال میں رکھتا ہے اور میانہ روی کی سیدھی راہ پر قائم رکھتا ہے اور انحراف کی راہوں سے دور رکھتا ہے۔ بعض مفسرین نہج البلاغہ نے طریقِ وسطیٰ کی تفسیر میں کہا ہے کہ یہ امامت اور ولایتِ معصومین علیہم السلام کا مسئلہ ہے کہ اُن بزرگوار ہستیوں کے بارے میں ہر طرح کا غلو یا افراط و تفریط یا کوتاہی، گمراہی کا سبب ہے مگر اس میں کوئی ممانعت نہیں کہ ہم اس جملے کو زیادہ وسیع مفہوم میں سمجھنے کی کوشش کریں، یعنی یہ کہ ہم اس جملے کو مسئلۂ ولایت اور تمام تر اعتقادی، عملی و اخلاقی مسائل پر حاوی جانیں، خداشناسی کے مسئلے میں ایک گروہ تشبیہ کی وادی میں گرفتار ہے اور خدا کو اُس کی مخلوق جیسا سمجھتے ہیں اور ایک گروہ جو راستے منحرف ہوگیا ہے، کہتا ہے، خدا کی ذات اور اُس کی صفات ایسی ہیں کہ کوئی بھی ان کی شناخت ہی نہیں کرسکتا (یہاں تک کہ اجمالی شناخت بھی) جبکہ ایسا نہیں ہے اور ان دونوں راستوں یعنی تشبیہ اور تعطیل کی راہوں کے درمیان میں بھی ایک راستہ ہے، وہ یہ کہ ہم اُس کو اُس کے افعال کے ذریعے تو پہچان سکتے ہیں مگر اُس کی ذات کی گہرائیوں سے بے خبر ہیں اور سمجھ نہیں

---

[۱] مَضَلَّۃٌ، مفعلہ کے وزن پر ہے جو کہ بعض اربابِ لغت کے مطابق کسی چیز کا اپنی جگہ پر زیادہ مقدار میں موجود ہونا ہے، اس بنا پر یہاں مفہوم یہ ہوگا کہ دائیں اور بائیں جانب منحرف ہونے سے بہت ساری گمراہیاں ہی نصیب ہوں گی۔

[۲] سورۂ بقرہ، آیت ۱۴۳

https://downloadshiabooks.com/

پائیں گے۔

بندوں کے افعال کے معاملے میں نہ تو جبر کی راہ اختیار کرنا صحیح ہے اور نہ ہی تفویض کی راہ ٹھیک ہے، بلکہ درمیانی راستہ ٹھیک رہے گا، جس میں دونوں طرف کی باتیں بھی شامل ہوجاتی ہیں اور اسی طرح سے ولایت کے مسئلے میں بھی نہ غلو ٹھیک ہے اور نہ تقصیر سے کام لینا ٹھیک ہے، اخلاقیات میں بھی اسی طرح ہے اور اعمال میں بھی اسی طرح۔ مثال کے طور پر انفاق، بخل اور اسراف کی درمیانی راہ ہے، اور لطیف بات یہ ہے کہ جو لوگ حضرتؑ کی مخالفت کے لیے کھڑے ہوگئے تھے، وہ بھی ان دو گروہوں سے خارج نہ تھے یعنی شامیوں کا گروہ تفریط کا شکار تھا، جنھوں نے کبھی حضرتؑ کو پہچانا ہی نہ تھا، پھر حضرتؑ نے اس درمیانی اور مستقیم راستے کی خصوصیات کا ذکر کرتے ہوئے فرمایا:

"عَلَيْهَا بَاقِي الْكِتَابِ وَآثَارُ النُّبُوَّةِ، وَمِنْهَا مَنْفَذُ السُّنَّةِ، وَإِلَيْهَا مَصِيرُ الْعَاقِبَةِ"

"قرآن جو کہ باقی رہنے والی کتاب ہے اور آثارِ نبوت، دونوں اسی راستے پر ہیں، اور سنّتِ نبوی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم میں داخل ہونے کا راستہ بھی یہاں سے ہے اور انجام بھی اسی پر ہوگا۔"

اس "عَلَيْهَا بَاقِي الْكِتَابِ" کے جملے کے بارے میں دو تفسیریں بیان کی گئی ہیں، پہلی یہ ہے کہ اس سے مراد قرآن مجید ہے جو کہ ایک ہمیشہ باقی اور رہنے والی زندۂ جاوید کتاب ہے اور تمام الٰہی پیغامات اور احکام وقوانین صرف اسی میں ہیں اور اس کے علاوہ کسی اور جگہ نہیں ملیں گے۔ دوسری یہ کہ کتاب جاوداں سے مراد امامِ معصومؑ کا وجودِ مبارک ہے جو کتاب اللہ کے محافظ ہیں اور حدیثِ ثقلین کے مطابق وہ ہمیشہ قرآن کے ساتھ رہیں گے، لیکن پہلی تفسیر زیادہ مناسب ہے، خاص طور پر اس لیے کہ اُس کے بعد کا جملہ آثارِ نبوت سے مراد ائمہ معصومینؑ کی ذوّاتِ مقدسہ کو لیا جاسکتا ہے، کیونکہ وہ خود بھی نبیوں کے آثار ہیں اور ان کے پاس انبیاءؑ کے آثار بھی موجود ہیں، اس مقام پر اور دیگر احتمالات بھی دیئے گئے ہیں جو کہ بعید ہیں۔

جملہ وَمِنْهَا مَنْفَذُ السُّنَّةِ سے مراد کیا ہے؟! اس کو سمجھنے کے لیے پہلے تو یہ ملحوظ خاطر رکھنا ہوگا کہ اس کے لفظی معنی ہیں دریچہ، نور کے گزرنے کی جگہ یا صرف گزرنے کی جگہ چاہے کچھ بھی گزرے، اس کے مطابق جملے کا مفہوم کچھ یوں نظر آتا ہے کہ سنّتِ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا راستہ بھی معتدل اور درمیانی اور سیدھا راستہ ہے، اِسی سے اللہ کے حبیب صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی دعوت اور مقصدِ رسالت سے آشنائی ہوسکتی ہے، اس طرح ان چار جملوں کا فرق واضح ہوجاتا ہے۔

پہلے حضرتؑ کا ارشاد ہوتا ہے کہ خدا کی زندۂ جاوید کتاب بھی اسی راہ پر موجود ہے، پھر فرماتے ہیں نبوتؐ کے آثار و دلائل اور اعجازِ رسالتؐ بھی اسی راہ پر ہے اور پھر اضافہ فرماتے ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی تعلیمات اور سنّت میں داخل ہونے کا واحد راستہ یہی ہے، اور بالآخر فرماتے ہیں کہ منزلِ مقصود اور انجامِ خیر تک پہنچنے کے لیے بھی اسی راہ سے گزرنا ضروری

https://downloadshiabooks.com/

ہے، جیسا کہ قرآن مجید میں ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

"وَالْعَاقِبَةُ لِلْمُتَّقِينَ"[۱]

''نیک انجام صرف متقی لوگوں کے لیے ہے۔''

پھر امامؑ عالی مقام نے امامت کے باطل دعویداروں کے انجام کا ذکر اور لوگوں کی ہدایت کی جانب قدم بڑھاتے ہوئے چار جملوں میں فرمایا، جس نے ناحق امامت وولایت کا جھوٹا دعویٰ کیا وہ ہلاک ہوجائے گا، کیونکہ وہ خود بھی گمراہ ہے اور دوسروں کو بھی گمراہی کی طرف گھسیٹ رہا ہے۔ ''هَلَكَ مَنِ ادَّعَىٰ'' اور جو شخص اللہ اور اُس کے رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر جھوٹا بہتان باندھ کر کسی ایسے مقام کو طلب کرے وہ محروم ہوجائے گا اور کسی جگہ بھی نہیں پہنچ سکے گا (وَخَابَ[۲] مَنِ افْتَرَىٰ)

"مَنْ اَبْدٰى صَفْحَتَهُ[۳] لِلْحَقِّ هَلَكَ"

''جو شخص جھوٹے دعوے کے ساتھ حق کے خلاف سینہ تان کر کھڑا ہوجائے وہ ہلاک ہوجائے گا۔''

"وَ كَفٰى بِالْمَرْءِ جَهْلًا اَلَّا يَعْرِفَ قَدْرَهُ"

''اور انسان کے نادانی کے لیے یہی کافی ہے کہ وہ اپنی قدر کو نہ جانے۔'' (اور اپنی چادر سے زیادہ پاؤں پھیلائے اور ایسے مقام کا دعویٰ کرے جس کے لائق وہ ہرگز نہیں)۔

اِس بات کا بھی احتمال موجود ہے کہ یہ چاروں جملے مسئلۂ امامت سے متعلق ہوں، کیونکہ یہ خطبہ اسی مسئلے پر گفتگو پہ مشتمل ہے، بلکہ اور وسیع معنوں میں یہ کہنا چاہیے کہ یہ خطبہ، تمام باطل دعویداروں اور غلط لوگوں کے بارے میں ہے، چاہے امامت کا معاملہ ہو، چاہے کوئی اور معاملہ ہو۔ سمجھا رہا ہے کہ یہ خطرناک راستہ سوائے ہلاکت اور تباہی ونابودی کے اور کوئی ثمر نہیں رکھتا، کیوں کہ اس میں سوائے شقاوت و بدبختی کے کچھ بھی نہیں جو جہل کی پیداوار ہے، اور اپنے آپ کو نہ پہچاننے کی کھلی دلیل ہے۔

نہج البلاغہ کے بعض شارحین نے جملہ: "مَنْ اَبْدٰى صَفْحَتَهُ لِلْحَقِّ هَلَكَ" کی کچھ اور ہی تفسیر کی ہے، اور وہ تفسیر کچھ یوں ہے کہ جو بھی نادان لوگوں کے درمیان حق کے دفاع کے لیے کھڑا ہو اور اس کی حمایت کرنا چاہتا ہے، وہ اپنے

---

[۱] سورۂ اعراف، آیت ۱۲۸

[۲] خَابَ کا لفظ خیبة کے مادّے سے آیا ہے جس کا مطلب ہے بے فائدہ ہونا یا محروم ہوجانا، اسی لیے آگ لگانے کے لیے استعمال ہونے والے اُس پتھر کو جس میں سے کوئی چنگاری نہ نکلتی ہو۔ ''خیاب'' کہتے ہیں اور ''خاب'' کا لفظ یہاں پر محروم ہوجانے اور نتیجے تک نہ پہنچنے کے معنی رکھتا ہے۔

[۳] ''صفحة'' کا لفظ کسی چیز کے عرض کے لیے آتا ہے اور کبھی چہرے کے صفحے کے لیے استعمال ہوتا ہے اور ''مصافحة'' یہ ہے کہ صفحہ یعنی دو ہاتھوں کے صفحوں کو آپس میں ملایا جائے۔

https://downloadshiabooks.com/

آپ کو خطرے میں ڈال دیتا ہے اور جاہلوں کے غصے کی زد میں آ جاتا ہے۔ یہ بات اگرچہ ہے تو بالکل حقیقت پر مبنی، مگر یہ درج ذیل جملے کی تفسیر نہیں ہو سکتی، کیونکہ یہ نہ تو پچھلے جملوں سے کوئی مشابہت رکھتی ہے، جو باطل دعویداروں کے بارے میں گفتگو کر رہے ہیں اور نہ ہی بعد کے جملوں سے کوئی مماثلت رکھتی ہے، جس میں جاہل اور نادان لوگوں کے بارے میں گفتگو ہو رہی ہے۔ بالآخر مولاؑ اس گفتگو کے آخری مرحلے میں امامت اور حکومت کے موضوع پر جس کے متعلق پچھلے مقامات پر ذکر ہو چکا ہے، کچھ نصیحتیں فرما رہے ہیں کہ اگر ان پر عمل کیا گیا تو نفاق پھیلانے والوں اور ہنگامہ آرائی کرنے والوں اور باطل دعویداروں کے چنگل سے رہا ہو سکتے ہیں۔ سب سے پہلے تو تقویٰ کی جانب بُلا رہے ہیں جو کہ ہر صحیح اور پاک صاف اقدام اور عمل کی اساس ہے۔ فرماتے ہیں:

"لَا يَهْلِكُ عَلَى التَّقْوٰى سَنْخُ [1] أَصْلٍ، وَلَا يَظْمَأُ عَلَيْهَا زَرْعُ قَوْمٍ"

"جو درخت سرزمینِ تقویٰ میں لگایا جائے، وہ کبھی ختم نہیں ہوگا اور جو کھیتی تقویٰ کی زمین میں اُگائی جائے وہ کبھی پیاسی نہ رہے گی۔"

درحقیقت مولاؑ نے اس پُرمعنی گفتگو میں تقویٰ کو کسی ایسی زرخیز اور سیراب زمین سے تشبیہ دی ہے کہ جس میں نہ درختوں کی جڑیں خشک ہوتی ہیں اور نہ ہی اُس میں کوئی کھیتی پیاسی رہتی ہے۔ اس میں ایسی نرم خاک اور جاری نہریں ہیں، جو پھولوں، پودوں اور نیک اعمال اور انسانی فضائل کے پھلوں کی پرورش کی راہ ہموار کر دیتی ہیں، درحقیقت تمام تر اعمال ایک ایسے دانے کی مانند ہیں، جنھیں کسی اچھی زرخیز زمین میں بونا چاہیے اور اچھی طرح سے اُس کی آبپاشی ہونی چاہیے، یہ زمین اور یہ پانی سوائے تقویٰ کے اور کچھ نہیں۔ آگے فرماتے ہیں:

"فَاسْتَتِرُوْا فِيْ بُيُوْتِكُمْ"

"اپنے گھروں میں چھپ جاؤ (اور منافقوں اور تفرقہ اندازی کرنے والوں سے گریز کرو)۔"

کیونکہ امامِ عالی مقام نے اپنی چشمِ مبارک سے یہ دیکھ لیا تھا کہ اُن کی حکومت سے اُن لوگوں کا بڑا نقصان ہوگا جنھوں نے خلیفۂ سوّم کے دورِ حکومت میں بیت المال کا پیسہ غارت کیا تھا اور ظلم و ناانصافی کو دنیا میں پھیلاتے رہے ہیں۔ وہ لوگ اپنے جیسے افراد یا نادان لوگوں کو اپنے اردگرد جمع کریں گے اور خاموش نہ بیٹھیں گے۔ بے شک ایسے کسی گروہ یا لشکر کا

---

[1] "سنخ" کے لفظی معنی جڑوں اور اصل کے ہیں یا اُس جگہ کو کہا جاتا ہے جہاں کوئی درخت اُگے اور اُس کی جڑیں اُس مقام پر گڑی ہوئی ہوں اور بعض لوگ اسے کسی چیز میں رسوخ ہونے کے معنی میں استعمال کرتے ہیں۔ اور یہ تمام معانی ایک دوسرے سے قریب قریب ہیں۔ اس مقام پر عبارتِ مذکورہ میں معارف اور اعمالِ صالح کی جڑوں کے بارے میں گفتگو ہو رہی ہے جو تقویٰ کی زمین میں رسوخ پا چکی ہوتی ہیں اور اسی لیے وہ کبھی نہیں مرجھاتیں۔

https://downloadshiabooks.com/

حصہ بننا گناہ ہے اور یہی وہ موقع ہے کہ جب گھر میں بیٹھ جانا چاہیے۔ یہ گھر میں بیٹھ جانا جہاد اور کام کے موقع پر نہیں ہے، اور نہج البلاغہ کے بعض شارحین کے مطابق جب شور شرابہ انسانی معاشرے کے لیے نقصان دہ ہو تو خاموشی سب سے بہترین شے ہے۔

اپنی تیسری نصیحت میں، حق کے طرفداروں کی صفوں میں اتحاد پیدا کرنے اور ہر طرح کی تفرقہ بازی اور نفاق کا سدِ باب کرنے اور اہلِ باطل کی صفوں کو تہس نہس کرنے کے لیے فرماتے ہیں، اپنے آپ کی اصلاح کی کوشش کرو، (اور لوگوں میں دوستی پھیلاؤ اور اپنی صفوں میں اتحاد پیدا کرو) وَاَصْلِحُوْا ذَاتَ بَيْنِكُمْ اور بالآخر اپنی چوتھی اور آخری نصیحت میں جو اُن لوگوں سے متعلق ہے، جنھوں نے ماضی میں غلطیاں کی ہیں اور پچھلی حکومتوں میں خطائیں کی ہیں اور پشیمان ہیں، تو آپؑ اُن سے فرماتے ہیں کہ توبہ کے پانی سے گناہوں کے دھبوں کو اپنے دامن سے دھولیں اور ارشاد فرماتے ہیں:

''وَالتَّوْبَةُ مِنْ وَّرَائِكُمْ''[1]

''توبہ تمہارے پیچھے اور تمہاری دسترس میں ہے۔'' (اُسے تھام لو اور اُس کے سائے میں اپنے آپ کو چھپا لو)

اس بات کو مکمل کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

''وَلَا يَحْمَدْ حَامِدٌ اِلَّا رَبَّهُ، وَلَا يَلُمْ لَائِمٌ اِلَّا نَفْسَهُ''

''تعریف کرنے والے سوائے خدا کے اور کسی کی تعریف نہیں کریں اور گناہوں اور خطاؤں میں اپنے سوا کسی اور کو سرزنش نہیں کریں۔''

تمام نعمتیں خدا کی جانب سے ہیں اور ہر وہ توفیق اور سعادت جو انسان کو نصیب ہوتی ہے، وہ خداوند کریم کے لطفِ جلی اور خفی کی بناء پر اور اُسی کی جانب سے ہوا کرتی ہے، لہٰذا اطاعت کے وقت مغرور نہیں ہونا چاہئے اور جو بھی گناہ ہوتا ہے یا خطا سرزد ہوتی ہے وہ تمہاری کوتاہیوں کی وجہ سے ہے، سوائے اپنے آپ کے اور کسی کو ملامت نہ کرو اور اپنے گناہوں کو دوسروں کی گردن پر نہ ڈالو اور قضا و قدر کے بہانے نہ بناؤ، کوشش کرو کہ توبہ کے پانی سے اُن سب کو دھولو۔

---

[1] ''وراء'' کا لفظ ''وری'' کے مادّے سے آیا ہے اور ''وزن'' کے وزن پر ہے اور دراصل چھپنے کے معنی میں آتا ہے اور ''وَرَاء'' کبھی پیچھے کے معنی میں استعمال ہوتا ہے یا اُس شے کو کہا جاتا ہے جو پیچھے کی جانب ہے مگر چھپی ہوئی اور غیر نمایاں ہے اور مندرجہ ذیل عبارت میں پیچھے کے معنی ہی دُرست ہیں۔

https://downloadshiabooks.com/

چند نکات

جاہل وہ ہے جو اپنی قدر نہ جانے

بہت سی مشکلات اور معاشرتی مسائل کی جڑ اُونچی پروازیں یا یوں کہا جائے تو بے جا نہ ہوگا کہ اپنی چادر سے زیادہ پاؤں پھیلانا اور اُس مقام کی تمنا کرنا جس کے لیے وہ انسان بنایا نہ گیا ہو یا اُس کے لائق نہ ہو اور یہ سب اُس وقت ہوتا ہے جب بندہ ذاتی مقام و منزلت اور حیثیت کو پہچاننے میں غلطی کا شکار ہو جائے، اور یہ غلط فہمی اس لیے ہوتی ہے کہ انسان چھوٹی قوت کو بڑی اور بڑی کمزوری کو چھوٹا سمجھنے لگے، اپنی قدر و منزلت کو کھو دینا اور اپنی حدود سے زیادہ اُونچی اُڑان اُڑنا اور ان سب چیزوں کے نتیجے میں بے جا توقعات کرنا، ہمیشہ سے ہی انسانی معاشرے کے لیے بڑی بڑی مصیبتوں کا باعث بنا ہے، اور یہ نہ صرف انسانی معاشرے کے لیے نقصان دہ ہے، بلکہ خود اُس انسان کے لیے بھی زحمتوں، بدبختیوں اور نقصانات کا باعث بنتا ہے یعنی یہ انسان اگر اپنے پیرائے میں رہتے ہوئے چلتا تو کام احسن طور پر انجام پزیر ہوتا، لیکن چونکہ اس نے اپنی قدر و حیثیت نہ پہچانی اور اپنی اوقات کو ملحوظِ خاطر نہ رکھا تو لگاتار غلط راہ پر خاصی محنت و مشقت کرنے کے بعد اپنا بھی نقصان کیا اور دوسروں کے لیے بھی نقصان اور تکلیف کا باعث بنا۔ کاش ہر چھوٹا اور بڑا، عالم و جاہل اس اہم باریکی پر غور و خوض کرے اور اپنی قدر و منزلت کو جانچے اور راہ میں حائل رکاوٹوں کو ہٹا کر خود کو اور دوسروں کو بھی سعادت کی راہوں پر گامزن رکھ سکے۔ اسی لیے نہج البلاغہ میں بارہا اس اہم مسئلے کے حل کی تاکید کی گئی ہے، جیسے کہ خطبہ ۱۰۳ میں ہے:

"اَلْعَالِمُ مَنْ عَرَفَ قَدْرَهُ وَ كَفٰى بِالْمَرْءِ جَهْلًا اَنْ لَّا يَعْرِفَ قَدْرَهُ"

''واقعی عالم وہ ہے جو اپنی قدر و منزلت کو پہچان لے اور انسان کی نادانی کے لیے یہی کافی ہے کہ وہ اپنی قدر و منزلت کو نہ پہچانے۔''

نہج البلاغہ کے خط نمبر ۳۱ میں حکمت آمیز نصیحتوں کے بعد اپنے فرزند امام حسنؑ سے فرماتے ہیں:

"وَمَنِ اقْتَصَرَ عَلٰى قَدْرِهٖ كَانَ اَبْقٰى لَهٗ"

''جو شخص اپنی قدر و منزلت کے مطابق قناعت کرے، وہ اور اُس کا مفاد زیادہ پائیدار رہوگا۔''

https://downloadshiabooks.com/

حضرتؑ کے کلماتِ قصار کے ۱۴۹ویں کلمے میں ہے:

"هَلَكَ امْرُؤٌ لَمْ يَعْرِفْ قَدْرَهُ"

"جو شخص اپنی قدر و منزلت کو نہ پہچانے وہ ہلاک ہوجاتا ہے۔"

ایک حدیث میں ہے کہ ایک شخص نے امام موسیٰ بن جعفر علیہما السلام سے عرض کی کہ ہم بازار سے گزر رہے تھے کہ ایک شخص کو دیکھا جو آواز دے رہا تھا کہ میں محمدؐ و آلِ محمد علیہم السلام کے خالص شیعوں میں سے ہوں، جبکہ وہ ناانصافی سے کپڑے بیچ رہا تھا اور سستے مال کے لیے زیادہ رقم کا مطالبہ کر رہا تھا، تو امام موسیٰ بن جعفر علیہما السلام نے فرمایا:

"مَا جَهِلَ وَلَا ضَاعَ امْرُؤٌ عَرَفَ قَدْرَ نَفْسِهِ"

"جو شخص اپنی قدر و منزلت کو پہچان لے وہ نادان نہیں ہے اور ہرگز ضائع نہیں ہوگا۔"

پھر فرماتے ہیں کیا آپ لوگ جانتے ہیں یہ شخص کس جیسا ہے؟ اُس شخص جیسا ہے جو یہ کہے کہ وہ ابوذرؓ، سلمانؓ اور عمار یاسرؓ کی طرح ہے جبکہ وہ معاملے میں کمی کر رہا ہے اور اپنی چیز کے عیب گاہک سے چھپا رہا ہے، کیا ایسا شخص سلمانؓ، ابوذرؓ، مقدادؓ اور عمار یاسرؓ کی طرح ہوسکتا ہے؟ ہرگز نہیں۔ اب وہ چاہے تو یہ کہتا پھرے کہ میں محمدؐ و آلِ محمد علیہم السلام کے چاہنے والوں میں سے ہوں۔[1]

درج بالا جملے کے معنی میں یہ احتمال بھی ہے کہ اپنی قدر و منزلت کو پہچاننے سے مراد یہ ہے کہ انسان یہ ہرگز نہ بھولے کہ فقط یہ جسم و مادّہ ہی نہیں ہے کہ انسان اپنا مبادلہ چند یا کم قیمت چیزوں سے کر لے، بلکہ اُس کے پاس ایک ایسا گرانقدر گوہر نایاب ہے جو عالم بالا سے وابستہ ہے، وہ زمین میں خدا کا نمائندہ اور "خَلِيفَةُ اللهِ فِي أَرْضِهِ" ہے۔ وہ باغِ ملکوت کا پرندہ ہے، عالمِ خاکی کا نہیں، اگرچہ چند دنوں کے لیے بدن کے قید خانے میں کسبِ کمالات کی خاطر مقیم ہے، لہٰذا سچا عالم اور دانشور وہ ہے جو اس قدر و منزلت کو پہچانے اور جو لباس "كَرَّمْنَا" خدا نے اُسے پہنایا ہے اُس کے لطف و کرم کو سمجھے، جبکہ جاہل اور بے خبر تو وہ ہے جو اس مقامِ والا کو نظر انداز کردے اور شہوتوں اور نفسانی ہوا و ہوس کے چنگل میں پھنس جائے، اور جملہ "مَنِ اقْتَصَرَ عَلَى قَدْرِهِ كَانَ أَبْقَى لَهُ" اور اسی طرح سے ایک اور جملہ جو دانشوروں کے درمیان اہمیت رکھتا ہے، جو کہ ان مشہور احادیث سے حاصل کیا گیا ہے کہ فرمایا:

"اَلْعَالِمُ مَنْ عَرَفَ قَدْرَهُ وَلَمْ يَتَجَاوَزْ حَدَّهُ"

"عالم وہ ہے جو اپنی قدر و منزلت کو پہچانے اور اپنی حدود سے تجاوز نہ کرے۔"

---

[1] بحار الانوار، جلد ۶۵، ص ۱۵۷، تلخیص کے ساتھ۔

https://downloadshiabooks.com/

انہیں دیکھتے ہوئے پہلا مطلب زیادہ مناسب نظر آتا ہے۔ خطبے میں طلحہ وزبیر کا واقعہ اوران کی بے جا توقعات کو ملاحظہ کریں تو وہ بھی اسی تفسیر کی تائید کرتی ہے۔

اعتدال، اللہ کا سیدھا راستہ اور صراطِ مستقیم ہے

اگر اس جہانِ ہستی کو ایک نگاہ میں دیکھیں تو پتا چلے گا کہ قوتوں کے درمیان ایک خاصا اعتدال، توازن اور انصاف ہی دراصل اس جہان کی بقا کا باعث ہے، آسمان کے عظیم منظوموں اور کہکشاؤں کو قوتِ جاذبہ اور دافعہ کے درمیان موجود ایک خاص اعتدال نے ہی بچایا ہوا ہے، اگر ان دونوں میں سے صرف کوئی ایک قوت دوسری سے پہلے آجائے یا ایک دوسرے سے دور ہو جائیں کہ ان کے اثرات باقی نہ رہیں یا پھر اتنے نزدیک آجائیں گے کہ آپس میں ٹکرا جائیں گے اور نتیجے میں ایک بہت بڑا دھما کا ہوگا اور ہر چیز تباہ ہو جائے گی۔ یہ قانون جو کہ عالمِ کبیر میں صادق ہے، وہی انسان کے وجود میں بھی صادق آتا ہے، جسم و جان کی مختلف قوتوں کے درمیان تعادل وتوازن اور برابری ہی درحقیقت حیات انسانی کی سلامتی اور بقا کا راز ہے۔

خون کی مختلف ترکیبات اور اعصاب کی تحریک چاہے وہ ''سمپیتھک'' ہو یا ''پیرا سمپیتھک'' ہو، دل کی دھڑکن کا اعتدال، بدن کا وزن، خون کا دباؤ اور گاڑھے پن کی مقدار، سانس کے پھیپھڑوں کا خاص تعادل اور بالآخر ہر چیز کا ایک راہِ مستقیم پر چلتے رہنا، یہ سب کچھ ہماری صحت وسلامتی کا حقیقی باعث ہے اور اگر ہمارے وجود کے تمام ذرّات میں سے ایک ذرّہ بھی اُس میانہ روی سے ہٹ جائے اور افراط یا تفریط کی جانب چلا جائے، تو اُس کا اثر ہمارے جسم و جان پر فوراً لاحق ہوگا۔

قرآن نے امّت اسلامی کو ایک درمیانی امّت کے نام سے خطاب کیا ہے اور اسی وجہ سے اس امّت کو دنیا کی تمام ترقوموں اور لوگوں پر حجت قرار دیا ہے، کیونکہ یہ امّت الٰہی معیار کی بنا پر زیادہ روی اور کم روی کی تشخیص کر سکتی ہے، مولاؑ کے نورانی کلام میں اس بات کی سخت تاکید کی گئی ہے اور اصل راستہ وہی درمیانی راستہ بتایا گیا ہے جس میں آیاتِ قرآنی، آثارِ نبوت، سنّتِ معصومینؑ اور طریقۂ نجات سب ہی کچھ مل جائے گا، اس راہِ مستقیم سے انحراف کرنا انسانی معاشرے کے لیے وہ بدبختیاں لائے گا کہ ہر ایک دوسرے کو گھسیٹ رہا ہوگا، ہمیشہ افراط کا نتیجہ تفریط ہے اور اسی طرح سے ہمیشہ تفریط کا نتیجہ افراط ہے، اس دنیا میں ایک دن کوئی شخص اپنی ملکیت کی بنا پر افراط کر بیٹھتا ہے اور تمام سرمایہ جات صرف چند گنے چنے افراد کے ہاتھوں کا میل بن جاتے ہیں اور باقی تمام امت اور پوری قوم محروم اور فقیر رہتی ہے، جن کا کوئی پُرسانِ حال نہیں ہوتا، دوسرے دن محروم لوگ احتجاجی طور پر قیام کرتے ہیں اور اُس شخص کی ملکیت کے خلاف ہو جاتے ہیں اور نتیجے میں ایک نئی پارٹی اور ایک نیا راہنما بنا لیتے ہیں جو کہ ستر سال کی تگ ودو کے بعد بھی سوائے فقر، تنگدستی، بدبختی اور رسوائی کے کچھ نہیں حاصل کر پاتے،

https://downloadshiabooks.com/

اس کے دوران اس قدر ناحق خون بہتا ہے اور اتنا ظلم وستم ہوتا ہے کہ نہ پوچھیے! دیگر مسائل میں بھی اسی طرح ہیں۔

https://downloadshiabooks.com/

https://downloadshiabooks.com/

ستر ہواں خطبہ

وَمِنْ كَلَامٍ لَهُ عَلَيْهِ السَّلَامُ [1]

فِيْ صِفَةِ مَنْ يَتَصَدّٰى لِلْحُكْمِ بَيْنَ الْاُمَّةِ وَلَيْسَ لِذٰلِكَ بِاَهْلٍ وَفِيْهَا: اَبْغَضُ الْخَلَائِقِ اِلَى اللهِ صِنْفَانِ

ان نا اہلوں کے بارے میں جو صلاحیت کے بغیر فیصلے شروع کر دیتے ہیں اور اسی ذیل میں دو بدترین مخلوقات کا ذکر بھی ہے۔

پہلا حصہ

"اِنَّ اَبْغَضَ الْخَلَائِقِ اِلَى اللهِ رَجُلَانِ: رَجُلٌ وَكَلَهُ اللهُ اِلٰى نَفْسِهٖ: فَهُوَ جَائِرٌ عَنْ قَصْدِ السَّبِيْلِ، مَشْغُوْفٌ بِكَلَامِ بِدْعَةٍ، وَدُعَاءِ ضَلَالَةٍ، فَهُوَ فِتْنَةٌ لِمَنِ افْتَتَنَ بِهٖ، ضَالٌّ عَنْ هَدْيِ مَنْ كَانَ قَبْلَهُ، مُضِلٌّ لِمَنِ اقْتَدٰى بِهٖ فِيْ حَيَاتِهٖ وَبَعْدَ وَفَاتِهٖ، حَمَّالٌ خَطَايَا غَيْرِهٖ، رَهْنٌ بِخَطِيْئَتِهٖ"

"پروردگار کی نگاہ میں بدترین خلائق دو طرح کے افراد ہیں، وہ شخص جسے پروردگار نے اس کے اپنے حال پر چھوڑ دیا ہے اور وہ درمیانی راستے سے ہٹ گیا ہے اور صرف بدعت کا دلدادہ ہے اور گمراہی کی دعوت پر فریفتہ ہے، یہ دوسرے افراد کے لیے ایک مستقل فتنہ ہے اور سابق افراد کی ہدایت سے بہکا ہوا ہے۔ اپنے پیروکاروں کو گمراہ کرنے والا ہے زندگی میں بھی

[1] کتاب، مصادر نہج البلاغہ میں یہ خطبہ سیّد رضیؒ سے پہلے بزرگ علمائے کرام کی طرف سے نقل کیا گیا ہے، من جملہ ان میں سے (۱) علامہ کلینیؒ نے کتاب کافی میں دو طریقوں سے نقل کیا ہے۔ (۲) ابن قتیبہ نے کتاب غریب الحدیث میں۔ (۳) ابو طالب مکی نے کتاب، قوت القلوب میں، (۴) ہروی نے کتاب، الجمع بین المغر بین میں۔ (۵) قاضی نعمان نے کتاب، اصول المذہب میں، اس کے علاوہ سیّد رضیؒ کے بعد کے علمائے کرام نے بھی نقل کیا ہے، جیسے شیخ طوسی نے امالی میں، طبرسی، نے کتاب احتجاج میں اور شیخ مفیدؒ نے کتاب ارشاد میں نقل کیا ہے۔

https://downloadshiabooks.com/

اور مرنے کے بعد بھی۔ یہ دوسروں کی بھی غلطیوں کا بوجھ اٹھانے والا ہے اور ان کی خطاؤں میں بھی شریک ہے۔''

خطبہ، ایک نگاہ میں

یہ خطبہ جیسا کہ عنوان میں آیا ہے کہ یہ اُن لوگوں کے اوصاف بیان کرتا ہے جو بغیر کسی لیاقت واہلیت کے مقام ومنصبِ قضا پر بیٹھ جاتے ہیں اور لوگوں کو گمراہ کرتے ہیں۔ حضرت امام علیؑ نے اِنہیں دو گروہوں میں تقسیم کیا ہے:

پہلا گروہ وہ لوگ ہیں: جو کھلم کھلا راہِ ضلالت پر چلتے ہیں اور اپنی ہوا و ہوس کے آگے سرِ تسلیم خم کردیتے ہیں اور دین میں بدعت پھیلاتے ہیں اور اپنی اور خلقِ خدا کی گمراہی کا باعث بنتے ہیں۔

دوسرا گروہ عالم نُما جاہل حضرات کا ہے: جو خود سر ہیں اور آگاہی سے دور ہیں اور جہلِ مرکب میں گرفتار ہیں، کسی بھی طرح کی آمادگی کے بغیر لوگوں کے درمیان رواداری اور قضاوت کرنے کے لیے مسندِ قضاوت پر بیٹھ جاتے ہیں اور شبہات کے سمندر میں ڈوبے رہتے ہیں اور متواتر غلطی پر غلطی کرتے چلے جاتے ہیں، حق کو باطل کے ساتھ ملا دیتے ہیں اور بے گناہوں کا خون بہاتے ہیں اور لوگوں کا مال دوسروں کو ناحق دے دیا کرتے ہیں، یہ احتمال بھی پایا جاتا ہے کہ پہلے گروہ سے مُراد بدعتیں رائج کرنے والے حاکم ہوں جو ظلم و جور کی روش پر چلتے رہتے ہیں اور دوسرے گروہ سے مراد جاہل اور بے خبر قاضی ہوں۔ اس بنا پر لفظ حکم جو اس خطبے میں استعمال ہوا ہے، وہ عام مفہوم کے معنی میں استعمال ہوا ہو جو کہ حکومت اور قضاوت دونوں معنوں میں آتا ہے۔ خطبے کے آخر میں حضرت امام علی علیہ السلام ایسے افراد کی خدا سے شکایت کر رہے ہیں، جنھوں نے قرآن سے منہ پھیر کر اُسے پشت دکھا دی اور معروف اُن کی نظر میں مُنکر ہے اور مُنکر اُن کی نگاہ میں معروف ہے۔ اس بناء پر اس خطبے کو تین حصوں میں خلاصہ کیا جاسکتا ہے:۔ پہلا اور دوسرا حصّہ ان دو گروہوں کی شناخت بتانے میں اور تیسرا حصّہ خدا کے حضور اِن لوگوں کی شکایت پر مشتمل ہے۔

شرح وتفسیر

تمام مخلوقات میں ناپسندیدہ ترین افراد کون لوگ ہیں؟

حضرت امام علی علیہ السلام نے اپنے کلام کے اس حصّے میں سب سے پہلے تو تمام مخلوقات میں سے ناپسندیدہ ترین حضرات کو دو گروہوں میں تقسیم کیا، فرماتے ہیں:

https://downloadshiabooks.com/

"اِنَّ اَبْغَضَ الْخَلَائِقِ اِلَى اللّٰهِ رَجُلَانِ"

''دو افراد بارگاہِ الٰہی میں تمام مخلوقات میں سے سب سے بڑھ کر ناپسندیدہ ہیں۔''

یہ بات تو واضح ہے کہ حُب اور بُغض جس طرح سے انسانوں میں پایا جاتا ہے، خدا کے پاس اس طرح نہیں ہے، کیوں کہ انسانی حُب اور بُغض اُن حالات کی رنگینیوں اور تبدیلیوں کی وجہ سے ہوتا ہے جو انسان کی روح اور جان میں ہوتی ہیں اور پسند و ناپسند کے معاملات سے تعلق رکھتے ہیں مگر خداوندِ عالم کا حُب یعنی رحمت کے دائرے میں شامل رکھنا، اور بُغض سے مُراد اپنی رحمت سے دور رکھنا ہے۔ اس کے بعد آپؑ نے پہلے گروہ یعنی حاکموں اور نفس کی پیروی کرنے والے عالموں کی طرف اشارہ کیا ہے اور ہر چیز سے پہلے اُن کی بدبختیوں کی اصلی وجہ کی جانب اشارہ کیا ہے، فرماتے ہیں:

"رَجُلٌ وَكَلَهُ اللّٰهُ اِلٰى نَفْسِهِ"

''یہ ایسا شخص ہے جس کے پروردگار نے اُس کو، اُس کے اپنے حال پر چھوڑ دیا ہو۔''

تمام ممکنات من جملہ تمام انسان اس طرح ذاتِ خدا سے وابستہ اور جڑے ہوئے ہیں کہ اگر ایک لمحے کو بھی ان کا رابطہ اُس سے منقطع ہو جائے تو سب کے سب نیست و نابود ہو جائیں۔ اس نسبت اور وابستگی کی طرف توجہ کرنے سے انسان میں اللہ پر توکل کی روح زندہ ہو جاتی ہے کہ وہ اپنی ہر چیز کو اُس پر چھوڑ دے یعنی جہاں تک ہو سکتا ہے اور جہاں تک قُدرت رکھتا ہے، اپنے کاموں کے انجام دینے میں سعی و کوشش کرے، لیکن اُس کے ساتھ ہی یہ بات اپنے ذہن و دل و دماغ میں راسخ کر لے کہ ہر خیر و برکت اور ہر نعمت کا سرچشمہ اُس کی پاک ذات ہے، لیکن جب انسان غرور اور من مانی اور نفسانی ہوا و ہوس کی پیروی کرتے ہوئے اس بڑی حقیقت سے غافل ہو جائے اور اپنے آپ کو ہی سب کچھ سمجھے تو وہ خدا کی ذات سے دُور ہو جاتا ہے اور ہر کام میں وہ اُس سے دُور ہو کر رہ جاتا ہے۔ یہ خدا سے دُور ہو جانا ہی درحقیقت اُس کے اپنے حال پر چھوڑ دیئے جانے کے فقرے کی وضاحت کرتا ہے اور یہی دراصل تمام بدبختیوں اور انحرافات کا سرچشمہ ہے۔

اسی لیے رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم جن کی ذاتِ گرامی عالمِ تخلیق کے گلدانِ زینت کے پھول ہیں، آپؐ نے بارہا فرمایا ہے:

"اَللّٰهُمَّ... لَا تَكِلْنِيْ اِلٰى نَفْسِيْ طَرْفَةَ عَيْنٍ اَبَدًا" [1]

''اے اللہ! مجھے ایک چشمِ زدن کے لیے بھی میرے حال پہ مت چھوڑنا۔'' (اور اپنی پاک ذات سے دُور نہ فرما)

یہ وہی بات ہے جس کے بارے میں امیر المومنینؑ اپنے پُرمعنی کلام میں اشارہ فرماتے ہیں:

---

[1] بحار الانوار، جلد ۸۳، ص ۱۵۳

https://downloadshiabooks.com/

"اِلٰهِی کَفٰی بِیْ عِزًّا اَنْ اَکُوْنَ لَکَ عَبْدًا وَ کَفٰی بِیْ فَخْرًا اَنْ تَکُوْنَ لِیْ رَبًّا"[۱]

''اے میرے خدایا، میرے عزت کے لیے یہی کافی ہے کہ میں تیرا بندہ ہوں اور میرے فخر کے لیے یہی کافی ہے کہ تُو میرا پروردگار رہے۔''

جیسا کہ معصومینؑ کی دعاؤں میں آیا ہے:

"اِنَّکَ اِنْ وَکَلْتَنِیْ اِلٰی نَفْسِیْ تُقَرِّبُنِیْ مِنَ الشَّرِّ وَ تُبَاعِدُنِیْ مِنَ الْخَیْرِ"

''اگر تُو نے مجھے میرے حال پر چھوڑ دیا، تو میرا نفس مجھے شر سے نزدیک کردے گا اور خیر سے دور کردے گا۔''[۲]

اس کے بعد حضرت امام علیؑ نے ایسے افراد کی بدبختیوں کی اصل جڑ اور ان کے بُرے انجام کا ذکر کرتے ہوئے آٹھ بُرے نتائج گنوائے ہیں جو کہ سب کے سب ایک دوسرے کے علّت ومعلول ہیں، پہلے فرماتے ہیں:

"فَهُوَ جَائِرٌ عَنْ قَصْدِ السَّبِیْلِ"

''ایسا شخص راہِ راست سے منحرف ہو جاتا ہے۔''

"قَصْدِ السَّبِیْلِ" سے مُراد درمیانہ، متوسط اور ہر طرح کی افراط وتفریط سے خالی راستہ ہے؛ یہ وہ راستہ ہے جو انسان کو خدا کی طرف لے جاتا ہے، جیسا کہ قرآن مجید میں آیا ہے:

"وَعَلَی اللّٰهِ قَصْدُ السَّبِیْلِ"[۳]

''اور خدا اپنے بندوں کو راہِ راست دکھاتا ہے۔'' (یا یہ کہ سیدھا راستہ ہی خدا پر منتہی ہوتا ہے)

یہ بات تو واضح ہے کہ انسان بال سے زیادہ باریک اور تلوار کی دھار سے زیادہ تیز راہِ راست کو ہزاروں غلط راستوں کے بیچ میں سے چُن لے، یہ عنایاتِ الٰہیہ کے بغیر کسی طور ممکن نہیں، مگر وہ شخص جو خدا سے دور ہو چکا ہو اور اُسے اس کے اپنے حال پر چھوڑا جا چکا ہو وہ حیرت زدہ ہو کر رہ جاتا ہے اور گمراہ ہو جاتا ہے، خاص طور پر اس لیے کہ گمراہی کے راستے زیادہ تر نفسانی ہوا وہوس اور ظاہری زرق برق اور نقلی چکاچوند کی بنا پر ہوتے ہیں، اسے اپنی حالت پر چھوڑ دیئے جانے کا نتیجہ سیدھے راستے سے انحراف ہے۔ پھر فرماتے ہیں:

"مَشْغُوْفٌ بِکَلَامِ بِدْعَةٍ"

---

[۱] بحارالانوار، جلد ۹۱، ص ۹۴

[۲] بحارالانوار، جلد ۸۳، ص ۱۵۲

[۳] سورۂ نحل، آیت ۹

https://downloadshiabooks.com/

''ایسا شخص اپنی بدعت آمیز باتوں ہی پر قلبی یقین رکھتا ہے۔''

یہ شخص وہاں سے پھر تیسرے مرحلے کی طرف بڑھتا ہے:

"وَدُعَاءِ ضَلَالَةٍ"

''گمراہی کی طرف بلاتا ہے اور اُس کام سے خوش ہوتا ہے۔''

"شغف" کا لفظ "شغاف" کے مادّے سے ہے اور کلاف کے وزن پر ہے، اس کا مطلب ہے دل کے اوپر کی گرہ یا اُس کے اوپر کی کھال جس نے کسی غلاف کی مانند اُسے اپنے اندر سمیٹا ہُوا ہو۔ قرآن مجید میں حضرتِ یوسفؑ سے زُلیخا کی بے قراری اور محبت کی شدت کو مصر کی عورتوں کی زبانی جب بیان کیا گیا ہے "قَدْ شَغَفَهَا حُبًّا" تو شغف کے نام سے تعبیر کیا ہے، اور اس جملے میں بھی یہی مقصد پوشیدہ ہے کہ ایسے خودخواہ اور خودسر حضرات اپنے بدعت آمیز عقیدوں سے نہایت گہری محبت رکھتے ہیں اور یہی محبت اس کا باعث بنتی ہے کہ وہ دوسروں کو گمراہی کی طرف بُلاتے ہیں۔ قرآن مجید میں بھی ارشادِ باری ہے:

"وَمَا دَعَاءُ الْكَافِرِينَ إِلَّا فِي ضَلَالٍ" [1]

''اور کافر سوائے ضلالت و گمراہی کے اور کوئی دعوت نہ دیں گے۔''

بدعت کی حقیقت کے بارے میں ایک اہم گفتگو آگے آئے گی۔ چوتھی صفت: جو کہ درحقیقت پچھلے اوصاف کے نتیجے میں ظاہر ہوتی ہے، اُس کو یوں بیان فرماتے ہیں:

"فَهُوَ فِتْنَةٌ لِمَنِ افْتَتَنَ بِهِ"

ایسا شخص اُن لوگوں کے انحراف کا بھی باعث بنتا ہے جو اس کے دھوکے میں آ گئے ہیں۔''

وہ ہی لوگ جو اندھے بھروسے کی وجہ سے اُس کے ساتھ قلبی تعلق بنا لیتے ہیں اور اُسے اپنا پیشوا ٹھہرا کر اُس پر اعتماد کرنے لگتے ہیں، یہ تو ظاہری بات ہے کہ جو شخص بدعتوں کے ساتھ دل لگی کرے اور گمراہیوں کی طرف بُلانے والا ہو، وہ بہت سے گروہوں کی گمراہی کا باعث بنتا ہے۔

ایسے لوگوں کی پانچویں اور چھٹی صفت کے بیان میں یوں فرماتے ہیں:

"ضَالٌّ عَنْ هَدْيِ مَنْ كَانَ قَبْلَهُ وَمُضِلٌّ لِمَنِ اقْتَدَىٰ بِهِ فِي حَيَاتِهِ وَبَعْدَ وَفَاتِهِ"

''وہ خود بھی اپنے سے پہلے ہادیوں کے راستے سے دور ہو جاتا ہے اور اُن لوگوں کی گمراہی کا بھی باعث بنتا ہے جو

---

[1] سورۂ رعد، آیت ۱۴

https://downloadshiabooks.com/

اُس کی زندگی میں یا اُس کے مرنے کے بعد اُس کی پیروی کرتے ہیں۔''

"مَنۡ كَانَ قَبۡلَهُ" سے مراد پچھلے انبیا و اوصیا علیہم السلام ہیں، جو برحق ہیں۔ یہ اس بات کی طرف اشارہ کیا جا رہا ہے کہ ہدایت کا راستہ پہلے سے دکھایا جا چکا ہے اور اب کسی بھی گمراہی کے لیے کوئی عذر باقی نہیں ہے۔ یہ ہدایت کے پُرنور راستے کو چھوڑ کر گمراہی اور ضلالت کی اندھیر نگری میں خواہ مخواہ بھٹک رہا ہے، سب سے زیادہ افسوسناک بات تو یہی ہے کہ ایسے لوگ صرف اپنے زندگی میں گمراہی کا باعث نہیں بنتے، بلکہ اپنی وفات کے بعد بھی کئی صدیوں اور ہزاروں سال تک گمراہ کرنے والوں کی گمراہی میں شریک اور حصہ دار ہیں، کیوں کہ ایک معروف اور مستند حدیث نبوی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے مطابق:

"مَنۡ سَنَّ سُنَّةً حَسَنَةً عُمِلَ بِهَا مِنۡ بَعۡدِهِ كَانَ لَهُ اَجۡرُهُ وَمِثۡلُ اُجُوۡرِهِمۡ مِنۡ غَيۡرِ اَنۡ يَنۡقُصَ مِنۡ اُجُوۡرِهِمۡ شَيۡئاً، وَمَنۡ سَنَّ سُنَّةً سَيِّئَةً فَعُمِلَ بِهَا بَعۡدَهُ كَانَ عَلَيۡهِ وِزۡرُهُ وَمِثۡلُ اَوۡزَارِهِمۡ مِنۡ غَيۡرِ اَنۡ يَنۡقُصَ مِنۡ اَوۡزَارِهِمۡ شَيۡئاً"[1]

''اگر کوئی شخص کسی سنّتِ حسنہ کا رواج ڈال دے اور اُس کے بعد اُس پر عمل کیا جائے تو اُسے اُس کا اپنا اجر بھی ملے گا اور اُن لوگوں کا اجر بھی جو اس پر عمل کریں گے بغیر اس کے کہ ان لوگوں کے اجر میں کوئی کمی کی جائے، اور جو شخص کسی بری سنّت کا رواج ڈال دے اور اُس کے بعد اُس پر عمل کیا جائے تو اُسے اُس کا اپنا گناہ بھی ملے گا، اور اُن تمام لوگوں کے حصے کا گناہ بھی ملے گا جنھوں نے اُس پر عمل کیا ہوگا، بغیر اُس کے کہ اُن لوگوں کے گناہوں میں سے کوئی کمی کی جائے۔''

یہ تعبیر درحقیقت ایسے لوگوں کے لیے ایک اہم تنبیہ ہے، جو بدعتیں ایجاد کر دیتے ہیں اور بڑی بڑی گمراہیوں کی بنیاد رکھ دیتے ہیں، تو ایسے لوگوں کی بدبختیاں صرف ان کے دورانِ زندگی تک ہی منحصر نہیں رہتیں، بلکہ بعض اوقات ہزاروں سال بعد تک اُنھیں اپنے اس عمل کا کفّارہ ادا کرنا پڑتا ہے۔

مولا علیؑ نے خطبہ ۱۶۴ میں بھی ایک زبردست تعبیر پیش کی ہے، فرماتے ہیں:

"وَاِنَّ شَرَّ النَّاسِ عِنۡدَ اللّٰهِ اِمَامٌ جَائِرٌ ضَلَّ وَ ضُلَّ بِهِ فَاَمَاتَ سُنَّةً مَاۡخُوذَةً وَ اَحۡيٰى بِدۡعَةً مَتۡرُوۡكَةً"

''خدا کے نزدیک لوگوں میں سے بدترین شخص ایسا پیشوا ہے جو ستمگر بھی ہے اور گمراہ بھی، اور اُس کے ذریعے لوگ بھی گمراہ ہو رہے ہیں، اور بالآخر اس کی وجہ سے پچھلی نیک سنّتیں ختم ہو جائیں گی اور بھولی ہوئی اور متروک بدعتیں زندہ ہو جائیں گی۔''

[1] میزان الحکمۃ، جلد ۴، صفحہ ۵۲۶ پر اس حدیثِ مبارکہ کا مضمون متعدد روایات اور بہت سی کتب میں تکرار ہوا ہے۔

https://downloadshiabooks.com/

ساتویں اور آٹھویں صفتوں کے بیان میں، جو کہ پچھلی صفات کا نتیجہ ہیں، مولا علی علیہ السلام فرماتے ہیں:

"حَمَّالٌ خَطَايَا غَيْرِهِ، رَهْنٌ بِخَطِيئَتِهِ"

''وہ اُن لوگوں کے گناہوں کا بار بھی اُٹھاتا ہے، جنھیں اِس نے گمراہ کیا ہے اور مستقل اپنے گناہوں کے گھیرے میں رہتا ہے۔''

یہ بات یوں ہی نہیں کی گئی، بلکہ فکر و منطق کی میزان میں تلی ہوئی ہے، کیونکہ گناہ کی ہر طرح کی معاونت، اُس گناہ میں شریک ہونے کے برابر ہے، اور جیسا کہ ان گمراہ کرنے والے پیشواؤں کے ماننے والے، اپنے بھرپور ارادے کے ساتھ اس راہ پر گامزن ہوئے ہوتے ہیں لہٰذا اُن کے گناہوں سے کچھ بھی کم نہیں کیا جائے گا۔ قرآن مجید نے اسی معنی کو صراحت کے ساتھ سورۂ نحل میں بیان کیا ہے:

لِيَحْمِلُوا أَوْزَارَهُمْ كَامِلَةً يَوْمَ الْقِيَامَةِ وَمِنْ أَوْزَارِ الَّذِينَ يُضِلُّونَهُمْ بِغَيْرِ عِلْمٍ أَلَا سَاءَ مَا يَزِرُونَ [1]

''انھیں روزِ قیامت اپنے گناہوں کا بار پوری طرح سے اُٹھانا ہوگا اور کچھ تو اُن لوگوں کے گناہوں کے بار میں سے اُٹھانا ہوگا جنھیں اپنی جہالت کے باوجود گمراہ کیا کرتے ہیں؛ آگاہ رہو! یہ لوگ کیسا برا بوجھ اپنے اوپر لادے جا رہے ہیں۔''

قرآن مجید میں رہن کی جو تعبیر اپنے گناہوں کے بارے میں پیش کی گئی ہے، وہ نہایت معنی خیز ہے:

كُلُّ نَفْسٍ بِمَا كَسَبَتْ رَهِينَةٌ [2]

''ہر شخص اپنے اعمال کے گروی ہے۔''

جس طرح سے مال کو گروی رکھوانے والے جب تک اپنا حساب پورا نہ کر دیں تب تک وہ آزاد نہیں ہو سکتے، اسی طرح سے انسان جب تک اپنے گناہوں کا کفّارہ ادا نہ کرے، آزاد نہیں ہو سکتا اور ''حمال'' کی تعبیر جو کہ دوسروں کے گناہوں کے بوجھ کو اُٹھانے والوں کے لیے کی گئی ہے وہ بھی نہایت حسین تعبیر ہے، گویا گناہ (جیسا کہ وِزر کے لفظ سے استفادہ کیا جا سکتا ہے) ایک ایسا بڑا بوجھ ہے، جو اُن لوگوں کے کاندھوں پر پڑا رہتا ہے جو اُس کے باعث بنے اور وہ بوجھ اُن کی کمر توڑ دیتا ہے اور مقصد تک پہنچنے سے اور آسمان قریب کی بلندیوں کی طرف پرواز کرنے سے روک دیتا ہے اور آتشِ جہنم کی کھائی میں گرا کر ہی چھوڑتا ہے۔ اس سے یہ واضح ہو جاتا ہے کہ جسے خدا اُس کے اپنے حال پر چھوڑ دے وہ کس حالت میں

---

[1] سورۂ نحل، آیت ۲۵

[2] سورۂ مدثر، آیت ۳۸

https://downloadshiabooks.com/

مبتلا ہو جاتا ہے اور وہ کس راہ پر گامزن ہو جاتا ہے اور بالآخر کیسے دردناک انجام میں گرفتار ہو جاتا ہے۔

چند نکات

بدعت کیا ہے اور اسے ایجاد کرنے والا کون ہے؟

پچھلی گفتگو میں ایسی بدعت آمیز گفتگو کی مذمت کی گئی ہے جو لوگوں کو گمراہی کی طرف لے جاتی ہے اور اسلامی روایات میں بھی بدعت اور بدعتی لوگوں کے خلاف، خاص طور پر نہج البلاغہ میں مزید چند دیگر خطبات میں بھی بدعتیں ایجاد کرنے والوں کے خلاف اقوال پائے جاتے ہیں، من جملہ ہم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ایک حدیثِ مبارکہ میں دیکھتے ہیں کہ آپؐ نے فرمایا:

"كُلُّ بِدْعَةٍ ضَلَالَةٌ وَ كُلُّ ضَلَالَةٍ فِي النَّارِ"[1]

''ہر بدعت گمراہی ہے اور ہر گمراہی کا انجام آتشِ جہنم ہے۔''

آپؐ کی ایک اور حدیث مبارکہ میں ارشاد ہوتا ہے:

اَبَى اللهُ لِصَاحِبِ الْبِدْعَةِ بِالتَّوْبَةِ قِيْلَ يَا رَسُوْلَ اللهِ وَ كَيْفَ ذٰلِكَ؟ قَالَ: اِنَّهُ قَدْ اُشْرِبَ قَلْبُهُ حُبَّهَا[2]

''خداوند عالم بدعتی شخص کی توبہ کو ہرگز قبول نہیں کرتا، عرض کیا گیا: یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ایسا کیسے ہو سکتا ہے؟ آپؐ نے فرمایا، کیوں کہ بدعت کی محبت اُس کے دل کی گہرائیوں میں رچ بس چکی ہے۔''

بدعت کے لغوی معنی ہیں کوئی ایسا کام انجام دینا جو پہلے کبھی نہ تھا، مگر فقہا اور علمائے اسلام کے مطابق دین میں کسی چیز کے بلا دلیل کم یا زیادہ کرنے کے معنی میں آتا ہے۔ اور جیسا کہ معلوم ہے تمام معارفِ اسلام اور احکامِ الٰہی کو یا تو وحی کے ذریعے یا پھر معتبر دلائل کی روشنی میں ثابت ہوتے ہیں، لہٰذا ہر بدعت ایک عظیم گناہ ہے اور عام طور پر تمام تر گمراہیاں، بدعتوں سے ہی شروع ہوتی ہیں اور اگر بدعت کی روک تھام نہ کی جائے، اور ہر شخص اپنے ذاتی سلیقے اور محدود سوچ اور فکر کے تحت خدا کے قانون میں کچھ اضافہ کر دے یا کچھ گھٹا دے، قلیل مدت میں حقیقی دینِ الٰہی ختم ہو جائے گا، بلاشک یہ تحریمِ بدعت کا قانون

---

[1] شرح نہج البلاغہ خوئی، جلد ۳، ص ۲۵۱

[2] اصول کافی، جلد ۱، ص ۵۴، باب البدع

https://downloadshiabooks.com/

ہی تھا جو آج تک قرآن اور اسلام کو بچاتا چلا آ رہا ہے، بہت سی بدعتیں کچھ وجوہات کی بناء پر بہت تیزی سے پھیل جاتی ہیں اور بعض اوقات یہ بدعتیں باقی رہ جاتی ہیں اور بہت سے گروہوں کو منحرف کرنے کا باعث بن جاتی ہیں اور اس بدعت کو ایجاد کرنے والے کے گناہ کے بوجھ کو دن بدن سنگین تر کرتی رہتی ہیں۔ اور اسی وجہ سے ہم حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام کی ایک حدیث میں یوں دیکھتے ہیں کہ آپؑ نے فرمایا:

''ایک شخص شیطانی وسوسوں کے تحت ایک بدعت ایجاد کر دیتا ہے اور لوگوں کو اس کی ترغیب دیتا ہے، کچھ لوگ اُس کے زیرِ اثر آ جاتے ہیں، بعد میں جب اُسے اپنی غلطی کا احساس ہوا کہ میں نے یہ کیا کر دیا تو اُس نے توبہ کرنے کا ارادہ کیا اور طرح طرح کی نیکیاں کرنے اور معافی مانگنے لگا، اُس زمانے کے پیغمبر علیہ السلام کو وحی آئی کہ اُس شخص سے کہہ دو کہ مجھے میری عزت وجلال کی قسم ہے! اگر تم مجھے اتنا پکارو کہ تمہارے جسم کا ایک ایک جوڑ الگ ہو جائے، تب بھی میں تمہاری دعا قبول نہ کروں گا، سوائے اس کے کہ تم ہر اُس شخص کو زندہ کر کے توبہ کروالو، جنھیں تم نے گمراہ کیا ہے اور پھر وہ سب اُس بدعت کو چھوڑ دیں، تب ہی میں تمہاری توبہ قبول کروں گا۔'' [1]

جو کچھ بیان کیا گیا اُس سے یہ واضح ہو جاتا ہے کہ بدعت نہ تو کسی قسم کے سائنسی انکشافات اور نئی پیشکش کو کہا جاتا ہے اور نہ ہی ڈاکٹری یا میڈیکل کے علوم وفنون کی تبدیلیوں کو کہا جاتا ہے اور نہ یہ اِس سے مراد ادبیات اور زندگی کے آداب و رسم ورواج ہیں اور نہ ہی فقہا کے فقہی مسائل میں پیش آنے والی ایسی تبدیلیاں مراد ہیں جو کہ کتاب وسنّت کلّی قواعد کے نتیجے میں پیش آتی ہیں، بدعت تو یہ ہے کہ کسی حلال کو حرام یا کسی حرام کو حلال کر دیا جائے یا خدائی قوانین اور اُصولوں میں سے کچھ گھٹا دیا جائے یا اُن میں کچھ بڑھا دیا جائے، کسی معتبر دلیل کے قائم کیے بغیر یا کوئی جدید آئین بنا کر اور لوگوں کو ایک دین کے عنوان سے اُس کی جانب دعوت دی جائے، یہ عظیم ترین گناہانِ کبیرہ میں سے ہے۔

وہابیت کی تاریخ میں ہے کہ اُن میں سے ایک گروہ سائیکل کے خلاف تھا اور اُسے شیطان کی سواری کہا کرتا تھا، اور اس کے علاوہ جس وقت سعودی اعلیٰ افسران نے فوجی مراکز سے رابطہ رکھنے کے لیے ٹیلیفون کے تار بچھائے، تو اُن لوگوں نے حملہ کر کے اُن تاروں کو بھی کاٹ دیا اور اسے بدعت کا نام دیا، یہ ایک نہایت جاہلانہ اور بچکانہ کام ہے، جس کا فقہ اسلامی میں دیئے گئے لفظ بدعت کے مفہوم سے کوئی واسطہ نہیں ہے اور افسوس کے ساتھ یہ کہنا پڑ رہا ہے کہ اُن کی پوری تاریخ اس طرح کی باتوں سے بھری ہوئی ہے، اس گروہ کے بالمقابل ایک ایسا گروہ ہے، جن سے افراط کی بُو آتی ہے، وہ کہتے ہیں کہ دین کی کوئی جڑ یا اَساس نہیں ہے جبکہ یہ بات سب سے زیادہ خطرناک اور باطل ہے، جو تمام تر الٰہی قوانین اور شریعتوں کو برباد کر دیتی ہے

[1] بحار الانوار، جلد ۶۹، ص ۲۱۹

https://downloadshiabooks.com/

اور یوں ہر طرح کی تحریف اور تغیر کا راستہ ہر ایرے غیرے نا اہل کے لیے کھل جاتا ہے جو دین کی اصل کو مکمل طور پر ختم کر دیتا ہے۔

اس بات کو امیر المومنینؑ کے کلماتِ قصار، کلمہ ۱۲۳ میں بیان کیے گئے جملے پر ختم کرتے ہیں، امامؑ فرماتے ہیں:

"طُوبَى لِمَنْ ذَلَّ فِي نَفْسِهِ...وَ عَزَلَ عَنِ النَّاسِ شَرَّهُ وَ وَسِعَتْهُ السُّنَّةُ وَ لَمْ يُنْسَبْ إِلَى الْبِدْعَةِ"

''زہے نصیب اُس کے جو اپنی نظر میں چھوٹا ہے (اور کسی قسم کا تکبّر اور برتری نہیں رکھتا) لوگوں کو اُس کے ہاتھوں کوئی تکلیف نہیں پہنچتی، سنّتِ رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اُس کے لیے کافی ہے اور ہرگز اُس سے کسی بدعت کی نسبت نہیں جوڑی جاتی۔''

اس عبارت میں سنّت اور بدعت، ایک دوسرے کے بالمقابل ہیں، جو لوگ حکمِ خدا اور اُس کے رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی سنّت پر چلنے والے ہیں، وہ ہرگز بدعت کی طرف نہیں جاتے۔ لیکن بدعت پر چلنے والے لوگ سنّتِ رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے پیٹھ پھیر کے ایک بڑی اور خطرناک گمراہی میں مبتلا ہو جاتے ہیں۔

خطرناک ترین گناہ، دوسروں کے گناہوں کا بوجھ اپنے کاندھوں پر لادنا

بہت سے گناہانِ کبیرہ جو بظاہر ایک انفرادی گناہ کی حیثیت رکھتے ہیں، جیسا کہ وہ اعمال انجام دینا جو عفّت کے منافی ہیں یا شراب پینا اور دیگر ایسے محرمات خطرناک گناہ ہیں، درحقیقت ایسے گناہانِ کبیرہ ہیں جو ایک گروہ کو یا ایک بڑی تعداد کو گناہ کی طرف کھینچ لیتے ہیں اور اس بنیاد کو رکھنے والا شخص اُن تمام لوگوں کے گناہوں کے بار کو بھی اپنے دوش پر اُٹھا لیتا ہے بغیر اس کے کہ اُن لوگوں کے گناہوں میں سے کچھ کم ہو، ظلم و فساد کے بانی، بدعتیں ایجاد کرنے اور ان کا رواج ڈالنے والے اور امر بالمعروف اور نہی عن المنکر روکنے والے اور باطل کے دعویداروں کو اس صف میں شمار کیا جا سکتا ہے، بعض اوقات اس شخص کے گناہ کا دورانیہ اُس کی موت کے بعد تک کئی برسوں اور کئی نسلوں تک جاری رہتا ہے اور گناہگار شخص کو ان سب کا جرمانہ ادا کرنا ہوگا (بالکل اُسی طرح جیسے کہ بعض اوقات نیک کام کا ثواب اور اُس کی برکتیں کئی برسوں اور صدیوں تک جاری و ساری رہتی ہیں) قرآنِ کریم میں ایسے لوگوں کے بارے میں ارشاد ہوتا ہے:

وَلَيَحْمِلُنَّ أَثْقَالَهُمْ وَأَثْقَالًا مَّعَ أَثْقَالِهِمْ وَلَيُسْأَلُنَّ يَوْمَ الْقِيَامَةِ عَمَّا كَانُوا يَفْتَرُونَ [1]

''وہ لوگ اپنے گناہوں کے بارِ گراں کو اپنے دوش پر اُٹھائیں گے اور اسی طرح سے دوسرے لوگوں کے گناہوں کے بار بھی اُٹھائیں گے اور بروزِ قیامت اُن سے اُن تہمتوں کے بارے میں بھی پوچھا جائے گا جو وہ لگایا کرتے تھے۔''

[1] سورۂ عنکبوت، آیت ۱۳

https://downloadshiabooks.com/

ایسے گناہوں کا سب سے بڑا خطرہ اور نقصان یہی ہے کہ یہ قابلِ توبہ نہیں ہوتے کیونکہ توبہ کی شرط یہ ہے کہ گناہ کے آثار مٹ جائیں، تو انسان ایسے گناہوں کے آثار کیسے مٹا سکتا ہے جو بعض اوقات ایک وسیع و عریض علاقے کو اپنے گھیرے میں لیے ہوتے ہیں، یا بہت سے ایسے لوگ جو اس گناہ میں آلودہ ہو کر اس دُنیا سے جا چکے ہیں، یا پھر اس گناہ کی بنیاد رکھنے والے کے اس دنیا سے چلے جانے کے بعد کچھ پیروکار ایجاد ہو جائیں، لہٰذا بہت دھیان سے قدم اُٹھانا چاہیے اور کبھی ایسے گناہوں سے اپنے دامن کو آلودہ نہیں کرنا چاہیے جس کی کبھی بھی تلافی نہ ہو سکے اور ایسے شخص کے بارے میں بھی مولا علی علیہ السلام کی تعبیر حقیقت کا آئینہ ثابت ہوتی ہے کہ آپؑ نے فرمایا:

"حَمَّالُ خَطَایَا غَیْرِہٖ، رَھْنٌ بِخَطِیْئَتِہٖ"

''وہ ان لوگوں کے گناہوں کے بوجھ کو بھی اُٹھاتا ہے، جنھیں اس نے گمراہ کیا ہے اور اپنے گناہوں کے حصار میں بھی رہے گا۔''

دوسرا حصہ

وَرَجُلٌ قَمَشَ جَھْلًا مُوضِعٌ فِی جُھَّالِ الْاُمَّۃِ عَادٍ فِی اَغْبَاشِ الْفِتْنَۃِ عَمٍ بِمَا فِی عَقْدِ الْھُدْنَۃِ قَدْ سَمَّاہُ اَشْبَاہُ النَّاسِ عَالِماً وَلَیْسَ بِہٖ بَکَّرَ فَاسْتَکْثَرَ مِنْ جَمْعٍ مَا قَلَّ مِنْہُ خَیْرٌ مِمَّا کَثُرَ حَتّٰی اِذَا ارْتَوٰی مِنْ مَاءٍ آجِنٍ وَ اکْتَنَزَ مِنْ غَیْرِ طَائِلٍ جَلَسَ بَیْنَ النَّاسِ قَاضِیاً ضَامِناً لِتَخْلِیصِ مَا الْتَبَسَ عَلٰی غَیْرِہٖ فَاِنْ نَزَلَتْ بِہٖ اِحْدَی الْمُبْھَمَاتِ ھَیَّاَ لَھَا حَشْواً رَثّاً مِنْ رَاْیِہٖ ثُمَّ قَطَعَ بِہٖ فَھُوَ مِنْ لَبْسِ الشُّبُھَاتِ فِی مِثْلِ نَسْجِ الْعَنْکَبُوتِ لَا یَدْرِی اَصَابَ اَمْ اَخْطَاَ فَاِنْ اَصَابَ خَافَ اَنْ یَکُونَ قَدْ اَخْطَاَ وَاِنْ اَخْطَاَ رَجَا اَنْ یَکُونَ قَدْ اَصَابَ جَاھِلٌ خَبَّاطُ جَھَالَاتٍ عَاشٍ رَکَّابُ عَشَوَاتٍ لَمْ یَعَضَّ عَلَی الْعِلْمِ بِضِرْسٍ قَاطِعٍ یَذْرُو الرِّوَایَاتِ ذَرْوَ الرِّیحِ الْھَشِیمَ لَا مَلِیٌّ وَاللّٰہِ بِاِصْدَارِ مَا وَرَدَ عَلَیْہِ وَلَا اَھْلٌ لِمَا قُرِّظَ بِہٖ لَا یَحْسَبُ الْعِلْمَ فِی شَیْءٍ مِمَّا اَنْکَرَہُ وَلَا یَرٰی اَنَّ مِنْ وَرَاءِ مَا بَلَغَ مَذْھَباً لِغَیْرِہٖ وَاِنْ اَظْلَمَ عَلَیْہِ اَمْرٌ اکْتَتَمَ بِہٖ لِمَا یَعْلَمُ مِنْ جَھْلِ نَفْسِہٖ تَصْرُخُ مِنْ جَوْرِ قَضَائِہِ الدِّمَاءُ وَتَعَجُّ مِنْہُ الْمَوَارِیثُ.

دوسرا گروہ: عالم نما جاہلوں کے بارے میں امامؑ اس طرح فرماتے ہیں:

''وہ شخص جس نے جہالتوں کو سمیٹ لیا ہے اور انہیں کے سہارے جاہلوں کے درمیان دوڑ لگا رہا ہے، فتنوں کی تاریکیوں میں دوڑ رہا ہے اور امن و صلح کے فوائد سے یکسر غافل ہے۔ نامراد لوگوں نے اس کا نام عالم رکھ دیا ہے حالانکہ اس کا

https://downloadshiabooks.com/

علم سے کوئی تعلق نہیں ہے، صبح سویرے ان باتوں کی تلاش میں نکل پڑتا ہے جن کا قلیل ان کے کثیر سے بہتر ہے، یہاں تک کہ جب گندے پانی سے سیراب ہوجاتا ہے اور مہمل اور بے فائدہ باتوں کو جمع کر لیتا ہے تو لوگوں کے درمیان قاضی بن کر بیٹھ جاتا ہے اور اس امر کی ذمہ داری لے لیتا ہے کہ جو امور دوسرے لوگوں پر مشتبہ ہیں وہ انہیں صاف کردے گا۔ اس کے بعد جب کوئی مبہم مسئلہ آ جاتا ہے تو اس کے لیے بے سود اور فرسودہ دلائل کو اکٹھا کرتا ہے اور انہی سے فیصلہ کر دیتا ہے۔ یہ شبہات میں اسی طرح گرفتار ہے جس طرح مکڑی اپنے جالے میں پھنس جاتی ہے۔ اسے یہ بھی نہیں معلوم ہے کہ صحیح فیصلہ کیا ہے یا غلط۔ اگر صحیح کیا ہے تو بھی ڈرتا ہے کہ شاید غلط ہو اور اگر غلط کیا ہے تو بھی یہ امید رکھتا ہے کہ شاید صحیح ہو۔ ایسا جاہل ہے جو جہالتوں میں بھٹک رہا ہے اور ایسا اندھا ہے جو اندھیروں کی سواری پر سوار ہو۔ نہ علم میں کوئی حتمی بات سمجھا ہے اور نہ کسی حقیقت کو پرکھا ہے۔ روایات کو یوں اُڑا دیتا ہے جس طرح تیز ہوا تنکوں کو اُڑا دیتی ہے۔

خدا گواہ ہے کہ یہ ان فیصلوں کے صادر کرنے کے قابل نہیں ہے جو اس پر وارد ہوتے ہیں اور اس کام کا اہل نہیں ہے جو اس کے حوالے کیا گیا ہے۔ جس چیز کو ناقابل توجہ سمجھتا ہے اس میں علم کا احتمال بھی نہیں دیتا ہے اور اپنی پہنچ کے سوا کسی اور رائے کا تصور بھی نہیں کرتا۔ اگر کوئی مسئلہ واضح نہیں ہوتا ہے تو اسے چھپا دیتا ہے کہ اسے اپنی جہالت کا علم ہے، ناحق بہائے ہوئے خون، اس کے فیصلوں کے ظلم سے فریادی اور غلط تقسیم کی ہوئی میراث پکار رہی ہے۔''

شرح وتفسیر

عالم نُما جاہل

پہلے گروہ کا تفصیلی تعارف بیان فرمانے کے بعد مولا علی علیہ السلام دوسرے گروہ کے اوصاف بیان فرماتے ہیں، اور اُس شخص کے بارے میں بیان فرما رہے ہیں جو کہ جہل و نادانی کے سمندر میں غوطہ زن ہے مگر خود کو عقلمند اور سمجھدار جانتا ہے اور کسی بڑائی کے حصول کے بغیر بڑوں کے مقام پر تکیہ کرتا ہے۔ پہلے مرحلے میں ایسے شخص کی پانچ صفات بیان فرماتے ہیں۔

پہلی صفت:

''وَرَجُلٌ قَمَشَ جَهْلًا''

''وہ ایک ایسا شخص ہے جس نے جہالت و نادانی کا سارا انبار اپنے اندر جمع کر لیا ہے۔''

جیسا کہ اربابِ لغت نے ''قمش'' کے معنی یوں ذکر کیے ہیں بکھری ہوئی غیر متناسب کم قیمت اشیاء کو جمع کرنا اور

https://downloadshiabooks.com/

سمیٹنا، لہٰذا اس تعبیر کے مطابق مولا علی علیہ السلام کے کلام کا مفہوم کچھ یوں آشکار ہوتا ہے کہ یہ عالم نُما جہلاء ایسی مشتبہ معلومات کے پیچھے دوڑتے پھرتے ہیں کہ جن کا کوئی منطقی تناسب یا جوڑ بھی نظر نہیں آتا۔ مرحوم علامہ خوئی ؒ اس کلام کی شرح میں فرماتے ہیں: اِس سے مُراد یہ ہے کہ ایسا شخص جوزبانی طور پر اور غیر معتبر روایات اور قیاس کے ذریعے کچھ ایسی بے بنیاد باتیں جمع کر لیتا ہے کہ جن کا حجم تو بہت زیادہ ہوتا ہے مگر اُس کی کوئی قدر و قیمت نہیں ہوتی۔

دوسری صفت:

"مُوضِعٌ [۱] فِیْ جُهَّالِ الْاُمَّةِ"

''وہ نادان لوگوں کے درمیان بڑی تیزی سے اِدھر اُدھر بھاگتا پھرتا ہے۔'' (تاکہ اپنے جیسے ہم خیال ساتھی جمع کر سکے)

ظاہری بات ہے کہ ایسے افراد کے دوست احباب سوائے ان کے اپنے جیسے لوگوں کے اور کون ہو سکتے ہیں اور اُن سب کی اچھے لوگوں کے درمیان کوئی جگہ نہیں۔ ان کا مقصد جاہلوں کو اپنی طرف راغب کرنا اور ان کے درمیان نفوذ پانا ہے کیونکہ وہ اچھوں کی محفلوں میں شریک ہونے سے مایوس ہو چکے ہیں۔

تیسری صفت:

"عَادٍ [۲] فِیْ اَغْبَاشِ الْفِتْنَةِ"

''وہ فتنوں کے اندھیروں میں آگے بڑھتا چلا جا رہا ہے۔''

"غبش" کا لفظ ''اغباش'' کا مفرد ہے اور اربابِ لغت [۳] کی وضاحت کے مطابق اندھیرے کی شدت یا رات کے آخری پہر کے اندھیرے سے مراد ہے جو کہ چوروں کے لیے بہترین موقع ہوتا ہے، تو یہ پتا چلتا ہے کہ ایسے افراد ہمیشہ ہی اس چکر میں لگے ہوتے ہیں کہ فتنوں کے ماحول میں اپنے مفادات حاصل کریں، ہمیشہ روشنی سے دور بھاگتے ہیں اور تاریکیوں اور ظلمتوں کی پناہ لیتے ہیں جو کہ نادان لوگوں کو فریب دینے کے لیے بہترین جگہ ہوا کرتی ہے، کیونکہ اگر فتنے کی تاریکی تھم جائے اور علم و آگاہی کی روشنی پھیل جائے تو اُن کا واقعی چہرہ کُھل کر سامنے آ جاتا ہے اور وہ لوگ خاص و عام کی نظر میں رُسوا ہو جائیں گے۔

---

[۱] ''موضع'' کا لفظ ''ایضاء'' کے مادّے سے آیا ہے جس کے معنی حرکت میں تیزی کے ہیں اور باب افعال سے ہونے کی وجہ سے لازم کے معنی رکھتا ہے، متعدی کے نہیں اور یہاں پر عالم نما جاہلوں کے اپنے جیسے دوسرے جاہلوں کے درمیان تیزی سے گھومنے کے معنی میں استعمال ہوا ہے۔

[۲] ''عادٍ'' کا لفظ ''عدوٌ'' کے مادّے سے ہے اور ''صبر'' کے وزن پر ہے اور یہاں دوڑنے کے معنی میں ہے۔

[۳] مقائیس اللغۃ، جوہری، لسان العرب۔

https://downloadshiabooks.com/

چوتھی توصیف:

لوگوں کی بدبختی کے بارے میں فرماتے ہیں:

"عَمٍ بِمَا فِيْ عَقْدِ الْهُدْنَةِ"۔[1]

''وہ لوگوں کے درمیان صلح کے مفادات کو دیکھنے سے نابینا ہے۔''

یہ بات تو واضح ہے کہ "هُدْنَةِ" یعنی ''آرام، سکون''، سے مُراد یہاں پر مسلمانوں اور غیر مسلم لوگوں کے درمیان صلح مراد نہیں ہے، کیونکہ یہ ساری گفتگو ایسے شخص کے بارے میں ہو رہی ہے کہ جو لوگوں کے درمیان قاضی بنا ہوا ہے، اس بنا پر اس لفظ سے مراد لوگوں کے گروہوں میں صلح و مصالحت کرانا اور تنازعے حل کرانا ہے اور "هُدْنَةِ" کا لفظ یہاں پر "فِتْنَةِ" کے مقابل استعمال کیا گیا ہے۔ اصولاً ایسے افراد ہمیشہ اس بات کے خواہاں رہتے ہیں کہ اختلاف کی آگ بھڑکتی رہے تا کہ وہ اس طرح اپنی پلید نیتوں اور ناپاک عزائم تک پہنچ سکیں، جبکہ اگر وہ یہ جان لیتے کہ صلح و سکوں اور امن و سلامتی ہر ہر فرد کے لیے نفع بخش اور فائدہ مند ہے اور جھگڑے اور نزاع سے کسی کا بھی فائدہ نہیں ہوتا، تو کبھی ایسے معاملات کے سُراغ میں نہ جاتے۔ جی ہاں ایسے افراد ہرگز ایسے حقائق کا ادراک نہیں کر پاتے۔

پانچویں صفت:

"قَدْ سَمَّاهُ أَشْبَاهُ النَّاسِ عَالِماً وَلَيْسَ بِهِ"

''انسان نما لوگ اُسے عالم اور دانشور کہتے ہیں، جبکہ ایسا ہرگز نہیں ہے۔''

اصولاً جس قوت جاذبہ نے اس جہانِ عالم اور اس زمین و آسمان کے تمام ذرّات کو ایک دوسرے سے جوڑ کے رکھا ہے ہر موجود دوسرے موجود کی جانب رغبت رکھتا ہے اور یہی رغبت اس گروہ اور اس کے ماننے والوں کے درمیان بھی نظر آتی ہے۔ کیا حسین تعبیر ہے کہ ان عالم نما جاہلوں کے چاہنے والوں اور ان کی پیروی کرنے والوں کو "أَشْبَاهُ النَّاسِ" کے الفاظ سے یاد کیا گیا ہے۔ یہ اس بات کی جانب اشارہ ہے کہ ان عالم نما حضرات کی خدمت میں ہر وقت کچھ انسان نما حضرات موجود رہتے ہیں جن کے خود ساختہ اور جھوٹے چہرے ہوتے ہیں۔ یہ بات ایک امرِ بدیہی ہے کہ اُن کی انسانوں سے شباہت بالکل ایسی ہے کہ جیسے اُن کے پیشواؤں کی شباہت علماء اور دانشوروں سے ہے اور یہ شباہت محض ایک ظاہری شباہت ہے اور ایسی تعبیر صرف ایسے ہی مقامات پر استعمال ہوا کرتی ہے، جہاں صرف ظاہری شباہت مراد ہو، جیسے "يَا أَشْبَاهَ الرِّجَالِ وَلَا رِجَالَ"، جو کہ نہج البلاغہ کے خطبہ ۲۸ میں بیان ہوئی ہے۔

---

[1] ''هدنة'' سکون اور آرام کے معنیٰ میں ہے اور صلح کے معاملات میں بھی یہ لفظ استعمال ہوتا ہے۔

https://downloadshiabooks.com/

یہ پانچ صفات بیان کرنے کے بعد مولا علی علیہ السلام کچھ ایسے بُرے کاموں کا ذکر فرماتے ہیں جو کہ اس گروہ سے سرزد ہوتے ہیں جو کہ کھلم کھلا اُن کی اِن برائیوں کا لازمہ ہیں، فرماتے ہیں:

"بَكَّرَ [۱] فَاسْتَكْثَرَ مِنْ جَمْعٍ مَا قَلَّ مِنْهُ خَيْرٌ مِمَّا كَثُرَ" [۲]

''صبح جب اُٹھتا ہے تو سوائے اُن چیزوں کو جمع کرنے کے اس کا اور کوئی کام نہیں ہوتا، جن کی تھوڑی مقدار ان کے زیادہ مقدار سے بہتر ہے۔''

ممکن ہے کہ یہ تعبیر اس بات کی طرف اشارہ ہو کہ مادیات اور دنیاوی مال ومتاع جب حد سے زیادہ جمع ہو جائے تو انسان غفلت، تکبّر وغیرہ جیسی چیزوں کا شکار ہو جاتا ہے یا مادیات میں زیادہ مصروف ہو جاتا ہے جس کے نتیجے میں وہ معنویات سے دور رہ جاتا ہے اور ہمیشہ اُس کی کم مقدار اُس کے زیادہ ہونے سے بہتر ہوتی ہے اور کم کھانا پینا اور کم آرام کرنا اور سونا ہمیشہ سلامتی اور سعادت سے نزدیک تر کرتا ہے یا ہوسکتا ہے کہ فضول باتیں کرنے یا بیہودہ اور بے فائدہ کاموں اور مصروفیات میں پڑنا مراد ہو جس کے نتیجے میں آدمی اصل کاموں کو بھول جایا کرتا ہے۔

بعض نے اس کو باطل رائے اور فاسد عقائد کی جانب اشارہ کہا ہے مگر یہ احتمال بعید نظر آتا ہے، کیونکہ ایسی آراء اور عقائد کی معمولی مقدار بھی شدید مضر ہے، اگرچہ آگے آنے والے بعض جملوں کے ساتھ یہ احتمال سازگار ہے۔ پھر فرماتے ہیں:

"حَتّٰى إِذَا ارْتَوٰى مِنْ مَاءٍ آجِنٍ [۳] وَ اكْتَنَزَ مِنْ غَيْرِ طَائِلٍ [۴] جَلَسَ بَيْنَ النَّاسِ قَاضِيًا ضَامِنًا لِتَخْلِيصِ مَا الْتَبَسَ عَلٰى غَيْرِهِ"

''یہی حالت برقرار رہتی ہے، یہاں تک کہ وہ گندگیوں اور غلاظتوں کا پانی پی کر سیراب ہوتا ہے اور ڈھیر سارے بیہودہ مسائل کو اپنے دل ودماغ میں جمع کر لیتا ہے، پھر لوگوں کے درمیان قضاوت کی مسند پر بیٹھ جاتا ہے اور تعجب خیز بات تو یہ ہے کہ یہ نالائق اور بے نوا انسان اس بات کی ضمانت بھی دیتا ہے کہ ان حقائق کو روشن کرے گا جو دوسروں پر مشتبہ ہیں۔''

---

[۱] "بَكَّرَ" کا لفظ ''بکرہ'' کے مادّے سے آیا ہے اور ''لقمہ'' کے وزن پر ہے اور اصل میں دن کے آغاز کو کہا جاتا ہے اور پھر اس کے بعد ہر آغاز اور ابتلا کے لیے استعمال ہوا ہے اور اس مقام پر مقصد یہ ہے کہ علاّم نما جاہل حضرات کا صبح سے شام تک انہی بے بنیاد کاموں سے واسطہ ہوتا ہے۔

[۲] ممکن ہے کہ جملہ "مَا قَلَّ مِنْهُ خَيْرٌ مِمَّا كَثُرَ" دراصل لفظ ''جمع'' کے لیے بطور توصیف استعمال کیا گیا ہو، جس کا مفہوم یہ ہوگا، ایسے مجموعے کو جمع کرنا ہے جس کا کم، اُس کی زیادہ مقدار سے بہتر ہے، اور یہ احتمال بھی دیا جاتا ہے کہ وہ مضاف الیہ ہو اور اس صورت میں تقدیر کی ضرورت ہے، مثلاً "مِنْ جَمْعِ مَا قَلَّ مِنْهُ خَيْرٌ مِمَّا كَثُرَ" مگر اس طرح بھی معنی میں کچھ زیادہ فرق نہیں ہوگا۔

[۳] ''آجن'' کا مطلب گندہ اور غلیظ پانی ہے۔

[۴] ''طائل'' کا لفظ ''طذ ل'' کے مادّے سے آیا ہے اور ''قذل'' کے وزن پر ہے اور اس کا مطلب ہے فائدہ اور ''من عیر طائل'' کا مطلب ہے بے فائدہ اور بیہودہ ہونا۔

https://downloadshiabooks.com/

جی ہاں یہ نادان، گمراہ اور عالم نما جاہل شخص جس کا کل علمی سرمایہ سوائے مٹھی بھر اشتباہات، غلط فہمیاں اور بیہودہ مسائل ہیں اور اُس کے دل ودماغ اور روح میں حُبِ دنیا اور مادیات کی ظاہری چمک دمک کا گندا پانی ہے، وہ ایسی مسند پر ٹیک لگا کر بیٹھ گیا ہے جہاں سوائے انبیاءؑ ومعصومین علیہم السلام اور ان کے برحق جانشینوں کے کوئی اور نہیں بیٹھ سکتا۔ جس طرح سے مشہور و معروف حدیث میں آیا ہے کہ مولا علی علیہ السلام نے قاضی شریح کو مخاطب کر کے فرمایا:

"یَا شُرَیْحُ قَدْ جَلَسْتَ لَا یَجْلِسُهُ اِلَّا نَبِیٌّ اَوْ وَصِیُّ نَبِیٍّ اَوْ شَقِیٌّ"

''اے شریح! تم ایسی جگہ پر بیٹھ گئے ہو جہاں سوائے کسی نبی یا نبی کے وصی علیہما السلام یا کسی شقی کے علاوہ اور کوئی نہیں بیٹھتا۔''[1]

اس سے زیادہ بدتر یہ بات ہے کہ وہ کہتا ہے کہ میں اُن حقائق کو آشکار اور ظاہر کروں گا جو دوسروں سے پوشیدہ ہیں اور یہ تو عالم نما جاہلوں کا ہمیشہ ہی سے خاصہ رہا ہے کہ وہ بہت اونچی اُڑان بھرتے ہیں۔

نہج البلاغہ کے بعض شارحین نے حضرت مولا علی علیہ السلام کے اس کلام پر اس بات کا اضافہ کیا ہے کہ یہ صرف اُس زمانے کی بات نہیں ہے بلکہ ہمارے اس دور میں بھی یہی ہو رہا ہے کہ جو لوگ قضاوت اور عدالت کی مسند پر بیٹھے ہیں وہ خود ایسے مجرم ہیں کہ اگر واقعاً عادلانہ فیصلے کیے جائیں تو اُن لوگوں کو بھی زندان میں مجرموں کے ساتھ ہونا چاہیے تھا اور یہ مسئلہ دراصل ہمارے دور کی سب سے بڑی مشکلات میں سے ایک ہے، ایسے لوگوں نے صرف چند قوانین کا رٹا لگا کر اپنا دل خوش کر لیا ہے یا صرف چند مشرق ومغرب کی عدالتی کتب کا مطالعہ کیا ہوا ہے۔ اب دیکھنا یہ ہے کہ ایسے بے خبر جاہلوں کا عمل کے میدان میں کیسا چہرہ ہوتا ہے۔ مولا علی علیہ السلام نے ایسے شخص کے بارے میں فرمایا ہے:

"فَاِنْ نَزَلَتْ بِهٖ اِحْدَى الْمُبْهَمَاتِ هَيَّاَ لَهَا حَشْوًا رَثًّا مِنْ رَاْيِهٖ، ثُمَّ قَطَعَ بِهٖ"

''اب جب یہ شخص کسی مسئلے میں پھنستا ہے تو اس کو حل کرنے کے لیے کچھ بیہودہ اور بے معنی باتوں کو جمع کرتا ہے اور ان غلط مقدمات سے نتیجہ نکالتا ہے اور اُس کے غلط نتیجے کے تحت حکم دیتا ہے۔''

"حَشْوًا رَثًّا مِنْ رَاْيِهٖ" کی تعبیر۔ اس بات کو ملحوظِ خاطر رکھتے ہوئے کہ ''حشو'' کے معنی فالتو اشیاء اور بے کار چیزوں کے ہیں اور ''رث'' کے معنی[2] بوسیدہ اور پرانا ہونے کے ہیں۔ اشارہ ہے اس نکتے کی طرف کہ نہ تو یہ شخص کسی قسم کی

---

[1] وسائل الشیعہ۔ جلد ۱۸، صفحہ ۳۸، واضح رہے کہ وصیِ نبیؐ کا مفہوم اس مقام پر بہت وسیع ہے جس میں ایسے عادل علماء جو انبیاءؑ کے راستے پر چل رہے ہیں وہ بھی شامل ہیں۔

[2] شرح نہج البلاغہ، مرحوم مغنیہ، جلد ۱، صفحہ ۱۴۴

https://downloadshiabooks.com/

بڑائی کا اہل ہے اور نہ ہی اُس کے پاس ذہن ہے، اور نہ ہی وہ فکر و ادراک رکھتا ہے اور نہ ہی اپنے مقصد تک پہنچنے کے لیے کوئی خاص دلائل جمع کر سکتا ہے، اُس کا کل سرمایہ صرف چند مٹھی بھر باطل، بے بنیاد اور فاسد افکار اور عقائد ہیں، جن کی کوئی قدر و قیمت بھی نہیں اور وہ شخص اُنہی پر بھروسا کیے ہوئے ہے اور انہی کے ذریعے وہ یقین اور رائے کا اظہار کرتا ہے۔ ظاہر سی بات ہے کہ ایسے باطل اور بے بنیاد مقدمات سے ہرگز یقین حاصل نہیں ہوسکتا، وہ لوگوں کو دھوکا دیتا ہے اور یقین کا اظہار کرتا ہے اور اگر فرضی طور پر اُسے یقین حاصل ہو بھی جائے تب بھی کیونکہ وہ شروعات میں غلط مقدمات کا سہارا لے چکا ہے، لہٰذا خدا کے نزدیک اُس کا کوئی عذر باقی نہیں بچتا۔ عدالتی مشکلات بالکل سیاسی، علمی اور سماجی مشکلات کی طرح حل کی جاتی ہیں، جن کے پیچھے کئی منطقی اور فکری صحیح مقدمات کا ہونا ضروری ہے، مگر وہ شخص جو ان صحیح مقدمات سے واسطہ ہی نہیں رکھتا اور کچھ باطل اور غلط مقدمات سے وابستگی اختیار کر چکا اور اپنی روح کو اُسی سے تسکین دیتا رہتا ہو جس کے نتیجے میں وہ نہ صرف یہ کہ صحیح نتیجے تک نہیں پہنچ سکتا، بلکہ گمراہی کی وادی میں حیران و سرگرداں پھرتا رہتا ہے اور یوں دوسروں کو بھی گمراہی کی طرف کھینچتا رہتا ہے اور اس سے زیادہ بُری بات تو یہ ہے کہ وہ جتنا زیادہ ان چیزوں میں گھرتا چلا جاتا ہے، اُتنا ہی حقیقت سے دور ہوتا جاتا ہے۔ امامِ عالی مقام علیہ السلام اس کے بعد فرماتے ہیں:

"فَهُوَ مِن لَبْسِ الشُّبُهَاتِ فِي مِثْلِ نَسْجِ الْعَنْكَبُوتِ" [۱]

وہ ان بے حساب شبہات کے گھیراؤ میں گویا کسی مکڑی کی مانند ہوتا ہے جو اپنے اردگرد کچھ جال بنا لیتی ہے اور اُسی پر تکیہ کرتی ہے۔" (ایسے کمزور جال جو کہ اس قدر ہلکے اور بے اساس ہوتے ہیں کہ نہ تو وہ بارش کے آگے رُک سکتے ہیں اور نہ ہی ہلکی ہوا کے آگے ٹھہر سکتے ہیں)

حضرت مولا علی علیہ السلام کی اس تشبیہ کے بارے میں نہج البلاغہ کے شارحین کے درمیان مختلف بحثیں پائی جاتی ہیں، جن میں سے بعض تو کسی بھی تحریری تبدیلی کے قابل نہیں ہیں، جو بات سب سے زیادہ مناسب نظر آتی ہے وہ یہ ہے کہ مولا علی علیہ السلام نے ایسے جاہل اور مغرور اور ضعیف الفکر افراد کو مکڑی سے تشبیہ دی ہے جو کہ اپنے لیے جال بناتی ہے اور اُس پر تکیہ کرتی ہے جو اُس کے لیے گھر بھی ہوتا ہے اور شکار کرنے کا جال بھی، مگر ایسا گھر جو کسی طور بھی قابلِ بھروسا نہیں ہے، ایسا جال جس میں سوائے کچھ ضعیف و ناتواں حشرات الارض کے اور کوئی شکار نہیں پھنستا۔ جی ہاں وہ عالم نما جاہل اپنے اس کمزور جال سے فقط اپنے جیسے کم زور اور ناتواں جاہل افراد ہی کو پھنسا سکتا ہے، اس طرح وہ ایک مکڑی کی مانند ہے اور اس کے افکار محض کمزور جال

[۱] "عنکبوت" ایک مشہور کیڑا ہے اور یہ لفظ دراصل "عکب" کے مادّے سے ہے یا "عنکب" کے مادّے سے آیا ہے۔ اس میں کئی اختلافات موجود ہیں اور بعض نے کہا ہے کہ دراصل "عکوب" ہے جس کا مطلب ہے گرد و غبار کیونکہ اس کا جال غبار کی مانند ہوتا ہے۔

https://downloadshiabooks.com/

کی مانند ہیں اور اس کا شکار بھی صرف چند کم علم و جاہل و ناتواں افراد ہی ہیں:

"لَا يَدْرِي أَصَابَ أَمْ أَخْطَأَ فَإِنْ أَصَابَ خَافَ أَنْ يَكُونَ قَدْ أَخْطَأَ وَإِنْ أَخْطَأَ رَجَا أَنْ يَكُونَ قَدْ أَصَابَ"

"یہ بے نوا شخص اس خطرناک راستے میں اُس وقت چلتا ہے، جبکہ اُسے خود نہیں پتا کہ اُس نے صحیح حکم دیا ہے یا غلط، اسی وجہ سے اگر (اتفاقاً) صحیح فیصلہ دیا ہے تو اُسے یہ ڈر ہوتا ہے کہ غلطی کی ہوگی، اور اگر غلطی کی ہے تو اُسے یہ اُمید ہے کہ شاید (اتفاقاً) کامیاب ہو جائے۔"

یہ اُن تمام افراد کا انجام ہے جو نادان اور بے خبر ہونے کے ساتھ بڑے بڑے کاموں کے عہدیدار ہو جاتے ہیں، جن کی ان میں صلاحیت بھی نہیں ہوتی۔ یہ لوگ ہمیشہ شک و تردّد کا سفر کاٹتے ہیں، یہاں تک کہ اگر اتفاقاً صحیح قدم اُٹھا بھی لیا ہو تب بھی اپنے فیصلے پر یقین و ایمان نہیں ہونے کی بنا پر متزلزل رہتے ہیں کیونکہ انہوں نے اندھے کنویں میں تیر چلایا ہوتا ہے اس اُمید پر کہ شاید ہدف پر جا لگے۔

نہج البلاغہ کے بعض شارحین نے یہ تصور کیا ہے کہ آخری جملوں کا اوپر کے ان جملوں سے تضاد ہے جیسا کہ فرمایا: "ثُمَّ قَطَعَ بِهِ" کیونکہ اس جملے میں قطع و یقین کی بات ہو رہی ہے اور یہاں شک و تردّد کی بات ہو رہی ہے اور یوں اس تضاد کو حل کرنے کی فکر میں ہیں، جبکہ اوپر کا جملہ دراصل قاطعانہ اور اٹل فیصلے کی وضاحت کر رہا ہے نہ کہ قاضی کی یقین کی درحقیقت وہ صرف حکم کرتا ہے اور ظاہری طور پر ایک مطمئن انسان کا تاثر دیتا ہے، جبکہ اندر سے ایک شک کے طوفان کا سامنا کر رہا ہوتا ہے۔

جی ہاں! اُس کی حقیقی بدبختی تو یہی ہے کہ اتفاقاً وہ حقیقت تک پہنچ بھی گیا، کیونکہ اُسے اطمینان اور یقین حاصل نہیں، لہٰذا وہ ہمیشہ ہی متزلزل رہے گا اور فیصلے کی قوت اُس کے پاس نہیں رہتی اور اگر غلطی کر جائے تو کیونکہ وہ خود اپنی غلطی سے واقف نہیں، اس لیے اُس کی واپسی کے راستے بھی بند رہتے ہیں۔ پھر ان کی توصیف کے ضمن میں اپنی زبردست تشبیہات اور تعبیرات کے ذریعے ایسے لوگوں کا حال بیان کرتے ہیں:۔

پہلی توصیف میں فرماتے ہیں:

"جَاهِلٌ خَبَّاطُ [1] جَهَالَاتٍ"

---

[1] "خباط" کا لفظ "خبط" کے مادّے سے ہے اور اس کے معنی دراصل بے ترتیبی سے مارنے یا بے نظم و ترتیب حرکت کرنے کو کہتے ہیں، جو کہ ظاہر ہے غلط انجام تک ہی منتہی ہوتا ہے اسی لیے ایسے دیوانے افراد کو "خابط" یا "خباط" کہا جاتا ہے جو عدل و انصاف اور میانہ روی کو اپنے آپ میں نہ رکھ سکیں۔

https://downloadshiabooks.com/

''وہ ایسا نادان ہے کہ جو جہالت کی تاریکیوں میں حیران وسرگرداں ہے۔''

"عَاشٍ رَكَّابُ عَشَوَاتٍ"[۱]

''وہ ایسا نابینا ہے کہ خطروں سے بھرپور اندھیروں میں اسی طرح اپنے راستے پر چل رہا ہے۔''

حضرت امام علی علیہ السلام نے اس کے جاہل ہونے کے بیان پر قناعت نہیں کی، بلکہ اُس پر تاکید کرتے ہوئے فرمایا:

''وہ مسلسل اپنی جہالتوں میں سرگرداں ہے اور اپنے نابینا ہونے سے بے خبر بھی ہے۔ وہ مستقل اپنی اُسی تاریکی اور ظلمت کی راہوں پر گامزن ہے اور یہ جانے بغیر کہ انجام کیا ہوگا، ہر طرف چلا جارہا ہے اور بڑھتا جارہا ہے۔''

یہ ایسے شخص کی سب سے پہلی صفت ہے، یہ بات ملحوظِ خاطر رہے کہ ''عاش'' کا لفظ جو کہ ''عشا'' کے مادّے ہے اور یہ ''فنا'' کے وزن پر ہے، دراصل اس کے معنی ہیں مستقل اندھاپن اور نابیناپن، اور بعض اوقات آنکھوں کی بینائی کی کمزوری کے لیے اور بعض اوقات رات کو نہ دیکھ پانے والوں کے لیے کہا جاتا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ ایسی آنکھ والا شخص اپنے آگے پیچھے کے راستے پر صحیح سے نہیں دیکھ سکتا اور اطراف کے حالات نہیں جان سکتا اور اگر بے احتیاطی یا بغیر مطالعے اور بغیر رہنما کے چل پڑے تو بعض اوقات کنویں میں گر جاتا ہے اور کبھی آگ میں۔ جو لوگ کافی علم و آگاہی اور تجربہ نہیں رکھتے اور خطرناک کام کرنے لگتے ہیں، جیسے لوگوں کے درمیان روزمرہ زندگی میں پیدا ہونے والے واقعات وحادثات کے فیصلے اور مصالحت کے لیے اقدام کرنا، ان حالات میں وہ بدبختیوں کی دلدل میں پھنس جاتے ہیں اور ان کا انجام کفر وشقاوت کی گہری کھائی میں دفن ہو جانا ہے۔ اس سے بدتر یہ ہے کہ اس قسم کے لوگ اپنے آپ کو لوگوں کے درمیان صلح وصفائی اور فیصلے کرنے کو اپنا حق سمجھتے ہیں، جبکہ ان کی غلطیوں اور گناہوں کی کوئی حد نہیں ہے۔

دوسری توصیف: حضرت امام علی علیہ السلام اس قسم کے لوگوں کی جہالت ونادانی کے بارے میں یوں فرماتے ہیں:

"لَمْ يَعَضَّ عَلَى الْعِلْمِ بِضِرْسٍ قَاطِعٍ"

''انہوں نے علم و دانش کو ہرگز حقیقی منابع اور ذرائع سے نہیں حاصل کیا۔'' (اور اسی دلیل کی بنیاد پر کبھی کسی مسئلے پر یقین واطمینان حاصل نہیں کرسکتے)

امامؑ ایسے افراد کو ان لوگوں سے تشبیہ دیتے ہیں جن کے پاس کھانے کو بہت کچھ ہے، مگر ہضم نہیں ہوتا ہے، ہرگز جسم میں جذب نہیں ہوتا ہے۔ نہج البلاغہ کے بعض شارحین نے کہا ہے کہ ''ضرس'' سے مراد اس مقام پر عقل کے دانت ہیں جو کہ عقل کے کمال پر فائز ہونے کے وقت نکلتے ہیں، اور گویا ان جاہلوں کی عقلوں کے ابھی دانت ہی نکلے ہیں اور یہ لوگ کسی بھی

[۱] ''عشوات'' کا لفظ ''عشوۃ'' کی جمع ہے اور ظلمت وتاریکی سے عبارت ہے۔

https://downloadshiabooks.com/

مسئلے کو صحیح معیار پر نہیں تولتے اور ان کے بالمقابل وہ لوگ ہیں جو تمام مسائل سے مکمل طور پر آگاہ ہیں، اور ان کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ وہ ''ضرس'' کے ساتھ یعنی قاطعیت اور بھرپور یقین اور وثوق کے ساتھ بات کرتے ہیں اور اُن کی باتیں اُصولوں پہ مبنی ہوتی ہیں۔

تیسری توصیف میں فرماتے ہیں:

''يَذْرُو [۱] الرِّوَايَاتِ ذَرْوَ الرِّيحِ الْهَشِيمِ.'' [۲]

''جس طرح طوفانی ہوا جو کہ پودوں اور گھاس پھوس کو اِدھر اُدھر اُڑاتی ہے، وہ بھی روایاتِ نبویؐ کو اِدھر اُدھر اُڑاتا ہے'' (تاکہ اپنے گمان کے مطابق اُس نتیجے کو اخذ کر سکے جسے وہ پانا چاہتا ہے)

یہ بات اس مطلب کی طرف اشارہ کر رہی ہے کہ وہ اگرچہ بظاہر روایتوں اور سنّتِ نبویؐ کو پڑھتا ہے، مگر کیا فائدہ، کسی طریقے سے بھی ان کا تجزیہ و تحلیل نہیں کر سکتا، نہ اس کے فائدے سے آگاہی حاصل ہے، نہ اُس کی قوت وضعف اور سند کے بارے میں آگاہ ہے اور نہ ہی آپس میں متعارض روایتوں کے درمیان موافقت ایجاد کرنے کے طریقوں سے واقف ہے اور نہ ہی اسے روایاتِ محکم اور متشابہ کو پہچاننے کی تمیز ہے؛ بالکل اُس طوفانی ہوا کی طرح کہ جو خشک گھاس پھوس کو اِدھر سے اُدھر اُڑاتی اور اُلٹ پلٹ کرتی رہتی ہے اور اس کا کوئی فائدہ یا ہدف بھی نہیں ہوتا۔ خشک شدہ گھانس پھوس ''هَشِيم'' کا کچھ خاص فائدہ بھی نہیں، اگرچہ کچھ تھوڑا بہت فائدہ حاصل ہو سکتا ہو، مگر تیز ہوائیں انہیں اس طرح سے اُڑاتی پھرتی ہیں کہ وہ ممکنہ فائدہ بھی حاصل ہونے کے لائق نہیں رہتی اور یہی حال اُن ناواقف بدبختوں کا ہے، جو صحیح حدیث کو ضعیف سے اور ٹھیک کو غلط سے تمیز نہیں دے سکتے۔

چوتھی توصیف میں آپؑ فرماتے ہیں:

''لَا مَلِيٌّ - وَاللهِ - بِإِصْدَارِ [۳] مَا وَرَدَ عَلَيْهِ، وَلَا أَهْلٌ لِمَا قُرِّظَ بِهِ.'' [۴]

---

[۱] ''یذرو'' کا لفظ ''ذرو'' کے مادّے سے ہے اور ''ضرب'' کے وزن پر ہے جس کے معنی ہیں پھیلانا۔ یہی معنی ناقص واوی اور ناقص یائی، دونوں صورتوں میں ہے۔

[۲] ''ھشیم'' کا لفظ ''ھشم'' کے مادّے سے ہے اور ''پشم'' کے وزن پر ہے اور اس کا مطلب ہے کسی خشک چیز کو توڑنا، چاہے وہ اندر سے بھری ہوئی ہو یا خالی ہو۔ اس لیے خشک گھاس پھوس کو ''ھشم'' کہتے ہیں۔

[۳] ''اصدار'' کا لفظ ''صدر'' کے مادّے سے ہے اور یہ ورود کے مدمقابل آتا ہے، دراصل اندر آنے اور باہر جانے کے لیے استعمال ہوتا ہے۔ اس کے بعد ہر طرح کے دخول اور خروج کے لیے استعمال ہونے لگا۔

[۴] ''قرظ'' کا لفظ ''تقریظ'' کے مادّے سے ہے اور اس کے معنی کسی کی حیات میں اُس کی مدح و ثناء کرنا ہے، دراصل کمال کو چمکانے یا اُسے دلکش اور مرغوب بنانے والی چیز کو ''قرظ'' کہتے ہیں۔

https://downloadshiabooks.com/

''خدا کی قسم! یہ مغرور جاہل شخص نہ تو مسائل کے حل کرنے کے لیے قابل اعتماد ہے اور نہ یہ اُن چاپلوسوں کی مداحی کے لائق ہے جو اس کی مدح سرائی کرتے ہیں۔''

یہ بات تو واضح ہے کہ عدالتی اور قضاوتی مشکلات کا حل، بلکہ فقہا کی اصطلاح میں ''رَدّ فروع بہ اصول'' سے کام لینا بہت بڑے علمی سرمائے کا محتاج ہے، جو کہ اِن مغرور جاہلوں کے پاس نہیں ہے، اور اسی علمی فقر و تنگدستی (توجہ رہے کہ مَلِیّ غنی اور مال دار ہونے کے معنی میں استعمال ہوا ہے) کے باعث وہ مجبور ہوتا ہے کہ مشکلات کے آگے گھٹنے ٹیک دے اور وہ مختلف مسائل سے نمٹنے کی راہ بھی نہیں پہچان سکتا (توجہ رہے کہ ورود اور خروج ایک دوسرے کے مدمقابل ہیں یہ مطالب علمائے کرام اپنی تعبیرات میں استعمال کرتے ہیں کہ فلاں شخص عالم اور آگاہ مرد ہے۔ مسائل سے بخوبی نمٹنا جانتا ہے، مگر خطبے کے بحث میں جو شخص مراد ہے وہ اپنی علمی کم مایگی کی وجہ سے اس خصوصیت سے مکمل خالی ہے)۔ ایسے افراد کی ایک اور مخصوص برائی یہ ہے کہ کچھ چاپلوسوں کا گروپ ان کے اردگرد اپنا مطلب پورا کرنے اور ذاتی مفادات کے حصول کے لیے منڈلاتا رہتا ہے اور جھوٹی چاپلوسی اور فضول کی مدح وثنا کرتے رہتے ہیں اور ان کی تعریف میں وہ وہ باتیں کرتے ہیں، جن کے وہ ہرگز اہل ہی نہ ہوں اور یہ اعلیٰ حضرات اُن کی جھوٹی تعریفوں سے محظوظ ہوتے رہتے ہیں اور جانتے ہیں کہ یہ تعریفیں جھوٹی ہیں اور ہم ان کے اہل نہیں ہیں، مگر بعد میں آہستہ آہستہ اُنہیں شہ ملتی ہے اور وہ یہ باور کر لیتے ہیں کہ ہاں ہم واقعاً ایسے ہی ہیں، اور یہی ان کی بدبختیوں کا سب سے بڑا عروج ہوتا ہے کہ پھر تمام نجات کی راہیں مسدود ہو جاتی ہیں [۱]۔

پانچویں توصیف: اس بارے میں فرماتے ہیں:

''لَا يَحْسَبُ الْعِلْمَ فِي شَيْءٍ مِمَّا أَنْكَرَهُ، وَلَا يَرَى أَنَّ مِنْ وَرَاءِ مَا بَلَغَ مَذْهَباً لِغَيْرِهِ''

''یہ بیوقوف شخص اس بات کو ماننے کے لیے ہی تیار نہیں ہے کہ جو کچھ اُس نے سمجھا ہے، اُس کے علاوہ بھی کوئی علم و آگاہی ہو سکتی ہے اور جو کچھ اس نے سمجھا ہے اس کے علاوہ کوئی اور نظریہ (رائے) بھی ہو سکتا ہے۔''

یہ خود ایک مثال ہے چھوٹی فکر اور کم علمی کے شکار لوگوں کے لیے کہ وہ اپنے آپ کو عقلِ کل سمجھتے ہیں اور اُس کے علاوہ کسی اور علم اور نظریے کو علم ہی نہیں سمجھتے اور دوسروں کے افکار کا کم ترین احترام بھی نہیں کرتے، جبکہ سب سے بڑے عالم اور دانشور حضرات وہ لوگ ہیں جو علم و آگاہی کے کمال پر فائز ہونے کے باوجود اپنی کم علمی کا اعتراف کرتے ہیں اور اُن کا کہنا یہ ہے کہ ہر دماغ اور ہر عقل کے اندر حقیقت کا کوئی نہ کوئی ذرّہ موجود ہے۔ وہ لوگ کھلے دل سے دوسروں کی باتیں سنتے ہیں، یہ

---

[۱] ''اصدار'' کا لفظ ''صدر'' کے مادّے سے ہے اور یہ ورود کے مدمقابل آتا ہے، دراصل اندر آنے اور باہر جانے کے لیے استعمال ہوتا ہے۔ اس کے بعد ہر طرح کے دخول اور خروج کے لیے استعمال ہونے لگا۔

https://downloadshiabooks.com/

لوگ اس قولِ باری تعالیٰ کے مطابق:

"فَبَشِّرْ عِبَادِ الَّذِيْنَ يَسْتَمِعُوْنَ الْقَوْلَ فَيَتَّبِعُوْنَ اَحْسَنَهُ"[۱]

جو بات شائستہ ہو، اسے قبول کرتے ہیں (جبکہ جاہل مکمل یقین سے بات کرتے ہیں) وہ لوگ علمی مسائل میں احتیاط برتتے ہیں چونکہ وہ جانتے ہیں کہ علم کا دائرہ وسیع اور ہمارے خیال وتصور سے بالاتر ہے۔

چھٹی توصیف: اس بارے میں فرماتے ہیں:

"وَاِنْ اَظْلَمَ عَلَيْهِ اَمْرٌ اكْتَتَمَ بِهِ لِمَا يَعْلَمُ مِنْ جَهْلِ نَفْسِهِ"

"جب کبھی اُسے کوئی موضوع مبہم لگے تو اُسے چھپا لیتا ہے، کیونکہ وہ اپنی جہالت سے آگاہ ہے۔"

یہ عالموں اور مغرور جاہلوں کے درمیان ایک کھلا فرق ہے، عالم اگر کسی مبہم معاملے میں پھنس جاتا ہے تو اُسے اپنے مطالعے کے موضوعات میں شامل کر لیتا ہے اور اُس کی کھوج میں لگ جاتا ہے اور اگر خود اس مسئلے کا حل نہ نکال سکے تو دوسروں سے مدد لیتا ہے اور اُن کے افکار سے تعاون لیتا ہے، پھر مشورہ کرتا ہے، مگر مغرور جاہل اُسے چھپا دیتا ہے اور تیزی سے گزر جانے کی کوشش کرتا ہے، کیونکہ وہ جانتا ہے کہ جتنا بھی اُس میں رکا رہے گا، اُتنی ہی رُسوائی اور جگ ہنسائی کا سبب بنے گا۔ مختصر یہ کہ وہ روایات اسلامی کے خلاف عمل کرتا ہے۔

"وَلَا يَسْتَحِيَنَّ اَحَدٌ مِنْكُمْ اِذَا سُئِلَ عَمَّا لَا يَعْلَمُ اَنْ يَقُوْلَ: لَا اَعْلَمُ، وَلَا يَسْتَحِيَنَّ اَحَدٌ اِذَا لَمْ يَعْلَمِ الشَّيْءَ اَنْ يَتَعَلَّمَهُ"[۲]

"اگر کسی چیز کو نہیں جانتے تو حیا نہ کرو (مت شرماؤ) جاؤ! اور جا کے سیکھو اور اگر تم سے کسی ایسی چیز کا پوچھا جائے، جس کا تمہیں علم نہ ہو تو مت شرماؤ اور کہہ دو کہ نہیں جانتے۔"

کیوں کہ اس طریقے پر عمل نہ کرنے کی صورت میں بہت شرمناک انجام سے خود اور معاشرے کو دوچار کرو گے، جیسا کہ امیر المومنینؑ نے بعد کے جملے میں نتیجے کے طور پر ان جاہل مغرور اور خوف خدا نہ رکھنے والے جاہل قاضیوں کے اعمال کے متعلق فرماتے ہیں:

"تَصْرُخُ مِنْ جَوْرِ قَضَائِهِ الدِّمَاءُ، وَتَعِجُّ[۳] مِنْهُ الْمَوَارِيْثُ"

---

[۱] سورۂ زمر، آیات ۱۷، ۱۸

[۲] نہج البلاغہ، کلماتِ قصار ۸۲

[۳] وتَعِجُّ کا مادّہ عج، وعجیج ہے معنی آواز کا بلند ہونا یا غبار بلند ہونا، اوپر کی عبارت میں فریاد کے معنی میں آیا ہے۔

https://downloadshiabooks.com/

''ناحق خون اُس کی ظالمانہ قضاوت پر فریاد کرتے ہیں اور برباد ہوئی میراثیں اُن کے فیصلے اور قضاوت پر چلاتی ہیں۔''

جی ہاں ناحق وہ خون جو اس غیر عادلانہ فیصلے کے نتیجے میں بہے ہیں، وہ فریاد کریں گے اور لٹے ہوئے مال ان کے فیصلوں پر دہاڑیں مار مار کر روئیں گے اور سننے والوں کے کان ان فریادوں کو سنیں گے اور اُن پر لرزہ طاری ہو جائے گا، جبکہ یہ جاہل اپنی مستی میں مست رہے گا۔ ''تَصْرُخُ'' اور ''تَعَجُّ'' کی تعبیر نہایت ہی حسین اور خوبصورت تعبیر ہے کہ ناحق بہائے جانے والے خون اور برباد کیے گئے مال، سب فریاد کریں گے۔ گویا علم، شعور، درک و آگاہی سب ہی گواہ بن گئے ہیں اور ایک محشر کا سا عالم ہے کہ یہ بے جان موجودات اور مخلوقات بھی زبانِ حال سے فریاد کر رہی ہیں، مگر یہ مغرور اور جاہل انسان اپنی نادانی اور جہالت کی مستی میں ہی رہتا ہے اور بعض حضرات نے اس لفظ کی تفسیر میں ''اہل'' کے لفظ کو تقدیر میں رکھا ہے اور کہتے ہیں کہ اس خون اور مال کے وارث فریاد کریں گے، مگر اس طرح سے مولا حضرت امام علی علیہ السلام کے کلام کی لطافت میں فرق آتا ہے، بہرحال جن قاضیوں کو لوگوں کے جان و مال اور خون کا محافظ ہونا چاہیے تھا، وہی لوگ صرف اپنی نادانی، جہالت اور تقویٰ کے نہ ہونے کی وجہ سے لوگوں کے جان اور مال کو ناجائز طور پر اپنی اکڑ میں امن سمیت ہر چیز کو برباد کر دیتے ہیں۔ یہ بات حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام کی اس ہلا دینے والی تعبیر سے مشابہت رکھتی ہے کہ جب میرے مولاؑ نے ''ابوولاد'' کی نہایت ظالمانہ قضاوتیں اور فیصلے سُنے تو فرمایا:

''فِيْ مِثْلِ هٰذَا الْقَضَاءِ وَشِبْهِهٖ تَحْبِسُ السَّمَاءُ مَاءَهَا وَتَمْنَعُ الْاَرْضُ بَرَكَاتِهَا''

''ایسی قضاوتیں ہی اس بات کا سبب بنتی ہیں کہ آسمان سے رحمت الٰہی نہ برسے اور زمین اپنی برکت روک دے۔''[1]

چند نکات

علمائے سُوء اور اُن کے خطرات

پچھلے متن میں مولائے کائنات امیر المومنین حضرت علی علیہ السلام کے کلام میں ایسے عالم نما جہلا کے خطروں کے غیر معمولی نتائج اور نقصانات کی طرف اشارہ ہوا ہے جو نہ صرف اپنے آپ کو بدبختی کی کھائی میں گرا دیتے ہیں، بلکہ معاشرے کو بھی نقصان پہنچاتے ہیں۔ ان کے نقصانات تو اس حد تک ہیں کہ بے گناہوں کے خون بھی بہائے جاتے ہیں اور مظلوموں کے حقوق بھی پامال ہو جاتے ہیں اور پھر ناحق خون اُن کے ظالمانہ فیصلوں پر فریاد کرتے ہیں اور ضائع شدہ اموال اُن کے خلاف

[1] وسائل الشیعہ، جلد ۱۳، ص ۲۵۶

https://downloadshiabooks.com/

دہاڑیں مارتے ہیں۔

رسولِ خدا آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی معروف حدیث ہے:

"مَنۡ عَمِلَ عَلٰی غَیۡرِ عِلۡمٍ کَانَ مَا یُفۡسِدُ اَکۡثَرَ مِمَّا یُصۡلِحُ"

"جو شخص آگاہی اور علم کے بغیر کسی کام کو اپنے ذمّے لے لیتا ہے، تو اُس کے ہاتھوں وہ کام بنتا کم اور بگڑتا زیادہ ہے۔"[۱]

آنحضرتؐ کی ایک اور حدیث میں ہے:

"مَنۡ اَفۡتَی النَّاسَ بِغَیۡرِ عِلۡمٍ وَ هُوَ لَا یَعۡلَمُ النَّاسِخَ مِنَ الۡمَنۡسُوۡخِ وَ الۡمُحۡكَمَ مِنَ الۡمُتَشَابِهِ فَقَدۡ هَلَكَ وَ اَهۡلَكَ"

"جو شخص بغیر علم و آگہی کے کوئی فتویٰ دیدے، جبکہ نہ تو وہ ناسخ کو منسوخ سے پہچان سکتا ہے اور نہ ہی محکم کو متشابہ سے پہچان سکتا ہے، وہ اپنے آپ کو بھی ہلاکت کی طرف لے جاتا ہے اور دوسروں کو بھی۔"[۲]

ایسے افراد جتنا زیادہ اور جتنی تیزی سے کام کرتے ہیں، اُتنا ہی اُن کی اور معاشرے کی بدبختی میں اضافہ ہوتا چلا جاتا ہے، جس طرح سے ہم حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام کی ایک پُرمعنی حدیث میں پڑھتے ہیں:

"اَلۡعَالِمُ عَلٰی غَیۡرِ بَصِیۡرَةٍ کَالسَّائِرِ عَلٰی غَیۡرِ الطَّرِیۡقِ لَا یَزِیۡدُهٗ سُرۡعَةُ السَّیۡرِ اِلَّا بُعۡدًا"

"جو شخص آگاہی کے بغیر عمل کرے گا وہ اُس شخص کی طرح ہے جو انجان راستوں سے گزرتا جا رہا ہو، اب وہ چاہے جتنا ہی تیز چلتا رہے، اپنے آپ کو صحیح راستے سے دور کرنے کے سوا اور کچھ اُس کے ہاتھ نہیں آئے گا۔"[۳]

مکڑی کے جال جیسی کمزور معلومات

پچھلے بیانات میں ایسے عالم نما جہلاء کی معلومات کو مکڑی کے جال سے تشبیہ دی گئی ہے ایسی تشبیہ جو در حقیقت سورۂ عنکبوت میں مشرکوں کے خداؤں کو دی گئی ہے۔ اس دنیا میں ایک عجیب الخلقت شے مکڑی ہے، یہ کیڑا اپنے شکم کے نیچے سے ایک لیس دار پانی نکالتا ہے اور اُس کے ذریعے سے جال بناتا ہے، کیونکہ اس پانی میں کچھ ایسی قدرتی ترکیب ہے کہ یہ ہوا لگتے

---

[۱] اصول کافی، ج ۱ ص ۴۴

[۲] اصول کافی، جلد ۱ ص ۴۳

[۳] اصول کافی، جلد ۱ ص ۴۳

https://downloadshiabooks.com/

ہی سخت اور مضبوط ہو جاتا ہے،بعض دانشوروں کا کہنا ہے کہ ہر مکڑی میں اتنی صلاحیت ہوتی ہے کہ وہ اس مختصر سے پانی سے کم و بیش پانچ سو میٹر کی لمبائی پر مشتمل جال بُن سکے، اور اس سے زیادہ تعجب خیز بات تو یہ ہے کہ ان جالوں کی کمزوری ان کے نازک پن کی وجہ سے ہے لیکن اگر انہی جالوں سے فولاد کی تار جتنی ضخامت پر مشتمل تار بنایا جائے تو وہ فولاد سے زیادہ مضبوط ہو گی، یا دوسرے لفظوں میں یوں کہا جائے کہ اگر فولاد کی تار کو مکڑی کے جال کا سا نازک بنایا جائے تو وہ مکڑی کے جال سے کمزور ہو گی۔

بہر حال جو اتنی ظریف اور نازک ٹیکنیک(Technic) سے بنتا ہے، اس کو مکڑی کا گھر بھی کہا جاتا ہے اور اس کے شکار کو پکڑنے کا جال بھی کہا جاتا ہے، مگر جیسا کہ قرآن مجید میں ارشاد ہوتا ہے کہ اس سے زیادہ کمزور گھر موجود ہی نہیں ہے، ہوا کا ایک ہلکا سا جھونکا بھی اسے درہم برہم کر سکتا ہے۔ایک بارش کا قطرہ بھی اس کو چیر سکتا ہے، آگ کا ایک ہلکا سا شعلہ بھی اسے نیست و نابود کر دیتا ہے، بلکہ معمولی سی گرد و غبار کا بوجھ اُٹھانے کی بھی اس میں طاقت نہیں اور وہ بھی اسے تار تار کر دیتا ہے اور یہی مثال ہے مشرکوں کے خداؤں کی اور مغرور عالم نما جہلا کی، کہ جو ہر ہلکی سی مشکل کے سامنے ضعیف و ناتواں ہیں، ایسے علما جو کہ قیاس اور ظن پر تکیہ کیے بیٹھے ہیں ان کا معاملہ بھی کسی مکڑی کی طرح ہے جو کمزور گھر پر تکیہ کیے ہوئے ہے۔اس ضمن میں اس تشبیہ سے یہ استفادہ بھی کیا جا سکتا ہے کہ ان عالم نما جہلا کے جال میں ان کے جیسے دوسرے افراد گرفتار ہو جاتے ہیں جن کی قدر و منزلت بھی کسی کیڑے یا مکھی کی سی ہے اور اہلِ علم و تحقیق کبھی ان جالوں میں نہیں پھنستے۔

چاپلوس مداح (حاشیہ نشین)

مذکورہ موضوع میں ایسے چاپلوس مداحوں کی نااہلی کا تذکرہ بھی کیا گیا ہے۔یہ ایسی عظیم مصیبت ہے جو عالم نما جاہلوں کے گریبان میں لٹکی ہوئی ہے، جس کی وجہ سے یہ عالم نما مغرور جہلا رفتہ رفتہ اپنے علم و آگہی اور لیاقت کے قائل ہو جاتے ہیں اور پھر ایسے عہدوں پر فائز ہوتے ہیں جن کے وہ اہل نہیں ہوتے اپنی اور معاشرے کی ہلاکت کا باعث بنتے ہیں، ان چاپلوسی کرنے والے حاشیہ نشینوں کا نقصان بھی ان جاہل مغروروں کے نقصانات سے کچھ کم نہیں ہوتا بلکہ زیادہ ہی ہوتا ہے۔قرآن مجید اور اسلامی روایات میں اس چیز کی شدید مذمت کی گئی ہے ہم حضور اکرمؐ کی ایک حدیث میں دیکھتے ہیں کہ آپ نے فرمایا:

"اِذَا مُدِحَ الْفَاجِرُ اِهْتَزَّ الْعَرْشُ وَ غَضِبَ الرَّبُّ"[1]

---

[1] بحار الانوار، جلد ۷۴ صفحہ ۱۵۰

https://downloadshiabooks.com/

''جب کسی فاجر کی مدح وثناء کی جائے تو عرش الٰہی ہل جاتا ہے اور پروردگارِ عالم غضبناک ہوتا ہے۔''

اور آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ایک اور حدیث میں آیا ہے:

"مَنْ مَدَحَ سُلْطَاناً جَائِراً وَ تَخَفَّفَ وَ تَضَعْضَعَ لَهُ طَمَعاً فِيهِ كَانَ قَرِينَهُ إِلَى النَّارِ"۔[۱]

''جو شخص کسی ظالم بادشاہ کی مدح وثناء کرے اور مادّی امداد کی لالچ میں اُس کے لیے تواضع سے کام لے، وہ جہنم میں اُس کا ہم نشین ہوگا۔''

اسی بنا پر روایات میں ظالموں کی مدح سرائی پر سختی سے تنبیہ کی گئی ہے، یہاں تک کہ پرہیز گار لوگ بھی اپنی مشکلات میں اس قسم کے لوگوں کی مدح سرائی کرتے ہیں۔

ایک مشہور حدیثِ نبوی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہے:

"أُحْثُوا فِي وُجُوهِ الْمَدَّاحِينَ التُّرَابَ"۔[۲]

''مداحوں کے چہروں پر خاک ملو۔''

یعنی اُنہیں اپنے آپ سے دور کرو کہ وہ تمہیں تمہارے عیبوں سے غافل کر دیتے ہیں۔

حضرت امیر المومنین علیہ السلام، مالک اشترؒ کو مشہور ومعروف عہد نامے میں اس بات کی سختی سے تاکید کرتے ہیں، اور پھر اہل صدق وورع کے ساتھ ہم نشینی اختیار کرنے کی دعوت دیتے ہوئے فرمایا:

"ثُمَّ رُضْهُمْ عَلَى أَلَّا يُطْرُوكَ وَ لَا يَبْجَحُوكَ بِبَاطِلٍ لَمْ تَفْعَلْهُ فَإِنَّ كَثْرَةَ الْإِطْرَاءِ تُحْدِثُ الزَّهْوَ وَ تُدْنِي مِنَ الْعِزَّةِ"۔[۳]

''ان کی ایسی تربیت کرو کہ وہ تمہاری بیہودہ مدح وثنا نہ کریں اور تمہارے ان افعال کے بارے میں تعریف نہ کریں جو تم نے انجام ہی نہیں دیئے، کیونکہ مدح وثنا کی کثرت انسان کو عُجب اور تکبّر وغرور کی مہلک بیماریوں سے قریب کر دیتی ہے۔''

تیسرا حصہ

---

[۱] بحار الانوار، جلد ۲۷، ص ۳۶۹

[۲] بحار الانوار، ج ۷۰، ص ۲۹۴

[۳] نہج البلاغہ، نامہ ۵۳

اِلَى اللّٰهِ اَشْكُوْ مِنْ مَعْشَرٍ يَعِيْشُوْنَ جُهَّالًا وَ يَمُوتُونَ ضُلَّالًا لَيْسَ فِيْهِمْ سِلْعَةٌ اَبْوَرُ مِنَ الْكِتَابِ اِذَا تُلِيَ حَقَّ تِلَاوَتِهِ وَلَا سِلْعَةٌ اَنْفَقُ بَيْعاً وَلَا اَغْلَى ثَمَناً مِنَ الْكِتَابِ اِذَا حُرِّفَ عَنْ مَوَاضِعِهِ وَلَا عِنْدَهُمْ اَنْكَرُ مِنَ الْمَعْرُوفِ وَلَا اَعْرَفُ مِنَ الْمُنْكَرِ۔

''میں خدا کی بارگاہ میں فریاد کرتا ہوں ایسے گروہ کی جو زندہ رہتے ہیں تو جہالت کے ساتھ اور مر جاتے ہیں تو ضلالت کے ساتھ، ان کے نزدیک کوئی متاع، کتاب خدا سے زیادہ بے قیمت نہیں ہے، اگر اس کی واقعی تلاوت کی جائے تو کوئی متاع اس کتاب سے زیادہ قیمتی اور فائدہ مند نہیں ہے، اگر اس کے مفاہیم میں تحریف کر دی جائے، ان کے لیے معروف سے زیادہ منکر کچھ نہیں ہے اور منکر سے زیادہ معروف کچھ نہیں ہے۔''

شرح وتفسیر

حضرت امامؑ خداوند عالم کی بارگاہ میں عالم نما جاہلوں نادان دنیا پرست ومغرور قاضیوں کی شکایت دردمندانہ انداز میں کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

"اِلَى اللّٰهِ اَشْكُوْ مِنْ مَعْشَرٍ يَعِيْشُوْنَ جُهَّالًا، وَ يَمُوْتُوْنَ ضُلَّالًا"

''یہ افراد جو جہل ونادانی میں زندگی بسر کر رہے ہیں اور گمراہی میں اپنی جان دے رہے ہیں، ان کی شکایت خدا کے حضور کروں گا۔''

درحقیقت یہ حصہ اس گروہ کی دوسری صفات اور گذشتہ مباحث کی تکمیل سے متعلق ہے۔ اُن کی صفات میں سے ایک یہ ہے کہ انہوں نے گزشتہ زندگی جاہلانہ مباحث اور نادانی میں گزاری، اس لیے ان کی موت بھی گمراہی میں ہوئی (درحقیقت دوسرا جملہ پہلے جملے کی وجہ سے ہے جس سے اجتناب نہیں کیا جا سکتا) کس طرح ممکن ہے ایک انسان ساری زندگی جہالت میں بسر کرے اور گمراہی کے عالم میں اس دنیا سے نہ جائے۔

دوسری صفت میں جو اس گروہ کی شناخت کی بہترین علامت ہے، فرماتے ہیں:

https://downloadshiabooks.com/

"لَيْسَ فِيهِمْ سِلْعَةٌ [۱] أَبْوَرَ [۲] مِنَ الْكِتَابِ إِذَا تُلِيَ حَقَّ تِلَاوَتِهِ، وَلَا سِلْعَةٌ أَنْفَقُ [۳] بَيْعاً وَلَا أَغْلَى ثَمَناً مِنَ الْكِتَابِ إِذَا حُرِّفَ عَنْ مَوَاضِعِهِ"

''ان کے نزدیک قرآن کی صحیح قرأت اور تفسیر کی جائے تو اس سے کم قیمت اور ارزاں کوئی شے نہیں اور اگر اس میں تفاسیر اور مفاہیم میں (ان کی گمراہ خواہشات کے مطابق) تحریف کر دی جائے تو ان کے لیے اس سے قیمتی اور گراں بہا کوئی کتاب نہیں۔''

قرآن پڑھنے کے ساتھ یہ بھی چاہتے ہیں کہ قرآن ان کی نفسانی خواہشات، ان کے فاسد اغراض، شرم ناک و پلید نیتوں اور افکار کے مطابق ہو۔ اسی وجہ سے جب وہ دیکھتے ہیں کہ قرآن کی صحیح تفسیر ان کی انحرافی خواہشات کے مطابق نہیں، تو ہمیشہ تفسیر بالرّائے کی طرف ہاتھ بڑھاتے ہیں۔ اور اپنے بُرے اعمال و افکار کی توجیہ کے لیے اپنے طرف داروں کے پاس قرآن کی تحریف کی تلاش میں رہتے ہیں۔

قابلِ توجہ یہ بات ہے کہ یہ لوگ اُس معاشرے میں زندگی بسر کرتے ہیں جہاں قرآن مجید کا بہت احترام کیا جاتا ہے۔ وحیِ الٰہی کی نظر سے لوگ اس کا احترام کرتے ہیں، اس لیے یہ اپنے فاسد مقاصد کے حصول کے لیے قرآن کے زیرِ سایہ آ کر قرآن کی غلط تفسیر کرتے ہیں، تاکہ وہ اپنے باطل و ناپاک مقاصد کو قرآنی رنگ دے سکیں اور اس عظیم کتاب کو جو ہدایت کی کتاب ہے، اس کی تعریف کے بعد اس کے ذریعے لوگوں کو گمراہ کر سکیں۔

آخری توصیف میں فرماتے ہیں:

"وَلَا عِنْدَهُمْ أَنْكَرُ مِنَ الْمَعْرُوفِ، وَلَا أَعْرَفُ مِنَ الْمُنْكَرِ"

''ان کی نظر میں معروف سے بُری اور منکر سے اچھی کوئی چیز نہیں۔''

کیونکہ ان کا پورا وجود بُرا اور قبیح ہے؛ ان کے اعمال کفر پر مبنی ہیں؛ یہ معروف (اچھائی) سے بے خبر ہیں۔

---

[۱] سلعہ'' فرقہ کے وزن پر ہے اس کے معنی متاع و مالِ تجارت ہیں۔ دراصل مادّہ سلع سے لیا گیا ہے جس کے معنی شگاف یا پہاڑوں میں شگاف سے ہیں۔ جو مالِ تجارت آشکار ہو سامنے ہو اس کو سلعہ کہتے ہیں۔

[۲] ابور'' بور سے ہے۔ اس کا وزن غور ہے اس کے معنی ہلاکت و فساد کے ہیں۔ جب بازار کے کساد کی وجہ سے سرمایہ ڈوب جائے تو اس وقت یہ کلمہ اس کے لیے آتا ہے۔

[۳] انفق، نفاق و نفوق سے ہے۔ دراصل اس کے معنی چیز کا ختم و ضائع ہو جانا ہیں۔ اس لیے کسی کو بخش دینے کو انفاق کہتے ہیں، مال ہاتھ سے چلا جاتا ہے، اگرچہ انفاق کا اجرِ عظیم ہے۔ اس طرح بازار میں مال کو نفاق (طلاق کے وزن پر) کہتے ہیں۔ خریدار اس کو خرید لیتا ہے۔ اور بازار سے وہ شے چلی جاتی ہے۔

https://downloadshiabooks.com/

نکتہ

تفسیر بالرائے اور حقائق کی تحریف

متقی مومنوں اور بے ایمان غیر متقی افراد کے درمیان واضح فرق قرآن ہے، متقی و مومن قرآن کو اپنے لیے اصل سرمایہ سمجھتے ہیں اور کوشش کرتے ہیں اپنی مرضی و چاہت کو قرآن کے مطابق بنائیں۔ اگر غلطی و خطا ان سے سرزد ہوتی ہے تو پشیمان ہوتے ہیں، خدا کی بارگاہ میں توبہ اور اس کا ازالہ کرتے ہیں۔ دوسرے افراد (غیر متقی، بے ایمان) ہوا پرست ہیں۔ وہاں اصلی معیار ان کے دل کی چاہتیں ہیں جو کسی بھی اصول کی پابند نہیں، اس لیے وہ کوشش کرتے ہیں کہ آیاتِ الٰہی کو اپنی خواہشات کے مطابق بیان کریں، یعنی اصل ان کی مرضی و چاہتیں ہیں اور قرآن فرع ہے۔ دین اور احکامِ الٰہی صرف اس حد تک قابلِ احترام ہیں جب تک ان کی مرضی کے مطابق ہیں، جیسے ہی احکامات و آیات ان کی مرضی کے خلاف ہوں، یہ قرآن و احکامات سے دور ہو جاتے ہیں۔ اسی لیے یہ گروہ آیات الٰہی کے سامنے ان دو طریقوں میں سے ایک کو اپناتے ہیں:

پہلا طریقہ: "نُؤمِنُ بِبَعۡضٍ" فائدہ اُٹھاتے ہیں ان چیزوں سے جو ان کی مرضی و ہوائے نفس کے مطابق ہیں اور جو ان کی مرضی کے مخالف ہیں اس کو چھوڑ دیتے ہیں اور کافر ہو جاتے ہیں۔ درحقیقت یہی افراد "اَفَرَاَیۡتَ مَنِ اتَّخَذَ اِلٰهَهٗ هَوٰىهُ" کا مصداق ہیں اور ہوائے نفس کی پیروی کرتے ہیں نہ کہ خدا کی۔

دوسرا طریقہ: تحریف معنوی کرنا اور تفسیر بالرائے کرنا، یہ کبھی لوگوں کو اور کبھی اپنے وجدان کو دھوکا دینے کے لیے ہوتا ہے، یہ طریقہ پہلے طریقے سے زیادہ خطرناک و قبیح ہے۔ اس لیے قرآن اور روایات نے اس کی بے پناہ مذمت کی ہے۔ قرآن یہودیوں کے بارے میں فرماتا ہے:

"اَفَتَطۡمَعُوۡنَ اَنۡ یُّؤۡمِنُوۡا لَکُمۡ وَقَدۡ کَانَ فَرِیۡقٌ مِّنۡهُمۡ یَسۡمَعُوۡنَ کَلٰمَ اللّٰهِ ثُمَّ یُحَرِّفُوۡنَهٗ مِنۡۢ بَعۡدِ مَا عَقَلُوۡهُ وَهُمۡ یَعۡلَمُوۡنَ"[1]

''(اے مسلمانو!) کیا تم یہ توقع رکھتے ہو کہ وہ (یہودی) تم پر یقین کر لیں گے، جبکہ ان میں سے ایک گروہ کے لوگ ایسے (بھی) تھے کہ اللہ کا کلام (تورات) سنتے پھر اسے سمجھنے کے بعد (خود) بدل دیتے حالانکہ وہ خوب جانتے تھے (کہ حقیقت کیا ہے اور وہ کیا کر رہے ہیں)''

[1] سورۂ بقرہ، آیت ۷۵

https://downloadshiabooks.com/

مسلّم ہے کہ اس طرح کے افراد کبھی بھی کسی بھی حقیقت کے سامنے سرِ تسلیم خم نہیں کریں گے، یہ وہ چمگاڈریں ہیں جو سورج اور روشنی کی حقیقی دشمن ہیں، یہ ہرگز خدا پر ایمان نہیں لائیں گے۔

حدیثِ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہے:

"قَالَ اللهُ جَلَّ جَلَالُهُ: مَا آمَنَ بِي مَنْ فَسَّرَ بِرَأْيِهِ كَلَامِي" [۱]

''خداوند عالم فرماتا ہے: جو میرے کلام کی اپنی رائے کے مطابق تفسیر کرے، وہ مجھ پر ایمان نہیں لایا ہے۔''

ایک دوسری حدیث میں آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ارشاد فرماتے ہیں:

"اَشَدُّ مَا يُتَخَوَّفُ عَلَى اُمَّتِي ثَلَاثٌ: زَلَّةُ عَالِمٍ اَوْ جِدَالُ مُنَافِقٍ بِالْقُرْآنِ اَوْ دُنْيَا تَقْطَعُ رِقَابَكُمْ [۲]

''شدید ترین خطرات جو میری امت پر منڈلا رہے ہیں وہ تین ہیں: علماء کی لغزش، منافقوں کا قرآن سے استدلال کرنا (اپنی مرضی کے مطابق) اور دنیاوی خواہشات جو تمہاری گردنوں کو کاٹ ڈالے گی (تمہیں ذلت کی طرف گھسیٹے)۔''

تفسیر بالرائے کے خطرات کیا ہیں اس کے متعلق انشاءاللہ مناسب مقام پر توضیحات پیش کی جائیں گی۔

[۱] بحارالانوار، ج۸۹، ص۱۰۷

[۲] بحارالانوار، ج۸۹، ص۱۰۸

https://downloadshiabooks.com/

اٹھارہواں خطبہ

وَمِنْ كَلَامٍ لَهُ عَلَيْهِ السَّلَامُ

فِي ذَمِّ اخْتِلَافِ الْعُلَمَاءِ فِي الْفُتْيَا وَفِيهِ يَذُمُّ أَهْلَ الرَّأْيِ وَيَكِلُ أَمْرَ الْحُكْمِ فِي أُمُورِ الدِّينِ لِلْقُرْآنِ

فتویٰ کے بارے میں علماء کے درمیان اختلاف اورخود ساختہ رائے کی مذمت اورتمام دینی وشرعی مسائل کے حل کے لیےقرآن سے رجوع کرنے کاحکم ہے۔

حصہ اوّل

تَرِدُ عَلَى أَحَدِهِمُ الْقَضِيَّةُ فِي حُكْمٍ مِنَ الْأَحْكَامِ فَيَحْكُمُ فِيهَا بِرَأْيِهِ ثُمَّ تَرِدُ تِلْكَ الْقَضِيَّةُ بِعَيْنِهَا عَلَى غَيْرِهِ فَيَحْكُمُ فِيهَا بِخِلَافِ قَوْلِهِ ثُمَّ يَجْتَمِعُ الْقُضَاةُ بِذَلِكَ عِنْدَ الْإِمَامِ الَّذِي اسْتَقْضَاهُمْ فَيُصَوِّبُ آرَاءَهُمْ جَمِيعاً وَإِلَهُهُمْ وَاحِدٌ وَكِتَابُهُمْ وَاحِدٌ.

کبھی ایک مسئلہ درپیش ہوتا ہے قاضی اپنے رائے سے اس کا فیصلہ دیتا ہےاور پھر یہی قضیہ بعینہٖ دوسرے قاضی کے پاس جاتا ہےتو وہ اس کے خلاف فیصلے کر دیتا ہے۔اس کے بعد تمام قضاۃ خلیفہ کے پاس جمع ہوتے ہیں جس نے انہیں قاضی بنایا ہےتو وہ سب کی رائے کی تائید کر دیتا ہے، جب کہ سب کا خدا ایک' نبیؐ ایک اور کتاب ایک ہے۔

خطبہ، ایک نگاہ میں

بعض محققین کے عقیدے کے مطابق یہ خطبہ سابقہ خطبے کا ایک حصہ ہے،لیکن سیّد رضیؒ کے کلام میں سے بھی جدا ہے اور خطبے کا مضمون خود اس چیز کی گواہی دیتا ہے، کیونکہ گزشتہ خطبے میں ان قاضیوں کے بارے میں بیان ہوا جو نا آگاہ اور غیر صالح تھے اور وہ غلط فیصلوں کی وجہ سے لوگوں کی جان ومال کو خطرے میں ڈال دیتے تھے اور معاشرے پر اس کے غلط

https://downloadshiabooks.com/

اور بُرے اثرات رونما ہوتے تھے اور اس خطبے میں ان قاضیوں کے بارے میں کلام ہے جو کمزور دلائل، قیاس واستحسان کو بنیاد بناتے ہوئے فیصلے کرتے تھے اور غلط نتیجہ اخذ کرتے تھے۔ اور اس سے بدتر یہ کہ ان کے پیشوا، ان کی ضد ونقیض آراء، فیصلوں کو اللہ کا حکم مانتے تھے اور واقع کے مطابق سمجھتے تھے۔ پھر امام علیہ السلام نے نظریہ تصویب (یعنی قاضیوں کی آراء اور ان کے فتوے اگرچہ ان میں تضاد بھی کیوں نہ پایا جاتا ہو انہیں حکم الٰہی جاننا) کے عقیدے کو مناسب اور استدلالی طور پر باطل قرار دیتے ہیں اور حق کے حصول کی راہ کو جو کہ ایک اہم اسلامی مسئلہ ہے، بیان کرتے ہیں۔

یہ خطبہ تین حصّوں پر مشتمل ہے، پہلے حصّے میں ان قاضیوں کے بارے میں گفتگو ہے جو مسئلہ تصویب پر عمل کرتے ہوئے تمام ضد ونقیض آراء کو حکم خدا قرار دیتے ہیں، دوسرے حصّے میں آپؑ اس نظریئے کے باطل ہونے پر گفتگو فرماتے ہیں، تیسرے حصّے میں قرآن کی عظمت پر گفتگو فرماتے ہیں اور بیان کرتے ہیں کہ تمام اختلافات ومشکلات کا حل قرآن پاک میں موجود ہے۔

شرح وتفسیر

یہ تمام اختلافات کیوں ہیں؟

حضرت امام علی علیہ السلام اپنے بیان کو یوں شروع کرتے ہیں::

"تَرِدُ عَلَى اَحَدِهِمُ الْقَضِيَّةُ فِي حُكْمٍ مِنَ الْاَحْكَامِ فَيَحْكُمُ فِيهَا بِرَأْيِهِ، ثُمَّ تَرِدُ تِلْكَ الْقَضِيَّةُ بِعَيْنِهَا عَلَى غَيْرِهِ فَيَحْكُمُ فِيهَا بِخِلَافِ قَوْلِهِ"

"کبھی ایک معاملے پر قاضی اپنی رائے کے مطابق حکم دیتا ہے اور پھر اسی جیسا مسئلہ دوسرے قاضی کے سامنے پیش ہوتا ہے تو وہ پہلے کے مخالف حکم دیتا ہے۔"

"ثُمَّ يَجْتَمِعُ الْقُضَاةُ بِذَالِكَ عِنْدَ الْاِمَامِ الَّذِي اسْتَقْضَاهُمْ فَيُصَوِّبُ آرَاءَهُمْ جَمِيعاً. وَ اِلٰهُهُمْ وَاحِدٌ! وَنَبِيُّهُمْ وَاحِدٌ! وَ كِتَابُهُمْ وَاحِدٌ"

"پھر یہ قاضی (جنہوں نے ایک ہی مسئلے میں ضد ونقیض حکم دیا تھا) اپنے رہبروں کے پاس آتے ہیں، جنہوں نے انہیں منصب قضاوت پر نصب کیا تھا، وہ ان کے حکم کی تصدیق کرتے ہوئے تصویب کرتے ہیں (سب کے فتویٰ کو صحیح قرار دیتے ہیں) جبکہ ان سب کا خدا اور رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور کتاب ایک ہے (تو فتاویٰ میں اختلاف اس حد تک کہ ضد ونقیض ہوں،

https://downloadshiabooks.com/

کیوں ہے؟)''

اگرچہ یہ مسئلہ بہت سے لوگوں کے لیے حیرت انگیز ہو اور اس پر یقین کرنا مشکل ہو کہ ان ضد و نقیض آراء و حکم (سب کے سب) کو صحیح اور حکمِ خدا قرار دیتے ہیں، لیکن یہ ایک حقیقت ہے کہ مسلمانوں کا ایک گروہ بنامِ اہلِ سنّت اس عقیدے کا حامل ہے۔ اگر اس بات پر توجہ کریں کہ اہلِ سنّت اس عقیدے کی طرف کس وجہ سے مائل ہوئے (اس کو بعد میں مفصلاً بیان کریں گے) وہ اسباب کیا تھے تو اس نتیجے پر پہنچتے ہیں کہ وہ ایسی مشکل میں گرفتار تھے کہ سوائے عقیدۂ تصویب کے قائل ہونے کے کوئی اور چارہ نہ تھا۔

لیکن حضرت امام علیہ السلام آخری جملے میں اس غلط فکر پر ایک ضرب لگاتے ہوئے فرماتے ہیں: کہ یہ اس صورت میں ہے جبکہ ان کا خدا و رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور کتاب ایک ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ خدا ایک ہے تو ایک مسئلے میں اس کا حکم بھی ایک ہی ہونا چاہیے۔ وہ تمام حقیقتوں سے آگاہ ہے۔ تمام مصلحتوں اور مقاصد سے آگاہی رکھتا ہے تو اس کا حکم ایک مسئلے میں معین ہے۔ وہ نہ غلطی کرتا ہے نہ بھولتا ہے اور نہ بعد میں پشیمان ہوتا ہے اور نہ کچھ عرصے بعد کوئی شے اس کے لیے آشکار ہوتی ہے سب اس کے لیے روشن ہے تو پھر اختلافات اس کی طرف سے نہیں ہو سکتے۔

توجہ رہے کہ ان کا رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم بھی ایک ہی ہیں اور وہ تمام چیزوں میں حکم الٰہی کے مطابق معصوم ہیں۔ وہ حکم حق کو بغیر کسی کمی و زیادتی کے بیان کرتے ہیں۔ اختلافات یہاں بھی نہیں ہیں (ایک مسئلے میں) قانون اور آئین بھی ایک ہی ہے اور کتابِ الٰہی جس میں کوئی تبدیلی کوئی تحریف ہو ہی نہیں سکتی۔ یہ وحیِ حق کے ذریعے رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم تک پہنچی ہے اور سب کی دسترس میں ہے اور سب اس پر سرِ تسلیم خم کرتے ہیں، تو اس کتاب میں بھی اختلافات و تضاد کا امکان نہیں ہے۔

"وَلَوْ كَانَ مِنْ عِنْدِ غَيْرِ اللّٰهِ لَوَجَدُوْا فِيْهِ اخْتِلَافًا كَثِيْرًا"۔[1]

اور اگر یہ (قرآن) غیرِ خدا کی طرف سے (آیا) ہوتا تو یہ لوگ اس میں بہت سا اختلاف پاتے۔

پس اختلافات کتاب آسمانی کی طرف سے نہیں ہے۔ حضرت امام علی علیہ السلام کا یہ کلام دراصل مقدمہ ہے اس کلام کے لیے جو دوسرے حصے میں آئے گا۔ جہاں سے معلوم ہوگا کہ اختلافات خود ان کی غلط فکر کی وجہ سے ہیں۔ ان کے افکار کی درست سمت پر نہ ہونے کی بنا پر ایسے اختلافات پیدا ہوتے ہیں۔ دوسرے الفاظ میں یہ مسئلہ تصویب کا اجمالی جواب ہے جس کی تفصیلی شرح، امامؑ بعد کی بحث میں روشن فرمائیں گے۔

دراصل تصویب پر اعتقاد، متناقض اور متضاد آراء کا صحیح ہونا، ایک طرح کا توحید سے انحراف اور شرک کی طرف

[1] سورۂ نساء، آیت ۸۲

https://downloadshiabooks.com/

رغبت کی ایک قسم ہے۔ اُلوہیت میں توحید، خدا کو ایک ثابت کرتی ہے، نبوت میں توحید ہر زمانے میں ایک اولوالعزم نبی کے ہونے کو ثابت کرتی ہے، شریعت میں توحید، خدا کی کتاب کو ایک ثابت کرتی ہے، احکام واقعی کے متعدد ہونے کی طرف مائل ہونا سوائے شرک کے کچھ اور نہیں اور یہ توحید سے مکمل تضاد رکھتا ہے۔

نکات

مسئلۂ تصویب کیا ہے اور اس کی ابتدا

مسئلۂ تصویب اہم ترین اسلامی مسائل میں سے ایک ہے اور اس کا ربط اجتہاد، رائے، قیاس اور استحسان اور اس طرح کے مباحث سے ہے، اور نزدیکی ربط ان حادثات سے ہے جو سیاسی اور تاریخی حادثات بعد از رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم رونما ہوئے۔ یہ طولانی ہو کر ہماری بحث سے خارج نہ ہو جائے اس لیے مختصر جائزہ لیتے ہیں:

۱۔ رسول اکرمؐ کی زندگی حادثات و طوفانوں میں گھری ہوئی تھی، یہ حوادث سیاسی، سماجی اور جنگی تھے۔ مسلمانوں کے لیے مسائل کو سیکھنے کی گنجائش نہیں تھی جبکہ ان کے بنیادی اصول قرآن سے بیان ہوئے تھے۔

۲۔ رسول اکرمؐ کے بعد اسلام پھیل رہا تھا، ہر دن نئے مسائل اور احکام فقہی رونما ہو رہے تھے مسلمانوں کو بے شمار جدید مسائل کا سامنا تھا، جن کا حل احادیثِ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم میں موجود نہیں تھا، مزید یہ کہ بعض خلفا (خلیفۂ دوّم) اس امر کے مخالف ہو گئے کہ احادیثِ پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو محفوظ کیا جائے، کیوں کہ اُن کے خیال میں احادیث، قرآن کے نشر ہونے میں مزاحم ہوں گی۔ [۱]

اس وجہ سے بہت سی احادیث بالکل ناپید ہو گئیں اور مسائلِ فقہ کے حل کے لیے احادیث نہیں رہیں، فقہائے اسلام خصوصاً خلفاء مسائلِ جدیدہ میں جوابات دینے سے عاجز تھے۔ اگر یہ کہا جائے کہ اس اسلام کے پاس افراد و سماج کے لیے انصاف اور حقوق کی فراہمی کے مسائل کا حل نہیں تھا، تو یہ آیت:

[۱] مرحوم علامہ امینیؒ نے کتاب الغدیر کی جلد ۶ میں اس مسئلے کی شروح کے مدرک کے طور پر اہلِ سنّت کی اہم کتابیں جیسے سنن ابن ماجہ، سنن دارمی، مستدرک حاکم، تذکرۃ الحفاظ، کنز العمال میں نہی الخلیفۃ عن الحدیث کے عنوان کے تحت ذکر کیا ہے اور صریح طور پر بیان کیا ہے کہ حضرت عمر نے کس طرح حدیثِ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو نقل کرنے سے منع کیا ہے اور احادیث بیان کرنے والے راویوں کو مارا پیٹا جاتا تھا اور انہیں شہر بدر کر دیتے تھے، یہ بحث بہت ہی عبرت انگیز اور افسوس ناک ہے۔

https://downloadshiabooks.com/

"اَلْيَوْمَ اَكْمَلْتُ لَكُمْ دِيْنَكُمْ وَاَتْمَمْتُ عَلَيْكُمْ نِعْمَتِيْ وَرَضِيْتُ لَكُمُ الْاِسْلَامَ دِيْنًا"۔[۱]

''آج کے دین میں نے تمہارے لیے تمہارے دین کو مکمل کر دیا اور اپنی نعمتوں کو تم پر تمام کر دیا اور تمہارے لیے دینِ اسلام پر راضی ہو گیا۔'' کے ساتھ کیسے موافق ہوگا، جو آئین تمام ادیان کے ختم ہونے پر دلالت کرتا ہو اور من حیث المکان، کسی مخصوص ملک کے لیے نہیں ہے، بلکہ آئینِ اسلام جاودانی اور عالمی ہے۔ تمام زمانوں کی ضروریات کو قیامت تک پورا کرنے والا ہے ان چند اور محدود وپسندیدہ احادیث جو رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے نقل ہیں کس طرح جواب دہ ہو سکتیں ہیں؟ اس چیز کو نظر انداز نہ کریں کہ یہ مشکلات، جوابات سے عاجزی صرف اس وجہ سے ہوئی کہ مسلمانوں نے رسول اکرمؐ کی معروف حدیث ''قرآن اور اہلِ بیتؑ سے جدا نہ ہونا، اگر ایسا کیا تو ہرگز گمراہ نہ ہوگے۔''[۲] کو تسلیم نہیں کیا اور اہلِ بیتؑ کو چھوڑ دیا۔ اگر رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی وصیت پر عمل کرتے تو ان مشکلات کا شکار نہ ہوتے، کیوں کہ احادیثِ اہلِ بیتؑ احادیثِ نبوی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم جیسی ہی ہیں۔ مکتبِ اہلِ بیتؑ کے ماننے والے اس مشکل کا شکار نہیں ہوئے، کیوں ان کے پاس مسائل کے لیے احادیثِ اہل بیتؑ موجود ہیں۔ ہزاروں حدیثیں ان بزرگوار سے نقل ہیں۔ فقہاء کو اجازت ہے کہ ان میں سے ہر ایک سے اسلام کے نقطہ نظر کے مطابق مسائل فقہی بیان کئے جائیں۔

۳۔ بالآخر اہلِ سنّت کے فقہا اس مشکل سے نجات کے لیے مسئلہ قیاس، استحسان اور اجتہاد بہ معنی خاص کے مطابق قانون سازی کرنے لگے۔ اب انھوں نے مسائل کو دو حصوں میں تقسیم کر دیا: مسائلِ "منصوص" اور "غیر منصوص" (وہ مسائل جن کے لیے کتاب وسنت میں حکم بیان ہوا ہے اور وہ جن کے لیے حکم بیان نہیں ہوا) مسائل منصوص میں نص کے مطابق فتوے دیے اور غیر منصوص مسائل کے بارے میں یہ کہنے لگے، اس کا حل یہ ہے کہ اگر اس جیسا کوئی مسئلہ موجود ہے تو قیاس کرتے ہوئے اس کے مطابق فتویٰ دیں، مثلاً اگر نماز کے لیے حکم موجود ہے تو ہم روزے کا حکم نماز پر قیاس کرتے ہوئے دیں، اگر حج کے لیے حکم موجود ہے تو عمرے کا حکم اس کے مطابق دیں گے اگر شبیہ ونظیر موجود نہیں تو فقہا بیٹھیں، صلاح، فساد کو مدنظر رکھتے ہوئے قانون وضع کریں، یہ کام اجتہادِ خاص ہے۔ روشن تر تعبیر کے مطابق ایک گروہ نے واضح طور پر کہا:

''جس کے بارے میں نص موجود نہیں اس کے لیے حقیقتاً قانونِ خاص اسلام میں موجود نہیں، یہ فقہا کا کام ہے کہ وہ قانون سازی کریں اور مصالح ومفاسد کو پیش نظر رکھتے ہوئے ظن وگمان کے ذریعے حکمِ الٰہی بیان کریں، جس چیز میں

---

[۱] سورۂ مائدہ، آیت ۳

[۲] اہلِ سنّت وشیعہ دونوں کے ہاں حدیثِ ثقلین تواتر کے ساتھ موجود ہے۔ صحیح مسلم، ترمذی، مسندِ احمد، خصائص نسائی، مستدرک الصحیحین، سنن بیہقی اور اس کے علاوہ زیادہ وضاحت کے ساتھ کتاب پیامِ قرآن کی ج ۹ میں ولایت وامامتِ عامّہ در سنّت کے زیرعنوان بیان کیا گیا ہے۔

https://downloadshiabooks.com/

مصلحت نظر آئے اسے حکم الٰہی قرار دیں، اس طرح اجتہاد بھی فقیہ کی قانون سازی کی حیثیت سے رائج ہوا۔"[1]

اجتہاد کے دو مختلف معنی ہیں جن پر توجہ ضروری ہے، ورنہ متعدد غلطیوں کا شکار ہو جائیں گے:

پہلا معنی: اجتہاد کتاب و سنت اور ادلہ شرعیہ کے ذریعے استنباط سے عبارت ہے۔ تمام علمائے شیعہ اس کے قائل ہیں۔ اگرچہ اخباری علما اس کا انکار کرتے ہیں، لیکن عمل میں وہ بھی اسی کے قائل ہیں۔ اخباریوں کے بزرگ احکامِ شرعی کے اثبات کے لیے کتاب و سنّت سے استدلال کرتے ہیں اور عام و خاص و مطلق و مقید کے احکام اور اس کی مانند کی رعایت کرتے ہیں۔

دوسرا معنی: اجتہاد خاص، جن مسائل میں نص موجود نہیں، یعنی آیت و روایت نہیں ہے تو یہاں قانون سازی سے متوسل ہوتے ہیں، مصالح و مفاسد کا خیال رکھتے ہوئے اشباہ اور نظائر کا خیال کرتے ہوئے مسائل کا حکم بیان کرتے ہیں۔ یہ طریقۂ کار اکثر علمائے اہلِ سنّت کا ہے، اسے وہ اجتہاد اور رائے کے مطابق عمل کا نام دیتے ہیں۔ علمائے شیعہ اس اجتہادِ خاص کے قائل نہیں ہیں، اس لیے کہ شیعوں کے ہاں ائمہ علیہم السلام کی کثیر احادیث موجود ہیں اور نص کے نہ ہونے کا امکان بہت ہی کم ہے، اس لیے اجتہاد بہ معنی دوّم اور قانون سازی کی ضرورت نہیں ہے، کیوں کہ اس قسم کے مسائل میں قواعد کلّیہ (اصولِ فقہ و اصولِ عملیہ) کے ذریعے مسائل کو حل کیا جاتا ہے۔

تعجب انگیز بات یہ ہے کہ علمائے اہلسنت اس چیز کے بھی معتقد ہیں: "مَالَا نَصَّ فِیْہِ لَا حُکْمَ فِیْہِ" "جہاں نص موجود نہیں اور حکم وضع ہی نہیں ہوا ہے۔" وہاں علما کی ذمہ داری ہے کہ اس قسم کے مسائل میں قانون وضع کریں (اس موضوع کو سمجھنے کے لیے اس خطبے آنے والے کے حصوں پر توجہ دیں) یہ وہ چیز ہے جو شریعت کی تکمیل کے ساتھ کوئی ربط نہیں رکھتی۔

۴۔ "مَالَا نَصَّ فِیْہِ" کے مطابق اگر قانون سازی کا حق فقیہ کو دیا جائے جبکہ فقہاء کی تعداد زیادہ ہو اور ہر ایک کو قانون سازی کا حق دیا گیا ہے اور شوریٰ تشکیل دینا بھی لازمی نہ ہو، جو ایک حکم تصویب کرے، تو ایک ہی مسئلے میں متضاد آراء سامنے آئیں گے، یہاں گویا ایک اور مشکل پیش آتی ہے کہ کیا مختلف آراء کو حکم اللہ تسلیم کریں یا ایک کو حکم اللہ اور باقی کو باطل قرار دیں؟ اور جہاں ظاہراً آراء میں اختلاف نہیں ہے اور یہ آراء علما کے افکار ہیں، جہاں واقعاً حکم الٰہی موجود نہیں، وہاں کیا پیمانہ ہوگا کہ آراء صحیح ہیں یا غلط، چنانچہ سب مجبور ہوئے کہ عقیدۂ تصویب کو مانیں یا بہتر عبارت یہ ہے کہ تصویب کے گڑھے میں گر گئے اور کہنے لگے کہ فقہا کی آراء واقعی احکامِ الٰہی ہیں، خصوصاً وہ افراد جو صحابہ کی عدالت کے قائل ہیں اور ان کی

[1] الاصول العامۃ للفقہ المقارن، ص ۶۱۷

https://downloadshiabooks.com/

عدم خطا کے قائل ہیں، وہ متعدد مجتہدین کی مختلف آراء کو حکمِ واقعی شمار کرتے ہیں، ان لوگوں کا اعتقاد ہے کہ جب خلافت جیسا اہم مسئلہ اپنی تمام تر اہمیت کے باوجود امت کے اہلِ حل وعقد (دانشمندوں) پر چھوڑ دیا گیا ہے تو کوئی ممانعت نہیں کہ فروعی مسائل میں جہاں کوئی نصِ صریح موجود نہیں، قانون سازی کا حق انہی دانشمندوں کو دے دیا جائے۔ اس طرح یہ خطرناک اور مہلک عقیدۂ تصویب مسلمانوں میں رائج ہو گیا، جس کی واحد وجہ ''حدیث ثقلین'' کو فراموش کر دینا تھا۔

اجتہاد کے دروازے کو بند کر دینا

اس مسئلے کے سبب اسلامی معاشرے اور فقہا کے درمیان متضاد ومختلف عقائد پیدا ہوئے اور ایسی صورت سامنے آئی کہ لوگ دینی مسائل میں تذبذب کا شکار ہوئے اور دشمنوں کی زبانیں کھلنے لگیں اور احکامات اسلامی اور مسلمانوں کے متعلق منفی باتیں ہونے لگیں، اس صورتحال میں ایک گروہ کھڑا ہوا اور اس نے اجتہاد کے دروازے کو بند کر دیا جو ایک اور بُرا کام تھا کہتے تھے کہ اتنا کافی ہے اب کسی کو اجتہاد کرنے کا حق نہیں ہے، کیوں کہ لوگ احکام شرعی میں مختلف فرقوں میں تقسیم ہو گئے تھے اور ہر گروہ اپنے عالم کی پیروی کرتا تھا اس لیے ''ابوحنیفہ، مالک، محمد بن ادریس شافعی، اور احمد حنبل'' کو منتخب کیا اور لوگوں کو پابند کیا گیا کہ ان چاروں میں سے کسی ایک کی پیروی کریں اور ان چار کے علاوہ کسی اور کے عقائد وآراء کو باطل قرار دیا تا کہ اختلافات سے بچا جا سکے، حالانکہ ان چاروں پر انحصار سے متعلق بھی کتاب وسنّت سے کوئی دلیل موجود نہیں ہے اور نہ ہی ان کے لیے وجہِ امتیاز پایا جاتا ہے۔

سوائے اس کے کہ ان کے پیروکاروں کی تعداد زیادہ ہے، اجتہاد کے دروازے کو بند کرنے پر کوئی اور دلیل نہیں اور حقِ اجتہاد ان چاروں کے لیے مخصوص کرنے پر بھی کوئی دلیل نہیں اور اجتہاد صرف ایک خاص زمانے تک کے لیے کھلا رہا، اس پر کوئی دلیل نہیں۔ حضرت امام علی علیہ السلام سولہویں خطبے میں فرماتے ہیں: خطا وگناہ سرکشی کی سواری ہے، جو انسان کو ایک پُرخطر وادی سے دوسری پُرخطر وادی کی طرف لے جاتی ہے۔ یہ ایک غلطی جو انہوں نے پہلے دن کی تھی، اس کی وجہ سے دوسری غلطیوں کا شکار ہیں اور ان غلطیوں اور اشتباہات کا تسلسل اب تک موجود ہے۔ اجتہاد کو بند کرنا اہلِ سنّت کے فقہا کے لیے ایک بہت بڑی مشکل کی صورت اختیار کر گئی ہے۔ انہیں بہت سارے ایسے نئے مسائل کا سامنا کرنا پڑا جن کا حل موجود نہیں تھا اور ان کا حکم بھی چاروں مذاہب میں موجود نہیں، اس وجہ سے بعض گروہ کھلم کھلا اور بعض نے خفیہ طریقے سے اس مسئلے کی مخالفت کی اور اجتہاد کے دروازے کو کھولنے کی طرف مائل ہوئے۔ چار فقہا پر انحصار نہ کیا جائے، یعنی آج فتویٰ دیا جائے اور پچھلے فتویٰ پر نظرثانی کی جائے۔

https://downloadshiabooks.com/

یہ سوال اُٹھایا گیا کہ کیوں اجتہاد صرف ان چاروں کے لیے مخصوص ہو، جب کہ آج ان سے بڑھ کر علما و دانش مند موجود ہیں اور اگر فرض کرلیں کہ ان سے برتر نہیں، پھر بھی جدید فقہی مسائل کا جواب کون دے گا، لیکن اہلِ بیتؑ کے ماننے والے ان طوفانوں کے مقابل کامیاب ہوئے، کیونکہ اجتہاد کا دروازہ انھوں نے بند نہیں کیا، تمام فقہا کو حق دیا کہ دینی مسائل میں استنباط کریں لیکن یہ اجتہاد میں بمعنی دوّم اور قانون سازی کے قائل نہیں ہیں۔

سوال: یہاں سوال یہ سامنے آتا ہے کہ اجتہاد بمعنی اوّل کی وجہ سے بھی اختلافات وجود میں آتے ہیں تو کیا اجتہاد اوّل و دوّم میں کوئی خاص فرق نہیں؟

جواب: ایک نکتے کی طرف توجہ کریں تو جواب مل جائے گا، وہ نکتہ یہ ہے کہ اجتہاد بمعنی استنباط احکام کتاب و سنّت سے، جن کا محور اصلی نصوصِ کتاب و سنّت ہیں اور تمام فقہا ان کے گرد جمع ہیں۔ ایک وحدت ان سب کے درمیان موجود ہے اگرچہ کتاب و سنّت سے اخذ کرنے کی صلاحیت مختلف ہے، اس لیے ایسے مسائل میں فقہاء کے درمیان زیادہ اختلافات نظر نہیں آتے، اسی بنا پر اکثر فقہاء میں ایک ہی نظریہ پایا جاتا ہے، اگرچہ جزوی امور میں اختلاف ممکن ہے، لیکن اجتہاد بمعنی دوّم میں کوئی خاص محور نہیں، جس کے گرد مجتہد جمع ہوسکیں، ہر کسی کا معیار اس کی اپنی فکر اور رائے ہے جس کی وجہ سے اختلاف بہت زیادہ ہوتے ہیں۔ ممکن ہے ایک مسئلے میں بہت ساری مختلف آراء پائی جائیں کہ اسلامی معاشرہ کے چہرے کو مکمل طور پر داغ دار کیا جائے، اجتہاد بمعنی استنباط کتاب و سنّت کے قائلین کہتے ہیں: دینِ خدا کبھی بھی ناقص نہیں تھا اور نہ ہے۔ آج کل اور قیامت تک پیدا ہونے والے مسائل جو مسلمانوں کے درمیان پیدا ہوتے رہیں گے۔ ہر زمانے میں مسئلے کا حکم الٰہی موجود تھا جو عمومات، اطلاقات یا ادلّہ خاص کتاب و سنّت میں موجود تھا اور معصوم ائمہ علیہم السلام کے کلام سے واضح تھا، جو بھی اجتہاد کے ذریعے اس حکمِ الٰہی تک رسائی پیدا کرتا ہے، وہ راہِ ثواب کو پا گیا اور جو نہ پہنچ سکا اس نے خطا کی۔ اگر اس نے مقدماتِ اجتہاد میں غلطی نہیں کی تو وہ خدا کے نزدیک اجر کا مستحق ہوگا اور وہ معذور بھی ہے۔ تصویب کے مقابل خطا کا عقیدہ بھی یہی ہے۔

اس عقیدے کو ماننے والے کہتے ہیں:

لِلْمُصِیْبِ اَجْرَانِ وَلِلْمُخْطِیِٔ اَجْرٌ وَاحِدٌ

''جو حکم واقعی تک پہنچ گیا اس کو دو اجر ملیں گے، جس سے خطا ہوئی اور وہ مقصر نہیں ہے، اسے ایک اجر ملے گا۔''

جبکہ وہ لوگ جو اجتہاد میں بھی قانون سازی کے قائل ہیں، کہتے ہیں:

''کُلُّ مُجْتَہِدٍ مُصِیْبٌ''

''ہر مجتہد کا حکمِ واقعی ہے۔'' تمام مجتہدین کے احکام جو ان کی (متضاد و نقیض) رائے کے مطابق ہیں، حکمِ الٰہی کے

https://downloadshiabooks.com/

مطابق ہیں (غور کیجیے)

عقیدۂ تصویب اور اجتہاد کا دروازہ بند کرنے کے نتائج

عقیدۂ تصویب اور اجتہاد میں قانون سازی کی وجہ سے جو مفاسد رونما ہوئے وہ بہت زیادہ ہیں، مگر یہاں چند کی طرف اشارہ کرتے ہیں:

۱۔ فقہاء اور خطا کار افکار کے افکار میں افراط و تفریط کی وجہ سے (العیاذ باللہ) دین کے ناقص ہونے کا اعتراف۔

۲۔ اجتہاد کا دروازہ بند کر دینا یعنی اس بات پر عقیدہ رکھنا کہ اہلِ سنت کے چاروں فقہاء کے علاوہ کسی کو اجتہاد کا حق حاصل نہیں۔ اس خیال سے کہ اگر دروازۂ اجتہاد کھول دیں تو مختلف آراء مختلف طور پر سامنے آئیں گی اور ہم جانتے ہیں کہ آنے والے مسائل میں فقہاءِ اسلام اور مسلمانانِ عالم کے لیے احکامِ شرعی کے دروازے بند کر دیئے گئے۔

اُدھر چار مذاہب کی تاریخ درد انگیز ہے، تاریخ بتاتی ہے کہ اس بدعت سے جو اس سے قبل اسلام میں نہیں تھی، اس نے فقہا کے استقلال کو سلب کر دیا اور وہ حادثات کا شکار ہو گئے۔ مقریزی اپنی کتاب ''الخطط المقریزیہ'' میں لکھتا ہے کہ ابن فوطی اور دوسرے لکھنے والوں نے لکھا کہ ان چاروں فقہا کے انتخاب میں کوئی قانون نہیں تھا، مگر مذاہبِ فقہی کی کثرت نے حکمرانوں کو پریشان کر دیا تھا، جس کی وجہ سے اختلافات بہت بڑھ چکے تھے، دوسری طرف یہ چار فقہی مسالک سیاسی وجوہات کی بنیاد پر بہت زیادہ پھیل گئے تھے، جس کی وجہ سے ان کو ختم کرنا ناممکن ہو گیا تھا جس طرح مذاہب کی کثرت مشکلات میں اضافے کا سبب بنتے تھے، اس لیے فقہاء اور حکام نے طے کیا کہ اب جو بھی ان چار مسالک سے ہٹ کر بات کرے اس کا مقابلہ کیا جائے گا۔ حیرت اس بات پر ہے کہ یہ واقعہ ساتویں قرن میں رونما ہوا۔

مصر میں سال ۶۶۵ھ ق، بغداد میں سال ۶۳۱ھ ق، میں ہوا جبکہ سال ۶۴۵ھ ق، میں مدرسۂ مستنصریہ کے معلّموں نے پختہ ارادہ کیا کہ ان چار مذاہب کے علاوہ سب کی تحریم کی جائے گی، اس طرح اسلام کے ظہور کے ساتویں صدی کے بعد اجتہاد کے دروازے بند کر دیئے گئے اور تمام فقہاء ان چاروں کے پیرو ہو گئے، اور اپنے استقلال فقہی کو کھو دیا۔ یہ سب کچھ صرف اس انحراف کی وجہ سے ہوا جو پہلے قرن میں رونما ہوا تھا یعنی قرآن و اہلِ بیتؑ جو دو ثقلِ عظیم تھے، ان کو چھوڑا گیا اور اجتہاد بالرائے، قیاس و استحصان کے دروازوں کو کھول دیا گیا اور تمام آراء ضد و نقیض اور حرج و مرج سے پُر ہو کر ظاہر ہوا، ان سب کو حکم اللہ قرار دیا گیا۔ نہایت ہی افسوس کی بات یہ ہے کہ مکتبِ اہلِ بیت علیہم السلام کو ان چار مذاہب کے ساتھ نہیں رکھا گیا۔ درحقیقت یہ پہلا انحراف اس بُری بدعت کے پیدا ہونے کا سبب ہوا ایسی بدعت کہ جس کے سوا کوئی چارہ

https://downloadshiabooks.com/

کار نہیں تھا۔ [۱]

۳۔ایک ہی مسئلے میں کئی مجتہدین کے آراء کی وجہ سے فقہی و قضائی امور میں ھرج و مرج وجود میں آیا البتہ اختلاف و مشکلات ہمارے زمانے میں زیادہ ہیں۔مگر کیوں کہ عام قانون سازی کے لیے ایک ملک کے کئی نمائندے ایک جگہ جمع ہوتے ہیں اور کثرتِ رائے سے ایک قانون کو ایک مدت کے لیے تسلیم کرتے ہیں، جب کہ اجتہاد بالرائے وتصویب ہر ''فقیہ'' کو اجازت دیتا ہے کہ وہ تنہا قانون سازی کرے، اور عجیب تر یہ کہ اس کی رائے حکم اللہ ہے، جبکہ قانون ساز اداروں میں جو حکم کثرت آراء سے مانا جاتا ہے وہ حکم، بشری ہے، مجتہد کے پیروکار مجبور ہیں فقیہ کے حکم کو مانیں اور حکم الٰہی کے طور پر اطاعت و پیروی کریں۔ مسئلہ تصویب کی توضیح کی وجہ سے ہم اصل گفتگو سے کچھ دور ہو گئے لیکن چونکہ مسئلہ اہم تھا اس لیے روشنی ڈالنا ضروری سمجھا، آئندہ خطبے مین مزید وضاحت کی جائے گی جبکہ اس اہم اسلامی مسئلے کی مزید توضیح کے لیے کتب کی طرف رجوع کریں۔ [۲]

دوسرا حصہ

اَفَأَمَرَهُمُ اللهُ سُبْحَانَهُ بِالِاخْتِلَافِ فَأَطَاعُوهُ اَمْ نَهَاهُمْ عَنْهُ فَعَصَوْهُ اَمْ اَنْزَلَ اللهُ سُبْحَانَهُ دِيناً نَاقِصاً فَاسْتَعَانَ بِهِمْ عَلَى اِتْمَامِهِ اَمْ كَانُوا شُرَكَاءَ لَهُ فَلَهُمْ اَنْ يَقُولُوا وَ عَلَيْهِ اَنْ يَرْضَى اَمْ اَنْزَلَ اللهُ سُبْحَانَهُ دِيناً تَامّاً فَقَصَّرَ الرَّسُولُ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم عَنْ تَبْلِيغِهِ وَ اَدَائِهِ وَ اللهُ سُبْحَانَهُ يَقُولُ مَا فَرَّطْنَا فِي الْكِتَابِ مِنْ شَيْءٍ وَ فِيهِ تِبْيَانٌ لِكُلِّ شَيْءٍ وَ ذَكَرَ اَنَّ الْكِتَابَ يُصَدِّقُ بَعْضُهُ بَعْضاً وَ اَنَّهُ لَا اخْتِلَافَ فِيهِ فَقَالَ سُبْحَانَهُ وَلَوْ كَانَ مِنْ عِنْدِ غَيْرِ اللهِ لَوَجَدُوا فِيهِ اخْتِلَافاً كَثِيراً.

''تو کیا خدا ہی نے انہیں اختلاف کا حکم دیا ہے اور یہ اُسی کی اطاعت کر رہے ہیں یا اس نے انہیں اختلاف سے منع کیا ہے، مگر پھر بھی اس کی مخالفت کر رہے ہیں؟ یا خدا نے دین ناقص نازل کیا ہے اور ان سے اس کی تکمیل کے لیے مدد مانگی ہے یا یہ سب خود اس کی خدائی ہی میں شریک ہیں اور انہیں یہ حق حاصل ہے کہ یہ بات کہیں اور خدا کا فرض ہے کہ وہ قبول کرے یا خدا نے دین کامل نازل کیا تھا اور رسول اکرمؐ نے اس کی تبلیغ اور ادائیگی میں کوتاہی کر دی ہے، جب کہ اُس کا اعلان ہے کہ ہم نے کتاب میں کسی طرح کی کوتاہی نہیں کی ہے اور اس میں ہر شے کا بیان موجود ہے۔اور یہ بھی بتا دیا ہے کہ اس کا

---

[۱] مزید معلومات کے لیے'' توضیح الرشاد فی تاریخ عصر الاجتہاد'' جو آقا بزرگ تہرانی کی ہے، سے رجوع کریں۔

[۲] انوار الاصول، جلد ۲، ص ۵۱۹ تا ۵۴۳، جلد ۳، ص ۲ ۶۳ تا ۶۵۸، المستصفی معصف غزالی، جلد ۲، ص ۴ ۳ ۲۳، اصول العامۃ للفقہ المقارن، ص ۳۰۵ تا ۶۱۷۔

ایک حصہ دوسرے کی تصدیق کرتا ہے اوراس میں کسی طرح کا اختلاف نہیں ہے۔ یہ قرآن غیر خدا کی طرف سے ہوتا تو اس میں بے پناہ اختلاف ہوتا۔‘‘

شرح وتفسیر

ان اختلافات کی توجیہہ نہیں کی جاسکتی

"وَ ذَكَرَ اَنَّ الْكِتَابَ يُصَدِّقُ بَعْضُهُ بَعْضًا، وَ اَنَّهُ لَا اخْتِلَافَ فِيهِ فَقَالَ سُبْحَانَهُ: وَلَوْ كَانَ مِنْ عِنْدِ غَيْرِ اللّٰهِ لَوَجَدُوا فِيهِ اخْتِلَافًا كَثِيرًا"

’’یہ بھی بتادیا ہے کہ اس کا ایک حصہ دوسرے کی تصدیق کرتا ہے اوراس میں کسی طرح کا اختلاف نہیں ہے اور اگر یہ (قرآن) غیرِ خدا کی طرف سے (آیا) ہوتا تو یہ لوگ اس میں بہت سا اختلاف پاتے۔‘‘

حضرت امام علی علیہ السلام اس حصہ میں اپنے کلام میں محکم استدلال کے ذریعے اجتہاد بالرائے اور فقہاء کی تصویب (فقہاء کی قانون سازی پر خطِ بطلان کھینچتے ہیں۔ اور ایک دقیق تقسیم کے ساتھ، جو کہ پانچ اہم ستونوں پر استوار ہے، فرار کے تمام راستے بند کردیتے ہیں اوراس طرزِ فکر کے صحیح نہ ہونے کی روشن طریقے سے وضاحت کرتے ہیں۔

پہلے مرحلے میں فرماتے ہیں کہ ان فقہی مسائل میں ان تمام مخالف آراء کا بنیادی سرچشمہ کیا ہے:

"اَفَاَمَرَهُمُ اللّٰهُ سُبْحَانَهُ بِالْاِخْتِلَافِ فَاَطَاعُوهُ"

’’کیا خدا نے انہیں اختلافات کا حکم دیا ہے، اورانہوں نے اس کے فرمان کی اطاعت کی؟‘‘

یقیناً ایسا ممکن نہیں ہے، اس لیے کہ خداوند یکتا ہے، اُس نے ہمیشہ وحدت کی طرف دعوت دی ہے، تفرقے سے دور رہنے کو کہا ہے۔

وَاعْتَصِمُوا بِحَبْلِ اللّٰهِ جَمِيعًا وَلَا تَفَرَّقُوا

’’خدا کی رسی کو مضبوطی سے تھام لو اور تفرقہ میں نہ پڑو۔‘‘[1]

اختلافات کہیں اور سے ابھرا ہے، اسی لیے دوسرے مرحلے میں فرماتے ہیں:

"اَمْ نَهَاهُمْ عَنْهُ فَعَصَوْهُ"

[1] سورۂ آل عمران، آیت ۱۰۳

https://downloadshiabooks.com/

''کیا خدا نے ان کو اختلاف سے منع تھا اور انھوں نے گناہ کیا؟''

یقیناً یہی اصل سرچشمۂ اختلاف ہے، لیکن قاضی جو ایک مسئلے میں مختلف آراء رکھتے ہیں، اس احتمال کو قبول نہیں کرتے پس اس سوال کے مقابلے میں اُن کا جواب نفی میں ہے۔

تیسرے مرحلے میں فرماتے ہیں:

"اَمۡ اَنۡزَلَ اللّٰهُ سُبۡحَانَهٗ دِيۡنًا نَاقِصًا فَاسۡتَعَانَ بِهِمۡ عَلٰى اِتۡمَامِهٖ"

''کیا خدا نے دین کو ناقص نازل کیا ہے اور اس کی تکمیل میں ان سے مدد لی ہے۔''

ظاہر ہے کہ کوئی مسلمان ایسا نہیں کہہ سکتا کہ خدا نے دین ناقص نازل فرمایا اور لوگوں سے اس کی تکمیل کے لیے مدد لی ہو۔ قرآن اس کے برعکس کہہ رہا ہے:

"اَلۡيَوۡمَ اَكۡمَلۡتُ لَكُمۡ دِيۡنَكُمۡ وَاَتۡمَمۡتُ عَلَيۡكُمۡ نِعۡمَتِىۡ وَرَضِيۡتُ لَكُمُ الۡاِسۡلَامَ دِيۡنًا"

''آج تمہارا دین کامل کر دیا اپنی نعمت کو تم پر تمام کیا، اسلام سے ایک جاوید آئین کے طور پر راضی ہو گیا۔''

پھر چوتھے مرحلے کہ جس کا باطل ہونا روز روشن کی طرح عیاں ہے، میں فرماتے ہیں:

"اَمۡ كَانُوۡا شُرَكَآءَ لَهٗ، فَلَهُمۡ اَنۡ يَّقُوۡلُوۡا، وَعَلَيۡهِ اَنۡ يَّرۡضٰى"

''کیا یہ خدا کے شریک ہیں اور یہ حق رکھتے ہیں کہ جو کچھ کہیں (حکم صادر کریں، قانون سازی کریں) خدا پر لازم ہے اس کی منظوری دے۔''

ظاہر ہے جو متعدد خداؤں کا قائل ہوگا، ہر ایک خدا کے لیے قانون سازی اور صدورِ حکم کا قائل بھی ہوگا۔ کیا ایسا ممکن ہے کہ جو مسلمان توحید پرست اور تمام اصول و فروع اسی توحید سے استفادہ کرے وہ شرک کا شکار ہو جائے اور فقہاء کو خدا کا شریک قرار دے۔

دوسرے الفاظ میں توحید کی اقسام میں (توحیدِ ذات و صفات کے بعد) توحید افعال بھی ہے، توحید حاکمیت بھی ہے توحیدِ قانون سازی بھی ہے، اس بنا پر ہر شے جو بھی ان امور کے متعلق ہو، وہ خدا کی طرف پلٹے گی، ہر حکم اسی خدا کا حکم اور ہر فرمان اسی خدا کا فرمان ہے، یقیناً خدا کا فرمان ایسا نہیں کہ وہ قوانین کا کچھ حصّہ خود بیان کرے اور کچھ انسانوں کو بیان کرنے کے لیے دے دے، آیا خدا کے علاوہ ممکن ہے کہ وہ مفاسد و مصالح سے آگاہ ہو، آیا ممکن ہے خدا بندوں کو ان کے حال پر چھوڑ دے کہ وہ خود قانون سازی کریں جو ظن و گمان اور اپنی شخصی رائے کے مطابق حکم دیتے ہوں اور ضد و نقیض باتوں میں لوگوں کو پریشان کر دیں۔ پھر آخری احتمال کی جانب توجہ مبذول کراتے ہوئے فرماتے ہیں:

https://downloadshiabooks.com/

پانچویں مرحلے میں فرماتے ہیں:

"اَمْ اَنْزَلَ اللّٰهُ سُبْحَانَهُ دِيْنًا تَامًّا فَقَصَّرَ الرَّسُوْلُ (صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَآلِهِ وَسَلَّمَ) عَنْ تَبْلِيْغِهٖ وَ اَدَائِهٖ"

''یا خدا نے دین کو کامل نازل کیا اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اس کی تبلیغ میں کوتاہی کی ہو۔''

واضح ہے کوئی بھی مسلمان پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے متعلق ایسا عقیدہ نہیں رکھتا کیوں کہ جو افراد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے متعلق عصمت کو کاملاً قبول نہیں کرتے اور آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے معصوم ہونے پر دلائل کو ہر جگہ اور ہر چیز میں کافی نہیں سمجھتے وہ بھی تبلیغ اور وحی کے پہنچانے میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی عصمت کے قائل ہیں، کیونکہ اگر معصوم نہ مانیں تو نبوت و رسالت کا مفہوم باقی نہیں رہتا اور نقضِ غرض (رسالت و نبوت) لازم آتی ہے، پھر امام اصل مسئلے کی طرف پلٹتے ہیں اور اس حقیقت کو واضح کرتے ہیں کہ اسلام نے تمام انسانوں کی ضروریات (جو احکام ان کے لیے ضروری تھے) کو وضاحت سے بیان کر دیا ہے، اس بنا پر

"مَا لَا نَصَّ فِيْهِ لَا حُكْمَ فِيْهِ"

جس بارے میں نص نہیں، حکم نہیں ہے، کو ان سے چھین لیتے ہیں یعنی یہ عقیدہ ان کا صحیح نہیں، ہر شے مذکور ہے، آپؑ فرماتے ہیں، اللہ فرماتا ہے:

"مَا فَرَّطْنَا فِي الْكِتَابِ مِنْ شَيْءٍ ○ وَفِيْهِ تِبْيَانٌ لِكُلِّ شَيْءٍ" [1]

''ہم نے کتاب (قرآن) میں کوئی بات فروگزاشت نہیں کی ہے اور تمام چیزوں کا بیان قرآن میں ہے۔''

یہ دو آیات گواہ ہیں کہ خدا نے دین کو ناقص نازل نہیں کیا۔ کسی سے تکمیلِ دین کے لیے مدد طلب نہیں کی ہے۔ بلکہ تمام ضروری چیزیں قرآن میں بیان کر دی گئی ہیں، جزئیاتِ قرآن و احکام خاصہ کی شرح آئندہ آئے گی، پھر اس حربے کو ان قاضیوں سے لے لیا جو ضد و نقیض آراء دیتے ہیں اور جہاں ممکن ہوا ایسی آیات سے استفادہ کیا، جن کا مفہوم دوسری آیات سے مختلف ہو۔

آپؑ اضافہ فرماتے ہیں:

"وَذَكَرَ اَنَّ الْكِتَابَ يُصَدِّقُ بَعْضُهُ بَعْضًا وَاَنَّهُ لَا اخْتِلَافَ فِيْهِ"

''اللہ نے فرمایا ہے، قرآن کا ایک حصہ دوسرے کی تصدیق کرتا ہے، اور یہ کہ اس میں کوئی اختلاف موجود نہیں۔''

---

[1] توجہ کریں جملہ ''ما فرطنا فی الکتاب ین شئی'' وہی چیز ہے جو سورۂ انعام آیت ۳۸ میں آیا ہے۔ جملہ دوّم ''فِيْهِ تِبْيَانٌ لِكُلِّ شَيْءٍ'' سورۂ نحل آیت ۸۹ کا مضمون ہے، فرماتے ہیں: ''نَزَّلْنَا عَلَيْكَ ... تِبْيَانًا لِكُلِّ شَيْءٍ'' نہ یہ کہ وہی جملہ ہو۔

https://downloadshiabooks.com/

خداوند عالم فرماتا ہے:

"وَلَوْ كَانَ مِنْ عِنْدِ غَيْرِ اللّٰهِ لَوَجَدُوْا فِيْهِ اخْتِلَافًا كَثِيْرًا"[1]

قرآنی آیات میں کسی کا اختلاف نہ ہونے پر، خود قرآن سے ہی اس گفتگو کو مکمل کرنے اور روشن دلیل بیان کرنے کے بعد خدا کا فرمان ہے: "اگر یہ کتاب غیرِ خدا کی طرف سے ہوتی تو تم اس میں کثیر اختلافات پاتے۔"

یہ بات روشن ہے کہ انسانوں کا علم محدود ہے زمانے کے گزرنے، حالات کے بدل جانے سے ان کے افکار میں تبدیلی آتی ہے، اس طرح ممکن ہے ایک لکھنے والے اور کہنے والے نے اپنی زندگی میں ضد و نقیض باتیں کی ہوں، اس کا ایسا کرنا اس کے محدود علم پر دلالت کرتا ہے، افکار میں تکامل زمانے کے گزرنے سے حاصل ہوا، دوسرے لحاظ سے انسان بھول جاتا ہے، کتنے مطالب آج کہتا ہے اور کل یا ایک مہینہ یا ایک سال بعد بھول جاتا ہے اور اس کے خلاف جو کہا ہوتا ہے، بات کرتا ہے، لیکن خدا تمام چیزوں کا عالم ہے گزشتہ کا بھی اور آئندہ کو بھی جانتا ہے۔

وَمَا كَانَ وَمَا يَكُوْنُ

زمانہ کوئی تبدیلی اُس میں نہیں لاتا، وہ زمان و مکاں سے بالاتر ہے، بھول کا وہاں تصور ہی نہیں؛ پھر کس طرح ممکن ہے کہ اس کے کلام میں ضد و نقیض باتیں پائی جائیں۔

جو باتیں بیان ہوئیں، اُن کی روشنی میں اب ہم نتیجہ نکال سکتے ہیں کہ حضرت امام علی علیہ السلام نے بہترین و مدلل انداز میں مسئلہ تصویب، قیاس، استحسان، اجتہاد بہ رائے کو باطل قرار دیا اور ان کے ماننے والوں کے لیے کوئی راستہ نہیں چھوڑا، خدا نے دین کامل نازل کیا، قرآن انسان کی ضروریات کو بیان کرتا ہے، رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے تبلیغ میں کوئی کوتاہی نہیں کی، خدا نے اختلافات کو امت اسلامی کے لیے پسند و قبول نہیں فرمایا، سب جگہ اتحاد کی دعوت دی ہے، اس بنا پر اس پر اعتقاد رکھنا کہ تصویب، متناقض آراء اور مختلف فتاویٰ سب حکمِ واقعی خدا ہیں، یہ ایک انحراف و گمراہی ہے نہ کہ حقیقت و واقعیت۔

نکتہ

قرآن میں کس طرح ضرورت کی تمام چیزیں موجود ہیں

جس طرح اس خطبے میں تاکید کی گئی کہ قرآن متعدد آیات میں صراحت کے ساتھ بیان کر رہا ہے کہ انسان قیامت

[1] سورۂ نساء، آیت ۸۲

https://downloadshiabooks.com/

تک اس قرآن کا نیازمند ہے اور احادیث بیان کرتی ہیں، امام صادق علیہ السلام فرماتے ہیں:

اِنَّ اللّٰہَ تَبَارَكَ وَتَعَالٰی اَنْزَلَ فِی الْقُرْآنِ تِبْیَانَ کُلِّ شَیْءٍ حَتّٰی وَاللّٰہِ مَا تَرَكَ شَیْئًا تَحْتَاجُ اِلَیْہِ الْعِبَادُ، حَتّٰی لَا یَسْتَطِیْعَ عَبْدٌ یَقُوْلُ لَوْ کَانَ ھٰذَا، اُنْزِلَ فِی الْقُرْآنِ، اَلَا وَقَدْ اَنْزَلَہُ اللّٰہُ فِیْہِ"

''خداوندعالم نے ہر چیز قرآن میں بیان کردی؛ خدا کی قسم کوئی ضروری چیز ایسی نہیں جس کو بیان نہ کیا ہو، تاکہ کوئی نہ کہہ سکے کہ اگر فلاں مطلب صحیح ہے تو قرآن میں آتا، آگاہ ہوجاؤ تمام ضروریاتِ انسان قرآن میں بیان ہوگئی ہیں۔'' [۱]

سوال: یہاں ایک سوال پیش آتا ہے کہ ہم مختلف احکامات کو دیکھتے ہیں جو قرآن میں نہیں بیان ہوئے، آیا یہ قرآن کی جامعیّت کے ساتھ سازگار ہے؟ مثلاً نماز کی رکعتوں کی تعداد، وہ اجناس جن پر زکوٰۃ واجب ہے، نصابِ زکوٰۃ، مناسکِ حج، صفا و مروہ کتنے چکر لگانے ہیں، طواف اور دوسرے مسائل جو حدود اور دیات سے تعلق رکھتے ہیں، آداب قضاوت، شرائط معاملات، انواعِ معاملات مستحدثہ، اسی طرح دوسرے مسائل قرآن نے بیان نہیں کیے۔

جواب: اس سوال کے جواب کے لیے تین نکات کی طرف توجہ دیں:

۱۔ قرآن میں کلّی احکام، قواعد، عمومات، اطلاقات بیان ہوئے ہیں، چنانچہ بہت ساری مشکلات کو ان کے ذریعے حل کرسکتے ہیں، مثال کے طور پر معاملات میں:

"اَوْفُوْا بِالْعُقُوْدِ" [۲]

''اپنے اقراروں کو پورا کرو۔''

اور عبادات میں:

"وَمَا جَعَلَ عَلَیْکُمْ فِی الدِّیْنِ مِنْ حَرَجٍ" [۳]

''اور (اللہ نے) امور دین میں تم پر کوئی سختی نہیں کی۔''

اور حقوق والدین میں:

وَلَا تُضَآرَّ وَالِدَةٌۢ بِوَلَدِھَا وَلَا مَوْلُوْدٌ لَّہٗ بِوَلَدِہٖ" [۴]

---

[۱] تفسیر نور الثقلین، جلد ۳، ص ۷۴، اصول کافی، جلد ۱، ص ۵۹، اسی روایت میں دو احتمال دیئے گئے ہیں، اوّل تو شرطیہ ہے دوّم تمنا ہے اور الا کبھی الا استثنائیہ کبھی برائے تنبیہ کہا گیا، مرآۃ العقول جلد ۱، ص ۲۰۲ پر رجوع کریں۔

[۲] سورۂ مائدہ، آیت ۱

[۳] سورۂ حج، آیت ۷۸

[۴] سورۂ بقرہ، آیت ۲۳۳

https://downloadshiabooks.com/

''نہ ماں کا اس کے بچے کی وجہ سے نقصان گوارا کیا جائے اور نہ جس (باپ) کا لڑکا ہے اس کا۔''

اس طرح دوسری آیات بہت سارے سوالات اور درپیش مسائل کا جواب دے رہی ہیں۔

۲۔ قرآن نے صراحتاً احکام الٰہی اور معارف اسلامی کا اصلی منبع سنت پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو قرار دیا ہے:

"مَآ اٰتٰىكُمُ الرَّسُوْلُ فَخُذُوْهُ وَمَا نَهٰىكُمْ عَنْهُ فَانْتَهُوْا"

''رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم جو دیں لے لو، جس سے روکیں رک جاؤ۔''[1]

دوسری جگہ پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا، بیان کرنے والا اور قرآن کے شارح کے طور پر تعارف کرایا ہے:

"وَاَنْزَلْنَآ اِلَيْكَ الذِّكْرَ لِتُبَيِّنَ لِلنَّاسِ مَا نُزِّلَ اِلَيْهِمْ"[2]

''اور تمہارے پاس قران نازل کیا ہے تاکہ جو احکام لوگوں کے لیے نازل کیے گئے ہیں تم ان سے صاف صاف بیان کردو۔''

رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے حدیثِ ثقلین میں قرآن واہلِ بیتؑ کو احکامِ شرعی ومعارفِ اسلامی کے لیے ایک مطمئن منبع قرار دیا۔ اگر رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے اس قول پر عمل ہوجاتا تو یقیناً کوئی بھی سوال ایسا نہ ہوتا جس کا جواب نہ دیا جاسکتا ہو۔

۳۔ مختلف روایات سے استفادہ ہوتا ہے کہ قرآن کا ظاہر و باطن ہے۔ ظاہری معنی ومفہوم وہ ہیں جو ہر انسان کی دسترس میں ہیں، جن سے وہ بہرہ مند ہو رہا ہے۔ لیکن باطن کے معنی ومفہوم دوسرے ہیں، جو صرف رسولؐ اور اہلِ بیتِ رسول علیہم السلام کے اختیار میں ہیں۔ معصومینؑ اپنے غیر معمولی فہم کے ذریعے آیات کو سمجھتے ہیں اور ان سے استفادہ کرتے ہیں۔ حدیث ثقلین کے مطابق قرآن واہل بیت علیہم السلام کو ایک دوسرے کے ساتھ رکھا ہے، لوگ جدا نہ کردیں۔ اس مفہوم قرآنی سے وسیع راستے کھلتے ہیں، جن سے فائدہ اٹھانا چاہیے۔ اہل بیت علیہم السلام کے سائے میں قرآن سے بہرہ مند ہوں، جیسا کہ حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام کی مشہور حدیث ہے:

"اَنَا اَعْلَمُ كِتَابَ اللهِ وَفِيهِ بَدْءُ الْخَلْقِ وَمَا هُوَ كَائِنٌ اِلٰى يَوْمِ الْقِيَامَةِ وَفِيْهِ خَبَرُ السَّمَاءِ وَخَبَرُ الْاَرْضِ وَخَبَرُ الْجَنَّةِ وَخَبَرُ النَّارِ وَخَبَرُ مَا كَانَ وَمَا هُوَ كَائِنٌ، اَعْلَمُ ذَالِكَ كَمَا اَنْظُرُ اِلٰى كَفِّيْ اِنَّ اللهَ يَقُوْلُ فِيْهِ تِبْيَانٌ كُلِّ شَيْءٍ"

''میں قرآن کو جانتا ہوں؛ اس میں خلقت کے آغاز اور جو قیامت تک ہوگا، کا بیان ہے۔ اس طرح آسمان وزمین

[1] سورۂ حشر، آیت ۷

[2] سورۂ نحل، آیت ۴۴

https://downloadshiabooks.com/

کی خبریں، بہشت وجہنم کی خبریں جو تھیں اور جو آئیں گی، میں ان سب کو جانتا ہوں، اس طرح جیسے اپنے ہاتھ پر نگاہ کرتا ہوں، خدا فرماتا ہے قرآن میں ہر شے موجود ہے۔''[۱]

نہج البلاغہ میں آیا ہے:

"وَفِي الْقُرآنِ نَبَأُ مَا قَبْلَكُمْ وَ خَبَرُ مَا بَعْدَكُمْ وَ حُكْمُ مَا بَيْنَكُم"

قرآن میں تم سے پہلے کی خبریں تمہارے بعد کی خبریں اور تمہارے حال کی خبریں موجود ہے (گزشتہ، آئندہ، حال) سب اس میں موجود ہے۔[۲]

دوسری تعبیر میں امامؑ فرماتے ہیں:

"اَلَا اِنَّ فِيهِ عِلْمَ مَا يَأْتِي وَ الْحَدِيثَ عَنِ الْمَاضِيْ وَ دَوَاءَ دَائِكُمْ وَ نَظْمَ مَا بَيْنَكُم"[۳]

'' قرآن میں تمہارے متعلق علوم جو آئندہ سے متعلق ہیں ،گزشتہ کی خبریں ہیں،تمہاری بیماریوں کا علاج اور تمہارے درمیان نظم وضبط کے اصول،سب کچھ موجود ہے۔''

یہ سخن صرف احادیث اہل بیتؑ میں ہی نہیں، بلکہ اہلِ سنّت کے ہاں بھی موجود ہے۔

سیوطی نے درالمنثور میں ابن مسعود سے نقل کیا ہے:

"اِنَّ فِيهِ عِلْمَ الْاَوَّلِيْنَ وَ الْآخِرِيْنَ"

''قرآن میں اوّلین وآخرین کا علم ہے۔''

اور ''اوزاعی'' سے نقل کیا ہے کہ آیت: وَنَزَّلْنَا عَلَيْكَ الْكِتَابَ تِبْيَانًا لِكُلِّ شَيْءٍ قَالَ: بِالسُّنَّةِ[۴] سے مراد یہ ہے کہ سنّت کے ذریعے تمام حقائق جو قرآن میں ہیں، کشف ہوتے ہیں۔

سیوطی نے کتاب اتقان میں اس معنی کو آپ سے نقل کیا، آپؐ نے فرمایا: قرآن میں تم سے پہلے اور تمہارے بعد کی خبریں ہیں اور تمہارے حال کا حکم موجود ہے[۵] اور لکھا ہے کہ اس حدیث کو ترمذی اور دوسروں نے بھی بیان کیا ہے۔

---

[۱] اصول کافی، جلد ا،ص ۶۱ مرحوم کلینیؒ نے متعدد روایات بیان کی ہیں۔

[۲] کلماتِ قصار حکمت،ص ۳۱۳

[۳] نہج البلاغہ،خطبہ ۱۵۸

[۴] الاتقان نوع،صفحہ ۶۵ علوم سے استفادہ ہوتا ہے کہ مراد قرآن ہے۔

[۵] الاتقان نوع،صفحہ ۶۵ علوم سے استفادہ ہوتا ہے کہ مراد قرآن ہے۔

https://downloadshiabooks.com/

تیسرا حصہ

"وَاِنَّ الْقُرْآنَ ظَاهِرُهُ اَنِيقٌ وَ بَاطِنُهُ عَمِيقٌ لَا تَفْنَى عَجَائِبُهُ وَلَا تَنْقَضِي غَرَائِبُهُ وَلَا تُكْشَفُ الظُّلُمَاتُ اِلَّا بِهِ."

"بے شک قرآن کا ظاہر خوش نما اور باطن گہرا ہے، نہ اس کے عجائبات مٹنے والے اور نہ اس کے لطائف ختم ہونے والے ہیں، ظلمت کا پردہ اسی سے چاک کیا جاتا ہے۔"

شرح وتفسیر

قرآن کی خوشنمائی اور گہرائی

اس خطبۂ عالی کے دوسرے اور تیسرے حصے میں امیر المومنینؑ قرآن مجید کی توصیف بیان فرماتے ہیں اور پانچ مختصر اور جامع جملوں میں قرآن کی اہمیت کے بارے میں زندہ حقائق کو بیان فرمایا تاکہ گزشتہ بحثوں کی تکمیل ہو اور بتایا کہ فقہائے اسلامی قضات (فیصلے کرنے والے) ہرگز قرآن سے غافل نہ ہوں اور اس کے حقائق اور احکام کو کم نہ جانیں اور قرآن کے ہوتے ہوئے دوسرے منابع (سوائے منابع سنّت جو قرآن سے ہی لیے گئے ہیں، یہ قرآن کی شریعت بیان کرنے والے اور اس کی وضاحت کرنے والے ہیں) کی طرف محتاج نہ ہو۔

پہلی صفت: حضرت امام علی علیہ السلام فرماتے ہیں:

"وَاِنَّ الْقُرْآنَ ظَاهِرُهُ اَنِيقٌ"[1]

"قرآن کا ظاہر زیادہ خوبصورت اور تعجب میں ڈالنے والا ہے۔"

اس جملے کا قرآن کی فصاحت و بلاغت کی طرف اشارہ ہے۔ اس کے الفاظ زیادہ موزوں ہیں اور اس کی تعبیرات زیادہ منظم انداز میں کی گئی ہیں۔ آیات کی ہم آہنگی اپنے اندر ایک خصوصیت رکھتی ہے کہ جس قدر انہیں انسان پڑھے اور بار بار پڑھے، تھکتا نہیں ہے۔ کہنے کو بہت کچھ ہے مگر اس دریا میں کود جائیں گے تو ہم اپنے مقصد سے دور ہو جائیں گے۔[2]

---

[1] انیق کا مادّہ انق ہے، یہ حیرت انگیز اور خوبصورتی کے معنی میں آتا ہے۔

[2] پیام قرآن، جلد ۸، ص ۱۱۴

https://downloadshiabooks.com/

دوسری صفت: بیان کرتے ہوئے آپؑ فرماتے ہیں:

"وَ بَاطِنُهُ عَمِيقٌ"

''اس کا باطن گہرا ہے۔''

غالباً ظاہری بناوٹ اور خوبصورتی انسان کو معنوی گہرائی سے دور کر دیتی ہے، جبکہ گہرے اور دقیق مسائل اکثر ایسے انداز میں بیان ہوتے ہیں، جو عام فہم نہیں ہوتے۔ ان دونوں کو جمع کرنے کے لیے نہایت قدرت کی ضرورت ہے، معنی کا حق مکمل طور پر ادا ہو اور ساتھ ساتھ خوبصورت ترین قالب اور جذب کرنے والے الفاظ میں ڈھلے ہوئے ہوں۔ یہ ایک ایسی حقیقت ہے کہ قرآن مجید میں وضاحت کے ساتھ نظر آتی ہے، اس کا ظاہر فوق العادہ طریقے سے آراستہ ہے، روح پرور ،جذب کرنے والا اور دل آویز ہے اور اس کا باطن زیادہ گہرا اور جامع ہے۔ قرآن کی گہرائی اتنی ہے کہ جو بھی اس قرآن سے متعلق مضبوط و محکم فکر کو کام میں لانے کی کوشش کرے گا، پھر بھی آخر تک نہیں پہنچ پائے گا۔ ایسا کیوں نہ ہو کہ یہ وحی الٰہی کا نتیجہ اور خدا کا کلام ہے اور پاک و پاکیزہ ہے۔ اس قرآن میں بہت سارے نمونۂ حیات مختلف سورتوں میں پائے جاتے ہیں جنہیں امامؑ نے دو جملوں میں ارشاد فرمایا، یہ کتاب انسان کے لیے واضح اور احساس دلانے والی ہے۔ [1]

تیسری اور چوتھی صفت: بیان کرتے ہوئے آپؑ فرماتے ہیں:

"لَا تَفْنَى عَجَائِبُهُ، وَلَا تَنْقَضِي غَرَائِبُهُ"

''قرآن کے عجائبات کبھی ختم نہیں ہوں گے اور اس کے چھپے ہوئے راز کبھی اختتام تک نہیں پہنچ سکتے۔''

ممکن ہے ان دو جملوں میں فرق اس طرح ہو کہ پہلے جملے: لَا تَفْنَى عَجَائِبُهُ سے قرآن کی خوبصورتی اس کے عجائبات، اور واضح حقائق کی ہمیشگی اور ابدیت کی طرف اشارہ ہو، کیونکہ اس سلسلے میں بہت ساری کتابوں کے نام لیے جا سکتے ہیں، جو اپنے زمانے میں تعجب آور، جاذب ترتھیں مگر زمانے کے گزرنے کے ساتھ ساتھ گرد آلود ہو گئیں اور ان کے عجائبات داغدار ہو گئے، لیکن قرآن مجید ہرگز ایسا نہیں ہو سکتا، کیونکہ جو بھی اس قرآن سے واقفیت رکھتا ہے، وہ اس کے الفاظ و معانی پر غور و خوض اور مطالعے سے ہمیشہ لطف اندوز ہوتا رہا ہے۔

دوسرے جملے "وَ لَا تَنْقَضِي غَرَائِبُه" سے قرآن کے چھپے ہوئے اسرار کی طرف اشارہ ہو کہ زمانے کے گزرنے کے ساتھ ساتھ ہر دن ایک نیا حصہ ظاہر ہوتا ہے۔ یہ بات نہ بھولیں کہ ''غرائب'' جمع غریب جو غربت اور غروب کے مادے سے ہے جو اپنے رہنے کی جگہ سے دور ہونے کے معنی میں ہے یا چھپ جانے کے معنی میں ہے، یہ تعبیر قرآن کے

[1] مزید توضیح کے لیے سابقہ منابع یعنی کتاب پیام قرآن، ص ۱۳۴ پر رجوع کریں۔

https://downloadshiabooks.com/

اسرار سے زیادہ مناسبت رکھتی ہے۔

پانچویں اور آخری صفت بیان کرتے ہوئے آپؑ نے فرمایا:

"وَلَا تُكْشَفُ الظُّلُمَاتُ إِلَّا بِهِ"

"ظلمتوں اور تاریکیوں کے پردے صرف نورِ قرآن سے چاک کیے جاسکتے ہیں۔"

نہ صرف جہل و تاریکی، کفر و بے ایمانی و عدمِ تقویٰ کی ظلمت بلکہ وہ تمام ظلمتیں جو زندگی میں سماجی و سیاسی و معاشی ہیں، تعلیماتِ قرآنی کے بغیر دور نہیں ہوسکتی ہیں، آج کل دنیا صنعتی طور پر بہت زیادہ ترقی کر چکی ہے، لیکن اس کے باوجود ظلمتوں نے طرح طرح سے انسانی معاشرہ پر منفی اثرات چھوڑے ہیں جنگ، خونریزیاں، ظلم، ناانصافیاں، فقر و بدبختی اور سب سے اہم بات یہ ہے کہ اندرونی طور پر بے سکوں ہونے نے ہر ایک کو ہر طرف سے گھیر رکھا ہے۔ یہ سب کچھ ایمان، تقویٰ، قناعت نہ ہونے اور اخلاقی تنزلی کا نتیجہ ہے۔ اس کا بہترین راستہ قرآن کے سائے میں پناہ لینا ہے۔ سب سے زیادہ افسوس کا مقام یہ ہے کہ احکام کے سلسلے میں قرآن کو چھوڑ کر گمانی آراء اور ان افکار سے جن سے انسان قاصر ہے، سہارا لیا جارہا ہے، چنانچہ مسلمانوں کے بعض گروہ قرآن سے دور ہونے کی وجہ سے ظنی آراء سے احکام بتانے کے مرض میں گرفتار ہیں۔

نکات

قرآن و اہلِ بیتؑ سے دوری کے بُرے نتائج

قرآن سے دور ہونا تمام مسلمانوں کے لیے نقصان کا باعث ہے، بالخصوص دانشمندوں، علمائے امت کے لیے جیسا کہ مذکورہ بالا خطبے میں امیر المومنینؑ نے انتہائی دقت اور کامل طریقے سے بتا دیا ہے، ظہورِ اسلام کی پہلی صدی میں یہی گروہ قرآن و اہل بیتؑ سے فاصلہ رکھنے کی وجہ سے (جو قرآن کے مفسر ہیں) سرگرداں ہوا اور اس راستے کو جو عالم اسلام کی شان کے خلاف ہے، اختیار کیا، اس مقام پر ایک پُرکشش حدیث نقل کرتے ہیں، جو حضرت امام جعفر صادقؑ کے ایک دوست عمر بن اذینہ [۱] اور ابن ابی لیلیٰ [۲] سے کی گئی گفتگو سے لی گئی ہے، اس میں اہم حقائق کی وضاحت کی گئی ہے، وہ فرماتے ہیں:

---

[۱] عمر ابن اذینہ بصرہ کے بزرگ شیعہ علماء میں سے ہیں، مہدی عباس کے زمانے میں احکامِ دین میں مورد اعتماد تھے۔

[۲] ابن ابی لیلیٰ، جن کا نام محمد بن عبد الرحمٰن ہے، یہ اہلسنت کے مشہور علماء میں سے ہیں، ابن ابی لیلیٰ محمد بن اذینہ جو حضرت امام جعفر صادقؑ کے اصحاب میں سے تھے، اُن کے ہم عصر ہیں۔

https://downloadshiabooks.com/

ایک دن میں ابن ابی لیلیٰ کے پاس گیا، وہ مسندِ قضاوت پر فائز تھے، میں نے کہا:

''میں آپ سے کچھ سوالات کرنا چاہتا ہوں۔(اس وقت میں نوجوان تھا)

انہوں نے کہا: کہ بھتیجے پوچھئے۔

میں نے کہا: آپ کی قضاوت کا طریقہ کار عجیب ہے، مالی امور کا مسئلہ ہو یا شادی بیاہ یا خون کا، آپ کے سامنے جب بیان ہوتا ہےتو آپ اپنی رائے سے قضاوت کرتے ہیں، جبکہ وہی مسئلہ مکہ کے قاضی کے سامنے بیان ہوتا ہےتو دوسری رائے دیتا ہے، پھر وہی مسئلہ بصرہ، یمن اور مدینے کے قاضیوں کے پاس بیان ہوتا ہے، تو وہ بھی دوسری آراء سے فیصلہ صادر کرتے ہیں، جو پچھلی آراء کے برعکس ہوتے ہیں، پھر آپ سب اس خلیفہ کے پاس جس نے آپ کو اس منصب پر فائز کیا ہے، جمع ہوتے ہیں اور اسے ان مختلف آراء کے بارے میں باخبر کرتے ہیں اور وہ آپ سب کی آراء کو صحیح مانتا ہے، حالانکہ آپ کا خدا ایک، پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ایک، دین ایک ہے۔ کیا خدا نے آپ کو اختلاف کے لیے دعوت دی ہے اور اس اختلاف کی اطاعت کرتے ہیں؟ یا خدا نے آپ کو ان سے منع کیا ہے اور آپ نافرمانی کرتے ہو، یا آپ احکام کو بیان کرنے میں خدا کے شریک ہیں اور جو چاہتے ہیں اسے بولنے کا حق رکھتے ہیں، اور اس بارے میں جو حکم دیتے ہیں، (نعوذ باللہ) اللہ پر لازم ہے کہ اس پر راضی ہوجائے؟ یا یہ کہ (نعوذ باللہ) اللہ نے ناقص دین کو نازل کیا ہے اور آپ سے اس کی تکمیل کے لیے مدد مانگی ہے یا یہ کہ دینِ کاملہ نازل کیا مگر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے (معاذ اللہ) اس کو پہنچانے میں کوتاہی کی؟ صحیح جواب کیا ہے؟

ابن ابی لیلیٰ نے کہا: بیٹے تمہارا تعلق کہاں سے ہے؟

میں نے کہا: اہل بصرہ سے ہوں۔

انہوں نے کہا: کس قبیلے سے ہو؟

میں نے کہا، عبد قیس کے قبیلے سے ہوں۔

انہوں نے کہا: کس گروہ سے (عبد قیس کے)؟

میں نے کہا: بنی اُذینہ سے۔

انہوں نے کہا: عبدالرحمٰن ابن اذینہ سے کیا نسبت رکھتے ہو؟

میں نے کہا: وہ میرے دادا ہیں۔ اس مقام پر اس نے مجھے خوش آمدید کہا اور مجھے اپنے پاس بٹھایا اور کہا:

میرے بھائی کے بیٹے آپ نے سوالات کیے اور خوب غصہ اُتارا اور اپنی گفتگو کو بار بار دوہرایا اور اعتراض کیا اور میں انشاءاللہ تمہیں جواب دوں گا، تم نے قضات (فیصلہ کرنے والے) کے اختلاف کے بارے میں سوال کیا۔ اس کی دلیل یہ

https://downloadshiabooks.com/

ہے کہ جو مسئلہ ہمارے سامنے پیش ہوتا ہے، اس کا اگر کتابِ خدا اور سنّت رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلّم سے رابطہ اور تعلق ہوتا ہے، تو ہمارے لیے ہرگز مناسب نہیں ہے کہ کتاب خدا اور سنّت رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلّم سے رُوگردانی کریں، مگر وہ مسائل جو ہمیں پیش آتے ہیں اگر کتاب خدا اور سنّتِ رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلّم سے معلوم نہ ہوں تو ہم اپنی رائے سے اخذ کرتے ہیں۔

میں نے کہا: یہ جو آپ رائے دیتے ہیں، درست نہیں، کیونکہ خداوند متعال فرماتا ہے: میں نے کسی چیز کو بھی قرآن سے مخفی نہیں رکھا ہے؛ پھر خدا مزید فرماتا ہے کہ قرآن کو تمام چیزوں کے بیان کے لیے نازل کیا ہے۔ اگر اس کے اوامر پر کسی نے عمل کیا یا نواہی سے اپنے کو روک دیا تو کیا آپ کے عقیدے میں اس کا وظیفہ (شرعی) کیا ہونا چاہیے، کہ انجام نہ دیا تو اللہ اسے عذاب دے اور اگر انجام دیا تو اللہ اسے جزا دے گا؟

انہوں نے کہا: کیسے ممکن ہے کہ جس چیز کا حکم نہ دیا ہو، اس کی جزا دے اور کسی چیز سے نہ روکا گیا ہو اس کی سزا ملے؟

میں نے کہا: اصولی طور پر یہ کیسے ممکن ہے کہ پیش آنے والے مسائل کے بارے میں کتابِ خدا اور سنّتِ رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلّم میں ذکر نہ ہو؟

انہوں نے کہا: بھائی کے بیٹے! خلیفۂ دوّم سے روایت ہے کہ دو آدمیوں کے درمیان فیصلہ سنا رہے تھے، سب سے زیادہ جو خلیفۂ دوّم کا قریبی تھا، اس نے کہا، اے امیر المومنینؑ آپ نے صحیح راستہ بتا دیا۔ خلیفۂ دوّم نے اپنے ہاتھ میں موجود تازیانے سے اُسے مارا اور کہا کہ تمہاری ماں تمہارے غم میں بیٹھے، خدا کی قسم خود خلیفۂ دوم کو معلوم نہیں کہ صحیح کہا یا غلط رائے تھی، میرے سامنے میری تعریف نہ کرو۔

میں نے اُن سے کہا: میں بھی آپ کے لیے ایک حدیث نقل کرتا ہوں، کہا بولو!

میں نے کہا: میرے لیے میرے والد نے اس حدیث کو حضرت علی علیہ السلام سے نقل کیا ہے کہ ''قضات (فیصلہ کرنے والے) کے تین گروہ ہیں، دو گروہ ہلاک ہو جائیں گے اور ایک گروہ نجات پائے گا، مگر وہ جو دو گروہ ہلاک ہو جائیں گے، ایسے گروہ ہیں کہ جان بوجھ کر ظالمانہ فیصلے کرتے ہیں یا اجتہاد کرتے ہیں اور خطا میں پڑ جاتے ہیں اور نجات یافتہ وہی ہیں جو خدا کے حکم پر عمل کرتے ہیں''۔ اے میرے چچا جان! یہ حدیث آپ کی حدیث کو باطل کر دیتی ہے۔

انھوں نے کہا: خدا کی قسم! اے بھتیجے! جو تم کہتے ہو سب صحیح ہے؛ تو تم کہتے ہو کہ قرآن میں سب کچھ ہے؟

میں نے کہا: خداوند عالم نے یہی فرمایا ہے: ''کوئی حلال و حرام و امر و نہی نہیں ہے مگر قرآن میں موجود ہے، خواہ کوئی اس سے آگاہ ہو یا نہیں۔'' خداوند عالم نے قرآن مجید میں ایسے مسائل کی نشاندہی کی ہے کہ اس سے زیادہ ہم محتاج نہیں ہیں، کیسے ممکن ہے کہ جن امور کی ہمیں احتیاج ہے، اللہ نے اس کی خبر نہ دی ہو۔

https://downloadshiabooks.com/

انہوں نے کہا: مثلاً کیسے مسائل؟

میں نے کہا: ان دو آدمیوں کا قصہ کہ ایک کے پاس باغ تھا اور دوسرا ایماندار تھا لیکن تہی دست تھا۔[1]

انہوں نے کہا: بہت خوب، یہ جو علومِ قرآنی بتاتے ہو وہ کس کے پاس ہیں؟

میں نے کہا: آپ تو خود جانتے ہیں کہ کس کے پاس ہیں۔

انہوں نے کہا: میں اسے جاننا چاہتا ہوں، اگر میں اسے پہچان لیتا، تو اپنے ہاتھوں سے اس کے پیر دھوتا، اس کا خادم بن جاتا اور ہمیشہ اسی سے سیکھتا۔

میں نے کہا: آپ کو خدا کی قسم، کیا ایسے شخص کو جانتے ہیں کہ جب وہ رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے کوئی بات دریافت کرتا، تو آپؐ اسے جواب دیتے اور جب خاموش رہتا تو پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم خود سے بول اٹھتے؟

انہوں نے کہا، : جی ہاں وہ علی ابن ابی طالب علیہ السلام تھے۔

میں نے کہا: میرا دوسرا سوال ہے کہ کیا آپ نے کبھی سنا ہے کہ بعدِ رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم حضرت علی علیہ السلام نے حلال و حرام کے بارے میں کسی سے سوال کیا ہو؟

انہوں نے کہا: نہیں۔

میں نے کہا: کیا آپ جانتے ہیں کہ دوسرے اُن کے محتاج تھے اور مسائل کے حل کے لیے ان کی طرف رجوع کرتے تھے؟

انہوں نے کہا: ہاں۔

میں نے کہا، پس تمام علومِ قرآنی ان کے پاس موجود تھے۔

انہوں نے کہا: وہ دنیا سے چلے گئے اب کس کا دامن تھامیں؟

میں نے کہا: ان کے فرزندوں کی طرف رجوع کریں، یہ علوم ان کے پاس ہیں۔

انہوں نے کہا: ان تک میں کیسے پہنچوں؟

میں نے کہا: یہ بتاؤ اگر میں دیکھوں کہ ایک بیابان ہے اور راہ دکھانے والے بھی موجود ہیں، مگر کچھ لوگ ان راہنماؤں میں سے کچھ کو قتل کردیں اور کچھ کو اتنا خوفزدہ کردیں کہ وہ فرار ہو جائیں اور جو باقی رہ جائیں وہ اپنے آپ کو پوشیدہ کر لیں اور اب یہ بغیر رہنما کے مسافر اس بیابان میں بھٹک جائیں اور ہلاک ہو جائیں، تو آپ ان کے متعلق کیا کہیں گے (غلطی

---

[1] تفسیرِ نمونہ۔ آیت ۳۲، اور اس کے بعد سورہ کہف سے رجوع کریں۔

https://downloadshiabooks.com/

کس کی ہے اور اب کیا کرنا چاہیے؟)

انہوں نے کہا: انھیں جہنم میں جانا چاہیے۔ (یہ کہا اور اس کا رنگ متغیر ہو گیا، اس کا چہرہ زرد پڑ گیا، اس کے ہاتھ میں ایک پھل تھا، زمین پر گر پڑا اسے تلاش کرتے ہوئے کہنے لگا: اِنَّا لِلّٰهِ وَاِنَّا اِلَيْهِ رَاجِعُوْنَ [۱])

گویا یہ حدیث جو کہ مختصر عبارات میں پُرکشش حقائق کو بیان کرتی ہے، امام جعفر صادق علیہ السلام کے زمانے کے شیعوں میں معروف تھی اور شیعہ جوان اس سے بخوبی آگاہ تھے۔

قرآن اور جدید مسائل

بعض اعتراض کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ اس وقت انسانی معاشرہ بکھرا ہوا ہے اور ہر زمانے میں تازہ مسائل رونما ہیں، کیسے ہو سکتا ہے کہ قرآن مجید جس کے احکام ثابت اور غیر متغیر ہیں، ایسے انسانی معاشرے پر جو مسلسل تغیر کر رہا ہے، جو ہر حال میں مستقل تغیر پذیر ہے، اس پر منطبق ہو؟ اور کیسے ہو سکتا ہے کہ جدید مسائل کا قرآن سے جواب ملے۔ اس سوال کا جواب ایک نکتہ پر توجہ دینے سے روشن ہو جائے گا، اور وہ یہ کہ قرآن مجید میں دو قسم کے احکام موجود ہیں، احکام جزئی اور احکام کلّی، احکام جزئی ایسے احکام کی طرح ہیں جو عبادت کے لیے ذکر ہوئے ہیں۔ جیسے وضو، غسل، تیمم یا جیسے قبلہ، نمازوں کی تعداد اور ان جیسے مسائل، مسائل کلّی کا مطلب وہ عام مطالب ہیں جو قرآن مجید میں ہیں جو کہ بہت وسیع مفاہم پر مشتمل ہیں، مثلاً ہر قسم کے عقد و پیمان کی وفا کا واجب ہونا اَوْفُوْا بِالْعُقُوْدِ [۲] اور لَا حَرَجَ کا قانون و قاعدہ ہو وَ مَا جَعَلَ عَلَيْكُمْ فِي الدِّيْنِ مِنْ حَرَجٍ [۳] اور قاعدہ لَا ضَرَرَ جو کہ بعض آیاتِ قرآنی سے استفادہ ہوتا ہے، اور ان مسائل میں جو انسانی ضرورتوں (جیسے مسائلِ حقوق وغیرہ) سے متعلق ہے، اگر وہ اصول اور کلّی قواعد کو جو معصومینؑ کے کلمات سے ماخوذ ہیں اور قرآن مجید سے ان کی حجت اور اعتبار ثابت ہے، اضافہ کریں تو مسئلہ روشن تر ہو جائے گا، دوسری تعبیر کے مطابق موضوعات ہمیشہ حالت تغیر میں ہیں اور کلّی اصولی ثابت (غیر متغیر) ہیں، بکھرے ہوئے موضوعات کسی ایک حکم کے موضوع بننے سے خارج ہوتے ہیں اور دوسرے حکم کا موضوع قرار پاتے ہیں۔ اس دلیل کی بنا پر ہم ان جدید مسائل کو کہ جن کا ذکر کتاب وسنّت میں خصوصیت کے ساتھ نہیں ہے، ان سے قواعد کلّیہ کو استنباط کر سکتے ہیں اور انہیں جدید مسائل کی کتابوں میں لکھ سکتے ہیں اور

[۱] مستدرک الوسائل جلد ۱۷ صفحہ ۲۴۵ حدیث ۱۳، اس حدیث کو بہت ساری کتابوں میں نقل کیا گیا ہے۔

[۲] سورۂ مائدہ، آیت ۱

[۳] سورۂ حج، آیت ۷۸

https://downloadshiabooks.com/

کسی چیز کے امکان کے لیے بہترین دلیل یہ ہے کہ وہ واقع ہو۔ مزید وضاحت جدید مسائل کی کتابوں میں ہے۔

قرآن کے عجائبات کیوں ختم نہیں ہوتے ہیں؟

اس خطبے کے آخری جملے میں ہم پڑھتے ہیں:

"لَا تَفْنٰی عَجَائِبُهُ وَلَا تَنْقَضِیْ غَرَائِبُهُ"

''قرآن کے عجائبات ختم نہیں ہوتے اور اس کے چھپے ہوئے اسرار مٹنے والے نہیں ہیں۔''

دوسری تعبیر کے مطابق جیسے زمانہ گزرتا جاتا ہے، اس کے اسرار و رموز کے بارے میں جستجو کرنے والے طالب علم (دانشمند) زیادہ متوجہ ہوتے ہیں اور اس آسمانی کتاب سے نئے اسرار کشف کرتے ہیں۔ مزید یہ کہ اس کی خوبصورتی اور عجائبات پہلے کی طرح تر وتازہ ہیں، یہ ہرگز پرانے نہیں ہوتے۔ اس دلیل کی بنا پر ہم اس حقیقت کو تجربے سے دریافت کرتے ہیں کہ اس کے پڑھنے اور تکرار سے ہرگز تھکاوٹ اور ملال کا احساس نہیں ہوتا۔ اس مطلب کی دلیل کے لیے ایک نکتہ یہ ہے کہ قرآن کلامِ خدا ہے جیسا کہ اُس کی پاک ذات لامحدود و لامتناہی ہے، اسی طرح اُس کا کلام بھی لامحدود و لامتناہی ہے مخلوق کا کلام نہیں کہ اس کی عقل وفکر محدود ہے، اس کے علاوہ قرآن کے مخاطبین تا قیامت انسان ہیں۔ خداوند عالم نے اس آسمانی کتاب میں ہر ایک کے لیے حصہ رکھا ہے۔

اس گفتگو کو حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام کی اس جامع حدیث سے اختتام تک پہنچائیں گے کہ اس حدیث میں امام علی ابن موسیٰ الرضا علیہما السلام سے نقل ہوا ہے کہ ایک آدمی نے امام جعفر صادقؑ سے پوچھا:

"مَا بَالُ الْقُرْآنِ لَا يَزْدَادُ عَلَى الدَّرْسِ وَالنَّشْرِ اِلَّا غَضَاضَةً"

''نشر و اشاعت، تکرار، کثرت تلاوت اور تدریس سے قرآن، کیوں پرانا نہیں ہوتا، بلکہ اس میں ہر روز تازگی پائی جاتی ہے؟''

امام جعفر صادق علیہ السلام نے جواب میں فرمایا:

"لِاَنَّ اللّٰهَ تَبَارَكَ وَ تَعَالٰى لَمْ يَجْعَلْهُ لِزَمَانٍ دُوْنَ زَمَانٍ وَ لَا لِلنَّاسِ دُوْنَ نَاسٍ فَهُوَ فِیْ كُلِّ زَمَانٍ جَدِيْدٌ وَعِنْدَ كُلِّ قَوْمٍ غَضٌّ اِلٰى يَوْمِ الْقِيَامَةِ"[1]

''اس لیے کہ خداوند عالم نے اسے کسی خاص زمانے یا معین گروہ کے لیے قرار نہیں دیا ہے (اس کے مخاطبین پوری

[1] میزان الحکمۃ، جلد ۸، ص ۷۰، بحار الانوار، ج ۹۲ ص ۱۵

https://downloadshiabooks.com/

تاریخ کے تمام انسان ہیں) اسی وجہ سے یہ ہر زمانے میں تازہ ہے اور قیامت تک ہر قوم کے پاس تر و تازگی کے ساتھ موجود رہے گا۔"

https://downloadshiabooks.com/

اُنیسواں خطبہ

وَمِنْ كَلَامٍ لَهُ عَلَيْهِ السَّلَامُ

قَالَ لِلْاَشْعَثِ بْنِ قَيْسٍ وَ هُوَ عَلَى مِنْبَرِ الْكُوفَةِ يَخْطُبُ فَمَضَى فِي بَعْضِ كَلَامِهِ شَيْءٌ اِعْتَرَضَهُ الْاَشْعَثُ فِيهِ فَقَالَ يَا اَمِيرَ الْمُؤْمِنِينَ هٰذِهِ عَلَيْكَ لَا لَكَ فَخَفَضَ (عَلَيْهِ السَّلَامُ) اِلَيْهِ بَصَرَهُ ثُمَّ قَالَ علیہ السلام: [1]

یہ خطبہ اُس وقت ارشاد فرمایا جب آپؑ مسجد کوفہ کے منبر پر لوگوں کو وعظ و نصیحت فرما رہے تھے اور اشعث بن قیس کندی نے ٹوک دیا کہ یہ بیان آپؑ خود اپنے خلاف دے رہے ہیں؛ آپؑ نے پہلے نگاہیں نیچی کر کے سکوت فرمایا اور پھر جلال میں آکر فرمایا:

"مَا يُدْرِيكَ مَا عَلَيَّ مِمَّا لِي عَلَيْكَ لَعْنَةُ اللهِ وَ لَعْنَةُ اللَّاعِنِينَ حَائِكٌ ابْنُ حَائِكٍ مُنَافِقٌ ابْنُ كَافِرٍ وَ اللهِ لَقَدْ اَسَرَكَ الْكُفْرُ مَرَّةً وَ الْاِسْلَامُ اُخْرَى فَمَا فَدَاكَ مِنْ وَاحِدَةٍ مِنْهُمَا مَالُكَ وَ لَا حَسَبُكَ وَ اِنَّ امْرَاً دَلَّ عَلَى قَوْمِهِ السَّيْفَ وَ سَاقَ اِلَيْهِمُ الْحَتْفَ لَحَرِيٌّ اَنْ يَمْقُتَهُ الْاَقْرَبُ وَ لَا يَاْمَنَهُ الْاَبْعَدُ"

"تجھے کیا خبر کہ کون سی بات میرے موافق ہے اور کون سی میرے خلاف ہے۔ تجھ پر خدا اور تمام لعنت کرنے والوں کی لعنت۔ تو سخن باف اور تانے بانے درست کرنے والے کا فرزند ہے۔ تُو منافق ہے اور تیرا باپ کھلا ہوا کافر تھا۔ خدا کی قسم، تُو ایک مرتبہ کفر کا قیدی بنا اور دوسری مرتبہ اسلام کا، لیکن نہ تیرا مال کام آیا نہ حسب۔ اور جو شخص بھی اپنی قوم کی طرف تلوار کو راستہ بتائے گا اور موت کو کھینچ کر لائے گا، وہ اس بات کا حقدار ہے کہ قریب والے اس سے نفرت کریں اور دور والے اس پر بھروسا نہ کریں۔"

---

[1] کتاب مصادر نہج البلاغہ میں اس طرح آیا ہے کہ اس خطبے کے نقل ہونے میں دانشوروں میں کوئی اختلاف نہیں ہے۔ سیّد رضیؒ سے پہلے والے علما میں ابوالفرج اصفہانی نے کتاب اغانی میں نقل کیا ہے، جنہوں نے نہج البلاغہ کی کتاب اشاعت سے ۴۴ سال پہلے انتقال کیا۔ (مصادر نہج البلاغہ، جلد ۱، ص ۳۶۹)

https://downloadshiabooks.com/

"قَالَ السَّيِّدُ الشَّرِيفُ: يُرِيْدُ عليه السلام اَنَّهُ اُسِرَ فِي الْكُفْرِ مَرَّةً وَفِي الْاِسْلَامِ مَرَّةً وَاَمَّا قَوْلُهُ دَلَّ عَلَى قَوْمِهِ السَّيْفَ فَاَرَادَ بِهِ حَدِيْثًا كَانَ لِلْاَشْعَثِ مَعَ خَالِدِ بْنِ الْوَلِيْدِ بِالْيَمَامَةِ، غَرَّ فِيْهِ قَوْمَهُ وَمَكَرَ بِهِمْ حَتّٰى اَوْقَعَ بِهِمْ خَالِدٌ، وَكَانَ قَوْمُهُ بَعْدَ ذَالِكَ يُسَمُّوْنَهُ "عُرْفَ النَّارِ" وَهُوَ اِسْمٌ لِلْغَادِرِ عِنْدَهُمْ"

سیّد رضی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں: یہ ایک مرتبہ کفر کے زمانے میں اور ایک مرتبہ اسلام کے زمانے میں اسیر کیا گیا تھا۔ رہا حضرتؑ کا یہ ارشاد کہ جو شخص اپنی قوم پر تلوار چلوادے، تو اس سے اس واقعے کی طرف اشارہ کیا ہے کہ جو اشعث کو خالد ابن ولید کے مقابلے میں یمامہ میں پیش آیا تھا کہ جہاں اس نے اپنی قوم کو فریب دیا تھا اور ان سے چال چلی تھی۔ یہاں تک کہ خالد نے ان پر حملہ کر دیا اور اس واقعے کے بعد اس کی قوم والوں نے اس کا لقب عرف النار رکھ دیا اور یہ ان کے محاورے میں غدار شخص کے لیے بولا جاتا ہے۔

شرح و تفسیر

بے ادب اور جسور منافق سے مڈ بھیڑ

اس خطبے کی شرح و تفسیر سے پہلے دو نکتوں کی طرف اشارہ کرنا لازمی ہے:

۱۔ جیسا کہ ہم جانتے ہیں کہ اس کلام میں ابن قیس مخاطب ہے کہ جس کا نام "معدیکرب" تھا، اس کے بکھرے ہوئے بالوں کی وجہ سے اسے اشعث کے نام سے پکارا گیا۔ یہاں تک کہ اس کا اصل نام فراموش کر دیا گیا۔ پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے زمانے میں مسلمان ہوا، پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی رحلت کے بعد مرتد ہو گیا اور گروہ بنی ولیعہ جنھوں نے ارتداد کا ارتکاب کیا تھا، کی حمایت انجام دی، زیاد بن لبید، حضرت ابوبکر کی طرف سے ان لوگوں کے ساتھ جنگ پر مامور تھا اور اسی دوران اشعث اسیر کیا گیا اور یہی اس کی اسلام کے اندر اسیری تھی، دورِ جاہلیت میں جب اس کا باپ قیس قتل ہوا، اس کے خون کا انتقام لینے کی خاطر اپنے قبیلے کے ساتھ چل پڑا اور قاتل قبیلے بنی مراد پر حملہ کرنے کے بجائے غلطی سے قبیلۂ بنی حارث پر حملہ کر دیا، اس جنگ میں شکست کھائی اور اسیر ہوا، اپنی آزادی کے لیے سیکڑوں اُونٹوں کا فدیہ دیا (یہ اس کی کفر کی حالت میں اسیری تھی) بہر حال جب اُسے حضرت ابوبکر کے پاس لے گئے تو ان سے شرمندگی کا اظہار کیا اور انھوں نے اسے معاف کر دیا۔ اور اپنی بہن اُم فروہ جو کہ نابینا تھی کو اس کے عقد میں دے دیا، اس خاتون سے چار بچے ہوئے، ان میں سے ایک کا نام محمد تھا، جس نے حضرت امام حسین علیہ السلام اور ان کے ساتھیوں سے کربلا میں مقابلہ کیا اور اس کی بیٹی جعدہ کے نام سے تھی، اس نے امام حسنؑ کو زہر دیا، اشعث ان لوگوں

https://downloadshiabooks.com/

میں سے تھا، جیسے عمرو بن عاص جو جنگ صفین میں حضرت علی علیہ السلام کے ساتھیوں میں نفاق ڈالنے میں مددگار رہا۔ ابن ابی الحدید اور محمد بن عبدہٗ نے ایک مختصر سی گفتگو میں اشعث کا اس طرح تعارف کرایا، وہ حضرت امام علی علیہ السلام کے زمانے میں منافقین میں سے تھا، جس طرح آنحضرتؐ کے اصحاب میں عبداللہ بن ابی سلول رسول خداؐ کے ساتھیوں میں سے تھا اور یہ لوگ اپنے زمانے میں منافقین کے سردار تھے اور فساد پھیلانے والی سازشوں میں شریک تھے۔[۱]

۲۔ اس بارے میں کہ یہ خطبہ کب اور کہاں دیا گیا اور امیرالمومنینؑ نے اشعث سے کس مناسبت سے یہ گفتگو کی، اس بارے میں دانشمندوں میں بحث ہے۔ ایک روایت میں ہم اس طرح پڑھتے ہیں کہ جب امیرالمومنینؑ منبر پر تھے اور آپؑ نے ایک خط نکالا کہ جس پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی یہ تحریر تھی:

اَلْمُسْلِمُوْنَ تَتَكَافَؤُ دِمَاءُهُمْ وَ هُمْ يَدٌ عَلٰى مَنْ سِوَاهُمْ مَنْ اَحْدَثَ حَدَثاً اَوْ آوٰى مُحْدِثاً فَعَلَيْهِ لَعْنَةُ اللّٰهِ وَالنَّاسِ اَجْمَعِيْنَ

''مسلمانوں کا خون آپس میں برابر ہے اور سب دشمنوں کے مقابلے میں ایک مٹھی کی طرح ہیں کوئی بھی دینِ خدا میں کوئی بدعت پیدا کرے یا بدعت کو اپنے اندر پناہ دے خدا اور تمام لوگوں کی اس پر لعنت ہو۔''[۲]

اشعث ابن قیس منافق نے اس جگہ آواز دی:

هٰذَا وَاللّٰهِ عَلَيْكَ لَا لَكَ

''خدا کی قسم! یہ تمہارے فائدے میں نہیں ہے، بلکہ تمہارے نقصان میں ہے۔''

حضرتؑ نے اُسے دیکھا اور اس کے جواب میں سخت لہجے میں فرمایا اور تمام لوگوں کے سامنے صراحت کے ساتھ اس کا تعارف کرایا۔ شاید اشعث کا اس جملے سے یہ مطلب ہوگا کہ اگر تمام مسلمانوں کا خون برابر ہے تو سب کو متحد ہونا چاہیے، پھر آپؑ نے مسلمانوں کے ایک گروہ سے کیوں جنگ کی؟ (کیوں کہ نفاق پیدا کرنے والے، جنگ جمل، صفین اور نہروان میں آگ بھڑکانے والے تھے جب کہ حضرت علی علیہ السلام کی خلافت پر نص بھی موجود ہے لوگوں نے ان کی بیعت کی اور خلیفۃ الرسولؐ کے لقب سے پہچانے جاتے تھے)

ایک دوسری روایت کے مطابق جیسے ہی حضرت علی علیہ السلام نے منبرِ کوفہ پر خطبہ (حکمین) دیا اور جو جنگِ صفین کے

---

[۱] شرح نہج البلاغہ ابی الحدید، جلد ا، ص ۲۹۲، عبدہٗ، ص ۵۶

[۲] بہت سی روایات میں ''من احدث حدثا'' کے جملے سے خوں ریزی و قتل مراد ہے۔ وسائل الشیعہ۔ جلد ۱۹ صفحہ ۱۱ تا ۱۹، ابواب القصاص باب ۴ اور ۸ پر رجوع کریں۔

https://downloadshiabooks.com/

بعد دنیائے اسلام میں ایک بڑی مصیبت کی شکل میں ظاہر ہوئی، اس کے بارے میں فرمایا: آپؑ کے دوستوں میں سے ایک کھڑا ہوا اور عرض کیا، یا امیر المومنینؑ آپؑ نے حکمین کی قبولیت سے ہمیں روکا، پھر حکم دیا، ان میں کون سا بہتر ہے، ہم نہیں جانتے؟ حضرت علی علیہ السلام نے دونوں ہاتھوں کو ایک دوسرے پر مارا اور فرمایا:

"هٰذَا جَزَاءُ مَنْ تَرَكَ الْعُقْدَةَ"

''یہ ان کا انجام ہے جنہوں نے صحیح رائے کو چھوڑ دیا۔''

آپ لوگوں نے بھی حکمین کے سلسلے میں میری بات نہیں مانی اور اصرار کرتے رہے کہ میں ان کے سامنے سرِ تسلیم خم کروں۔ یہاں اشعث نے یہ سمجھا کہ آپؑ کا مقصد یہ ہے، یہ میرے کام کا صلہ ہے کہ میں نے صحیح رائے کو چھوڑ دیا اس لیے اعتراض کیا اور کہا کہ یا امیر المومنینؑ یہ بات جو آپؑ نے کہی آپ کے نقصان ہی میں ہے نہ کہ آپؑ کے فائدے میں۔[1] اب ہم اس خطبے کی تفسیر وتشریح کا رخ کرتے ہیں۔ اس گفتگو میں جو کچھ بیان ہوا اس کے مطابق امیر المومنینؑ، اشعث کے اعتراض کے جواب میں فرماتے ہیں:

"مَا يُدْرِيكَ مَا عَلَيَّ مِمَّا لِيَ"

''تو کیا جانتا ہے کہ کون سی چیز میرے نقصان میں ہے یا میرے فائدے میں؟''

اس چیز کی طرف اشارہ ہے کہ آپؑ نے اُسے کہا کہ تُو نے اصلاً میرے کہنے کا مقصد نہیں سمجھا کہ کس نکتے کی طرف اشارہ کر رہا ہوں، میرا مقصد مسلمانوں کو اتحاد کی دعوت دینا ہے اور اس اشتباہ کی طرف اشارہ ہے کہ جو حکمین کی قبولیت کے مسئلے میں ہے تا کہ اس قسم کے کاموں کی تکرار نہ ہو، مگر تُو نے مطلب کو اچھی طرح نہیں سمجھا۔ اس کے بعد سخت لہجے میں اُس سے کہا:

"عَلَيْكَ لَعْنَةُ اللّٰهِ وَ لَعْنَةُ اللَّاعِنِيْنَ"

''خدا کی لعنت اور لعنت کرنے والوں کی لعنت ہو تجھ پر۔''

اشعث کی بری اور ناشائستہ تاریخ بھی اچھی طرح نشاندہی کرتی ہے کہ وہ اسی لعنت کا مستحق تھا چونکہ جتنی بھی اس زمانے کی سماجی سازشیں تھیں، اس کے ذمے تھیں اور وہی ان کا اصلی رہبر اور سردار تھا۔ ابن ابی الحدید کے مطابق، خلافتِ حضرت علی علیہ السلام کے زمانے میں جتنے بھی فتنہ وفساد واقع ہوئے، ان سب کی اصل اور بنیاد اشعث ابن قیس تھا۔[2]

---

[1] مصادر نہج البلاغہ، جلد ۱، ص ۳۶۸، ۳۶۹

[2] شرح ابن ابی الحدید، جلد ۲، ص ۲۸۹

https://downloadshiabooks.com/

آپؑ مزید فرماتے ہیں: حَائِكُ ابْنُ حَائِكٍ اے جولا ہے کے بیٹے جولا ہے اور ''مُنَافِقُ ابْنُ كَافِرٍ'' اے کافر کے بیٹے منافق، اس مقام پر ''حَائِک'' جولا ہے کا کیا مقصد ہے؟ نہج البلاغہ کے شارحین نے بہت کچھ کہا ہے، بعض نے ظاہراً لغوی معنی بتائے ہیں، اور کہا ہے کہ اشعث اور اس کے باپ کے پیشے کی طرف اشارہ ہے اور یہ پیشہ اس زمانے میں معاشرے کے نچلے طبقے کے افراد سے مخصوص تھا جو معارفِ دینی، اجتماعی تمدن و آداب سے دور تھے لیکن یہ معنی جس طرح اشعث اور اس کے باپ کی تاریخ میں نقل کیے گئے ہیں۔ مناسب نہیں ہیں، کیونکہ وہ لوگ ظاہراً اس پیشے میں نہیں تھے۔

بعض نے اسے متکبر اور خود پسند انسان کہا ہے، کیونکہ ''حائك'' کے معنی لغت میں اُس شخص کے ہیں جو تکبر کرتا ہے۔[۱] بعض نے کنائے کے معنی لیتے ہوئے کہا ہے کہ ''حائک'' سے مراد وہ شخص ہے جو جھوٹی باتوں کو گھڑتا ہے۔ وہ باتیں جو جھوٹ اور کذب پر مبنی ہوں، یہ دراصل اشعث اور اس کے باپ کا کارنامہ تھا، نہ صرف لغت عرب بلکہ دوسرے لغات میں بھی اس طرح کا کنایہ موجود ہے۔ توجہ رہے کہ جس روایت میں اس معنی کی طرف زیادہ واضح اشارہ موجود ہے، وہ حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام کی روایت ہے کہ جس میں لفظ ''حائك'' استعمال ہوا ہے۔ امامؑ فرماتے ہیں ''اَنَّهُ مَلْعُوْنٌ'' حائک ملعون ہے۔ پھر اس کی تفسیر میں یہ فرمایا:

''اِنَّمَا ذَالِكَ الَّذِیْ یَحُوْكُ الْكِذْبَ عَلَى اللّٰهِ وَ عَلٰی رَسُوْلِهِ''[۲]

''حائک وہ ہے جس نے خدا اور رسولؐ پر دروغ گوئی کی ہو۔''

امامؑ نے اُسے منافق شمار کیا ہے، جو تاریخ کا ایک روشن باب ہے، کیونکہ حکومتِ حضرت علی علیہ السلام کے دوران اس سے کچھ اعمال سرزد ہوئے، جو اُس کے منافقین کے سردار ہونے کی طرف نشاندہی کرتے ہیں۔ یہ ملعون شہادتِ امیر المومنینؑ، جنگ صفین میں ناکامی، روز جنگ نہروان، داستانِ حکمین کے وجود میں آنے اور بہت ساری سازشوں کے عوامل میں سے ایک ہے، جیسا کہ ہم نے اوپر ذکر کیا ہے، بعض دانشمندوں نے اُسے رسالت مآبؐ کے زمانے میں ''عبداللہ بن ابی'' جو اس زمانے کے منافقین کا سردار تھا، کا ہم پلّہ جانا ہے[۳] اور اس سے تشبیہ دی ہے۔

مختصراً یہ کہ نفاق پیدا کرنے اور منافقین کو تقویت دینے میں اس کا کردار زیادہ روشن ہے جو کہ مزید وضاحت کا محتاج ہے، مگر باپ کی نسبت سے اُسے کافر سے تعبیر کرنا بھی تاریخ کے مسلّمات میں سے ہے، کیونکہ اس کا تعلق مشرکین سے

[۱] حائک کبھی مادّہ حوک سے آیا ہے جس کے معنی جولاہا ہیں اور کبھی حیک سے آیا ہے، جس کے معنی تکبر کرنے کے ہیں۔
[۲] وسائل الشیعہ، جلد ۱۲، ص ۱۰۱، باب ۲۳ ما یکتسب بہ کے ابواب سے، حدیث ۲۔
[۳] شرح نہج البلاغہ ابن الحدید، اسی طرح شرح عبدہٗ سے رجوع کریں۔

https://downloadshiabooks.com/

تھا، جو زمانۂ جاہلیت میں کسی قبیلے سے اختلاف کی وجہ سے مارے گئے، پھر اس گفتگو کو تسلسل دیتے ہوئے فرماتے ہیں:

"وَ اللّٰہِ لَقَدْ اَسَرَكَ الْكُفْرُ مَرَّةً وَ الْاِسْلَامُ اُخْرٰى! فَمَا فَدَاكَ مِنْ وَاحِدَةٍ مِنْهُمَا مَالُكَ وَ لَا حَسَبُكَ"

''خدا کی قسم تجھے ایک دفعہ کفر میں اسیر کیا گیا اور دوسری دفعہ اسلام میں، تیرے مال اور حسب نے تجھے ان دونوں صورتوں (کفر اور اسلام) میں آزاد نہیں کیا۔''

ابن ابی الحدید کے قول کے مطابق اس کی اسیری کی داستان زمانۂ جاہلیت میں اس طرح ہے کہ اشعث کا باپ قیس قبیلہ بنی مراد کے ہاتھوں مارا گیا، اس کا بیٹا اشعث اپنے باپ کے انتقام کے لیے نکلا اور قبیلۂ طائفہ کندہ کے تعاون سے حملہ کرنا شروع کیا، لیکن قبیلہ بنی مراد کی جگہ غلطی سے قبیلہ بنی حارث پر حملہ کیا، بنی کندہ نے بری طرح شکست کھائی اور اشعث اسیر ہو گیا اور جیسا کہ ذکر ہوا کہ سیکڑوں اونٹوں کے بدلے میں آزاد کیا گیا۔

بعض کی نقول سے استفادہ کیا جاتا ہے کہ ان اُونٹوں کو قبیلہ اشعث نے جمع کیا تھا، اس بنا پر فرماتے ہیں: اور تیرا حسب ونسب تجھے آزاد نہ کرا سکا۔ گویا گداگری کی طرف اشارہ ہے جو اشعث کی آزادی کے لیے انجام پائی، یہ بھی احتمال پایا جاتا ہے کہ اس گفتگو کا مقصد یہ ہے کہ تیرا حسب، قدرت اور شخصیت تیری اسیری میں رکاوٹ نہیں بن سکیں، بلکہ ذلت کے ساتھ دشمن کے چنگل میں پھنس گیا، حالانکہ بنی کندہ کے دوسرے بزرگوں نے مقابلہ کیا اور قتل ہو گئے لیکن تم نے ذلت کے ساتھ اسیری قبول کی، مگر ابی الحدید کے قول کے مطابق اسلام میں اس کی اسیری کی داستان اس طرح سے تھی کہ اسلام کی قدرت کے نفوذ اور قبولیتِ اسلام کے بعد عرب کے قبائل کے کچھ نمائندہ گروہ جن میں قبیلہ بنی کندہ کا بھی ایک گروہ تھا، جس کا ایک فرد اشعث بھی تھا، پیغمبر اسلامؐ کے پاس آئے اور ظاہراً اسلام قبول کیا پیغمبرؐ نے انھیں کچھ ہدیے بھی دیئے۔

لیکن پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی رحلت کے بعد اشعث مرتدین کی صفوں میں شامل ہو گیا اور اسلام اور مسلمین کے خلاف قیام کیا۔ اسلام کے ایک گروہ نے ان کا محاصرہ کیا اور وہ راتوں رات لشکرِ اسلام کے سپہ سالار کے پاس آیا، امن کا تقاضا کیا اور بچ گیا، اور بعض کہتے ہیں کے اس نے اپنے خاندان کے دس افراد کے لیے امان کا تقاضا کیا، باقی آٹھ سو افراد نے اسلام کی سپاہ کے سامنے ہتھیار ڈال دیے۔ انھوں نے ان سے سخت انتقام لیا۔ پھر اشعث کو گرفتار کر کے خلیفۂ اوّل کے پاس لے آئے، خلیفۂ اوّل نے اُسے معاف کر دیا اور اپنی بہن فروہ جو کہ نابینا تھی، کی اس سے شادی کر دی۔ [1] جیسا کہ پہلے ذکر ہو چکا ہے۔

طبری اپنی تاریخ میں لکھتے ہیں، اسی وجہ سے مسلمان بھی اس پر لعنت کرتے تھے اور ان کے قبیلے کے اسیر بھی اس پر

---

[1] شرح ابن ابی الحدید، جلد ۱، ص ۲۹۳، ۲۹۶

https://downloadshiabooks.com/

لعنت کرتے تھے، یہاں تک کہ اس کے قبیلے کی خواتین بھی اُسے عرف النار کہہ کر پکارتی تھیں۔ عرف النار کے معنی آگ کے شعلے کے ہیں۔ یہ اُن کے لیے مستعمل ہے، جو خیانت کے مرتکب ہوئے ہوں، کیونکہ اشعث نے اپنے قبیلے کے ساتھ بہت بڑی خیانت کی تھی۔ [۱] اس وجہ سے امامؑ نے اپنی گفتگو کو تسلسل دیتے ہوئے فرمایا:

وَاِنَّ اِمْرَأً دَلَّ عَلٰی قَوْمِهِ السَّیْفَ، وَسَاقَ اِلَیْهِمُ الْحَتْفَ! لَحَرِیٌّ اَنْ یَمْقُتَهُ الْاَقْرَبُ، وَلَا یَأْمَنُهُ الْاَبْعَدُ"

''وہ شخص جس نے تلواروں کو اپنے قبیلے کی طرف چلایا اور موت کو ان کی طرف پھرایا، اس کے نزدیکیوں کو حق پہنچتا ہے کہ اسے ختم کریں اور غیر بھی اس پر اعتماد نہ کریں۔''

اشارہ ہے اس بات کی طرف کہ تُو اس شخص کی طرح ہے، جو اسلام لانے کے بعد دوبارہ مرتد ہوا اور خلیفۂ اوّل کے زمانے میں حکومتِ اسلامی کو زکوٰۃ دینے کے مخالفت کی، جب کہ زیاد ابن لبید (امیرِ حضرموت) ایک بڑا لشکر لے کر تمہاری طرف آیا تو اس کے اور تمہاری قوم کے درمیان شدید لڑائی ہوئی، تمہاری قوم نے ایک مضبوط قلعے میں پناہ لی، جب حالات خراب ہوئے تو موقع پا کر امن کے طلبگار ہوئے، ایک روایت کے مطابق اپنے لیے اور دوسری روایت کے مطابق اپنے خاص دس افراد کے لیے امان مانگی تھی، اور باقی کو مسلمانوں کی تلواروں کے حوالے کر دیا، جبکہ قوم کے باقی افراد نے گمان کر رکھا تھا کہ ان کے لیے بھی امان مانگی ہے، حالانکہ ایسا نہیں تھا۔ یہی وجہ تھی کہ لوگوں کے درمیان خیانت کار مشہور ہو گیا۔

توجہ کی بات یہ ہے کہ بعض مورّخین نے لکھا ہے، جب اس نے لشکرِ اسلام سے امان مانگی تو دس افراد کے نام لکھ کر دینے تھے، وہ اس نے لکھ کر دے دیے اور اپنا نام لکھنا بھول گیا، اس دلیل کی بنا پر جب وہ دس افراد جو قلعہ میں پناہ لیے تھے جدا ہو گئے اور خود اس کا نام اس دستاویز میں نہیں دیکھا تو مسلمانوں میں سے کوئی ایک خوش ہوا اور اُسے مخاطب کر کے بولا، اے دشمنِ خدا تم نے جان بوجھ کر اشتباہ کیا ہے، حالانکہ موت تمہارے انتظار میں ہے۔ دوسروں نے تجویز دی کہ اسے قتل نہ کیا جائے، بلکہ خلیفۂ اوّل کے پاس لے جائیں جب اسے کچھ گرفتار شدہ گروہ کے ساتھ خلیفۂ اوّل کے پاس لے آئے تو اس نے شرمندگی کا اظہار کیا اور توبہ کی تو خلیفۂ اوّل نے اُسے معاف کر دیا۔ [۲]

مرحوم سیّد رضیؒ اس مقام پر ایک دوسری روایت نقل فرماتے ہیں، وہ کہتے ہیں، امامؑ کا مقصد یہ ہے کہ اشعث ایک دفعہ کفر کے زمانے میں اسیر ہوا اور دوسری دفعہ اسلام لانے کے بعد دَلَّ عَلٰی قَوْمِهِ السَّیْفَ کے جملے سے اس گفتگو کی

---

[۱] تاریخ طبری، جلد ۱، ص ۵۴۸

[۲] کامل ابن اثیر، جلد ۲۔ ص ۳۸۱

https://downloadshiabooks.com/

طرف اشارہ ہے جو اشعث نے خالد بن ولید کے ساتھ یمامہ میں کی تھی۔ اشعث نے اپنے قبیلے کو فریب دیا اور ان کے ساتھ خیانت کی اور خالد نے انھیں قتل کیا، اسی بنا پر اس کے قبیلے نے اس کا نام عُرفُ النّار رکھا ہے، یہ لفظ خائن اور وعدے کی خلاف ورزی کرنے والوں کے لیے استعمال کیا جاتا ہے۔ نہج البلاغہ کے بعض مورّخین اور شارحین نے کہا ہے کہ اشعث کی خالد بن ولید کے ساتھ کوئی داستان نہیں تھی، بلکہ بہت ساری تاریخوں میں یہ بات واضح ہے کہ یہ ماجرا زیاد بن لبید کے ساتھ تھا۔ لیکن ابن میثم کے قول کے مطابق جو انھوں نے اپنی شرح نہج البلاغہ میں کہا ہے اور سیّد رضیؒ کے مطابق یہ واقعہ خالد بن ولید سے متعلق ہے۔ جہاں تک سیّد رضیؒ شریف کا تعلق ہے وہ آگاہ اور دانشمند انسان ہیں، ممکن ہے ان کے ہاتھ میں ایسی تاریخ آئی ہو جو ہم تک نہیں پہنچ پائی ہو۔[1] جیسا کہ اوپر اجمالاً اشارہ ہوا ''عرف'' اصل میں ابھار کے معنی میں آیا ہے، اس دلیل کی بنا پر گھوڑے اور مرغ کی گردن پر اُگنے والے بالوں کے ابھار کو عرف کہتے ہیں۔ کبھی بال کو بھی عرف کہا گیا ہے۔ عرفات کو اسی وجہ سے عرفات کہتے ہیں کہ وہ ایک بلند سرزمین ہے، جس کے اطراف میں پہاڑ ہیں اور اعراف ایسی دیوار ہے جو بہشت اور دوزخ کے درمیان میں کھینچی گئی ہے۔[2] اگر اسی وجہ سے خائن اور عہد شکن افراد کو عرف النار کہتے ہیں کہ انھوں نے اپنی قوم کو آگ میں دھکیل دیا ہے تو یہ گویا اُس آگ کے شعلے کی مانند ہیں۔

نکات

اتنا سخت برتاؤ کیوں؟

ممکن ہے کوئی اشعث ابن قیس کی تاریخ اور اس کی منافقت کے بارے میں واقفیت نہ رکھتا ہو، وہ امامؑ کے اشعث کے ساتھ سخت برتاؤ پر تعجب کرے گا، خدا کی لعنت اور تمام لعنت کرنے والوں کی لعنت کی، پھر اُسے دروغ گوئی اور جھوٹی باتیں گھڑنے والا، منافق و کافر کہا ہے، جس کی نہ اسلام میں کوئی قیمت و مقام ہے اور نہ کفر میں، اور وہ اپنی قوم اور نزدیک ترین افراد میں خیانت کا مرتکب ہے، اس کی تذلیل کرتے ہیں لیکن اس شخص کی زندگی کی سیاہ اور بدترین تاریخ جو کہ تقریباً اکثر اسلامی تاریخوں میں ہے، کی جانچ پڑتال کریں اور دیکھیں کہ کس حد تک یہ شخص مسلمانوں میں حتیٰ کہ دورِ جاہلیت میں بھی فتنے کا باعث ہوا اور مختلف جنگوں میں آگ بھڑکانے کا باعث ہوا کہ اُسے ''عرف النار'' سے پکارا گیا تب ہمارا تعجب ختم ہوتا ہے

[1] شرح ابن میثم، جلد ۱، ص ۳۳۵

[2] لسان العرب، مقائیس اللغۃ و مجمع البحرین

https://downloadshiabooks.com/

اور ہم قبول کرتے ہیں کہ گویا اشعث ابن قیس اس سے کہیں زیادہ لعنت کا حقدار ہے، امامؑ نے تو صرف تھوڑے سے اس کے اعمال اور بُری صفات کا ذکر فرمایا ہے، جتنا ہوسکتا ہے یہ مختصر جملے اس کے حقیقی چہرے کو ذہنوں تک پہنچا سکتے ہیں۔ جو بھی امامؑ کی گفتگو میں بیان ہوا ہے، وہ اشعث ابن قیس کے اوصاف کے کچھ حصے کا بیان ہے، ایک تیز نگاہ رکھنے والے رہبر کے لیے لازم ہے کہ معاشرے کے منافق اور سازشی عناصر کا تعارف کرائے، تا کہ معاشرے کے لوگ اس کے دام میں گرفتار نہ ہوں، بالخصوص وہ جو اس گروہ کی گزشتہ زندگی سے باخبر نہیں ہوتے ہیں، اس کے آس پاس جمع نہ ہوں۔ یہ سب انکشافات برحق ہیں نہ کہ دشنام طرازی اور افترا پردازی ہیں۔

امامؑ نے کیسے اس منافق آدمی کو برداشت کیا؟

جو کچھ مذکورہ نکتے میں اور خطبے کی شرح میں آیا ہے، اس سے ہوسکتا ہے یہ سوال پیدا ہو کہ اگر اشعث ابن قیس کو اس طرح کی رسوائی ہوئی اور تمام مفاسد کی بنیاد یہی تھا، تو امامؑ نے کیوں اُس کے وجود کو برداشت کیا اور اقدام کرنے کا حکم کیوں صادر نہیں فرمایا؟ اس کا جواب یہ ہے کہ پیشوایان اسلام کا منافقین کے ساتھ ٹکراؤ بہت پیچیدہ مسئلہ تھا، کیونکہ ان کے دو چہرے تھے۔ ان کے باطن میں کفر، سازش اور فساد اور ان کے ظاہر میں اسلام، قرآن اور نماز۔ اسی دلیل کی بنا پر انھیں اجتماعیت سے الگ کرنا باعث اضطراب وٹکراؤ ہوتا اور دوسری بات یہ کہ منافقوں کو یہ بہانہ مل جاتا کہ یہ مسلمانوں اور قبلے کی طرف نماز پڑھنے والوں کو قتل کرتے ہیں، بالخصوص اشعث جیسے لوگ جو طاقتور قوم وقبیلہ رکھنے کی وجہ سے معاشرے میں اضطراب و انتشار کا سبب بنتے تھے، یہ مشکل رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے زمانے میں بھی موجود تھی، منافقین جو کہ ظاہراً اسلام کے لباس میں تھے، ان کی ہمراہی نے پیغمبرؐ کا راستہ دشوار اور پیچیدہ کر دیا تھا، یہاں تک کہ پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی مشہور حدیث جس میں آپؐ فرماتے ہیں:

"لَوْلَا اَنِّيْ اَكْرَهُ اَنْ يُقَالَ اِنَّ مُحَمَّدًا (صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَآلِهِ وَسَلَّمَ) اِسْتَعَانَ بِقَوْمٍ حَتّٰى اِذَا ظَفَرَ بِعَدُوِّهِ قَتَلَهُمْ لَضَرَبْتُ اَعْنَاقَ قَوْمٍ كَثِيْرًا"

''اگر مجھے یہ بات بُری نہ لگتی کہ لوگ یہ کہیں گے کہ محمدؐ نے کچھ گروہوں کی مدد لی اور دشمنوں پر فتح کے بعد اپنے ہی حمایتیوں کو قتل کر دیا، تو میں بہت سے لوگوں کی گردن اُڑا دیتا۔'' [1]

جی ہاں، کچھ گروہ ایسے تھے جنھوں نے مسلمانوں کی صفوں میں اپنے آپ کو چھپایا، یہاں تک کہ میدان جنگ میں

[1] وسائل الشیعہ، ابواب حد المرتد، باب ۵، حدیث ۳

https://downloadshiabooks.com/

مسلمانوں کے ساتھ شرکت کی اور جنگ کے دوران ان کے ساتھ سخت ٹکراؤ کا سامنا رہا اور یہ گمان پیدا کیا گیا کہ بعض ناعاقبت اندیش کہنے لگے اسلام مسلمانوں کے خون کا محافظ نہیں ہے، اسی بنا پر، ہمیں یاد نہیں پڑتا کہ پیغمبر اکرمؐ نے اپنی پوری زندگی میں کسی منافق کو قتل کرنے کے احکامات دیئے ہوں، لیکن یہ امر مانع نہیں تھا کہ پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور قرآن مجید ان منافقین کے معاملے میں عمومی یا خصوصی طور پر کوئی ہدایات دیں تا کہ لوگ ان پر نظر رکھیں۔

https://downloadshiabooks.com/

بیسواں خطبہ

وَمِنْ كَلَامٍ لَهُ عَلَيْهِ السَّلَامُ

وَفِيهِ يَنْفِرُ مِنَ الْغَفْلَةِ وَيُنَبِّهُ إِلَى الْفِرَارِ لِلّٰهِ

اس خطبے میں غفلت سے بیدار کررہے ہیں اور اللہ کی جانب حرکت کرنے کی طرف متوجّہ کررہے ہیں۔

فَإِنَّكُمْ لَوْ قَدْ عَايَنْتُمْ مَا قَدْ عَايَنَ مَنْ مَاتَ مِنْكُمْ لَجَزِعْتُمْ وَوَهِلْتُمْ وَسَمِعْتُمْ وَأَطَعْتُمْ وَلٰكِنْ مَحْجُوبٌ عَنْكُمْ مَا قَدْ عَايَنُوا وَقَرِيبٌ مَا يُطْرَحُ الْحِجَابُ وَلَقَدْ بُصِّرْتُمْ إِنْ أَبْصَرْتُمْ وَأُسْمِعْتُمْ إِنْ سَمِعْتُمْ وَهُدِيتُمْ إِنِ اهْتَدَيْتُمْ وَبِحَقٍّ أَقُولُ لَكُمْ لَقَدْ جَاهَرَتْكُمُ الْعِبَرُ وَزُجِرْتُمْ بِمَا فِيهِ مُزْدَجَرٌ وَمَا يُبَلِّغُ عَنِ اللّٰهِ بَعْدَ رُسُلِ السَّمَاءِ إِلَّا الْبَشَرُ.[1]

”یقیناً جن حالات کو تم سے پہلے مرنے والوں نے دیکھ لیا ہے، اگر تم بھی دیکھ لیتے تو پریشان و مضطرب ہو جاتے اور بات سننے اور اطاعت کرنے کے لیے تیار ہو جاتے، لیکن مشکل یہ ہے کہ ابھی وہ چیزیں تمہارے لیے پسِ حجاب ہیں اور عنقریب یہ پردہ اٹھنے والا ہے۔ بیشک تمہیں سب کچھ دکھایا جا چکا ہے اگر تم نگاہِ بینا رکھتے ہو اور سب کچھ سنایا جا چکا ہے، اگر تم سننے والے کان رکھتے ہو اور تمہیں ہدایت دی جا چکی ہے، اگر تم ہدایت حاصل کرنا چاہو اور میں بالکل برحق کہہ رہا ہوں کہ عبرتیں تمہارے سامنے کھل کر آ چکی ہیں اور تمہیں اس قدر ڈرایا جا چکا ہے، جو بقدر کافی ہے اور ظاہر ہے کہ آسمانی فرشتوں کے بعد الٰہی پیغام کو انسان ہی پہنچانے والا ہے۔“

شرح و تفسیر

بہت جلد پردے اٹھا دیئے جائیں گے

[1] مرحوم کلینیؒ نے اصول کافی میں باب ”مَا يَجِبُ مِنْ حَقِّ الْإِمَامِ عَلَى الرَّعِيَّةِ“ اس خطبے کا کچھ حصہ نقل کیا ہے۔ حدیث ۳، ص ۴۰۵ پر رجوع کریں۔

https://downloadshiabooks.com/

امامؑ نے اس گفتگو کے مطابق تمام لوگوں کو خبردار کیا ہے کہ وہ خوابِ غفلت سے بیدار ہو کر اطاعت و پروردگار کی بندگی کے ذریعے اپنی کوتاہیوں کا ازالہ کریں اور آئندہ آنے والے خطرناک حالات کے پیش نظر خوف میں رہیں اور گزشتہ تاریخ سے عبرت حاصل کریں اور آئندہ کو سازگار بنانے کے لیے ان سے مدد لیں۔ اس گفتگو کے پہلے حصے میں فرماتے ہیں:

"فَإِنَّكُمْ لَوْ قَدْ عَايَنْتُمْ ما قَدْ عايَنَ مَنْ ماتَ مِنْكُمْ لَجَزِعْتُمْ وَ وَهِلْتُمْ [1] وَ سَمِعْتُمْ وَ أَطَعْتُمْ"

اگر اپنے مرنے والوں کی طرح تم بھی ان چیزوں کو دیکھتے، جو انہوں نے مرنے کے بعد دیکھی ہیں تو گھبرا جاتے اور مضطرب ہو جاتے؛ حق کی بات سنتے اور اس پر عمل کرتے۔''

بعض روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ گفتگو حضرت علی علیہ السلام نے بیعت کے بعد کے پہلے جمعہ میں ارشاد فرمائی اور اُصولِ کافی کی روایت کے مطابق سب سے پہلے لوگوں کو خبردار کیا کہ اپنے پیشواؤں سے خیانت نہیں کرو؛ اپنی صفوں میں اتحاد برقرار رکھو اور جو تفرقے کا باعث ہیں، ان سے پرہیز کرو۔ پھر آپؑ نے اسی معنی کی تاکید کے لیے مذکورہ جملے کو بیان فرمایا۔

امامؑ کی نظر میں وہ کون سے موضوعات ہیں کہ جن سے حجابِ چشمِ بصیرت کے ہٹنے اور مرنے کے بعد کے منظر کا مشاہدہ کرنے کے بعد انسان وحشت و اضطراب میں غرق ہوتا ہے اور فریاد کرتا ہے؟ دانشمندوں میں یہ بات زیر بحث ہے، لیکن یہ مسلّم بات ہے کہ اس حالت میں انسان دو موقعوں پر فکر مند ہوتا ہے، سب سے پہلے یہ کہ اپنے اعمال کے نتائج اپنے سامنے دیکھتا ہے۔ اُس انجام اور بدلے کا، جو اُس کی راہ تک رہے ہیں، مشاہدہ کرتا ہے اور اس کے علاوہ اپنی گزشتہ کوتاہیوں پر افسوس کرتا ہے کہ خدا نے اُسے عمر کا جو سرمایہ اور مواقع اُسے فراہم لیے تھے، اُن سے استفادہ کر کے سعادت کی بلندیوں کو چھو سکتا تھا اور عالمِ ملکوت اور خدا کے جوارِ رحمت میں اپنے لیے جگہ بنا سکتا تھا، لیکن اُس نے ان سب مواقع کو ضائع کر دیا اور سب سے بدترین چیز یہ ہے کہ اب واپسی کا راستہ نہیں ہے، پھر اس گفتگو کو مزید تسلسل دیتے ہوئے فرماتے ہیں:

"وَلٰكِنْ مَحْجُوبٌ عَنْكُمْ مَا قَدْ عَايَنُوا، وَ قَرِيبٌ مَا يُطْرَحُ الْحِجَابُ"

''لیکن جو انھوں نے دیکھا ہے ابھی تک تم سے پوشیدہ ہے، لیکن قریب ہے کہ وہ پردہ اٹھا دیا جائے (تم اس وحشت کو بھی دیکھ لوگے)۔''

یہ جو تم ان سب چیزوں سے غافل ہو اور تم نے دل کو دنیا سے جوڑ لیا ہے اور اپنے مقام کو اس دنیا میں کھو دیا ہے، اس

[1] وَهِلتم ''وَهل'' کے مادّے سے ہے ''بروزن وھب'' معنیٰ اس کے یہ ہیں کہ سخت حوادث کے مقابلے میں صبر کرنا۔

https://downloadshiabooks.com/

وجہ سے ہے کہ تمہارے اوران وحشت ناک اور خطرناک مقامات کے درمیان پردہ حائل ہے؛ لیکن یہ بات نہ بُھولو کہ ان واقعات کے بُھولنے سے ان کی نابودی کا سبب نہیں بنتا، کیونکہ بہت جلد پردے اُٹھ جائیں گے اور تمام چیزوں کا مشاہدہ کروگے۔ یہ وہ زمانہ ہے کہ نہ وحشت واضطراب اور جزع وفزع کام آئے گی اور نہ توبہ کے دروازے کھلیں گے۔

سوال: خدا اسی دنیا کی روزمرہ زندگی میں ہی کیوں پردوں کو ہٹا نہیں دیتا، تاکہ لوگ بیدار ہوں اور ہوش میں آئیں؟

جواب: آیات قرآنی میں اس سوال کے جواب کی طرف اشارہ ہوتا ہے:

"وَلَوْ اَنْزَلْنَا مَلَكًا لَّقُضِيَ الْاَمْرُ ثُمَّ لَا يُنْظَرُوْنَ"[1]

"اور ہم اگر فرشتہ اتار دیتے تو (ان کا) کام ہی تمام ہو چکا ہوتا پھر انہیں (ذرا بھی) مہلت نہ دی جاتی۔"

اگر حجاب ہٹا دیئے جائیں اور لوگ قطعی طور پر ان حالات وواقعات کا نظارہ کریں تو اسی دنیا میں ہی ان کی خلاف ورزیوں کا دردناک صلہ ملنے کا امکان ہے، کیونکہ کوئی عذر باقی نہیں رہتا ہے، جیسا کہ تقاضا کیا گیا ہے کہ اگر فرشتے ظاہری طور پر نازل ہوں اور پیامِ الٰہی کو انھیں پہنچائیں تاکہ وہ ایمان لے آئیں، چنانچہ فرشتے کا مشاہدہ کرنے کے بعد ایمان نہیں لائے تو ان کی زندگی کا خاتمہ ہو جائے گا (اور بلا فاصلہ ان کے اوپر عذابِ الٰہی نازل ہوگا)۔

اس بات کو کہنے دیجیے کہ مرنے کے بعد کے مسائل پر چشم دید مشاہدہ کرنے کے بعد ایمان لے آنا اطاعت وبندگی کی دلیل نہیں ہے، یہ حقیقت میں اضطراری ایمان کی طرح ہے، بالکل اسی طرح افراد یہاں تک کہ بچے بھی جب آگ کے نزدیک ہاتھ لے جاتے ہیں تو ردّ عمل کا اظہار کرتے ہیں۔ اگر گناہوں سے پرہیز کرنے کا طریقہ بھی یہی ہو جائے تو یہ ہرگز تقویٰ اور خدا کی بندگی کی دلیل نہیں ہے۔

حضرت علی علیہ السلام فرماتے ہیں، "قَرِيْبٌ مَا يُطْرَحُ الْحِجَابُ" "بہت جلد پردے ہٹا دیے جائیں گے"، اس وجہ سے کہ انسان کی عمر جتنی بھی لمبی ہو جائے پھر بھی دنیا کی عمر اور آخری زمانے کا برپا ہونا جلدی گزرنے والے لمحات کے مقابلے میں کچھ بھی نہیں۔ اس کے بعد امامؑ اپنے کلام کے دوسرے حصے میں ایک اہم نکتے کی طرف اشارہ کرتے ہیں:

"وَلَقَدْ بُصِّرْتُمْ اِنْ اَبْصَرْتُمْ، وَاُسْمِعْتُمْ اِنْ سَمِعْتُمْ، وَهُدِيْتُمْ اِنِ اهْتَدَيْتُمْ"

"اگر چہ تم نے موت کے بعد کے احوال اپنی آنکھوں سے نہیں دیکھے ہیں، لیکن بہت سارے دلائل کے مطابق سب کچھ تمہارے سامنے ہے، اگر دیکھنے والی آنکھ اور سننے والے کان رکھتے ہو تو تمہیں سنایا اور دکھایا جا چکا ہے اور ہدایت کی

[1] سورۂ انعام، آیت ۸

https://downloadshiabooks.com/

طلب ہے تو تمہیں ہدایت کی جا چکی ہے۔"

اس بنا پر تمہارے لیے کوئی عذر باقی نہیں رہا اور ہرگز خطا کے راستے سے معذور نہیں ہو، کیونکہ موت کے بعد کے عالم کے واقعات، اگرچہ پسِ پردہ ہیں، مگر اُن سے متعلق تم تین طریقوں سے آگاہ ہو:

پہلا: سب سے پہلے اس دنیا کے عبرت انگیز مسائل کے ذریعے سے کہ جنہیں اپنی آنکھوں سے دیکھتے ہو اور قدیم شاہی آثار تمہاری آنکھوں کے سامنے ہیں؛ گزرے ہوئے لوگوں کی ٹوٹی پھوٹی قبریں اس دنیا کی ناپائیداری کی علامت ہیں، ظالم اقوام اور برباد و ستم گر لوگوں کا انجام دیکھ چکے ہو، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اس سب کے پیچھے کوئی طاقت اور قدرت ہے۔

دوسرا: دوسری طرف آسمانی کتابوں کی آیات ان حقائق سے پردہ اٹھاتی ہیں اور خدا کے پیغمبروںؑ کی طرف سے دلائلِ نقلی بھی موجود ہیں، جو بیان کرتی ہیں۔

تیسرا: اگر عقل سے کام لیا اور اہلِ ہدایت میں سے ہو گئے تو دلائلِ عقلی بھی کم نہیں ہیں، یعنی معاد اور مرنے کے بعد کی دنیا خود رہنمائی کرتی ہے۔ اس بنا پر مذکورہ بالا تینوں جملوں میں سے ہر ایک جملہ ان تین دلائل میں سے کسی ایک کی طرف اشارہ ہے: حس، نقل اور عقل۔

ممکن ہے کہ پہلا جملے کا اشارہ حسی و عقلی دلائل کی طرف ہو (اس لیے کہ عقلی ادراک کو بھی بصیرت کہا جاتا ہے)؛ دوسرا جملہ نقلی دلائل کی طرف اشارہ ہو اور تیسرا جملہ ان تینوں کے طفیل حاصل ہونے والی ہدایت کی طرف اشارہ ہو۔

پھر، اس کلام کے آخری حصے کے جملوں میں اس معنی کی تشریح اور تین نکات کو بیان کرتے ہیں:

"وَبِحَقٍّ اَقُوْلُ لَكُمْ: لَقَدْ جَاهَرَتْكُمُ الْعِبَرُ"

"(سب سے پہلے یہ کہ) میں سچ کہتا ہوں کہ عبرتیں تمہیں بلند آواز سے پکار چکی ہیں۔"

یہ حوادث جنہوں نے پوری تاریخِ بشریت کو پُر کر رکھا ہے اور انسان نے اپنی مختصر زندگی میں بھی ان کے نمونے دیکھے ہیں، ان کا کسی سے پوشیدہ ہونا اور چھپ جانا کوئی معنی نہیں رکھتا یا کہ مزید غور وخوض اور دقت کی ضرورت نہیں ہے۔ فرعون، نمرود، قیصر و کسریٰ جو اپنے اپنے دور میں عجیب شان و شوکت سے حکومت کرتے تھے، آج تھوڑی سی مٹی کے علاوہ ان کے کوئی آثار و نشان باقی نہیں ہیں، ان کے محل ویران، قبرستان خاموش، تخت و تاج گرے ہوئے ہیں۔ یہ سب کچھ ہر طرف نمایاں ہے ان میں سے ہر ایک اپنی بے زبانی سے موجودہ اور آئندہ نسلوں کو درسِ عبرت دیتا ہے۔ شہروں کی ویرانی اور گناہ گار اقوام کی آبادیوں اور گوشہ و کنار میں موجود بہادر افراد کے قصے درس عبرت ہیں۔ قرآن مجید فرماتا ہے:

https://downloadshiabooks.com/

"وَإِنَّكُمْ لَتَمُرُّونَ عَلَيْهِمْ مُصْبِحِينَ. وَبِاللَّيْلِ أَفَلَا تَعْقِلُونَ." [۱]

''اور بے شک تم لوگ اُن (کی اُجڑی بستیوں) پر صبح کے وقت بھی گزرتے ہو، اور رات کو بھی، کیا پھر بھی تم عقل نہیں رکھتے ؟''

دوسری جگہ فرماتا ہے:

"كَمْ تَرَكُوا مِنْ جَنَّاتٍ وَعُيُونٍ وَزُرُوعٍ وَمَقَامٍ كَرِيمٍ وَنَعْمَةٍ كَانُوا فِيهَا فَاكِهِينَ كَذَٰلِكَ وَأَوْرَثْنَاهَا قَوْمًا آخَرِينَ."

''وہ کتنے ہی باغات اور چشمے چھوڑ گئے، اور زراعتیں اور عالی شان عمارتیں، اور نعمتیں (اور راحتیں) جن میں وہ عیش کیا کرتے تھے، اسی طرح ہوا، اور ہم نے اِن سب کا دوسرے لوگوں کو وارث بنا دیا۔''

بعد والی آیت میں مزید فرماتا ہے:

"فَمَا بَكَتْ عَلَيْهِمُ السَّمَاءُ وَالْأَرْضُ وَمَا كَانُوا مُنْظَرِينَ." [۲]

''ان لوگوں پر زمین و آسمان کو بھی رونا نہ آیا اور نہ انھیں مہلت دی گئی۔''

قرآن کریم اور روایات اس طرح کی خبر دار کرنے والی آیات اور گفتگو سے پُر ہیں۔ شعراء اور ادیبوں نے بھی اپنے بیانات لَقَدْ جَاءَكُمُ الْعِبَرُ ان عبرت انگیز حوادث کو مضبوط اور مؤثر پیرائے میں پیش کیا ہے، اس کی تعبیر سے خوب واضح ہوتا ہے۔

دوسرے نکتے میں فرماتے ہیں:

"وَزُجِرْتُمْ بِمَا فِيهِ مُزْدَجَرٌ." [۳]

''اور دھمکانے والی چیزوں سے تمھیں دھمکایا جا چکا ہے۔''

یہ نہی اور دھمکایا جانا ممکن ہے کہ تکوینی ہو کہ تاریخ میں گزشتہ لوگوں کی خبریں اور ان کے باقی ماندہ آثار مٹی سے ظاہر ہوتے ہیں، جیسا کہ قرآن کریم میں ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

"وَلَقَدْ جَاءَهُمْ مِنَ الْأَنْبَاءِ مَا فِيهِ مُزْدَجَرٌ."

---

[۱] سورۂ صافات، آیات ۱۳۷، ۱۳۸

[۲] سورۂ دخان، آیات ۲۷، ۲۹

[۳] زجرتم ومزدجر مادّہ ''زجر'' سے ہے جو روکنے کے معنی میں ہے، یعنی بلند آواز سے روکا جاتا ہے۔

https://downloadshiabooks.com/

''اور بیشک اُن کے پاس (پہلی قوموں کی) ایسی خبریں آچکی ہیں جن میں (کفرونافرمانی پر) سرزنش ہے۔''[1]

یا تشریعی اور وحی کے طریقے سے ہو، جو کہ آسمانی کتابوں میں موجود ہے۔ اس ترتیب سے دونوں زبانوں (تکوینی وتشریعی) سے اتمامِ حجت حاصل ہوا ہے، اور کوئی شخص اپنی غفلت اور بے اعتنائی میں معذور نہیں ہے۔

تیسرے اور آخری جملے میں فرماتے ہیں:

"وَمَا يُبَلِّغُ عَنِ اللهِ بَعْدَ رُسُلِ السَّمَاءِ إِلَّا الْبَشَرُ"

''آسمانی رسولوں (فرشتوں) کے بعد بشر ہی ہوتے ہیں جو تم تک اللہ کا پیغام پہنچاتے ہیں۔''

یہ اشارہ ہے کہ تم کس کے انتظار میں ہو، اس انتظار میں ہو کہ آسمان سے فرشتے نازل ہوں اور تم پر آیاتِ الٰہی کی تلاوت کریں، جیسے رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے زمانے میں بہانہ تلاش کرنے والے کفار کہتے تھے:

"لَوْ مَا تَأْتِينَا بِالْمَلَائِكَةِ إِنْ كُنْتَ مِنَ الصَّادِقِينَ"

''اگر آپ صحیح کہتے ہیں تو فرشتوں کو کیوں ہمارے پاس نہیں لاتے؟''[2]

قرآن ان کے جواب میں کہتا ہے:

"مَا نُنَزِّلُ الْمَلَائِكَةَ إِلَّا بِالْحَقِّ وَمَا كَانُوا إِذًا مُنْظَرِينَ"[3]

''ہم نے فرشتوں کو سوائے حق کے نازل نہیں کیا (ہر آنکھ انھیں نہیں دیکھ سکتی اور انھیں صرف حق کو آشکار کرنے کے لیے نازل کیا گیا ہے، پھر بھی اگر ان کے اوپر فرشتے نازل ہو گئے تو بھی یہ ایمان نہیں لائیں گے) اور انھیں مہلت نہیں دی جائے گی اور عذاب الٰہی سے انہیں نابود کیا جائے گا۔''

اس بنا پر انسانوں میں کچھ لوگ یعنی انبیائے الٰہی پیام کو پہنچانے کا ذریعہ ہیں کہ جو اللہ کے مقرب فرشتوں کے ذریعے سے بھیجے گئے ہیں۔ مختصراً یہ کہ خداوند عالم نے بہت کافی طریقوں سے اتمامِ حجّت کر دیا ہے۔ مشاہداتِ حسی جو گزشتہ اقوام کی حالتِ زار کے بارے میں ہیں، ان کے ذریعے اور وحی اور عقل کے طریقے سے بھی کوئی یہ بہانہ نہیں کر سکتا کہ مجھ پر فرشتہ نازل نہیں ہوا اور راہِ فرار اختیار نہیں کی جا سکتی۔

---

[1] سورۂ قمر، آیت ۴

[2] سورۂ حجر آیت ۷

[3] سورۂ حجر، آیت ۸

https://downloadshiabooks.com/

ایک نکتہ

مرنے کے بعد کی دنیا

یہ بات درست ہے کہ ہماری اس دنیا اور مرنے کے بعد کی دنیا کے درمیان ایک ضخیم حجاب حائل ہے؛ وہ تاریک پردے عالم برزخ کے حوادث کو دیکھنے سے مانع ہیں، (ایسا ہی ہونا چاہیے) کیونکہ اگر پردے ہٹا دیئے جائیں اور امتحان کی بھٹی سرد ہو جاتی اور تمام کے تمام بحالت مجبوری خدا کی طرف جائیں، فرماں بردار اور نافرمان بھی نہ پہچانے جائیں، لیکن قرآن کی آیات اور معصوم پیشواؤں نے اس وحشت ناک عالم کے گوشوں کی طرف اشارہ کیا ہے اور بتایا ہے کہ انسان موت کے فرشتے کو دیکھنے کے وقت کیوں خوف میں غرق ہوتا ہے، جبکہ اپنے اعمال اور ان کے آثار کو اپنی آنکھوں سے دیکھتا ہے اور التماس کی فریاد بلند کرتا ہے اور موت کے فرشتے سے کہتا ہے، اے اللہ کے فرشتو! مجھے چھوڑ دو تا کہ گناہوں سے توبہ کروں اور اپنی کوتاہیوں کی تلافی کروں شاید صالح اعمال اس مقام کے لیے بجالاؤں:

رَبِّ ارْجِعُوْنِ لَعَلِّيْٓ اَعْمَلُ صَالِحًا فِيْمَا تَرَكْتُ[۱]

''اے میرے رب مجھے دنیا میں واپس بھیج دے تا کہ میں وہ نیک عمل بجالاؤں جو مجھ سے چھوٹ گئے ہیں۔''

لیکن بہت جلد اس کو منفی جواب کا سامنا کرنا پڑے گا کیونکہ اس قسم کے تبدیل ہونے والے دور واپس نہیں آسکتے، جیسے بچہ رحم مادر میں واپس نہیں جا سکتا اور وہ پھل جو درخت سے جدا ہو، اپنی شاخ پر دوبارہ لگ نہیں سکتا۔ امیر المومنین علیہ السلام نے نہج البلاغہ کے بعض خطبوں میں اس سلسلے میں تفصیلی شرح بیان فرمائی ہے، یہاں صرف ایک جملے کہ طرف اشارہ کریں گے، آپؑ فرماتے ہیں:

يُفَكِّرُ فِيْمَ اَفْنٰى عُمُرَهٗ وَ فِيْمَ اَذْهَبَ دَهْرَهٗ وَ يَتَذَكَّرُ اَمْوَالًا جَمَعَهَا اَغْمَضَ فِيْ مَطَالِبِهَا... وَ اَشْرَفَ عَلٰى فِرَاقِهَا تَبْقٰى لِمَنْ وَرَائَهٗ[۲]

''موت کے وقت انسان اچانک خوابِ غفلت سے بیدار ہوتا ہے اور خیال کرتا ہے کہ اس نے اپنی عمر کو کس راستے میں خرچ کیا اور وقت کو کس راستے میں ضائع کیا، جو دولت اس نے جمع کی ہے اس کی یاد کرتا ہے، یہی دولت ہے جس کی خاطر

---

[۲] نہج البلاغہ، خطبہ ۱۰۹

https://downloadshiabooks.com/

اس نے نیندیں حرام کیں اور حلال وحرام اور مشکوک چیزوں میں فرق پہچان نہ سکا۔ اب جدائی کے وقت یہ ساری دولت وارثوں کے ہاتھ چلی گئی۔"

جی ہاں! یہ بیداری وآگاہی اور یہ جزع وفزع اور یہ تمام چیزیں مرنے کے بعد اور موت کے فرشتے کو دیکھنے کے بعد حاصل ہوتی ہیں، الٰہی رہبروں نے ان پُرخطر اور پُرخوف منازل کے بارے میں ہمیں خبردار کیا ہے، اگر ہم انھیں سننے والے ہوتے۔ پروردگار نے ہمیں عبرت حاصل کرنے والی آنکھ، سننے والے کان اور آگاہ رہنے والا دل عطا فرمایا، تاکہ مرنے سے پہلے اپنی جلد گزرنے والی منزل کے لیے ضروری توشہ تیار کرلیں اور اطمینانِ قلب کے ساتھ ابدی دنیا کی طرف روانہ ہوں اور پاک ونیکوکار لوگوں کے جوارِ رحمت میں جگہ پائیں، جو کہ بہترین ساتھی اور رفیق ہیں۔ "وَحَسُنَ اُولٰٓئِكَ رَفِيْقًا"۔

خداوندا! اِس عظیم کام کو پایۂ تکمیل تک پہنچانے کے لیے ہمیں توفیق مرحمت فرما۔ (آمین)

تمّت بحمد اللہ

https://downloadshiabooks.com/